ہماری ویب ڈیجیٹل بک

امیر جان حقانی

AMIR JAN HAQQANI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Amir Jan Haqqani"
at Hamariweb.com

تعلیم یافتہ احباب سے دردناک اپیل

اس میں دو رائے نہیں کہ کسی بھی قوم ، ملک و ملت کی ترقی و عروج کا دارومدار نوجوانوں پر منحصر ہے ، یعنی تعلیم یافتہ نوجوانوں پر۔ تعلیم یافتہ کی تعبیر کن پر منطبق ہوتی ہے ، فی الحال اس بحث سے اجتناب ہی مفید ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ میں ذاتی طور پر تعلیم میں دوئی کا قائل نہیں ہوں، یعنی علم میں دینی و دنیوی تقسیم کا قائل نہیں ہوں۔ مسلمانوں کو اس چیز نے برباد کرکے رکھ دیا ہے۔ علم کو قدیم وجدید، مشرقی و مغربی اور نظری و عملی میں تقسیم کرنا ملت اسلامیہ کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ مرحوم اقبال نے اس واسطے کہا تھا۔

''حدیث کم نظراں قصۂ قدم وجدید''

علم ایک صداقت ہے، یہ کسی ملک و قوم کی ملکیت نہیں، علم ایک وحدت ہے اور اس کو کثرت کہا جاتا ہے اور اس کثرت میں وحدت ہے۔ اسی وحدت کا نام حق و صداقت کی تلاش اور سچ کی جستجو ہے۔

آج میرے مخاطب نواجوان ہیں اور بالخصوص وہ نوجوان جن پر'' تعلیم یافتہ'' کی تعبیر صادق آتی ہے۔ مجھے لفظ نوجوان سے بے حد محبت ہے، لفظ نوجوان کو دیار غیر کی لغت میں ''یوتھ'' (Youth) کہا جاتا ہے۔ رازدانِ علوم مغرب حضرت اقبال

نے کیا خوب کہا ہے کہ

محبت ہے مجھے ان جوانوں سے
جو ستاروں پر ڈالتے ہیں کمند

میں اس وقت ذہنی طور پر کشمکش کا شکار ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں اور اپنی بات کو کس طرح سمیٹوں' کیونکہ آج میرا مخاطب وہ طبقہ ہے جو قلیل کا نہیں کثیر کا متقاضی ہے۔ ''خیر الکلام ما کل و دل'' کی روشنی میں خاطرات دل مختصراً گوش گزار کرونگا اس نیت کے ساتھ کہ اللہ تعالی ہمیں نظری سے زیادہ عملی انسان بننے کی توفیق دے' اور جو بات دل سے نکلتی ہے وہ ضرور آثر رکھتی ہے۔

ملک وملت کی دگروں حالت کا ثاقبانہ نظر کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت نوجوانوں بالخصوص تعلیم یافتہ (بشمول قدیم وجدید) اور علماء ملت کی ذمہ داری بہت ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے، اگر کسی بھی انقلابی کام کا آغاز تعلیم یافتہ نوجوان اور مخلص علماء کرام سنجیدگی' گہرائی اور پختگی اور عزم مصمم کے ساتھ شروع کریں تو بہت جلد مثبت نتائج ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ اس میں عامیانہ انداز سے گریز کرنا ہوگا اور تعلیم یافتہ نوجوان اور علماء ملت دعوت الی اللہ اور اصلاح معاشرہ و نفس کی جدوجہد کو سطحیت سے بچاتے ہوئے

انجام دیں گے بلکہ عامة الناس کو یہ باور کرائیں گے کہ ان کے انقلابی و اصلاحی تحریک کا مقصد عظیم اور اس کی جڑیں گہری اور علم و تحقیق اور دورِ جدید کی ضروریات کے عین مطابق ہے تو پھر کوئی بُعد نہیں کہ مدد رحمانی شامل حال نہ ہو۔

میں تعلیم یافتہ نوجوانوں سے پر امید ہوں' کیونکہ '' تعلیم یافتہ '' ہیں۔ کل انھوں نے اس ملک جو قلعہِ اسلام سمجھا جاتا ہے کی باگ وڈور اپنے ہاتھ میں لینا ہے بلکہ اللہ نے چاہا تو دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی مثبت کردار ادا کریں گے۔ یا جن کے ہاتھ میں زمام کار آئے وہ امت مرحومہ کی درست تربیت اور نونہالانِ قوم کی صحیح تعلیم کا بندوبست کریں گے۔ اس کے لیے طبقہ نوجواں کو تعلیم یافتہ ہونا از حد ضروری ہے۔ وہ کونسی تعلیم ہے جس کا زور دیا جارہا ہے تو اس حوالے سے بھی کچھ سماعت فرمائیں۔ تعلیم کی غرض و غایت اور مقصدیت کے بارے میں بہت کچھ کی گنجائش ہے ' لیکن یہاں تعلیم کی افادیت اور فوائد کے حوالے سے ایک حوالہ دیا جائے گا جو جامعیت اور بلوغید پر مبنی ہے۔

دیار غیر (برٹش /برطانیہ) کے ایک ماہرِ تعلیم نے تعلیم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہیے یہ ہے کہ تعلیم اس '' کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریہ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں۔'' مدرسہ '' (اسکول 'کالج و یونیوسٹی) کا فریضہ ہے وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظریہ حیات سے وابستہ ہیں طالب علم پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعے وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے ''۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا' آرٹیکل ایجوکین' مترجم (مفکر اسلام حضرت علی میاں۔

تعلیم کی یہ تعریف انتہائی زیادہ جامع اور عملی زندگی بیں ملانے والی ہے۔ ملک عزیز میں نظام تعلیم' نصاب تعلیم کے حوالے سے ناچیز اپنی ہی ایک تحریر کا حوالہ دینا چاہتا ہے' شاید یہ بے ربط باتیں آپ کا دل و دماغ بھی قبول کریں۔'' دل و دماغ میں ایک اضطراب ، انقلاب، اور خیالات و سوالات کا ایک دریا امڈ آ رہا تھا کہ کیا ہم موجودہ تعلیمی صورت حال سے مطمئن ہیں؟ عصری نظام تعلیم و دینی نظام تعلیم ؟ طبقاتی نظام تعلیم ؟ غریبوں کے لیے الگ اور امیروں کے لیے الگ، قدیم طرز تعلیم و جدید طرز تعلیم ؟ ہمارے نظام تعلیم کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہماری علمی و تحقیقی بنیادیں کمزور ہو گئی ہیں، کیمبرج سسٹم، فرنچ سسٹم، امریکن سسٹم، مدرسہ سسٹم، اور گورنمنٹ اسکول سسٹم

جس کو آپ پہلے اسکول والا نظام بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس ملک میں بہ یک وقت کئی نظام چل رہے ہوں وہ ملک ترقی کیسے کر سکتا ہے اور کیسے ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ ہمارا نظام تعلیم تخلیقی بنیادوں پر نہیں ہے۔ کاش صرف اور صرف طریق تدریس ہی کو جدید بنیادوں پر استوار کیا جاتا اور اپنی قومی و مادری زبان کو تدریسی زبان قرار دی جاتی۔ کیا ترقی یافتہ چین اور جاپان نے اپنی زبان چھوڑ کر کسی بدیسی زبان کو تعلیمی زبان کے طور پر اپنا کر بام عروج حاصل کئے ہیں؟۔ ہر گز نہیں۔ تو پھر ہم کیوں انگریزی کو اپنی کھال سمجھ بیٹھے ہیں اور پیشاب تک انگریزی میں کیوں کرنے لگے ہیں۔ کیا ہم اب تک اس گورے کے غلامی کے طوق میں پھنسے ہوئے نہیں ہیں؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ ہم بہت جلد نماز بھی انگریزی میں پڑھنے لگیں۔ اللہ بچائے۔ آہ! دھرتی عزیز میں یکساں نظام تعلیم نہیں ہے مختلف طبقے اور گروہ پیدا ہو رہیں، عجب ابہام ہے۔ ایک طبقہ صرف قدیم اور مدرسے کی تعلیم کو اہم اور ضروری سمجھتا ہے اور ایک بڑا طبقہ انگلش میڈیم اور مغربی طرز تعلیم کو کامیابی کی کنجی اور ترقی و عروج کا راز سمجھتا ہے۔ اور کچھ بے چارے دونوں طبقوں میں پھنس کر اپنے نونہالوں کو دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ لوگ قابل تقلید ہیں مگر یہ انداز بے حد صعب و مشقت طلب ہے۔

قارئین! دل کی بات یہ ہے کہ میں تعلیم میں دوئی وثنویت کا قائل نہیں ہوں۔

اسلامی تاریخ پر عمیق نظر ڈالی جائے تو تعلیم میں تقسیم نظر نہیں آئے گی۔ یہ تقسیم گذشتہ ۲، ۳ سو سال پہلے کی ہے جو ہمارے دشمن کی کامیاب چال ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد انسانوں کو حیوانیت کی نچلی سطح سے اٹھا کر انسانیت و مسلمانیت کے عروج و بلندیوں پر پہنچانا ہے۔ تعلیمی نظام و نصاب ایسا ہونا چاہیے جو فرد کو اس کی اصل حقیقت و ذات سے روشناس کروائے، اور وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہو، دو جہانوں میں، اور یہ کہ اپنے اندر چھپی ہوئی تمام صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور حقیقت کا ادراک کرلے۔ اور جب وہ اس قابل ہو کہ وہ خود کو جان سکے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکے تو پھر وہ جدھر چاہے ادھر جائے۔ چاہے تو مفسر و محدث بنے یا ڈاکٹر و انجینئر اور تعلیمی نظام اس کی کامیاب رہنمائی و مدد کرے۔ انتہائی معذرت سے عرض ہے کہ کیا ہمارا موجودہ تعلیمی نظام ہماری درست رہنمائی کر رہا ہے؟ بالخصوص ہمارا موجودہ نصاب تعلیم (دینی و دنیاوی) کسی نوعمر کی ذات کی نشو ونما، حقیقت کا ادراک، سچ کی تلاش اور کامیاب زندگی و معاشرت کے لیے مکمل کردار ادا کر رہا ہے؟ یعنی ایک اسلامی ریاست کے تمام تقاضے پورا کر رہا ہے۔ یقینا جواب نفی میں ہوگا۔ ہمیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سخت قسم کے اقدامات کرنے ہونگے۔ (بحوالہ سہ ماہی نصرۃ الاسلام گلگت' سفر نامہ' محبتوں کی زمیں وادی غذر کا ایک سفر' جلد نمبر۱' شمارہ نمبر۱، ص/۱۶)۔

نظام تعلیم اور نصاب تعلیم پر میرے جیسے کم علم اور بے مایہ انسان کے لیے بات کرنا مشکل ہے اور یہ ایک نازک مسئلہ بھی ہے۔ایک مملکت اسلامیہ کے لیے ایسا نظام تعلیم ہونا چاہیے جو یقین پیدا کرے ان چیزوں کے بارے جو اس قوم کے معتقدات' مقاصدا ور تہذیبی سرمایہ ہو' اس قوم کے عقائد' اقدار' ویلوز وافکار ہوں۔ اور یہ یقین کھوکھلے نعروں اور تعصب پر مبنی روایات پر نہیں بلکہ علم' مطالعہ' وجدان اور دماغ کے راستے سے ہو' تقابلی مطالعہ کے طور سے یہ یقین پیدا ہوتا ہو اور اس یقین میں دل اور دماغ کا مطمئن ہونا از بس ضروری ہے۔ علم تو ایک جذبہ صادق ہے۔خدا کی نعمت کبریٰ ہے' علم عَالم کی اشد ضرورت ہے' علم تحقیق و جستجو کے ذریعے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا نام ہے۔کاش ! کہ ہمیں علم کا اصل مفہوم و مقصد سمجھ آتا....اے کاش !!!! آج کے دور میں ایک ایسا انقلابی نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو'' علم ''و'' دین'' میں خلیج پیدا نہ کریں۔ اگر ہم مملکت عزیز کی ۶۷ سالہ نظام پر نظریں دوڑائیں تو ہمیں کفِ افسوس ہی ملنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک آج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کرنے کا سب سے بڑا کام یہی ہے۔ آئر کنڈیشن کمروں میں بیٹھ کر ملک وملت کی تقدیر کے فیصلے کرنے والے اس انداز میں سوچنے سے قاصر ہیں۔ تعلیم گاہیں ایسی فیکٹریاں ہیں جہاں سے تمام اداروں کو خام مال سپلائی ہوتا ہے۔ اگر یہاں ہی خرابی اور نقص ہو تو پھر بہتری کی کسی امید کی گنجائش

نہیں۔قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی اولین تعلیمات بھی تعلیم پر ہی مبنی ہے۔ہم اس دین کے داعی ہیں جس نے سب سے پہلے اپنی دعوت و علم کا اعلان ان خوبصورت الفاظ میں کی ہے۔ '' اقرأ باسمک ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم، الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم'' اس آیت کریمہ کا ایک نرالا مفہوم یہ ہے کہ اس میں صرف علم کی بات نہیں کی گئی بلکہ علم کے لیے کاغذ، نقوش، قلم وقرطاس،سیاہی و دوات اور کتاب اور دوسرے لوازمات کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔آج کے دور میں اس کی نئی شکل کمپیوٹر، بھی ہے۔غور سے دیکھیں گے تو اس آیت کے مفہوم میں ای میل،کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، ڈیزائننگ،آن لائن ٹیچنگ، ویب میگزین پروف ریڈنگ،پرنٹنگ اور طباعت وابلاغیات کی تمام جدید و قدیم صورتیں شامل ہیں۔یہ علم ''لدنی'' نہیں بلکہ کسبی ہے۔یہ علم کوئی جہالت کے دروازے سے یا فوجی بغاوت کے طور پر ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے۔آج تعلیم یافتہ طبقہ (جس بھی سبھی شامل ہیں، عصری دانشگاہوں میں تحقیق وریسرچ کی داد پانے والے اور دینی جامعات میں خلوص وللّٰہیت کے ساتھ کسب فیض حاصل کرنے والے) کی بڑی ذمہ داری ہے کہ اقوام عالم اور اپنے نادان مسلمان بھائیوں کو یہ باور کرانا ہے کہ یہ علم معرفت سے پیدا ہوا ہے، رجم بالغیب کے لئے اس میں گنجائش نہیں، یہ وحی سے پیدا ہوا ہے،زمانے کی تمام ضروریات و مقتضیات کے ساتھ دے سکتا ہے، معاشرتی و تمدنی زندگی کی رہنمائی و سرپرستی کر سکتا ہے۔ تعلیم کی وحدت اور

اکائی کی بنیادیں علماء دین اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ڈال سکتے ہیں۔ میرا دل مجھے بتاتا ہے یہ میرا وجدان ہے اور مجھے اس پر کامل وشواش ہے کہ آج تعلیمافتہ طبقے کو کرنے کا جو' سب سے اہم کام ہے وہ یہ ہے کہ قدیم درسگاہوں میں جدید ماہرین کو'' اہلاً و سہلاً'' کہا جائے اور عصری دانشگاہوں میں ان لوگوں کو '' ویلکم'' کیا جائے جنہوں نے انتہائی محنت' خلوص' للّٰہیت اور ایثار کے ساتھ علوم نبوی کو پڑھا ہے' سمجھا ہے اور عصر حاضر کے نئے علمی و ادبی' تحقیقی ذخیرے سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔آج اگر ''ملا'' اور مسٹرِ'' ،''قدیم'' و''جدید'' ، ''دنیاوی علوم'' و'' دینی علوم'' کی تفریق کو نہ '' پاٹا جائے' اس کی بیخ کنی نہ کی جائے تو امت مسلمہ اور مسلمانان پاکستان کا بیڑہ روز بروز غرقابی کا شکار ہوتا جائے گا۔ اس تفریق اور امتیاز کو ختم کرنا ہوگا کہ '' علم ادب، شاعری، حکمت و فلسفہ، سائنس و ٹیکنالوجی،''قدیم'' و''جدید'' ، ''دنیاوی، علوم'' ، '' ودینی علوم'' کی مخصوص یونیفام جو پہن کر آئے وہ قابل قبول ہے اور باقی سب شئی لایعنی۔ یعنی جو ادبیت کی مخصوص وردی نہ پہنے اور ادب (مروجہ) کا کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے وہ ادیب کہلانے کا مستحق نہیں' یہی حال دوسرے علوم و فنون کا ۔جب تک اس رجحان کو ملیامیٹ نہیں کیا جاتا' اس کی مٹی پلید نہیں کی جاتی ہم روز بروز تنزلی کا شکار ہوتے رہیں گے۔ترقی رک جائے گی' انتہا پسندی ناسور کی طرح پھیل جائے گی' دینی طبقہ دلائلِ قرآن و حدیث کا انبار لگا کر عصری طبقے

کو زیر کرنے کی کوشش جاری رکھے گا اور عصری طبقہ بھی اپنی تحقیق جدید اور ''جہاں دیدگی'' کے گمان میں دینی طبقے کو آنکھیں دکھاتا رہے گا۔ اور سچی بات یہی ہے کہ یہ ایک المیہ سے کم نہیں اور یہ المیہ گزشتہ کئی دہائیوں سے مسلم امہ اور مسلمانان پاکستان کو زنگ کی طرح چاٹ رہا ہے۔

آج نوجوانوں کو اُٹھنا ہوگا' اپنے اندر تفریق کو ختم کرنا ہوگا' صبر برداشت' تحمل' رواداری' اخوت کا ماحول پید کرنا ہوگا۔ مغربی افکار و جدوجہد کے نتیجے' میں پیدا ہونے والی تفریق کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ہمیں مل بیٹھ کر ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا کہ جو محبت و اخوت اور ایک دوسروں کے مسائل و ضروریات کو سمجھنے' اور مایوس قوم کی رہنمائی کا نوید بنے۔ جب تک ہم ان گھمبیر مسائل کا ادراک نہ کریں ہم کوئی انقلابی قدم نہیں اُٹھا سکتے ہیں۔ ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں' ہمیں سمجھ ہی نہیں آرہا ہے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ کاتب تقدیر اس انتظار میں ہے کہ کوئی ہے جو ڈوبی کشتی کو پار کرائے' خدا تعالی کی سنت ہے، وہ دیکھتا ہے کہ کسی قوم میں کہاں تک اخلاص ہے' عزم کس قسم کا ہے' صلاحتیں کیسے استعمال کی جاتیں ہیں۔ یاد رہے کچھ تقدیریں بدل جاتی ہیں اور کچھ بدلی جاتی ہیں۔ اللہ تعالی کے ہاں بعض دفعہ کسی فرد یا جماعت کے حق میں کچھ فیصلے لکھ دیے جاتے ہیں' وہ ایسا متبرک وقت ہوتا ہے کہ ایک لمحہ صدیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اور قوموں میں انقلاب آیا کرتا ہے' اور کبھی ایک نقطۂ ''محرم'' کو''

مجرم'' بنا دیتا ہے ایک ہلکی سی لغزش پوری قوم کے سفینے کو غرق کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ کاش ہمیں اس کا ادراک ہو' اگر ادراک ہے تو اس سے نمٹنے کے لیے کوئی عملی اقدام' کوئی لائحہ عمل.....؟

دھرتی بے اماں ایک قربانی مانگتی ہے' ایسی قربانی جو ملت کے مفاد میں ہو۔ پارٹیوں کے مفاد' علاقوں کے مفاد' زبانوں اور رنگوں کے مفاد' یہاں تک کہ اختلافی نظریوں اور مسلکی خیالوں سے ہٹ کر ایک ایسی قربانی جو صرف اور صرف ملت و وحدت کے لیے دی جائے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کے جذبے صادق کی ضرورت ہے۔ حضرت نے ایک ایسی قربانی دی جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ وہ نواسہ رسول ' جگرِ گوشہ بتول، ان کے ساتھ شرعی دلائل ہیں' کبار صحابہ ہیں' عاشقان علی کی تلواریں ہیں' قرن اول کے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی ہے' ایک بڑی تعداد ان کے ہاتھ پر بیعت ہے اور وہ خلیفہ راشد' مگر امت مسلمہ کو خون خرابے سے بچانے کے لیے خلافت سے دستبرداری کی قربانی دی' کیا ایسے سازگار حالات میں کوئی ایسی عظیم قربانی دے سکتا ہے؟ یقیناً نہیں... انھوں نے تو اپنے نانا جان کی پیش گوئی کی لاج رکھی ہے۔ پیارے حبیب نے فرمایا تھا' کہ '' ان ابنی ہذا سید' لعل اللہ ان یصلح بین فئتین من المسلمین '' میرا یہ بیٹا رہنما ہے' سردار ہے' کیا عجب ہے کہ ربِ کائنات اس (حضرت حسن) کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں مصالحت کرا دیں۔ کیا حضرت حسن رضی

اللہ عنہ کے نام لیوا ایسی قربانی پیش کر سکتے ہیں ؟۔ میرے اپنے نوجوان تعلیم یافتہ اگرچہ عمر کے لحاظ سے بوڑھے ہوں مگر عزم و جذبہ کے لحاظ سے نوجوان ہوں)) دوستوں سے ہاتھ جوڑ کر اپیل ہے کہ وہ امت کی بگڑی حالت کا جائزہ لیں' اپنے مسائل کا ادراک کریں' زمانے کی چیلنج کو قبول کریں' اور اس کا جرأت و بہادری سے سامنا کرنے کا عزم پیدا کریں۔کاش ! کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا نظام تعلیم کی داغ بیل ڈال دی جائے جو نفرتوں کے بجائے محبتیں پھیلائے' جو انسان کے بجائے رحمان کا بندہ بنائے' جو امت کی بگڑی بنائے' جس کے سبب مسلمانوں کو عروج ملے'۔ قارئین ! تعلیم جو انسان کو مکمل انسان بناتی ہے' حب الوطن پاکستانی بناتی ہے' وہ نظام تعلیم یہاں ناپید ہے۔ اس موضوع پر بات کرنا' لکھنا اور کچھ کہنا عجیب سا لگتا ہے پر امید پر دنیا قائم ہے' خدائی تعلیمات بھی ناامیدی سے گریز کا تلقین کرتی ہیں، اس امید کے ساتھ لکھنے کی گنجائش ہے کہ کبھی تو گلستان میں سورج طلوع ہوگا۔ میرے جیسے علم و عمل سے تہی دامن طالب علم بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ دھرتی عزیز میں تعلیم کے حوالے سے دعوؤں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے' ہر ایک (اسلامی و دنیاوی 'مکتبہ ہائے فکر تعلیم) اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے مگر کہیں پر بھی مربوط نظام تعلیم 'واضح اور متعین لائحہ عمل موجود نہیں ہے' اور بد قسمتی سے ہم اس سب کچھ کا ذمہ دار ارباب حل وعقد اور منتخب و غیر منتخب حکومتوں کو سمجھتے ہیں، درحقیقت ان کے ساتھ ہم خود بھی اس تباہی و بربادی شریک ہیں۔ سیکولر طبقے کو

ہم کیا الزام دیں جو دینی ذہن رکھتے ہیں اور ان کی زیر سرپرستی میں اسکول و کالجز اور یونیورسٹیاں چلتی ہیں ان کا ''حال'' کوئی قابل تقلید اور نمونہ نہیں ' انہوں نے بھی اس حوالے سے کوئی اساسی تو کیا بہتری کی طرف پیش رفت بھی نہیں کی' اسلامی ذہن کے مالک لوگوں کی زیر نگرانی چلنے والی یونیورسٹیاں مثلاً رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی' شفاء انٹر نیشنل یونیورسٹی'قرطبہ یونیورسٹی' ہمدرد یونیورسٹی' منہاج یونیورسٹی' اسراء یونیورسٹی (کتنے خوبصورت اسلامی نام ہیں) اور ان جیسی کئی اور یونی روسٹیاں جن کے ذمہ داران بزعم خویش دینی جذبوں سے سرشار ہیں کو کون ہدایات فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اداروں کو مغربی انداز میں چلائے اور قوم وملت کے نونہالوں کو ''مغربیت'' لبرل پسندی'' کی طرف مائل کریں اور ان کو مغرب زدہ ماحول کا عادی بنائے ؟ اور'' ان کو کس نے روکا ہے کہ تمام نئے اور جدید علوم میں اسلامی نقطہ نگاہ اور فکر سے تحقیق و ریسرچ کا کام نہ کریں ؟۔ جدید و قدیم ' عصری و دینی' اسلام اور سائنس ' قرآن وحدیث اور کمپیوٹر وانگلش کے ساتھ ساتھ یا ان کا حسین امتزاج جیسے پرفریب نعروں اور سلوگن کے تحت قائم کیے جانے والے اسکولوں کا حال بھی کوئی ماڈل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا ہے ، مثلاًدعوۃ ماڈل اسکولز، اقراء اسکولز، یقین ماڈل اسکولز، غزالی اسکولز، منہاج ماڈل اسکولز، قیادت اسکولز، فاران اسکولز اور ان جیسے بیشمار سکولز ہیں۔ ان میں بیکن اسکولز، کیمبرج اسکولز' سینٹ جوزف اسکولز جیسے لادین

اسکولوں سے شر و فتن تو بظاہر کم ہے مگر کیا ان میں خیر و صلاح کی مقدار بھی وہی ہے جو ایک مثالی اسلامی ریاست کے نظام تعلیم کے لیے مطلوب ہو سکتی ہے یعنی نونہالان قوم کو ایک کامل انسان اور اکمل مسلمان بنانے کے لیے ان مذکورہ یونیورسٹیوں اور دینی ماڈل کے اسکولوں کا منہج تعلیم کافی ہے؟ یقیناً نہیں۔ دینی مدارس کے ارباب حل وعقد سے بھی ایک ادنیٰ طالب علم کی گستاخی پر معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ وہ نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالے سے شیخ الہند کے خیالات واحساسات ' شیخ العرب والعجم حضرت مدنی کے مرتب کردہ دینی مدارس کا نصاب اور مقاصد تعلیم کو علی منہاج النبوۃ وعلی منہاج السلف قائم کرنی کی جاندار تجویز' بے باک قلم کار علامہ مناظر احسن گیلانی کے بیان کردہ منہج تعلیم پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنا چاہیے۔ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لیے بہت گنجائش ہے مگر کاغذ کے ان اوراق میں اتنی گنجائش نہیں، اور خیالات بھی منتشر و بے ہنگم ہیں۔ کچھ باتیں اگلی دفعہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

میں آج اپنے آپ سے ،اپنے نوجوان بھائیوں سے مخاطب ہوں اور انتہائی دلبرداشتہ ہو کر میرے دل میں ٹیسیں اٹھتی ہیں اور دل و دماغ بیک وقت پکار اٹھتے ہیں کہ '' کوئی ہے جو مسلمانوں کی بگڑی تقدیر کو سامنے رکھئے؟ 'ہم سے بے شمار غلطیاں ہوئی ہیں' ہم مزید غلطیوں کے متحمل نہیں ہیں' ہماری مزید غفلت' انا' نفسانیت' علاقائی اور طبقاتی عصبیت' جذباتی نعرے' ذاتی مفاد پرستی' تفرقہ بازی' انتشار وافتراق' اختلاف و جھگڑا اور اپنی اپنی ڈیڑھ

اینچ کی مسجد ملک وملت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دے گا۔ ہے کوئی جوان تمام مفادات سے ہٹ کر ملت کے مفاد کی بات کرے اور ملک وملت کے مفادات کو مقدم سمجھے؟ کیا اتنا بھی ممکن نہیں کہ چند ہی ایام کے لیے اختلافی مسائل و ذاتی مفادات اور گروہی جذبات اور مسلکی نعروں سے بالائے طاق ہو کر ''ملی'' مفادات کے لیے مکمل ایثار و للٰہیت سے کام کیا جائے؟ شاید نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ایسا کر سکے! شاید۔ اگر یہ انقلاب اپنی ذات سے شروع کیا جائے تو وہ دن بعید نہیں کہ ہم پورے عالم اسلام بلکہ عالم انسانی کے لیے حق و انصاف اور عدل و مساوات کے لیے پشت پناہ نہ بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر بن جائے۔

محبوبِ خدا حضرت مولانا شاہ حکیم اختر رحمہ اللہ

میں ابھی سن بلوغت کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ حفظ قرآن کے لیے کراچی سدھار گیا۔ میرے انکل مولانا موسیٰ ولی خان صاحب کراچی میں درس وتدریس میں مشغول تھے۔میں اپنے والدین کا اکلوتا بچہ تھامگر قرآن پاک کو حفظ کرنے کے لیے ہزاروں میل دور کراچی بھیج دیا گیا۔جامعہ اشرف العلوم کورنگی کراچی، مولانا سحبان محمود صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی) کا لگایا ہوا حسین پودا ہے۔میں حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہو رہا تھا۔ یہ غالبا2000ء کی بات ہے۔ حضرت سحبان محمود صاحب سے دوران حفظ کئی دفعہ انعام میں کتابیں لینے کا اعزاز حاصل رہا۔امتحانات میں پوزیشن ہولڈر طلبہ کوکتابیں انعام میں دی جاتیں تھیں۔ چونکہ ہم چھوٹے تھے اس لیے ہمیں اکابرین علماء کرام کے رسائل دیے جاتے۔ان رسائل میں زیادہ تر دارالعلوم کراچی والے رسائل ہوتے مگر تین شخصیات کے رسائل ہر انعام میں ہوتے۔ ا۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی، مولانا عاشق الٰہی بلندشہری ثم مکی اور شاہ حکیم اختر نوراللہ مرقدہ کے رسائل ہوتے۔چونکہ میں مبتدی طالب علم تھا۔ علم وادب سے نابلد تھا۔اکثر رسائل درمیان سے کچھ کچھ پڑھنے کے بعد اچھے وقتوں کے لیے سنبھال رکھتا۔ مگر حضرت مولانا حکیم اختر صاحب قدس سرہ کے رسائل اور کتب کے ساتھ معاملہ برعکس ہوتا۔ کیوں ؟ صرف اس لیے کہ حضرت کے

رسائل انتہائی خوبصورتی کے ساتھ معیاری کاغذ میں مزین طریقے سے چھاپے جاتے اور سہل اور آسان موضوعات پر مبنی یہ رسائل اور کتب جابجا اشعار اور قصوں اور کہانیوں سے مملوء ہوتے تھے۔ حضرت اپنے مواعظ میں دقیق علمی مسائل نہیں چھیڑتے۔ وہ تو انتہائی دلچسپ اور دلربا انداز میں وعظ کرتے اور یہی وعظ کتب و رسائل کی شکل میں چھپتے۔ اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ حضرت کے مخاطب دینی مدارس کے طلبہ و علماء سے زیادہ عوام تھے۔ عام طور پر ہمارے مدارس میں علمی زبان استعمال کی جاتی ہے جو عوام الناس کی فہم و ادارک سے دور ہوتی ہے جس کی وجہ سے مناسب فائدہ نہیں ہوتا۔ مگر حضرت حکیم صاحب کا لب و لہجہ، انداز بیاں، اور طرز تخاطب عوامی ہوتا۔ وہ بڑے بڑے علمی دقیق مسائل اور صوفیاء کا کلام بالخصوص پیر رومی کا فارسی کلام انتہائی جاذب اور دل نشیں انداز میں سمجھاتے تھے۔ پیر رومی کا کلام اور اس کی تشریحات تفصیل سے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے البتہ جو پڑھا ہے وہ حضرت شاہ صاحب کی بیان کردہ توضیحات و تشریحات ہی پڑھا ہے۔ حق یہ ہے کہ شاہ صاحب نے حق ادا کیا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میں حضرت شاہ صاحب کا سن بلوغت سے پہلے کا قاری ہوں اور اس زمانے سے حضرت کا قدر دان بھی۔ حضرت کے کئی اشعار تو دوران حفظ ازبر ہوئے تھے۔ ابتدائی اسلامی ادبی ذوق بھی حضرت والا کے لٹریچر اور کتابوں سے پیدا ہوا۔ یقینا حضرت کی کتب ادب اسلامی سے مملوء ہیں۔

دارالعلوم کراچی میں ہمارے ایک برادر محترم مولانا عبدالقدوس صاحب پڑھتے تھے۔ان کا ایک مشغلہ یہ تھا کہ بزرگ علماء سے ملاقات اور زیارت کرتے تھے۔ وہ غالباً درجہ ثالثہ کے طالب علم تھے۔ اکثر گلشن اقبال میں حضرت کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھتے تھے۔ جمعرات کو میں دارالعلوم میں ان کے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ میرے نگران بھی تھی اور رشتہ دار بھی۔وہ حضرت شاہ صاح بؒ اللہ مرقدہ کے دلدادہ تھے۔شاہ صاحب کی اکثر کتب ان کے پاس موجود تھیں۔وہ شاہ صاحب کی کتب اپنے دوستوں اور اساتذہ میں بانٹتے۔ مجھے بھی کئی کتب دی تھیں۔ویسے بھی ان کے پاس حضرت کی جو کتابیں تھی وہ میرے دسترس تھی اور مطالعہ میں رہتے تھی ۔ایک دفعہ میری چاہت پر مجھے بھی اپنے ساتھ حضرت کی بارگاہ میں لے گئے۔ ہم بہت پہلے ہی مسجد میں پہنچ گئے اور اگلی صفوں پر بیٹھ گئے۔ مسجد تنگ تھی۔لوگوں کا ایک جم غفیر ہوتا تھا۔کافی انتظار کے بعد حضرت شاہ صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ سفید ریش بزرگ سفید پوشاک میں جب منبر پر بیٹھ گئے تو اللہ اللہ ! دیدنی کا کیا منظر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ حکیم اختر رحمۃ اللہ علیہ کو جن جن وہبی و کسبی صفات عالیہ سے نوازا تھا ان پر تو اہل علم و قلم اور اصحاب سلوک وطریقت ہی روشنی ڈالیں گے مگر اس پہلی زیارت میں مجھ پر جو واہ ہوا، اور میرے دل و دماغ میں حضرت کی جو شخصیت سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ اللہ نے انہیں اخلاص و للّٰہیت، تقویٰ و طہارت،الفت و محبت،احترام واکرام اور علم و عمل سے وافر مقدار میں نوازا

تھا۔ عشق رسول میں فدائیت، عشق الٰہی میں فنائیت، عشق صحابہ ہیں غرق اور عشق اولیاء و صوفیاء میں قربان نظر آئے۔ علم تصوف میرا موضوع نہیں اور نہ ہی تصوف وطریقت کے رموز سے واقفیت ہے اور نہ ہی موجودہ دور کے اکابر صوفیاء و شیوخ شناسائی ہے۔ لیکن اگر قسم کھا کر کہوں کہ حضرت شاہ حکیم اختر صاحب اکیسوی صدی کے علم تصوف و طریقت اور اصحاب تصوف و سلوک کے بے تاج بادشاہ تھے تو حانث نہیں ہو نگا۔ بلکہ وہ تو باتاج بادشاہ تھے۔

نماز جمعہ کے بعد حضرت والا سے مصافحہ کے لیے لائن لگ گئی۔ بخدا لوگوں کی ایک کثیر تعداد مصافحہ کے لیے تپتی دھوپ میں کھڑی تھی۔ ہم بھی لائن میں لگ گئے۔ حضرت سے مصافحہ کیا۔ پھر ہوتے ہوتے حضرت کی نشست گاہ تک پہنچے۔ مریدین وسالکین کا ایک مجمع تھا۔ دبک کے کسی کونے میں بیٹھ گئے۔ واللہ! حضرت باتیں نہیں کر رہے تھے دَہن مبارک سے پھول جھڑتے تھے۔ کتنی رسیلی گفتگو تھی جس کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔

حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیارے حبیب سے فرمایا کہ '' میں نے اپنی رضا کو نفس کی مخالفت و مخاصمت میں رکھ دیا ہے اور لوگ اُسے موافقتِ و مطابقتِ نفس میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے میری رضا پائیں گے۔ شاہ حکیم اختر صاحب نے بھی اپنے نفس کی مخالفت کرکے اللہ کی رضا پالی

تھی۔ مخالفتِ نفس ان کا سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔ مخالفتِ نفس میں تادم آخیر قائم و دائم رہے۔یہی حدیث میں آتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ '' میں نے عزت و اکرام اور شرف و منزلت کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں رکھ دیا ہے لوگ اُسے بادشاہوں کے محلوں اور درواروں میں ڈھونڈتے ہیں۔ بھلا انہیں عزت کیسے ملے گی۔'' حضرت شاہ صاحب بارک اللہ وجہہ نے اطاعت خداوندی میں اپنے زندگی بتائی تھی۔ڑے۔ڑے بادشاہ اور بادشاہ گران کے آستانہ میں حاضری دیتے تھے۔اطاعت خداوندی کی وجہ سے اللہ نے انہیں وہ عزت و مرتبہ اور شرف سے نوازا تھا کہ ماو شما سوچ سکتے ہیں۔ جس قدر انسان کے اندر اللہ کی معرفت و محبت صحیح ہوگی اس قدر اس کا عمل درست اور عنداللہ مقبول و ماجور ہوگا۔اللہ تعالٰی کی معرفت ، محبت و مودت، اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی کیفیات دلوں میں کیسے جاگزیں ہوتیں ہیں اس کو جاننے کے لیے حضرت شاہ صاحب کی کتب کا مطالعہ اور اس کی جیتی جاگتی حیات کا سمجھنا ضروری ہے۔اور اس پر چلنا اور پھر وہی مطلوب نتائج کا حصول کیسے ممکن ہوتا ہے اور سنت کے راستے کیسے اللہ تک ملاتے ہیں کا پتہ چلانے کے لیے بھی ان کی سوانح عمری کوپڑھنا ہوگا۔ میں نے حضرت والا کو بارہا سنا۔ ہر بار دل میں ان کے لئے ایک بلند مقام پیدا ہوتا۔ وہ خدا کی معرفت اور محبت کو سمجھانے کے خدا کی کتاب مقدس اور رسول اللہ کی تعلیمات کا مکمل سہارا لیتے تھے۔خداوند کریم کا ارشاد گرامی ہے کہ '' یھدی الیہ من اناب'' یعنی اللہ راہ مستقیم انہیں کو دکھاتا ہے جو اس

کی طرف متوجہ ہو۔ حضرت والا نے عمر بھر یہی کام کیا کہ بندگانِ خدا کو خدا کی طرف متوجہ کیا۔

حضرت حکیم صاحب نوراللہ کا فیض چاردانگ عالم پھیلتا رہا۔ کراچی میں تو آپ کے فیوض وانوار کی برسات تادم حیات جاری و ساری رہا۔ علماء و صلحاء اور تشنگانِ تصوف و طریقت کی آمدورفت ہمیشہ رہتی۔ گلشن اقبال کی یہ عظیم خانقاہ حضرت رحمہ اللہ کے وجودسعید سے ایک طویل عرصہ جگمگاتی رہی۔ گلشن اقبال مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک سے لوگ قطار در قطار آ رہے تھے۔ آج خانقاہِ گلشن کے در و دیوار پسماندگان شیخ میں شامل ہیں۔

کلیوں کو میں خونِ جگر دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

ہم بھی اپنی بساط کے مطابق حضرت سے مستفید ہوتے رہے مگر سچی بات یہ ہے کہ جس انداز میں حضرت سے کسب کرنا تھا، ان کی خدمت کرنی تھی وہ نہ کرسکے۔ تاہم بارہا حضرت کی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا۔ حضرت کے مواعظ سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کچھ مواقع ایسے بھی آئے کہ حضرت کو بہت قریب سے دیکھا۔

غالباً مارچ 2008ء کی بات ہے۔ مولانا عطاء اللہ شہاب کراچی میں آئے تھے۔ ان

کے ساتھ جامعہ اشرف المدارس سندھ بلوچ سوسائٹی میں جانا ہوا۔ حضرت مولانا حکیم مظہر صاحب اور ان کے صاحبزادے کے ساتھ ایک تفصیلی ملاقات ہوئی۔ کئی امور زیر بحث آئے۔ وہاں سے حضرت حکیم مظہر صاحب کی معیت میں حضرت شاہ حکیم اختر صاحب کے حجرے پہنچ گئے۔ حضرت کو دیکھ کر دل مسرور ہوا۔ حضرت نے نفیس طبع پائی تھی۔ حضرت والا طویل عرصے سے بستر علالت میں تھے۔ بستر علالت اور حجرہ مبروک سے بھی نفاست ٹپک رہی تھی۔ حجرہ خاص سے باہر مریدین باصفا کا ایک مجمع تھا۔ جب ہم حاضر ہوئے تو حضرت کے صاحبزادے مولانا حکیم مظہر صاحب نے تعارف کروایا۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے اور احقر نے حضرت کے ہاتھ دبانے شروع کیا۔ سلسلہ دراز ہوا۔ پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ پھر پاؤں بھی دیر تک دباتا رہا۔ کتنے نرم گرم اور ملائم پاؤں تھے۔ حضرت ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ میری زندگی کے حسین لمحات میں ان چند لمحات کا بھی شمار ہوتا ہے کہ جب میرے کہنے پر حضرت شاہ صاحب نے میرے لیے ہاتھ اُٹھا کر دعاء کی تھی۔ قارئین میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میری دل کی کیفیات کیا تھیں۔ ایسا ہی ایک مقبول دعا مجاہد اسلام حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے بھی میرے لیے خصوصی کی تھی جب برادرم مولانا۔۔۔ابن شیخ الحدیث مولانا مغفوراللہ باباجی (حقانیہ اکوڑہ خٹک) کی معیت میں ان کے دولت کدے میں حاضر ہوئے تھے۔ اللہ اللہ! کہاں یہ بزرگان باصفا کے ہاتھ بندہ پر تقصیر کے لئے اُٹھنا کہاں خواہشات نفسی کا یہ پتلا۔ بندہ عاصی کے لیے محبوب خدا کے ہاتھ اُٹھنا کوئی

معمولی بات ہے کیا۔ میرا دل سرشار تھا۔اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ محبوبِ خدا تھے۔وہ کیونکہ کر محبوب خدا تھے تو سیدھی سی بات ہے وہ عاشقِ محبوبِ خدا تھے۔کیونکہ اس (رسول اکرم) کے بغیر اللہ تعالیٰ سے محبت، اس کی اطاعت میں مداومت ناممکن ہے۔بدون واسطے رسول بندے کی ایمان قبول نہیں چہ جائیکہ وہ محبوب خدا بنے۔ا

دورہ حدیث کے سال استاد محترم مولانا عبید اللہ خالد صاحب نے موطا امام مالک کی ایک حدیث دلنشیں انداز میں پڑھائی تھی۔حدیث کا مفہوم یوں ہے کہ: '' جب اللہ رب العزت کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل امین سے فرماتے ہیں کہ

! اے جبرئیل

میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، اسے پسند کرتا ہوں لہٰذا تو بھی اس سے محبت رکھ۔چنانچہ ملائکہ کے سردار حضرت جبریل امین بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔پھر وہ اہل سماء میں اعلان فرماتے ہیں کہ

!اے سکان سمائ

مالک ارض وسماء فلاں بندے سے محبت رکھتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔چنانچہ خلائق سماء بھی اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔اس کے بعد اس محبوب خدا کی ''مقبولیت زمین میں پھیلتی ہے اور اہل ارض بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

حضرت شاہ حکیم اختر صاحب بھی ان معدودے لوگوں میں سے جو اللہ کو محبوب تھے، وہ کیوں نہ اللہ کے محبوب ہوتے کہ پوری عمر محبوب خدا کی سنتوں کو زندہ کرنے میں بتائی۔وہ تو علماء دیوبند کے محبوب تھے۔ عوام و خواص اس سے کٹ کر محبت کرتے تھے۔ افراتفری اور مادیت کے اس دور میں مخلوقِ خدا حضرت والا کے آستانے میں حاضری دینا سعادت سمجھتی تھی۔بغیر کسی دنیاوی غرض اور مقصد کے صرف اللہ کے لیے محبت کرنا ہی محبت حقیقی ہے۔ورنہ تو آج لوگ کسی کے خوف و شر سے بچنے اور مال و متاع کے لالچ میں محبت واکرام کرتے ہیں۔اور شاہ صاحب سے خلقت رضاء الٰہی کے لیے محبت کرتی تھی۔

استاد محترمولانا عبیداللہ خالد صاحب نے جامعہ فاروقیہ میں طلبہ کے ایک پروگرام میں فرمایا تھا کہ '' آجکل دینی مدارس و اجتماعات میں بھی غیر مستند شعراء کا کلام، نظمیں،اور نعتیں سنائی جاتی ہیں، بعض دفعہ تو ان کا کلام دینی احکامات کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ میری گزارش ہے کہ جامعہ کے پروگراموں میں حضرت نفیس شاہ صاحب اور حضرت حکیم اختر صاحب کا کلام پڑھا جائے۔ ان دونوں بزرگوں کا کلام شرعی پیمانوں پر پورا اترتا ہے۔کلام میں شرینی اور لطافت بھی ہے۔اور شعری معیار پر پورا بھی اترتا ہے اور اکابر علماء ان کے کلام پر اعتماد بھی کرتے ہیں''۔

حضرت والا کی اصلاحی و علمی خدمات کے ساتھ سماجی خدمات کا بھی ایک وسیع نیٹ ورک ہے۔ الاختر ٹرسٹ کے نام سے ملک بھر کی طرح گلگت بلتستان کے غریب مسلمان بھی مستفید ہوتے رہے۔ مگر افسوس کہ کچھ عرصے سے یہاں گلگت کے مقامی نااہل ذمہ داروں کی غیر شائستہ حرکتوں کی وجہ سے الاختر ٹرسٹ کی امداد و معاونت سے باسیان گلگت بلتستان محروم ہیں۔ گلگت بلتستان میں الاختر ٹرسٹ کی ذمہ داریاں جن لوگوں کو سونپی گئی تھیں انہوں نے غریب اور مستحق عوام کے مال پر ہاتھ صاف کیا۔ شروع شروع میں ٹرسٹ کا امدادی مال گلگت بلتستان کے پسماندہ علاقوں تک پہنچ چکا تھا مگر بعد میں صورت حال مختلف رہی۔ جس کی وجہ سے شاید ٹرسٹ کے بزرگوں نے یہاں کام معطل دیا۔ حضرت والا رحمہ اللہ کی باقیات صالحات سے گزارش ہے کہ گلگت بلتستان کے غیور اور مستحق مسلمانوں کو الاختر ٹرسٹ کے فیوض و امداد سے محروم نہ رکھیں۔
دیندار اور صالح علماء کی ایک کمیٹی بنا کر یہاں دوبارہ سماجی کاموں کا نیٹ ورک بچھایا جا سکتا ہے۔ اہل باطل نے گلگت بلتستان میں سماجی کاموں کا وسیع نیٹ ورک بچھا کر یہاں فتنہ و فساد شروع کر رکھا ہے۔ دیگر قبیح مضرات کے ساتھ ایک عظیم المیہ یہ بھی وقوع پذیر ہو رہا ہے کہ غریب اور سادہ لوح مسلمان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ الاختر ٹرسٹ اور دیگر رفاہی و سماجی اداروں بالخصوص اکابر علماء کرام کو اس حوالے سے سنجیدگی سے کوئی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ وگرنہ آنے والے

دنوں کے موسم یہاں کے اہل سنت عوام کے لیے صحت افزا نہیں۔ گلگت بلتستان کے مدارس بھی مفلوک الحال ہیں، ان پر بھی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ بہر صورت الاختر ٹرسٹ والوں کی نظر کرم والتفات کی اشد ضرورت ہے۔ حضرت والا کا لٹریچر بھی اگر گلگت بلتستان میں مستقل بنیادوں پر تقسیم کیا جائے تو مناسب نتیجے کی توقع ہے۔

حضرت والا کی رحلت ہو چکی ہے۔ موت کو کسی سے رستگاری نہیں۔ ہم نے بھی وہاں جانا ہے جہاں حضرت چلے گئے ہیں۔ اس معمورے بے ثبات میں کسی کو مخلد نہیں رہنا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو محبوبِ خدا جناب محمد مصطفیٰ کو کبھی بھی موت نہ آتی۔

ولوکانت الدنیا تدوم لواحد

لکان محمد فیہا مخلداً

حضرت والا کی رحلت کی خبر سن کر دل افسردہ ہوا۔ مگر فوراً ''انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لیا۔ ان کی وفات حسرت آیات پر ہر ایک رویا۔ العین تدمع۔ آنکھوں پر اختیار'' ختم ہو چکا ہے۔ خلقت بے ساختہ روئی۔ دل مغموم ہیں۔ والقلب یحزن۔ حضرت کی وفات پر تو اہل علم و عمل لکھیں گے۔ ان کی زندگی، سوانح عمری پر بھی اصحاب قلم ہی قلم اُٹھائیں گے۔ تاہم ہماری اس ناقص تحریر کا سبب

.برادرم مکرم مولانا زین العابدین حفظہ اللہ رعاہ نے جو حضرت شاہ صاحب نوراللہ مرجعہ کی وفات حسرت آیات پر اہل علم و قلم کی تحریری جمع کر کے ''تذکرہ و سوانح'' ترتیب دے رہے ہیں۔ سچ یہ کہ وہ ثواب کما گئے اور ان کی بدولت ہم بھی خریداران یوسف میں شامل ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم۔ ہم تو انہی لوگوں میں ہیں جو حضرت والا کے نام سے نام کمانا چاہتے ہیں۔ کسی عربی شاعر نے حضرت محمد مصطفیؐ کے حوالے سے کیا خوب کہا ہے کہ

مامدحتُ محمداً بمقالتی لکن مدحت مقالتی بمحمدِ

امیر جان حقانی

ایڈیٹر: سہ ماہی نصرۃ الاسلام گلگت

مدرس: جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت

لیکچرر: ایف جی ڈگری کالج گلگت

کالم نگار: آن لائن پامیر ٹائم اینڈ روزنامہ صدائے گلگت

وفاؤں کی دیوی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب راجو اپنے گھر سے ہزاروں میل دور ایک بڑے شہر یں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مشکل سے راجو کی عمر کوئی تیرا چودہ سال ہو گی۔ راجو کا ایک دوست فیضی تھا جس کے گھر میں راجو کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہ شہری لوگ تھے اس لیے بڑی نفیس طبع پائے تھے۔ راجو اپنے دوست فیضی کے گھر میں ان کی آپا سے انگلش کے ابتدائی گرائمر پڑھتا تھا۔ راجو اور فیضی ہم کلاس تھے، مگر فیضی تعلیم میں زیادہ توجہ نہیں کر رہا تھا جبکہ راجو مسلسل پڑھنے میں منہمک رہتا۔ فیضی کی دو بڑی بہنیں تھی۔ دونوں یونیورسٹی میں تعلیم پا رہی تھی۔ فیضی اور راجو کو انگلش پڑھایا کرتی تھیں۔ راجو چونکہ پہاڑی علاقوں کا باسی تھا، اس لیے فطرتاً گوری رنگت کا حامل تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے بے حد حسن وجمال سے نوازا تھا۔ موٹی آنکھیں، نرم وملائم ہاتھ اور چہرے پر دل دوز مسکراہٹ راجو کی خاص پہچان تھی۔ اس کے ہاتھوں کی بناوٹ دیکھ کر بڑے بڑوں کے دل دھک جاتے۔ ایک دن فیضی کی ایک بہن نے دوسری سے سوال کیا کہ جانور فلم میں جو بچہ ہے اس جیسا خوبصورت بچہ دیکھا ہے کبھی؟۔ فیضی کی دوسری بہن نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور کہا کہ کیوں آپ کیوں پوچھ رہی ہو؟۔ راجو یہ باتیں سن رہا تھا مگر اس کی سمجھ

سے بالاتر تھیں۔ وہ ٹیبل پر رکھی کاپی پر کچھ نوٹ کررہا تھا۔راجو کے متصل والے صوفے پر فیضی کی اماں اور فیضی بیٹھے ہوئے تھے اور راجو کے سامنے والی کرسی پر فیضی کی دونوں بہنیں۔فیضی کی ایک بہن نے جواب دیا کہ ہمارے سامنے بیٹھا بچہ جانور فلم کے راجو سے بھی زیادہ حسین وجمیل ہے۔اس پر راجو کے دوست فیضی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور راجو کے ساتھ چمٹ گیا کہ میرا یار راجو سے بھی زیادہ پیارااور خوبصورت ہے۔وہ خوشی سے پھولے نہیں سماپارہا تھا۔ادھر سے فیضی کی ماں نے بھی کہا کہ ہمارا راجو اس راجو سے واقعی پیارا ہے۔دیکھو نا اتنی معصومیت چہرے پر نظر آرہی ہے۔وہ راجو اپنی ماں کے قریب ہوتے ہوئے بھی دور تھا اور ہمارا راجو بھی اپنی اماں سے ہزاروں میل دور ہے۔وہ تعلیم پانے کے واسطے روزانہ ماں سے ملتا تھااور یہ تعلیم پانے کے واسطے ماں سے دور ہے۔ راجو کے دوست فیضی نے چیخ چیخ کر پورا گھر سرپر اٹھا رکھا تھا۔گھر کے تمام افراد اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کررہے تھے مگر راجو ان کی باتوں کو مبہوت ہوکر سن رہا تھا۔ یہ تمام باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔راجو کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جانور فلم کس بلا کا نام ہے۔وہ تو فلم میں کیا ہوتا ہے اس سے بھی نابلد تھا۔وہ کبھی فلم ہال نہیں گیا تھا البتہ روڈ کے.براب سنیما گھر میں لگے فلم پوسٹروں کو دیکھا تھا۔راجو کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس فلم میں راجو نام کا لڑکا کون ہے اور اس کی عمر کیا ہے اور کیونکہ کر خوبصورت ہے۔ راجو کو یہ سب مافوق الفطرت معلوم ہوتا تھا۔اس

کے ذہن میں یہ باتیں نقش ہو چکی تھی مگر وہ سلجھ کر نہیں دیتی۔
زندگی کے ماہ و سال گزرتے گئے۔ راجو اپنی تعلیم کے سلسلے میں مسلسل گھر سے باہر ہی تھا۔ اس کی ایک ہی دُھن تھی کہ پڑھ لکھ کر ایک اچھا اور کامیاب مسلمان بن جائے اور ایک کامل انسان اور مہذب شہری۔ راجو اپنے اس مقصد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار تھا۔ وہ بڑی شہروں کے پارکس، لائبریریز اور دیگر تعلیمی و علمی مقامات میں دیوانہ وار گھومتا رہا۔ وہ تو پبلک مقامات پر بھی کوئی کتاب کھولے گھنٹوں دنیا ومافیہا سے بے خبر پڑا رہتا۔ کم عمری میں ہی سینکڑوں نامور شخصیات سے اپنا تعارف کروا چکا تھا۔ بڑوں کو دیکھ کر بڑا بننے کا بے انتہا شوق تھا مگر کیسے........ راجو اس سوال کے جواب کے لیے قابل قدر شخصیات کی سوانح عمریوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرتا۔ راجو ان کامیاب شخصیات کی زندگی میں ایک قدر مشترک پاتا، وہ تھی ایک
عورت!!!!.. یہ سچ ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ عورت نہ ہوتی تو وہ کامیاب مرد جنتا بھی کیسے ؟۔ راجو نے جب حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیا تو آپ کی زندگی میں جہاں دکھ ہوتے، تکالیف ہوتی وہاں کوئی عورت ان دکھوں اور تکالیف کو پاٹتے نظر آتی۔ آپ پر پہلی وحی کی وجہ سے خوف طاری ہوا تو سیدہ خدیجہ کبری آپ کو دلاسا دیتی نظر آتی۔ راجو نے دیکھا کہ بڑھاپے کی دہلیز میں حبیب خدا محمد مصطفیٰ سیدہ عائشہ صدیقہ کے ساتھ دوڑ

لگاتے نظر آتے تو راجو کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی۔اور جب امی عائشہ کا چبایا ہوا مسواک آپ اپنے دَہن مبارک میں لیتے .... کتنی عظیم بات تھی ۔حضرت علی کرم اللہ وجھہ اور فاطمۃ الزھرۃ کی بے مثال محبت راجو کو نہال کر دیتی۔ ازدواجی زندگی کی کتنی عظیم مثالیں تھیں۔راجو نے اپنے ارگرد عورت کو بحیثیت شریک حیات دیکھا تو وہ اس عورت سے مختلف تھی جو رحمۃ اللعالمین کی عورتیں تھیں۔آپ ازواج مطہرات سے دل لگی کرتے۔ان کی تمام ضروریات کا خیال کرتے۔ان سے مشاورت کرتے۔ان کی دل آزاری کرنے کا خیال سے بھی دور بھاگتے۔راجو نے جوں جوں تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات کی بائیو گرافی کا اسٹڈی کی تو اس کو عمر بن عبدالعزیز اور ان کی اہلیہ کے دکھ اور سکھ کے دن بھی دیکھنے کو ملے۔ابوالکلام آزاد جب تفسیر قرآن لکھتے تو ان کی رفیق حیات ان پر پنکھا جھلتی اور رات بھر اس کی خدمت میں گزارتی۔ عبدالماجد دریا آبادی کی آپ بیتی خاص کر شادی والا باب پڑھ کر راجو کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔راجو چونکہ بیس سال کا ہو چکا تھا۔راجو اپنے ننھیال اور ددھیال میں بہت ہی محبت سے دیکھا جاتا۔راجو نے کبھی بھی کسی کی دل آزاری نہیں کی تھی۔راجو جب تیرہ سال کا تھا تو اس کے پڑوس میں ایک غریب اور مفلوک الحال بوڑھی خاتون رہتی تھی۔سارے محلے کے لڑکے اس کا مزاق اڑاتے جبکہ راجو ہمیشہ اس کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔وہ بوڑی راجو کی دعائیں دیتی کہ '' بیٹا جگ جگ جیو''۔وہ جوانوں اور بوڑھوں کی اعانت اور خدمت اپنا فرض سمجھتا تھا۔

راجو اپنی والدہ اور بہنوں سے ہمیشہ اپنی شادی کا ذکر چھیڑتا۔ راجو جب بھی سالانہ تعطیلات میں چند ایام کے لیے گھر آتا تو وہ اس بحث کو ضرور چھیڑتا۔ اپنی شریک حیات کے حوالے سے راجو کے خیالات سب سے مختلف اور شاید سب سے نرالے تھے۔ راجو کی ماں راجو کو کٹ کر چاہتی تھی لیکن جب بھی راجو کی شادی کے متعلق راجو کی باتیں سنتی تو ششدر رہ جاتی۔ چونکہ وہ ایک دیہاتی خاتون تھی وہ راجو کی کسی بات سے اتفاق نہیں کر سکتی تھی۔ راجو اپنی ماں کے ساتھ گھنٹوں اس موضوع پر بات کرتا، ہزار زاویوں سے اسے سمجھاتا مگر راجو کی باتیں ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ راجو کا باپ اس حوالے سے مکمل ڈکٹیٹر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ راجو کے حوالے سے جو بھی فیصلہ وہ کرے گا وہی حتمی ہوگا۔ راجو اس کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ کسی بڑے سے بڑے نقصان کو مول لینے کے لئے بھی تیار تھا۔ راجو کے باپ کی ایک ہی دلیل تھی کہ ''جب اس کے باپ نے اس کا رشتہ کیا تھا تو اس سے کب پوچھا تھا، تو وہ اپنے بیٹے سے پوچھ کر اس کا رشتہ طے کرے گا''۔ راجو اور اس کی ماں کی مرضی اور ان سے مشاورت راجو کے باپ کے لیے انا اور غیرت کا معاملہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ راجو اور اس کی ماں اس کے کسی بھی جائز اور ناجائز فیصلے پر رضامند نہ ہو کر اس کے اختیارات کو چیلنج کر رہے ہیں۔ راجو کا باپ بدلتے حالات و اطوار سے نابلد تھا یا جان بوجھ کر بے خبر رہنا چاہتا تھا۔ راجو کے باپ کا رشتہ اس کے باپ

نے بیسوی صدی کے وسط میں کیا تھا اور اس میں اس کی قبل از وقت رضامندی حاصل نہیں کی تھی جبکہ راجو اکیسوی صدی کا نوجوان تھا۔ پھر راجو نے گھاٹ گھاٹ کا پانی بھی تو پیا تھا۔ کہاں باپ بیٹے کے خیالات میں موافقت ؟۔ عورت کے حوالے سے راجو کے باپ کا خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ایک دلھن نہیں بلکہ اپنی رعایت اور خدمت و فرمانبرداری اور رشتہ داری کو مضبوط کرنے کے لیے بہو لانا چاہتے تھے سو وہ اپنی من مانی اور پرانی روایت پر قائم تھا۔ اس حوالے سے جب کبھی راجو کی کوئی بہن یا اماں بات کرتی تو وہ آگ بگولہ ہو جاتا۔ انہیں کوستا کہ یہ سب کچھ تم لوگوں کا پڑھایا ہوا سبق ہے ورنہ میرا بیٹا ایسا نہیں۔ راجو کا ایک انکل بڑا بذلہ سنج تھا۔ اس نے ایک دفعہ راجو کے باپ سے کہا تھا کہ راجو کے حوالے سے کیا فیصلہ کیا ہے۔ شاید راجو کے باپ نے ان سے کسی کے بارے میں کہا تو راجو کے انکل نے کہا کہ اگر راجو انکار کرے بلکہ وہ تو انکار ہی کر رہا ہے۔ راجو کے باپ نے برجستہ کہا کہ '' اگر انکار کیا تو میری ناک کٹ جائے گی اور مجھے ایسا بیٹا نہیں چاہیے میں تو اس کو گولی مار دونگا''۔ راجو کے پاس جب یہ الفاظ ہو بہو پہنچے تو راجو ہکا بکا رہ گیا مگر راجو بھی تو اس باپ کا بیٹا تھا جو کسی کی ناک کٹنی نا گن کے لیے اپنے بیٹے کو گولی مارنا چاہتے تھے۔ راجو کے باپ کو شاید اپنے بیٹے سے زیادہ اپنی پسند کی بہو محبوب تھی اور راجو نے جب دیکھا کہ معاملہ اس حد تک جا سکتا ہے تو کئی واسطوں سے اپنے باپ کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی بھی صورت میں اس کا

کوئی بھی فیصلہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھر بار اور علاقہ تک چھوڑ سکتا ہے مگر کوئی ناجائز فیصلہ قبول نہیں کر سکتا۔ راجو کے باپ کے لیے یہ الفاظ ڈرون حملوں سے کم نہیں تھے مگر وہ بھی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایک انچ پیچھے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ کش مکش کا یہ سلسلہ طویل عرصہ چلتا رہا۔

دن گزرتے گئے ،ماہ گزرے گئے اور سال گزرتے گئے ۔اور راجو اپنی اماں اور بہنوں سے کہتا رہتا کہ میرے لیے کوئی دلہنیا ڈھونڈو۔ پھر راجو ان کو بتاتا کہ اس میں یہ یہ صفات ہونی چاہیے۔یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ اس دنیا ییں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ لڑکیاں بہت تھی، اپنوں میں بھی پرائیوں میں بھی۔ راجو کی بہنیں کسی پر متفق ہوتی تو راجو کی اماں فوری فیصلہ سنادیتی کہ اس لڑکی کی دادی میں یہ خامیاں تھی اور اس کی پھوپھی نے یہ کیا تھا وہ کیا تھا، لہٰذا وہ انہیں پسند نہیں۔ بارہا کئی مناسب لڑکیاں راجو کی ماں نے مسترد کردیے۔جب راجو نے خود اپنی ماں سے کہا کہ کوئی لڑکی پسند کرو اور بتاؤ، کیوں کہ راجو کو بھی شادی کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ راجو محبت کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی کو ٹوٹ کر چاہنا چاہتا تھا۔ راجو کی ماں بے سوچے سمجھے ایک ہی بات کہتی کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں جو بہو بنا کر لاؤں۔ راجو اپنی ماں سے کہتا تھا کہ تمہارے بیٹے کے لیے کوئی آسمان سے تو نہیں آئے

گی مگر راجو کی ماں بھی راجو کے باپ کی طرح اس معاملہ میں کوئی سنجیدہ نہیں تھی۔ بہو کے سلسلے میں وہ بھی اپنے بیٹے سے زیادہ اپنا مفاد سوچتی اور راجو باپ اور ماں کے اس رویہ کو دیکھ کر کڑھتا رہتا تھااور اس کی زندگی اجیرن بن جاتی تھی۔راجو اپنے والدین کا بڑا بیٹا تھا وہ کسی بھی صورت اپنے والدین کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔راجو کے والدین نے اپنا پیٹ کاٹ کر اس سے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔راجو کی زندگی کے یہ آیام راجو کے مشکل ترین آیام تھے ۔معاملہ بہت گھمبیر ہوتا جاتا راجو کے لیے

....

راجو کی ایک بہن نے راجو سے کہا کہ جیسی دلہن آپ چاہتے ہو، جو شرائط آپ کے ہیں وہ اگر کسی لڑکی میں پائے جاتے ہیں تو وہ روحی ہیں۔راجو کی شرائط کیا تھی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ جو بھی راجو کی دلہن بنے وہ کسی امیر باپ کی بیٹی نہ ہو۔ لڑکی دیندار اور پڑھی لکھی ہو، ملکہ حسن نہ ہو مگر لنگور بھی نہ ہو۔کم سے کم راجو کے ساتھ شکل و صورت میں میل کھاتی ہو اور اگر رشتہ داری میں ہو تو '' نور علی نور''۔اعلیٰ خاندان کی ہو یا گھٹیا خاندان کی مگر مہذب ہو۔زیادہ گفتگو کی شائق نہ ہو یعنی بے ضرورت ایک لفظ نہ بولے۔ راجو اگرچہ گلگت بلتستان کے کسی پہاڑی گاؤں کا تھا مگر اس کے دوست احباب سارے شہری تھے کیونکہ دیہاتی بچے نے بلوغت اور جوانی کی اکثر بہاریں شہروں میں گزاری تھی۔ وہ دیہاتی ہو کر بھی شہری تھا۔اس کے معاملات شہری تھے۔اس کی

سوچ و فکر، رہن و سہن اور طور واطوار سب شہری تھے۔ وہ دیہاتوں سے ایک ایسی شریک سفر ڈھونڈ رہا تھا جو اس کے ساتھ شہری بن کر زندگی گزارے۔ راجو نے روحی کو بچپن میں دیکھا تھا۔ راجو نے دھڑلے سے کہہ دیا کہ وہ تو چھوٹی سے بچی ہے، نہ رنگ ہے نہ حسن اور نہ کوئی خاص خوبی۔ راجو کی بہن نے کہا کہ جب اب نے دیکھا تھا تب ایسی بات تھی اب ایسا کچھ نہیں ۔ نہ وہ بچی رہی نہ آپ کی دیکھی ہوئی معصوم سی روحی۔ وہ اب ایک جوان رعنا بن چکی ہے۔ اس نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنی عمر سے زیادہ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ ایک دفعہ اس کو دوبارہ دیکھ لیں، آپ حیران ہو جائیں گے کہ وہ آپ کے خوابوں کی مکمل تعبیر بن چکی ہے۔ راجو چونکہ دینی ذہن رکھتا تھا، وہ اپنی ہمشیرہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اتنا بتایا کہ '' جب میں وہاں آ ونگا تو اس کو دیکھ کر ہی فیصلہ کرپاؤنگا ''۔ مگر سچی بات یہ تھی کہ اس دن سے راجو کے دل میں روحی کے لیے جگہ بن گئی تھی۔ راجو کی ہمشیرہ نے جو تفصیلات و عادات روحی کے حوالے سے راجو کی بتلائی تھی وہ یقینا عام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اب راجو بے چین ہونے لگا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ پرندوں کی طرح اُڑے اور روحی کا دیدار کرے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ راجو اور روحی بیں ہزاروں میل کی مسافت تھی۔ بیابان اور صحراء تھے۔ بڑے بڑے دریا اور کالے کالے پہاڑ حائل تھے۔ راجو کے دیگر مشاغل کے ساتھ ایک مشغلہ یہ بھی بن گیا تھا کہ روحی کے بارے میں معلومات جمع کریں۔ وہ مختلف لوگوں سے اس کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں

معلومات لیا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ چلا۔ بالآخر وہ دن بھی آگیا کہ راجو روحی کے دیار میں پہنچ گیا۔ راجو کا روحی کے ہاں جانا معمول کی بات تھی۔ روحی کی ماں نے راجو کی خوب آؤ بھگت کی۔ روحی کے گھر والے بھی راجو کے ساتھ بڑی خوش دلی سے ملتے تھے۔ دونوں میں دور کی رشتہ داری بھی تھی اور پھر راجو جب سالانہ تعطیلات میں گاؤں آتا تو تمام رشتہ داروں کے ہاں ملنے جاتا۔ اس کی یہ عادت بڑی پرانی تھی۔ اس کی وجہ سے خلقت میں راجو نے اپنے لیے بڑا مقام پیدا کیا تھا۔ جب روحی نے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ راجو کو'' اسلام علیکم '' کہا تو راجو '' وعلیکم السلام '' بھی نہ کہہ سکا۔ کیوں؟ روحی کی شکل وصورت اور اس کا اچانک اتنا بڑا ہونا، اور پھر دلفریب لہجے میں سلام کرنا راجو کے لیے کسی سرپرائز سے کم نہ تھا۔ راجو کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی اتنی تبدیلی آسکتی ہے۔ راجو نے جب روحی کو آخری بار دیکھا تھا تو اس وقت روحی کی عمر نو سال تھی اور اب کی بار روحی پندرہ سال کی ایک سندر لڑکی تھی۔ اس نے اپنا سر دوپٹہ سے کس کر باندھا ہوا تھا مگر اس کا وجیہہ چہرہ مکمل کھلا ہوا تھا۔ اور وہ مسلسل مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی۔ وہ آداب محفل سے واقف تھی۔ راجو کے احوال پوچھ رہی تھی۔ راجو کی تعلیمی مراحل اور کارکردگی سے تو وہ پہلے ہی سے آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجو نے کم عمری ہی میں بڑا نام کمایا ہے۔ دور دور تک اس کا شہرہ ہے۔ یہ معمول کی بات ہے کہ دیہاتوں میں لوگ دور دور کے رشتہ داروں کے بارے میں بھی مکمل معلومات

رکھتے ہیں، بالخصوص جو بچے اچھی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور محنت و لگن سے پڑھتے ہیں وہ تو سب کی نظروں میں ہوتے ہیں۔ دیہاتوں میں لڑکوں کا تعلیم حاصل کرنا اور بڑی شہروں میں جانا تو معمول کی بات ہے مگر لڑکیوں کا پڑھنا عجوبے سے کم نہیں۔ کیونکہ دیہاتی لوگ سمجھتے ہیں لڑکیوں کو تعلیم دینے سے بیہودگی پھیلتی ہے۔ عورتیں نافرمان بنتی ہیں۔ بس عورتوں کو آن پڑھ ہی رکھ لو، اسی میں عافیت ہے مگر راجو کے خیالات یکسر الگ تھے۔ اور پھر جب راجو نے روحی کی تعلیم کے بارے پوچھا تو روحی نے مختصراً سب بتا دیا۔

وہ تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی۔ وہ اپنے ادارے کی زینت تھی۔ بڑی زیرک، ذہین، نرم طبیعت اور شگفتہ مزاج کی مالک تھی۔ جماعت کی تمام ہم جھولیاں اس سے محبت کرتیں تھیں۔ یہ سب کچھ راجو کے لیے ایک خوشگوار حیرت سے کم نہ تھا۔ راجو نے روحی کی کتابیں دیکھی، کاپیوں کا جائزہ لیا، اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اب اس کے ذہن میں خیالات کا دریا امنڈ آیا۔ راجو نے فیصلہ کیا کہ بس روحی کو ہی شریک حیات بنا لیا جائے۔ کیوں کہ وہ روحی کو دل دے بیٹھا تھا یا پھر چند لمحات میں روحی نے اس کے دل میں جگہ پکڑی تھی۔ روحی نے اس کے لیے ایک کپ چائے بنالی۔ راجو کوئی نشہ نہیں کرتا مگر چائے کا نشئی ضرور ہے۔ چائے پتلی تھی، راجو نے چائے کے بارے ہدایات جاری کرتے ہوئے چائے دوبارہ بنانے کی فرمائش کی۔ روحی کی ماں نے کہا کہ جب آپ کو چائے

بنانی نہیں آتی تو مجھے ہی کہتی ، یہ کہہ کر وہ اٹھی مگر راجو نے انہیں روک لیا، کہ وہ خود ہی بنائے گی۔ روحی نے بے باکانہ کہہ دیا کہ مجھے کیا پتہ جو بھی کراچی جاتا ہے وہ تیز پتی والا چائے پیتا ہے۔ابھی بنائے دیتی ہوں، کہہ کر کچن کی طرف گئی۔ دیہاتوں میں کیا کچن، بس گھر کے سامنے یا برآمدے کے ساتھ ایک مخصوص جگہ بنائی گئی ہوتی ہے، بخاری نکالا ہوتا ہے یا انگیٹھی لگائی گئی ہوتی ہے۔جب روحی چائے بنا رہی تھی تو راجو اس کے حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا مگر روحی اس سے بے خبر تھی۔ اس کے دل میں تو راجو کے لیے ایک احترام تھا جو عام طور پر عمر رسیدہ لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ پھر راجو اس سے عمر کا کافی بڑا بھی تو تھا۔ پہاڑی لڑکیوں میں شہری لڑکیوں کے نخرے و چونچل بھی کہاں ہوتے ہیں۔ وہ تو شرم وحیا کی پیکر ہوتی ہیں۔ ایسے معاملات میں ان کے دل میں حسین خیالات تک نہیں آتے۔ روحی نے چائے دوبارہ اس کو پیش کی۔اب کی بار چائے مزے دار تھی۔ روحی کی ماں راجو سے احوال پوچھے جا رہی تھی، تمام گھر والوں کے بارے فرداً فرداً پوچھ رہی تھی۔اس طرح پوچھنا دیہاتی روایات ہوتی ہیں۔ وہ ماں کے متصل دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اب راجو کے بہت ہی قریب تھی، اسکے لبوں پر ایک عجیب یاس و حسرت انگیز مسکراہٹ تھی۔ راجو اس یاس انگیز مسکراہٹ کی گہرائی کو نہیں سمجھ سکا۔ ضرور اس کے دل میں کوئی ایسا غم تھا جس نے اس کے خوبصورت چہرے کو ملول بنا رکھا تھا۔روحی نے آہستگی سے اپنے بازو اپنی کمزور سی چھاتی پر باندھ لیے

اور اپنے دونوں پاؤں ہلکے پھیلائے۔اس نے اپنا سر حجاب سے چھپا رکھا تھا مگر راجو اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ اس کے نرم و خوبصورت ہاتھوں کو، اس کے رخساروں کو، اور اس کے کمزور سے نازک ٹخنوں کو۔راجو مسلسل ٹکٹکی باندھ کر روحی کو مبہم، خمار آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کیوں؟ کیوں کہ راجو کی آنکھیں شاید کھل کر دل کا راز روحی سے کہہ دینا چاہتی تھیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ کیوں؟ کیونکہ روحی نے اپنی نظریں زمین پر گاڑھی ہوئی تھی۔ وہ شرم اور حیا کے باعث نگاہیں نیچے کیے ہوئی تھی۔ روحی کی یہ ادا بھی راجو کے دل کو بھا گئی۔

یکایک روحی کا بازو تھوڑا اُوپر اُٹھ گیا۔

ہلکی سی جنبش ہوئی۔

چوڑیوں کی جھنکار پیدا ہوئی۔

تب راجو نے روحی کی طرف دیکھا۔

روحی کانپ کر رہ گئی، یہ لاشعوری میں ہوا تھا۔

اب وہ نظریں نیچے کیے اپنی چوڑیاں بازوں میں چھپا رہی تھی اور ساتھ ساتھ دوپٹے اور بازو بھی ٹھیک کر رہی تھی۔ پھر روحی سنبھل کر بیٹھ گئی۔راجو کے دل میں ایک عجیب احساس پیدا ہوا۔ وہ متجسس نگاہوں سے اس کو دیکھ رہا تھا مگر اب اس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا۔ کسی بھی قسم کے جذبات و تاثرات سے

عاری۔ اور راجو کے دل و دماغ میں ایک اضطراری کیفیت طاری ہو چکی تھی اور وہ خود اس اضطراری کیفیت کی المناک گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر تھا۔

کبھی کبھار روحی بھی کسی کے متعلق پوچھتی۔ روحی کا آواز کتنا خوبصورت تھا! وہ سریلی سی آواز میں آہستہ سے کچھ پوچھ لیتی۔

روحی کی آواز نے راجو کے کانوں یں رس گھول دیا۔ اس کی پُر سوز آواز نے راجو کے جذبات میں ایک ہیجان اور طلاطم پیدا کیا تھا۔

راجو کا دل عجب لذت کے مزے لے رہا تھا۔ اس کی ہر بات سے راجو کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آب حیات میں ڈھل رہا ہے۔

روحی کی باتیں نہیں تھی بلکہ حسین نغمے تھے، بلبل کے نغموں سے بھی حسین! ان نغموں نے راجو کے دل میں روحی کی محبت پیدا کر دی تھی۔

روحی کہہ رہی تھی اور راجو فقط سن رہا تھا۔ وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔

روحی جیسا خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ راجو نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ

تو گلگت کے حسن صبیح کا ایک حسین نمونہ تھی۔
اس کے خدوخال بڑے دلکش تھے، دلکش نہیں بھی تھے تو راجو کو پسند ضرور تھے۔
راجو کے دل میں کیا طلاطم پیدا ہو رہا تھا اس سے روحی مکمل بے خبر تھی۔ اتنی جلدی اس سے خبر بھی کیسے ہوتی۔
یہ یکطرفہ محبت اور سپردگی کی ایک حسین مثال تھی۔
راجو ان سے اجازت لے کر رخصت ہوا۔ اب راجو کے خیالات کا محور ہی روحی تھی۔ اس نے روحی کے متعلق تمام کوائف جمع کیے۔ راجو اپنی منزل بہت قریب دیکھتا تھا۔ اس نے دھیمے انداز میں اپنے والدین کی رائے جاننے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں گی۔ راجو جس سے بھی مشورہ کے انداز میں پوچھ لیتا تو اس کو روحی اور اس کی فیملی کے متعلق عجیب و غریب باتیں سننے کو ملتے۔ ایک طویل عرصہ تک راجو مختلف لوگوں سے پوچھتا رہا مگر کوئی ایک آدمی نہیں تھا جو روحی اور اس کے گھر والوں کے متعلق کوئی اچھا جملہ کہہ دیتا۔ کیوں؟ ایک ہی وجہ تھی۔
ذات پات کا فرق۔

ہر ایک کو یہ تسلیم تھا کہ روحی ایک اچھی لڑکی ہے۔

سندر ہے۔

کم عمری میں اچھی تعلیم پائی ہے۔

مشرقی روایات کی امین ہے۔

گھر سے باہر کم ہی نکلتی ہے۔

سگھڑ ہے۔

دینی ذوق و شوق رکھتی ہے۔

مگر...................

اس مگر کے بعد جب روحی اور اس کی فیملی کے متعلق جو کچھ سنتا تھا اس کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔

لوگوں کے عجب خیالات و باتیں تھیں۔ ارے! وہ تو کوئی خاندانی لوگ تھوڑی ہیں۔

اپنے آپ کو کیوں بے عزت کرانا چاہتے ہو۔

دنیا کی لڑکیاں پڑی ہیں کوئی خاندانی لڑکی کی بات کرو یار راجو۔

خاندانی آدمی کو خاندانی عورت کے ساتھ شادی کرنی چاہیے۔آخر تمہارا ایک سٹیٹس ہے جی! باپ دادے کا نام کیوں رسوا کرنا چاہتے ہو؟۔

اس قسم کے سوالات نے راجو کا جینا حرام کر دیا تھا مگر وہ کہاں کسی کی سننے والا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے دو ٹوک کہہ دیا تھا کہ روحی کے متعلق سوچا جائے۔

راجو کی ماں نے جب روحی کو دیکھا تو اس کا دل مطمئن ہوا،اطمینانِ دل میں راجو کا خیال تھا۔ ورنہ راجو کی ماں بھی ایک روایتی عورت تھی ، وہ کب ....روحی کو تسلیم کرتی..... کیوں؟اس کیوں کے پیچھے کافی سارے سوالات تھے۔

یہ خاندان اور بے خاندان اور ذات پات کا چکر راجو کے سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا کیا ہم ہندو ہیں جو ذات پات اور اعلیٰ ادنی کی بات کرتے ہیں۔اگر نہیں تو پھر ہم نے یہ کہاں سے سیکھا ہے۔

کیا دین محمدی کی یہی تعلیمات ہیں؟نہیں تو....پھر یہ کیا چکر ہے کہ بذعم خویش دیندار اور شریف لوگ ذات پات کو اتنا مسئلہ کیوں بناتے ہیں۔

کیا یہ دین سے دوری نہیں، یہ تو جہالت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

جدید جہالت.........۔

یہ شین یشکن کا قضیہ کیا ہے؟۔

ڈوم کمین کوئی اور مخلوق ہیں کیا؟۔

پھر سید اور غیر سید کا جھنجھٹ...۔

مالکانہ اور غیر مالکانہ کا تصور......۔

اعلیٰ خاندان اور گھٹیا خاندان کے بکھیڑے......۔

غریب اور امیر کا جھگڑا.....چہ معنی دارد......۔

اپنے اور غیر کا جاہلانہ خیال اور روایتی باتیں.......۔

کیا شین اور یشکن نے اپنے لیے کوئی مخصوص سند اللہ سے لے کر آئے ہیں ؟۔ یا انہیں کوئی اعزازی پروانہ ملا ہے ؟۔ نہیں تو پھر یہ نام نہاد تفریق اور ذلالت پر مبنی بکاؤ خیالات کیوں......؟۔

! اُف !!! یا خالقِ ارض وسماء

ان باتوں نے راجو کو بے کل و بے دل کر دیا تھا مگر کیا وہ ان بکھیڑوں میں الجھنا چاہتا تھا۔ ہر گز نہیں۔

راجو نے اپنے احباب اور دوستوں کو بتانا شروع کر دیا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا جو اس کے ہر کام میں معاونت کرے گی..............۔

ہر کام میں معاونت.............۔

کیسی معاونت............؟۔

راجو کا ایک لنگوٹیا یار تھا۔ وہ بڑا ادبی ذوق رکھتا تھا۔ پڑھت لکھت اس کا مشغلہ تھا۔

ایک دن راجو سے کہنے لگا..........۔

یار راجو ! ایک بات سمجھ ہی نہیں آ رہی ہے۔ ایک تو تمہیں شادی کا فوبیا ہو چکا ہے۔

دوسرا آپ شادی بھی گاؤں سے کریں گے۔

پھر تمہارے خیالات میں جو '' بیوی '' سما گئی ہے وہ حسین بھی ہو گی شریف بھی۔

پڑھی لکھی بھی ہوگی اور پھر آپ کے امور میں معاونت بھی کرے گی؟۔
یار کیا وہ بھی کالم لکھے گی یا پھر آپ کے کالم کمپوز کرے گی۔
ان کی پروف ریڈنگ کرے گی۔
فیس بک میں چیٹنگ کرے گی اور انٹرنیٹ سے کالم ڈاؤن لوڈ کرے گی۔
آپ کی طرح اخبارات اور کتابوں کی رسیا ہوگی۔
کیا وہ بھی سعادت حسن منٹو کے فحش افسانے پڑھے گی اور شیخ زکریا کی مقدس آپ بیتی بھی۔
شورش کاشمیری کی '' اس بازار میں '' بھی پڑھے گی اور شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی بھی۔
رات تین بجے تک آپ کے ساتھ جاگے گی۔
آپ کی تحریروں پر تبصرہ کرے گی۔
آپ کے خیالات سے اختلاف کرے گی۔
عربی اناشید بھی سنے گی اور شینا کلام بھی......۔
کہیں وہ بھی تو بانو قدسیہ کی طرح ''راجہ گلگت '' تو نہیں لکھے گی؟۔
یا پھر کوئی اور معاونت.........................؟؟۔
راجو جوش میں بانہیں کھولتا۔ قہقہہ لگاتا اور کہتا ہاں ہاں یہی سب کچھ کرے گی۔ پھر وہ کہتا، ایک تو آپ اپنے والدین کا رونا روتے ہو، پھر آپ کے ہاں لڑکیوں کی تعلیم پر بھی قدغن ہے اور پھر یہ سب کچھ...............۔

مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا۔
کہی کسی شہری لڑکی کو تو نہیں پٹایا ہے ؟۔
یہ سب کچھ تو ایک شہری لڑکی کر سکتی ہے جس نے کسی بڑے تعلیمی ادارے میں تعلیم پائی ہو۔
راجو کہتا۔ یار بات یہ نہیں۔
بس اللہ نے ایسا انتظام کر لیا ہے شاید اللہ دلوں کے ارمان پورے کرنا چاہتا ہے۔ بھائی اللہ کی چاہت کا کیا کہنا.........۔
اب راتوں کو جب پڑھت لکھت سے فارغ ہو کر راجو بستر پر لیٹتا تو روحی ایک دم سے سامنے آ جاتی۔ راجو اس سے ہزاروں راز و نیاز کی باتیں کرتا، تعلیم کے متعلق پوچھتا، زیادہ محنت و لگن سے پڑھنے کی تلقین کرتا۔اپنے خیالات اور منصوبوں سے اس سے باخبر رکھتا، شادی کا دلربا ذکر چھیڑتا، شادی کے بعد ہنی مون کی کہانی تو راجو کی دلچسپ کہانی ہوتی۔ راجو ہنی مون کے موقع پر پورے ملک گھومنا پھرنا چاہتا تھا۔گھوم پھر کر ایک کتاب بھی لکھنا چاہتا تھا۔اس نے تمام اہم مقامات سیلکٹ کر رکھے تھے۔ دیہاتوں اور شہروں میں جہاں جہاں جانا تھا اپنے دوستوں کو اطلاع کر رکھا تھا کہ شادی کے بعد آپ کے پاس اتنا وقت ٹھہریں گے۔یہی خیالات راجو کے لیے دلچسپی کے باعث ہوتی۔ بظاہر اس کی آنکھیں بند ہوتی، مگر وہ جاگا ہوتا، وہ خیالات کی بے اب وگیاہ وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہوتا اور ادھر مسجد سے مؤذن '''اللہ اکبر'' کی صدا دیتا اور آخر میں

کہتا کہ ''الصلوۃ خیر من النوم'' تو راجو طوعاً و کرھاً اٹھتا، وضو بناتا اور نماز فجر کی ادائیگی میں لگ جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ رات بھر ایک منٹ نہیں سو سکا ہے۔ راجو فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ نیند زیادہ قیمتی ہے یا وہ حسین خیالات۔

راجو نے تخیلاتی طور پر تیاریاں مکمل کی تھی۔ وہ تو اس بہار میں روحی کا رشتہ مانگنے جا رہا تھا۔ اپنے والدین کو راضی کرنا تھا۔ وہ اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھا۔ راجو جب گاؤں آیا تو روحی کے گھر خصوصی ملنے گیا تھا، اس کی ماں نے پھر سے اس کی خوب خاطر مدارت کی تھی۔ اس کی نظریں روحی کو دیکھ رہی تھی مگر وہ نہیں تھی۔ راجو نے جاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ تو اپنی بہنوں اور سہلیوں کے ساتھ کھیتوں میں مکئی کاٹ رہی ہے۔

مکئی۔۔۔۔

ہری بھری مکئی، سنہری رنگت کے بھوٹے۔

راجو اس کی ماں کے ساتھ مکئی کے کھیتوں میں پہنچا، جہاں روحی اور اس کی سہلیاں گیت گاتے کام کاج میں مصروف تھیں۔

پریمی گیت۔

محبت بھرے نغمے۔

..............جادوائی راگ

وہ دیر تک مکئی کے کھیتوں میں ان کے ساتھ بیٹھا رہا۔

وہ تھوڑی دیر بعد جانے کا کہتا مگر اسکی ماں اصرار کر رہی تھی کہ آج ان کے پاس ہی ٹھہرے۔

شام کے دھندلکوں میں راجو کو مکئی کے بھٹوں سے محظوظ کیا گیا۔

روحی مکئی کا سنہرا، سینکا ہوا بھٹا جب راجو کی طرف بڑھاتی تو اس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے سارا صحن زردِ زعفران بن جاتا۔

راجو مکئی کے بھٹوں کی تعریف کیے جا رہا تھا۔

ان کا ذائقہ بے حد لذیذ اور شریں تھا۔

یہ وہ بھٹے تھے جن کے بیج روحی نے بوئے تھے، نلائی کی تھی، پانی دی تھی، پھر یہ پودے بڑے ہو گئے تھے۔

اب وہ خود آگ میں سینک کر اس سے کھلا رہی تھی......۔

روحی کے ہاتھ سے آڑوو، خوبانی، ہرمت، آلوچے اور انجیر.......... کھانا کا الگ ہی مزہ تھا۔

وہ بھی تو پورے خلوص کے ساتھ کھلا رہی تھی نا.............۔

موسم بہار بیں جب اپنے آنگن میں لگے خوبانیوں کے پیڑ سے اس نے ہلکا سا سنہرا رنگ لگا ہوا خوبانیاں راجو کی کھلائی تھی اور اپنے نازک ہاتھوں اور کبھی دانتوں سے گٹھلیاں توڑ توڑ کر اس سے کھلائی تھی تو......... ۔

خوبانیاں اپنی رنگت کے ساتھ ذائقے میں بھی لذید تھیں۔

دَہن میں گھل جاتی تو خالص شہد اور گلاب جامن کا مزہ دیتی۔

اس کے آنگن میں خوبانیوں کے کئی پیڑ تھے۔
ہر پیڑ کی خوبانیوں کا ذائقہ مختلف۔
پھر گٹھلیوں کے اندر نرم اور کچے بیج اپنے ذائقے میں غذر اور ہنزہ کے کاغذی باداموں کو بھی مات کر دیتے تھے۔
روحی کی طرح اس کے آنگن کی سرخ سرخ اور سنہری خوبانیاں بھی اپنی رنگت اور خوبصورتی میں ہنزہ کی دوشیزاؤں اور غذر کی کنواریوں کی طرح صبیح تھیں۔
یہ خوبانیاں داریل کی حیادار باکروں کی طرح گونگھٹ کے آوٹ سے جھانکتی نظر آتی تھیں۔
روحی بھی تو اس کا جُھوٹا کھا کر شاداں وفرحاں ہو جاتی۔ اور فخریہ کہتی کی میں کسی کا جُھوٹا نہیں کھاتی مگر....... وہ جب گائے کا دودھ نکال رہی تھی تو بے حد حسین لگتی۔ چھوٹے چھوٹے نرم و ملائم ہاتھ جب گائے کے تھنوں کو چھو لیتے تو راجو کے لیے یہ منظر بڑا دلکش ہوتا۔ وہی دودھ تو گلاس بھر کر اس نے راجو کو پلایا تھا۔ جب وہ بکری کا دودھ نکال رہی تھی تو راجو نے کہا کہ میں نکالتا ہوں تو اس نے طنزیہ کہا تھا کہ تم سے نکلنے والا نہیں۔ تمہارے ہاتھ تو چار کلو چاول کا تھیلہ اٹھا کر بازار سے گھر لانے تک پھول جاتے ہیں تو کہاں بکری سے دودھ نکالنے والے...... مرد کے ہاتھوں میں اتنی ملائمیت بھی ٹھیک نہیں، آہنی ہاتھ ہونے چاہیے۔ یہ کہہ کر وہ اپنی روایتی مسکراہٹ لیے راجو کے تاثرات جاننا چاہتی تھی مگر....... وہ ہنس کر ٹال دیا۔

روحی اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھی ۔اس نے روحی کی تمام کتابوں کو دیکھا تھا۔
اس کی کاپیاں بھی غور سے دیکھا تھا۔
اور اپنا آٹوگراف بھی ثبت کردیا تھا۔
...- -آٹوگراف کے الفاظ تو روحی کو بڑا عرصہ بعد بھی زبانی یاد تھے-- ....

وہ بڑا خوش تھا۔ لیکن اچانک ایک بات نے راجو کو بے کل کردیا۔ روحی کی ماں نے باتوں باتوں میں کہہ دیا کی روحی کی نسبت فلاں کے ساتھ کردی گئی ہے۔ میں راضی نہیں ہوں نہ ہی روحی ۔ بس اس کے باپ اور برادری کا کارنامہ ہے۔ ان کی انا ہے۔ یہ باتیں اس کے دل پر پہاڑ بن کر گر رہی تھی۔ خون آشام پہاڑ، ناناگا پربت سے بھی زیادہ خون آشام۔

راجو کو اپنا تاج محل گرتا دکھائی دے رہا تھا جہاں اس نے روحی کو رکھنا تھا۔
وہ محبت کی نشانی۔ کیا محبت میں ناکامی لازمی ہے۔
محبت کو زوال ہے، محبت میں نہ ملنا ہی کامیابی ہے............... اس کے دل میں ہزاروں خیالات آئے۔

راجو نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ مزید جاننا چاہتا تھا۔ اس نے غور سے روحی کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں اس کی مرضی شامل ہے کہ نہیں۔ راجو کو روحی کی جس چیز نے بے قرار رکھا تھا وہ اس کی ظاہری شکل و

صورت سے زیادہ اس کا حزن و ملال تھا جس سے راجو نے بھانپ لیا تھا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ دیہاتوں میں کسی کی نسبت کسی کے ساتھ کی جائے یا کسی کا رشتہ مانگا جائے اور وہاں کوئی ٹانگ اڑائے تو نوبت لڑائی جھگڑا اور قتل و غارت تک پہنچتی ہے۔ نسبتیں طے کرنے میں لڑکیوں کی مرضی کہاں شامل ہوتی ہے۔ حور کو لنگور کے ساتھ باندھنا دیہاتوں میں معمول کی بات ہوتی ہے۔ اگر کوئی انکاری ہو جائے تو والدین اپنی انا اور غیرت کا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ انہیں اپنی اولاد کا مستقبل سے زیادہ اپنی نام نہاد غیرت عزیز ہوتی ہے۔ وہ برادری میں ناک کے کٹ جانے کے خوف سے غلط سے غلط فیصلہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ابھی تک تو باقاعدہ رشتہ طے نہیں ہوا تھا، بس زبانی کلامی باتیں تھیں۔ راجو یہ سب سن کر اور دیکھ کر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا مگر وہ تو بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ تب اس کو قرآن کی آیت فصبر جمیل یاد آ رہی تھی۔

جب روحی تعلیم کے بالکل آخری مراحل میں تھی تو لنگور کے ساتھ باقاعدہ اس کی نسبت طے ہوئی۔ اس نے رو دھو کر اپنا برا حال کر دیا۔ سر پر مٹی ڈال دی مگر اس کی کون سنتا۔ اس نے ہر حربہ استعمال کی مگر............ کچھ نہ بن پڑا۔ روحی کی نسبت تو اس کی مرضی کے خلاف طے ہو گئی تھی مگر کیا یہ رشتہ جڑ سکے گا۔ کیا نکاح ہوگا۔ جب تک روحی نکاح کی اجازت نہیں دیتی دین محمدی میں تو نکاح نہیں ہو سکتا۔ نکاح جیسے مقدس رشتے کو لوگ اپنی خواہشات کا بھینٹ کیوں چڑھاتے ہیں۔ یہ تو قبل از وقت ہوگا.......۔انجام کیا ہوگا۔ اللہ سے خیر کی

دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ سب کچھ تو اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تقدیر کا لکھا ہوا کون روک سکتا ہے مگر دعاؤں سے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ اس کو تو ''کن فیکون'' کی دیر ہے۔

راجو نے بڑی رنگیلی طبیعت پائی تھی۔ راجو کے دوستوں میں کون تھا جو اس کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا۔ وہ تو اپنی واہیات اور لغویات سے اپنے استادوں تک کو بھی کھلکھلانے پر مجبور کرتا۔ وہ جب دوستوں کی محفل میں فحش لطیفے سنانے لگتا، کسی پر پھبتی کَستا، کسی کا تمسخر اُڑاتا تو محفل زردِ زعفران بن جاتی۔ لوگ اپنے مسائل بھول کر اس کے ساتھ ہنسی مزاق میں کھو جاتے۔ راجو کے وہ خشک اور تبلیغی دوست جو معمولی سی باتوں پر بھی '' استغفر اللہ اور لاحول ولا قوۃ'' پڑھتے تھے، پڑھنا بھول جاتے۔

خواتین اور شادی'' اس کا محبوب موضوع تھا مگر..... جب اس نے روحی کی قسمت'' کا مظلومانہ فیصلہ سنا تو اس کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کی سماعتیں اس کے ساتھ دینے سے قاصر تھیں۔

وہ دلبراشتہ ہو کر وہاں سے نکلا تھا۔

اب اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ نہ ہی کوئی سمت تھی۔

وہ بے نَج بے آب وگیا وادیوں میں گھوم رہا تھا۔

اس کی رنگینیاں اور شوخیاں ماند پڑھ گئی تھی۔

وہ بظاہر شادی کا خواہش مند ضرور تھا مگر کوئی اس کو نہیں بھاتی۔

اس نے لڑکی کا چناؤ اپنے والدین پر چھوڑا تھا۔ اس پر کیا بیت رہی تھا اس سے کوئی آشنا نہ تھا یہاں تک کہ روحی بھی۔

زمین اس پر تنگ ہو رہی تھی۔

آسمان نالاں۔۔۔۔

اس کے دل میں ایک ارمان تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح روحی کو پتہ چل جائے کہ ''میں انہیں کٹ کر چاہتا ہوں، محبت کرتا ہوں، اس سے لاشعوری میں دل دے بیٹھا ہوں''۔ یہ ارمان لیے وہ ایک طویل عرصہ گھومتا رہا۔ وہ بلاواسطہ روحی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی محبت کے ساتھ اس کا رعب بھی تھا۔ اس سے خوف تھا کہ کہیں روحی کا ردعمل الٹا نہ ہو۔ وہ کسی کے ذریعے ان تک پیغام پہنچانا چاہتا تھا مگر طویل سوچ بچار کے بعد بھی وہ ایسا نہ کر سکا۔ کیوں؟ اس لیے کہ دیہاتوں میں ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی ہیں اور مضر ہوتی ہیں۔

یہ نیک جذبے اور انمول رشتے دیہاتیوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

لوگ بات سے بتنگڑ بنانے میں دیر نہیں کرتے۔

اس نے کئی لوگ سیلکٹ کیے کہ ان کے ذریعے روحی تک اصل بات پہنچائے مگر ناکامی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کو یقین تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسکو معلوم ہو جائے گا۔ بالآخر ایک طویل مدت کے بعد ایک ایسا موقع ہاتھ آیا کہ راجو نے ڈرتے ڈرتے روحی سے ایک مختصر سا جملہ کہہ دیا۔

تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو''۔ ''

روحی کے رسپونس نے اس کو مبہوت کر دیا تھا۔

اس نے کہا کہ

کب سے'' ۔ ''

پھر کیا تھا کہ دردِ دل سارا اس کے سامنے انڈیل دیا۔

روحی سنتی گئی ،راجو سناتا گیا۔

داستان محبت ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

راتوں کے رات بیت گئے۔

روحی کا کوئی خاص رسپونس نہ تھا۔ وہ سنتی جاتی تھی اور کبھی کبھار کچھ سوالات بھی کرتی۔

راجو اس کے قریب ہونا چاہتا تھا مگر وہ تو سانپ کی طرح پھن نکال لیتی۔ وہ ایک دم نرم ہو جاتی اور پھر سخت کہ ! اُف اللہ۔

اس نے اپنی محبت کو ہزار زاویوں سے سمجھانا چاہا۔

اس کی منتیں کی۔

اس کے پیر پکڑے۔

اس کے سامنے ہاتھ جوڑے مگر وہ خاموش تھی۔

خاموشی کا بت ٹوٹا نہیں تھا۔

اس نے اس کے ہاتھ چومے۔

دنیا جہاں کی قسمیں کھائی، اپنا حال دل سنایا۔

............مگر

راجو کو کچھ سمجھ نہیں آیا تو اس نے اس کے پاؤں دبوچ لیے اور قسم کھایا کہ اب میں آپ کے پاؤں چوم کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ سے دور ہو جاؤنگا۔ روحی اس کو روک رہی تھی مگر اس نے کہاں رکنا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا پاؤں پکڑا۔ وہ چھڑانا چاہتی تھی مگر اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔

اس نے ایک لمبا سا سانس لیا اور ایک سرد آہ بھری......۔

وہ غصے سے لبریز تھا۔

اس کی انکھوں سے دو آنسو ٹپکے۔ یعنی اس کا غصہ سیل رواں کی طرح بہہ گیا۔

روہانسی آواز میں اس نے روحی سے کچھ کہا اور پھر دیوانہ وار اس کے پاؤں چومے۔

...........میلے کچیلے پاؤں

کیوں؟ وہ اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک چومنے کے بعد وہ یہ کہہ اٹھا کہ خدا تجھے بھی میری طرح بیقرار کر دے اگر تو مجھے رسوا کرنا چاہتی ہے تو تیرا حال بھی میرا جیسا ہو۔ یعنی خدا تجھے بھی کسی طوفان سے آشنا کر دے۔

وہ بلبلا اٹھی۔

وہ راجو کی منتیں کرنے لگی کہ خدا کے لیے بد دعائی نہ دے دیں۔

یہ بددعائی تھی یا دعا مگر راجو سب کچھ لگی لپٹائی بغیر کہہ کر وہاں سے چل دیا۔
وہ ایک آسودہ جگہ پر لیٹا اور پھوٹ پھوٹ کر معصوم بچوں کی طرح رونے لگا۔
جب رو کر دل کا بھڑاس نکالا تو آنکھیں موندلیں ۔
پھر سے روحی کے خیالات میں کھو گیا۔
اب روحی اپنے حنائی ہاتھوں سے اس کے گال تھپکار رہی تھی۔
..........نرم گرم گال
اس کے بالوں پر اپنے حنائی ہاتھوں سے کنگھی کر رہی تھی ۔
اسے منانے کی کوشش کر رہی تھی ۔
یکایک اس نے آنکھیں کھول دی تو وہاں کوئی نہیں تھا بس روحی کا ہیولا اور تصور کے سوا۔
اب وہ مطمئن بھی تھا بے قرار بھی۔
راجو اس کا رویہ دیکھ کر حددرجہ مایوس ہوا تھا۔اب ان دونوں کے راستے کافی دور ہوچکے تھے۔ مگر دنیا میں کچھ راستے دور ہو کر بھی قریب ہوجاتے ہیں یعنی ایک لمبا موڑ کاٹ کر پھر مل جاتے ہیں کسی چوراہے میں۔ راجو تمام کشتیاں جلا چکا تھا۔ راستے کے سارے نشانات مٹا چکا تھا۔ یاد ماضی اس کے لئے عذاب سے کم نہ تھا...... مگر اب آگ تو روحی کے دل میں لگی تھی نہ بجھنے والی آگ۔اور ایسی آگ جس کی تشبیہ دنیا کی آگ سے دنیا ممکن نہیں۔جس نے اس کو جلا کر راکھ

کر دیا تھا۔ اس کی نیندیں حرام ہو چکی تھی۔ وہ کئی راتیں سو نہیں سکی تھی۔ زندگی میں کوئی پہلی بار ملا تھا جو اس کو خلوص دل سے چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار اس سے رابطہ کرنے کوشش کی مگر راجو نے انتہائی سخت لہجے میں بات کی۔

وہ اس کو لتھاڑنے لگا۔

اس کو فراڈی اور مغرور کہہ کر پکارتا مگر اس نے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

وہ راجو کو کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس کی کڑوی کسیلی باتوں کا برا نہیں مناتی۔

بالآخر راجو کا دل پسیج گیا۔..............

وہ دونوں تخیل کی دنیا میں ہزاروں باتیں کرنے لگے۔

کون سی بات تھی جو انہوں نے بذریعہ تخیل نہیں کی۔

اپنے سارے درد، دکھ اور جذبات سناڈالے۔

وہ دونوں دھاڑے مار مار کر رونا چاہتے تھے مگر نہیں روتے۔

روحی نے ایک بار، جی صرف ایک بار اس سے کہا تھا کہ

'' I LOVE YOU''۔

راجو نے بارہا کوشش کی کہ وہ دوبارہ کہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ پہلی بار جو کہا ہے وہ دل سے کہا ہے۔ دوسری بار یا بار بار کہنے سے اس کی لذت، مٹھاس اور شرینی ختم ہو جائے گی۔ یہ کہنا آسان ہے مگر نبھانا مشکل۔ روحی اور راجو تخیل کی دنیا میں روزانہ ڈھیر ساری باتیں کرتے۔ ایک دوسروں کو

چومتے، محبت کی قسمیں کھاتے۔ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ان دونوں کے رابطے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی تخیل۔سب سوجاتے تو وہ تخیل کے ساتھ جاگ جاتے۔ جس دن تخیل کا رشتہ ٹوٹ گیااس دن راجو اور روحی کے لیے قیامت کا دن تھا۔

ایک دفعہ راجو نے اس سے کہا تھا کہ

'' ایکkiss کروں؟ ''

روحی نے اثبات میں جواب دیا''۔

اس نے پوچھا کہ کہاں؟

روحی نے کہا کہ

آپ کو کون منع کرسکتا ہے یا روک سکتا ہے، جہاں کرنا ہے کرو، آپ کی مرضی '' ہے''۔

میں سرتا پا آپ کی ہوں''۔''

کردی گئی۔راجو نے حقیقت کیkiss پھر کیا تھا کہ تخیل کے ذریعے ایک عظیم محبت بھری دنیا میں اس کے پاؤں میں چومے تھے اور اب وہ بھی تخیل کی دنیا میں اس کے پاؤں چومنا چاہتی تھی مگر راجو مان کر دینے کو تیار نہیں تھا مگر اس نے بذریعہ تخیل اس کے پاؤں میں ایک جاندار کِس کی۔

ایک دن راجو نے روحی سے پوچھا کہ مجھے ایسا کوئی نام بتاؤ کہ آئندہ میں اس نام سے آپ کو پکاروں۔ تو روحی نے فوراً'' روحی'' بتادیا۔راجو نے کہا کہ کیا مطلب؟ روحی نے کہا کہ تم جب بھی مجھے پکاروگے تو اس کا مطلب یہ ہوگا

کہ '' اے میری جان،اے میری روح'' ۔جو راجو کو بہت پسند آیا۔جب اپنے لیے نام تجویز کرنے کو کہا تو پکار اٹھی'' راجو'' یعنی تو ہی میرا راجہ ہے۔ میرا راجہ کوئی نہیں بن سکتا۔تُو وہ راجہ ہے جو میرے دل پر حکومت کر رہا ہے۔اگر میرے جسم پر کسی کی حکومت ہو بھی گئ تو، میرے دل و دماغ، میرے خیال و سوچ اور میرے تصور و تخیل کے راجہ تم ہی ہو۔تم تو واقعی اس راجو سے بے حد حسین ہو جو جانور فلم میں ہے''۔

ویسے حقیقت یہ تھی کہ روحی نہ اتنی خوبصورت تھی نہ ہی بدصورت، عام لڑکیوں کی طرح ایک کمزور پتلی کمر اور نازک بدن والی لڑکی تھی۔ رنگت سانولی، بے حد شرمیلی،نہ چنچل،نہ دل لبھانے والی کوئی ادا، ایک خاموش طبع لڑکی تھی، مگر راجو کے لیے تو ملکہ حسن تھی، دنیاوی حور تھی۔ لیلیٰ کون سی خوبصورت تھی۔ وہ تو لیلیٰ ہی تھی یعنی کالی کلوٹی مگر مجنون کی محبوبہ۔تب تو ناز سے حاکم وقت سے لیلیٰ نے کہا تھا کہ مجھے اپنی آنکھ سے نہیں مجنون کی آنکھ سے دیکھو تو میری حقیقت کھل جائے گی۔روحی جیسا خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ راجو نے آج تک نہیں دیکھا تھا اگر دیکھا بھی تھا تو اس کو کب پسند آیا تھا۔وہ تو اس کے لیے گلگت کے حسن صبیح کا ایک حسین نمونہ تھی،فیری میڈو اور دیوسائی میں بسنے والی حسین پریوں سے بھی زیادہ حسین تھی بلکہ یہ پریاں تو اس کی پرچھائیوں تک بھی نہیں پہونچتی تھی،وہ سراپا پری پیکر تھی۔

وہ دونوں دیر تک تخیل میں باتیں کرتے رہتے۔ روحی ہلکی آواز میں بات کرتی تو

راجو کو سخت غصہ آ جاتا۔ وہ اسے جھڑکتا، آواز نکالنے کا کہتا۔ایک دفعہ راجو نے اصرار کیا کہ تمہیں میری کونسی عادتیں اچھی نہیں لگتی؟۔ روحی نے منع کیا۔ وہ نہیں بتانا چاہتی تھی مگر اس کا اصرار بڑھتا رہا تو اس نے کہا تھا'' سب ٹھیک ہے مگر تم باتوں باتوں میں گالیاں بہت نکالتے ہو۔اس سے مجھے کوئی تکلیف اور شکایت نہیں مگر آپ کا اول فول بکنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔اس سے آپ کی شخصیت بھی تو متاثر ہو رہی ہے''۔ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا کہ

آپ اپنی بنی بنائی شخصیت کو کیوں مجروح کرنا چاہتے ہو؟

روحی کے کچھ الفاظ ، کچھ جملے بھی تو راجو کو اچھے نہیں لگتے۔جب وہ کچھ پوچھتا یا روحی کو کرنے کا کہتا تو وہ آہستہ سے کہتی کہ

''چُھکم''

یعنی ''دیکھ لونگی'' تو راجو غضب ناک ہو جاتا۔ کہتا ہاں یا ناں میں جواب دو۔

یہ ''چُھکم چُھکم'' کیا ہے۔

اور جب روحی باتوں باتوں میں

''نَھے یا''

کہتی یعنی ''جی نہیں'' تو راجو جھوم جاتا۔

اس'' نَھے یا'' میں کتنی لذت تھی راجو ہی محسوس کر سکتا تھا۔

روحی کے دو اور لفظوں نے بھی تو راجو کو پاگل بنا رکھا تھا کہ

''آواہ را''، ''مُتی را''

یعنی ''جی ہاں بولیں''، '''اور بولیں''۔

تخیل ان دونوں کا واحد آلہ تھا،جب وہ میسر نہیں آتا تو دونوں تڑپ اُٹھتے۔شاید تخیل سے مقدس ان کے لئے بے ثبات دنیا میں کوئی چیز نہ تھی۔

راجو کو روحی کی جس چیز نے کبیدہ خاطر بنا رکھا تھا وہ اس کی ظاہری شکل و........ صوت سے زیادہ اس کا حزن وملال اور دکھ درد تھا جس سے راجو پہلی فرصت میں بھانپ گیا تھا۔راجو کی محبت میں وہ اندھی ہوچکی تھی۔

اس کا جسم گھلنے لگا تھا۔

لمبے لمبے سیاہ زلف عنبریں جو کولہوں تک لٹکتے تھے جھڑنے لگے تھے۔

راجو تو ان زُلف عنبریں کا سودائی ہوچکا تھا۔

صبیح چہرے پر کیل مہاسوں کے نشانات پڑ گئے تھے۔

رو روکے اس کے آنسو خشک ہوچکے تھے۔

شریں زباں سے بات کرنی والی پری پیکر کی زبان سے اب تلخ الفاظ نکلتے۔

وہ سب کو کُوستی۔

منہ پھٹ بن گئی تھی۔

زبان سے زہر اگلنے لگی تھی۔

کھانا اتنا کھاتی کہ مر نہ جائے۔

روزانہ کپڑے بدلنے والی اب میلے کپڑوں میں رہا کرتی ۔

سرد مزاجی اور بے التفاتی اب اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔

اس کے آنگن کے ارد گرد پورا علاقہ سبز پوش تھا۔
بالکل سامنے پہاڑ اپنی تمام تر رعنائیوں اور رعب کے ساتھ ایستادہ تھے۔
....آبشاروں کا پانی بہہ رہا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا پانی
دریائے گلگت غل غپاڑے کرتا ہوا دریائے سندھ میں گر رہا تھا۔
اس کے ارد گرد سبز درخت تھے۔
ان کی بھینی بھینی خوشبو تھی۔
خوبصورت پرندے ان خوشنما درختوں میں طرب زا چہچہے بلند کر رہے تھے۔
اور ایک فرحت انگیز ساز پیدا ہو جاتا تھا۔
مگر روحی کے لیے یہ سب کچھ بے ثبات تھا۔
وہ ان میں دلچسپی لینا چاہتی تھی مگر اس کا دل تو کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔
اب اس کو گلگت بلتستان کے سبز پوش درخت اچھے نہیں لگتے تھے۔
قراقرم کے پہاڑوں کے دامن میں پھولوں اور پھلوں سے لدی ڈالیاں اس کے دل میں لطف و سرور پیدا نہیں کر رہی تھیں۔
ہمالیائی سلسلوں کے گلاب اور کنول کے پھولوں کی نکہتیں اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں تھیں۔
بالاور دیس کے آبشاروں، ندی نالوں اور شریں چشموں کا نیلا اور مصفا پانی بھی اس کے دل مضطر میں کوئی کشش پیدا نہیں کر سکتا تھا۔
دیامر کے گھنے جنگلات اور '' ہیپرنگ '' کی مہیب صورت بھی تو اس کے لیے کوئی

معنی خیز نہیں تھی اور نہ ہی '' کھلمئی '' کا نظر فریب منظر۔
وہ بذریعہ تخیل سب کچھ راجو سے کہہ دیتی۔ اب ان دونوں میں کوئی پردہ نہ رہا تھا،
تخیل ایک ایسا رشتہ تھا جس نے راجو اور روحی کو بہت قریب کر دیا تھا بلکہ ملا دیا تھا۔ وہ
دونوں تخیل کی آس پہ ہی جی رہے تھے۔ روحی نے اس سے کہا تھا کہ
میں سو نہیں سکتی''۔ ''
نیند مجھ سے کوسوں دور ہے''۔ ''
بظاہر آنکھیں بند کیے ہوئے آپ کے خیالوں پہ میں کھو جاتی ہوں''۔''
''آپ کی حسین شبیہ ''
پہ میں جب بستر پر لیٹتی ہوں تو گھر والے سمجھتے ہیں کہ میں تکان سے چور ہوں، سو رہی''
ہے''۔
میں بستر پر بے حس و حرکت ایک مرمریں مجسمہ کی طرح ہمہ وقت پڑی رہتی''
ہوں''۔
مجھے زندگی سے گھن آتی ہے''۔''
ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوں''۔''
پھنڈر کی ٹروٹ مچھلیاں بھی جب پانی سے نکالی جاتی ہیں تو مجھ سے کم تڑپتی''
ہو نگیں''۔
میں نے مچھلیوں کو بے آب تڑپتے دیکھا ہے مگر خود کو ان سے بھی مظلوم ''

سمجھتی ہوں''۔

آنکھیں موند کر سپنے دیکھنے لگتی ہوں''۔''

.....''آپ کا سایہ اور چھاؤں کے ٹھنڈے میٹھے سپنے''

رات کے آخری پہر جب جاگ جاتی ہوں تو نماز تہجد سے پہلے نیلگوں آسمان میں''
ستارے جھلملا رہے ہوتے ہیں، ان ستاروں کی تھرتھرائی ہوئی لامتناہی دنیا میں مجھے
اپنے راجو کا تلاش رہتا ہے''۔

شہاب ثاقب کا ٹوٹ ٹوٹ کر ہواؤں کے دوش بکھرنے کا منظر مجھ سے دیکھا نہیں''
جاتا''۔

''راجو! کہیں تم تو وہ شہاب ثاقب نہیں ہو؟ ''

''لختِ جگر! تمہارا وجود بھی تو ''لخت لخت ''ہو چکا ہے ''

موسم بہار اور گرما کی ان خوشگوار راتوں کو میری روح آوارہ بھٹک رہی ہوتی ''
ہے، نانگا پربت کی بلندیوں سے ہو کر پامیر کے آخری سرے تک جاتی ہے۔واپسی پر نگر
کے لذیذ ناشپاتیوں کی لطیف اور بھینی خوشبو اور بگروٹ کے یخ برف کا ایک ٹکڑا ہاتھ
میں لیے، بھٹکتے بھٹکتے آپ کے پاس پہنچ جاتی ہے''۔

نماز میں بھی تیرا خیال دامن گیر رہتا ہے''۔''

میری رنگینیاں اور دلفریبیاں ختم ہو گئی ہیں''۔''

دل مضطر ہے''۔''

عشرت کی جگہ عُسرت نے لی ہے''۔''

نہ مست شباب ہے نہ ہی شغل شراب''۔''
کشتی گرداب میں پھنسی ہے''۔''
میں ہوں''۔''
دریا کا بہاؤ ہے''۔''
موجیں ہیں''۔''
چنگھاڑتی موجیں''۔''
بھنور ہے''۔''
گرداب ہے''۔''
مگر جان جگر: غور سے سنو: میں اللہ کی رضا پر خوش ہوں''۔''
امتحان اور مصیبت کے میدان میں غوطہ لگائے بغیر اللہ کی خوشنودی حاصل نہیں کی''
جاسکتی ہے''۔
مجھ سے شاید کوئی خطاء سرزد ہوئی ہے جس کی وجہ سے میں ابتلاء میں ہوں''۔''
اللہ مجھ سے روٹھ گیا ہے''۔''
اور روٹھے ہوئے خدا کو منانا کوئی آسان کام نہیں''۔''
اللہ تعالی اپنے بندوں کو مختلف مصیبتوں سے آزماتا ہے''۔''
کبھی مال و متاع دے کر اور کبھی چھین کر''۔''
کبھی نقصان اولاد سے'' ۔''
کبھی کسی کی محبت چھین کر''۔''

کبھی کسی کو محبت دے کر''۔''

''!دیکھو نا......راجو''

تم میرے ہو کر بھی میرے نہیں''۔''

کیا یہ کوئی کم آزمائش ہے''؟۔''

''..........................اور پھر میری نسبت''

جو اِن حالات میں ثابت قدم رہے''۔ ''

سجدہِ شکر بجا لائے''۔''

عجز و انکساری سے خاک فرش پر جبیں رگڑے''۔ ''

کاتبِ تقدیر پر راضی برضا رہے''۔''

پھر اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے''۔''

اس کی آہیں عرش تک پہنچتی ہیں''۔ ''

!'' تب رب المغربین والمشرقین''

اپنے فضل و کرم کے دروازے کھول دیتا ہے''۔''

تکالیف، مصیبتیں، دکھ درد اور بلاخیز موجیں پاس نہیں آتیں''۔''

اپنوں کی بے رعنائیاں اور غیروں کی ریشہ دوانیاں کچھ نہیں بگاڑتیں''۔ ''

وہی میری بھلائی سب سے بہتر سمجھتا ہے''۔''

وہی تو میری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ ہاں راجو ! تم سے بھی قریب، بہت''

قریب''''۔

آہ! اگر ایسا نہ کروں اور رب کی رضا پہ راضی نہ ہو جاؤں تو خدا جانے دیگر کن ''
مصیبتوں میں مبتلا کر دیا جاؤں''۔

راجو اس کی تقریر دلپذیر سن کر فرحاں و شاداں ہوتا اور پھر یک دم
نالاں ....۔

روحی کو اس پر بھی شکایت تھی کہ '' اس کی اماں اور ابا نے ایک ایسے مرد کے ساتھ اس کا رشتہ کیوں طے کیا جو اس کا ہم کفو نہیں تھا۔کیا ان کی ماںمتا نہیں جاگتی ؟۔ اس کا بھیا، بہنیں، رشتہ دار اور عزیز و اقارب اس ظلم کے خلاف آواز کیوں نہیں بلند کرتے ہیں؟ بلکہ وہ تو اس کو مزید چڑھاتے تھے۔اس کا گھر، اس کے در و دیوار، اس کی کیاریاں، درخت ، جانور، سہلیاں، کتابیں اور سب کچھ چلا چلا کر کیوں نہیں احتجاج کناں بنتے ہیں؟''۔

! ....''ماما''

''آہ! ماما ''

ماما کو ماما اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب ماں اور باپ کا سایہ یا شفقت اُٹھ جائے تو '' ماما'' کی ذمہ داریاں دُھری ہو جاتی ہیں۔دو دفعہ ماں سے ایک دفعہ ماما بن جاتا ہے مگر یہاں تو '' ماما'' بھی آلہِ قتل ید بیضا میں لیے پھر رہا تھا۔آہ ! اس بیچاری کو کیا معلوم کہ زمانہ تو کسی کے دکھوں پر ہنس رہا ہوتا ہے۔چہ جائے کہ کسی کی مظلومیت پر آنسو بہائے اور تسلی کے دو بول بولے۔

اس کی نگاہیں ہمیشہ آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔
اور رب کے حضور التجا کر رہی تھیں۔
وہ جانتی تھی کہ افراتفری کے اس دور میں کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔
سب کچھ تو خاموش تھا۔
اس کا گھر، آنگن سنسان تھا۔
یہ بھی تو انسان کے دل کی طرح
سخت،
سیاہ،
بے رحم،
بے حس
اور نامہربان تھے۔
وہ یہ سب کچھ دیکھتی تھی، سب کی باتیں سنتی تھی۔ وہ بے سُدھ اور بے خود تھی مگر سب پر کُڑھتی تھی۔ اور پھر اس کا راجو بھی تو بے بس اور بے برگ و نوا تھا۔
بظاہر روحی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی، اس کی سرمئی آنکھوں............ میں خوشیوں کے آنسو تیرتے رہتے مگر وہ ایک کرب میں مبتلا تھی، اس کا دل ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا، وہ ہر ملنے والے سے دل آویز مسکراہٹ لیے ملتی لیکن............ ایک دفعہ اس کی ایک سہیلی نے کہا تھا کہ تم کتنی

خوش قسمت ہو کہ ہر لمحہ چہرے پر مسکراہٹ لیے بیٹھتی ہو، تم اگر اس مسکراہٹ کے ساتھ جیو گی تو تم بوڑھی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔وہ بھی کتنا نصیب والا ہو گا جس کو تمہاری مسکراہٹیں تھوک میں ملیں گی۔ روحی نے اس کا کوئی خاص رسپونس نہیں دیا مگر دل ہی دل میں کہا کہ تمہیں کیا پتہ میری بدقسمتی کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔روحی کو کوئی ہمیشہ ''بدقسمت'' کے نام سے بھی پکارتا۔ جب راجو اسے پوچھتا کہ ''کیا تم میری کنول ہو، میری روح ہو، میری زندگی ہو؟ تو وہ کہتی۔ نہیں میں ''غم'' ہوں۔ ''مصیبت'' ہوں۔ سب کے لیے، تیری لیے بھی اور سب سے بڑھ کر'' بدقسمت'''' بدنصیب'' ہوں۔ وہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کے اس فلسفے میں الجھی ہوئی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

اس کے بہت سارے شوق تھے۔ وہ سیدھی سادھی گھریلو لڑکی تھی۔ اس سے مختلف قسم کے لذیذ کھانے پکانا، سنیریاں پرونا، کپڑے دھونا، گھر اور آنگن میں جھاڑو دینا، بالوں کی کنگھی کرنا، سرمہ لگانا، کپڑوں کو استری کرنا، بکریوں کو گھاس اور سبز پتے اور ٹہنیاں کھلانا، درختوں سے پھل توڑ کر اپنے چاہنے والوں کو کھلانا، گھریلو اشیاء قرینہ سے رکھنا اور سونے کی انگوٹھیاں پہننا، افسانے اور ناول پڑھنا، کتب و رسائل کا مطالعہ کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا بے حد اچھا لگتا تھا۔ اعلیٰ درجے کے کالے برقعے اور سرخ کلر کے کپڑے بڑے شوق سے پہنتی تھی۔ یہ سب کچھ اب بھی چلتا تھا مگر بددلی اور بے ذوقی سے۔ اس کو کالے چشمے پہننے کا حد درجہ شوق تھا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کرنے میں قاصر

تھی۔ اس نے راجو سے کہا تھا کہ '' پہن لو نگی کسی وقت انشاء اللہ، سیاہ، بالکل سیاہ چشمے ! ! اب نہیں پہن سکتی۔ کیوں کہ زمانہ پہننے میں حائل ہے ''۔ آہ ! کتنا معصوم سا ارمان زمانے کے خوف کی وجہ سے پورا نہیں کر سکتی تھی۔

راجو کی محبت میں روز اضافہ ہوتا، گہری سی گہری ہو جاتی۔ اس کی.............. شیفتگی اور وارفتگی میں کمی آنے کا نام نہیں لیتی۔ آہ ! ! ! راجو کسی کو کیسے بتاتا کہ اس کی روحی (میری جان) سے کتنی محبت ہے۔ وہ تو ایک دیوی تھی دیوی، جس کی پوجا کی جا سکتی تھی۔ اس قدر پاکیزہ، مقدس اور معصوم........ وہ تو چنبلی کا پھول تھی، لاکھوں میں ایک تھی، راجو کو پوری دھرتی میں اس جیسی ایک بھی لڑکی نہیں ملی تھی..... کبھی دیوانہ وار وہ روحی (میری جان) سے کہہ دیتا۔ '' تم میری جان ہو، تم میری آمانت ہو، مجھے تم سے ابدی اور سرمدی محبت ہے، لازوال محبت ہے جس کو کبھی موت نہیں آ سکتی، تم اپنا بہت خیال رکھنا، میری امانت میں خیانت نہ کرنا، میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں، کچھ بھی نہیں۔ ہم تم دور دور ضرور ہیں مگر بہت قریب۔ '' یہ محبت کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں بظاہر دور ہو کر بھی بہت قریب ہوتے ہیں۔ یک جان دو قالب۔

جب راجو کی اپنی پاکیزہ اور مقدس محبت کا خیال آتا تو اس کے آنسو امڈ.......... آتے، گلے میں ہچکیاں تڑپنے لگتی، چہرہ ملول، دل بے زار، دنیا بے گانہ، سب کچھ تو اس کو کریہہ لگتا....... اس کے دل میں کس قدر محبت تھی وہ تو راجو، روحی اور ان کے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا نہ جان

سکتا۔ راجو اور روجی پر امید تھے۔ ان دونوں کا ملن کسی نہ کسی دن ہونا تھا۔ کیونکہ راجو اور روجی کی محبت گندے بدبودار اور غلیظ چھتیڑوں میں لپٹی ہوئی محبت نہ تھی، ان دونوں کی محبت خواہشات کی تکمیل کا نام نہ تھا۔ اس محبت میں رائیکوٹ کے "تتہ پانی سے نہائے ہوئے جسموں، مشک و عنبر سے رنگے ہوئے کپڑوں کی مہک اور گلاب و" کنول کی خوشبو آتی تھی۔ راجو کا دل اس کی محبت کی گہرائیوں اور گیرائیوں میں غرق ہو چکا تھا۔

راجو کی زندگی میں عجب تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ اکثر مضمحل اور افسردہ رہتا۔ کئی کئی دن گھر میں اکیلا رہتا۔ اب وہ جلوت سے خلوت کا شائق تھا۔ روجی کے چھن جانے کا غم اس کے سپاٹ چہرے پر اس طرح چھایا ہوا تھا جس طرح ناننگا پربت کی حسین چوٹی پر بادل کا ٹکڑا۔ راجو کی دنیا اُجڑ گئی تھی۔

آہ!!!

ہزار مربع میل پر مشتمل پوری دھرتی بقعہء نور بن گئی تھی۔ 28

فیری میڈو میں پریاں ناچ رہی تھیں۔....

عطاء آباد میں کشتیاں جھوم رہی تھیں۔ ....

سدپارہ دمک رہا تھا۔....

راما کا حسن نکھر رہا تھا۔....

قرمنبر کی رعنائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔....

خلتی جھیل کا نیلگوں پانی اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔....

لالوسر کی جھیل نوحہ کناں تھی۔.....

نلتر میں گلزار سبزہ زار رقصاں تھے۔....

جلال آباد میں ثمر شریں سے جھکے ہوئے اشجار کی بہتات تھی۔....

گیٹی داس میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور آبشاریں جاری تھیں۔.....

جگلوٹ میں ٹھنڈے میٹھے پانیوں کی افراط تھی۔.....

سارگن گلگت کی دلفریب عمارتیں آرائشوں اور آسائش سے مزین تھیں۔.....

کوہستان کے کالے کالے پہاڑ ہر طرف جاذب نظر تھے۔.....

بلتستان کے ماخور اور غزال چوکڑیاں بھر رہے تھے۔.....

وادیِ جنت نظیر کی صبحیں راحت زا تھیں، شامیں فرحت افزا۔ ہوائیں بابرکت تھیں، پانی صحت افزا۔ زندگی آسودہ تھی۔ دل مطمئن و مسرور تھے۔ جسم مخمور تھے۔ آنکھیں شراب مستی میں مسحور تھیں.....اب گلگت بلتستان کی ہر چیز حسین تھی۔

.... مگر

راجو کے لیے یہ سب کچھ ایک فریب تھا۔ دغا تھا۔ مکر تھا۔ سراب تھا۔ چشم تر تھی۔ فصل گل کی رنگینیاں اور موسم برسات کی بہاریں اسے لطف نہیں دیتی تھیں۔ اس کے دل و دماغ کو معطر نہیں کر رہی تھیں۔

ہاں!!!

شنگریلا میں غنچے چیخ رہے تھے۔.....

دیوسائی ہیں کلیاں مسکرا رہی تھیں۔۔۔۔۔

مارتل گوہرآباد ہیں پھول کھلکھلا رہے تھے۔۔۔۔۔

ہر ایک اپنی پسند کا پھول توڑ کر زندگی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ راجو بھی اپنی پسند کا پھول توڑنا چاہتا تھا۔ اس کا خوشبو سونگھنا چاہتا تھا۔ اپنی نازنین آنکھوں سے لگانا چاہتا تھا مگر اس سے اس کا پھول چھین لیا گیا تھا۔ اگر وہ جانتا کہ اس کا پھول چھننے والا ہے تو وہ بروقت کوئی مناسب تدبیر کرتا مگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے کئی تدابیر کیں مگر الٹی ہو گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ وہ چِلّانا چاہتا تھا۔ وہ ببانگ دہل کہنا چاہتا تھا کہ یہ خوبصورت پھول میرا ہے صرف اور صرف میرا۔ اس کی تخلیق ہی میرے لیے کی گئی ہے مگر اس کا پھول کوئی اور سونگھنا چاہتا تھا۔ سو اس نے راجو سے کہ دیا کہ یہ پھول اب تیرا نہیں رہا۔ یہ میرا ہے میرا۔ راجو پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور وہ کھل کھل کر ہنس دیا۔

راجو مایوس ہوا۔ اور روتا دھوتا چل دیا۔ اور اس کا دل ریزہ ریزہ ہوچکا تھا۔ اس کا نہیں پتہ کہ اب وہ کہاں ہے۔ زمیں نگل گئی تھی یا آسماں۔ مجذوب بن کر کہیں بیابانوں، پہاڑوں، جنگلوں ہیں آوارہ پھر رہا ہوگا۔ اور خلوت کدوں اور چھپے حجروں میں اپنی کھوئی ہوئی '' روحی'' ڈھونڈ رہا ہوگا۔ کون پوچھے گا اس کا، اور کیوں پوچھے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا پھول تو پامال ہوچکا تھا۔ اور مسلا جانے والا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف سر اُٹھایا، ہاتھ پھیلائے اور سرگوشی میں کہا

کہ

........اے رب السماء ! کہاں ہے؟''

میری زندگی کا پھول''۔''

میرے حسین خوابوں کی تعبیر''۔''

میری وفاؤں کی دیوی''۔''

میری جوانی کی امنگ''۔ ''

......اے رب الزھرۃ والشجرۃ ! کہاں ہے؟ ''

''گلاب کی پنکھڑی ''

''کنول کی پتی ''

''نیلوفر کی کلی ''

''گل سر سبد کا شگوفہ ''

''گل بکاؤلی کی سفیدی ''

''گل لالہ کی لالی''

''گل مہندی کی حنا ''

''گل خیرو کا نیلا پن

''گل نار کی سرخی''

''شاخ کی کلی''

''کلی کی نازکی ''

......اے رب الحجر! کہاں ہے؟ ''

''ہیرے کی چمک ''

''یاقوت کی رمانی''

''مرجان کا حسن ''

''فیروزہ کا نیل گوں ''

''الماس کا جلوہ''

''زمرد کا سبزہ ''

......اے رب الارض''! کہاں ہے؟ ''

فیری میڈو کی پریوں کی سردار''۔ ''

دیوسائی کی جل پریوں کی سرخیل''۔ ''

غذر کی دوشیزاؤں کی ملکہ''۔''

''دیامر کی حسیناؤں کی راجکماری ''

''ہنزہ کی کنواریوں کی شہلا''

''داریل کی حیاداروں کی مان ''

''گوہرآباد کی نازنینوں کی رانی ''

''بلتستان کی حوروں کی سردار ''

......اے رب اللیل والفلق''! کہاں ہے؟ ''

''سیاہ رات کی ماہِ تمام ''

''چاند کی چاندنی ''

''دھوپ کی روشنی''

''شب دیجور کی ماہ رُخ ''

''ستاروں کی جھرمٹ ''

......اے رب الملک ! '' کہاں ہے؟''

''ہندوستان کی دیویوں کی لکشمی ''

''عربستان کی لیلاؤں کی ناز ''

......اے رب الطیور ! '' کہاں ہے؟''

''بلبل کا نغمہ ''

''فاختہ کا ترنم''

''کوئل کی کوں کوں ''

.......اے رب الجبال'' کہاں ہے؟ ''

''کوہِ صفاء کی تقدیس ''

''کوہ طور کی تجلی ''

''نانگا پربت کی شان ''

''کے ٹو کی بلندی ''

''راکاپوشی کا نظارہ ''

.......اے رب البحرین !'' کہاں ہے؟ ''

''مرج البحرین کا مٹھاس و کڑواہٹ ''

دریائے گلگت کی جل ترنگ''۔ ''

''دریائے پھنڈر کا حسن ''

''دریائے یاسین کی موج ''

''دریائے اسکردو کی لہر''

''دریائے چلاس کا طلاطم ''

''دریائے استور کی خنکی ''

اے رب الشعراء !'' کہاں ہے؟ ''

''شاعر کی غزل ''

''بانسری کی لَے ''

''گائیک کی سُر ''

''مُغنی کی غنا''

''قوال کی راگ''

''طبلے کی تھاپ''

اے رب العشاق والمجانین !'' کہاں ہے........؟ ''

''مجنون کی لیلیٰ ''

''یوسف کی زلیخا ''

''آدم کی حوا ''

''ہارون کی زبیدہ ''

''شاہ جہاں کی نورجہاں''

''شہزادہ سلیم کی انارکلی''

''فرہاد کی شریں ''

''پنوں کی سسی''

''میرا کی کبیرہ''

''رانجھا کی ہیر ''

''راجو کی روحی''

رب العالمین کے حضور دعا کرتے کرتے راجو کی روح پرواز کر گئی۔اب صرف قفسِ عنصری تھا۔ قفلِ خموشی تھی۔ کیوں؟ کیوں کہ اب نہ خواب تھا نہ خواب کی تعبیر، نہ جوانی تھی نہ امنگ۔ ہیرے کی چمک بھی غائب تھی مرجان کا حسن بھی، فیروزہ کا نیل گوں بھی نہیں تھا الماس کا جادو بھی نہ ہی یاقوت کی رمانی، نہ دریاؤں کی موج تھی نہ پہاڑوں کی تقدیس، نہ بلبل کا نغمہ تھا نہ فاختہ کا ترنم،نہ چاند کی چاندنی تھی نہ دھوپ کی روشنی، نہ شاعر کی غزل تھی نہ مغنی کا غنا، نہ عاشق کی معشوق تھی نہ حسیناؤں کی راجکماری۔آہ! نہ گل تھا نہ بلبل، نہ گل تر تھی نہ گل چیں۔ نہ گل دستہ تھا نہ گل دان۔ نہ گلشن تھا نہ گلشن آراء ۔کچھ بھی تو نہیں تھا۔سب کچھ گُل ہوا تھا یا گُل کر دیا گیا تھا ۔اب جئے بھی تو کوئی کیوں جئے!!۔

روحی بڑی نیک دل تھی، اس نے کبھی کسی غیر کے ساتھ ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ وہ تو کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ وہ ہمیشہ اللہ سے توبہ استغار کرتی تھی۔۔ نمازوں کا اہتمام اس کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی، وہ تو تہجد بھی پڑھتی تھی، رمضان کے سوا بھی وہ رضائے الٰہی کے لیے روزے رکھتی ،گناہوں کا شائبہ تک نہیں تھا مگر ایک گناہ وہ روزانہ کی بنیاد پر کرتی جاتی تھی۔ وہ یہ کہ وہ اپنی نمازوں میں بھی راجو کے لیے کوٹہ رکھتی۔ اس نے اپنے اللہ سے ہمیشہ راجو کا ساتھ مانگا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ سخت مایوس ہو گئی تھی، وہ زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی، اس نے وقت افطار رو رو کر اللہ سے اپنی زندگی بھی راجو کے لیے مانگی تھی۔ وہ بول کتنے عظیم تھے کہ '' یااللہ میری زندگی بھی راجو کو دے دیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی، وہ زندگی بھی کیا زندگی ہے جو راجو کے بغیر گزرے۔ میں کسی اور کی نہیں بن سکتی۔ یہ میری تخلیق کے خلاف ہے، میں اسی کے لیے جی ہوں اسی کے لیے مرنا چاہتی ہوں ، بس میری عمر بھی ان کو لگ جائے ''۔ یہ لازمی نہیں کہ انسان کی ہر تمنا پوری ہو جائے۔ خواہش اور حسرت کا التزام ہے۔ یہ تو محال ہے کہ مختصر سی زندگی میں تمام خواہشات پوری ہو جائے۔ ہزار کوششوں کے بعد بھی کچھ خواہشات حسرتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ انسان زندگی میں جس چیز کی سب سے زیادہ حسرت کرتا ہے وہ اس سے دور بھاگتی چلی جاتی ہے کوسوں دور..... کیا خواہشات کے پیچھے سرپٹ بھاگنا چاہیے ؟ شاید نہیں۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کرنے والے رب

کے حوالہ کرنا چاہیے۔ روحی تو ایسا کر چکی تھی، وہ اللہ کی مرضی پر خوش تھی۔ اکثر فصبر جمیل کی تفسیر کرتی رہتی اور رکاوٹوں کو دور کرنے والے وظیفے بھی پڑھتی۔ وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ جو بھی ہوگا رب کی مرضی و چاہت سے ہوگا پھر رب کے کاموں میں دخیل ہونا چہ معنی دارد۔ مگر کیا راجو کے لیے بھی یہ ممکن تھا۔ شاید نہیں۔ اس کے دل میں ایک نہ ختم ہونے والا اضطراب تھا۔ کسی دانا نے کہا تھا کہ '' حاصل اور خواہش کے درمیان فرق کا نام اضطراب ہے''۔ راجو کو چاہیے کہ وہ اپنی خواہش کے لئے دیوانہ نہ بنے۔ کیوں ؟ کیونکہ تحصیل خواہش کے لیے اس سے جائز و ناجائز راستے اختیار کرنے پڑیں گے۔ اسے جرم کے راہ پر چلنا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یقینا انسان کو غلیظ، متعفن اور بدصورت بنا کر رکھ دیتی ہے۔ راجو خوبصورت ہے، عظیم ہے اس کو غلیظ اور بدصورت نہیں بننا چاہیے۔ اس کو تو ہر دم '' ربنا أتنا فی الدنیا حسنۃ...... کا ورد کرنا چاہیے۔ محبت میں وصل کامیابی ہے یا فصل؟۔ یہ سوال لیے راجو، شہروں، قصبوں، دیہاتوں، بیابانوں، صحراؤں، عاشقوں، مجنونوں، محبوبوں، علمی مرکزوں اور کتابوں میں سرگرداں گھوم رہا تھا مگر جواب ندارد......۔

یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ انسان مرجاتے ہیں لیکن محبت.............. نہیں مرتی۔ ہاں سچی اور مقدس محبت۔ وہ صدیوں زندہ رہتی ہے۔ بہار کے بعد خزاں ضرور آتا ہے مگر جلد ہی دوسری بہار بھی تو آجاتی ہے۔ بدبودار محبت کا کوئی بھروسہ نہیں اس کی تو عمر ہی چند لمحے ہوتی ہے، اسکی موت یقینی ہوتی

ہے، وقتی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں لیکن.............بے لوث محبت، سچی اور پاکیزہ محبت کیا مر سکتی ہے، نہیں قطعاً نہیں۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس کو قائم رہنا ہے جو صدیوں تک قائم رہی گی۔ آہ ! راجو کی وفاؤں کی دیوی ! وہ تو قسمیں کھا کر کہتی کہ ''تمہیں کبھی بھی نہیں بھولونگی۔ بڑھاپے میں بھی، موت کے بعد بھی''۔ راجو بھی اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ تو اس سے بیس سال بعد بھی قبول کرنے کو تیار تھا۔ وہ دونوں تمام گناہوں سے توبہ کرنا چاہتے تھے مگر محبت کے گناہ سے بھی توبہ ممکن تھا۔

مجنون غلاف کعبہ پکڑ کر کہا رہا تھا

الٰہی تبت من کل المعاصی

ولکن حب لیلٰی لا اتوب

پروردگار: تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلٰی کی محبت سے توبہ نہیں کر سکتا)۔ تو) پھر ان دونوں کے لئے کیسے ممکن تھا محبت سے توبہ۔ ان دونوں کے نزدیک محبت سے توبہ بھی تو گناہ کے زمرے میں آتا تھا پھر ان سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوتا۔

مولانا قاضی نثاراحمد صاحب، گلگت بلتستان میں ایک چھپا صوفی

مولانا قاضی نثاراحمد ایک جید عالم دین ہیں۔ قاضی نثاحمد ۲۷ جون ۱۹۶۴ء میں گلگت کشروٹ کے ایک مذہبی اور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد قاضی عبدالرزاق نوراللہ مرقدہ فاضل دارالعلوم دیوبند تھے۔اور آپ کے ناناجان بھی دارالعلوم دیوبندکے فاضل تھے ۔ان کا نام مولانا عبدالرحیم تھا۔اور آپ کے سسر مولانا عزیزالرحمان صاحب بھی دارالعلوم دیوبندکے فاضل تھے۔ابتدائی پرائمری کی تعلیم کشروٹ کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔اپنے والد ماجد حضرت مولانا قاضی عبدالرزاق صاحب سے ناظرہ قرآن، ابتدائی فارسی، صرف و نحو اور فقہ کی کتابیں پڑھی۔ مولانا قاضی عبدالرزاق صاحب 1939 ء کو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر گلگت تشریف لائے تھے۔ قاضی عبدالرزاق صاحب نے ایک طویل عرصہ دارالعلوم میں کبار علماء سے کسب فیض کیا۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے دورہ حدیث پڑھا۔گلگت بلتستان میں قاضی عبدالرزاق اور ان کے تلامذہ کی شاندار دینی خدمات ہیں۔تاحیات گلگت بلتستان کی مرکزی جامع مسجد گلگت کے خطیب رہے۔ باطل قوتوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار تھے۔اور قاضی بھی رہے۔ قاضی عبدالرزاق صاحب نے گلگت بلتستان کی اولین دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ نصرۃ الاسلام کی بنیاد ڈالی۔ جامعہ کے ساتھ ہی اہلسنت کے لیے مرکزی

عیدگاہ اور قبرستان کی جگہ بھی حاصل کی۔تبلیغی مرکز گلگت کو بھی ایک وسیع اراضی قاضی مرحوم نے جامعہ کی وسیع اراضی سے ھدیۃً دے دی جہاں آج جامعہ نصرۃ الاسلام کے ساتھ تبلیغی مرکز موجود ہے۔

قاضی نثاراحمد نے 1980ء میں گلگت ہائی سکول نمبر ایک سے سائنس میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔چونکہ اس وقت گلگت بلتستان کے تعلیمی ادارے فیڈرل بورڈ کے ساتھ منسلک تھے۔توآپ نے وفاقی بورڈ سے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔مزید تعلیم جاری رکھا۔1984ء کو پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔آپ کے والد گرامی نے 1985ء میں تحصیل علوم دینیہ کے لیے آپ کو جامعہ علوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی بھیجا۔ وہاں سخت جائزے کے بعد درجہ ثانیہ میں داخل ہوئے۔ درجہ رابعہ تک جامعہ میں ہی کبار اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی۔ درجہ خامسہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں پڑھا۔دارالعلوم حقانیہ ہیں کبار علماء کرام سے فیض حاصل کیا۔درجہ سادسہ مدرسہ انوار لعلوم گوجرانوالہ میں قاضی حمیداللہ جان رحمہ اللہ کے پاس پڑھا۔ قاضی حمیداللہ صاحب سے درجہ سادسہ کے علاوہ منطق و فلسفہ میں اقلیدس، مطول، صدرا، قاضی، حمداللہ خلاصہ شرح خیالی اور توضیح تلویح وغیرہ دیگر کتابیں بھی پڑھیں۔ مولانازاہدالرشدی صاحب سے کتاب الاثار اور حماسہ پڑھی۔ امام اہلسنت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب سے دورہ تفسیر پڑھا۔بقول قاضی صاحب کے " اُس

سال چھ سو طلبہ دورہ تفسیر میں شریک تھے۔ دورہ کے بعد امتحان لیا جاتا تھا، مولانا عیسیٰ صاحب نے مجھ سے تفصیلی امتحان لیا اور چھ سو میں مجھے شرف اول سے نوازا، الحمدللہ ''میرے پاس ان کی دی ہوئی پوزیشن کی سند ابھی تک موجود ہے،

قاضی نثار احمد نے موقوف علیہ (درجہ سابعہ) جامعہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھا۔

1991ء میں دورہ حدیث شریف جامع علوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے کیا۔ بخاری اول مولانا مصباح اللہ شاہ صاحب، بخاری ثانی مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار صاحب، مسلم اول مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، مسلم دوم مولانا عبدالسلام چاٹگامی صاحب، ابوداؤ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صاحب، ترمذی اول وثانی شہید اسلام مولانا ڈاکٹر نظام الدین شامزئی صاحب سے پڑھی، موطائین بھی ان سے پڑھی۔ قاضی نثار احمد کی پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔

حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صاحب سے اکثر ملاقاتیں رہتی۔ میرے استفسار پر بتایا کہ '' جنگ دفتر میں حضرت اکثر تشریف فرما ہوتے تھے، یہں وہاں جاکر ملاقات کیا کرتا تھا''۔ جنگ دفتر سے مراد یہ ہے کہ '' جب روزنامہ جنگ نے '''اقراء ''کا اسلامی کالم شروع کیا تو اس کی ابتداء علامہ لدھیانوی سے ہوئی۔ حضرت جنگ میں اسلامی طرز کے کالم لکھا کرتے تھے۔ حضرت جس دفتر میں بیٹھ کر دوسرے امور کے ساتھ روزنامہ جنگ کے امور بھی نمٹاتے تھے اس لیے وہ

جنگ دفتر سے معروف تھا۔ حضرت مولانا نذیراللہ خان صاحب نے بھی کئی دفعہ قاضی نثاراحمد کی ملاقات حضرت لدھیانوی صاحب سے کرائی تھی۔ مولانا نذیراللہ خان صاحب چونکہ حضرت بنوری کے اولین دس تلامذہ میں سے تھے اس لیے علامہ بنوری ٹاؤن میں ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔

بیعت کے حوالے سے قاضی نثاراحمد صاحب نے بتایا کہ ''میں سال بھر حضرت کی عصر کے بعد کی مجلسیں سنتارہا، کلاس میں بھی حضرت کا درس اور وعظ نصیحت غور سے سنتا، حضرت سے انس اور محبت پیدا ہوگیا تھا، تاہم بیعت کے حوالے سے میں حساس تھا، اس لیے سال بھر حضرت کے معمولات وغیرہ کو غور سے دیکھتا رہا کہ کوئی کام شریعت کے مخالف تو نہیں ہورہا، تاہم اختتام سال میں مجھے شرح صدر ہوا۔ اور حضرت سے ہر طرح مطمئن ہوا۔ فراغت کے فوراً بعد رمضان المبارک کے اخیر تک حضرت کی مسجد الفلاح میں معتکف ہوا۔ اس تمام عرصہ حضرت سے خوب استفادہ کیا اور خوب خدمت بھی کی۔ حضرت سے رمضان المبارک میں ہی بیعت کی، ساتھ ہی حضرت نے خلافت سے بھی نوازا۔ الحمدللہ میں اس حوالے سے بڑا خوش قسمت واقعہ ہوا ہوں، حضرت مجھ ناچیز پر شروع ہی سے بے حد اعتماد کرتے تھے''۔

قاضی نثاراحمد نے تخصص نہیں کیا اس کی وجہ بھی حضرت لدھیانوی اور مولانا عبدالسمیع صاحب رحمہما اللہ بنے۔ جب انہوں نے حضرت لدھیانوی کے سامنے اپنے

تمام حالات بالخصوص گلگت بلتستان کے حالات سامنے رکھے تو حضرت نے فیصلہ صادر فرمایا کہ فوراً گلگت جاکر دینی خدمت شروع کرو، آپ کو تخصص کی ضرورت نہیں۔اپنے استاد مولانا عبدالسمیع صاحب سے مشورہ لینا چاہا تو انہوں فرمایا کہ مولانا آپ کی استعداد بہتر ہے لہذا تخصص کے بجائے تدریس کا مشغلہ اپناؤ، زیادہ مفید رہے گا۔بقول قاضی نثاراحمد کے '' حضرت شامزئی صاحب نے تو بالکل منع فرمایا اور کہا کہ کتب کا مطالعہ جاری رکھو بالخصوص بدائع الصنائع کا۔ تخصص کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں''۔

جامع مسجد گلگت میں حضرت لدھیانوی سے بیعت:... حضرت لدھیانوی شہید رحمہ اللہ نے 1999ء کو اپنے رفقاء سمیت گلگت تشریف لائے تھے۔یہاں حضرت لدھیانوی نے اقراء روضۃ الاطفال کے چند اسلامی اسکولوں کا افتتاح کرنا تھا۔ قاضی نثاراحمد اس تمام سفر میں حضرت لدھیانوی اور دیگر اکابرین کے ساتھ ساتھ رہے۔ ان کی خدمت کی۔ گلگت شہر اور اس کے مضافات میں حضرت نے کئی اداروں کا بنیاد رکھا۔ کئی مساجد میں بیانات کیے۔۔بروز جمعہ مرکزی جامع مسجد گلگت میں نماز جمع ادا کی۔ نماز کے بعد حضرت نے مجمع عام میں لوگوں سے فرمایا کہ '' آپ کے گلگت میں قاضی نثار احمد میرا نمائندہ ہے۔میں نے انہیں بہت پہلے خلافت سے سرفراز کیا ہے، مجھے ان پر اعتماد ہے لہذا آپ بھی اعتماد کرو اور ان سے بھرپور اصلاحی فائدہ اٹھاؤ۔آج ایک بار پھر میں انہیں آپ سب کے سامنے خلافت و

نیابت سے نواز رہا ہوں''۔اس مجمع میں ہزاروں لوگ تھے۔ مسجد کے دروازے تک چادروں کے ذریعے ایک لائن لگائی گئی اور یوں لوگوں نے ان چادروں کے سروں کو پکڑا اور ہزاروں لوگوں نے حضرت لدھیانوی سے بیعت کی۔الحمد للہ اکابرین دیوبند کا فیض پوری دنیا کی طرح گلگت میں بھی پہنچا اور خوب پہنچا۔

قاضی نثار احمد نے یہ واقعہ مجھے کئی بار سنایا کہ '' ایک دفعہ میں نے حضرت لدھیانوی رحمہ اللہ سے عرض کی کہ '' گلگت اور ہمارے حالات تو آپ کے سامنے ہیں لہٰذا آپ ہمیں خصوصی دعاء کریں، تو حضرت نے فرمایا '' بھائی تمہیں تو تھوک کے حساب سے دعائیں کرتا ہوں''۔ یہ اعتماد کا مظہر تھا۔بقول قاضی نثار احمد کے کہ '' گلگت میں مرزائیوں کا جو معبد خانہ ہے اس کو 1974ء میں اباجان (حضرت قاضی عبدالرزاق فاضل دارالعلوم دیوبند) نے توڑا تھا، تاہم بھٹو صاحب کی حکومت تھی اس پر قبضہ نہ ہو سکا۔ حکومت نے ان کی طرف داری کی اور انہیں تحفظ دیا۔ جب میں نے اس پر قبضہ کے حوالے سے حضرت لدھیانوی سے بذریعہ خط مشاورت اور اجازت چاہی تو حضرت نے مشروط اجازت دی تھی کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو ضرور قبضہ کیجئے گا۔ شاید حضرت کے خطوط سنسر ہوتے تھے۔ حضرت نے مجھے جو خط لکھا تو وہ وزارت داخلہ میں پہنچ گیا۔ وزیر داخلہ نے وہ خط وزیر امور کشمیر کو بھیجا، اس نے آئی جی گلگت کو، آئی جی نے ایس پی اور ایس پی نے ڈی ایس پی کو بھیجا۔ ڈی ایس پی رجی رحمت اور ایس ایچ او

امتیاز وہ خط لے کر میرے پاس آئے۔اب وہ صرف خط نہیں رہا تھا بلکہ ایک ضخیم سی فائل بن گئی تھی۔انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ قبضہ ضرور کریں مگر ابھی نہیں۔آج بھی پولیس ریکارڈ میں یہ فائل موجود ہے''۔جب بات وظائف واذکار کی چلی تو قاضی نثاراحمد نے بتایا کہ حضرت نے مجھے جو وظائف واذکار دیے تھے وہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے تھے ،وہ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں''۔ حضرت لدھیانوی نے قاضی نثاراحمد کو تصدیق نامہ بھی مرحمت فرمایا تھا،حضرت سے رابطے کا سلسلہ بذریعہ خطوط ہوا کرتا اور مفتی سیف الدین استوری کے ذریعے بھی رابطہ جاری رہتا۔مفتی سیف الدین اس وقت کراچی میں طالب علم تھے ۔ وہ حضرت لدھیانوی اور قاضی نثاراحمد کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دیتے۔

شہید اسلام حضرت لدھیانوی کی وفات کے بعد قاضی نثاراحمد نے اور دو بزرگوں سے اصلاحی رشتہ قائم کیا۔جن دو حضرات سے اصلاحی رشتہ قائم ہوا، وہ علمائے دیوبند کے چمکتے ہوئے تارے اور سرخیل تھے۔اللہ تعالی نے انہیں علم و عمل سے خوب نوازا تھا۔چہار دانگ عالم ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ان میں پہلے بزرگ وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوال والے تھے جبکہ دوسرے بزرگ اور ولی اللہ، ختم نبوت کے امیر حضرت پیران پیر خواجہ خان محمد صاحب نوراللہ مرقدہ تھے۔ قاضی نثاراحمد نے ان دونوں بزرگوں سے بھی خوب استفادہ کیا۔ان کی خدمت میں حاضری دی۔ان کے بتائے ہوئے وظائف واعمال پابندی

سے کیے۔ میرے استفسار پر بتایا کہ ''حضرت شہید اسلام علامہ لدھیانوی کی وفات حسرت آیات کے کافی عرصہ بعد میں نے محسوس کیا کہ کسی بزرگ سے رشتہ قائم کیا جائے۔ اگرچہ حضرت کے بتائے ہوئے معمولات پر پابندی کے ساتھ کاربند تھا تاہم پھر بھی ضرورت محسوس ہوئی تو نظریں جا کر حضرت قاضی مظہر حسین صاحب پر ٹکی۔ حضرت قاضی صاحب نوراللہ مرقدہ سے تعلق تو والد گرامی (قاضی عبدالرزاق) کے دور سے تھا، تاہم اب باقاعدہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور اصلاحی تعلق قائم ہوا۔ حضرت قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ کی وفات کے چار سال بعد پھر دوبارہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق قائم ہو، اب کی بار دل ودماغ نے فیصلہ دیا کہ امیر ختم نبوت حضرت مولانا خواجہ خان محمد نوراللہ مرقدہ سے تعلق قائم کیا جائے۔ پھر حضرت سے بھی باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم ہوا۔ حضرت کی محفلوں میں شرکت کرتا رہا، اب حضرت کی وفات کے بعد فی الحال کسی سے اصلاحی تعلق قائم نہیں کیا۔ حضرت لدھیانوی کے بتائے ہوئے وظائف واذکار اور معمولات کا خوب پابند ہوں۔ حضرت کا جو دوازدہ وظیفہ ہے جسے حضرت سہ ازدہ کہتے تھے کا معمول باقاعدہ ہے۔ باقی میں نے نفس کشی اور باطنی طاقت حضرت لدھیانوی سے زیادہ حاصل کی۔ حضرت کی طرف سے مجھے باقاعدہ خلافت بہت پہلے ملی ہے۔ الحمدللہ علی ذالک''۔

قاضی نثار احمد نے اپنے پیر و مرشد حضرت لدھیانوی شہید کے حوالے سے کئی

تفصیلی واقعات مختلف اوقات میں مجھے سنائے، حضرت لدھیانوی کے لکھے ہوئے کئی خطوط، تحریریں اور تصدیق نامہ قاضی نثار احمد کے پاس محفوظ ہیں، عجلت میں میسر نہ آسکے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد اور مربی و استاد اور محسن اعظم پر ان کی وفات کے بعد ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ جو بینات شہید اسلام خصوصی نمبر میں شائع ہوا ہے۔ ان کی زبانی ان کے مرشد کی کہانی سنتے ہیں۔

گمراہوں، فتنہ پروروں اور منکروں کو ''بینات'' کے ذریعہ للکارنے والے، شرعی'' سوالات اور دینی اشکالات کا مختصر ترین جملوں میں جامع و مانع اور مسکت جواب دینے والے، چار سلسلوں میں کمال رکھنے والے، سلف کے مسلک و مشرب، فکر و نظر کے عملی نمونہ، ہر مسئلہ و ہر معاملے میں نہایت اعتدال و توازن رکھنے والے، ''انزلوا الناس علی منازلہم'' اور'' کلموا الناس علی قدر عقولہم'' کے ایسے عامل و ماہر کہ ہر ملنے والے، ہر دیکھنے والے، ہر سننے والے آپ کا فریفتہ و گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر گونہ زخمی اور ہر گونہ بیمار کو مرہم شفاء رکھنے اور مجرب نسخہ دینے والا، ہر دُکھے دل کا ملجا و ماویٰ، رخسار پر ہاتھ پھیر کر یا پیار کی چپت لگا کر داڑھیاں بڑھانے کی کرامت رکھنے والا، حکیم العصر، فہیم الدہر، دین حق پھیلانے، رضا الٰہی کی طلب میں دشوار گزار، طویل ترین اور دور دراز اسفار کرنے والا، بطل حریت، سلوک و احسان کے میدان میں اعتماد و ہمت کے مالک، افراط و تفریط سے دور، نہایت

محتاط، متواضع، متوازن اور معتدل، فیض و توجہ اور دعاؤں میں ایسے فیاض، خصوصاً رمضان المبارک میں ''کالریح المرسلہ'' کے مصداق، مردم شناس، معبر، قیافہ دان، جلال و جمال کے حسین امتزاج، سفر میں خدام اور عزیزوں کے ساتھ نہایت ہنس مکھ رہنے والے، الہامی، شگفتہ اور دل ربا انشاپرداز، دشمن کے مقابلے میں تیغ براں، کسی کو دیکھا کہ یہ شہباز ہیں تو قابو میں رکھنے کا وظیفہ دیا، کسی کو دیکھا کہ جوان تیز اُڑان کا مالک ہے تو پر کاٹ کر قابو میں رکھا، کسی کو دیکھا کہ نالائق و ناکارہ ہے ہے اور ضرورت ہے کہ کچھ کام کا بنے، دونوں کان پکڑ کر سیدھا کیا، کچھ کو بچا ہوا کھانا، پانی اور آئس کریم دے کر اپنا گرویدہ بنا کر سلیقہ اور ادب سے نوازا۔ غرض چن چن کر، دیکھ دیکھ کر، پرکھ پرکھ کر نہایت جود و فراخدلی سے افراد سازی اور اصلاح فرماتے، اسلاف کے قافلے کے ساتھ جوڑتے، اپنا اعتماد عنایت فرما کر حوصلہ و ہمت سے نوازتے، دعاؤں کی درخواست کی جاتی تو فرماتے تھوک سے دعائیں دوں گا۔ واہ کیا عجیب دعا گو اپنے متعلقین کے لیے خصوصا جملہ مسلمانوں کے لیے دعا کے مرکز تھے۔ نرم مزاجی کے سمندر، خلاف شرع و سنت کوئی عمل دیکھتے، ناموس رسالت و ناموس صحابہ پر کسی کو حملہ آور دیکھتے تو فوراً جلال کے پہاڑ بن کر مدافعت و تعاقب کرکے ٹھکانے لگاتے:

مشفق لکھوں شفیق لکھوں یا لکھوں صنم
جناب کے القاب میں حیراں ہے قلم

اِن اَن گنت و بے شمار صفات وکمالات کا حامل یہ بطل حریت، صاحب صفا بھی اپنی تمنا و دعا مستجاب سے اس سعادت عظمیٰ سے ہمکنار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور ہمیں داغ مفارقت دے گیا:

موت صاحب دل جہاں را دلیل کلفت است

(شمع چوں خاموش گردد داغ محفل میشود''۔ (ماخوز از بینات شہید اسلام نمبر، ص ۱۴۲

قاضی نثاراحمد صاحب کے دینی خدمات کا سلسلہ کافی وسیع ہے۔ تنظیم اہل سنت والجماعت گلگت بلتستان و کوہستان کے مسلمانوں کی نمائندہ مذہبی جماعت ہے۔اس کی بنیاد فاضلین دارالعلوم دیوبند نے رکھی ہے۔ اس کے بانی وامیر اول قاضی نثاراحمد کے والد ماجد حضرت قاضی عبدالرزاق صاحب ہیں۔1994ء سے لے کرتاحال تنظیم کی امارت قاضی نثاراحمد کے پاس ہے۔گلگت بلتستان کے 313 جید اور نامور علماء کرام نے طویل غور و خوض اور مشاورت کے بعد متفقہ طور پر تنظیم اہل سنت کی امارت اومرکزی جامع مسجد کی خطابت کی ذمہ داریاں قاضی نثاراحمد کے سپرد کی۔ سقوط طالبان کے دوران پاکستان بھر میں امریکہ کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا۔ گلگت بلتستان اور کوہستان کے علماء و عوام نے بھی طالبان افغانستان کے ساتھ یکجہتی کے طور پر شاہراہ قراقرام بلاک کیا۔ دیامر میں گلگت بلتستان کے تمام علماء جمع ہوئے۔ ایک اتحاد قائم ہوا۔اور ایک تنظیم کی

شکل دی گئی، جس میں کوہستان کے مولانا عبدالحلیم امیر اور قاضی نثار احمد نائب امیر مقرر ہوئے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ کے لیے گلگت بلتستان سے ایک رکن منتخب کیا گیا۔ وہ سعادت بھی قاضی نثار احمد کے ہاتھ آئی۔ پورے گلگت بلتستان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مولانا نذیر اللہ خان رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جامعہ نصرۃ الاسلام کا انصرام وانتظام اور اہتمام قاضی نثار احمد کے پاس ہے۔ 2008ء میں گلگت شہر میں جامعہ عائشہ صدیقہ کے نام سے بنات کا ایک مدرسہ قائم کیا جہاں درجہ حفظ سے لے کر دورہ حدیث اور ابتدائی سکول کی تعلیم وسیع پیمانے پر دی جاتی ہے۔ اب یہ ادارہ گلگت بلتستان میں بنات کا سب سے بڑا مدرسہ بن چکا ہے۔ 2011ء کو گلگت بلتستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ کسی بھی دینی مدرسے سے باقاعدہ دینی، اخلاقی، اصلاحی، ادبی اور صحافتی مجلے کا اجراء کیا اور یوں قاضی نثار احمد '' سہ ماہی نصرۃ الاسلام کا مدیر اعلیٰ اور رئیس التحریر ٹھہرے۔ اور راقم الحروف کو مدیری کی ذمہ داریاں ملی۔ '' 1992ء سے 2005ء تک جامعہ نصرۃ الاسلام میں مسلسل تدریس کی۔ درجہ اولی سے لے کر دورہ حدیث تک کتب پڑھائی۔ کئی سال جامعہ نصرۃ الاسلام میں دورہ تفسیر کرایا۔ 2005ء کے بعد جزوقتی تدریس کرتے ہیں۔ قاضی نثار احمد نے بتایا کہ '' میرے تمام اساتذہ بہت محنتی اور مشفق تھے مگر میں سب سے زیادہ اپنے استاد

محترم قاضی حمیداللہ جان سے سے متاثر ہوں۔اللہ تعالی نے انہیں بے شمار صفات کے ساتھ فنِ تدریس سے خوب نوازا تھا۔بڑے بڑے علمی مسائل چٹکیوں میں سمجھا دیتے تھے۔ان کا انداز تدریس مجھے بے حد پسند تھا''

قاضی نثاراحمد تین دفعہ گرفتار اور ایک دفعہ ہوم اریسٹ ہوا۔1993 کو ابھی انہیں کوئی بڑی ذمہ داری نہیں ملی تھی مگر اس کے باوجود انہیں گرفتار کیا گیا۔اس وقت قاضی نثار کے ساتھ مولانا لقمان حکیم، مولانا نذیراللہ خان، مولانا عنایت اللہ، رسول میر، اور راجہ نثار ولی بھی گرفتار ہوئے۔ 2005ء کے فسادات کے بعد انہیں گرفتار کرکے اڈیالہ جیل بھیج دیا گیا، جہاں 6 ماہ قید رہے۔2012ء میں تین ماہ گھر میں مقید رہے، حکومت کی طرف سے ناکہ بندی کرکے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگادی گئی اور 16 MPO کے تحت گرفتار کرکے جیل بھیج دیے گئے تھے ان کے تمام رفقاء اور احباب کو جو تین ماہ بعد رہا ہوئے۔ قاضی نثاراحمد نے باتوں باتوں میں ایک تلخ واقعہ سنایا کہ'' 2007 میں ، میں سخت بیمار تھا، بسترعلالت پر تھا، میرا سخت مطالبہ تھا حکومت سے کہ امن معاہدے پر عمل درآمد کروایا جائے۔میں نے بیماری کے باوجود گرفتاری دی۔پھر بھی میرے گھر پر گولیاں چلائی گئی، میرے محافظ کو شدید زخمی کیا۔پورا محلے کو خوف زدہ کیا گیا۔میں حیران تھا کہ انتظامیہ سے مکمل تعاون کے باوجود ہمارے ساتھ ناروا سلوک کیا جارہا تھا''۔اپنی زندگی کا سب سے خوشگوار واقعہ یوں سنایا۔

گلگت میں ایک فتنہ اٹھایا گیا کہ نصاب تعلیم سے صحابہ کرام کے نام نکالے جائے۔چونکہ اہل سنت کو یہ مطالبہ کسی بھی قیمت پر منظور نہیں تھا،ہم نے ہر سطح پر محنت شروع کی، ہم نے ڈائیلاگ کے ذریعے سمجھایا کہ یہ ناممکن ہے مگر ایک فریق نہ صرف مصر تھا بلکہ قومی سلیبس سے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہمااور دیگراصحاب رسول کے ناموں کو خارج کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنے لگا۔چونکہ مشرف کا دور تھا،مشکلات کے باوجود ہم نے سخت مخالفت کی، جس کی وجہ سے مجھے23جون 2001 ء کو گرفتار کیا،فوجیوں نے اپنے پاس رکھا، میرے آنکھوں میں پٹیاں باندھی گئی تھی، اور طرح طرح کی سزائیں دی گئی، ایک ایسے دُرے سے پٹائی کی گئی جس کے مارنے سے جسم کا گوشت اُدھڑ جاتا تھا، میرے جسم کے مختلف حصوں سے گوشت اُدھڑگیا تھا۔یہ سب کچھ میں نے ججوں اور پولیس والوں کو بھی دکھایا تھاجب وہ میرے پاس جیل میں آئے تھے تفتیش اور جسمانی معائنہ کرنے کے لیے۔ایک دن میری آنکھوں میں کالی پٹیاں باندھی گئی، چھ فوجی کمانڈو میرے کمرے میں آئے اور انہوں نے لاتوں، مکوں اور ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا۔بہت زیادہ مارا۔میں نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔آنکھوں سے پٹی سرک گئی تھی۔جب وہ جانے لگے تو کمرے سے باہر ایک دوسروں کو دھکے دیتے ہوئے پہلے نکلنے کی کوشش کررہے تھی کہ کہیں میں انہیں دیکھ کر پہچان نہ جاؤں۔مجھے ان کی بزدلی اور خوف پر بے حد مزہ آیااور میں خوب محظوظ ہوا۔اس دن میں ظہر کی نماز بھی نہ پڑھ سکا۔کیونکہ اُٹھ نہیں سکتا تھا۔یہ میری

زندگی کا سب سے خوشگوار واقع ہے، اب تک وہ منظر دیکھتا ہوں تو دل مسرور ہوتا ہے۔قرآن کریم میں ہے نا کہ ''وجعلنا فی قلوبھم الرعب''۔اللہ نے بھی ان فوجی بھائیوں کے دلوں میں میرا رعب ڈالا ہوا تھا تو اس لیے وہ اتنے ڈر کر بھاگ رہے تھے، ورنہ میں تو باندھا ہوا ان کی قید میں تھا۔میری گرفتاری پر عوام نے حکومت کا جینا حرام کر دیا اور پورے گلگت کو جام کر لیا تھا۔27 جون کو عوام کے شدید دباؤ پر مجھے غیر مشروط طور پر رہا کیا''۔

قاضی نثار احمد نے اپنے مطالعے کے اوقات بتاتے ہوئے کہا کہ '' میں اکثر مطالعہ نمازِ فجر سے پہلے اور رات کے آخری پہر میں کرتا ہوں'' وہ اب تک کئی ممالک اسلامیہ بالخصوص افغانستان، عرب امارات، ترکی اور سعودی عرب کا سفر کر چکے ہیں۔ کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں علمی تقاریر کی ہیں۔چار دفع حج کی سعادت میں حاصل ہوئی ہے۔ مولانا یوسف لدھیانوی کے دیے ہوئے وظائف ابھی بھی پابندی سے کرتے ہیں۔ قارئین! مجھے یہ بتانے میں کوئی باک نہیں کہ قاضی نثار احمد کے دیگر دینی سلسلے تو باقاعدگی کے ساتھ چل رہے ہیں مگر اتنی مضبوط نسبت ہونے کے باوجود بھی ابھی تک انھوں نے باقاعدہ تصوف و طریقت یعنی پیر مریدی کا سلسلہ شروع نہیں کیا ہے۔اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر میرے ذہن میں جو آ رہا ہے وہ ہے کہ اس حوالے سے گلگت بلتستان کی زمین بانجھ ہے۔گلگت کے مسلمان قاضی نثار احمد سے بڑے (پیمانے پر کوئی روحانی (تصوف و طریقت

استفادہ نہیں کرپا رہے ہیں، شاید خود قاضی صاحب بھی نہیں چاہ رہے ہیں کہ بڑھاپے سے پہلے خانقاہی سلسلہ جاری کیا جائے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔تاہم تزکیہ نفس اور سلوک و طریقت کے حوالے سے گلگت بلتستان کی زمین بانجھ ہے۔ قاضی نثار احمد کو اس حوالے سے سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے۔

سفر اور حضر میں مجھے قاضی نثار احمد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔وہ ایک انسان ہیں وہ بھی اکیسویں صدی کے۔ خدا کے حبیب نے ارشاد کیا کہ انسان خطاء کا پتلا ہے۔اگر انسان سے خطا نہ ہوتی تو پھر وہ کوئی خلائی مخلوق ہو سکتی ہے مگر انسان نہیں۔ قاضی نثار احمد کے اندر مجھے جو نظر آیا وہ یہ ہے کہ ''سفر وحضر یں وہ تہجد کی نماز قضاء نہیں کرتے۔ دوران سفر اپنے وظائف کا خوب پابند ہیں۔ ڈر اور خوف نام کی کوئی چیز اللہ نے ان کے دل میں رکھا ہی نہیں ہے۔جس کے دل میں اللہ کا ڈر اور خوف ہو تو باقی سارے خوف اور ڈر نکل جاتے ہیں۔لالچ نام کی کوئی چیز نہیں۔بے حد مہمان نواز ہیں، بارہا بڑے بڑے حکومتی عہدوں کی پیش کش ہوئی مگر قریب سے بھی نہیں گزرے۔ گلگت بلتستان کی پوری اہل سنت عوام ان پر جان نچھاور کرتی ہے۔ علماء کرام ان کی آواز پر کوہستان سے یاسین تک لبیک کہہ کر باہر نکلتے ہیں۔ مجاہدین انہیں اپنا رہنما سمجھتے ہیں اور تبلیغی اپنا سرمایہ۔ مساجد و مدارس والے اپنے اداروں کی افتتاح کے لیے ان کے علاوہ کسی کو دعوت دینا پسند نہیں کرتے۔ سرکاری ملازمین بھی مشکل

کی گھڑی میں آپ کے در پر آ دھمکتے ہیں۔کالج یونیورسٹی کے طلباء کا تانتا باندھتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی آمد تو روزانہ کا معمول ہے۔یقین جانیں ! ان کا گھر ودفتر مرجع خلائق ہے وہ گلگت بلتستان کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

قاضی نثاراحمد کئی امتیازی خصوصیات کے مالک ہیں۔جذبہ خدمت خلق، دین متین کی خدمت کا نیک جذبہ اور بالخصوص اہلسنت عوام کے حقوق ،ان کی محرومیوں اوران کے ساتھ ہونی والی سماجی ناانصافیوں کے حوالے سے ان کا دل کڑھتا رہتا ہے اور ان کے لیے نیک جذبات سے مملوء ہے۔وہ اہل سنت کے لئے کسی بھی حدتک جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔میں نے خود کئی غریب اہل سنت کے لیے وزیروں، مشیروں اور بیوروکریسی کے ساتھ لڑتے جھگڑتے اور تلخ کلامی کرتے دیکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاضی نثاراحمد بے پناہ جرأت، عزم، حوصلہ اور جذبہ کے ساتھ نہایت تندہی اور جفاکشی کے ساتھ اہل سنت عوام کے لیے اہم کارنامے انجام دیتے آرہے ہیں جو عموما دوسروں کے لیے محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس جہد خیر میں اس کے معاصرین میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔''من تواضع للہ رفع اللہ'' یعنی جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے سربلندی اور عظمت سے بہرور کرتا ہے۔

قاضی نثاراحمد کی ایک اچھی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر کس و ناکس سے انتہائی خندہ

پیشانی اور خوش دلی سے ملتے ہیں۔دوران کھانے وہ خود ہر ایک کی پلیٹ میں بوٹیاں اُٹھا اُٹھا کر ڈالتے ہیں، خوب کھلاتے پلاتے ہیں۔اپنے رفقاء اور ساتھیوں کی تلخ باتوں کو خوش دلی سے سنتے ہیں۔۔برداشت کرجاتے ہیں۔ہنس کر.بڑے.بڑے کام کرواتے ہیں۔فون سنتے ہیں اور وقت بے وقت اپنے ساتھیوں کو فون بھی کرتے ہیں۔مدرسے کے طلبہ کے بھی فون سنتے ہیں اور فوراً ان کی شکایات کا نوٹس لیتے ہیں۔مجھے چونکہ ان کے ساتھ تعلیمی اور تحریری کام زیادہ کرنے پڑتے ہیں تاہم ان کے تحریکی کاموں سے میں نے اپنے آپ کو بالکل الگ رکھا ہوا ہے، بعض دفعہ میں انہیں سخت سناتا ہوں، تلخی اور ترشی کے ساتھ مختلف امور میں اپنی بساط کے مطابق مشورے دیتا ہوں، تو وہ ہنستے ہیں، قہقہ سے بات کہی اور موڑ دیتے ہیں۔کبھی فون بند کرتے ہیں۔کبھی کبھار غصے تک کی بھی نوبت آجاتی ہے۔اگر وہ سمجھتے ہیں کہ میرا غصہ کافور نہیں ہوا ہے، تو وہ ایک sms سینڈ کرتے ہیں۔کبھی کبھار کوئی سوٹ دے کر اور کبھی باہر سے کوئی قیمتی مزاحیہ قلم تحفے میں لاکر، اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔میں اکثر ان کے ساتھ اختلاف کرتا ہوں، اور یہ اختلاف ان کے سامنے بلکہ تمام احباب کار و اساتذہ کے سامنے کرتا ہوں مگر وہ ناراض ہونے کے بجائے مجھ پر کوئی پھبتی کَستے ہیں اور بات ٹال دیتے ہیں۔اکثر ہنس کر سارے کام نکلوادیتے ہیں۔میں منہ پھٹ آدمی ہوں جو منہ میں آیا کہہ دیتا ہوں مگر وہ اپنا کام کرواکے ہی دَم لیتے ہیں۔ایک دفعہ جامعہ میں طلبہ کی تعلیم و تربیت پر جامعہ کے دو اساتذہ حدیث

قاضی صاحب اور میری ایک اہم میٹنگ ہوئی۔ دوسرے اساتذہ کو نہیں بلایا گیا تھا۔کافی، بحث کے بعد میں نے دو ٹوک اور سخت لہجے میں آئندہ سال تعلیمی ترتیب کے حوالے سے اپنی معروضات بیان کی۔ایک استاد نے نفی میں سرہلایا اور دوسرے نے کہا کہ گلگت کے پہاڑوں میں یہ ممکن نہیں، حالانکہ میں بالکل سادہ سی بات کر رہا تھا۔جب ان کے منہ سے میں نے یہ سنا تو میں غصے میں اُٹھ گیا اور کہا کہ میں آپ حضرات کے ساتھ نشست نہیں کرسکتا۔ قاضی صاحب نے کہا ''یار اتنی جلدی غصہ کرنے والی کون سی بات ہے، کچھ باتیں اپنی منواؤ اور کچھ ہماری مانو، ہم پرانے ذہن کے مالک لوگ ہیں۔ یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑا اور دوبارہ بٹھایا۔ سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ رضا الٰہی کے لیے مخلصانہ طور پر دینی، تعلیمی وسماجی خدمات انجام دیتے ہیں اللہ رب العزت انہیں دارین میں فلاح سے نوازتے ہیں۔

اکابر علماء دیوبند ان پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ مولانا عبداللہ شہید، مولانا مفتی احمدالرحمان شہید سے گہرے مراسم تھے۔ مولانا شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مفتی رفیع عثمانی صاحب،ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب، مولانا سمیع الحق صاحب، مولانا زاہدالراشدی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب،ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، قاری حنیف جالندھری صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب اور دیگر کبار علماء سے قریبی تعلقات ہیں۔ وہ حضرات بھی قاضی نثاراحمد کو بے حد عزت دیتے

ہیں۔عالم اسلام کا عظیم مجاہد اسامہ بن لادن سے افغانستان جا کر ملاقات کی۔ کشمیر کے سردار عتیق تو بے حد عزت دیتے ہیں۔دیگر سیاسی زعماء بھی قاضی صاحب کی بات غور سے سنتے ہیں۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمان صاحب قاضی نثاراحمد کی بے حد توقیر کرتے ہیں۔ مجھے خود دو مجلسوں میں اس کا مشاہدہ ہوا ہے۔ قاضی نثاراحمد بڑے خوش قسمت نکلے ہیں کہ انہیں تبلیغی جماعت کے مرکزی مبلغ حضرت مولانا طارق جمیل صاحب،جہادکے معروف رہنما مولانا مسعود اظہر صاحب، دفاع صحابہ کے مجاہد اعظم مولانااعظم طارق صاحب شہید اورمیدانِ سیاست کے امین مولانا فضل الرحمان صاحب کے '' پیر بھائی'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قاضی نثاراحمد نے ملک کی چار عظیم دینی درسگاہوں سے علمی اور تین عظیم شخصیات سے روحانی فیض کیا۔صاحب علم ودل جانتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی نسبتیں ہیں۔ہم سب جانتے ہیں کہ علوم نبوت و نسبت نبوت بہت بڑی چیز ہے۔ جن کی علم اور اصلاح کی نسبت رسول اکرم سے ہو،بڑی سعادت کی بات ہوتی ہے۔انہیں رب کریم کے بے حد مشکور ہونا چاہیے۔انہیں آج کی مادیت پرست دنیاکی بے رغبتی اور ناقدری دیکھ کرمایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اصحاب علم ودل کی قدر ومنزلت اور مقام ومرتبہ اورشان جلالی سے نابلد

: ہیں۔ بہرصورت شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان اشعار سے اجازت چاہونگا

رضینا قسمت الجبار فینا

لنا علم وللجہال مال

فان المال یفنی عنقریب

وان العلم باق لایزال

☆☆☆☆☆

والسلام مع الاکرام: حافظ امیر جان حقانی

بنیاد کا پتھر

تبصرہ وتعارفِ کتب

کتاب کا نام: بنیاد کا پتھر

تصنیف: مولانا عبدالقیوم حقانی

تاریخ طباعت: جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰۱۲ئ

ضخامت: 272 صفحات

قیمت: درج نہیں

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

بنیاد کا پتھر اپنے موضوع پر ایک اچھوتی اور البیلی کتاب ہے۔کتاب کو ناول کہنے کی قطعاً گنجائش نہیں مگر لطف و سرور افسانے سے کم بھی نہیں۔کتاب اول تا آخر دیکھی، اسلامی ادب میں ایسی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔اصاغر و گمنام کارکنوں، مخلص احباب ورفقاء اور جانثاران رفقاء زندگی پر لکھنا کمیاب ضرور ہے مگر یہ روایت بالکل ناپید نہیں۔اس کتاب کا اصل موضوع دینی اداروں، سماجی و سیاسی تحریکات میں جو لوگ مرکزی کردار ادا کرتے ہیں مگر ظاہراً و باہراً

ان کا علم خواص کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا ہے۔ آج کے جدید میڈیائی دور میں تو ہر چیز فوراً منظر عام پر آجاتی ہے مگر سچ یہ ہے کہ آج بھی کسی ادارے کی تعمیر و ترقی اور انتظام و انصرام، کسی سیاسی پارٹی کی تنظیم و ترتیب اور کسی انقلابی کارواں کے نظم و ضبط یں بنیادی طور پر بہت ہی قلیل لوگ خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان اقل لوگوں کی حد درجہ محنت، کام سے شغف، خلوص و للّٰہیت اور بے انتہا ذہانت ان اداروں کو بام عروج تک پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ ایسے ادارے، تنظیمیں، پارٹیاں کامیابی و کامرانی کے بعد ایسے جواہرپاروں اور مخلص و گمنام کارکنوں کو تکمیلِ مقصد کے بعد خاموشی سے راستے سے ہٹا دیتی ہیں۔ یعنی قائد یہاں بھی اندھے ہوتے ہیں۔ کسی معمولی کمزوری، ہلکی سی لغزش، کسی چمچے کی غلط رپورٹ سے ان کی تمام محنت اور خلوص پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ بعض دفعہ تو ایسے ایسے '' عظیم ''لوگوں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے اور باقاعدہ تشہیر کی جاتی ہے کہ انسان کانپ جاتا ہے۔ اس رویے سے بہر حال گریز کیا جانا چاہیے۔ اس کتاب کا مرکزی محرک بھی ایسے ہی چند مخلص کارکن بنے ہیں جن کی شبانہ روز محنت سے ادارہ ترقی و تعمیر کے منازل طے کرتا گیا ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی داد اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان مخلصان کی خدمات کو اچھے وقتوں میں فراموش کرنے کے بجائے پوری کتاب لکھ کر ان کی محبت و خلوص کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اَمر کردیا ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں مجموعی طور پر ایسے جفاکشوں اور

اداروں کی تعمیر وترقی، تزئین وارائش، انتظام وانصرام اور نظم وضبط میں ''بنیاد کا پتھر'' بننے والوں کا انجام کافی حدتک ناخوشگوار ہوتا ہے۔ مغربی دنیا کی ترقی کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے جفاکش اور قوم وملت اور اداروں کے لیے قربانی دینے والوں کی کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ان کو فکر معاش سے تاحیات آزاد رکھا جاتا ہے۔ مشرقی دنیا میں یہ عنقاء ہے اور اس کا نتیجہ بھیانک ہے۔ مغربی دنیا میں ایسے جاندار کانامے انجام دینے والوں کو مختلف ''خطابات'' یا ''نوبل انعام'' کی شکل میں ایک بھاری معاوضہ دیا جاتا ہے تاکہ مزید کارنامے وجود میں آسکیں۔ہم مغرب کی نقالی غلط چیزوں میں تو سرعت کے ساتھ کرتے ہیں مگرایسی اچھی باتوں کی تقلید سے کنی کتراتے ہیں۔

صاحب کتاب مولانا عبدالقیوم حقانی کا ''رفیق سفر'' جگہ جگہ ان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کبھی جامعہ ابوھریرہ اور کبھی ٹرسٹ کا حساب وکتاب کرتا نظرآتا ہے تو کبھی رفیق عزیز اور ان کے والدین جامعہ کے مختلف شعبوں کی ''چوکیداری'' کرتے نظرآتے ہیں۔ مولانا کا'' رفیق عزیز'' ہمہ وقت خدمت میں مصروف ہوتے ہیں۔ ''رفیق عزیز'' روز عید بھی خوشی خوشی تصنیف وتالیف اور کمپوزنگ کا کام کرتا نظرآتا ہے، اس سے نہ ان کے چہرے پر بل آتے ہیں نہ ان کا چہرہ شکن آلود ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کام کا بہانہ بناکر، نہ کسی عزیز کی ملاقات کا چکمہ دے کرکام سے جی چراتے ہیں۔ ''رفیق عزیز'' ان خدمات کی عوض کوئی بڑی خواہشات

بھی نہیں پاتا ہے۔بس اتنی سی خواہش ہوتی ہے کہ ''علوم دینیہ کے مطالعہ کا موقع،ادارے کی ہمہ وقت خدمت،ایک چھوٹا سا ملکیتی بیتِ عنکبوت،قرب اساتذہ اور رضائے رحمٰن''بس یہی تو حاصل زندگی یعنی دارین میں کامیابی۔ہاں ''رفیق عزیز'' کو ان کی خدمات کا صلہ بھی ملتا ہے اور ایسا صلہ جو ان کی وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے دنیا میں نیک کاموں کا صلہ ملنا ضروری نہیں مگر آج کا جدید دور متقاضی ہے کہ صلہ ملنا چاہیے، کیونکہ احسان کا بدلہ احسان ہی سے اتارا جاتا ہے۔روزجزا تو رب رحمٰن از خود صلہ دیں گے۔جب انہیں تمام سہولیات مہیا کی جاتیں ہیں تو''رفیق عزیز''کام ،کام اور کام کی پالیسی اپنا لیتے ہیں۔ان کی انہی خدمات کے صلے میں ''رفیق عزیز''اپنی مخلصی، جفاکشی کی وجہ سے ایک فکرانگیز، سبق آموز اور علمی وادبی اچھوتی کتاب کا سبب تصنیف وتدوین کا سبب بنے ہیں۔اورجب تک ادبی دنیا میں یہ کتاب پڑھی جائے گی''رفیق عزیز'' کو لوگ پہچانتے رہیں گے۔پیش لفظ مولانا طاہر محمود اطہر، مقدمہ مولانا عبدالمعبود اور حرف مزین کے عنوان سے وقیع تحریرات بھی شامل کتاب ہیں۔کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔دینی و عصری اداروں، سیاسی پارٹیوں اور تحریکی و تنظیمی کام کرنے والے لیڈروں اور کارکنوں کو ایک دفعہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔تاکہ انہیں معلوم ہو کہ کون کہاں اپنا کردار ادا کر رہا۔ ہے اور کون صرف نام و نمود کی حد تک ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔

محبتوں کی زمین، وادیِ غذر کا ایک سفر

رب العزت کا بے انتہا کرم ہے کہ اس نے ہمیں نبی آخری الزماں کے امتی پیدا کیے ، اور آپ ایک ایسی کامل دین لے کر مبعوث ہوئے جو دین فطرت کہلاتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام لمحات یں،دین فطرت انسان کی کامل و اکمل رہنمائی کرتا ہے۔ آپ کی حیات طیبہ اور آپ کے جانثار صحابہ کی زندگی میں ہمیں سفر اور حضر کے لیے رہنما اصول ملتے ہیں۔ آپ اور آپ کے جانثاروں نے بے شمار اسفار کیئے ہیں۔

نبی آخرالزماں نے اپنے رب کے حکم پر نبوت کا اعلان کیا تو اہل مکہ آپ اور آپ پر ایمان لانے والوں کے جانی دشمن بن گئے ، باآآخر آپ کو اپنے احباب سمیت اپنے آبائی وطن کو خیرآباد کرنا پڑا۔ اور وہ خوبصورت دھرتی چھوڑنا پڑا جس میں آپ کا بچپن اور لڑکپن گزرااور عنفوان شباب کی کئی بہاریں گزری تھیں ، اور وہاں خدا کا گھر اپنی پوری عظمت اور جلال و دبدبہ کے ساتھ موجود تھا۔ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا یہ سفر ناقابل شکست عزم ، غیر متزلزل استقامت ، عدیم المثال ایثار اور بے نظیر قربانی کا مظہر ہے۔ ظلم اور باطل کے سامنے جھکنے کے بجائے اس کے مقابلے میں شعور ، یقین اور عزم کے

ساتھ کھڑا ہونے کا تاریخی اعلان ہے۔اس لازوال تاریخی اعلان نے مظلوم اور مفلوک الحال انسانی معاشروں بالخصوص کمزور اور لاچاروں کو جدوجہد کا ایک نیا اسلوب عطاء کیااور نصب العین سے مستقل وابستگی کا قرینہ سکھایااور فکرونظر اور عقیدے کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا ایک نرالا باب رقم کیا۔

وادی غذر محبتوں کی سرزمین ہے۔ اس وادی کے دو مشہور اور تاریخی علاقے چٹور کھنڈ اور یاسین کے دو سفر ہوئے۔ یہ دونوں اسفار خالص دینی، فکری، تحریکی اور اصلاحی تھے۔ ان میں محبت و مودت اور امن و آشتی کا عنصر غالب تھا۔ آئندہ سطور میں قاضی صاحب حفظہ اللہ کی معیت میں کیے گئے ان دو تبلیغی اسفار کی مختصر روئیداد بیان کی جائے گی۔ امید ہے کہ ناچیز کی اس ناکام سی کوشش کو آپ پسند فرمائیں گے۔

سفر وسیلہ ظفر

یہ جمعہ کا دن تھا۔ڈگری کالج گلگت میں مسلسل ۳ پیریڈ پڑھا کر تھکا ماندا کالج وین میں بیٹھا ہی تھا کہ سیل فون رنگ رنگ بجنے لگا۔ دوسری جانب قاضی نثار احمد صاحب محو گفتگو تھے۔ علیک سلیک کے بعد فوراً فیصلہ صادر فرمایا کہ بھائی جمعہ کی نماز کے بعد علماء کرام اور کچھ بزرگوں کا ایک وفد چٹور کھنڈ جارہا ہے تو آپ کا ساتھ جانا ضروری ہے۔ میں پس و پیش کر رہا تھا مگر ان

کا انداز آمرانہ تھا اور فیصلہ اٹل، جہاں میرے اعذار نہ چل سکے۔ سیانوں کا قول ہے کہ رواں، رواں اور ہر دم جواں زندگی کے لیے سفر شرط ہے اور اگر یہ سفر مثل جنت نظیر ہو تو وسیلہ ظفر بن جاتا ہے۔ اسی وسیلہ ظفر کے لیے ہم بھی پا بہ سفر ہوئے۔

مرکزی جامع مسجد گلگت میں جمعۃالمبارک کی نماز کی ادائیگی کے بعد گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا ایک قافلہ جامع مسجد سے جامعہ نصرۃ الاسلام کونوداس کی طرف چل پڑا، مجھے بھی بھائی شرافت الدین اور برادرم میر باز کے ساتھ ایک پجارو گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑیوں کا یہ قافلہ پولیس موبائیلوں کی حفاظت میں جامعہ نصرۃ الاسلام کے آفس پر جا رکا۔ میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ دو روزہ دورہ خالصتاً تبلیغی و اصلاحی دورہ ہے۔

مناظر قدرت کے مشاہدے کا حکم

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی مسافر یا سیاح سفر یا سیاحت و تفریح کے لیے روانہ ہوتا ہے خواہ وہ سفر تبلیغی و اصلاحی نوعیت کا ہو یا مناظر قدرت دیکھنے کا، تو اس کے دل و دماغ میں جذبات و خیالات کا ایک طوفان بپا ہوتا ہے۔ اپنے مسکن سے دوری اور اپنے روزمرہ کے کاموں کا جائزہ، اپنے سفر کے مختلف پڑاؤ و مراحل، راستے کی دشواری، بُعد منزل کی دوری کا خیال اور

وہاں کے حالات و ماحول کے بارے میں خدشے و اندیشے ، لوگوں کے رویے ، کام کی نوعیت ، واپسی کا ٹائم فریم اور نہ جانے کیا کیا دل و دماغ کے اسکرین پر ایک فلم کی طرح چلنے لگتے ہیں۔ جن کے طلاطم میں مسافر پابہ رکاب ہوتا ہے۔

قارئین ! اس حقیقت سے بھی کوئی انکاری نہیں کہ مسلم مصنفین اور قلم کاروں نے ہر زمانے میں بڑے دلچسپ اور معلومات افزا سفر نامے لکھے ہیں۔ اور آج بھی یہ روایت زوروں پر ہے۔ کیونکہ خدائے وحدہ لاشریک کی آخری کتاب قرآن کریم فرقان حمید سیر و سیاحت ، مناظر قدرت کے مشاہدے اور خدا بزرگ و برتر کی عظیم الشان نشانیوں پر غور و فکر کی بار بار دعوت دیتا ہے۔

جب میں سفر کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر تیار ہوا تو حکم خداوندی یاد آیا۔ قرآن پاک کی یہ آیات بے اختیار زبان پر آ گئی "سیر و فی الارض" اللہ تعالیٰ کے حبیب نے بھی سفر کو وسیلہ ظفر قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں میں سفر پر جانے کا داعیہ ہمیشہ طاقتور اور مستحکم رہا ہے۔ تھوڑا غور کیا جائے تو تاریخی اہمیت کے بڑے بڑے سفر نامے وجود میں آئے ہیں۔ انظرو ماذا فی السمٰوت والارض پھر کیا تھا کہ رخت سفر باندھ لیا۔

سفر کی مسنون دعائیں

جب بھی مسلمان سفر پر نکلے تو مسنون دعاؤں کا اہتمام ضرور کریں۔آپ کی وہ پاکیزہ دعائیں جو آپ سفر پر روانہ ہوتے وقت فرماتے تھے میں نے بھی پڑھنا شروع کر دیا۔

۱) اللھم انی اسئلک فی سفری ھٰذا البر والتقوٰی و من العمل ماترضیٰ، (اے اللہ میں تجھ سے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ کی توفیق مانگتا ہوں اور ایسے عمل کی جس سے تو راضی ہو)

۲) سبحان الذی سخر لنا ھٰذا وماکنا لہ مقرنین، وانا الی ربنا لمنقلبون، ترجمہ : پاک ہے) وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کر دیا جب کہ ہم میں اس کی طاقت نہ تھی اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

روانگی

۳۰ ستمبر ۳ بجے کے قریب ۲۰ رکنی قافلہ پولیس کی حفاظت میں براستہ سکار کوئی چٹور کھنڈ کے لیے روانہ ہوا۔ قافلہ کے روح رواں قاضی نثار صاحب تھے۔ان کے ساتھ گاڑی میں مولانا منیر صاحب ، محمد نواز صاحب اور چند ذاتی محافظ تھے۔ ہماری گاڑی میں بھی ۵ ساتھی تھے مگر سب نوجوان اور خیالات و جذبات میں یکسانیت رکھنے والے تھے ۔ابتداء سفر سے ہی ماحول خوشگوار تھا۔ نعت ، تقاریر اور مختلف ترآنے ابتداء سفر سے ہی رفیق سفر تھے۔ گاڑیاں سکار کوئی روڈ پر

فراٹے بھرتیں ہمبین کراس کر گئیں۔ میں خیالوں کی دنیا میں مگن تھا کہ بھائی شرافت الدین نے پھبتی کَسی کہ میاں یہ ڈگری کالج کی لائبریری نہیں ہے، کہ آپ افلاطون اور ارسطو کے بوسیدہ نظریات کا مطالعہ کرو اور ان کو اپنی کسوٹی پر پرکھو ! میں ہو، ہا، نا، نا کرکے شریک محفل سخن ہونا چاہتا مگر دل تھا کہ مضطرب، مسلسل قلابازیاں کھا رہا تھا، تخیلات کے بے آب وگیا وادیوں میں ۔ایک گاڑی میں حاجی جلیل صاحب اور دیگر احباب تھے۔

گاڑیوں کا یہ قافلہ اپنی آب وتاب کے ساتھ ہینزل جا پہنچا اور اچانک ایک کچی روڈ پر مڑا ۔اور سیدھا جا کر ایک گھر کی چار دیواری میں رکا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا یہ چٹور کھنڈ ہے ؟ تو بھائی میر باز نے ایک زور دار قہقہہ لگایا او کہا بات یہ نہیں بلکہ گذشتہ روز ایک نوجوان کا علاقہ جج بارگو میں کار ایکسیڈینٹ میں انتقال ہوا ہے۔ تو ان کی فاتحہ خوانی بھی پروگرام کا حصہ ہے ۔ ان کا نام نعیم ہے ہینزل کا باشندہ ہے۔ میں ہینزل کا جائزہ لے رہا تھا مکئی کی فصل پک کر تیار تھی۔ درختوں کے جھنڈ اور دریائے غذر کی روانی اور موسم خزاں کی ابتدائی ہوائیں فراق کی سی کیفیت پیدا کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک صاحب میرا ہاتھ کہہ رہا تھا کہ یہ ہے گلگت بلتستان کے معروف شاعر وگلوکار جناب صلاح الدین حسرت ، میں علیک سلیک کے بعد حسرت صاحب کے خدو خال اور ان کی مونچھوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ صاحب کہنے لگے کہ حسرت

صاحب ! یہ ہیں آپ کے پسندیدہ کالم نگار، سابق ابن شہزاد حقانی اور موجودہ امیر جان حقانی جن سے بالمشافہ ملاقات آپکی ترتیب حیات تھی۔دائیں جانب ٹینٹ لگے ہوئے تھے اور دو بڑے درخت ٹینٹوں پر شاخیں پھیلائے سایہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ لوگ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے،آ جا رہے تھے کہ قاضی صاحب بھی خوبصورت عربی جبہ زیب تن کیئے ہوئے فاتحہ گاہ میں داخل ہوئے۔ میں ان مناظر کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ معروف قلم کار و شاعر حبیب الرحمان بغل گیر ہوئے۔ صلاح الدین حسرت اور حبیب الرحمان مشتاق سے اللہ نگہبان کہہ کر فاتحہ گاہ میں داخل ہوا۔ لوگون کا ایک جم غفیر ہے۔ ہمہ تن خاموش قاضی نثار احمد صاحب کا چہرہ تک رہے ہیں۔ سکوت کا عالم ہے۔ مرحوم کے لواحقین بھی خاموش ہیں۔ میں بھی دبک کر ایک کونے ہیں بیٹھ گیا، بالآخر سکوت ٹوٹ گیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ "کل نفس ذائقۃالموت" ہر ذی جان نے موت کا پیالہ پینا ہے موت اٹل ہے۔ مسلمان کو ہر وقت موت کا خیال رکھنا چاہیے۔ کل ہم نے بھی وہاں جانا ہے۔ کیا ہم جب بھی اپنے مرحومین کی قبروں میں حاضری دیتے ہیں تو یہ دعا نہیں پڑھتے ہیں۔ "السلام علیکم یا اھل القبور، یغفراللہ لنا ولکم، وانتم سلفنا و نحن بالاثر" دفعتاً دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ دراز فرما دیے۔ سب نے مل کر کئی بار اجتماعی دعا کی، لواحقین سے صبر جمیل کی تلقین کی، اور اپنی نشست سے اٹھ کر چل دیے۔ میں صلاح الدین حسرت کے بارے سوچ رہا تھا، ان کی عجیب زندگی ہے۔ وہ ایک بہترین شاعر ہیں، کاش ! وہ اپنی

شاعری کو خالص اسلامی شاعری یں تبدیل کریں تو کیا بات ہوگی، کل قیامت کے دن آپ کے مداحوں میں ان کا نام بھی ہوگا اور یہ کسی سعادت سے کم نہیں۔ اگر حسرت صاحب تک میری نحیف سی آواز پہنچی تو وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرے، خدا سب کو راہ مستقیم دکھادیں۔ آمین یارب العالمین

دریائے غذر کی بے پروائی سے روانی

قافلہ ہرپون کی آبادی سے گزر رہا تھا اور کوئی میرے کان میں سرگوشی کر رہا تھا کہ حقانی بھائی ! یہ خالص کشروٹیوں کا علاقہ ہے میں حال و قال سے بے خبر دریا کی روانی پر سوچ رہا تھا۔ دریائے غذر اپنی تیز بہاؤ و روانی سے ہمیں یہ باور کروا رہا تھا کہ کسی کے آنے جانے سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غذر کا روڈ اور دریا کا حسین ملاپ ہے۔ دریا میں نیلے پانیوں کی سرزمین کا پانی جمع ہو کر بہتا ہے تو روڈ میں تار کول کی سیاہی نے عجب دلکشی پیدا کی ہے دور سے دیکھنے والے کو بڑا دلکش منظر دِکھتا ہے۔

تھولداس

تھولداس روڈ سے اس پار ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ تھولداس کے لوگ غیرت مند اور اسلام پسند ہیں۔ گلگت کے ناک تلے اس گائوں میں شاید ہی کوئی سرکاری ملازم ہو، مسائل کا انبار ہے زندگی کی تمام سہولتوں سے یہ گائوں عاری ہے۔

تھولداس میں پہلے بھی ایک دفعہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہاں ایک مسجد کی سنگ بنیاد پر گلگت بلتستان کی دو نامور شخصیات مولانا قاضی نثار احمد اور مولانا عطاء اللہ شہاب صاحب (مشیر چیئر مین گلگت بلتستان کونسل) مدعو تھے۔

شیکیوٹ ہیں مسجد کا تعمیراتی کام کا جائزہ

بارگو اور شروٹ آمنے سامنے ہیں۔ شکیوٹ میں قاضی نثار احمد صاحب کی نگرانی و انتظام میں ایک بڑی مسجد کا تعمیراتی کام جاری ہے۔ کسی بندہ خدانے ۵۳ کنال زمین مدرسہ و مسجد کے لیے وقف کیا ہے۔ جہاں مستقبل قریب میں ایک بہت بڑا دارالعلوم بنے گا۔ مسجد کے قربت میں اقراء روضۃ الاطفال کا سکول ہے۔ اقراء روضۃ الاطفال دینی اسکولوں کا ایک مضبوط نیٹ ورک ہے۔ جس کے پورے ملک میں ۳۰۰ سے زائد سکول ہیں گلگت بلتستان کے مضافات میں بھی اقراء کے کئی سکول بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اقراء سکولوں کے ابتداء وارتقاء میں شہید اسلام حضرت مولانا یوسف لدھیانوی جیسے اکابر علماء کی جدو جہد اور دعائیں شامل ہیں۔ گلگت بلتستان میں اقراء اسکول کے قیام وانتظام میں قاضی نثار احمد صاحب کا بڑا عمل دخل ہے۔ چونکہ قاضی صاحب لدھیانوی کے خلیفہ مجاز ہیں۔ تو حضرت بنفس نفیس یہاں آئے اور قاضی صاحب کی معیت میں کئی اسکولوں کا افتتاح کیا۔ ہمارا قافلہ مسجد کے سامنے جارکااور قافلہ کے تمام

شرکاء نے مسجد کی زیارت کی اور قاضی صاحب میرا ہاتھ تھامے کام کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے اور مستقبل قریب کے پلان کو بڑی خوبصورتی سے بیان کر رہے تھے مگر دل و دماغ میں ایک اضطراب ، انقلاب، اور خیالات و سوالات کا ایک دریا امڈ آرہا تھا کہ کیا ہم موجودہ تعلیمی صورت حال سے مطمئن ہیں؟ عصری نظام تعلیم و دینی نظام تعلیم ؟ طبقاتی نظام تعلیم ؟ غریبوں کے لیے الگ اور امیروں کے لیے الگ، قدیم طرز تعلیم و جدید طرز تعلیم ؟ ہمارے نظام تعلیم کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہماری علمی و تحقیقی بنیادیں کمزور ہو گئی ہیں، کیمبرج سسٹم، فرنچ سسٹم،امریکن سسٹم، مدرسہ سسٹم، اور گورنمنٹ اسکول سسٹم جس کو آپ پیلے اسکول نظام بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس ملک میں بہ یک وقت کئی نظام چل رہے ہوں وہ ملک ترقی کیسے کر سکتا ہے اور کیسے ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ ہمارا نظام تعلیم تخلیقی بنیادوں پر نہیں ہے۔ کاش صرف اور صرف طریق تدریس ہی کو جدید بنیادوں پر استوار کیا جاتا اور اپنی قومی و مادری زبان کو تدریسی زبان قرار دی جاتی۔ کیا ترقی یافتہ چین اور جاپان نے اپنی زبان چھوڑ کر کسی بدیسی زبان کو تعلیمی زبان کے طور پر اپنا کر بام عروج حاصل کئے ہیں؟۔ ہر گز نہیں۔ تو پھر ہم کیوں انگریزی کو اپنی کھال سمجھ بیٹھے ہیں اور پیشاب تک انگریزی میں کیوں کرنے لگے ہیں۔ کیا ہم اب تک اس گورے کے غلامی کے طوق میں پھنسے ہوئے نہیں ہیں؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ ہم بہت جلد نماز بھی انگریزی میں پڑھنے لگیں۔ اللہ بچائے۔

آہ ! دھرتی عزیز یہاں یکساں نظام تعلیم نہیں ہے مختلف طبقے اور گروہ پیدا ہو رہیں ، عجب ابہام ہے۔ ایک طبقہ صرف قدیم اور مدرسے کی تعلیم کو اہم اور ضروری سمجھتا ہے اور ایک بڑا طبقہ انگلش میڈیم اور مغربی طرز تعلیم کو کامیابی کی کنجی اور ترقی و عروج کا راز سمجھتاہے ۔ اور کچھ بے چارے دونوں طبقوں میں پھنس کر اپنے نونہالوں کو دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ لوگ قابل تقلید ہیں مگر یہ انداز بے حد صعب و مشقت طلب ہے ۔

قارئین ! دل کی بات یہ ہے کہ میں تعلیم میں دوئی کا قائل نہیں ہوں۔ اسلامی تاریخ پر عمیق نظر ڈالی جائے تو تعلیم میں تقسیم نظر نہیں آئے گی۔ یہ تقسیم گذشتہ ۲، ۳ سو سال پہلے کی ہے جو ہمارے دشمن کی کامیاب چال ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد انسانوں کو حیوانیت کی نچلی سطح سے اٹھا کر انسانیت و مسلمانیت کے عروج و بلندیوں پر پہنچانا ہے ۔ تعلیمی نظام و نصاب ایسا ہونا چاہیے جو فرد کو اس کی اصل حقیقت و ذات سے روشناس کروائے ، اور وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہو، دو جہانوں میں ،اور یہ کہ اپنے اندر چھپی ہوئی تمام صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور حقیقت کا ادراک کر لے۔ اور جب وہ اس قابل ہو کہ وہ خود کو جان سکے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکے تو پھر وہ جدھر چاہے ادھر جائے۔ چاہے تو مفسر و محدث بنے یا ڈاکٹر وانجینئر اور تعلیمی نظام اس

کی کامیاب رہنمائی و مدد کرے۔ انتہائی معذرت سے عرض ہے کہ کیا ہمارا موجودہ تعلیمی نظام ہماری درست رہنمائی کر رہا ہے ؟ بالخصوص ہمارا موجودہ نصاب تعلیم (دینی و عصری) کسی نو عمر کی ذات کی نشو ونما، حقیقت کا ادراک، سچ کی تلاش اور کامیاب زندگی کے لیے مکمل کردار ادا کر رہا ہے ؟ یقینا جواب نفی میں ہوگا۔ ہمیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سخت قسم کے اقدامات کرنے ہونگے۔

سنگل اور گلمتی جڑواں بستیاں

پولیس موبائل گلاپور سے واپس ہوئی اور وہاں سے آگے سیکیورٹی کے انتظامات ضلع غذر کے پولیس نے سنبھالا، گلاپور کے بعد شیر قلعہ آتا ہے۔ شیر قلعہ نالے سے بہنے والا پانی انتہائی شفاف ہے دودھ سے زیادہ سفید یہ پانی جب دریائے غذر سے ملتا ہے تو عجب خوبصورت سماں بن جاتا ہے۔ مشہور قوم پرست لیڈر اور گلگت بلتستان لیجسلیٹیو اسمبلی کے رکن نواز خان ناجی بھی یہاں کا باسی ہے۔

سنگل کافی بڑا گائوں ہے قافلہ خرامے خرامے چل رہا ہے۔ میں عقابی نظروں سے دائیں بائیں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ مکئی کی فصل کاٹ کر کھیتوں میں بچھادی گئی ہے۔ سنگل میں ایک پرانا ریسٹ ہائوس ہے۔ غالباً ۱۹۹۱ء میں مولانا لقمان حکیم صاحب اور مولانا نذیر اللہ صاحب مرحوم گرفتار کرکے یہاں لائے گئے تھے

۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی بڑی قدر دانی کی۔ دونوں حضرات ہمیشہ اعتراف کیا اور اپنے ان بھائیوں کی محبت پہ فخر کرتے ہیں۔

سنگل ایک ڈیویلپڈ گائوں کا منظر پیش کر رہا ہے۔ آغا خان کمیونٹی کے کئی اسکول اور ہسپتال کام کر رہے ہیں۔ سنگل اور گلمتی جڑواں گائوں ہیں۔ گلمتی مرکزی مسجد کے خطیب مولوی غفران صاحب مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ حقانی بھائی، آپ نے گلمتی اور سنگل میں کیا فرق محسوس کیا؟ دونوں الگ الگ بستیاں ہیں یا ایک؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو دونوں جڑواں گائوں لگتے ہیں۔ انہوں نے کہا لو جی ! میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ اصل میں انہوں نے گلمتی میں نماز جمعہ کے حوالے سے دارالعلوم کراچی سے استفتاء کیا ہے۔

دارالعلوم والوں نے لکھا ہے کہ اگر دونوں جڑواں ہیں تو نماز جمعہ شروع کیا جائے۔ اور اب یہ فیصلہ باقی تھا کہ جڑواں کا حکم کون لگائے گا۔ قاضی صاحب غور سے سن رہے ہیں اور فرمانے لگے کہ میاں غفران ! حقانی باہر سے آنے والے آدمی ہیں ان کا مشاہدہ ہمارے لیے دلیل رکھتا ہے۔ بس اب کسی فیصلے کی ضرورت کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔

قاضی عبدالرزاق صاحب کے آبائی گائوں میں

گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا قافلہ ٹھیک اسی جگہ جار کا یہاں گلگت بلتستان کے عظیم قومی لیڈر بطل حریت قاضی عبدالرزاق صاحب پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں قاضی

صاحب کے خاندان والے اب بھی موجود ہیں۔ قاضی صاحب کی زمینیں اب بھی موجود ہیں۔ ہم اس گلی سے گزر رہے تھے یہاں قاضی مرحوم کا گھر ہے۔ قاضی نثار احمد صاحب میرا ہاتھ تھامے تفصیلات بتانے میں مصروف تھے۔ مولانا منیر صاحب اور دیگر احباب قاضی صاحب کے نقش پا میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں برادر خلیق صاحب کے گھر میں عصرانہ کا انتظام تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے کافی سیر ہو گئی ، باغات دیکھے۔ پرانی طرز کے مکانات قدیم طرز لائف کا پرچار کر رہے ہیں۔ عورتیں کھیتوں میں کام کاج کر رہی تھیں۔ راستے میں ایک بوڑھے بابا کے ساتھ ملاقات ہوئی وہ فرداً فرداً سب سے ملا۔ خیریت دریافت کی، جب انہیں بتایا گیا کہ یہ (قاضی نثار احمد) قاضی عبدالرزاق کے فرزند ارجمند ہیں تو وہ فرط محبت میں چیخ اٹھے کہ ہائے میرے "بابا" کے بیٹے ہیں۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ وہ اسماعیلی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر عجب حیرت کی بات ہے کہ قاضی مرحوم کے لیے اتنی وسعت ظرفی اور فرط محبت ، درحقیقت ایں سعادت بزور بازو نیست۔

نماز عصر مرکزی مسجد گلمتی میں ادا کی گئی اور مولوی غفران صاحب کو بھی شریک سفر کیا گیااور یوں گاڑیاں فراٹے بھرنے لگیں

سلپی اور گاہکوچ کے درمیان دریا کی تباہ کردہ زمین

ضلع غذر کے کیپٹل ایریا گاہکوچ سے چند قدم پہلے تحصیل اشکومن کے لئے جو پل بنائی گئی ہے وہاں سے پولیس کا حفاظتی دستہ تبدیل ہوا اور سیکورٹی کے انتظامات اشکومن پولیس نے سنبھال لیئے، اشکومن پل اتنی خوبصورت اور پختگی کے ساتھ بنائی گئی ہے کہ دیکھتے دیکھتے جی نہیں بھرتا۔ یہاں سے تھوڑا آگے سلپی ہے جو چھوٹا سا گاؤں ہے، گاہکوچ اور سلپی کے درمیان دریائے غذر بہہ رہا ہے، سلپی اور گاہگوچ کے درمیان دریا کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ ایک چھوٹا سا جزیرہ نما دکھائی دے رہا ہے، پانی کے بہاؤ اور پھیلاؤ سے بڑی قیمتی زمین ضائع ہوا ہے، اچھی پلاننگ کی جائے تو ہزاروں کنال قیمتی اراضی بچائی جا سکتی ہے۔ دریا کے وسط میں جزیرہ نما زمین پر لڑکے کرکٹ، فٹ بال اور والی بال کھیلتے نظر آرہے تھے۔

درختوں کے جھنڈ میں راز ونیاز کی باتیں

جب ہم اشکومن روڈ سے گزر رہے تھے تو سورج غروب ہو چکا تھا، شام کے دھندلکے ہیں وادی غذر کا حسن نکھر کر سامنے آرہا تھا، سلپی سے تھوڑا آگے درختوں کا ایک بڑا جھنڈ ہے جو ایک چھوٹا چھانگا مانگا نظر آرہا تھا، لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی نظر آرہی تھی، دور چند پرندے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف نظر گئی، غالبا ایک پریمی جوڑا راز ونیاز کی باتیں کررہا تھا، سپیدہ کے ہزاروں درخت خزاں کا استقبال کے لیے کھڑے تھے اور لوگ بھی مکمل خزان سے

پہلے درختوں کے جھنڈ سے بہار کی لذتوں سے محظوظ ہونے کیلئے باغات اور درختوں کے جھنڈ میں سرکتے نظر آرہے تھے۔ میں بھی ان مناظر کو دیکھ کر محظوظ تو ہو رہا تھا مگر دل تھا کہ عجب کیفیت میں مبتلا تھا۔

باسیانِ غذر کی ایک دل موہ لینے والی عادت

لوگ قافلے کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر اظہار محبت کر رہے تھے۔ ضلع غذر کے لوگوں کی ایک عادت دل موہ لینے والی ہے، ہر گزرنے والے کو ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے ہیں، اس میں کوئی تمیز نہیں کہ سلام کرنے والے مرد و زن اور بوڑھے جوان سبھی شامل ہیں، آپ کا فرمان ہے کہ افشوا السلام (سلام کو پھیلاؤ) ، ایک اور روایت میں ہے کہ البادیٔ بالسلام بری من الکبر، نبی کریم کے ان فرامین مبارکہ کا صحیح عملی مفہوم ایسے مواقعوں پر سمجھ آجاتا ہے، کاش ! یہ روایت ہمیں بھی اپنانے کی توفیق ملتی۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں صاف ارشاد ہے کہ '' لاتاذنوا من لم یبدأ بالسلام '' جو سلام کے بغیر داخل ہو اس سے داخل ہونے کی اجازت نہ دیجیے۔ ہم مسلمانوں نے اسلام کے ان زندہ و جاوید فرامین کو پس پشت ڈالا ہوا ہے۔

اشکومن میں سیلابی تباہ کاریاں اور پیر کرم کی عدم چشمیاں

وادی غذر کے پہاڑوں پر برف کی سفید تہ ہلکی سے جمی ہوئی تھی، پانی یخ ٹھنڈا

تھا، منظر بڑا دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ ایک موسم سہانا، دوسرا ہوا خوشگوار، کیا ہی دلچسپ ماحول۔۔۔۔۔۔ سلپی سے چٹور کھنڈ تک کے بعض علاقوں میں سیلاب نے جو تباہ کاریاں مچائی ہے اسکو دیکھ کر دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے، مگر کمال ہے کہ ہمارے گورنر صاحب کو اپنے ناک تلے یہ تباہ کاریاں نظر نہیں آرہی ہو، دہائیوں سے الیکشن جیتنے والوں کو عوامی تباہ کاریاں نظر کیوں کر آسکتی ہیں، ویسے بھی انہوں نے اپنی طبعی عمر پوری کی ہے، اور الیکشن سے ریٹائرڈ ہونے والے ہیں، خدا اندھے کو ناخن نہ دے۔ ہمیں اس بارے زیادہ متحیر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے۔ زندگی کی اقدار بدل چکی ہیں، اب نیا دور ہے، وہی کامیاب ہے جو زمانے کے ساتھ چل سکے یعنی جھوٹ، دھوکہ، فراڈ، اقرباپروری اور ذخیرہ اندوزی۔ اور ہمارے گورنر صاحب بھی یہی کر رہے ہیں۔ اشکومن روڈ میں ہاسیس بڑی خوبصورت جگہ ہے، ہاسیس میں بھی بڑی تعداد میں درخت لگائے گئے ہیں۔

فمانی میں شاندار استقبال

فمانی ایک خوبصورت گاؤں ہے، جہاں مولوی اکبر صاحب، مولوی رحمت گل صاحب اور دیگر احباب قافلے کی استقبال کے لئے نماز جمعہ کے بعد چٹور کھنڈ سے تشریف لائے تھے، فمانی میں مولوی رحمت گل کے گھر میں چائے کا انتظام تھا مگر مغرب کا وقت قریب ہو رہا تھا اس لئے قاضی صاحب کی خواہش پر چٹور کھنڈ کی جامع

مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کا فیصلہ کیا گیا، تھوڑا سا وقفہ کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ فمانی سے چٹور کھنڈ تک گاڑیوں کا ایک سیلاب تھا جو اپنے مہمانوں کے استقبال کے لئے جمع کی گئی تھی، لوگ ذاتی اور کرایہ کی گاڑیاں لیے قافلہ کے ہم دم ہوئے۔ دیہاتی لوگوں یں خلوص و محبت کا پرجوش مظاہرہ تھا، اشکومن کے علماء اور معززین تشریف لائے تھے، سچی بات ہے کہ یہ تمام مناظر محبت و مودت کے خالص جذبے مجھے عجیب لگ رہے تھے۔ میں نے محبت کے قصے و کہانیاں صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔زندگی کی کچھ بہاریں تو لہو ولعب میں گزری اور جب ہوش سنبھالا تو تعلیم کے لئے کراچی سدھار گئے، عنفوان شباب کے کچھ دن ''ڈگریوں'' کے حصول میں بیت گئے اور کچھ غم دوراں میں گزرنے شروع ہوئے۔کہاں محبت کے فلسفے اور مودت کی باتیں اور اکرام و شرف کی نرالی کیفیات سمجھ آتیں۔یقینا غذر کے احباب کا انداز محبت اور والہانہ استقبال کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ کیا مادیت کے اس دور میں اس کی گنجائش ہے۔ ذہن کے نہاں خانوں میں فلسفۂ محبت پر خیالات کے موجیں اُمڈ ارہی تھی، کبھی اقبال کے اشعار اور فلسفہ اسکرین پر نمودار ہو رہے تھے۔آپ سے آپ کے جانثاروں کی محبت و ایثار کی کہانیاں بھی یاد آرہی تھی۔ اختر شیرانی کے یہ اشعار سے سہارا لیناپڑا، لو آپ بھی محظوظ ہو جائے اور سر دھنتے جایئے۔

محبت،آہ! تیری یہ محبت رات بھر کی ہے

تیری رنگین خلوت کی لطافت رات بھر کی ہے
تیرے شاداب ہونٹوں کی عنایت رات بھر کی ہے
تیرے مستانہ ہونٹوں کی حلاوت رات بھر کی ہے
تو کیا جانے سودائے محبت کس کو کہتے ہیں
محبت اور محبت کی لطافت کس کو کہتے ہیں

چٹور کھنڈ میں نماز مغرب کی ادائیگی

چٹور کھنڈ کی جامع مسجد میں نماز مغرب ادا کی گئی، بابا عبدالقیوم سے مختصر بات چیت ہوئی، قاضی عبد الرزاق صاحب، مولانا گلشیر صاحب، مولانا نزیر اللہ، مولانا عزیزا لرحمٰن صاحب اور دیگر علماء کی یادیں تازہ کروادیں جو 1953ء میں مدرسے کے چندے کے حوالے سے یہاں آئے تھے،ان اکابر کو یاد کرتے نہ تھکتے، اس زمانے میں روڈ کی سہولیات نہیں تھی لوگ پیدل اور گھوڑوں میں سفر کرتے۔

کراچی کی بریانی کی خوشبو

رات کا کھانا دائن میں مولوی اکبر کے گھر میں تھا اور قیام کا بندوبست بھی وہی تھا، ہم سب نے وہاں چل دیے۔ تمام مقامی اور گلگت سے آئے ہوئے مہانوں کے لیئے قیام و طعام کا بندوبست تھا، اب شرکاء کی تعداد ۳۰ سے متجاوز کر گئی

تھی، نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد کھانے کا دور چلا، ضلع غذر کے لوگوں کی مہمان نوازی دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا جو کبھی سنا تھا آج دیکھنے کا موقع ملا، ضلع غذر کے ایک گاؤں میں جب کراچی کی بریانی کی خوشبو آنے لگی تو یادوں کے دریچے کھل گئے، بسم اللہ ہوٹل، الحرمین چکن سینٹر اور پشاوری ہوٹل کا وہ دور یاد آنے لگا کہ ہم ساتھیوں کا ایک ٹولہ اکثر بریانی کھانے وہاں جائے کرتے تھے، معلوم کرنے پر انکشاف ہوا کہ مولوی اکبر کی گھروالی کافی عرصہ کراچی میں رہ کر آئی ہے یہ ان کے ہاتھ کا کمال ہے کہ پہاڑوں کی بیٹی شہریوں سے بھی آگے نکل سکتی ہے۔ کھانا واقعتاً بڑا لذیذ تھا، پر تکلف بھی تھا، پانی نارمل تھا مگر بہت ہی شریں، چشمے کا لگتا تھا، بعد میں معلوم کرنے پہ پتا چلا کہ واقعی چشمے کا صاف پانی ہے۔میں پانی اور چائے کے بارے میں بڑا احساس ہوں، پورے پاکستان کا پانی چکھ لیا ہے، سب سے شریں اور ذائقہ دار پانی گلگت بلتستان کا ہی ہے، اور گلگت بلتسان میں سب سے زیادہ شریں پانی گوہر آباد (گنو داس) کا ہے۔ ایک حکیم کی تحقیق اور تجربے کے مطابق گنو داس کا پانی انتہائی ہاضم ہے۔

کمانڈر منیر کے ساتھ بات چیت

کمانڈر منیر صاحب کے ساتھ جب بھی نشست ہوتی تو وہ اپنے دور کی کہانیاں مزے لے لے کے سنا رہے تھے، ایک دور تھا جب وہ کراچی سے گلگت اور خیبر سے

افغانستان تک گھوما کرتے تھے، جگہ جگہ ان کی دفاتر ہوا کرتے تھے اور وہ اپنے پروفیشنل کام کو بڑی مستعدی سے انجام دیا کرتے۔ میڈیا بھی ان کو بڑی اچھی کوریج دیتی۔ آج کل وہ قاضی نثار احمد کے دست معاون بنے ہوئے ہیں اور تنظیم اہلسنت کے امور بڑی خوش اسلوبی کیساتھ نمٹا رہے ہیں اور محمد نواز صاحب بھی ان کے ہمدم ہیں، اللہ نے محمد نواز صاحب کے قلم میں بڑی تاثیر رکھی ہے، اردو اور انگلش میں انہیں ید طولی حاصل ہے۔ جتنا اچھا بولتے ہیں اس سے کئی گنا اچھا لکھتے ہیں۔

SMSکا روگ

موبائل فون کے غلط اور بے جا استعمال کے نتیجے جو نقصانات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں وہ بے حد مضر ہوتے ہیں۔ ان میں اخلاقی بے راہ وری اور بدکاری کو بھی فروغ ملتا ہے۔ نہایت ہی بے ہودہ اور نازیبا و فحش قسم کے SMS کے تبادلہ نے نوجوانوں کو مخرب اخلاق بنایا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ موبائل فون کے غلط استعمال نے ہماری معاشرت کو تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ کلاس رومز میں ہمارے طلبہ وطالبات گیمز میں مصروف رہتے ہیں اور SMS تو معمول کی بات ہے۔ انتہائی معذرت سے عرض ہے SMS کے تبادلہ تو بڑی دینی درسگاہوں کے رواج عام پکڑ چکا ہے' یقینا یہ کہ طلبہ میں کوئی مثبت اور اچھی صورت حال نہیں ہے۔

ہمارے دوست.برادرم شرافت الدین بھی کبھی کبھار محفل سخن میں شریک ہونے کی سعی کا روگ بھی عجیب روگ ہے، جس کوSMS کرنے لگ جاتے۔ SMS کرتے مگراچانک لگ جائے اسکی جان نہیں چھوڑتا، اور پھر اگر انسان غیر شادی شدہ ہو تو اس کی تو راتوں انسان کے لئے بڑے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ SMS کی نیند اُڑ جاتی ہے، بعض دفعہ یہی کےSMS چینل کھول رکھے ہیں جو تمام باتیں SMS میرے بعض دوستوں نے تو اتنے مضحکہ خیز ہوتے ہیں کہ الامان والحفیظ، SMSذریعے ہی پوچھتے ہیں۔ کبھی کبھار تو یہ سرزد ہوتا ہے وہ یہ کہ بعض اسلام بیزار لوگ قرآن کریمSMS ایک اور فعل بذریعہ اوراحادیث مبارکہ کے ترجمے اور مفاہیم اپنی طرف سے نقل کرکے آگے فارورڈ کرتے ہیں اور اس سے مزید آگے فارورڈ نہ کرنے کی صورت میں سخت نتائج کا مژدہ سناتے SMS من گھڑت اور واہیات ہوتے ہیں۔انہی غلط SMS ہیں۔درالاصل اس قسم کے کی انفارمیشن پر مجھے اپنے نیٹ ورک سے ہاتھ دھونا پڑااور کئی دن نمبر بند پڑا رہااور تما م احباب سے رابطہ منقطع۔۔برادرم شرافت الدین کی حالت دیدنی تھی، شاید وہ اپنی منکوحہ کو اپنی سفری کارکردگی سنارہے تھے بذریعہ ایس ایم ایس، ان کی ابھی رخصتی نہیں ہوئی ہے، اور رسم رواج کے بندھن میں پھنسا یہ معاشرہ کب اسلامی اقدار کو اپنا لے گا۔ نوجوانوں کو اسطرح نہیں تڑپانا چاہیے۔شادی بیاں اور نکاح کو جتنا ممکن ہو آسان بنانا چاہیے۔ عین اسلام کے مطابق

رات کے مشاغل اور قاضی صاحب کے سفری معمولات

رات کافی بیت چکی تھی۔ قاضی صاحب اور دیگر علماء کے ساتھ مختلف موضوعات پر تفصیلی گفت وشنید ہوتی رہی، قاضی نثار احمد صاحب کی ایک عادت بھلی لگی، وہ سخت سے سخت بات کو بھی سنتے ہیں، اپنوں کے لئے ابریشم اور غیروں کے لیے سخت جان، یہاں بھی یں سفری واقعات قلمبد کرتا رہا۔ اکثر احباب مجھ سے گفتگو کرنا ضروری خیال کرتے۔ بعض پھبتیاں کستے اور بعض دھیمے انداز میں طنز و مزاح کے نشتر چلاتے اور کچھ بڑے محتاط رہتے۔

جب سوئے تو لمبی تان کر سوئے، یکم اکتوبر ۲۰۱۱ء کو علی الصبح مؤذن کی آواز نے جاگنے پر مجبور کیا، اللہ اکبر کی صدا گونجنے لگیں، قاضی صاحب ہمیں کہہ رہے تھے کہ یوں گھوڑے بیچ کر سونا اچھی بات نہیں، وہ سفر اور حضر میں تہجد کی پابندی کرتے ہیں، یہاں بھی وہ تہجد پڑھ کر اپنے وظائف میں مشغول تھے، مجھے ان کے ساتھ کئی دفعہ سفر کرنے کا موقع ملا ہے، وہ ذکر واذکار اور اپنے معمولات کا بڑی تندی سے پابندی کرتے ہیں۔ حصن حصین میں ایک حدیث منقول ہے کہ جو شخص اپنے سفر میں تنہائی کے وقت اللہ تعالی کے دھیان اور اس کے ذکر میں مشغول رہتا ہے تو اللہ تعالی ایک فرشتہ اسکا ہم سفر بنا دیتے ہیں۔ اور جو شعر و شاعری اور دیگر لغویات مین منہمک ہوتے ہیں اللہ تعالی ان کے پیچھے ایک شیطان لگا دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ '' والشعراء

یتبعھم الغاوٗن، تاہم یہاں وہ شاعری مراد جو حدود سے متجاوز ہو، ہاں حدود و قیود کے اندر رہ کر شاعری کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مثبت اور معیاری شاعری کا ہونا تو ضروری ہے، شاعری سے حالات و کیفیات میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور لوگوں کے طبائع بھی نثر سے زیادہ نظم کو قبول کرتیں ہیں اور فوری اثر لیتی ہیں۔ مثبت اور تعمیری شاعری کی مکمل حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

یخ بستہ پانی سے وضوء، رومان و حقیقت میں کشمکش اور مخمصہ حیات

نماز فجر سے کافی پہلے یعنی صبح کاذب کو قضائے حاجت کے لیے دائن کے کھیتوں میں نکل گیا، چاروں طرف مکئ کی فصل کھڑی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی اور میں بھی سرد موسموں کی وجہ سے سرتاپا ہل رہا تھا، تمام بدن میں کپکپی جاری تھی،اُف یا خدا ! سرسراتے ہوئے یہ جھونکے۔ میں نیند کے خمار میں تھا تاہم یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ ہوا کے سرد جھونکے دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں مصروف تھے، شاید ان کی یہ وجد آفریں سرگوشیاں ایک نو وارد کے حوالے سے ہوں ۔اچانک دل و دماغ میں خیالات کا ورود'' ہونا شروع ہوا،اپنے متعلق عجیب و غریب باتوں نے آ گھیرا، جس طرح'' دائن کی یخ ہواؤں نے جسم کے تمام حصوں کو منجمد کر دیا تھا بالکل اسی طرح مختلف وساوس اور خیالات نے دماغ کو فریزر بنا دیا تھا۔ جسم اور دماغ کی اس کیفیت کے درمیان بیچارہ دل سراسیمہ تھا۔ماضی اور مستقبل کے سارے مناظر ہاتھ جوڑ کر دست بدستہ کھڑے تھے۔ اپنی حالت اس

شعر کے مانند تھی۔

عرصہ گاہ زندگی کا ہوں وہ رہرو جسے
فکر منزل ہے نہ کچھ اندیشہ سود وزیاں
ہوں میں وہ آشفتہ سر وہ بیخود جوش طلب
جس کی حاجت راہبر کہ ہے نہ ذوق آستاں

یہ ایک حقیقت ہے کہ رومان حقیقت سے زیادہ دلکش ہوتے ہیں مگر رومان حقیقت نہیں ہوتے، حقیقت کے آئینہ دار ضرور ہوتے ہیں۔ میں اپنی اس کیفیت کا نام حقیقت رکھوں (جو واقعی حقیقت ہے) تو پھر یہ رومان لگتی ہے اور اگر رومان کا نام دوں تو حقیقت ہے۔ ذہنی نہاں خانوں ہیں کشمکش کی یہ لڑائی جاری تھی، میں جامد و ساکت ایک کھیت میں کھڑا آسمان کے تاروں کو تک رہا تھا، دور کہی چاند نیلگوں گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا اور بادل کے سیاہ ٹکڑے اِدھر اُدھر دندناتے پھر رہے تھے۔ درخت بھی خاموشی سے میری حالت زار پر رو رہے تھے، اور کچھ غریب الدیار سمجھ کر ترس بھی کھا رہے تھے تاہم کچھ منچلے توڈھٹائی سے ہنس رہے تھے۔ مجھے درختوں کا یہ رویہ اچھا نہیں لگا۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ قریب کہی دریائے غذر کی سرکش موجیں مدھم سروں ہیں کوئی پریمی نغمہ الاپ رہی ہیں۔ اللہ !اللہ!!! کشمکش حیات کی یہ ہنگامہ آرائیاں۔ ہر شے پر دلاویز مسکراہٹ جھلک رہی تھی، بس میں ہی تھا جو قلابازیاں کھا رہا تھا اور مجھے لگ

رہا تھا کہ فضائے بسیط میں کوئی مقدس ہستی مجھ پر کھلکھلا رہی ہے اور اس کے مخلوقات میری درماندگی و بیچارگی پر مسرور ہیں اور مجھے یہ باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں کہ کشاکش حیات کی حیرانگی و شوریدگی پر یقین کرلو، مجھے اس عالم پر کیف کی شوریدگیوں پر بادل نخواستہ بھی یقین کرنا ہی پڑا۔ باالآخر یخ بستہ پانی سے وضوء کیا جو کہ چشمہ کا تھا، اس وقت میرا پورا جسم سردی سے کانپ رہا تھا اور قریب بیٹھے دوست بھی میری ٹھٹھر اہٹ پر کھلکھلاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے، سچ بات یہ ہے کہ مجھ سے سردی برداشت نہیں ہوتی وہ بھی غذر کی۔

دائن کا جائزہ اور پل کی خستہ حالی

ناشتے کے بعد میں کھسک کر باہر نکل گیا اور دائن کا جائزہ لینے لگا، دائن ایک خوبصورت گاؤں ہے، یہاں انگور، ناشپاتی، سیب، خوبانی، انار اور بادام کے درخت وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ دائن سے پکورا کا منظر بڑا خوبصورت دکھائی دیتا ہے، چٹور کھنڈ اور دائن جڑواں گاؤں ہیں مگر درمیان میں دریا حائل ہے، ایک پل کے ذریعے دونوں کو ملا دیا گیا ہے اور اس پل کی خستہ حالی کی کا کیا کہنا، ہمارے ہاں عموما اشیاء کی خستہ حالی مثالی ہوتی ہے، ہم نے کبھی بھی سنجیدگی سے خوش حالی کو نہیں سوچا ہے۔ یہ ہمارا قومی المیہ اور وطیرہ ہے اور بد قسمتی سے ہم اس پر فرحاں و شاداں بھی ہیں۔ اور قوم کی اس خستہ

حالی اور بد حالی کے نام پر عالمی ڈونرز سے بھاری رقوم لیتے ہیں اور ہڑپ کر جاتے ہیں، اس چھینا چھپٹی میں حکومت کے ساتھ ساتھ مقامی اور ملکی و بین الاقوامی این جی اوز بھی شریک ہیں۔ آ و مل بیٹھ کر کھائیں والا سلسلہ گزشتہ کئی دہائیوں سے (NGOs) ساری و جاری ہے۔

اشکومن کے مختلف گاؤں

تحصیل اشکومن میں کئی خوبصورت گاؤں ہیں جن میں سلپی، گولوداس، ہابس، فمانی، بِرگَل، چٹور کھنڈ، بار جنگل، دائن، پکورہ ایمت وغیرہ قابل ذکر ہیں، چٹور کھنڈ اشکومن کا کیپٹل ایریا ہے اور پیر کرم علی شاہ کا آبائی گاؤں بھی ہے۔ پیر صاحب کی حویلی بہت مشہور ہے جس پر کروڑوں خرچ کرکے بنائی گئی ہے، پیر کرم علی شاہ اپنے حلقہ انتخاب سے ہمیشہ جیتا ہے، اب کی بار تو وہ جیت کر پھر جیتا ہے،اب شاید دوبارہ اس کا نمبر نہیں آئے گا کیونکہ ضلع غذر کے لوگ اب بہت ہوشیار ہوگئے ہیں، اور پیر صاحب مرحوم کی عمر کا تقاضہ بھی ہے، انہوں نے بڑی تگ و دَو کرکے گورنر کا عہدہ ہتھیا لیا ہے،جب وہ گورنر بنے تو ان کی سیٹ پر ناجی نے بھاری اکثریت سے جیتا۔ بہر صورت پیر کرم علی شاہ، شاہ سے زیادہ شاہ (اسلام آباد کے شاہوں کی بات ہورہی ہے) کا وفادار ہونے کا عملی مظاہرہ کر رہے ہیں اور قومی مسائل پر توجہ کے بجائے ذاتی مفادات کی تکمیل یں مصروف ہیں۔

اشکومن کا آخری گاؤں ایمت ہے، اس کی سطح سمندر سے بلندی 6500 فٹ ہے۔ اشکومن میں بالعموم اور ایمت میں بالخصوص مختلف زبانیں بولی جاتیں ہیں، سب سے زیادہ بولی جانی والی زبان وخی ہے۔، پھر بالترتیب شینا، کھوار، گوجری، پشتو، کاشغری، کوہستانی، فارسی اور بروشکی بولی جاتیں ہیں۔یوں مقامی کلچر ایک خاص قسم کا مربہ بن گیا ہے۔

دریائے غذر پر'' پگڈنڈی پلوں'' کی بھرمار اور ڈراؤنی کیفیت

ضلع غذر کے تمام گاؤں دریا کے آس پاس ہیں۔نالوں کی شکل میں آبادی بہت کم ہے، ضلع دیامر میں دریا کے ساتھ آبادیاں ضرور ہیں مگر اصل آبادیاں نالوں کی شکل میں ہیں۔ ضلع غذر میں دریا کو عبور کرنے اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو ملانے کے لیے جگہ جگہ ''پگڈنڈی پل'' بنائے گئے ہیں۔لوگ ان پلوں کے ذریعے دریا کراس کرتے ہیں، بہت سارے پل خطرناک حد تک ڈراؤنے لگ رہے ہیں اور اگر ہوا تیز چلے تو یہ پل الٹ ہی جاتے ہیں۔ ان پلوں کے ذریعے صرف انسان ہی ایک طرف سے دوسری طرف جاسکتے ہیں۔گاڑی کا گزارنا ممکن نہیں، لوگ رسک لے کر اپنے ساتھ ہلکا پھلکا سامان بھی اُٹھا لاتے ہیں۔ کئی قیمتی جانوں کا ضیاع ہو چکا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اسماعیلیوں کا مذہبی پیشوا پرنس کریم آغا خان اور حکومت وقت اس پر چپ سادھ کیوں لئے بیٹھے ہیں۔

دائن میں سیپ گرلز سکول کی بے چار گی

میں دائن کا وزٹ کرتے کرتے ایک سڑک سے گزر رہا تھاایک عمارت کے اندر سے پاک سرزمیں شاد باد، کشور حسین شاد باد'' کی سریلی آواز سنائی دی۔ معلوم کرنے پر'' پتا چلاکہ یہ دائن کا سیپ گرلز سکول ہے، معصوم بچیوں کی محسور کن آوازوں نے مجھے سکول کے اندر جانے پر مجبور کردیا۔ تمام بچیاں لب آتی اور پاک سرزمیں کے خوبصورت ترانے کے ذریعے ملک وملت کی سلامتی کے لیے اجتماعی طور پر دعا گوہ تھیں۔بڑے شہروں اور بند کمروں ہیں بیٹھ کر ملکی محبت کے نام نہاد علمبرداروں اور بھاری معاوضوں کے بدلے سرکاری امور انجام دے کہ ملک وملت کی پاسبانی کے دعویداروں کو یہ بات سمجھ ہی نہیں آسکتی کہ ملک وملت کے اصل پاسبان اور محب تو یہی لوگ ہیں جوزندگی کی تمام بنیادی سہولیات سے محروم ہونے کے باوجود محبت کا حق ادا کررہے ہیں۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ اصل پاکستانی کون ہے تو میرا سیدھا سادھا جواب ہوگا کہ گوہرآباد کے مارتل میں رہنے والا'' گجر گونیا انکل'' اور دائن کے سیپ سکول میں بغیر لالچ اور ستائش کے ملک وملت کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے والی وہ تمام بچیاں اور بچے ہیں اور جو ملک کے کسی بھی پسماندہ گاؤں ہیں ہوں، اور پہاڑوں میں رہنے والا وہ غریب طبقہ جو باوجود آن پڑھ ہونے کے اردو بولتا ہے اور سمجھتا ہے،اور اردو سے محبت کرتا ہے، یہی حال انکل گوجر گونیا کا ہے۔ کیا اقتدار کے

سنگھاسن پر براجمان ارباب حل و عقد نے کبھی ان غریب محب وطن پاکستانیوں کی بھلائی کا سوچا ہے؟ یقیناً نہیں، وہ کیوں سوچے، ان کی ترجیحات ہی کچھ اور ہیں۔ خیر! دائن میں چار سکول ہیں۔ ۱۔ ڈی جی پرائمری سکول ۲۔ نان فارمل پرائمری سکول، ۳۔ پرائمری سکول اور سیپ گرل سکول، جس میں میں گیا تھا۔ میرے ساتھ ایک مقامی آدمی بھی تھا انھوں نے اسکول اسٹاف سے میرا تفصیلی تعارف کروایا۔ یہاں ایک سرکاری پرمننٹ ٹیچر ہے اور دو کمیونٹی استانیاں ہیں، اکیسوی صدی میں مجھے یہ انوکھی بات سننے کو ملی کہ گورنمنٹ کی طرف سے ان دو کمیونٹی استانیوں کو ماہوار 150 روپے تنخواہ ملتی ہے۔ ان میں ایک میٹرک پاس اور ایک انٹرمیڈیٹ ہے، ڈائیریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی ان کے ساتھ یہ ہمدردانہ سلوک کا دورانیہ چھ سال پر مبنی ہے اور ہنوز جاری ہے۔ اس سکول میں 45 بچیاں تعلیم حاصل کرہی ہیں۔ تینوں استانیاں اپنے مسائل بیان کر رہی تھیں، کہ بس میں ان کے مسائل حل ہی کردوں گا۔ میں نے ان کی توجہ اس علاقے کے باسی گورنر پیر کرم کی طرف کروانی چاہی تو انھوں نے کہا کہ گورنر صاحب اور علاقے کے ڈسٹرکٹ ممبر کئی دفعہ تشریف لاچکے ہیں مگر........ بچیوں کے لیے بیٹھنے کی کرسیاں تو چھوڑو، دریاں تک نہیں ہیں، ان کی سینئر کا مطالبہ تھا کہ میری دونوں کولیگ کو ریگولر کیا جانا چاہیے۔ ہم نے گورنر کے سامنے تمام باتیں رکھیں ہیں مگر صرف وعدے وعید سے کام لیا جارہاہے، تین کمروں اور تین ٹائلٹوں پر مشتمل یہ سکول پرائیوٹ کمیونٹی اور ڈسٹرکٹ کونسل کے فنڈ سے

تعمیر ہوا ہے۔ جس آدمی نے سکول کے لیے جگہ دی ہے اسکو سکول کا گریڈ ون لگانا تھا جو نہیں لگایا جارہا ہے، بہر صورت ان سے تمام مسائل سننے کے بعد ان سے یہ وعدہ کرکے رخصت ہوا کہ آپ کے مسائل ارباب اقتدار اور صاحبان بست وکشاد تک ضرور پہنچائیں گے۔ یوں آج ان سطور کے ذریعے اپنے وعدے کا ایفا کر رہا ہوں۔

ریٹائرڈ صوبیدار حاجی نیک بخت سے ملاقات

انہوں نے پاک آرمی میں ۲۴ سال خدمات انجام دیں ہیں اوراب انکھوں سے معذور ہیں۔ 1995ء میں دعوت تبلیغ میں وقت لگایا، اسماعیلی مکتبہ فکر کو خیر آباد کہ کرہلسنت برادری میں شامل ہوگے اور مذہب حقہ کی ترویج وتنفیذ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ ان کے ساتھ بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی، ان کا کہنا ہے کہ ان کی پوری برادری اب بھی اسماعیلی ہی ہے مگر اپس کی خوشی غمی میں آنا جانا رہتا ہے۔ تبدیلی مذہب سے معاشرتی زندگی میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یہی اصل دینی مزاج ہے کہ انسان انسان کی قدر کریں، اسلام نے ہمیشہ دوسروں کی قدر واحترام کا درس دیا ہے اور صبر و تحمل کی تلقین کی ہے، بد قسمتی سے ہمارے ہاں اسکا شدید فقدان ہے۔ علاقے میں ان کی دینی خدمات کا بڑا غلغلہ ہے، کئی مسجدیں تعمیر کرواچکے ہیں۔ باتوں باتوں سے پتہ چلا کہ نماز فجر کے بعد قاضی نثار صاحب بھی ان کے ساتھ ملاقات کرچکے ہیں۔ وہ بھی ان سے بڑے متاثر تھے۔ حاجی صاحب علاقے کے مسائل پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے

ہیں۔ انہوں نے ناشپاتی اور دیگر فروٹ کے ذریعے ہماری ضیافت کی اور خشک میوہ جات دیکر رخصت کیا۔ حاجی صاحب کا کہنا تھا کہ پیر کرم علی شاہ ۴۲ سال سے علاقے کا نمایندہ ہیں مگر کبھی اس علاقے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ علاقے کی پسماندگی آپ کے سامنے ہے۔ ہنستے ہوئے۔ اب تو وہ سیاست اور حکومت سے ریٹائرڈ ہونے والے ہیں لہٰذا علاقے کے مسائل سے انہیں کیا سروکار۔ ناجی بھی الیکشن سے پہلے بڑی بڑی باتیں کیا کرتے تھے، کئی دفعہ یہاں آیا تھا مگر جیتنے کے بعد دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کیا۔

مدرسہ حدیقۃ الاسلام چٹور کھنڈ میں

یکم اکتوبر صبح 9 بجے دائن سے مدرسہ حدیقۃ الاسلام واقع چٹور کھنڈ معلم آباد کی طرف نکلے۔ اس کے مدیر و رئیس مولوی نادر شاہ صاحب ہیں، مولوی نادر شاہ جامعہ علوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فاضل ہیں۔ فراغت کے بعد اپنے علاقے میں دینی خدمات کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق مدرسہ حدیقۃ الاسلام چٹور کھنڈ کی باقاعدہ اولین دینی درسگاہ ہے۔ اور وفاق المدارس کے ساتھ ملحق ہے۔ جامع مسجد چٹور کھنڈ اور مدرسہ ایک ساتھ واقع ہیں۔ مسجد کمیٹی کے چند ممبران اور مدرسہ کے اراکین میں کچھ چپقلش تھی جس کو سلجھانے کو ضروری خیال کیا گیا تھا، قاضی نثار صاحب نے طرفین کی بات تفصیل سے سنی، مسجد کمیٹی والے اپنی بات پر مصر تھے۔ کچھ ایسے احباب تھے جو دین

کافرضی جذبہ لیے اندرون خانہ مسجد و مدرسہ دونوں کے لیے کینہ رکھتے تھے۔ اردو لٹریچر پڑھ کر علوم عربیہ و اسلامیہ پر عبور حاصل کرنے والا یہ طبقہ دین کی اصل روحانیت سے ہمیشہ عاری رہا ہے مگر بزعم خویش خود کو بڑا مفکر اور مصلح سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ دینی امور میں ٹانگ اڑاتے ہیں جو مضحکہ خیز ہوتے ہیں، جہاں پر بھی یہی معاملہ تھا۔ بہر صورت مولوی نادر شاہ مکمل یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ رہے۔ ان پر تلخی اور سختی کا الزام تھا مگر پورے دو دن وہ مہمان علماء کے سامنے مہر بلب رہے۔

جامع مسجد چتور کھنڈ میں اجتماع عام

دس بجے عوام الناس نے مسجد آنا شروع کیا، بڑی تعداد نے شرکت کی۔ قاضی نثار صاحب کی ایماء اور دیگر احباب کی اصرار پر احقر راقم الحروف نے بھی ''اخلاق مصطفیٰ اور ہماری حالت زار'' کے عنوان پر تفصیلی گفتگو کی۔ میری گفتگو کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

حمد و ثناء کے بعد: سورۃ القلم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی اور ان کی مختصر تشریح'' کے بعد'' وانک لعلی خلق عظیم'' پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

جب بھی اس آیت کو کوئی پڑھتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ'' نبی کریم بہت ''

بااخلاق تھے'' بے شک تھے مگر ایک طالب علم کی وضاحت یوں ہے کہ بااخلاق تو دنیا میں ایسے ایسے موجود ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ صرف با اخلاق ہونا قرب خداوندی کی اساس نہیں، تاہم یہ بہت اچھی صفت ہے جو کسی کسی کے حصہ میں آتی ہے۔ انک لعلی خلق میں علی استعلاء کے لیے اتا ہے، نبی کریم اخلاق کی اس بلندی پر کھڑے ہیں کہ اخلاق کی انہیں کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اخلاق کو پیارے حبیب کی ضرورت ہے۔ اخلاق ہاتھ جوڑ کر آپ کے نیچے ہے اور آپ کے جوتیوں کے تلے۔ جہاں اخلاق کی انتہا ہے وہاں محبوب کی ابتدا ہے، جتنی مرضی اخلاق کے محل بنا لیے جائیں اور مینارے تعمیر کیے جائیں اور اخلاق کے کے۔ ٹو اور نگا پربت سے اونچی چوٹیاں بنا لیے جائیں مگر جہاں محمد عربی فداہ ابی وامی کے جوتے ہیں وہاں اخلاق کا سر ہے۔ اخلاق اخلاق کے رٹ لگانے والو! اخلاق سے کہا جائے کہ ذرا خیال سے چلو، جہاں وہ جائے گا تو لوگ کہیں گے کہ بڑا اخلاق والا آیا ہے مگر جہاں میرے آقا مدنی کے قدم پڑیں گے وہاں اخلاق کے چشمے صافی ابل پڑیں گے''۔ بہر صورت آج مسلمانوں کو نبی کی قدموں والا اخلاق اپنانا چاہیے نہ کہ مغرب کے بوسیدہ اخلاقیات پر سر جھکانا چاہیے۔

برادرم شرافت الدین نے بھی مجمع عام سے خطاب کیا مگر تفصیلی خطاب تو حضرت مولانا قاضی نثار احمد کا ہی ہوا۔ قاضی نثار احمد ایک جید عالم دین ہیں، اللہ نے انہیں بڑی اچھی خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ درس تدریس کے ساتھ ایک اچھے

خطیب بھی ہیں۔ ان کی تقریر میں عجب اثر ہے، کبھی انداز بڑا سخت ہوتا ہے اور کبھی ابریشیم کی طرح نرم، ان کی آواز بہت بلند، ثریلی اور مؤثر اور لحن بہت ہی دلپذیر، انہوں نے سلیس اور سادہ انداز میں عوام الناس سے بڑی شستہ گفتگو کی۔ ان کی تقریر دلپذیر ہوتی ہے۔ قرآنی آیات واحادیث مبارکہ کی انبار لگاتے ہیں۔ اسماعیلی مکتبہ فکر کی بڑی تعداد بھی تھی، قاضی نثار احمد نے اسماعیلی اور سنی بھائیوں کو محبت اور آشتی سے رہنے کی تلقین کی۔ گلگت میں ہونے والے واقعات و حادثات کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا اور یہ بات واضح کردی کہ حالات کی کشیدگی میں ایک مخصوص ٹولہ ملوث ہے۔ اظہار حقیقت کوئی برائی نہیں۔ بہر صورت قاضی نثار احمد کا خطاب جتنا دلنشیں تھا اتنا ہی دلوں کو موہ لینے والا بھی تھا۔

پکورہ کا وزٹ

چٹورکھنڈ سے چار میل کی مسافت پر پکورہ کی آبادی ہے۔ ہمارا قافلہ پکورہ میں ایک مسجد کے کچھ امور سلجھانے گیا تھا، وہاں قاضی صاحب اور دیگر علماء نے مقامی لوگوں سے مشاورت کی، مسجد اور مدرسے کی نوعیت دیکھی اور مسجد میں مجمع عام سے خطاب بھی کیا۔ میں اور برادرم عبداللہ ایک دیوار کی نکڑ پر بیٹھ کر پکورہ کا جائزہ لے رہے تھے، دائیں بائیں کا منظر دیدنی تھا، چار سو سبزہ تھاتاہم خزاں کی آمد آمد تھی، عورتیں کھیتوں میں کام کاج کرتیں نظر آرہیں

تھیں، بچے ہاتھ ہلا ہلا کر اظہار محبت کر رہے تھے، قافلے کے چند نوجوان پکورہ کے نالے میں بہنے والا شفاف پانی سے ہاتھ پاؤں دھو رہے تھے، چار سو پہاڑوں یں گھری اس وادی میں کئی بہتے جھرنے ہیں، ان تمام جھرنوں، گلیشیروں اور آبشاروں کا بہتا پانی دریائے اشکومن میں جا گرتا ہے اور پھر دریائے غذر کے نام سے دریائے سندھ میں جا شامل ہوتا ہے۔

میں بھی شکستہ دل کو لئے پکورہ میں بہنے والے نالے کی طرف چل پڑا، برادرم عبداللہ بھی خراماں خراماں اُترائی اُترنے لگے۔ شفاف پانی تھا، وہاں ہر قسم کے پتھر دیکھنے کو ملے۔ ضلع غذر کی خلقت بھی عجیب ہے۔ موسم بہار بالخصوص موسم گرما میں ضلع غذر کو سیاحوں کی جنت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

گلگت بلتستان کو خوبصورتی بالخصوص ضلع غذر کی ہیئت، حسن جمال کو سامنے رکھ کر میرے دوست عبدالکریم کریمی نے ایک دل آویز غزل کہی ہے جس کے چند بند یہاں آپ کو محظوظ کرنے کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔

فلک کے ماہ و اختر بولتے ہیں
پہاڑوں کے یہ پتھر بولتے ہیں
اسے کہتے ہیں سیاحوں کی جنت
یہاں کے سب گُل و تر بولتے ہیں
پہاڑی سلسلوں یں ہر قدم پر

زمرد لعل و جوہر بولتے ہیں
اچھلتی کودتی نہروں کی مستی
چمن میں اب کوثر بولتے ہیں
اب دریا پہ ٹیلے ریت کے ہیں
ذرا تو دیکھیے زر بولتے ہیں
ذرا اُٹھ کر یہاں کے ٹو کو دیکھو
پرندوں کے کھلے پر بولتے ہیں
کھڑا کس شان سے ہے ننگا پربت
مناظر اس کے اکثر بولتے ہیں

گلگت بلتستان کے بے شمار آبشاروں، جھرنوں، چشموں اور گلیشیرؤں سے بہنے والا پانی کئی دریاؤں کے نام سے بالاخر دریائے سندھ بن جاتا ہے اور دریائے سندھ کے پانی پر حق بھی یہاں کے مقامی لوگوں کا ہے مگر بد قسمتی سے دیامر میں ڈیم بنا کر اس کی ریالٹی اور دیگر مراعات صوبہ خیبر پختون خواہ کو دی جاتی ہیں، یہ کونسا نظام حکومت اور انصاف کا تقاضہ ہے، غرقابی کا شکار ہم ہوں اور مراعات اور سہولیات کوئی اور سمیٹے۔ کم سے کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

نالے سے بہنے والا پانی اور ریتلی زمین پہ نیلے پتھروں سے کھیل رہا تھا اچانک

وادی پکورہ کی طرف نظریں گھوم گئی ،کیا دیکھتا ہوں کہ مرد وزن اور پیر و جواں اکھٹے کام کرتے نظر آ رہے ہیں، سکول کے بچے بچیاں گھروں کو لوٹ رہے ہیں، عجیب مناظر دیکھنے کو ملے۔ یہاں محبت ، زندگی کے منتشر اجزا کو جمع کرنا شروع کرتی ہے اور محبت کے بے پناہ جذبے دیکھنے کو ملے۔ سچ کہا کسی نے کہ غذر محبتوں کی زمیں ہے، محبتیں اور پیار یہاں خوب ملتا ہے، پہلے ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا اور احباب سے سنا تھا اور اب خود دیکھ کر پڑھا اور سنا ہوا پر یقین آنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ زمین واقعی شہیدوں اور غازیوں کی سرزمین ہے، میری ملاقات کارگل کے جنگ میں شرکت کرنے والے کئی غازیوں اور کئی ریٹائرڈ فوجی بزرگوں سے ہوئی۔ ان کا وطن اور گلگت بلتستان کے لیے جذبہ دیدنی تھا اور نا قابل بیان بھی۔ امارت اسلامی افغانستان میں بھی وادی غذر کے کئی سپوتوں نے جرأت وہمت کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں، کئی شہید ہوئے ہیں اور کئی دوست اب بھی موجود ہیں جو دل و دماغ سے اسلامی نظام حکومت اور نظام خلافت راشدہ کے احیاء کے لیے بے تاب ہیں، خدا ہمیں ان شھداء اور غازیان اسلام کی برکت جو پوری دنیا میں بغیر طمع و حرص کے کفر سے برسرپیکار ہیں کی بدولت نظام اسلامی سے مالا مال فرمائے اور اسلام کا اولین سنہرا دور جیسا دور و عروج دکھا دے۔ آمین

پکورہ میں ظہرانہ

پکورہ میں مولوی رقیب اللہ اور برادرم غیاث کے گھر میں ظہرانہ تھا، مختصر طعام کے بعد پکورہ کی مرکزی جامع مسجد باب الجنتہ میں جانا ہوا، یہاں عوام الناس کی بڑی تعداد جمع تھی، قاضی نثار صاحب نے ان سے تفصیلی خطاب کیا اور تنظیم سازی کی۔

باب الجنتہ ییں مہانوں پر پھول نچھاور کیے جارہے تھے، سکول کے بچے جگہ جگہ مہانوں کے استقبال میں کھڑے تھے اور کچھ نوجوانوں نے سیکورٹی کے انتظامات کا سلسلے کو سنبھالا ہوا تھا، ہم نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ واقعتا دل سے قدر کرتے ہیں۔ عجب اتفاق تھا کہ شرکاء استقبال میں بڑی تعداد اسماعیلی برادری کی بھی تھی جو بڑے پیار محبت سے ملتے تھے۔ اور قاضی نثار صاحب جگہ جگہ اپنے خطاب میں اہلسنت برادری سے گزارش کرتے کہ '' اسماعیلی برادری کے ساتھ رواداری وتلطف اورامن کے ساتھ رہیں کیونکہ وہ آپ کے ہمسایہ ہیں اور آپس میں خونی رشتہ داریاں بھی ہیں، گلگت جیسے حساس شہر میں بھی کبھی اسماعیلی اور سنی اختلاف اور جھگڑا نہیں ہوا ہے۔ اگر کسی نے شعوری یا لاشعوری طور پر فساد یا دنگا کی کوشش کی بھی تو جانبین سے گزارش ہے کہ صبر و تحمل سے کام لیں، صبر کرنے والوں کو اللہ کے ہاں بے حد عزت دی جائی گی اور بغیر حساب کتاب کے جنت میں دخول کی اجازت دی جائے گی۔ اور اپنے عمل اور اخلاق کریمہ سے ثابت کریں اور ان کے ساتھ تشدد، سختی اور زیادتی

والا معاملہ سے گریز کریں''۔

قاضی نثار نے مزید کہا کہ '' آپس کے نظم و نسق اور طرز معاشرت کو مثالی بناؤ، چٹور کھنڈ، پکورہ اور دائن کے علماء اور عوام الناس سے گزارش کی کہ آپس میں اتحاد و یکجہتی قائم کرکے جماعت کا نظم بناؤ اور ہمیشہ ہمارے ساتھ رابطے یں رہو، اب کمیونیکیشن گیپ ختم ہونا چاہیے اپنی کارکردگی اور محنت سے وقتا فوقتا ہمیں آگاہ کرتے رہو''

چٹور کھنڈ سے واپسی

ظہر کی نماز اور پکورہ کی باب الجنتہ سے فارغ ہوکر واپسی کے لیے سامان سفر باندھ لیا اور اشکومن کی ایک بڑی تعداد نے اپنے مہمانوں کو رخصت کیا اور یوں ہم لوگ ان کی محبتیں سمیٹ کر روانہ ہوئے۔ہمارے قافلے کے ساتھ کئی گاڑیاں اور درجنوں موٹر سائیکلیں تھی جو ہمیں الوداع کرنے کے لیے سلپی پل تک آئے۔ پولیس والوں نے بھی سیکورٹی کا حق ادا کیا۔

قاضی نثار صاحب کی ایک نیک خصلت

یہ میر اذاتی مشاہدہ ہے کہ قاضی نثار صاحب سیکورٹی پر مامور پولیس اہلکاروں کا بے حد خیال رکھتے ہیں،جہاں بھی خوردونوش کا سلسلہ چلتا وہاں قاضی

صاحب اپنے میزبانوں سے پوچھتے کہ بھائی پولیس والوں کو کھانا کھلایا ہے، اکثر ایسا ہوتا کہ ان تک چائے اور کھانا پہنچ چکا ہوتا اور بعض دفعہ میزبان جھینپ سے جاتے اور کہتے کہ حضرت ابھی پہنچاتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا کہ وہ اپنی پلیٹ سے گوشت کی بوٹیاں اٹھا اٹھا کر پولیس والوں کی جانب بڑھا دیتے۔ جب گلگت پولیس نے گلاپور میں سیکورٹی کے انتظامات غذر پولیس کے حوالے کیا تو قاضی صاحب نے گلگت پولیس کے لیے بہترین انگور راستے میں کھانے کے لیئے خرید کر دیے۔ ہمارے وی آئی پی کلچر میں ایسی باتوں کو متروک سمجھا جاتا ہے اور بعض دفعہ تو سیکورٹی پر مامور اہلکاروں کو قضائے حاجت تک کی اجازت نہیں دی جاتی، اگر آپ کو وزیروں اور مشیروں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے تو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ میں خود کئی ایسی واقعات کی چشم دید گواہ ہوں اور سیکورٹی اہلکاروں سے نازیبا سلوک کی کئی داستانیں زبان زد عام ہیں۔ مغرب کے اس غلیظ کلچر سے جب تک جان نہ چھڑائی جائے تب تک ہم ان کی تقلید میں کھڑے ہو کر پیشاب کرتے رہیں گے۔

گلمتی میں قبور کی زیارت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس نے اپنے ماں باپ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کی قبر کی زیارت کی اللہ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے تو اس کو ایک مقبول حج کا ثواب ملے گا اور جو (نیک بخت) شخص ماں باپ کی زیارت کرے گا، فرشتے اس کی

قبر کی زیارت کو آئیں گے۔زیارت قبور بالخصوص روضہ رسول اکرم پر حاضری تو کسی سعادت سے کم نہیں، قاضی صاحب نے اپنے ابا واجداد کے قبور کی زیارت کی اور طویل دعائیں مانگی، قافلے کے دوسرے ارکان بھی ان کے ساتھ دعاؤں یں شریک ہوئے مگر جلد ہی وہ ادھر اُدھر سرکنے لگے مگر قاضی صاحب دیر تک دعا مانگتے رہے، ہمارے ایک دوست اور جامعہ کے استاد کا بھی معمول ہے کہ ہر جمعرات کو اپنے والدین کے قبور پر حاضری دیتے ہیں اور دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں۔

نماز عصر کے بعد گلگت روانگی

عصر کی نماز گلمتی کی جامعہ مسجد میں ادا کرنے کے بعد گلگت روانہ ہوئے۔اب تک سیکورٹی کے انتظامات غذر پولیس کے پاس تھی، گلاپور سے آگے سیکورٹی کی ذمہ داریاں گلگت پولیس نے سنبھال لی، انسپکٹر عبدالرؤف اپنی پلاٹون لیے کھڑا تھا، یوں ان کی معیت میں گلگت پہنچ گئے، قافلے کے تمام احباب مسرت امیز لہجے میں محو گفتگو تھے۔سب کے ریماکس یہی تھے کہ سفر بے حد اچھا رہا اور اپنے مقاصد پورے کرنے میں کامیاب رہا۔چٹورکھنڈ کی مسجد ومدرسہ کے بگڑے معاملات بھی سدھر گئے۔بقول مولوی اکبر کے یہ علماء کرام کے دورہ اور دعاؤں کی برکت کا نتیجہ ہے۔کہ مولوی میر نادر شاہ اور'' مسجد انتظامیہ شیر وشکر بن گئے''۔الحمدللہ علی ذلک

ایس ایم ایس اور فیس بک پوسٹ

اسلامی تعلیمات میں یہ بات صراحت سے بیان کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی بات آپ تک پہنچ جائے تو بغیر تصدیق و تحقیق کے اس بات کو آگے نہ پہنچائے۔ من گھڑت باتوں کو پھیلانے اور اپنی طرف سے باتیں وضع کرکے دوسروں کے ریفرنس سے آگے پہنچانے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ محدثین کرام نے ایسے لوگوں کو وضاع اور کذاب جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ بہرصورت آج کی محفل میں ہم آپ سے کچھ باتیں شیئر کریں گے جو دانستہ طور پر ہم سب سے صادر ہو رہی ہیں۔ اکیسوی صدی کے اوائل ہی سے مواصلاتی نظام میں بے حد ترقی ہوئی ہے۔ میڈیا کی بے مہا آزادی نے وہ گُل کھلائے ہیں کہ انسان کانپ ہی جاتا ہے۔ امن کی آشا کے نام پر بد امنی کی تبلیغ عام ہو چکی ہے۔ موبائل کے عام ہونے سے بھی اطلاعات کی فراہمی میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ آج سیکنڈوں میں پیغام موبائل کے ذریعے لاکھوں میل دور پہنچ جاتا ہے۔ ایک اور نئی روایت سوشل میڈیا کی شکل میں پیدا ہوئی ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے جو جھوٹ اور من گھڑت کہانیاں لمحوں میں سینکڑوں لوگوں تک پہنچائی جاتی ہیں اس کا آج سے دس سال پہلا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک ہی آدمی مختلف ناموں سے ایک ہی وقت کئی قسم کی باتیں ہزاروں ناظرین و قارئین تک پہنچاتا ہے۔ نام کی تبدیلی سے جنس میں تبدیلی

آ جاتی ہے۔لڑکا لڑکی بن گیا پھر ایک جھوٹ پر مسلسل لاکھ جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور جھوٹ کا بازار گرم رہتا ہے۔اس گرمیِ بازار میں جاہلوں اور ٹھگوں کے ساتھ اہل علم و قلم بھی دانستہ و نادانستہ طور پر جھوٹ پھیلانے میں برابر کا شریک رہتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک روایت رہی ہے کہ ہمارے پاس جو بھی مسیج سیل فون میں آتا ہے وہ دوستوں کی انجوائی کے لیے فوراً آگے فارورڈ کیا جاتا ہے۔آج تک یہ دیکھنے اور سمجھنے کی جسارت نہیں کی جاتی ہے کہ جو بات مجھ تک پہنچائی گئی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ کچھ SMS تو ہنسی مزاق کے ہوتے ہیں۔ کچھ انتہائی فحش و نازیبا ہوتے ہیں۔ اور کچھ SMS کسی کے اوپر بہتان تراشی کی گئی ہوتی ہے۔ پھر خاص کر سکھوں اور پٹھانوں کو بدنام کرنے کے لیے باقاعدہ SMS فیکٹریاں کھولی گئی ہیں۔ اس قسم کے SMS ہر انسان کی وجہ سے بعضSMS فوراً آگے سینڈ کردیتا ہے۔ تاکہ اگلا انسان محظوظ ہو۔ تاہم ان بدگمانیاں پیدا ہوجاتیں ہیں۔ ہم بھی اس فعل بد میں کسی دفعہ انتہائی یاس پھیلتی ہے۔ سے کم نہیں۔ ہماری تعلیم برائے فحاشی پر مبنی SMS اصحاب علم اور قلم دوستوں کی INBOX کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں جس سے بعض دفعہ اچھی خاصی رسوائی ہوتی ہے۔

ہمارے ایک بزرگ پروفیسر جلال صاحب ہیں۔ اللہ نے انہیں طبع لطیف سے نوازا ہے۔اگر متلون کہوں تو وہ ناراض ہونگے۔ قوی حافظے کے مالک انسان ہیں۔ہمارے یہ SMS

کا فارورڈ کرنے کا ایک مقصد ہمارا SMS روزانہ کی بنیاد پر انہیں موصول ہوتے ہیں۔ ان
یہ بھی ہوتا ہے کہ دکھ، پریشانی، ٹینشن اور مصائب کے دور میں اکابر اور اصاغر دوستوں
کو وقتی طور پر ہنسایا جائے یا کم از کم کھلکھلانے پر تو مجبور کیا جائے۔ اب کی بار جب
کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تو انھوں نے سب SMS میں ایسے INBOXجلال صاحب کے
کو زبانی از بر کیا اور ساتھ ہی حوالہ جات کو بھی۔ مزید تشریح اور حاشیہ خود سے چڑھا
کر سویرے کالج وین میں ہماری موجودگی میں یارانِ محفل سے شیئر کیا تو سب کے ساتھ
ہم بھی قہقہے لگانے پر مجبور ہوئے اور دل سے انہیں کوستے بھی رہے کہ آخر ان واہیات
کا بیان کرنے کا یہ کونسا موقع محل ہے۔ مگر پھر بھی پروفیسر جلال کی جلالی طبیعت SMS
پر معروف کالم نگار جاوید SMS کو داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ بہتان تراشی پر مبنی ایک
چودھری نے فون کرکے ہمیں منع کیا کہ ایسا کرنا کسی کی عزت کے ساتھ کھیلنا والا معاملہ
ہم نے تمام پروفیسرز اور SMS ہے لہٰذا آئندہ کے لیے احتیاط ہی بہتر ہے۔ ایسا ہی ایک
اصحاب علم کو سینڈ کیا جس میں آپ کے متعلق ایک خوبصورت بات کہی گئی تھی۔ اکثر
دیا جبکہ ایک محقق لیکچرر جناب احتشامReply نے تو سبحان اللہ، ماشاء اللہ سے ہمیں
صاحب نے اس '' موضوع حدیث '' کا پول کھول کر رکھ دیا۔ ہمیں فوری ہدایات جاری
کی کہ اس قسم کے مسیج من گھڑت، اور جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ دین اسلام چونکہ
توہمات، موضاعات اور من گھڑت باتوں سے پاک ہے۔ اگر یہ سلسلہ نہ رکا تو دین کے
نام پر خرافات کی

تبلیغ عام ہو گی۔احتشام صاحب نہ صرف محقق لیکچرر ہیں بلکہ ایک جید عالم دین بھی ہیں اور M.Phil کے اسکالر بھی ہیں ۔ اس لیے فوراً ہمیں ان کی ہدایات کی تعمیل کرنی پڑی۔ایک مصیبت فیس بک اور ٹیوٹر کے نام سے متعارف ہوئی ہے۔ ہمیں بھی یہ لَت بری طرح لگی ہوئی ہے کہ ہم اپنے قیمتی اوقات میں سے کئی گھنٹے اس میں ضائع کر دیتے ہیں۔ فیس بک میں بے شمار اچھائیاں ہیں لیکن ہم میں اجتماعی طور پر ابھی وہ ذہنی بلوغت پیدا ہی نہیں ہوئی ہے کہ ہم خوبیوں اور خامیوں کے انتخاب میں خوبیوں کا پلہ بھاری رکھ سکیں۔ فیس بک میں روزانہ کی بنیاد پر کئی ایسی تصاویر موصول ہوتی ہیں جن کا حقیقت کی دنیا سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ گزشتہ ایک سال سے ہم بھی ایسی کئی بے ہودہ تصاویر اپنے دوستوں کو پوسٹ کر چکے ہیں ۔ ہمارے ایک لکھاری دوست سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ گزشتہ دنوں انھوں نے وہاں سے فون کر کے اس طرف ہماری توجہ مبذول کروائی۔یقیناً انھوں نے درست رہنمائی کر کے اپنا فریضہ انجام دیا اور ہمیں موضوع اور من گھڑت باتوں کی تشہیر سے روکا۔ سو ان کی بے حد مہربانی۔ سوشل میڈیا پر شخصیات کی تصاویر جس طرح بگاڑ کر پیش کی جاتیں ہیں وہ ایک المیہ سے کم نہیں۔حالیہ انتخابات میں نونہالانِ انقلاب نے فیس بک میں ہی انقلاب بپا کیا تھا یعنی مشرق کی خوبصورت روایات کا جنازہ نکل کر۔ کورل ڈرا اور فوٹو شاپ کی مدد سے ملک وملت کی عظیم شخصیات کی وہ نازیبا تصاویر ایڈٹ کر کے فیس بک میں پوسٹ کی گئی کہ مشرق تو مشرق مغرب بھی کانپ اٹھا۔ مغرب میں

مادر پدر آزادی ہے مگر اس میں اب بھی وہ ہم سے کئی گناہ پیچھے ہیں۔ تاہم دوستوں کی اور فیس بک پر بے SMS یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے کہ آج کی تحریر کے بعد ہمارے ہودہ پوسٹس انہیں موصول نہیں ہونگیں۔ وہ سلسلہ آب و تاب کے ساتھ جاری رہے گا۔ آپ دل بڑا رکھیں۔ اتنی جلدی ہم ہتھیار ڈالنے والے نہیں۔ ویسے بھی ہم تو ہتھیار اٹھانے والوں میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ فی الواقع ہمیں ہتھیار پر تیل و پالش بھی نہیں کرنا آتا۔

فیس بک اور موبائل فون کے غلط اور بے جا استعمال کے نتیجے میں جو نقصانات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں وہ بے حد مضر ہوتے ہیں۔ ان میں اخلاقی بے راہ وری اور بد اور SMS کاری کو بھی فروغ ملتا ہے۔ نہایت ہی بے ہودہ اور نازیبا و فحش قسم کے کے تبادلے نے نوجوانوں کو مخربِ اخلاق بنایا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ POSTs فیس بک اور موبائل فون کے غلط استعمال نے ہماری معاشرت کو تبدیل کرکے رکھ دیا تو SMS ہے۔ کلاس رومز میں ہمارے طلبہ و طالبات گیمز میں مصروف رہتے ہیں اور کے تبادلہ تو بڑی SMS معمول کی بات ہے۔ انتہائی معذرت سے عرض ہے کہ طلبہ میں دینی درسگاہوں میں بھی رواج عام پکڑ چکا ہے' یقیناً یہ کوئی مثبت اور اچھی صورت حال نہیں ہے۔ اک فعل بد فیس بک کی دنیا میں یہ بھی صادر ہوتا ہے کہ خواتین بالخصوص نوجوان لڑکیوں کی تصاویر شیئر کی جاتیں ہیں۔ کیا ہمیں اچھا لگے گا کہ ہماری بہن، بیٹی یا بیوی کی تصویر کوئی پوسٹ

بھیComents کریں اور وہ شیئر کے ذریعے ہر گندی نگاہ کے پاس پہنچ جائے اور وہ
کرے۔ اس سے بھی گریز ہی بہتر ہے۔

کا روگ بھی عجیب روگ ہے، جس کو لگ جائے اسکی جان نہیں چھوڑتا، اور پھر اگرSMS
SMS انسان غیر شادی شدہ ہو تو اس کی تو راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے، بعض دفعہ یہی
چینل SMS انسان کے لئے بڑے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ میرے بعض دوستوں نے تو
SMSکے ذریعے ہی پوچھتے ہیں۔ کبھی کبھار تو یہSMS کھول رکھے ہیں جو تمام باتیں
سرزد ہوتا ہےSMS اتنے مضحکہ خیز ہوتے ہیں کہ الامان والحفیظ، ایک اور فعل بذریعہ
وہ یہ کہ بعض اسلام بیزار لوگ قرآن کریم اوراحادیث مبارکہ کے ترجمے اور مفاہیم
اپنی طرف سے نقل کرکے آگے فارورڈ کرتے ہیں اور اس سے مزید آگے فارورڈ نہ کرنے
من گھڑت SMS کی صورت میں سخت نتائج کا مژدہ سناتے ہیں۔ درالاصل اس قسم کے
کی انفارمیشن پر مجھے اپنے نیٹ ورک سے ہاتھ SMS اور واہیات ہوتے ہیں۔ انہی غلط
دھونا پڑا اور کئی دن نمبر بند پڑا رہا اور تمام احباب سے رابطہ منقطع۔

کے سینڈ کرنے اور فیس بک SMS بہر صورت احباب اور دوستوں سے اپیل ہے کہ وہ
میں بے ہودہ اور جھوٹ پر مبنی پوسٹس شیئر کرنے سے مکمل گریز کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
آپ کی غلط اطلاع سے کسی کا جان لے لی جائے۔ گزشتہ سالوں میں

کی وجہ سے کئی فسادات وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ کئی SMS ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ ایک SMS قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ اب کی بار سانحہ راولپنڈی کے بعد مجھے ایسے ایسے موصول ہوئیں کہ میں ان کی زبان تحریر میں نہیں لا سکتا۔ ایک دوسروں Posts اور کو اتنے غلیظ الفاظ سے یاد کیا جانے لگا کہ ایک مہذب انسان تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو فیس بک اور سیل فون کی اچھائیوں کو لے لی جائے اور خامیوں کو ''دریائے جہنم'' میں پھینک دی جائے۔ کوئی یہ سوال نہ کرنا کہ دریائے جہنم کہاں ہے۔ آدمی جہلم کی جگہ غلطی سے جہنم بھی تو لکھ سکتا ہے نا۔ اور یہ غلطی کمپوزر سے بھی تو صادر ہو سکتی ہے۔

مسلم لیگ نون والو: پیغام پہنچاؤ

یہ یکم مارچ کی ایک خنک شام تھی، میں اپنے آفس میں اپنے پیشہ وارانہ امور میں مصروف تھا۔ گلگت بلتستان میں ابھی سردی کا زور پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ اچانک مولانا خلیل الرحمان صاحب داریلی میری آفس میں تشریف لائے۔ مجھ سے کہا کہ '' میں نے دو مہینے پہلے ایک خواب دیکھا ہے۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اس خواب میں ''دیکھے پیغام'' کو میاں نواز شریف تک پہنچاؤں مگر ابھی تک کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی ہے کہ کیسے ان تک اپنا پیغام پہنچاؤں؟ میں نے ان سے کہا کہ ذرا اپنا خواب تو بتائیں، انہوں نے ایک خواب سنایا کہ '' اگلی حکومت ن لوگ کی ہوگی ''۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں اپنے معمولات میں مصروف رہنے لگا۔ پھر دو ہفتے بعد مولانا دوبارہ آئے۔ وہ کافی پریشان تھے انہوں نے کہا کہ آپ لکھاری آدمی ہے کوئی سبیل نکالو۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ کا خواب بذریعہ خط مسلم لیگ نون کی مرکزی قیادت تک پہنچا دیتے ہیں اور حافظ حفیظ الرحمان صاحب کو بھی ایک کاپی دے دو۔ وہ بھی ارسال کریں گے۔ میں نے مولانا کے خط کو مختصراً کمپوز کیا اور انہیں تین کاپیاں پرنٹ دے دی۔ میں مولانا کی باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھتا تھا۔ میں نے اس کو معمول کا واقعہ قرار دیا۔ مولانا نے اس خط کی ایک کاپی بذریعہ ڈاک

ارسال کیا اور حافظ صاحب کو بھی پہنچایا۔آئیں پہلے اس خط کو پڑھ لیتے ہیں۔
بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ محترم و مکرم جناب نواز شریف صاحب (صدر مسلم لیگ '' نون پاکستان)۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ ! امید ہے مزاج گرامی خریت سے ہونگے۔ محترم المقام ! آپ کی خدمت عالیہ میں ایک خصوصی درخواست ہے کہ '' بندہ ناچیز نے دو ماہ قبل ایک خواب دیکھا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ایک بزرگ جو سفید ریش اور سفید پوش تھا نے فرمایا کہ '' اگلی حکومت پاکستان میں نواز شریف کی آئے گی' اور وہ برسر اقتدار ہونگے۔ تو آپ ابھی ہی میرا یہ پیغام ان کو ضرور پہنچائے کہ '' اس ملک کو جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے سے سود جیسی لعنت سے پاک کردیں''۔ محترم المقام یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ سود قرآن و حدیث کی روشنی میں قطعاً حرام ہے۔ لہٰذا آپ اس مسلم ریاست سے سود جیسی قبیح چیز کو جڑ سے اُکھیڑ کر ختم کردیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس نے سود ترک نہیں کیا اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا واضح اعلان کیا، اور حرمت سود پر احادیث مبارکہ کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ والسلام مع الاکرام، (مولانا) خلیل الرحمان عفی عنہ، استاد الحدیث و ناظم تعلیمات جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت، بتاریخ 14,03,2013 فون نمبر: 03555408149''۔

وقت گزرتا رہا، میں بھی اس بات کو تقریباً فراموش کر بیٹھا تھا۔اب جب 2013ء کے انتخابات ہو چکے تھے ،نواز شریف کو اکثریت مل چکی تھی مگر میں اس سب کچھ کو بھول چکا تھا۔ کل اچانک سرراہ مولانا نے مجھ سے کہا کہ دیکھا ! آپ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے بے حد تعجب ہوا۔میں نے طویل سوچ و بچار کی ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سود کے حوالے سے کچھ تحقیق کروں کہ اب تک اس ملک میں اس کے خاتمہ کے حوالے سے کیا کوششیں ہوئی ہیں۔جب میں نے اس حوالے سے جاننے کی کوشش کی تو میری معلومات میں کچھ ایسی باتیں آئی جن کا یقینا مجھے علم نہیں تھا اور خوشگوار حیرت ہوئی اور اس خواب کا اور سفید ریش بزرگ کے حکم کا پورا پس منظر سمجھ میں آگیا۔ مولانا خلیل الرحمان صاحب جامعہ عائشہ صدیقہ اور جامعہ نصرۃ الاسلام کے شیخ الحدیث ہیں۔ایک سادہ لوح اور فقیر منش انسان ہے۔ جید عالم دین ہے۔ نمود و نمائش سے کوسوں دور ہیں۔ذہنی و نظری سیاست میں جمیعت علماء اسلام کا رجحان رکھتے ہیں اور عملی سیاست سے میلوں دور ہیں۔آج مجھے ان کے درویش ہونے کا پورا یقین آیا۔ورنہ تو ہم جیسے لوگ ایسے بزرگوں کی تضحیک میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام سودی معاملات قرآن و حدیث کی رو سے حرام ہیں۔پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر بنا تھا، اس لیے اس ملک کا حق ہے کہ یہاں اسلامی احکامات نافذ کیے جائے۔ سود جیسی قبیح لعنت کے خلاف سب سے پہلے

اس ملک میں قائداعظم محمد علی جناح نے آواز اُٹھایا تھا۔ یکم جولائی 1948ء کو انھوں نے کراچی میں سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا۔ افتتاحی تقریب میں قائداعظم نے کہا تھا کہ ''میں اس بینک کے تحقیقی شعبے کی کارکردگی، امور اور معاملات وغیرہ کو ذاتی طور پر خود دیکھونگا کہ وہ بینکنگ کے شعبے کو اسلام کے معاشی واقتصادی اور معاشرتی اصول و ضوابط کے مطابق ڈھالے۔ مغرب کے معاشی و اقتصادی نظام نے بنی نوع انسان کے لیے ایسے ناقابل اصلاح مسائل پیدا کیے ہیں کہ اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کوئی معجزہ ہی اس ظالمانہ نظام سے دنیا کو بچا سکتا ہے یعنی انسانیت کو اس کے عذاب سے نجات دلا سکتا ہے۔'' قائداعظم کی یہ تقریر بہت طویل ہے۔ جسے سٹیٹ بینک کی ویب سائٹ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

دسمبر1969ء کو اسلامی مشاورتی کونسل کا ایک اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں طویل غوروخوض اور بحث و مباحثہ کے بعد بینک کے قرضوں، پوسٹل لائف انشورنش، پرائز بانڈ، سیونگ سرٹیفکیٹ وغیرہ سب کے سب کو سود قرار دے دیا۔ اور ان سودی معاملات کے خاتمے کے لیے اقدامات کرنے کو کہا۔ 1973ء میں جب متفقہ طور پر آئین منظور ہوا تو اس میں بہت ساری اسلامی باتوں کے ساتھ سود کے خاتمے کی بات آئین کا حصہ بنا اور اس کے خاتمے کی ذمہ داری حکومت کو سونپ دی گئی۔ اور حکومت خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہی۔ جنرل ضیاء الحق نے جب

اقتدار پر قبضہ جمالیا تو انہوں نے اپنی پہلی نشریاتی تقریر میں ہی پاکستان میں اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا وعدہ فرمایا۔1981ء میں وفاقی شرعی عدالت وجود میں لائی گئی مگر افسوس کہ اس پر پابندی لگادی گئی کہ وہ دس سال تک اقتصادی امور کے حوالے سے کوئی کیس سماعت نہیں کرسکے گی۔ یہ تھی ضیائی اسلام کی اصل حقیقت اوران کی واضح منافقت ،کہ وفاقی شرعی عدالت سودی معاملات کو نہ روکے۔اللہ اللہ کرکے جب یہ دس سال اختتام کو پہنچے تو وفاقی شرعی عدالت نے 14نومبر 1991ء کو ایک تاریخ ساز فیصلہ دیا کہ بینکوں وغیرہ کے تمام سود کو حرام قرار دے دیا اور حکومت کو تنبیہ کی کے وہ فوری طور پراس کے خاتمے کا اعلان کرے۔جب یہ تاریخی فیصلہ ہورہا تھاتو نوازشریف اقتدار کے '' شیر '' پر براجمان تھے۔وہ اپنے شیر پہ سوار ہوئے ،رعونت سے سیدھے سپریم کورٹ آف پاکستان پہنچے اور وفاقی شرعی عدالت کے اس تاریخ ساز فیصلے کے خلاف اپیل دائر کردی کہ یہ غلط ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون ! صوم و صلوۃ کے پابند نوازشریف سے مسلم عوام یہ توقع نہیں کرسکتی تھی۔خیر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ہرآنے والی حکومت سپریم کورٹ سے تاریخ پہ تاریخ لیتی رہی یعنی سپریم کورٹ سود کے خلاف کوئی فیصلہ نہ دے۔پھراس ملک میں وہ دن بھی آیا جب پاکستان کی سپریم کورٹ نے 23دسمبر 1999ء کو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے تمام سودی معاملات کو حرام قرار دے دیا۔سبحان اللہ

معلوم نہیں ہم اللہ کے کس کس عذاب میں کیسے ہوئے ہیں۔جب سپریم کورٹ میں یہ تاریخ رقم ہورہی تھی تو اس وقت جنرل مشرف زمامِ اقتدار سنبھالے ہوئے تھے بلکہ ہتھیا لیے ہوئے تھے۔یہ تو سود سے بھی بڑا عذاب تھے۔ مشرف نے ایک سرکاری بینک یونائیٹڈ بینک'' کو فرمان جاری کیا کہ وہ کورٹ میں کیس دائر کرے کہ عدلیہ اس'' فیصلے کی نظر ثانی کرے۔ پھر کیا تھا سپریم کورٹ کے اس مبارک فیصلے کے خلاف لمبی لمبی زبانیں کھولی جانے لگی۔ کئی ہڈ حرام خور وکیل خدا اور اس کے حبیب کے احکامات کے خلاف زبانیں دراز کرنے لگے۔ وفاقی شرعی عدلیہ کو لتھاڑا گیا۔ نظر ثانی کے نام پر اس مبارک فیصلے کو ردی کی ٹوکری کا خوراک بنایا گیا۔ پھر ہمیں اس اسلامی ملک میں یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ چیف جسٹس شیخ ریاض حسین کی سربراہی میں قائم بنچ نے وفاقی شرعی عدالت کا مبارک فیصلہ کالعدم قرار دے دیا۔اور اللہ کے ساتھ ہم نے حکومتی و عدالتی طور پر جنگ شروع کیا۔ 24 جون 2002ء کا یہ سیاہ دن بھی ہمیں دیکھنے کو ملا۔ یا اللہ معاف فرما۔اس حوالے سے مزید تفصیلات ہیں ۔بہر صورت مجھے مولانا خلیل الرحمان کے خواب کا پس منظر سمجھ میں آگیا۔

اس ملک کے درودیوار چیخ چیخ کر پکار رہے ہیں کہ یہاں نظام اسلام کو نافذ کیا جائے۔حالات دہائی دے رہے ہیں کہ اگر مسلم قوم کو زندہ رکھنا ہے پاکستان

کو بچانا چاہتے ہو، اس کی سالمیت و بقاء عزیز ہے، دہشت گردی، انتہا پسندی، افراتفری، نفسا نفسی، قتل و غارت اور لوٹ مار، کرپشن اور آئین کی پامالی سے بچنا ہے تو اسلام کو عملی طور پر نافذ کردیا جائے۔ میں حیران ہوں کہ ہمارے ارباب اقتدار اب تک ایسا کرنے سے کیوں گریزاں ہیں۔ کیا اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا شیرانی صاحب بتا سکیں گے کہ نفاذ اسلام کی راہ میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ ملکی تاریخ میں پہلی دفعہ کوئی عالم دین اس کونسل کا چیئرمین بنا تھا مگر انہوں نے بھی خاموشی سے مراعات لیتے ہوئے اپنا پریڈ پورا کرلیا۔ ہم نے بڑی جدوجہد سے اللہ سے زمین کا یہ ٹکڑا حاصل کیا تھا کہ ہم یہاں اسلام نافذ کریں گے مگر ہم نے اللہ سے دھوکہ دیا تو اللہ نے ہمیں مختلف عذابوں میں مبتلا کردیا، اس ملک کے ایک شعبے میں بھی اسلام نافذ نہیں ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اسلام مساجد اور مدارس میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ نظریاتی طور پر اب بھی ہم مسلمان ہیں مگر عملی طور پر بالکل ایسا نہیں۔ کیا آج ہماری دانش گاہوں، علمی اداروں، عدالتوں، سرکاری و غیر سرکاری محکموں اور قومی اداروں اور گھر گھر سے اسلام کو دھکیل کر باہر نہیں نکالا گیا اور کھرچ کھرچ کر اس کا چہرہ مسخ نہیں کیا گیا۔

آج اللہ تعالیٰ نے نواز شریف کو ایک دفعہ پھر موقع دیا ہے، وہ اس ملک اور قوم کے ساتھ مہربانی فرماتے ہوئے نفاذِ اسلام کا آغاز کرے۔ اور اس کی ابتداء

سود کے خاتمے سے کیا جائے تو کیا ہی بہتر ہے۔ سودی معاملات کرنے والوں کے بارے میں آپ کا فرمان ہے کہ '' اس کا اقل گناہ اپنی ماں سے نکاح کرنے کا مترادف ہے۔ سورہ بقرہ میں اللہ کا فرمان ہے '' یٰاَیّھا الذین آمنوا اتّقوا اللہ وذروا مابقی من الربوا اِن کنتم مؤمنین، فِاِن لم تفعلوا، فاذنوا بحرب مّن اللہ ورسولہ ''یعنی ''اے یمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم ایمان پر قائم ہو تو سود (سودی معاملات) میں جو کچھ باقی ہے اس کو چھوڑ دو، اور اگر تم ایسا نہیں کروگے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ جانتے ہو اللہ سے جنگ کتنی مشکل پڑے گی۔ اور پھر اس کے حبیب سے۔ خمیازہ بھگت رہے ہیں 66 سال سے۔

آج اسلام اور پاکستان کو کسی عمر بن عبدالعزیز، صلاح الدین ایوبی، اورنگزیب عالمگیر اور امیر المومنین ملا عمر جیسے جری لوگوں کی ضرورت ہے جو ملک و حکومت کے تمام وسائل و ذرائع، اسلام اور نفاذِ اسلام کے لیے وقف کریں۔ کیا نواز شریف ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟۔ نون لیگ گلگت بلتستان کے تمام ذمہ داروں بالخصوص حافظ حفیظ الرحمان، سلطان مدد، حاجی غندل شاہ، حاجی فدا محمد ناشاد، مخلص کارکنوں اور موسمی پرندوں کی طرح جگہ بدلنے والے لیگی لیڈورں سے بھی گزارش ہے کہ ہمارا پیغام اپنی مرکزی قیادت کو پہنچاؤ۔ شاید ہماری کوئی نیک امید بھر آئے، اپنی زندگی میں اسلام کی بہاریں دیکھنے کو ملے اور اس

واسطے کل روز قیامت اللہ مغفرت فرمادے۔ وماعلینا الا البلاغ

سیرتِ رسول کی روشنی میں سماجی انصاف اور عمدہ حکمرانی

بسم اللہ الرحمان الرحیم

(یہ مقالہ شیعہ امامی اسماعیلی طریقہ اینڈ ریلیجس ایجوکیشن بورڈ برائے پاکستان، فیسلیٹیٹنگ کمیٹی گلگت بلتستان کی طرف سے منعقدہ سیمینار''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں سماجی انصاف اور عمدہ حکمرانی'' 9 جون 2013 کو سرینہ ہوٹل گلگت میں پڑھا گیا۔ (ادارہ)

سماج کا مفہوم:۔ عربی زبان میں سماج کا معنی ''معاشرہ'' اور انگریزی میں ''Society''کے ہیں۔ جو باب تفاعل عاشر یعاشر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے معنی باہم مل جل کر رہنا، جیسے ''اعتشر یا تعاشر القوم'' ایک دوسرے کے ساتھ رہنا (ا)۔ انگریزی میں

.Social mode of living, A social community

مثال کے طور پر

(Society has a right to expect peaple to obey tha law".(2

''

سماج کی تعریفیں مختلف مفکرین نے کی ہے جن میں سے ایک دو کی تعریفیں ہم

{Social justice یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ آگے سماجی انصاف اور عمدہ حکمرانی
جو کہ مقالے کا عنوان ہے کو درست طریقے سے سمجھ {and Good governance
سکیں۔ رالف لنٹن (Ralphlinton) نے سماج کو یوں بیان کیا ہے''افراد کا ایسا گروہ
معاشرہ بن جاتا ہے جو طویل عرصہ ایک جگہ رہ رہا ہو اور اشتراک عمل کی وجہ سے اس
حد تک منظم ہو جائے کہ تمام لوگ اپنے آپ کو ایک جسم کی مانند محسوس کریں (۳)۔
ایک اور انگریز مفکر پروفیسر پیٹرک کے مطابق

''Civics is a science dealing only with life and problems of cities'' [4]

تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرہ/ سماج کا مفہوم یا اصطلاح بڑی جامع اور وسیع ہے۔ اس
، میں افراد کے شعوری اور لاشعوری طور طریقے، ان کے منضبط اور غیر منضبط تعلقات
تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی احوال، ان کی محبت و مودت، نفرت، بغض و عداوت اور حسد
وکینہ اور ان جیسے دیگر تعلقات و اعمال سب شامل ہیں۔
معروف اسلامی مفکر ابن خلدون نے معاشرے کو حیوانی جسم سے تشبیہ دی ہے۔ قوموں
کے عروج وزوال کے ابدی اصول وضع کیے ہیں۔ ارسطو نے انسان کو معاشرتی حیوان
قرار دیا ہے۔ غرض ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ افراد کا ایک دوسروں کے ساتھ
اشتراک و تعاون لاشعوری طور پر نہیں ہوتا بلکہ انسان سوچ

سمجھ کر اور شعوری طور پر معاشرتی و سماجی تعلقات استوار کرتا ہے۔اگر معاشرے کے افراد کا طرز عمل، رہن سہن کسی ضابطہ اخلاق یا قانون کے پابند نہ ہو اور ان افراد کے اندر کوئی نصب العین اور زندگی کے خاص مقاصد نہ ہوں تو ایسے ہجوم کو قطعاً معاشرہ نہیں کہا جاسکتا یا کم از کم مہذب و متمدن معاشرہ نہیں کہا جاسکتا۔

علامہ سید جمال الدین افغانی کے مطابق'' انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا، اس سے ترقی یافتہ زندگی بسر کرنے کی توفیق دی گئی ہے یہ زندگی اجتماعی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ان سب کے اجتماع کا نام معاشرہ ہے اور معاشرہ ایک جسم کی مانند ہے''(۵)

Social Justice: سماجی انصاف

سماجی انصاف کو انگریزی میں یوں بیان کیا جاتا ہے:

''The fair and proper administration of laws conforming to the natural law that all person,irrespective of ethnic origin, gender,possession,race, religion,ect...are to be treated equally and without prejudice"(6)

یعنی کہ معاشرے میں بسنے والے تمام طبقات کو یکساں حقوق میسر ہوں۔بغیر امتیاز قوم و نسل، اعلیٰ وادنی، غریب و امیر اور مسلک و مذہب کے تمام لوگوں کو خوشیاں فراہم کرنا، اور ان کے حقوق کا زیادہ سے زیادہ تحفظ و

نگہداشت کرنا اور ان کو تمام انسانی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنا۔اور یہ عمدہ اورانصاف پسند طرز حکمرانی کے سوا بے سود ہے۔

Good Governance:عمدہ طرز حکمرانی

:عمدہ طرز حکمرانی کو موجودہ دور میں یوں بیان کیا جاتا ہے

Good governance is an indeterminate term used in international development literature to describe how public institutions conduct public affairs and manage public resources. Governance is "the process of decision-making and the process by which decisions are implemented (or not implemented)". The term governance can apply to corporate, international, national, local governance, or to the interactions between other sectors of society.

Good governance to a set of requirement that conform to the organization's agenda, making "good governance" imply many different things in many different contexts [7]

یہ تو مروجہ نظریہ ہے۔ہم جب سماجی انصاف اور عمدہ حکمرانی کو سیرت رسول اور احکامات الٰہی میں دیکھتے ہیں تو وہاں اس سے بھی ارفع و اعلیٰ انداز میں واضح ارشادات اور احکامات ملتے ہیں۔

اسلام میں عمدہ طرز حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز اللہ جل وعلا نے اچھا

قرار دیا ہے اور اس کے رسول اور خلفائے راشدین نے اس سے قائم کیا ہے وہ اچھی ہے اور جس چیز کو اللہ تبارکت وتعالی اور اس کے حبیب نے بری قرار دیا ہے وہ بری ہے۔ بہترین طرز حکومت اور عمدہ حکمرانی کے مقاصد میں ہے کہ وہ'' امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' یعنی حکومت اچھائی کو پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اور حکومت کے ساتھ عوام الناس پر پر بھی لازم ہے کہ وہ برائی کو روکے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ'' من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یسطع فبقلبہ، وذالک أضعف الایمان'' (۸) ''یعنی: تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، پھر اگر اُس کی کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے (بدل دے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے (اُسے برا سمجھے)''۔

اللہ تعالی نے حضرت داؤد علیہ الصلواۃ والسلام کو سماجی انصاف کے قیام کے لیے خلافت ارضی سے نواز تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے'' یاداؤد انا جعلنٰک فی الارض خلیفۃ فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ'' (۹) یعنی: ''اے داؤد! ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے، اس لیے تم لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کرو، اور خواہش کے پیچھے نہ چلو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیگی''۔

آپ کا مکتوب گرامی

نبی اکرم شفیع اعظم جناب محمد مصطفیٰ نے کوہ تہامہ کو ایک مکتوب گرامی

: تحریر فرمایا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

☆... من محمد رسول اللہ کی طرف

سے ....خدا کے آزاد بندوں کے

نام

جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، نماز پڑھیں اور زکواۃ ادا کریں وہ '' غلامی سے آزاد ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حاکم ہیں۔ ان کو نجران کے قبیلوں میں واپس نہیں کیا جائے گا،اور نہ ہی سابقہ جرائم پر ان سے کوئی باز پرس کی جائے گی۔ ان لوگوں پر کسی قسم کی ظلم اور زیادتی نہیں کی جائے گی۔مذکورہ بالا امور پر ان لوگوں کے لیے جو اسلام لائیں، اللہ اور محمد کی ذمہ داری ہی ہے'' (۱۰)۔

اللہ تعالی کے حکم اور آپ کے اس مکتوب مبارک سے یہ سمجھ آجاتا ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام قائم کیا جائے، جس سے عوام الناس کو سماجی انصاف مل سکے، رعایا کے ساتھ عدل و انصاف والا معاملہ کیا جائے اور اس پر اسلامی حکومت کی طرف سے کسی بھی قسم کا ظلم و ستم،زیاتی اور سماجی ناانصافی والا معاملہ نہ کیا جائے۔آپ کے اس خط سے واضح ہوجاتا ہے کہ سماجی انصاف کی فراہمی اور رعایا کو ظلم و ستم سے محفوظ رکھنا اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اور اہم مقاصد میں شامل ہیں۔

اسلام میں سماجی انصاف اور بنیادی حقوق کا تصور:۔ اسلام نے سماجی انصاف، انسانی بنیادی حقوق اور معاشرے میں قیام عدل کا تصور اس وقت پیش کیا جب یہ تمام باتیں باقی دنیا اور انسانیت کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔مدینہ کی اولین اسلامی ریاست میں سماجی انصاف کو اولین ترجیح دی گئی اور بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اسلا م ہر فرد پر مکمل ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ دوسروں کی مال جان، عزت و آبرو غرض ہر چیز کا احترام کریں۔ اسلام کے یہ احکامات و فرامین افراد، معاشرے اور، حکومت و ریاست سب پر یکساں لاگو ہوتے ہیں۔

اسلام نے انسان کے تمام بنیادی حقوق بدرجہ اتم قبول کیے ہیں بلکہ ان کو پورا کرنے کے واضح احکامات بھی صادر فرمایا ہے۔

حق زندگی ...۱ ....[Protection of life]

شخصی آزادی کا حق ...۲.........[Right to personal freedom]

خاندانی زندگی کا حق ...۳.........[Right of family]

حق مساوات ...۴........[Right of equality]

آزادی رائے کا حق ...۵........[Right To express]

حق روزگار ...۶.........[Right to livelihood]

تحفظ ملکیت ...۷......[Protection of property]

مذہب و عقائد کا حق ...۸......[Religious rights]

[Right to jistice]........٩... حقِ انصاف

[Political and Social rights].........١٠... سماجی و سیاسی حقوق

اسلام نے تعلیمی حقوق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ حصول تعلیم کو فرض قرار دیا ہے۔اسلام ایک ایسا بہترین نظام وضع کرتا ہے جو سماجی انصاف، قیام امن و عدل اور دیگر تمام حقوق کی پوری ضمانت دیتا ہے۔طوالت سے بچنے کے لیے ماقبل میں بیان کردہ ایک دو حقوق کے حوالے سے قرآنی دلائل پیش کرتے ہیں ورنہ تو قرآن حدیث، سیرت رسول اور سیرت خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ تحفظ زندگی و حق زندگی کے حوالے سے اللہ کا ارشاد ہے'' من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض ،فکانما قتل الناس جمیعا' ومن احیاھا فکانّما احیا الناس جمیعا'' (١١) یعنی: جس نے کسی متنفس ،کے بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو یا زمین میں فساد انگیزی کی ہو، قتل کردیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اس سے زندہ رکھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ کھا''۔ حق ملکیت

اور تحفظ جائیداد کے لیے بھی اللہ کا حکم صاف واضح ہے'' لاتاکلوا اموالکم بالباطل'' (١٢) یعنی باطل طریقے سے ایک دوسروں کا مال نہ کھاؤ''۔ خطبہ حجۃ الوداع میں بھی آنخضرت نے ارشاد فرمایا کہ خبردار! تمہاری زندگیاں اور تمہارے مال اس طرح تم پر قابل احترام ہیں جس طرح کہ آج کا یہ دن واجب الاحترام والتکریم ہے۔

سماجی انصاف کے لیے اسلام نے بڑے واضح اور جامع قوانین پیش کیے ہیں (آئندہ مزید وضاحت ہوگی) تاکہ عوام کی مال و جان، عزت وآبرو اور دولت وغیرہ ڈاکہ اور چوری سے محفوظ رہ سکے۔ یہ ڈاکہ ڈالنے والے چاہیے انفرادی طور پر ہوں یا اجتماعی طور پر۔ سرکاری و ریاستی سطح پر ہوں یا بین الاقوامی سطح پر، جیسا کہ عام مشاہدے میں آرہا ہے۔ آج مغرب سے لے کر مشرق تک، شمال سے لے کر جنوب تک ہر جگہ سماجی نا انصافیاں عروج پر ہیں۔ نہ انسان کی جان محفوظ ہے نہ مال، نہ سیادت و ریاست محفوظ ہیں۔ ہر سو تباہی و بربادی کے مناظر ہیں۔ بالخصوص مسلم ریاستوں میں بڑی طاقتوں کی طرف سے ظلم و جبر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔

امام الحرمین کے نزدیک عمدہ حکومت کے مقاصد: ۔ سماجی انصاف کے لیے عمدہ نظام حکومت بہت ضروری ہے۔ امام الحرمین نے بہترین حکمرانی کے لیے قرآن و سنت اور سیرت طیبہ کی روشنی میں درج ذیل مقاصد بیان کیے ہیں۔

۱...حفظۃ الحوزۃ.........مرکز اسلام کی حفاظت

۲...رعایۃ الرعیۃ.........رعیت و عوام کی نگرانی

۳۔.... اقامت دعوت دلائل و براہین اور طاقت کے ساتھ

۴۔...خوف اور ظلم کو روکنا

۵۔...ظالموں سے مظلوموں کو انصاف دلانا اور حقوق چھیننے والوں سے حقوق لے کر مستحقین کو دینا (۱۳)

حضرت شاہ اسماعیل شہید کے نزدیک عمدہ حکمرانی:۔ شاہ صاحب حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند ارجمند ہیں۔انہوں نے عمدہ حکمرانی کو یوں بیان کیا ہے۔''باید دانست کہ سیاست دریں مقام عبارت است، از تربیت بندگان الٰہی بر قانون اصلاح معاش و معاد بطریق امامت و حکومت'' (۱۴) یعنی: سیاست سے مراد بندگان الٰہی کی اصلاح معاش و معاد کے قوانین کے مطابق امامت و حکومت کے طریقے سے ترتیب کرنا ہے''۔

میثاق مدینہ، بہترین حکمرانی اور سماجی انصاف کے لیے یادگاہ معاہدہ:۔ مدینہ منورہ میں پہنچ کر آنحضرت نے سماجی انصاف اور معاشرے میں قیام امن کے لیے جملہ اقوام سے ایک عمرانی معاہدہ بین الاقوامی اصول پر کیا تاکہ معاشرتی اور مذہبی اختلافات اور تنازعات میں قومی وحدت قائم رہے۔اور سماجی انصاف کا قیام ہو سکے۔ اس معاہدہ میں مختلف مسالک، مذاہب زبان و نسل اور علاقہ کے لوگوں کے درمیان قیام امن اور آشتی کے ساتھ رہنے کے لیے بہترین رہنمائی ملتی ہے۔اس معاہدے کے جستہ جستہ فقرے یہ ہیں۔

۱...انھم امۃ واحدۃ............ یہ سب لوگ ایک ہی قوم سمجھے جائیں گے۔

۲... وان بینھم النصح و النصیحۃ والبر دون الاثم....... معاہدہ اقوم کے باہمی تعلقات، باہمی خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کے لیے ہونگے ضرر اور گناہ کے نہ ہونگے۔

۳... وآن النصر للمظلوم...... مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی۔

۴۔وان یثرب حرام جرفہا لاہل ہذہ النصیحۃ۔۔مدینے کے اندر کشت و خون کرنا اس (معاہدے کرنے والے سب قوموں پر حرام ہے۔ (۱۵

موجودہ دور میں گڈ گورننس (Good governance) کی اصطلاح چلی ہے۔گڈ گورننس اور اچھی طرز حکمرانی کی بے شمار مثالیں اسلامی تاریخ کے صفحات سے بھری پڑی ہیں۔ ہم ایک مثال عرض کیے دیتے ہیں۔علامہ کوثرنیازی صاحب لکھتے ہیں:

امیر المؤمنین حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ گشت کررہے تھے کہ انہوں نے ایک غیر'' مسلم کو دیکھاجو بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا، تم بھیک کیوں مانگ رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اب میں کمانے کی سکت نہیں رکھتا، امیر المؤمنین نے یہ سن کرفرمانے لگے کہ'' افسوس ہے عمرپر جس سے اس کی جوانی کے زمانے ییں جزیہ تو لیا لیکن بوڑھا ہوگیا تو اس سے اپنے حال پر چھوڑ دیا'' حکم دیا کہ اس کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کیا جائے (۱۶)۔

اس واقعہ سے ہم آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مسلمان حکومت غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری اور سماجی انصاف دینے کے فراخدالانہ مظاہرہ کررہی ہے دنیا کا کوئی دوسرا نظام حکومت اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مسلم ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق: ۔ سماجی انصاف مہیا کرنے میں مسلم ریاست اور مسلمان حکومت و حکمرانوں کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں، اگر ایک مسلمان کسی ذمی (غیر مسلم) کو قتل کرڈالے تو فقہ حنفی کے رو سے اس مسلمان کو قصاص میں قتل کردیا جائے گا۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا کہ

قاتل مسلم ہے اور مقتول غیر مسلم ہے کہہ کر کوئی ناانصافی کی جائے یا امتیاز روا رکھا جائے۔آنحضرت نے فرمایا'' من قتل معاھداًلم یرح رائحۃ الجنتہ '' (۱۷) یعنی: '' ذمی کو قتل کرنے والا مسلم کبھی جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا''۔ جان بہت عزیز چیز ہے ۔اسلام نے تو غیر مسلموں کی شراب، صلیب اور سور (خنزیر) کے گوشت تک کو نقصان نہ پہنچانے کا حکم دیا ہے۔فتاویٰ عالمگیری اور بدائع الصنائع فی الترتیب الشرائع میں مذکور ہے کہ ''ولو اتلف مسلم اَو ذمی علی ذمی خمراًاور خنزیراًیضمن'' اگر کوئی مسلمان کسی ذمی غیر مسلم) کی شراب ضائع کریں یا کسی عیسائی کی صلیب توڑ دیں تو بطور جرمانہ اس) (سے شراب اور صلیب کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔(۱۸

معاہدہ بیت المقدس:ذمی رعایا کے حقوق کی مقدس دستاویز:۔ حضرت عمر نے بیت المقدس کے فتح کرنے کے بعد وہاں کے شہریوں سے ایک معاہدہ کیا۔ذمیوں کو جو سماجی حقوق حضرت عمر نے عطا کیے وہ اس زمانے کی غیر مسلم سلطنتیں غیر قوموں کے لیے سوچنا بھی ناگوار کرتیں تھی۔بیت المقدس کا معاہدہ خود حضرت عمر کے الفاظ میں ترتیب دیا گیا،اس کے چند جملے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

ہذا مااعطی عبداللہ عمر امیر المؤمنین اھل ایلیا من الامان اعطاھم امانا بأنفسھم''
واموالھم وکنایسھم وصلبانھم وسقیمھا وبریھا و سایرملتھا انہ لایسکن کنایسھم ولاتھدم ولا ینتقض منہا ولا من خیرھا ولا من صلبھم
ولا من شئی من اموالھم ولایکرھون علی دینھم ولا یضار احدھم''یعنی: ''یہ وہ

امان ہے جو اللہ کے غلام امیر المؤمنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی' یہ امان ان کی جان و مال' گرجا' صلیب' تندرست' بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے اس طرح کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی' نہ ڈھائے جائیں گے' نہ ان کو یا نہ ان کے احاطے کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا۔نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا''۔(۱۹)

غیر مسلم رعایا کے شرائط کو پورا کرنے کا حکم:۔ حضرت عمر نے شام کی فتح کے بعد حضرت ابو عبیدہ کو غیر مسلم رعایا کے حوالے سے جو خصوصی حکم جاری کیا اس میں یہ یادگار اور بے مثال الفاظ مرقوم تھے ''وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار بھم واکل اموالھم الا بحلھا' ووف لھم بشرطھم الذی شرطت لھم فی جمیع ما اعطیتھم ''یعنی ''مسلمانوں کو منع کرنا کہ ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں' نہ ان کو نقصان پہنچائے' نہ انکے مال بے وجہ کھانے پائیں اور جس قدر شرطیں تم نے ان سے کی ہیں سب وفا کرو''۔(۲۰)

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحقیق:۔ مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی عالم عرب میں بڑے مقبول و معروف ہیں۔وہ اسلامی معاشرے اور مسلم حکمرانوں کے حوالے سے رقم طراز ہیں'' اسلامی معاشرے میں مختلف طبقے شیر و شکر ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے۔ مرد عورتوں کے ذمہ دار اور منتظم تھے۔ عورتیں نیک، وفاشعار اور امانت دار تھیں۔ ان کے حقوق مردوں

پر اور مردوں کے حقوق ان پر تھے'' (۲۱)۔

عمدہ حکمرانی کے لیے چند اصول:۔ بہترین طرز حکومت اور مثالی حکمرانی کے لیے یہاں چند اصول بیان کیے جاتے ہیں، اگرچہ یہ موضوع کافی تفصیل طلب ہے مگر اختصار کے ساتھ یہ باتیں موقع محل ہیں، سیرت طیبہ کی روشنی میں جو بھی حاکم یا سربراہ مملکت بنے گا اس منصب کے اہم تقاضے ہوتے ہیں۔بد قسمتی سے ہمارے ہاں تھوڑا اقتدار مل جائے تو اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حاکم اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے۔ حاکم یا خلیفہ سے مراد (نعوذ باللہ) خدا کی جگہ انتظام چلانے والا ہرگز نہیں، بلکہ حاکم یا خلیفہ سے مراد رب ذوالجلال کے بنائے ہوئے قوانین اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق مملکت کا نظم و نسق چلانا ہوتا ہے۔ وزرائ' گورنرز،اور دیگر ارباب اختیار کے فرائض وذمہ داریاں اور اختیارات پر حضرت عمر نے بارہا خطبے دیے۔ایک خطبے میں عاملوں (یعنی وزرائ' مشیر' گورنرز'اور دیگر صاحب اقتدار واختیار) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا''یاد رکھو کہ میں نے تم لوگوں کو امیر اور سخت گیر مقرر کرکے نہیں بھیجا ہے بلکہ امام بنا کر بھیجا ہے کہ لوگ تمہاری تقلید کریں۔تم لوگ مسلمانوں کے حقوق ادا کرو۔ان کو زدکوب نہ کرو۔ان کی بے جا تعریف نہ کرو کہ غلطی میں پڑیں۔ان کے لیے اپنے دروازے بند نہ رکھو کہ زبردست کمزوروں کو کھا جائیں۔ان سے کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ یہ ان پر ظلم کرنا ہے'' (۲۲)۔اصول ملاحظہ ہو:

۱... قرآن و سنت کے تابع ہونا:۔ انتہائی اہم بات یہ ہے کہ حاکم اپنے تمام احکامات 'افعال واعمال اور اقدامات میں قرآن و سنتِ رسول اور اجماعِ امت کا پابند ہوگا۔ حاکم کے لیے بالکل کسی بھی قسم گنجائش نہیں کہ وہ قرآن و سنت اور اجماعِ امت کے خلاف کسی بھی قسم کا کوئی قانون بنائے اور قانونی اقدام کرے۔ اگر حاکم /ارباب اقتدار یا کوئی مقتدر طبقہ کوئی فیصلہ یا اقدام اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام وسنت رسول اللہ کے خلاف کرے گا تو وہ سراسر ظلم ہوگا۔ انصاف کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں واضح ارشاد ہے'' ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الظالمون'' (۲۳) یعنی جو لوگ ان احکام کے مطابق فیصلہ (امور مملکت نہ چلائے) نہ کریں جو اللہ نے نازل فرمائے ہیں، تو وہ لوگ ظالم ہیں''۔

۲... حاکم کا شوریٰ سے مشورہ لینا:۔ فقہ اسلامی کے نزدیک سربراہ مملکت کو شوریٰ سے مشورہ کرنا واجب ہے، اقتدار حاصل ہونے کے بعد تو حاکم یا خلیفہ پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی شوریٰ سے تمام امور میں مشورہ کرے، فقہاء کرام کے نزدیک جو بھی حاکم سرکاری امور چلانے میں مشورہ نہیں کرتا یا لیتا وہ معزولی کا مستحق ہے۔ قرآن کریم میں بھی ارشاد ہے'' وشاورہم فی الامر، فاذا عزمت فتوکل علی اللہ'' (۲۴) یعنی: ''ان مسلمان عوام یا رعیت) سے مشورہ کیا کرو، پھر جب تم عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ) کرو''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ بہت زیادہ مشورہ کا اہتمام فرماتے تھے۔ مشورہ آپ کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ آپ اکثر معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابو ھریرہ سے روایت فرماتے ہیں ''مارأیت أحداً قطّ أکثر مشورۃ لأصحابہ من رسول للہ '' (۲۵) یعنی: ''میں نے رسول اللہ سے زیادہ کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا''۔

۳... عدل و انصاف کا قیام: ۔ عدل و انصاف اسلامی معاشرے کا ایک اہم اور بنیادی ستون ہے۔ عدل و انصاف ہی کی وجہ سے ہی حقدار حق پالیتا ہے اور مجرم سزا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل'' (۲۶) یعنی: '' جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔ ایک اور جگہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ''وان حکمتم فاحکم بینہم بالقسط، ان اللہ یحب المقسطین'' (۲۷) یعنی: ''اور اگر تم ان کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی وارثی ونفسی) کا ارشاد گرامی ہے کہ ''انما أھلک الذین قبلکم أنھم کانوا اذا سرق فیہم الشریف ترکوہ واذا سرق فیہم الضعیف أقاموا علیہ الحد. وأیمُ اللہ أنّ فاطمۃ بنت محمّد سرقت لقطعت یدھا'' (۲۸) یعنی: '' جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں، انہیں اسی چیز نے ہلاک کیا کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے، اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کردیتے، اور اللہ کی قسم اگر محمد (ﷺ) کی

بیٹی فاطمہ بھی چوری کریگی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹوں گا''۔
مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں''چنانچہ اسلامی حکومت کی تاریخ میں ایسی بہت سی تابناک مثالیں موجود ہیں کہ سربراہ حکومت پر نہ صر مقدمہ چلایا گیا، بلکہ قاضی نے اس کے خلاف فیصلہ دیا۔ حضرت علی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ امیرالمؤمنین تھے، اس وقت قاضی شریح نے ایک یہودی کے مقابلے میں ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ حضرت علی کی ایک زرہ گم ہو گئ تھی۔آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھی جو اسے بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہودی نے کہا کہ یہ تو میری زرہ ہے اور میرے قبضے میں ہے۔چنانچہ معاملہ قاضی شریح رحمۃ اللہ کی عدالت میں پہنچا۔ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے گواہ مانگے۔ حضرت علی نے ایک گواہ قنبر کو پیش کیا اور دوسرے گواہ کے طور پر اپنے
بیٹے کو پیش کیا۔ حضرت قاضی شریح نے فرمایا کہ بیٹے کی گواہی اپنے باپ کی حق میں قبول نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ یہودی کے حق یںفیصلہ کردیا'' (۲۹)۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بے لاگ عدل وانصاف مشہور ہے۔صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج تک ان کے عدل وانصاف کی گواہیاں دی جاتی ہیں۔ یہ گواہیاں دینے والے مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ ''سب سے بڑی چیز جس نے ان (عمر) کی حکومت کو مقبول عام بنادیا اور جس کی وجہ سے اہل عرب ان کے سخت گیر احکام کو بھی گوارا کرلیتے تھے ' یہ تھی کہ ان کا عدل

وانصاف ہمیشہ بے لاگ رہا، جس میں دوست 'دشمن کی تمیز نہ تھی۔ ممکن تھا کہ لوگ اس بات سے ناراض ہوتے کہ وہ جرائم کی پاداش میں کسی کی عظمت وشان کا مطلق پاس نہیں کرتے لیکن جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ خاص اپنی آل واولاد اور عزیز واقارب کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ ہے تو لوگوں کو صبر آ جاتا تھا۔ ان کے بیٹے ابو شحمہ }
ابو شحمہ کے قصے میں واعظوں نے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں لیکن اس قدر صحیح ہے کہ حضرت عمر نے ان کو شرعی سزا دی اور اسی صدمہ سے انہوں نے انتقال کیا' دیکھو معارف بن قتیبہ، ذکر اولاد عمر { نے جب شراب پی تو خود اپنے ہاتھ سے ان کو ۸۰ اسی) کوڑے مارے اور اسی صدمے سے وہ بیچارے قضا کر گئے۔ قدامہ بن مظعون جو) ان کے سالے اور بڑے رتبے کے صحابی تھے' جب اسی جرم میں ماخوذ ہوئے تو اعلانیہ ان کو ۸۰ درے لگوائے۔ (۳۰)۔

آج ہم اپنے ارد گرد نظریں دوڑاتے ہیں تو ہمیں اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ دعویٰ کی حد تک تو سب کرتے ہیں مگر عملی طور پر ایسا دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ہر حاکم اور ہر نظام حکومت زبان و بیان سے تو انصاف اور عدل کی بات کر رہا ہوتا ہے اورڈھنڈورا پیٹ رہا ہوتا ہے۔ اس نے جو بھی جائز ناجائز طریقہ اختیار کیا ہوا ہے اس سے برحق اور انصاف پر مبنی سمجھتا ہے۔ اور اس پر مصر بھی ہو جاتا ہے لیکن عدل و انصاف کے ساتھ ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ آج کی جدید جمہوریت کا تو نعرہ ہی انصاف اور مساوات ہے لیکن عملی طور پر جمہوریت کی تمام اقسام میں سربراہ مملکت اور دیگر اہم شخصیات کو استثنٰی کے

نام پر وہ کھلی چھوٹ مل جاتی ہے کہ الامان والحفیظ۔آج کی جمہوری سلطنتوں کے آئین اور قوانین ہیں لکھا ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت پر کسی بھی کسی کا کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا ہے۔ قانون اور آئین کی رو سے ہی وہ بری الذمہ قرار پاتا ہے بلکہ آئین اسی کا محافظ بن جاتا ہے۔یہی بات اسلام کے تصور انصاف و نظام عدل کے سراسر مخالف اور متضاد ہے۔اسلام میں کسی کو کوئی استثنیٰ حاصل نہیں۔

۴... نقص امن کی ممانعت/قیام امن: ۔ اسلام کا سیاسی نظام قیام امن پر بے حد زور دیتا ہے۔امن کی غیر موجودگی میں پورے معاشرے کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔معاشرتی امن ہو تو معاشرے میں پیار و محبت، مساوات ، حقوق کی حفاظت اور عدل وانصاف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے'' ولاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا'' (۳۱) یعنی : ''کسی سرزمین میں اصلاح ہوجانے کے بعد خرابی نہ کرو''۔ اگر کوئی خرابی کریں، حکومتی رٹ کو چیلنج کریں اور لاانیڈ آرڈر کا خیال نہ کریں تو مسلم حکمرانوں اور اسلامی ریاست کافریضہ ہے کہ وہ اس سے بزرو طاقت روکے اور امن اور قیام امن میں خلل ڈالنے والوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹے۔

۵... ظلم وستم سے بچنا/ظلم باعث زوال ہے: ۔ معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کافرمان گرامی ہے کہ کافر کے ساتھ حکومت چل سکتی ہے مگر ظالم کے ساتھ نہیں۔قرآن کریم کا مطالعہ بتاتا ہے

کہ جن اقوام وملل نے ظلم کیا، جن بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور جن معاشروں میں ظلم پروان چڑھتا رہا ان کو بالاخر زوال آگیا۔ تباہی و بربادی اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر بن گیا۔ ارشاد باری ہے'' وکم قصمنا من قریۃ کانت ظالمۃ وانشانا بعد قوماً آخرین'' (۳۲) ۔یعنی: '' اور ہم نے بہت سی بستیاں جہاں کے رہنے والے ظالم (کافر تھے) غارت کردی اور ان کے
بعد دوسری قوم پیدا کردی'' .آج مسلم دنیا بالخصوص پاکستان اس حوالے سے کمزور دکھائی دے رہا ہے۔ہر اس آدمی کی عزت کی جاتی ہے جو ظلم اور ستم کو روا رکھتا ہے۔انسانوں کا قتل کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں۔وہ اپنی طاقت اور مال و متاع کے زعم بیں ظلم وستم اور بربریت کے نئے نئے باب قائم کرتا جاتا ہے مگراس سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ڑے بڑے مجرم دندناتے پھرتے ہیں۔ان ظالموں نے غریب رعایا پر ہر قسم کا ظلم یعنی قتل، معاشی، سماجی اور تعلیمی اور عدالتی ظلم روا رکھا ہوا ہے، پھر بھی وہ معزز اور صاحب اقتدار ہیں۔

۶... دنیاوی جاہ ومنصب کی وجہ سے روزجزا کو نہ بھولنا: ۔ یہ ذہن میں رہے کہ حاکم بننا اتنا ضروری نہیں کہ اس کے لیے باقاعدہ جدوجہد کی جائے۔یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے جس سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ہاں اگر اشد ضرورت یعنی اسلامی معاشرہ کی اشد ضرورت کی وجہ سے کسی پر یہ ذمہ داری آجائے تو اس میں

امانت اور دیانت کے ساتھ ذمہ داری سمجھ کر امور مملکت نبھانے چاہیے۔ آپ کا فرمان مبارک ہے'' الامام راع و مسئول عن رعیتہ'' (۳۳)۔ حضرت ابو ذر غفاری ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ایک دفعہ پیارے آقا کی خدمت میں خواہش ظاہر کی مجھے کسی جگہ حکومت دے دی جائے۔ اس پر پیارے آقا نے کیا خوبصورت ارشاد فرمایا: ''یا اباذرّ! انکَ ضعیف، انہا امانۃ، ویوم القیامۃ خزی وندامۃ، الّا من أخذہا بحقہا وأدّی الذی علیہا فیہا'' (۳۴) یعنی '' اے ابوذر! تم ایک کمزور آدمی ہو، اور یہ حکومت و سیادت) ایک امانت ہے اور روز جزاء پریشانی اور پیشمانی ہے، الا یہ کہ کوئی) شخص برحق طریقے سے یہ امانت لے، اور اس پر اس کے جو حقوق عائد ہوجاتے ہیں وہ پورے پورے ادا کرے''۔ ہمارے ہاں تو معاملہ بالکل الٹ ہے۔ ہم حصول اقتدار کے لیے باقاعدہ قتل و غارت اور لعن وطعن کا بازار گرم کیے رکھتے ہیں۔ پروپیگنڈہ ایک عام سی روایت بن چکی ہے جس میں دوسرں کی تضحیک لازمی ہے اور اقتدار کے حصول کے بعد مزید شیر ہو کر روز آخرت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ چند دنوں کی جاہ و جلال اور اقتدار و اختیار کے لیے اصلی اور اخروی زندگی کی نہیں بھولنا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو انجام قارون سے مختلف نہ ہوگا۔ ہمیں فرعونیت اور قارونیت سے حتی الوسیع بچنا چاہیے۔ اللہ رب ذوالجلال کا صاف فرمان ہے کہ'' ولاتنس نصیبک من الدنیا'' (۳۵) یعنی اے قارون! تو دنیا کے گھمنڈ میں آکر اپنے نجات کا حصہ (آخرت میں لیجانا) کو فراموش نہ کر''

۷... سماجی انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانا:۔ اقوام وملل اور مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام سماجی انصاف کی فراہمی اور معاشرتی مساوات کا سب سے بڑا علمبردار، قائل اور سچا داعی مذہب ہے۔ اسلام نے معاشرے میں موجود تمام انسانوں کو ایک جیسا مقام سے نوازا ہے۔ اسلام میں رنگ و نسل، قوم و قبیلہ،ذات پات، دولت وثروت،اختیار واقتدار، عرب وعجم، غریب وامیر،کالاو گورا، گلگتی بلتی، پختون پنجابی، سندھی بلوچی وغیرہ وغیرہ ہونے پر کوئی خصوصی امتیاز روانہیں رکھا جائے گا۔ اور نہ ہی مرتبہ و شرف کو کسی بناپر تقسیم کیا ہے بلکہ اس کے تقسیم کا واحد قاعدہ واصول صرف اور صرف ''تقویٰ وللٰہیت'' پر قائم ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے''یا أیہا الناس انا خلقنٰکم من ذکرٍ و انثیٰ و جعلنٰکم شعوباو قبائل لتعار فوا،ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم''(۳۶) یعنی '' اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔اور تم کو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسروں کو پہچان سکو، اللہ کے نزدیک زیادہ متقی ہی عزت والا ہے''۔ان احکام کی روشنی میں سماجی انصاف کا قیام ایک اچھے حاکم بننے کے لیے ضروری ہے۔ جب تک و معاشرے کے تمام طبقات کو ایک نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ کسی خاص وجہ سے کسی کو ترجیح

دیتا ہے تو یہ اس معاشرہ اور حاکم دونوں کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔اچھا اور برا ہونا اور انسانیت کا احترام خدائی قوانین اور سیرت نبوی کے مطابق

ہونا چاہیے نہ کہ ذاتی خواہش کے مطابق۔ انصاف کی فراہمی کے لیے خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ سامنے رکھنا چاہیے اور اپنے اعزہ، احباب، ہم مسلک اور ہم زبان لوگوں کی خواہشات کے مطابق احکامات صادر نہیں کرنے چاہیے، خدا کا ارشاد ہے ''فاحکم بینہم بماانزل اللہ والاتتبع اَھوا ئَھم'' (۳۷)۔ یعنی: ''لہٰذا ان کے درمیان اس حکم کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ تعالی نے نازل فرمایا ہے۔ اور ان لوگوں کی خواہش (یعنی ان کی پسند اور ناپسند اور ناجائز مطالبات) کے پیچھے مت چلو''۔

عمدہ حکمرانی کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے رہنما اصول:۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے مصر کے گورنر مالک اشتر کو ایک طویل خط تحریر کیا۔ یہ صرف ایک خط نہیں بلکہ نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ امیر المؤمنین نے نہایت اختصار اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ حکمرانی' سیاست و سیادت اور سماجی انصاف اور قیام عدل کے جامع اصول وضع کیے ہیں۔ چند جملے درج کیے دیتے ہیں۔

ا۔ ''ثم اختر للحکم بینَ النّاس اَفضل رعیّتک فی نفسک ممّن لاتضیق بہ الامور ' ولا تمحکہ الخصومۃ، ولایتمادی فی الزّلۃ ولایحصر من لفییَ الی الحق اذا عرفہ ، ولا تُشرفُ نفسہٗ علی طمع، ولایکتفی بادنٰی فہم دن اَقصاہ، واوقفھم فی الشّبہات وآخذہم بالحجج'' یعنی '' پھر ملک میں انصاف قائم کرنے کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا جو تمہاری نظر میں سب سے افضل ہوں، ہجوم معاملات سے تنگ دل نہ ہوتے ہوں، اپنی غلطی پر اڑے رہنا ٹھیک نہ سمجھتے ہوں' اور حق

کے ظاہر ہونے کے بعد باطل سے چمٹے نہ رہتے ہوں۔ طمع نہ ہوں، اپنے فیصلوں پر غور کرنے کے عادی ہوں، فیصلے کے وقت شکوک و شبہات پر رکنے والے ہوں، صرف دلائل کو اہمیت دیتے ہوں۔'' (۳۸)

۲... '' ان شرّ وُزرائک مَن کان للاشرار قبلک وزیراً، ومَن شرکہم فی الاثام فلایکونَنّ لک بطانۃً، فانّہم اَعوانُ الاثمۃِ واخوان الظّلمۃِ، واَنت واجدُ منہم خیرَ الخلف ممن لہ مثلُ آرائہم و نفاذِہم ،ولیس علیہ مثل آصادہم واَوزارہم ممن لم یعاون ظالماً علی ظلمہ و آثماً علی اثمہ '' یعنی: ''بدترین وزیر وہ ہے جو شریروں کی طرف داری کرے اور گناہوں میں ان کا ساتھی ہو۔ ایسے آدمی کو اپناوزیر نہ بنانا۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ گنہ گاروں کے مددگار اور ظالموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ تمہیں ایسے آدمی مل جائیں گے جو عقل وتدبیر میں ان کے برابر ہونگے مگر گناہوں سے ان کی طرح لدے نہ ہونگے۔نہ کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی ہوگی،نہ کسی گناہ گار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہوگا''۔ (۳۹)

۳... '' وان افضل قُرۃ عین الولاۃِ استقامۃ العدل فی البلاد، وظہور مودّۃِ الرّعیۃَ۔ وانہّ لاتظہر مودّتہم الابسلامۃ صدرورہم ، ولا تصح نصیحتہم الا بحیطتہم علی وُلاۃِ امورہم وقلّۃ استثقال دُوَلہم ،وترکِ استبطائِ انقطاعِ مُدّتہم ،فافسح فی آمالہم ،وواصِل فی حسنِ الثناء علیہم ''یعنی حاکم کی آنکھ کی ٹھنڈک کس چیز میں ہونا چاہیے،اس میں کہ خود انصاف قائم کرے، اور

رعایا اس سے اپنی محبت ظاہر کرتی رہے۔رعایا کی محبت ظاہر نہیں ہوتی جب تک اس کے دل سلیم نہ ہوں اور رعایا کی خیر خواہی صحیح نہیں ہوتی جب تک اسے حاکم سے سچی محبت نہ ہو،

اس کی حکومت کو بوجھ اور اس کے زوال میں دیر کو وبال نہ سمجھتی ہو۔لہٰذا ضروری ہے کہ رعایا کی امیدوں کے لیے میدان کشادہ رکھنا، اس کی دل جوئی برابر کرتے رہنا'' (۴۰)

سماجی انصاف اور عمدہ حکمرانی کے قیام کا نتیجہ : ۔ سماجی انصاف کو یقینی بنانے اور قیام عدل اور عمدہ طرز حکمرانی سے جو نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے یا ماضی میں ہوا ہے اس کی ایک جھلک مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی صاحب کی زبانی سنیں: ''تمام مسلمان حق کے مددگار بن گئے تھے، ان کا کام مشورہ سے ہوتا تھا، خلیفہ جب تک خدا کا مطیع رہتا وہ عوام)اس کے مطیع ہوتے اور اگر نافرمانی کرتا تو اطاعت باقی نہ رہتی۔حکومت کا) شعار'' لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'' بن گیا تھا، وہ مال اور خزانے جو سلاطین اور امراء کا ذاتی جائیداد سمجھے جاتے تھے اب اللہ کی امانت سمجھے جانے لگے تھے۔اس کی رضا میں خرچ اور صحیح محل پر صرف کیے جاتے۔اور مسلمان اس دولت کے امین اور متولی تھے'' (۴۱)

مختلف مسالک کی موجودگی ' سماجی انصاف کے لیے رکاوٹ نہیں :۔ میں مکمل وثوق اور دعوے سے کہتا ہوں کہ کسی بھی علاقے میں مختلف مسالک اور مذاہب کا پایا

جانا سماجی انصاف کے قیام کے لیے قطعاً رکاوٹ نہیں۔ انسانی تاریخ بالخصوص برصغیر کی تاریخ کا عمیق مطالعہ بتاتا ہے کہ ادیان مختلفہ اور مسالک متعددہ کا کسی ریاست میں ہونا، کبھی بھی سماجی انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوا۔ مولانا مفتی محمد زاہد صاحب (۴۲) اپنے ایک تحقیقی مضمون میں لکھتے ہیں '' برصغیر میں اہل السنتہ والجماعتہ ہمیشہ اکثریت میں رہے ہیں۔ تاہم اہلِ تشیع کا بھی ہمیشہ قابل ذکر وجود رہا ہے۔ بعض علاقوں میں ان کی تعداد خاصی زیادہ رہی ہے۔ بعض جگہوں پر مقامی حکمران یا نواب وغیرہ اہلِ تشیع میں سے رہے ہیں۔ نظریاتی طور پر اہل السنتہ اور اہلِ تشیع کے درمیان بڑے نازک مسائل میں اختلاف موجود رہا ہے۔ ان مسائل میں بحث و مباحثہ اور کتابیں لکھنے کا سلسلہ بھی رہا ہے۔ لیکن سوائے چند استثنائی مثالوں کے یہ اختلاف کبھی ایک دوسروں کے لیے جانی خطرات کا باعث نہیں بنا۔ (۴۳) اگے چل کر لکھتے ہیں کہ '' یہ کہنا تو شاید خالی از مبالغہ نہ ہو کہ برصغیر میں اہل السنتہ اور اہلِ تشیع کے تعلقات بہت مثالی اور قابل رشک رہے ہیں، لیکن یہ کہنا ضرور درست ہوگا کہ ان میں کبھی اتنا زیادہ اور طویل عرصے کا تناؤ نہیں رہا جتنا ہمارے ہاں اسی (۸۰) کی دہائی کے بعد نظر آتا ہے''۔ (۴۴)

ماحاصل/خلاصہ کلام: ۔ ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ سماجی انصاف اور بہترین قیام عدل کے بغیر کوئی معاشرہ/ریاست/حکومت و سیادت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ اللہ کا ہی فرمان ہے '' وما کنا مہلک القری الا واھلہا

ظٰلمون'' (۴۵) یعنی: '''اور ہر گز نہیں غارت کرنے والے بستیوں کے مگر جبکہ وہاں کے لوگ گناہ گار ہوں.''۔ سماجی ظلم کے نتیجے میں حالیہ دنوں یں مشرقی وسطیٰ میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ سماجی انصاف کے بغیر نسلی تعصبات اور امتیازات کا خاتمہ ناممکن ہے۔ اعلیٰ اقدار کی ترویج اور عدل وانصاف کا قیام خواب بن کر رہ جائے گا۔ قانونی اور معاشرتی مساوات کا جنازہ نکل کر رہ جائے گا۔ مذہبی آزادی کی جگہ مذہبی دل آزاری لے گی۔ مال وجان ، عزت وآبرو اور بنیادی انسانی حقوق بری طرح پامال ہونگے۔ شخصی آزادی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ تعلیم وتعلم اور روشن خیالی وفکری کے دروازے بند ہو کر رہ جائیں گے۔ اطاعت حکومت، قانون کی پابندی، آئین کی بالادستی، لاائینڈ آرڈر اور باہمی تعاون ایثار، اخلاقی صفات، رواداری، رفاہ عامہ اوران جیسی بے شمار باتیں مفقود ہونگیں۔ معیشت کی گاڑی بیٹھ جائے گی۔ احتساب ،سزا وجزا کا تصور ختم ہوگا۔ تب چوروں کا راج ہوگا۔ اندھیر نگری ہوگی۔ ڈاکوؤں کے موج ہونگے۔ لٹیرے مسلط ہونگے۔ حرام

حلال کی تمیز ختم ہوجائے گی۔ غربت ، بیروزگاری، کرپشن، اقرباء پروری اور افراتفری شیش ناگ کی طرح پھن نکالیں گے۔ نمود ونمائش عام ہوگا۔ تجارتی اور معاشرتی اخلاقیات کا جنازہ نکلے گا۔ ذخیرہ اندوزی جڑیں پکڑے گا۔ جوا بازی معمول بن جائے گا۔ سماجی فلاحی اور معاشی انصاف خواب بن جائے گا۔

ہم بار دگر عرض کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے'' حکومت ہر اس شخص کی

ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو''۔خدائی احکامات اور سنت نبوی کے مطابق جو نظام ہوگا، جو ریاست چلے گی اور جو حاکم اس کا عملی نمونہ بنے گا تو اس ریاست میں زمین اپنے چھپے ہوئے قیمتی خزانے اُگل دے گی۔ اسمان اپنی بے انتہا نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے۔ افلاس و تنگی، ظلم وجبر، تشدد و دہشت اور انتہا پسندی اور دیگر مکروہات ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔اور ہر طرف امن و آمان، خوشحالی و خوش بالی اور سماجی انصاف قائم ہو جاتا ہے۔ نعمتوں اور رحمتوں کا دورہ دور ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مراجع و مصادر/Reference

۱)....مصباح اللغات' ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی، ص 532، مکتبہ برہان ' اردو بازار جامع مسجد دہلی ، بھارت

(2)....GEM Advance Practical Dictionary,S.A.Bhatti and M.B. Bhatti, page no,1262. Azhar Publishers Lahore-Pakistan

۳) .... شہرت حصہ اول ،پروفیسر ڈاکٹر محمد سرور' ص ۳۴، علمی کتب خانہ لاہور)

(۴).... Element of CIVICS, Part 1. Page no 2,By: Mazhar-ul-Haq, Bookland

۵)....افکار سیاسی (مغرب و مشرق) صلاح الدین ناسک، باب نمبر ۴ (جمال الدین)

افغانی) ص ۵۸۱، عزیز پبلیشرز اردو بازار لاہور

(۶).... Online Dictonary,wikipedia

(۱....(۷From Wikipedia, the free encyclopedia,online

۸)....رواہ مسلم عن بی سعید الخدری ، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن)
المنکر۔ حدیث نمبر ۱۸۸

۹)....القرآن، سورۃ ص، آیت نمبر ۲۶)

۱۰)... محمد بن اسماعیل البخاری،الصحیح البخاری، کتاب الانبیائ، باب ماذکر عن بنی)
اسرائیل، ماخوذ از: قاضی سلیمان منصور پوری. رحمۃ للعالمین، ج نمبر اول. ص ۱۰.
الفیصل ناشران وتاجران اردو بازار لاہو

۱۱)....القرآن، سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۳۱)

۱۲)...القرآن، سوربقرہ: آیت نمبر ۱۸۸)

۱۳)....اسلامی نظام خلافت اور سماجی ذمہ داریاں، مولانا محمد زاہد اقبال، ص نمبر)
(۲۰۱، ادارہ نشریات محمود حسن

۱۴)....شاہ اسماعیل شہید، منصب و امامت، ص نمبر ۳۰)

۱۵)....قاضی سلیمان منصور پوری، رحمۃ اللعالمین، ص ۹۲،۹۱، ج نمبر اول.)
الفیصل ناشران وتاجران اردو بازار لاہور

۱۶).... کوثر نیازی، اسلام ہمارا رہنما ہے، ص، ۹۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز انا کلی لاہور)

۱۷).... محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب اثم بن قتل معاہداًبغیر جرم: جلد اول، ص ۴۴۸، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی

۱۸)....علامہ علاؤالدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: جلد ۷، ص ۱۶۷، مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

۱۹... شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، الفاروق (سوانح عمری حضرت عمرفاروق) ص۲۵۸) اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور' دیکھو: تاریخ ابو جعفر محمد بن جریر طبری: فتح بیت، المقدس

۲۰)... شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، الفاروق (سوانح عمری حضرت عمرفاروق) ص) ۲۶۱،اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور' دیکھو: کتاب الخراج ص ۶۸

۲۱)....ابوالحسن علی ندوری، انسانی زندگی پر مسلمانوں کا عروج وزوال، ص ۱۳۶، مجلس نشریات اسلام کراچی

۲۲)... شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، الفاروق (سوانح عمری حضرت عمرفاروق) ص) ۱۷۳،اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور

۲۳) (۱۷)....القرآن، سورۃ المائدۃ: ایت نمبر ۴۵)

۲۴)...القرآن، سورۃ آل عمران: ایت نمبر ۱۵۹)

۲۵)... مسند احمد، مسند الکوفیین، حدیث المسور بن مخزمۃ و مروان بن الحکم، حدیث نمبر ۱۸۹۲۸

۲۶)..... .القرآن، سورۃ النسائ: ایت نمبر ۵۸)
۲۷)....القرآن، سورۃ المائدہ:ایت نمبر ۴۲)
۲۸)....محمد بن اسماعیل بخاری ،الصحیح البخاری، (قبیل کتاب المناقب، حدیث نمبر)
۳۴۷۵
۲۹)... مفتی محمد تقی عثمانی،اسلام اور سیاسی نظریات ،ص ۱۹۲تا ۱۹۳،مکتبہ معارف)
القرآن کراچی :اخبار القضاۃ لوکیع، فی اخبار القاضی شریح ص ۳۶۱
۳۰)... شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، الفاروق (سوانح عمری حضرت عمرفاروق)ص)
۲۸۷،اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور
۳۱)....القرآن، سورۃ الاعراف: آیت نمبر ۸۵)
۳۲)....القرآن، سورۃ الانبیائ: آیت نمبر ۱۱)
۳۳)... محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح البخاری، کتاب الجمعہ : جلد اول ، ص ۱۲۲،)
ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی اور کتاب الاحکام ، جلد ثانی، ص
۱۰۵۷،المیزان، ناشران و تاجران کتب، اردو بازار لاہور۔
۳۴).... رواہ مسلم، باب کراہۃ الامامۃ بغیر ضرورۃ: حدیث نمبر ۴۶۸۳)
۳۵)....القرآن، سورۃ القصص: آیت نمبر ۷۷)
۳۶)....القرآن، سورۃ الحجرات :آیت نمبر ۱۳)
۳۷)....القرآن، سورۃ المائدۃ: آیت نمبر ۴۸)
۳۸).... نہج البلاغۃ، (خطبات ،اقوال و خطوط حضرت علی) مترجمین: سید رئیس)

احمد جعفری؛ عبدالرزاق ملیح آبادی، مرتضٰی حسین فاضل اور نائب حسین نقوی، جلد ۲، (ص۶۶۸تا۶۶۹، شیخ غلام علی اینڈ سنز، (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز لاہور

۳۹) .... نہج البلاغۃ ، (خطبات ،اقوال و خطوط حضرت علی) مترجمین : سید رئیس احمد جعفری؛ عبدالرزاق ملیح آبادی، مرتضٰی حسین فاضل اور نائب حسین نقوی، جلد ۲، ص۶۶۴، شیخ غلام علی اینڈ سنز، (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز لاہور

۴۰) .... نہج البلاغۃ ، (خطبات ،اقوال و خطوط حضرت علی) مترجمین : سید رئیس احمد جعفری؛ عبدالرزاق ملیح آبادی، مرتضٰی حسین فاضل اور نائب حسین نقوی، جلد ۲، ص۶۶۸، شیخ غلام علی اینڈ سنز، (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز لاہور

۴۱) ..... ابوالحسن علی ندوری، انسانی زندگی پر مسلمانوں کا عروج وزوال، ص۱۳۷،) مجلس نشریات اسلام کراچی.

۴۲) ..... شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد۔)

zahidimdadia@yahoo.com

۴۳) ..... مولانا مفتی محمد زاہد، مقالہ بعنوان ''برصغیر کی دینی روایت میں برداشت) کا عنصر'' ماخوذ ماہنامہ الشریعہ، جلد نمبر: ۲۴، شمارہ نمبر: ۶، ماہ جون 2013ئ، ص، ۱۰، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

۴۴) .... مولانا مفتی محمد زاہد، مقالہ بعنوان ''برصغیر کی دینی روایت میں برداشت کا) عنصر'' ماخوذ ماہنامہ الشریعہ، جلد نمبر: ۲۴، شمارہ نمبر: ۶، ماہ جون 2013ئ، ص، ۱۲، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ،

۴۵)....القرآن، سورۃ القصص: ایت نمبر ۵۹)

پتھر پر اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، شہادتِ حق

یہ ایک حقیقت ہے کہ حقیقت چُھپتا نہیں۔ حق و صداقت کو منوایا نہیں جاتا بلکہ وہ اپنے آپ خود منواتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وہ عظیم الشان انسان ہیں جس کی نظیر انسانوں میں ڈھونڈنا عبث بلکہ گناہ ہے۔ یہ وہ نبی ہے جس نے مظلوموں کی داد رسی کی اور محروموں کو ان کا حق دلایا، قیام امن و نگرانی حقوق کے لیے انجمنیں قائم کی۔ نزول وحی نبوت کے مقام سے سرفراز ہونے سے قبل ہی آپ '' الصادق والامین '' سے ملقب تھے۔ آپ وہ انسان ہیں جو جملہ قبائل کی طرف سے حَکم مقرر ہوئے، حجرِ اسود کا واقعہ برہان ہے۔ میرے نبی نے غیروں کو عزت سے نوازا، کافروں کی تکریم کا حکم دیا، سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ طائف میں جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق اور تبلیغِ اسلام کو سننے سے انکار کیا تھا اور اوباشوں کو آپ کی تحقیر و تضحیک پر مامور کر دیا تھا اور آپ پر پتھر پھینکوائے تھے اور بعد میں حضرت عروہ جو کہ ان کے سردار بھی تھے کو تبلیغِ اسلام کی وجہ سے شہید کیا تھا، یہی لوگ جب دربارِ نبی میں حاضر ہوئے تو حضرت مغیرہ بن شعبہ کی درخواست پر آپ نے ایک تاریخ ساز جملہ ارشاد فرمایا کہ '' لا امنعک ان تکرم قومک '' یعنی میں منع نہیں کرتا کہ تم اپنی قوم کی عزت کرو۔ کاش ! تعلیمات

ٹیری جونز 'سام بیسائل جیسے دوسرے گستاخانِ رسول (Chapter) نبوی کا یہی چیپٹر اور غلیظ باطن رکھنے والے بدبودار انسانوں کو سمجھ آ جاتا۔کتنا درد اور دکھ کی بات ہے کہ مغرب حیوانات ' جمادات و نباتات تک کے حقوق کا علمبردار نظرآتا ہے مگر عالم اسلام کے نیک جذبات و حقوق اور نبی رحمت کے حقوق کو علی الاعلان پامال کرتا نظرآتا ہے جس سے آج کی گلوبل ویلیج میں بجائے محبت و مودت کے 'نفرت و کدورت کے جذبات پروان چڑھ رہے ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید اور اٹل حقیقت ہے کہ نبی ملحم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے احسانات اُمتِ محمدیہ تک محصور و محدود نہیں بلکہ عالم انسانیت' حجر و شجر اور حیوانات تک کو محیط و مبسوط ہیں۔آپ کی رسالت کی گواہی صرف انسانوں نے نہیں حیوانات اور حجروشجر' چرندوپرند اور اللہ تعالٰی کی دوسری تمام مخلوقات نے بھی دی ہے۔اور یہ گواہی دینے والی مخلوقات کا کسی خاص علاقے کے ساتھ خاص ہونا بھی لازم نہیں'گلگت بلتستان کے مسلمانوں کی طرح یہاں کے پتھر بھی آپ کی ذات اقدس کی بلندی' اوصاف حمیدہ'شان جلالی' رحمت کاملہ'نبی برحق اور رسالت حق کی گواہی دے چکے ہیں۔ہم آج کی محفل میں ایک ایسے پتھر کا ذکرِ خیر چھیڑنا چاہتے ہیں جس نے یہ گواہی بدرجہ اتم دی ہے۔جامعہ نصرۃ لاسلام گلگت بلتستان کا قدیم دینی درسگاہ ہے۔جامعہ کے بانی مبانی حضرت مولانا قاضی عبدالرزاق صاحب ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں

اور حضرت مدنی قدس سرہ کے تلمیذ خاص ہیں۔جامعہ کی آبیاری قاضی صاحب کے ہونہار تلامذہ بالخصوص مولانا گل شیر خان ' مولانا نذیراللہ خان اور دوسرے کبار علماء نے کی ہے۔جامعہ نصرۃ الاسلام کی ایک بہترین لائیبریری ہے جہاں نایاب و نادر کتب ہیں۔ جناب منصورالزمان صدیقی صاحب مدظلہ نے اپنی ذاتی لائیبریری 'جامعہ کی لائبیریری کو ہدیۃً دی ہے۔ جامعہ کی لائبریری میں ایک خوبصورت پتھر ہے۔ جس پر واضح طور پر '' محمد'' لکھا ہوا ہے۔ اس پتھر کا وزن کم و بیش چھ (6) من ہوگا۔دراصل یہ پتھر ضلع دیامر کا معروف علاقہ گوہرآباد گیس کے پل کے سامنے سے دریافت کیا گیا ہے۔1976ء کوجناب محمد عالم صاحب (ممبر چیف کورٹ) نے گیس پل کی تعمیر کے وقت بلاسٹنگ کے بعد یہK.K.Hکے بالمقابل کے۔کے۔ایچ میں دیکھا ہے۔ مقدس پتھر روڈ میں پڑا ہوا تھا۔ محمد عالم صاحب نے کچھ جوانوں کی مدد سے اس پتھر کو ایک اونچی جگہ میں احترام سے رکھوا دیا۔ بعد میں کسی نے نیچے گرادیاتو دوبارہ بڑی مشکل سے اوپر روڈ پر لاکر احترام سے رکھوا دیا۔ان کے بقول وقتاً فوقتاً وہ اس پتھر کو دیکھتے رہتے۔تب تک اس کی شہرت ہوچکی تھی۔ محمد عالم صاحب کو ابھی تک قلق ہے کہ انہوں نے اس حجر متبرک کو اپنے گھر محفوظ کیوں نہیں رکھا۔ وہاں سے حجر مقدس کو چلاس کے مشہور بسم اللہ ہوٹل (المعروف لالو ہوٹل) کے مالک الحاج داد علی المعروف لالو چچا نے اپنی جیپ میں ڈال کر گونر فارم اپنے گھر لے آئے۔ بقول الحاج داد علی صاحب کے ''چلاس کے مولانا عبدالباقی جو اس

وقت صوبہ سرحد کے وزیر تھے۔ ان کے پاس آئے اور کہا کہ وہ اس پتھر کو صوبہ سرحد کے گورنر جناب فضل الحق صاحب کو تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ اپنے والد صاحب سے مشاورت کرونگا۔ ان کے والد صاحب ان دنوں دعوت تبلیغ میں ملک کے مختلف علاقوں میں وقت لگا چکے تھے نے کہا کہ اگر یہ اس طرف گیا تو وہاں شرک و بدعت عام ہے' لوگ اس کی پوجا پاٹ شروع کریں گے جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔ تو میں نے مولانا عبدالباقی صاحب سے معذرت کی۔ بعد میں گلگت کی جامع مسجد کے خطیب مولانا قاضی عبدالرزاق صاحب نے بھی پیغام کہلوا بھیجا کہ وہ مقدس پتھر مجھ تک پہنچائے۔ ڈی سی شریف صاحب اور جج غزنوی صاحب ان دنوں چلاس میں ڈیوٹی کررہے تھے' دونوں قاضی صاحب کے داماد تھے کو میرے پاس بھیجا، مگر میں نے والد صاحب سے مشاورت کا کہہ کر ٹال دیا۔ پھر ایک دفعہ غالباً 1981ء کو حضرت قاضی صاحب خود ہمارے گھر میں تشریف لائے۔ اس وقت میں گھر پر موجود نہیں تھا۔ قاضی صاحب کے ساتھ اور علماء کرام بھی تھے۔ انہوں نے میرے گھر والوں کو سلام کیا اور کہا کہ ہم آپ کے مہمان ہیں۔ گلگت سے آئے ہیں۔ تو گھر والوں نے مہمان خانے میں بیٹھا کر ان معزز مہمانوں کو کھانا کھلایا اور خوب خاطر مدارت کی۔ آخر میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ میرے آنے کا اصل مقصد اس مقدس پتھر کو لے جانا ہے۔ تب میری شریک حیات نے حضرت قاضی مرحوم کو یہ متبرک پتھر لے جانے کی بخوشی اجازت دی۔ یوں قاضی صاحب رحمہ اللہ حکم پر ملک شریف صاحب ٹریکٹر بک کرواکے اس قیمتی اور متبرک پتھر کو

گلگت لے گئے۔ بعد میں میں نے گلگت جاکر حضرت قاضی مرحوم سے گزارش کی کہ وہ اس پتھر کو اپنی نگرانی میں ہی کسی متبرک و صاف جگہ پر رکھوادیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا اور مسلمانوں کے مرکزی عیدگاہ کے محراب میں احترام سے رکھوادیا''۔

ایک دفعہ کشمیر سے جناب سردار محمد عتیق صاحب (صدر مسلم کانفرنس آل جموں وکشمیر و سابق وزیراعظیم آزاد کشمیر) گلگت تشریف لائے تو حضرت قاضی مرحوم نے اس مبارک پتھر کی زیارت انہیں بھی کرائی۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو انتہائی قیمتی شئی ہے۔آپ اس کو کسی محفوظ جگہ منتقل کردیں۔ قاضی صاحب نے جامعہ نصرۃ الاسلام کی لائیبریری منتقل کردیا۔ بقول قاضی نثار احمد کے کہ '' حضرت والد گرامی کی چاہت تھی کہ مرکزی جامع مسجد گلگت میں کوئی چبوترہ بنایا جائے اور اس مقدس پتھر کو وہاں رکھ دیا جائے''۔ تاہم ایسا نہ ہوسکا۔ حضرت مولانا نذیراللہ خان مرحوم نے مدرسے کی ایک جائزہ رپورٹ میں اس کے بارے یوں لکھا ہے کہ '' قال اللہ تعالیٰ: وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل، أخی المشاھد ! انظر فی أحجار جلجت، التی تشھد برسالۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، فیا للاسف علی من ینکر ھذہ الرسالۃ من البشر''۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین ہر قسم کے چھوٹے بڑے گناہوں سے

معصوم ہوتے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی نبوت و رسالت و بعثت کا اولین تقاضا ہی یہی ہے کہ وہ عملی زندگی اور اپنے خیال و فکر' سوچ واحساس اور ارادے میں ہر قسم کے صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے پاک وصاف اور طاہر ہوں اور ہر قسم کی عصیان سے معصوم ہوں' اس لیے کہ بندگان خدا کو خدا وحدہ لاشریک کے پیغام پہنچانے میں کوئی کمی بیشی نہ کریں اور نیابت اللہ کے فرائض و ذمہ داریوں کو درست معنوں میں بلا افراط و تفریط ادا کر سکیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے اور یہ ایک طے شدہ معاملہ اور متفق علیہ عقیدہ و نظریہ ہے۔کاش مغرب اور مغرب کا ہزیانی میڈیا کو یہ تلخ حقیقت سمجھ آ جائے۔ مغرب اس بات پر تلا ہوا ہے کہ انسانیت کا محسن اور پیغمبر اسلام کی ناموس و عصمت پر کسی نہ کسی انداز میں وار کیا جائے۔ محسن کائنات اور مسلمانوں کی دل آزاری ان کا وطیرہ بن چکاہے۔خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے خبث باطن کو یوں بیان فرمایا ہے۔ ''قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر''۔ کہ '' بغض ان کے منہ سے ظاہر ہوچکا ہے اور جو کچھ (عداوت و دشمنی) ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ کہیں زیادہ ہے۔''۔ یہ ہے ان کی حقیقت، لہٰذا امت مسلمہ اور مسلم ریاستوں پر اجتماعی فرض ہوچکا ہے کہ وہ اس ناپاک اور غلیظ روش کے سدباب کے لیے مؤثر پلان بنائے اور اس پر عملی جامہ بھی پہنائے۔

جس نبی کی رسالت کی گواہی انسان تو انسان پتھر اور اللہ کی دوسری مخلوقات

بھی دیں آج اس نبی کی حرمت پر ناہنجار حملے کر رہے ہیں۔ کاش آسمانوں کو تسخیر کرنے والے اور چاند پر پہنچنے والے ' رسالت مآب کی حق و صداقت اور حرمت کا ان پتھروں سے ہی پوچھ لیتے کہ انھوں نے شہادتِ حق کس انداز میں دی ہیں۔ وماعلینا الا البلاغ

مناظرہ و مباہلہ" چند تجاویز"

اب کی بار پھر دھرتی کا خون گرم ہو رہا ہے۔ مولانا لدھیانوی صاحب اور آغا راحت صاحب کی تقاریر اور اخباری بیانات نے نوجوانوں کو شعلہ فشاں بنا دیا ہے۔ سوشل میڈیا میں ایک شور بپا ہے۔اخباری تراشے لمبے لمبے کمنٹس کے ساتھ پوسٹ ہو رہے ہیں۔ شیئر کیے جا رہے ہیں۔ موبائلوں میں لدھیانوی صاحب اور آغا صاحب کی تقاریر سنی جا رہی ہیں۔ مساجد ایکٹ کی منظوری کے بعد، ہونا تو یہ چاہیے تو کہ حکومت اس پر مکمل عملداری کرواتی، مگر اے کاش ایسا نہ ہو سکا۔اہل تشیع نے فقہ جعفریہ کے قائدین کو گلگت بلایا اور پورے جی بی میں مجالس اور پروگرامات منعقد کروائے۔ رہی سہی کسر فیصل رضا عابدی نے نکال دی۔ فیصل رضا عابدی نے وہ زبان استعمال کی کہ گلگت بلتستان کی عوام اور سیاسی قیادت دھنگ رہ گئی۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی کو سخت تردیدی بیان جاری کرنا پڑا۔اب کیا تھا کہ اہل سنت والے بھی موج میں آ گئے اور انہوں نے بھی اپنے مرکزی قائدین کو بلا کر ایک بڑا پروگرام منعقد کروایا اور تلخ زبان استعمال کی گئی۔اس کے بعد ایک دوسروں کے خلاف اخباری بیانات کا سلسلہ جاری ہوا۔مناظرہ اور مباہلہ کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔پولو گروانڈ اور گھڑی باغ میں میدان سجانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہر دوسرا آدمی حیران بھی ہے پریشان

بھی۔ میں خود سوچ رہا ہوں کہ آخر ہمیں کیا ہوا ہے، ہم کس سمت کو چل نکلے ہیں۔
گلگت بلتستان میری دھرتی ہے۔ میں اس دھرتی کا بیٹا ہوں۔ میری دھرتی کے مجموعی فرقہ وارانہ ماحول کے اثرات اب یہاں کی سیاست وصحافت اور تجارت و تعلیم میں بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ تعلیمی اداروں کا برا حال ہے۔ وہاں تعلیم بعد میں فرقہ پرستی پہلے ہے۔اخبارات نے قوم کو ایک ہیجان میں مبتلا رکھا ہوا ہے۔زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہے۔اہل تشیع اور اہل سنت نے آج تک اسماعیلی برادری سے کامیاب معاشرتی زندگی کے حوالے سے تھوڑا سا بھی سیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ مباہلہ اور مناظرہ کا ایک اخباری دور کچھ سال پہلے بھی چل نکلا تھا اور اب کی بار اس نے بلوغت کے بعد مکمل پَر نکالنے شروع کیے ہیں۔دونوں اطراف سے تیاریاں جاری ہیں۔ علمی کتابوں کو جمع کیا جارہا ہے۔ حوالے ڈھونڈے جارہے ہیں۔ ایک دوسروں کو زیر کرنے کی تراکیب اور ہنر سیکھے جارہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عوام حیران ہے۔ انتظامیہ تماشا بین ہے۔اور ایک نادیدہ قوت کھلکھلا کر ہنس رہی ہے۔ کیوں کہ اس کا گُر کارگر ثابت ہورہا ہے۔ یہ کوئی اچھا شگون نہیں ! یہاں ضابطہ اخلاق اور امن معاہدہ بنا مگر حکومت کی سرپرستی میں ان دونوں کا جنازہ نکالا گیا۔کیا اس دھرتی میں عدالت و قانون نام کی کوئی چیز نہیں ؟آخر سب کیوں خاموش ہیں؟ نوجوانوں بالخصوص کم عمر

طالب علموں کو جیلوں اور عدالتوں میں گھسیٹنا کیوں ضروری خیال کیا جاتا ہے؟ پھر ان پر لاکھوں خرچہ کرکے باہر نکالا جاتا ہے۔ کاش اس رقم سے کوئی تعلیمی ادارہ ہی منیج کیا جاتا۔

مناظرہ اور مباہلہ کے حوالے سے چند ایک گزارشات اہل تشیع اور اہل سنت کے سرکردہ لیڈران اور علماء و شیوخ سے کرنی کی جسارت کرونگا اس نیت سے کہ اللہ مجھے اس کے عوض ثواب عطا کرے۔ ہمارے ملک میں 2010ء کو اٹھارہویں آئینی ترمیم ہوئی تھی۔ اس ترمیم کے لیے پارلیمانی کمیٹیاں بنی تھی اور اسمبلی میں تمام سیاسی پارٹیوں نے کھل کر ان ترامیم پر مباحثہ کیا تھا۔ اور آخر میں اتفاق رائے سے ایک رزلٹ سامنے آیا تھا۔ جب تک مکمل پہنچتی اور اتفاق نہ پایا گیا تھا اس وقت تک اس تمام ترکاروائی کو خفیہ رکھا گیا تھا اور میڈیا کو خبر تک نہیں لگنے دیا گیا تھا۔ اگر اہل تشیع اور اہل سنت کے زعماء واقعی مخلص ہیں تو وہ اس طرح کی مناظرے کا اہتمام کریں۔ گلی کوچوں میں مناظرے اور مباہلوں سے لوگ آپ کے لیے محبت کے بجائے نفرتیں پال لیں گے۔ فرقہ واریت اور مناظرہ کا یہ معاملہ چونکہ ملکی ہے، صرف گلگت بلتستان کی سطح کا نہیں اس لیے سپریم کورٹ آف پاکستان اور قانون ساز اسمبلی اہل علم، قانونی و آئینی ماہرین، وکلاء اور ججوں پر مشتمل ایک جاندار کمیٹی تشکیل دیں۔ اور یہ کمیٹی مناظرہ اور مباحثہ کے اصول طے کریں۔ اور یہ واضح ہو کہ کن خطوط پر

مناظرہ ہونا چاہیے۔ پھر دونوں فریقین کے علماء کو بلایا لیا جائے اور ان کی تمام گفتگو کو باقاعدہ ریکارڈ کیا جائے۔ ایک ایسا پرسکون اور مہذب ماحول مہیا کیا جائے کہ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل اور خدشات آزادانہ طور پر بیان کریں۔ مباحثے کو حتمی شکل دینے تک کوئی فریق میڈیا پر نہ آئے۔ اس تمام کاروائی کے بعد کمیٹی مکمل سفارشات بنا کر قومی اسمبلی میں پیش کریں اور قومی اسمبلی ان سفارشات پر باقاعدہ قانون سازی کریں اور آئین پاکستان میں لکھ دیا جائے کہ آئندہ یہ ریاست کی پالیسی ہوگی۔ مبصرین کے طور پر اس علمی مباحثے میں فوجی قیادت، حساس اداروں کے ذمہ داران اور انتظامیہ و ریاست کے سربراہان کو بھی بٹھایا جائے۔

ریاست کی نگرانی میں ہونے والے مباحثے میں جو نتائج سامنے آئیں ان کی روشنی میں قانون سازی کرکے یہ باقاعدہ طے کرنا ہوگا اور آئین کا حصہ بنانا ہوگا کہ تکفیر صحابہ و اہل بیت کے بعد بھی انسان اسلام کی چاردیواری کے اندر ہوتا ہے یا باہر ؟ قائلینِ تحریفِ قرآن کا کیا حکم ہے؟ امہات المؤمنین و اہل بیت کے خلاف زبان درازیوں کا کیا حکم ہے اور ایسے افعال رذیلہ میں ملوث لوگوں کی کیا سزا ہے۔ امامت اور خلافت کا قضیہ کیا ہے؟ شرعی نصوص کیا ہیں اور فروع کیا ہے؟ شرعی نصوص کے ساتھ چھیڑنے والوں کا حکم کیا ہے؟ نصوص پر کیسے عمل کیا جائے گا اور فروعات کو کس حد تک دبایا جائے؟

کون شہید ہے کون

مردار ہے؟ پاکستان میں منعقد کی جانے والی مذہبی جلسہ جلوسوں کا شرعی حکم کیا ہے؟ ان جلوسوں کو موقوف یا محدود کیسے کیا جاسکتا ہے؟قران وسنت اور اھل بیت عظام کی تعلیمات ان جلسہ جلوسوں کے بارے میں کیا ہیں؟کیا مسلک و مذہب کے نام پر سیاست کی جانی چاہیے؟ کیونکہ ہمارے ہاں مذہب کو بیدردی سے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتاہے۔ مملکت کی اختیار کے بغیر کوئی کسی پر کفر وارتداد کا فتویٰ صادر کریں تو اس کی سزا کیا ہوگی اور فتویٰ کا اختیار کن لوگوں کو ہونا چاہیے؟ملت اسلامیہ کا اجتماعی تصور کیا ہے؟ اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ ریاست پاکستان کے شہری ہونے کے حوالے سے کیا فرائض و واجبات عائد ہوتے ہیں؟اور یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ کس حد تک ریاست کی اطاعت لازم ہے اور کہاں اور کب بغاوت کی راہ نکلتی ہے؟ محرم الحرام ، ربیع الاول اور رمضان المبارک جیسے مقدس مہینوں میں ہونے والے اجتماعات وحفلات کے لیے بھی شفاف اور واضح اصول و ضوابط طے کیے جانے چاہیے۔ ان جیسے کئی متنازعہ امور و سوالات ہیں جو دھرتی ماں میں کشت و خون اور مذہبی منافرت کے باعث ہیں ترتیب دیے جاسکتے ہیں۔اگر ریاست پاکستان کے لئے ایسا کیے جانا ممکن نہیں تو پھر یہ بازاری مناظروں، مباہلوں، چیلنجوں، مباحثوں، مسلکی فتاؤوں، تکفیری نعروں،

بینروں، پمفلٹوں، کتابوں، سی ڈیز، مجلسوں، خطبوں جو منافرت و مخاصمت کی ترویج کرنے کا سبب بن رہے ہیں کو سختی سے روکنا ہوگا۔ کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں ایسا ہی ہوتاہے۔ آخر ہم کب تک زوال کی سیڑھیاں چڑھتے رہیں گے۔ میں نے اپنے

علم اور مشاہدہ کے مطابق خلوص دل سے یہ تجاویز پیش کی ہے۔ میرے بڑوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی انتہائی سنجیدگی سے ایک طالب علم کے سوالات اور تجاویز پر غور کرنا چاہیے۔

ہم حیران ہیں کہ اہل تشیع بھی اخباری بیانات میں علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم خلفائے راشدین کو کچھ نہیں کہتے۔ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ آخر یہ معمہ کیا ہے جو اہل سنت والے کئی سالوں سے کھڑا کر رہے ہیں اور ہر چوک پر مناظرے کی دعوت دیتے ہیں۔ انقلابِ ایران کے بعد اس میں مزید شدت آئی ہے۔ بقول آغا راحت الحسینی صاحب کے کہ اہل سنت والے ملک کے ہر شہر میں ، ہر گلی اور چوک میں مناظرے کی چیلنج دیتے ہیں۔ اب کی بار گلگت میں آکر دی ہے لہٰذا ہم بھی مجبور ہیں کہ چیلنج قبول کریں۔ میری دونوں فریق سے گزارش ہے کہ خدا رسول اور اہل بیت و صحابہ کرام کے واسطے اس مناظرے کو کسی فرقہ کی جیت ہار کا مسئلہ نہ بنائیں ۔ اسلام کی خاطر، اس ملک کی خاطر اور اس قوم کی خاطر، آپ لوگ ایک دوسروں کو لتاڑنے، للکارنے اور کوسنے کے بجائے ایک آئینی راستہ اختیار کریں۔ اس ملک میں ایک آئینی نظام ہے۔ ایک مضبوط آئین ہے، ایک منظم فوج ہے، ایک فعال عدلیہ ہے۔ اور آزاد میڈیا بھی۔ جمہوریت کی پٹری پر چلنے والی ایک حکومت بھی ہے۔ کریم ذہنوں سے تیار کی جانے والی بیوروکریسی بھی ہے ۔ اب یہاں غیر آئینی اور غیر جمہوری و غیر اسلامی مباہلوں مباحثوں، جھگڑوں اور،

مناظروں کی گنجائش نہیں۔ اور نہ یہ مباہلوں ، مباحثوں، جھگڑوں اور مناظروں کا دور ہے۔اور نہ مقتضائے حال ان کے روادار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی اگر آپ دونوں ان مناظروں اور مباہلوں کے حوالے سے مخلص ہیں تو آپ دونوں یا کسی ایک فریق کو سپریم کورٹ آف پاکستان اور قومی اسمبلی کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے تاکہ ایک پُرامن ، آئینی، قانونی، اخلاقی اور جمہوری واسلامی راستے کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچ پاؤگے۔ورنہ یاد رہے کہ اخباری بیانات، اپنی اپنی مساجد وامام بارگاہوں اوراپنے اپنے پروگرامات میں ایک دوسروں کو للکار کر، لعن وطعن اور سب وشتم کرکے ،آپ نہ دین کی خدمت کررہے ہیں نہ اس قوم کی نہ ملک وملت کی۔ یہ بھی یاد رہے کہ اب قوم اتنی بے قوف بھی نہیں کہ آپ کی باتوں کو مان لیں۔ تحسین کے پھول نچھاور کردیں۔اور آپ کو سروں کا تاج بنائیں۔ میں نے خود کئی لوگوں کو دیکھا ہے جو مناظرہ کے شائقین پر پھبتیاں کستے ہیں۔اب بازاری مناظروں سے آپ کی دال گلنے والی نہیں۔دنیا بہت آگے جاچکی ہے۔ لوگ بہت اَپ ڈیٹ ہوچکے ہیں۔آپ کے سامنے احتراماً خاموش رہتے ہونگے لیکن دل میں بہت ہنستے ہیں۔ مضحکہ اڑاتے ہیں۔

یاد رہے کہ آپ کے ان رویوں نے کاروبارِامن اورانسانی جانوں، سمیت کئی اہم مسائل پیدا کیے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ میرے واجب الاحترام علماو شیوخ اور سنجیدہ تعلیم یافتہ احباب، صحافی ، وکلاء ،برادری اور طلبہ وطالبات نے

بہت سارے خرافات وبیئات اور غیر ضروری چیزوں کو ان کی شرعی حیثیت سے زیادہ اپنی انا کا مسئلہ بنایئے رکھا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کہ فرقہ پرست لڑائیاں اس طرح جاری رہی اور غریب لوگوں کا خون ''مقدس خون ریزیوں'' کی آڑ میں بہایا جاتا رہا اور ضد، حسد، کینہ، بغض، عداوت، ناانصافی، ظلم، ستم، بربریت و
چنگیزیت، میرٹ کی پامالی، تعلیم سے دشمنی، سماجی انصاف سے دوری، مقتضائے حال سے لاشعوری اور ''مسلکی اکھاڑ پچھاڑ'' کا یہ خونی سلسلہ جاری رہا تو ہم پر اللہ تعالیٰ کا کوئی عذاب نازل نہ ہو۔ویسے بھی بصیرت کی آنکھ رکھنے والے اہل دل و درد سال 2014ء کو انتہائی خطرناک سال قرار دے چکے ہیں۔آہ! ہماری بدقسمتی دیکھو کہ ہم اس دھرتی کے باسی ہیں جہاں ہر طرف موت کا رقص ہے اور آتش وآہن کی برکھا برس رہی ہے ۔، خونِ مسلم کا ضیاع ہے۔ غریب کے معصوم بچوں کے ہواؤں میں بکھرے لتھڑے ہیں۔ بہنوں کی لٹی جوانیاں ہیں، نازنینوں کے اجڑے سہاگ ہیں۔ حکایات خونچکاں ہیں۔ گھر گھر الم ناک داستانیں ہیں، معاشی بربریت ہے۔کساد بازاری کا ننگا ناچ ہے۔ مہنگائی کا وہ عفریت سوار ہے کہ دووقت کے کھانے کے لیے مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جسموں کی عصمت وحیا کا بیوپار بنیں پھر رہیں ہیں اور ہم خریدار............. ۔ پھر بھی مالکانِ دیر وحرم خوش ہیں اور مناظروں ومباہلوں کی تیاریوں میں مگن.....۔ سو تمہیں خوشیاں مبارک ہو اور مناظرے بھی۔۔آخر کیوں؟ یا اللہ کیوں.........................؟
شاید اس کیوں کا جواب میری زندگی میں

نہ ملے۔

علماء بورڈ کے قیام کا فیصلہ، چند تجاویز

انسانی فطرت ہے کہ وہ معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا، اور اگر معاشرے میں امن نہ ہو تو وہ معاشرہ، معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہر ذی شعور آدمی امن کا خواہاں ہے اور یہ واضح حقیقت ہے کہ امن کے بغیر کوئی قوم یا ریاست ترقی نہیں کر سکتی ہے۔ تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ تبلیغ اور محنت ''قیام امن'' کے لئے کی ہے۔ گلگت بلتستان کا سب سے بڑا المیہ امن و آمان کی دگرگوں صورت حال ہے اور بد قسمتی سے یہاں اس کا ذمہ دار علماء کرام اور مذہبی طبقات کو گردانا جاتا ہے اور بعض ناہنجار تو دین اسلام کو اس کا ذمہ دار و قصور وار ٹھہراتے ہیں، حالانکہ قرآن و حدیث، سیرت ہادی دو عالم اور سیرت صحابہ اور فقہ اسلامی اور اکابر و مشائخ کی تعلیمات کے گہرے مطالعے سے یہ بات بیانگ دہل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام سب سے زیادہ امن و آمان پر زور دیتا ہے اور انسانیت کے احترام کی بات کرتا ہے۔ اور امن و آمان اسلامی ریاست کی اولین ترجیح ہے۔ کاش !اسلام اور علماء کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والوں کو امن دشمن اور گلگت بلتستان کو مقتل بنانے والے حقیقی مجرم نظر آتے، سب جانتے ہیں مگر زبان سے کہنا اور قلم سے لکھنا جان کے لالے پڑ جاتے

ہیں۔

گلگت بلتستان کے ارباب اقتدار نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ گلگت بلتستان میں قیام امن اور مذہبی یک جہتی کے لئے گلگت بلتستان کے تمام مسالک کے جید علماء پر مشتمل ایک علماء کونسل/ بورڈ بنائیں گے۔ یہاں حکومت نے اعلان تو کر دیا مگر یہ اتنا آسان کام اور بچوں والا معاملہ نہیں کہ بس علماء بورڈ کے قیام سے گلگت بلتستان امن کا گہوارہ بن جائے گا۔ دھرتی عزیز پاکستان میں اس کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں،اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان وآزاد کشمیر اور متحدہ علماء بورڈ پنجاب کے نام سے یہ روایتی تجربے پہلے سے ہوتے رہے ہیں اور ان کے نتائج صفر ہیں۔1951ء میں پاکستان کے سارے دینی مکاتیب فکر کے معتمد علیہ ۳۱ علماء کرام نے عصر حاضر میں ریاست وحکومت کے اسلامی کردار کے حوالے سے ۲۲ نکات پیش کئے تھے اور ۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء کو بھی لاہور میں '' ملی اجلاس'' کے زیر اہتمام منعقدہ ''اتحاد امت کانفرنس'' میں تمام دینی مکاتیب فکر کے ۵۵ جید علماء کرام نے ایک مشترک اعلامیہ جاری کیا ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے متفقہ راہنماء اصول پیش کیے مگر اس کے نتائج ہنوز ندارد۔ حکومتی سطح پر کام کرنی والی اسلامی نظریاتی کونسل کے پیش کردہ سفارشات کو بار بار ردی کی ٹوکری کے نذر کر دیے گئے ہیں، تاہم ان کے چیئرمینوں اور ممبران اور دیگر عملے کو مکمل

پروٹوکول ملتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرّوفر سے ملتا رہے گا۔ اگر گلگت بلتستان میں بھی اس طرح کی ایک نام نہاد کونسل بنائے جانے کا پروگرام ہے تو میں حکومت وقت سے دست بستہ عرض کرونگا کہ خدارا! قوم کو بھی بے قوف نہ بناؤ اور خود کو بھی دھوکہ مت دو، اور تمام مکاتیب فکر کے سنجیدہ اور جید علماء سے بھی گزارش کرونگا کہ وہ ایسی نام نہاد کوششوں اور ڈھکوسلہ ٹائپ کی کونسلوں سے گریز کریں تاکہ عوام میں آپ کا وقار تو بحال رہے۔ تاہم آئندہ سطور میں ممکنہ کونسل یا علماء بورڈ کے قیام کے حوالے سے چند معروضات پیش کرونگا اس امید کے ساتھ کہ ارباب حل و عقد اگران پر سنجیدگی سے غور کریں گے تو شاید کوئی بہتری کا پہلو نکل جائے۔

سب سے پہلے اس بورڈ کی قانونی حیثیت واضح ہونی چاہیے، ایک دو سال کے لئے نہیں بلکہ اس کو ایک مستقل ادارے کی شکل دینی ہوگی، اس حوالے سے گلگت اسمبلی میں مکمل قانون سازی ہونی چاہیے اور سربراہ مملکت سے ادارے کی توثیق وتائید حاصل کی جانی چاہیے ۔اس بورڈ/ کونسل کے دائرہ اختیار اور دائرہ کار کو واضح کیا جانا چاہیے اور علماء بورڈ کے فرائض واختیارات اور دائرہ کار کو متعین کرنے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل اور سپریم کورٹ آف پاکستان اور پاکستان بھر کے جید علماء کرام، مستند دینی
جامعات، مختلف دینی وفاقی بورڈ اور اہل قلم و علم سے مکمل استفادہ کرنا چاہیے بلکہ گلگت حکومت یہ کام

ایک کمیٹی بناان کے سپرد کرے اور ان کی مکمل معاونت کرے۔تاکہ مستقل بنیادوں پر ایک جاندار ادارے کا قیام عمل میں لائے جاسکے۔اس کمیٹی کو واضح تو پر بتائے جائے کہ علماء بورڈ کے ممبران درج ذیل امور کے حوالے سے کام کریں گے۔ ا۔ قیام امن کے لئے سفارشات مرتب کرنا۔ ۲۔یہ بورڈ کوئی بھی قانون قرآن و سنّت کے متصادم بنانے کا مجاز نہ ہوگا۔ ۳۔ مشترکات کو مد نظر رکھا جانا ہو گا نہ کہ اختلافی امور کوزیر بحث لائے جائے گا۔ ۴۔بورڈ کے ممبران کے لیئے قانونی ماخذ قرآن ، حدیث، فقہ اسلامی، اجماع اور قیاس ہی ہونگے۔ ۵۔اسمبلی اگر کوئی غیر اسلامی یا کسی مکتب فکر کی دل آزاری پر مبنی قانون سازی کرے تو یہ بورڈان قوانین کو منسوخ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور اس کے فیصلوں اور سفارشات کا قانونی تحفظ بھی ہو۔

اب تک کے اطلاعات یہ ہیں علماء بورڈ کے سات ممبر ہونگے اوران کے ممبران کو گریڈ ۱۹کے مراعات اور چیئرمین کو گریڈ ۲۰کے مراعات دیے جائیں گے، کیا انصاف سے بتائیں کہ گریڈ ۱۹اور۲۰کے مراعات یافتہ کچھ علماء کوئی کردار ادا کر سکیں گئے؟۔

ناممکن۔ یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے اگر یہ بورڈ بنانا ہی ہے تو پھر ممبران کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے اور ان ممبران کے اختیارات و مراعات کم سے کم صوبائی وزراء اور چیئرمین کے اختیارات و مراعات وزیر اعلی کے برابر ہونی چاہیے تاکہ ادارے کا وقار قائم ہوسکے، تب یہ ادارہ

کوئی کردار ادا کر سکے گا۔ علماء بورڈ کے لئے جو ممبران ہونگے ان کے لئے کڑی شرائط ہونی چاہئے، علمی اور مستند علماء ہی کو بورڈ کا حصہ بننے کے لئے درج ذیل شرائط لاگو کیے جانے چاہیے تاکہ علمی ذوق رکھنے والے یہ مستند علماء کوئی کردار بھی ادا کر سکیں، اگر یہاں بھی پارٹی، سیاست، علاقائیت، اقربا اور رشوت کی بنیاد پر ممبر لئے جائیں گے تو یہ بورڈ پوری قوم کے لئے مضر اور ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے اور قومی خزانے پر ایک اضافی بوجھ ہوگا۔ ممبران بورڈ کے لئے علماء کا درج ذیل صلاحیتوں کے حامل ہونا ضروری قرار دیا جانا چاہیے۔

۱۔ باکردار اور متقی عالم ہو۔

۲۔ قرآن و حدیث نبوی سے مکمل آگاہی حاصل ہو۔

۳۔ خلفائے راشدین، تابعین کرام، آئمہ فقہ و اجتہاد کے فیصلوں سے پوری طرح واقف ہو۔

۴۔ عربی اور اردو پر مکمل عبور ہو اور انگریزی ضرورت کے مطابق جانتا ہو۔

۵۔ دور جدید کے تمام سیاسی، معاشی، اخلاقی اور علاقائی پہلوں پر دسترس رکھتا ہو۔

۶۔ تقریر و تحریر پر اچھی کمانڈ حاصل ہو اور قدیم و جدید لٹریچر کا وسیع مطالعہ اور وسعت ظرفی کا مالک ہو۔

۷۔ اپنے مسلک کے کسی معتبر ادارے کا سند یافتہ ہو اور علاقے میں اچھی شہرت

کا حامل ہو۔

۸۔ قانون کی زبان کو جانتا ہو۔

بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں خالص دینی و علمی مواقف بھی اب علمی اصولوں اور فتاویٰ نویسی کے قواعد و ضوابط کا لحاظ اور پابندی کرنے کے بجائے سیاسی، مسلکی اور علاقائی و لسانی حالات سے متاثر ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ بڑی بڑی معتبر علمی شخصیات اور معروف دارالافتاء بھی کسی بھی مسئلے کی وضاحت کرتے وقت دینی، شرعی، تحقیقی اور علمی حیثیت کو نظر انداز کرکے یہ دیکھنے لگتے ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اور یہی حال ہماری عدالتی اور انتظامی فیصلوں کا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا اور لکھنا پڑھتا ہے کہ بعض دفعہ اپنی پسند اور ناپسند کو شرعی و دینی اور قانونی وآئینی مسئلہ و معاملہ گردانا جاتا ہے۔ بہر صورت ہم ان سطور کے ذریعے یہ عرض کریں گے کہ ممکنہ علماء بورڈ کو ان تمام خرافات سے بچایا جانا چاہیے اور ان کے تمام فیصلے علمی بنیادوں پر ہونے چاہیے نہ کہ علاقائی، مسلکی اور سیاسی بنیادوں پر۔ اور اس کی سفارشات پر مکمل عمل درآمد ہونی چاہیے اگر اس کی بھی حالت گرینڈ امن جرگہ اور امن معاہدے کی طرح ہونی ہے تو الامان والحفیظ۔

اگر حکومت یہ خیال کرتی ہے کہ اس طرح کے بورڈوں کے ذریعے علماء کو اپنے تابع بنایا جائے تو یہ اس کی خیام خیالی ہے۔ انجمن امامیہ اور تنظیم اہل سنّت والجماعت کے سرکردہ علماء کو مکمل مشاورت میں رکھا جانا چاہیے تاکہ توازن اور اعتدال قائم ہوسکے اور بورڈ کی ابتداء بھی نیک شگون ہو۔ علماء بورڈ / کونسل میں ریٹائرڈ ججز، ماہرین قانون اور کچھ ایسے ارکان بھی شامل ہو جو طویل عرصہ اسلامی تحقیق وتدریس سے منسلک رہ چکے ہوں۔

گوہر آباد کے علماء کرام کی عوام کے لیئے کاوشیں

اس میں دو رائے نہیں کہ علمائے کرام نے ہمیشہ دین حق اور عوام کیلئے بے لوث قربانیاں دیں ہیں اور قیادت و سیادت کی ہیں۔تاریخ کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جائیگی۔دور جانے کی ضرورت نہیں،۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ تک کی مختصر تاریخ پر طائرانہ نظر دوڑائی جائی تو علماء حق کی بے شمار قربانیاں نظر آئینگی،اور واضح ہو جائیگا کہ تختہ دار پر کون آزادی کیلئے لٹکا تھااور کس کے بچے یتیم ہوئے تھے،ملک عزیز پاکستان کی ہسٹری کو بھی دیکھا جائے تو علماء کی خدمات نظر آئینگی،گلگت بلتستان میں بھی علماء کرام کی اشاعت دین متین کے لیئے لاتعداد ولاتحصی کاوشیں ہیں اس حوالے سے عنقریب میری کتاب ''مشاہیر علمائے گلگت بلتستان'' منصہ شہود پر آ ئیگی،تاہم ائندہ سطور میں ہم گوہر آباد کے علمائے کرام کی چند ایک مخلصانہ خدمات کا ذکر کریں گے تاکہ تاریخ کا ریکارڈ درست رکھا جاسکے۔

گوہر آباد ضلع دیامر کا سب سے پسماندہ گاؤں ہے،یہاں زندگی کی ساری بنیادی ضروریات عنقاء ہیں،تاہم اللہ تعالی نے اس علاقے کو بے شمار قدرتی وسائل سے

مالا مال فرمایا ہے۔ میں نے اپنی مختصر سی صحافتی زندگی میں گوہرآباد کے کئی مسائل منظر عام پر لایا ہے بالخصوص گوہرآباد کے جنگلات پر چند سرمایہ داروں کا قبضہ، نہری نظام کی ابتری، دونوں تباہ شدہ پل، صحت عامہ اور تباہ شدہ تعلیمی اسٹرکچر پر تو کئی کالم، فیچرز اور تحقیقاتی و تجزیاتی رپورٹیں مختلف اخبارات و جرائد اور میگزین میں لکھیں ہیں اور وہاں کے عوام اور مختلف عوامی لیڈروں اور نمبرداروں کے انٹرویوز اور خبریں بھی شائع کروائی ہیں۔اور ریڈیو پاکستان گلگت کے ذریعے کئی لائیو پروگرام کیے ہیں جن میں گوہرآباد کے مسائل تفصیل سے ڈسکس کیے ہیں،آج بھی ایک ایسا قومی اور عوامی مسئلہ لے کے بیٹھا ہوں جو لاینحل ہوتا نظر آرہا تھا تاہم گوہرآباد کے چند مخلص نوجوانوں اور تمام علماء کرام کی وجہ سے حل ہونے کے قریب ترین امکانات پیدا ہوچکے ہیں۔

دیامر بھاشا ڈیم ضلع دیامر کے غریب عوام کیلئے خون آشامی کا سبب بن رہا ہے، یہ اس لیئے نہیں کہ ڈیم اس ضلع میں تعمیر ہورہا ہے بلکہ واپڈا حکام، ضلعی انتظامیہ، پٹواری اور علاقے کے سرمایہ داروں اور وڈیروں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔چیلاس شہر میں KKH کے اوپر واقع اراضی، ڈیم کے اعلان سے پہلے ۲۰ لاکھ روپے فی کنال تھی مگر ڈیم کمیٹی نے اسکا معاوضہ حکام بالا کی ملی بھگت سے ۱۱ لاکھ فی کنال طے کیا ہے جبکہ روڈ سے ایک کلو میٹر پیچھے زیر کاشت اراضی

سے دور اراضی کا معاوضہ ۱۱ لاکھ KKH کا بھی یہی معاوضہ ہے حالانکہ مونسپلٹی ایریا میں پر واقع کمرشل اراضی (جو کہ ڈیم کے اعلان سے پہلے ہی ۲۰ لاکھ فی KKH ٹھیک تھا مگر کنال تک پہنچ چکی تھی) ۱۱ لاکھ معاوضہ پر رکھنا کتنا ظلم عظیم ہے۔ یہ صرف اس لیئے کہ کے اوپر واقع اراضی زیادہ تر غریب اور باہر سے آئے ہوئے (300 سال پہلے) KKH لوگوں کی ملکیت ہے۔یاد رہے کہ اللہ تعالی کو یہ طبقاتی ظلم ہر گز پسند نہیں ہے جو چلاس کے چند مقامی وڈیرے ان پر کر رہے ہیں جبکہ حکام بالا کا کہنا ہے کہ یہ ڈیم کمیٹی (ڈیم کمیٹی میں ان غریبوں کا کوئی نمائندہ نہیں) کا فیصلہ ہے جو ہم تبدیل نہیں کر سکتے ہیں۔

دیامر ڈیم کی تعمیر سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا علاقہ گوہرآباد ہے اور معاوضہ کے اعتبار سے سب زیادہ ظلم بھی اس علاقے کے عوام کے ساتھ ہوا ہے، اس علاقے کی زیرآب قابل کاشت اراضی کو چراگاہ شو کرکے ایک لاکھ روپے فی کنال معاوضہ طے کیا گیا ہے۔ یہ حکام بالا اور منتخب ممبران کی ملی بھگت سے ہوا ہے، گوہرآباد کے چند بااثر لوگوں نے قومی شاملات اراضی کو پٹواریوں، تحصیلداروں اور سابقہ ضلعی انتظامیہ سے ملکر اپنے نام اندراج کرواکر اپنے نام ایوارڈ بنوائے ہیں، جسکی وجہ سے نوجوانوں کا ایک طبقہ مشتعل ہوا اور ''گوہرآباد ویلفیئر موومنٹ'' وجود میں آئی۔

گوہرآباد ویلفیئر موومنٹ اوائل جولائی 2011 کو وجود میں آئی، جس میں پورے گوہرآباد کے پڑھے لکھے نوجوان بلا رنگ ونسل، قوم وقبیلہ اور غریب وامیر شامل ہیں۔انکی کچھ کاوشوں کے بعد گوہرآباد کے تمام عوام موومنٹ میں شامل ہوگے۔ گوہرآباد ویلفیئر موومنٹ یں رکنیت کیلئے کڑوی شرائط ہیں کہ قران پاک پر حلف اٹھانا ضروری ہے۔ موومنٹ کا روح رواں ڈرائیور ظہیراللہ ہیں جبکہ قمرالزمان، قاری شرافت الدین، سعیداللہ، حافظ عبیداللہ، عبدالقیوم پرنسپل پبلک سکول گوہرآباداور محبوب اللہ سرگرم ارکان ہیں۔ان نوجوانون کاایک شاندار کارنامہ یہ ہے انہوں کینو داس میں بلا معاوضہ واٹرچینل میں کئی دن مسلسل کام کرکے پانی پاس کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کیلئے گوہرآباد کے علماء کرام کو منتخب کیا اور گوہرآباد کے تمام علماء کی ایک کونسل'' سپریم کونسل جمیعت علماء گوہرآباد'' بنائی گئی، جس یں مولانا عبدالرؤف، مولانا مفتی رستم خان، مولانا جانباز، قاری قاسم اور دیگر شامل ہیں جبکہ قاضی عنایت اللہ صاحب (مرکزی نائب امیر جمیعت علماء اسلام گلگت بلتستان) سپریم کونسل کے لیڈر ہیں۔ قاضی عنایت اللہ کو اللہ تعالی نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے، وہ عرصہ درازتک جمیعت علماء اسلام گلگت بلتستان کے امیر و صدر رہے اور عوت تبلیغ میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ گوہرآباد ویلفیئر مؤومنٹ اور علماء سپریم کونسل نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ گوہرآباد گے غریب عوام کی غصب شدہ زمینوں کو واپس دلا کر رہیں گے۔انہوں نے گوہرآباد اور گوتر فارم اوردیگر

مقامات پر کئی بڑے جلسے کیے ہیں جن میں گوہرآباد کے تمام عوام نے شرکت کی ہے۔راقم الحروف کو بھی ان اجتماعات سے تفصیلی خطاب کرنے کا موقع ملا ہے۔یہ گوہرآباد کی تاریخ کا پہلا موقع تھا کہ تمام علماء کرام ایک اسٹیج پر جمع ہیں اور لوگ ہمہ تن ان کی باتیں سن رہے ہیں۔انہوں نے اپنے مختلف پروگراموں میں گوہرآباد پر ہونے والے مظالم پر ایک قرار داد پاس کی ہے جو حسب ذیل ہے۔

۱۔یہ کہ گوہرآباد کی تمام شاملات اراضی کو قبضہ مافیا سے واگزار کرایا جائے۔

۲۔یہ کہ کینو داس کی انڈر چینل اراضی کا پورا ریٹ دیا جائے۔

۳۔گوہرآباد کی جو زمینیں چراگاہ شو کیا ہے وہ گوہرآباد کا مستقل سرمایہ ہے لہٰذا اس کا ریٹ مناسب طریقے سے دوبارہ طے کیا جائے

پر موجودہ اراضی انتہائی قیمتی ہے،اس کا از سر نو کمرشل ریٹ مقرر کیا جائے۔KHH۔۴

والوں کا قبضہ نا قابل برداشت ہے،اگر T.N.T۔۵ کھلیچی داس میں ۳۰ کنال زیں پر انہیں یہ زمین چاہیے تو ہم سے مذاکرات کریں ،اور کسی نے اپنی ملکیت ظاہر کرکے انہیں بیچا ہے تو وہ اس سودا ختم کریں کیونکہ یہ گوہرآباد کے تمام عوام کی شاملاتی اراضی ہے۔

۶۔چیف سیکریٹری،وزیر اعلیٰ اور گورنر فوری ایکشن لے کر ضلعی انتظامیہ کو خبردار کریں کہ وہ گوہرآباد کے عوام پر ظلم روکے اور انکی جائز مطالبات

پورے کیے جائے۔

۷۔ جسٹس نواز عباسی گوہر آباد کے غصب شدہ زمینوں کے بارے سویو موٹو ایکشن لیں اور غریبوں کو انصاف فراہم کریں۔

گوہر آباد ویلفیئر مؤومنٹ اور علماء کرام کی سپریم کونسل کے احباب اعلی حکومتی ذمہ داروں سے ملاقاتیں کر چکے ہیں اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم سے انہیں آگاہ کیا ہے۔اور عوام کا اشتعال وغصہ اور غیض و غضب کا بھی انہیں بتلایا ہے،اور گلگت بلتستان کا پرنٹ میڈیا بھی انہیں بھر کوریج دے رہا ہے تو اللہ تعالی سے امید قوی ہیکہ علماء کرام کی اعلی سطحی کوششوں اور نوجوانوں کی بے لوث قربانیوں سے گوہر آباد کے مظلوم عوام کو ان کا حق ملے گا۔میں گوہر آباد ویلفیئر مؤومنٹ کے دوستوں اور سپریم کونسل جمیعت علماء گوہر آباد کے بزرگوں سے گزارش کرونگا کہ وہ غصب شدہ زمینوں کے معاملات سے نمٹا کر گوہر آباد کے غصب شدہ جنگلات (اب تک ۵ کھرب کا نقصان ہو چکا ہے) اور گوہر آباد کی تعمیر و ترقی ،اصلاح معاشرہ اور تعلیم و تربیت کیلئے بھی اقدامات کریں، اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

نانگاپربت سانحہ ! کون کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے

ضلع دیامر اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے پورے ملک کا ممتاز ضلع ہے۔دنیا کی عظیم ترین چوٹی''نانگاپربت'' ضلع دیامر میں واقع ہے۔جسے کلر مونٹین بھی کہا جاتا ہے۔گلگت بلتستان کے سب سے گھنے اور بڑے جنگلات ضلع دیامر میں واقع ہیں۔ قراقرام ہائی وے کا بڑا حصہ ضلع دیامر سے گزرتا ہے۔دنیا کی سب سے لمبی عمر والا ڈیم بھی ضلع دیامر میں بن رہا ہے۔ضلع دیامر وہ واحد ضلع ہے جس میں سو فیصد اہل سنت دیوبند مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہیں۔ضلع دیامر کے لوگ انتہائی ملنسار، دیندار اور سادہ ہیں۔

نانگاپربت انسانی دنیا کا ایک عجوبہ ہے،نانگاپربت ضلع دیامر کے علاقے گوہرآباد رائیکوٹ میں واقع دنیا کا عظیم ترین خونی پہاڑ ہے۔نانگاپربت محض ایک پہاڑ نہیں بلکہ ایک جادو ہے، طلسم ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔گزشتہ ڈھائی سو سال سے پوری دنیا سے سیاح اور کوہ پیما اس کی طرف کھنچے آرہے ہیں۔اب تک صرف دو دفعہ نانگاپربت کی چوٹیوں کو ہاتھ لگایا جا سکا ہے۔ایک دفعہ 1953 اور دوسری دفعہ 1995 کو۔باقی جب بھی کوئی کوہ پیما اس کو سر کرنے نکلا ہے خود اس کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔کوئی

پارٹی آخری سرے تک پہنچے، پاتی ہے کہ ہواؤں کے دوش اڑ جاتی ہے اور اس کی ہڈیاں برف بن کر رہ جاتی ہے۔ نانگا پربت کی بلند چوٹیاں ہمیشہ بادلوں سے ڈھکی رہتی ہیں۔ نانگا پربت کے قدموں میں ایک لمبی گلیشئر ہے جو دو رنگوں پر مشتمل ہے۔ سفید اور براؤن، مقامی لوگوں کے مطابق یہ جوڑا ہے اور اس کے اتصال سے گلیشئر میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی میاں بیوی کے اتصال سے نسل میں اضافہ ہوتا ہے اس طرح یہ جوڑا بھی گلشیئر بڑھانے کا کام دیتا ہے۔ خدا جانے۔

نانگا پربت پر چڑھنے کے بنیادی طور پر تین راستے ہیں۔ ایک راستہ بذریعہ لنک روڈ رائیکوٹ فیری میڈو تک جاتا ہے جو سب سے دشوار ترین ہے، ایک راستہ استور کی طرف سے بھی ہے اور تیسرا راستہ بونر نالہ سے جاتا ہے۔ فیری میڈو اور نانگا پربت کی سیر کے لیے جانے والے اکثر سیاح بذریعہ لنک روڈ رائیکوٹ پہنچ جاتے ہیں جبکہ کوہ پیمائی کے لئے اکثر بونر نالہ والا راستہ استعمال کیا جاتا ہے۔

رائیکوٹ کی حسین ترین وادی ''فیری میڈو'' ہے، جسے شینا زبان میں '' فری'' کہا جاتا ہے۔ 1953 کو اسٹرین کے ایک کوہ پیما ہرمن بوہل نے اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اسے فیری میڈو کا نام دیا ہے تب سے آج تک یہ فیری میڈو کے نام سے

معروف ہے۔فیری میڈو کو اللہ تعالیٰ نے بے حد قدرتی حسن سے نوازا ہے۔ اس کو پریوں کا مسکن اور چراگاہ بھی کہا جاتا ہے۔علاقائی کہاوت مشہور ہے کہ یہاں دیو پری رہتے ہیں۔جو بھی نانگا پربت کو سَر کرنے کے لیے جاتا ہے وہ اس کو غائب کر دیتے ہیں۔

ہر سال موسم سرما میں ملکی و غیر ملکی سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مقامی لوگ دو تین مہینوں میں کروڑوں کماتے ہیں۔نانگا پربت کی عظمت و بلندی کو اپروچ کرنے کے لیے چند کوہ پیماؤں نے بذریعہ بونر نالہ سفر شروع کیا۔راستے میں کیمپ لگایا،رات کو جی بی اسکاؤٹس کی وردی میں ملبوس سفاک قاتلوں نے انھوں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ان میں تین چینی،دو یوکرائن،ایک چینی نژاد امریکی،دو سلوا کیہ اور ایک ایک نیپال اور لتھوانیا کے باشندے ہیں اور دو پاکستانی۔

میری دانست کے مطابق یہ سانحہ ملک پاکستان اور گلگت بلتستان کے امیج کو خراب کرنے کی ایک اہم کڑی تو ہے ہی مگر ضلع دیامر کو بدنام کرنے کی اہم ترین سازش ہے۔اس کی کئی وجوہات ہیں،یہ بات تو ہم سب پر عیاں ہے کہ یہ واردت امریکی گریٹ گیم کا اہم حصہ ہے۔امریکہ مسلم دنیا کا تھوڑا سا مفاد بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ گوادر چین کے حوالہ کیا گیا ہے جو امریکہ کو

ہضم نہیں ہو پا رہا ہے۔ گوادر بذریعہ دیامر چین تک لنک کرتا ہے۔ اور دیامر بھاشا ڈیم بھی ضلع دیامر میں بن رہا ہے۔ پاک چائنہ ریلوے ٹریک استعماری قوتوں کو نا قابل برداشت ہے۔ کچھ نادیدہ قوتیں ایسی ہیں کہ جنہیں عالمی سطح پر بالعموم گلگت بلتستان اور بالخصوص دیامر اور اس کے خوبصورت سیاحتی مقامات کی مقبولیت پسند نہیں، اس لیے تو اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ امریکی استعماری قوتوں کا ایک اہم ایجنڈا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں جہادی سرگرمیاں ہوں وہاں مداخلت کرتا ہے اور ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو امت مسلمہ کے لیے تباہ کن ہو۔ یا پھر جہاں سے جہادی سرگرمیاں پیدا ہونے کا امکان ہو وہاں بھی جان بوجھ کر ایسے واقعات کراتا ہے کہ مقامی حکومتیں وہاں کے عوام سے نبرد آزما ہو۔ پھر افرا تفری پیدا ہو جائے اور اندرونی خانہ جنگی ہو۔ ضلع دیامر میں بھی دیندار اور اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ ہیں۔ اب امریکی استعماری قوتیں ایسے حالات پیدا کرا رہے ہے کہ اپریشن کی راہ ہموار ہو، حکومت پاکستان دہشت گردی کے نام پر وہاں اپریشن کرے۔ جس سے علاقائی اور ملکی سخت نقصان ہوگا اور در پردہ امریکی مفادات تکمیل کو پہنچے۔ جب ضلع دیامر میں اپریشن کیا جائے گا تو دیامر ڈیم کی تعمیر ناممکن ہوگی۔ گوادر پورٹ کا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ پاک چائنہ ریلوے ٹریک خواب بن کر رہ جائے گا۔ گلگت بلتستان کی سیاحت بالخصوص نانگا پربت کی سیاحت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور یہی امریکی اور صیہونی خواہش ہے۔ اس واقعہ سے پہلے میں

لولو

سر، چلاس اور کھنبری کے سانحات ہوئے ہیں جن کے مرکزی مقاصد گلگت بلتستان میں مذہبی تفرقہ اور خانہ جنگی پیدا کرنا تھا مگر دیامر اور گلگت کے عمائدین، علماء کرام نے مکمل یکجہتی سے ان ناپاک عزائم کو بڑی حکمت عملی سے خاک میں ملا دیا۔ اب کی بار اس گریٹ گیم کو کامیاب بنانے کے لیے امریکیوں نے ایک اور چال چلی کہ غیر ملکی سیاح کو قتل کروادیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عالمی لیول میں اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی، گورنمنٹ پاکستان اور اس کے حساس ادارے سخت دباؤ میں آجائیں گے اور یوں پاکستانی حکومت عالمی دنیا کو مطمئن یا خوش کرنے کے لیے ابتدائی طور پر ضلع دیامر پھر پورے گلگت بلتستان میں جنگ دہشت گردی کے نام سے اپریشن کرے گی، جس سے لازمی طور پر دیامر ڈیم منصوبہ، پاک چین تجارت، گوادر پورٹ پلان، گلگت بلتستان کی سیاحت اور کے کے ایچ اور دیگر منصوبے زیر زمین چلے جائیں گے۔ جس سے پاکستان اور گلگت بلتستان کو کھربوں کا نقصان ہوگا۔ یہی ہے اس گریٹ گیم کا مرکزی ٹارگٹ۔

ارباب اختیار سے ہمارا ایک طالب علمانہ سوال ہے کہ کیا اپریشن سے بلوچستان، وزیرستان اور فاٹا میں امن قائم کیا جا سکا ہے اور دہشت گردوں کو نکیل ڈالا جا سکا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے تو ہاتھوں میں اسلحہ اٹھایا ہوا ہے جبکہ دیامر کے لوگ تو ہر مشکل میں حکومت اور فوج کے ساتھ کھڑے ہیں، پھر بھی اگر قصور وار ٹھہرتے ہیں تو اللہ ہی جانے۔

ہماری دیامر کے علماء و عمائدین، جی بی حکومت، پاکستان آرمی اور حساس اداروں سے درمندانہ گزارش ہے کہ عالمی حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے ایسا کوئی لائحہ عمل تیار کرے کہ صیہونی اور استعماری مقاصد خاک میں مل جائے اور دجالی قوتیں امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنے میں ناکام ہوجائے۔اگر نااہلی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا گیا تو ضلع دیامر تو ہوگا ہی تباہ مگر پاکستان اور پورے گلگت بلتستان کا بھی نقصان عظیم ہوگا۔

ضلع دیامر کے تمام علماء کرام، عمائدین، طلباء اور عوام الناس نے اس بربریت پر مبنی واقعہ کی شدید مذمت کی ہے۔ ہر طبقے کے لوگوں نے کھل کر مذمت کی ہے۔ مختلف جگہوں میں اس کے خلاف احتجاج ہوئے ہیں۔اسلام ایسی بزدلانہ حرکتوں کی سخت مخالفت کرتا ہے کہ بے آسرا اور مسافر لوگوں کو یوں قتل کیا جائے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اس سانحہ کے پس منظر میں کوئی ایسی طاقت ہے جو پورے میں میں اس طرح کے واقعات کروارہی ہے۔اگر صاحبان اقتدار اور اصحاب بست وکشاد نے کسی کے دباؤ میں آکر یا عجلت کا مظاہرہ کرکے کوئی ایسا فیصلہ کیا جو دیامر کے لوگوں کے ساتھ ظلم پر مبنی ہوگا تو یاد رہے کہ پھر وزیرستان اور بلوچستان والے حالات پیدا ہونگے۔تب وہ سنبھالنا چاہیے تو بھی نہیں سنبھل پائیں گے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مولانا نذیر اللہ مرحوم کی وفات پر مختلف قومی وسیاسی رہنماؤں کے تعزیتی پیغامات

محترم جناب سید مہدی شاہ..... وزیر اعلی گلگت بلتستان

جملۂ خاندان مولانا نذیر اللہ صاحب مرحوم

مولانا صاحب کی وفات سے مجھے انتہائی دلی صدمہ پہنچا ہے۔ مرحوم کی گلگت بلتستان میں قیام امن، مذہبی ہم آہنگی اور بھائی چارگی برقرار رکھنے میں کی جانے والی کوششوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ ان کی وفات سے پیدا ہونے والی خلا کو پر کرنے میں بڑا وقت درکار ہے۔ ان کی رحلت سے جہاں آپ ایک شفیق باپ اور سرپرست سے محروم ہوگئے ہیں وہاں گلگت بلتستان کے عوام بھی ایک جید عالم سے محروم ہوگئے ہیں۔ میں اپنی اور گلگت بلتستان حکومت کی جانب سے مرحوم کے خاندان کے ساتھ دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہوں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت عطا کرے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

شریک غم:

سید مہدی شاہ، وزیر اعلیٰ، گلگت بلتستان

29/10/2010

☆☆☆

(محترم جناب وزیر بیگ صاحب..... (ایکٹنگ گورنر گلگت بلتستان

بسم اللہ الرحمان الرحیم

انا للہ وانا الیہ راجعون ! مرحوم مولانا نذیراللہ ہمارے علاقے کے ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ ان کی موت سے علاقے کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ایسی ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں' یہ نقصان صرف ان کے خاندان کا نہیں بلکہ پورے علاقے کا ہے لیکن حکم الٰہی کے سامنے انسان بے بس ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تبارکت و تعالیٰ ابدی دنیا میں مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو عظیم نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ اور توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین !

(وزیر بیگ ایکٹنگ گورنر گلگت بلتستان (ا

31/10/2010

ا) ان دنوں شمع خالد کے وفات سے وزیر بیگ صاحب ایکٹنگ گورنر تھے۔ادارہ)

☆☆☆

جمیعت اہلحدیث بلتستان و دارالعلوم غواڑی بلتستان کے علماء و رہنمائ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

الحمدللہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

امابعد: قال اللہ تعالیٰ وماکان لنفس ان تموت الا باذنہ

مولانا نذیراللہ کی وفات حسرت آیات پر جمیعت اہلحدیث بلتستان کے تمام احباب مولانا مرحوم کے عزیز و اقارب اور احبابِ گلگت کے ساتھ مصیبت میں برابر کے شریک ہیں۔ مرحوم کی دینی خدمات اتنی زیادہ کہ ہم گن نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ اسے مرحوم کی میزان حسنات میں جمع فرما کر ان کے لیے نجات اور بلندی درجات کا ذریعہ بنائیں، ہمیں ان کے نیک کاموں کو جاری رکھنے کی توفیق دے اور بشری لغزشوں کو درگذر فرمائے۔ تمام سوگواران کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

از:

۱۔ الشیخ عبدالرحمان حنیف' امیر جمیعت اہلحدیث بلتستان

۲۔ الشیخ عبدالواحد عبداللہ' ناظم اعلی جمیعت اہلحدیث بلتستان

۳۔ الشیخ محمد علی جوہر' مدیر مرکز اسلامی سکردو

۴۔ الشیخ عبیدالرحمان مدنی' نائب ناظم اعلیٰ' جامعہ دارالعلوم غواڑی

24/10/2010

☆☆☆

جناب فدا علی ایثار اعتمادی ہنزائی.... ممبر ایکٹنگ کمیٹی اسماعیلی کونسل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرحوم و مغفور مولانا نذیراللہ خان صاحب ارض شمال کے ایک ممتاز عالم دین تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو بین المسالک ہم آہنگی اور اتحاد بین المسلمین

کو یقینی بنانے کے لیے وقف کر رکھی تھی یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم تمام مسالک اسلامیہ کے لئے قابل صد احترام عالم دین تھے۔ ان کی وفات سے جو خلا محسوس کیا جارہا ہے وہ بہت دیر تک محسوس کیا جائے گا۔

اسماعیلی کونسل اور جماعت سوگوار خاندان کو اس موقع پر تعزیت پیش کرتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ خداوند عالمین مرحوم کی روح کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

فقط شریک غم: فدا علی ایثار اعتمادی ہنزائی

ممبر رابطہ کمیٹی اسماعیلی ریجنل کونسل

التحریر: 2010/10/24

☆☆☆

جناب مولانا لقمان حکیم صاحب.... امیر جے یو آئی گلگت بلتستان

مولانا لقمان حکیم صاحب مولانا مرحوم کے پرانے رفیقان کار میں سے ہیں اور دونوں ہمسائے بھی ہیں۔ مولانا لقمان حکیم صاحب ان کی وفات حسرت آیات پر بڑے مغموم ہوئے۔ مولانا نے اشعار مذکورہ سے اپنے غم دل کا اظہا کیا اور اپنے تعلق کو ظاہر کیا۔ مولانا نے تعزیت کے پیغام کو لمبی چوڑی تحریر کے بجائے انہی اشعار پر اکتفاء کیا جو حسب ذیل ہیں۔

زندگی انسان کی، مانند مرغ خوشنوا

شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

عمر بھر ہم آپ کی آغوش میں پلتے رہے

جب ہم ہوئے آپ کی خدمت کے قابل' آپ اب چلتے رہے

بندہ نابکار، مغوم ساتھی

(مولوی لقمان حکیم (امیر جمیعت علماء اسلام گلگت بلتستان

24/10/2010

☆☆☆

جناب عنایت اللہ شالی صاحب.... چیئر مین جی بی این اے' گلگت بلتستان

آج یہ سطور رقم کرتے ہوئے میرا قلم لرز رہا ہے اور اشکِ قلم سیاہی کی صورت میں' غیر مربوط انداز میں قرطاس پر بکھر رہے ہیں۔ آہ! مولانا نزیر اللہ ایک نابغہِ روزگار اور پورے گلگت بلتستان کے لیے ایک عطیہ خداوندی کے مانند تھے' مولانا مرحوم کی پوری حیاتِ مبارکہ اتحاد بین المسلمین کی ترویج اور اُخوت و بھائی چارے کی فضاء قائم کرنے کی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ مولانا کی رحلت سے خطہَ شمال میں امن کے حوالے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید پورا ہوسکے۔

بہر حال موت کا پیالہ ہر ذی نفس کا مقدر ہے۔ رب کریم حضرت کو اپنے جوارحمت میں بلند درجات عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل کے ساتھ ساتھ

حضرت مولانا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علاقے میں قیام امن اور بھائی چارے کے لیے ایک مثالی کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شریک حزن

(افسردہ شمالی (عنایت اللہ شمالی

☆☆☆

جناب مشتاق احمد صاحب.... ایڈیشنل جج استور

بسم اللہ الرحمان الرحیم

جناب مولانا نذیر اللہ صاحب مرحوم ومغفور کی ذات اور ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر کرنا میرے جیسے کم علم آدمی کے بس میں نہیں۔ مولانا مرحوم ایک انتہائی پرخلوص انسان تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ دارالعلوم نصرۃ الاسلام گلگت بلتستان کا ایک نمایاں ادارہ بن چکا ہے۔ جہاں دن رات دین کی ترویج کے لیے کام ہو رہا ہے۔ مولانا صاحب نے دارالعلوم کے لیے جس جانفشانی سے دن رات کام کیا ہے وہ دین سے محبت کی ایک مثال ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مولانا مرحوم کی کمی ایک عرصے تک گلگت بلتستان میں محسوس کی جائے گی۔

دعا گو: شریک غم

مشتاق احمد، ایڈیشنل سیشن جج استور، گلگت بلتستان

24/10/2010

وادی غذر: یاسین ویلی کا ایک انوکھا سفر

اقسامِ سفر

محترم قارئین: سفر دو قسم کا ہوتا ہے، ایک وہ جو تفریح کی غرض سے کیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی ضرورت اور مقصد کے تحت کیا جاتا ہے۔ ہم نے یاسین ویلی کا جو سفر کیا وہ نہ سیر و سیاحت کی غرض سے کیا اور نہ کسی نجی و ذاتی ضرورت کے تحت۔ ہمارا یہ سفر یاسین محض ایک مقدس مشن کی پکار تھی اور ایک دینی فریضہ کی تکمیل تھی اور جب کسی سفر کا محرک یہ مقدس و پاک جذبہ ہو تو مسافر اس کی صعوبتوں، مشکلات اور آزمائشوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہے اور مشن اور فرض کی بطریق احسن آدائیگی خود اپنا صلہ بن جاتی ہے۔

وادی یاسین کی دل فریبی

وادی یاسین جانے کا انتظام مکمل تھا اور اس وادی کا میرا پہلا سفر تھا، رفیقانِ سفر کافی سارے تھے۔ کچھ مختلف الطبع اور کچھ ہم خیال۔ میرے دل و دماغ میں اس خوبصورت وادی کے بارے میں جو مناظر تھے اس سے کئی گنا یہ وادی حسین و جمیل اور دلکش و جاذب النظر لگی۔ سفر سے واپسی پر وادی یاسین اور اس کے مضافاتی گاؤں کے بارے میں میرے خیالات کچھ یوں ہیں کہ جو بھی سیاح

سرزمین غذر بالخصوص وادی یاسین میں داخل ہوتا ہے تو وہ ضرور کہتا ہوگا کہ یہاں مذاق سلیم رکھنے والے کچھ لوگ ضرور گزرے ہونگے جنہیں کچھ اور ملا ہو یا نہ ملا ہو، لیکن ذوقِ جمال، رعنائیِ خیال، قوتِ آزادی، سلیقہ مندی، جرأت مندی ضرور ملی ہوگی۔ اس سیاح نے وادی یاسین اور اس کے مضافات میں گھومنے پھرنے کے بعد یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہوگا کہ یہاں محبت، آشتی، قدرتی خوبصورتی، خوداری، احساس و جذبہ اور فن تعمیر، ذوقِ سلیم اور ہمدردی اور مہربانی کے کتنے نمونے گزرے ہونگے۔

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہوگا

روانگی

۱۲۲اکتوبر۲۰۱۱ء کو دن ۲ بجے ایک بڑا قافلہ جامعہ نصرۃ الاسلام سے وای یاسین کی طرف پابرکاب ہوا۔اس سفر میں کئی گاڑیاں تھی جن میں کافی سارے پیر و جواں عازم سفر تھے۔مجھے ہدایت دی گئ کی میں قاضی نثار احمد صاحب حفظ اللہ کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ اور ہماری معیت میں میرے دوست مولانا اولیس صاحب بھی تھے جو بہت بڑے خاموش طبع انسان ہیں' بہت کم ہی کھل جاتے ہیں اور کبھی کبھی کھِل بھی جاتے ہیں۔ قاضی نثار احمد صاحب درمیانی نشست میں بیٹھے

اور ہم اس کے جانبین میں۔ جب سفر شروع ہوا تو قاضی صاحب نے وظیفے پڑھنے شروع کئے اور پڑھتے گئے۔ میرے استفسار پر بتایا کی حقانی! میں جب بھی سفر پر نکلتا ہوں تو جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہوں۔ کچھ وظائف جو قرآن حدیث میں مذکور ہیں ان کو پڑھتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ سفری دشواریوں اور مصائب و آلام سے محفوظ فرمائیں۔ ہماری گاڑیاں بسین کراس کر گئی تھی اور ہم سفری امور پر گپ شپ کر رہے تھے۔ مولانا اویس صاحب ایک شریف النفس انسان ہیں۔ جچی تلی باتیں کرتے ہیں۔ وہ ہمیں سفری امور بتا رہے تھے اور آگے کے انتظامات سے بھی آگاہ کرا رہے تھے۔ پلک جھپکنے میں ہم شکیوٹ پہنچ گئے اور وہاں مسجد کے تعمیراتی کام کا جائزہ لیا، پھر آگے چل دیے اور چند لمحوں میں گلاپور پہنچ گئے جہاں بھی قاضی صاحب نے حسب سابق گلگت پولیس کو پانچ کلو انگور خرید کر دیے اور آگے کے سیکورٹی کے انتظامات غذر پولیس نے سنبھال لیے۔

دارالعلوم غذر میں

گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی ضلع غذر کے کیپیٹل ایریا گاہکوچ میں واقع دارالعلوم غذر میں جا پہنچی اور سب سے پہلے نماز عصر ادا کی گئی۔ دارالعلوم غذر کا مؤسس و بانی مبانی مولانا مفتی شیر زمان صاحب ہیں۔ مفتی شیر زمان صاحب ایک نیک دل اور فطرتِ سلیم رکھنے والے انسان ہیں، ضلع غذر یہاں شرک و بدعات اور اسلام بیزاری عروج پر ہے اور دین دار طبقوں کو رجعت پسند سمجھا جاتا ہے اور کم سے

کم میرا مشاہدہ یہ ہے کہ دینی امور ضلع غذر میں انتہائی ہوشیاری اور مکمل سوچ بچار سے انجام دینے چاہیے، ہلکی سی غلطی بھی بڑے نقصان کا سبب بن سکتی ہے' یاد رہے کہ کبھی ایک نقطہ ''محرم'' کو'' مجرم'' بنا دیتا ہے ایک ہلکی سی لغزش پوری قوم کے سفینے کو غرق کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے، ہمارے کچھ نادان دوست اوٹ پٹانگ حرکتیں کرکے اخلاص و للٰہیت اور حکمت و بصیرت سے کام کرنے والوں کے لیے دشواریاں پیدا کر رہے ہیں جو کسی بھی طرح مناسب نہیں ۔اہلسنت اقلیت کے باوجود اکثریت کا روپ دھاری ہوئی ہے۔اہل سنت اور اسماعیلی برادری میں بڑی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے۔

کوئی بھی معاملہ درپیش ہو' بڑی سی بڑی چپقلش پیدا ہو جائے تو فریقین کے نامور اور ذمہ دار اشخاص گفت وشنیدی اور مذاکرات کے ذریعے نمٹاتے ہیں، یہی اسلامی تعلیمات بھی ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مکی و مدنی زندگی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ بہرصورت باسیانِ غذر محبت اور رواداری کی زبان زیادہ سمجھتے ہیں بہ نسبت تشدد اور کرختگی اور سخت لہجے کے، اور یہی انداز اپنانا آج بہت مشکل ہو چکا ہے۔ تاہم مجھے اس سفر میں اندازہ ہوا کہ ضلع غذر کے علماء محبت اور رواداری کا انداز اپنائے ہوئے ہیں۔ کم سے کم مفتی شیر زمان صاحب حفظہ اللہ اور اس کے رفقاء اس کی واضح مثال ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں دینی مدارس و جامعات کو شئی متروکہ سمجھا جاتا ہے اور

دینی مدارس و جامعات کے خلاف پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں دینی مدارس کا جو امیج پیش کیا جاتا ہے وہ عموماً حقائق سے کوسوں دور ہوتا ہے اور وہ اسلام دشمنی میں کر رہے ہیں اور مکمل پلاننگ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ مغربی میڈیا اور ان کے اسکالرز اور ان کے تھینک ٹینک خوب جانتے ہیں کہ یہ مدارس اسلام کے مضبوط قلعے ہیں جہاں سے دین کی ہر فیکٹری کو مال مہیا کیا جاتا ہے۔ اہل جہاد کی صدائیں بلند کرنے والے ہوں یا دعوت و تبلیغ کا علم بلند کرنے والے ہوں یا لاکھوں مساجد و مکاتیب میں اللہ اکبر اور مسلمانوں کو خدا سے جوڑنے والے یہی مدارس کے تربیت یافتہ ہیں۔ مغرب اسلام دشمنی میں اپنا کام کر رہا ہے مگر افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار اور اصحابِ قلم بھی ان کی لے میں لے ملا کر ان مدارس کو بدنام کرنے کوششوں میں لگے ہوئے ہیں اور ان کو ملیامیٹ کرنے کے مذموم جال بنتے ہیں اور ان کی عمارتوں کو قبضہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم ہے کہ مدرسہ کس چیز کا نام ہے۔ مجھے مفتی محمود علیہ الرحمہ کے الفاظ یاد آ رہے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ: ''مدرسہ عمارت کا نام نہیں بلکہ مدرسہ استاد شاگرد اور کتاب کے تعلق کا نام ہے۔ اگر حکومت نے مٹی اور گارے سے بنی عمارتوں کو قبضہ کر لیا تو ہم درختوں کے سائے میں چٹائیاں بچھا کر تشنگانِ علومِ اسلامیہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں گے۔'' حضرت مولانا محمد یوسف بنوری سے پوچھا گیا کہ حضرت! اگر اربابِ اقتدار علماء کرام سے مدارس چھین لئے تو آپ

لوگ کیا کریں گے؟ تو حضرت نے برجستہ بہت ہی خوبصورت جواب دیا کہ '' میں کسی دیہات میں ویران اور بند مسجد کو کھلوا کر جھاڑو لگاؤں گا۔ اذان اور باجماعت نماز کا اہتمام کرونگا اور اہل محلّہ سے درخواست کروں گا اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے بھیجیں'' یہ ہے مدرسہ کی حقیقت لہٰذا اہل اقتدار اور مدرسہ بیزار لوگوں کو اس قسم کی بھونڈی کوششوں سے گریز کرنا چاہیے۔

ہم دارالعلوم غذر میں داخل ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مدرسہ کے تمام اساتذہ اور طلبہ ہمارا انتظار میں کھڑے تھے۔ گاڑیوں سے اترے، یخ پانی سے وضو کیا، نماز عصر ادا کی اور قاضی نثار صاحب نے طلبہ سے مختصر خطاب کیا اور اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ مہمان اور میزبان مل کر چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور میں مدرسے کے لان میں کھڑا مدرسے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مدرسے کے تعمیراتی کام اور تزئین و آرائش اور صفائی دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے۔ میں خیالات کی دنیا میں چلا گیا۔ مدارس اسلامیہ کا جاندار ماضی یاد آنے لگا۔ اچانک کسی نے آواز دی کہ حقانی میاں! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے پہلے چائے نوش کرلو بعد میں مدرسہ کا جائزہ لو۔ میں مہمانوں کے درمیان بیٹھ گیا ایک کپ چائے پی لی۔ اس وقت چائے کی بڑی طلب تھی مگر سچی بات یہ ہے کہ چائے معیاری نہیں تھی۔ ویسے بھی میرا چائے کا نشہ ہے، نشہ اور طلب ساتھ ہوں اور چائے بھی کمزور ہو تو طبعیت مضمحل ہو جاتی ہے، چائے نوشی کے بعد قاضی نثار احمد

مفتی شیر زمان کے ساتھ مدرسے کے مختلف امور اور تعمیراتی کاموں اور مختلف شعبوں کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے اور دوسرے احباب ٹولیاں بنا کر ادھر اُدھر جھانک رہے تھے۔ میں بھی مدرسے کے حوالے سے کچھ چیزیں نوٹ کرنے بیٹھ گیا۔ دارالعلوم غذر میں حفظ و ناظرہ کے ساتھ درس نظامی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس دارالعلوم میں لڑکیوں کا بھی بہترین نظام ہے جہاں درجہ حفظ و ناظرہ سے لیکر دورہ حدیث تک کی مکمل تعلیم گزشتہ کئی سالوں سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ دی جاتی ہے۔ مولوی عبدالرزاق استاد دارالعلوم غذر بتا رہے تھے کہ اس سال (۲۰۱۲ئ) ۲۳۰ طالبات اور ۱۵۰ طلبہ تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ ان میں اکثر اقامتی طلبہ و طالبات ہیں جن کے طعام و قیام اور دیگر ضروریات مدرسہ پوری کرتا ہے اور ۲۲ اساتذہ ہیں جو تعلیم و تربیت پر مامور ہیں۔ اسی دوران ایک طرف سے قاضی نثار اور مفتی شیر زمان وارد ہوئے، مفتی صاحب میرا ہاتھ تھام کر کہ رہے تھے ''کہ بھائی آپ تو کبھی کبھار آیا کریں نا، ویسے بھی تم قلم کار لوگ سیر و سیاحت کے شوقین ہوتے ہو''۔ میں نے عرض کیا کہ مفتی صاحب! ضرور آئیں گے، بڑے شوق سے آئیں گے۔ بہر صورت اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر ہمارا قافلہ چل نکلا۔ مفتی شیر زمان بتا رہے تھے کہ کل ہم بھی پروگرام کے لئے آئیں گے۔

معالم کی تباہ حالی

معالم گاہکوچ سے تھوڑا آگے ایک گاؤں ہے جہاں سے ہم گزر رہے تھے، مغرب کا وقت تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہاں سیلاب نے اتنی تباہی مچائی ہے۔ بہت زیادہ زرعی زمینیں متاثر ہوئی ہیں اور اب تک ریکنسٹرکشن کا کام شروع نہیں کیا جا سکا۔ یہاں سخت سردی محسوس ہو رہی تھی۔پت جھڑ کا موسم عروج پر تھا۔

گوپس میں ہمارے قافلے کا استقبال

یاسین، گوپس اور دیگر مضافات کے علماء و طلبا اور عوام کا ایک جم غفیر گوپس میں جمع ہوا تھا جو اپنے معزز مہمانوں کے انتظار میں تھے۔یوں ہی قافلہ گوپس میں پہنچا تو ہزاروں لوگ جمع تھے۔ انہوں نے نعرے بازی شروع کی۔ میں مبہوت یہ والہانہ انداز محبت کو دیکھ رہا تھا اور دیکھتا جاتا تھا۔ قاضی نثار احمد صاحب گاڑی سے اترے اور تمام علماء سے فرداً فرداً معانقہ کیا، نوجوان اور بوڑھے بھی اپنے امیر سے ملنے کے لئے مسابقہ کر رہے تھے۔یہاں قاضی صاحب نے اپنے معزز میزبانوں سے کہا کہ تفصیلی بات آگے چل کر ہوگی۔ اب مغرب کا وقت قریب ہے ہمیں سفر جاری رکھنا چاہیے تاکہ بروقت ہم منزل تک پہنچ پائے۔ یوں ایک دفعہ پھر ہم مائل بہ سفر ہوئے۔ نوجوانوں نے سینکڑوں موٹرسائیکلوں کی ایک لائن بنائی اور چلنا شروع کیا۔ ہم درمیان میں تھے اور آخر میں گوپس اور یاسین والوں کی گاڑیاں تھی۔ مجھے ان کا نظم وضبط دیکھ کر

جماعت اسلامی کے جلسے اور احتجاجی مظاہرے یاد آنے لگے۔جماعت اسلامی کے پاس افرادی قوت بہت کم ہے مگر ان کا نظم و ضبط بالخصوص مظاہروں، ہڑتالوں اور کانفرنسوں میں جو ترتیب و تنظیم دیکھنے میں آتی ہے وہ بے حد بھلی لگتی ہے۔ بعض دفعہ تو وہ سینکڑوں کے مجموعے کو لاکھوں کا مجموعہ بنادیتے ہیں۔یہاں بھی ایسا لگ رہا تھا کہ بس گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا ایک دریا ہے جو پورے گلگت بلتستان سے اُمڈ آیا ہے۔

گوپس سے ایک راستہ پھنڈر کو نکلتا ہے جو آگے جا کر چترال سے ملتا ہے اور ایک راستہ یاسین کا ہے۔ گوپس اور یاسین کو ملانے کے لئے ایک پل بنائی گئی ہے جو نہایت خوبصورت ہے ۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ چین نے بنوائی ہے۔ فن تعمیر میں اہل چین کو ید طولٰی حاصل ہے۔انہوں یہاں جو بھی کام کیا ہے وہ پائیدار اور مضبوط ہے۔ کاش ہمارے انجنیئر بھی ان کی طرح سوچتے، کرپشن سے بعض آتے۔۔ ملک وملت کی ترقی کا سوچتے اور تعمیراتی کاموں میں خرد برد سے گریز کرتے یا کم سے کم حکومت ایسے ٹھیکیداروں اور انجینیروں کو کیفر کردار تک پہنچاتی جو کھربوں کے بڑے بڑے پراجیکٹس کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتے ہیں۔ وہ کیونکر ایسا کریں کیونکہ کمیشن میں وہ بچارے بھی تو حصہ دار ہوتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو اس ملک کی تباہی و بربادی میں کرپٹ حکمرانوں کے ساتھ چور ٹھیکیدار اور ان کے ناقص کاموں کی منظوری دینے والے تمام انجینئرز بھی

شامل ہیں۔۔

ہمیں گوپس سے یاسین تک پہنچنے میں کافی وقت لگا کیونکہ موٹرسائیکل والے خرامے خرامے چل رہے تھے اور وہ بھی لائن لگا کر۔ ایک دوسروں سے مسابقت کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ مزے کی بات یہ کہ رات کے اس وقت میں بھی لوگ روڈ کے کناروں میں استقبال کے لئے کھڑے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر اظہار محبت کرتے تھے۔

پھولوں اور پھلوں کے گھر میں اقامت

گاڑیوں کا قافلہ سیدھا مولاناارشاد صاحب کے گھر یں جا پہنچا۔ مولانا ارشاد مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں اور خوش اخلاق انسان ہیں، روانی سے عربی بولتے ہیں۔ وہاں اہل یاسین والے بڑی تعداد میں جمع تھے۔ وہ تمام مہمانوں سے انتہائی خوش دلی سے ملے۔ بہترین تواضع کیا۔ اگلے دن کے مختلف امورکے بارے میں صلاح مشورے ہونے لگے۔ میں دن بھر کے احوال کو نوٹ کرنے بیٹھ گیا۔ یاران قافلہ بھی سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ رات کو جب ہم یاسین پہنچے تو کچھ سرکاری فرشتے بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے کچھ دوستوں نے باخبر کیا تھا کہ ان '' سرکاری فرشتوں'' سے ہوشیار و محتاط رہوں۔ رات عافیت سے گزر گئی اور سویرے جاگ گئے، فجر کی نماز باجماعت پڑھی اور علماء ، طلباء اور عمائدین یاسین کی ایک

مجلس جم گئی اور روز مرہ کے مختلف احوال پر زور و شور سے مکالمہ شروع ہوا۔ میں کھسک کر یارانِ محفل سے باہر نکل گیا۔ مولانا ارشاد صاحب کا بڑا خوبصورت گھر تھا، مہمان خانہ الگ اور اندرون خانہ الگ۔ مہمان خانے کے ساتھ ایک بڑا صحن تھا جہاں ہر قسم کے درخت تھے اور سیب کے درخت کثرت سے تھے، کئی اقسام کے سیب تھے جن سے ایک ایک توڑ کر ذائقہ چکھ لیا۔ قدرت خداوندی بھی عجیب ہے کہ ہر سیب کا ذائقہ دوسرے سے مختلف تھا۔ درختوں سے پتے چھم چھم گر رہے تھے، پت جھڑ کے موسم میں بادِ صبا نے ذوق لطیف پیدا کیا تھا۔ یاسین میں سردی کی شروعات تھی اور یوں سویرے سویرے باد خزاں کے تھپیڑوں کا سامنا کر رہا تھا۔ اکتوبر کے آواخر کے ایام تھے۔ دائیں بائیں نظریں دوڑائیں تو یاسین کے کالے پہاڑ اپنی آن و شان کے ساتھ کھڑے تھے، ان پر برف کی سفید تہہ ہلکی سی جمی تھی، موسم بڑا خنک تھا' میں خیالوں و خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ دل دھک سے رہ گیا، دل و دماغ کے خوابیدہ خوف جاگنے لگے، کیفیت عجیب تھی، ایک لحظہ خوف اور ایک لحظہ خوشی و طمانیت' دائیں بائیں دیکھتا تو امنگوں کے مرغزار اور آرزوؤں کے اور خواہشوں کی کونپلیں پھوٹتیں، یہ ننھے ننھے درخت اور پر خوبصورت پھول اور ان کے ساتھ کانٹے اور کونپلیں، اور یہ ہری بھری کیاریاں، سچی بات یہ ہے کہ دل میں کسی بے نام و گمنام گزند کا خیال و خواب سانپ کے پھن کی طرح لہرانے لگا۔ ارشاد صاحب کے صحن نما باغ کے ایک طرف پانی نظر آیا، شفاف پانی' وادی یاسین کی ندی نالوں میں شفاف پانی بہتا دکھائی دے رہا

تھا۔ یہ شفاف پانی اپنی پاکیزگی، شریں و عذبیت اور رنگت میں چاندنی کی طرح چمک رہا تھا اور آسمان کو بھی شرماتا جاتا تھا۔ کبھی سورج کی کرنیں درختوں پر پڑھ رہی تھیں اور ایک خوبصورت سماں بندھا جارہا تھا۔ یکایک سامنے چیری کے درخت پر دو کبوتر نظر آئے اور پھدک پھدک کرایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ان دونوں کے دل دھڑکے، اضطراب و خوف کا حسین منظر، میں خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور اس خاموشی میں ایک بہترین قسم کا ترنم تھا۔ ایک پھولوں کے اس گھر میں جابجا پھول آگائے گئے تھے۔پت جھڑ کے موسم میں وہ مرجھائے ہوئے تھے' ایسا لگ رہا تھا کہ کافی عرصے سے ان کو پانی نہیں دیا گیا ہے حالانکہ زمین شبنم سے تر تھی، گھاس میں بھی زردی غالب تھی۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنے خیال میں یاسین کی معاشرتی و تمدنی ترقی و تغیر کا نقشہ کھینچ رہا تھا اتنے میں کہی دور سے مولانا منیر اور قاضی صاحب آتے دکھائی دیے۔جب ان کے پاس پہنچا تو وہ بتا رہے تھے کہ نسیمِ صبح سے دلدوز ہونے کے لئے نکلے ہیں، مولانا منیر صاحب لان میں ٹہلتے ہوئے ضلع غذر کی تعریفوں میں قلابازیاں لگا رہے تھے اور پت جھڑ کے موسم کی خصوصیات و افادیت پر لیکچر دے رہے تھے اور ضلع غذر کے لوگوں کی خوش اخلاقی اور تزئین اور آرائش کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے اور میں ان کے لیکچر سے اکتا کر موضوع بدلنا چاہتا مگر وہ کہاں جان چھوڑنے والے تھے۔ مولانا صاحب باتیں بڑے وجد میں آکر کرتے ہیں، انداز ہی کچھ نرالا ہے۔منیر صاحب کے لیکچر سے میں نے یہ محسوس کیا کہ

سرزمین غذر کے پھول، آسمانوں کے تارے اور چاند' ہواؤں کے بادل اور باسیان غذر کلیوں کی طرح کھلتے ہیں اور پریمی گیتوں کی طرح بلند ہوتے ہیں اور ہر جگہ پھیل جاتے ہیں۔ اور یہ حسین مناظر اور پاکیزہ جذبات محبت و مودت اور مسکراہٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔ سو ہے کوئی ان نرم ہواؤں اور سرخ رخساروں میں لطیف جھونکے اور مقدس لمس ڈھونڈے؟۔

یاسین پر ایک طائرانہ نظر

یاسین بے حد خوبصورت وادی ہے، یاسین کے لوگ ملنسار ہیں' ہوشیار ہیں اور حسین وجمیل بھی ہیں۔ وادی یاسین سیر و سیاحت کی غرض سے کوئی بھی پاکیزہ ذوق اور شگفتہ مزاج رکھنا والا انسان دیار غیر سے یہاں قدم رکھتا ہے تو وہ وادی یاسین کے بارے میں یہ ضروخیال کرتا ہوگا ''کہ وادیِ یاسین میں مذاق سلیم رکھنے والے کچھ لوگ ضرور گزرے ہونگے جنھیں کچھ اور ملا یا نہ ملا ہو، لیکن ذوق جمال، رعنائی خیال، قوت آزادی، سلیقہ مندی، جرأت مندی ملی ہوگی۔ اس سیاح نے وادی یاسین اور اس کے مضافات میں گھومنے پھرنے کے بعد یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہوگا کہ یہاں محبت، آشتی، قدرتی خوبصورتی، خوداری، احساس وجذبہ اور فن تعمیر، ذوق سلیم اور ہمدردی اور مہربانی کے کتنے نمونے گزرے ہونگے''۔

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہوگا

میں بھی انہی جذبات سے معمور لوٹا اور اپنے جذبات و خیالات کو نوک قلم کے ذریعے آپ سے شیئر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اس میں کامیاب ہو بھی رہا ہوں کہ نہیں مگر کیا کروں مجبور ہوں، لہٰذا پ ایک دیار غیر سے وارد ہونے والے نوآموز قلم کار کے تاثرات پڑھتے جائیں اور محظوظ ہوتے جائیں۔

ناشتہ کے بعد شیڈول کے مطابق مہمانوں سمیت میزبانوں کا ایک بڑا قافلہ ہندور روانہ ہوا۔ ہندور جانے کا شوق بہت پہلے سے دل یں انگڑائی لے چکا تھا اور آج خوش قسمتی سے یہ شوق بھی پور ہو رہا تھا۔ راستے میں قاضی نثار صاحب بتا رہے تھے کہ '' ۱۹۹۹ء کو ہم مولانا یوسف لدھیانوی کی معیت میں یہاں آئے تھے یہاں ہم نے اقراء روضۃ الاطفال کے سکول کا افتتاح کیا اور یہاں حضرت والا کا بیان بھی ہوا، علاقے میں کافی گھومے پھرے'' ۔یاسین میں اقراء روضۃ الاطفال کا بہترین سکول ہے جہاں دینی و عصری دونوں تعلیم اعلی معیار پر دی جاتی ہے، قراقرم بورڈ اور فیڈرل بورڈ میں بھی اقراء اسکول کے طلبہ و طالبات کو پوزیشنیں آتیں رہتیں ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں قراقرم بورڈ میں میٹرک کی تینوں پوزیشنیں اقراء روضۃ الاطفال یاسین برانچ کی تھی۔ بورڈ میں پوزیشن لینے والی طالبات کا تعلق بھی یاسین اور اسکے مضافات سے تھا۔ یاسین میں اقراء اسکول

نے سینکڑوں حفاظ پیدا کیئے۔ علماء اور دین دار طبقوں پر تبرا کرنے والوں کی آنکھیں کھل جانی چاہیے کہ ان کے زیر انتظام واہتمام چلنے والے سکول ومدارس کے طلبہ وطالبات سرکاری وعصری اداروں تعلیم حاصل کرنے والوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔

راستے میں یاسین اور اس کے ملحقہ گاؤں کا جائزہ لیتا رہا۔ سپیدہ کے درختوں کا بہتات تھا۔ یاسین ضلع غذر کے دیگر علاقوں سے بہت زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا ہے، یاسین کے مشہور گاؤں طاؤس، سندھی، سلطان آباد ہیں۔ ضلع غذر کا سب سے بڑا گاؤں شیر قلعہ ہے اور دوسرا بڑا گاؤں سندھی ہے۔ یاسین میں بھی دریا کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے، یاسین کا آخری گاؤں درکت ہے اس کے بعد پامیر کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ پامیر کو ایک راستہ ہنزہ سے جاتا ہے اور ایک یاسین سے، پامیر کا سن کر مجھے اپنے دوست نور محمد گوجالی یاد آگئے جو آن لائن میگزین پامیر ٹائم کا چیف ایڈیٹر ہیں۔ پامیر ٹائم میں میرے مضامین گزشتہ کئی عرصے سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں اور اہل ذوق کا اچھا فیڈ بیک بھی موصول ہوتا ہے۔ قاضی صاحب ہندور جاتے ہوئے راستے میں آنے والی بستیوں کے نام اور خصوصیات بھی بتاتے جا رہے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم گوہر آمان کے بڑے شیدائی ہیں ان کو موحد اور مجاہد کہتے ہیں۔ یاسین میں نوجوان مغربی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں جب کہ بوڑھے دیسی اور علاقائی لباس کے ساتھ علاقائی ثقافت اور تہذیب کو زندہ

کئے ہوئے تھے ۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یاسین کا اپنا کلچر، تہذیب و تمدن اور روایات سمندر کے کنارے کھڑی ہیں اور سمندر بُرد ہونے کو ہیں ۔ اسکے مقابلے میں مغربی لباس و خیال نے نوجوانوں کو بری طرح آ دبوچا ہے۔ بس نگلنے کو ہے۔ دل سے دعا ہے کہ خدا مسلمانوں کو بالخصوص نوجوانوں کو مغربی خرافات اور ان کے ٹشو ایبل کلچر سے محفوظ و مامون رکھے۔

لالک جان کے مزار میں

گاڑیوں کا قافلہ بالآخر جاکر حولدار لالک جان کے مزار پر رُکا۔ حولدار لالک جان ۱۲ ۔این۔ ایل۔ ائی رجمنٹ گلگت بلتستان کا وہ عظیم سپوت ہے جس نے ۷ جولائی ۱۹۹۹ء کو کارگل وار میں ملک عزیز کی خاطر اپنی پیاری جان جان آفریں کے سپرد کی اور عظمت و بہادری کے جھنڈے گاڑ دیے، انہیں گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے نشان حیدر کا تمغہ ملا۔ حولدار لالک جان گلگت بلتستان کے واحد فوجی ہے جنھیں یہ عظیم اعزاز ملا۔ لاریب کہ اس پہاڑوں کے بیٹے نے پوری قوم کا نام فخر سے بلند کردیا۔ قافلے کے تمام احباب نے مزار کا نظارہ کیا۔ میں سیدھا جاکر قبر کے ساتھ بنے مینارے کے پاس کھڑا ہوا، دیر تک سوچتا رہا۔ دل میں خیالات کا ایک دریا موجیں مارنے لگا، مجھے نام کمانے والے ان نامور لوگوں کے نام یاد آنے لگے جنھوں نے قوم وملت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کیا۔ دنیا، دنیا، دنیا یعنی اس وادی دل فریب میں زندہ رہنے کے لئے آخری حدوں

کو چھو گئے۔ کوئی قلم کی بدولت زندہ رہا، کوئی تقویٰ و زہد کی وجہ سے تابندہ رہا، کوئی جرأت و بہادری کی وجہ سے صدیوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے، کوئی حاتم طائی بن کر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا رہا، کوئی محبتوں کا درس عام کرتے ہوئے انبوہ عام میں اپنے لئے مقام و محبت سمیٹتا رہا، اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پاس ملک وملت کو دینے کے لئے کچھ نہ تھا بس خدا تعالی کی دی ہوئی جان کو جان آفریں کر دیا اور رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گئے اور تاریخ کو مجبور کیا کہ وہ ان کا تذکرہ ضرور کرے۔لالک جان کے مزار میں قبر کے ساتھ بنا مینارے کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے آنکھیں بند کر دی اور سوچنا شروع کیا، میرے دماغ نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ یہ دنیا بظاہر سر سبز و شاداب اور ہریالی کھیتی سے بھی زیادہ دلکش ہے' جاذب النظر ہے، مگر اے حقانی ! تیرے لئے ایک مرجھایا ہوا گلاب، کملایا ہوا پھول جس میں نہ رنگ ہے نہ خوشبو، یہ دنیا ایک دلفریب وادی ہے اور تبسم سے بڑھ کر حسین وجمیل، جہاں چاند اپنی پوری شوخی سے چمکتا ہے اور ستارے اس کے ارد گرد رقص کرتے ہیں،اور یہ عمل صدیوں سے جاری و ساری ہے، تا قیامت جاری و ساری رہے گا۔ اور خدا کی ذات کے بغیر اس میں کوئی تغیر نہیں کر سکتا مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ ایک وادی پُر فریب ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اے ناداں انسان ! یہ ایک جُرعہ ہلاہل ہے یعنی ایک کڑوا گھونٹ جسے محض چھونا ہی سینکڑوں مصائب کا پیش خیمہ ہے۔ اور عجب بات تھی کہ میرے دماغ کے اس فلسفیانہ لیکچر کو میرا دل تسلیم کر رہا تھا

بلکہ سرا رہا تھا۔اچانک میرا دل اور دماغ ایک ساتھ رب رحمٰن کے حضور دست بدعا تھے کہ اے مالک ارض و سمائ' اے خدائے رحیم و کریم !.........کیا اس وادی شوریدہ اور جائے دریدہ میں کوئی ایسا نغمہ ' کوئی ایسی لَے ' کوئی ایسی سُر یا کوئی ایسا گیت' پریمی گیت' محبت و مودت و اخوت و بھائی چارگی پر مبنی گیت نہیں ہے جو آپ اپنے خزانۂ غیب سے مجھے خصوصیت سے عطا فرمائے؟ جو میرے قلبِ حزیں اور دلِ درماندہ کو ایک لحظہ و ساعت سکون دے سکے اور مضطرب دل و بے کل دماغ اور کبیدہ جگر کو مکمل طمانیت۔ ایسی طمانیت جس کا ذکر آپ نے اپنے پیارے حبیب کے دلِ انوار میں بذریعے وحی اترا ہے کہ'' یٰایتھا النفس المطمئنۃ'''' بے شک اس نفس مطمئن کا وعدہ تو روز جزا کے وقت ہے اور دنیا دارالجزاء نہیں دارالعمل ہے لیکن تیری قدرت تو اس سے بڑھ کر ہے، تو اگر نوازنا چاہیے تو دارالعمل میں بھی ممکن ہے۔ اور یا اللہ ! عطا کر مجھ فقیر کو' اس وادیِ دلفریب میں ایسی عظمت و سطوت اور عزت و مرتبت جو مجھے صدیوں زندہ و تابندہ رکھے۔ یا پھر اس دنیا و مافیہا سے مجھے بے خبر کردے۔ بس اس وادیِ دلفریب میں میرا رَن نغمہ ہی اور ہو' سب سے نرالا ہو' جس طرح روز محشر میرے آقا محمد رسول اللہ کا ساری مخلوقات سے رَن نغمہ اور ہوگا۔ ہر ایک'' نفسی نفسی'' پکارے گا اور پیارے آقا'''امتی امتی''۔

لالک جان کا مزار صاف ستھرا تھا اور خوبصورت بھی۔ میں نے مزار کے ساتھ

تصویریں بنوائی اور ارگرد کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ دوسرے احباب مزار کا نظارہ کرنے کے بعد گیٹ سے باہر نکلے تھے، میں بھی ان کی تابعیت میں اس نامور انسان کو سیلوٹ کرتے ہوئے باہر نکلا، ساتھ ہی اسکا گھر ہے۔ دائیں بائیں نظریں دوڑائیں تو علاقہ بڑا پیارا لگا۔کالے پتھروں میں گرا ہندور میں منظر بڑا دلکش تھا، مزار کا کوئی محافظ اور چوکیدار نظر نہیں آیا۔ ایک مقامی آدمی قاضی صاحب کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ اصرار کررہا تھا کہ ان کے گھر میں ایک کپ چائے پی لیا جائے مگر ترتیب کے مطابق ہمیں ٹھیک وقت پر دوبارہ یاسین جلسہ گاہ میں پہنچنا تھا اس لئے اس سے معذرت کرنی پڑی، مجھے آج تک یہ بات سمجھ ہی نہ آسکی کہ اسماعیلی برادری کے لوگ قاضی نثار احمد کو اتنا کیوں پسند کرتے ہیں، بظاہر قاضی صاحب کے ان سے اتنے کوئی تعلقات بھی نہیں، نہ ہی کوئی ایسے معاملات ہیں، ضلع غذر کے اسماعیلی برادری سے آج تک قاضی صاحب کے بارے میں تذکرہ خیر ہی سننے کو ملا، ان کے اس تذکرے میں کوئی تصنع اور بناوٹ بھی نہیں، شاید ایں سعادت بزور بازو نیست۔

راجہ گوہر آمان کے قبر پر حاضری

قاضی نثار احمد کو راجہ گوہر آمان سے کچھ زیادہ ہی عقیدت ہے۔ وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، انہیں سید احمد شہید کے پیروکار کہتے ہیں۔ شیڈول کے مطابق لالک جان کے مزار سے سیدھا راجہ گوہر آمان مرحوم کی قبر

میں حاضر ہونا تھا، یوں ہم نے ہندور سے وہاں کی طرف رخت سفر باندھ دیا اور وہاں پہنچ گئے۔

راجہ گوہر آمان گلگت بلتستان کی تاریخ کا ایک معروف نام ہے۔ راجہ گوہر آمان نے یاسین سے حملہ آور ہو کر شاہ سکندر کو قتل کر دیا تھا اور گلگت ایجنسی پر اپنی حکومت قائم کی تھی، ایک روایت کے مطابق غضنفر جان راجہ ہنزہ اور جعفر علی راجہ نگر بھی راجہ گوہر آمان کے اتحادی تھے۔ ان تمام راجاؤں نے ڈوگرہ کے خلاف مختلف اوقات میں لڑائیاں کی، صلاح ہوئی، اقوام داریل بھی راجہ گوہر آمان کے اہم اتحادی اور جنگی معاونین تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق 1852ء کو راجہ گوہر آمان نے ڈوگروں کو قتل کر کے گلگت پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ بہر صورت تاریخی روایات مختلف ہیں۔ لیکن یہ بات متفقہ ہے کہ راجہ گوہر آمان ایک نڈر اور بہادر انسان تھے۔ انہوں نے اپنے علاقوں میں بیرونی طاقتوں کو کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کے ساتھ نبرد آزما رہا۔ اس حوالے سے وہ گلگت بلتستان میں قائم اس وقت کے مختلف راجاؤں سے سفارتی تعلقات بھی قائم کرتے رہے۔

راجہ کی قبر پر یارانِ قافلہ کی دعا و فاتحہ خوانی

راجہ گوہر آمان کی قبر ان کے قلعے سے تھوڑی پیدل مسافت پر اس پار ایک پہاڑی

کے دامن میں واقع ہے۔ ساتھ ہی نالہ بہتا ہے جہاں شفاف پانی ہے۔ ہم ان کی قبر تک نالہ عبور کرکے گئے، یہاں نالہ کراس کرنے کے لئے سفیدہ کے سالم درختوں سے عارضی گزرگاہ بنائی گئی تھی۔ شاید گزشتہ سیلاب نے جو راستہ یا پرانا پل تھا بہا لے گیا ہوگا۔جب ان کی قبر پر پہنچے تو ساتھ کئی اور قبریں نظر آئیں۔راجہ گوہر آمان کی قبر پرانے طرز کی ہے اور کچی بھی ہے، کوئی بناوٹ اور تعمیر نہیں کروائی گئی ہے۔اسلام کا بھی یہی درس ہے۔اگر راجہ مرحوم کی قبر کو مزار کا شکل دیا جائے تو بعید نہیں کہ ایک مدت کے بعد وہ قبر نہ رہے بلکہ خرافات و بدعات اور فاحشات کا گڑھ بن جائے۔ سمجھ دار ہیں راجہ مرحوم کی اولاد کہ انہوں نے اس بدعت کا راستہ روک رکھا ہے۔راجہ مرحوم کی آرام گاہ کے ساتھ ایک اور بڑی قبر ہے۔ مقامی لوگوں کا بتانا ہے کہ یہ قبر اس زمانے کے مشہور پہلوان کی ہے، نام معلوم نہ ہوسکا۔ پہلوان کے بارے میں بھی مقامی لوگوں کا خیال اچھا تھا۔ قاضی صاحب راجہ کی قبر پر ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے لگے، ہم نے بھی اپنی بساط کے مطابق دعا کی اور جلد ہی ادھر اُدھر کے نظاروں میں مصروف ہوگے۔ یہاں سے منظر بڑا پیارا دکھائی دیتا تھا، سامنے دریائے یاسین اپنی آب و تاب سے بہہ رہا تھا، اور پشت کی طرف ایک پہاڑی تھی، ایک جانب درختوں کا جھنڈ تھا اور ساتھ ہی شفاف پانی کا نالہ اپنی خوبصورتی کا احساس دلا رہا تھا۔جب قاضی صاحب فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے تو ہم نے چل دیے۔

راجہ کے قلعے اور مسجد کی زیارت

واپسی پر ہم لوگ راجہ گوہر آمان کی تعمیر کردہ مسجد میں گئے۔ یہاں دو مسجدیں ہیں، ایک مسجد راجہ کے زمانے کی ہے، جو اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ پرانی مسجد کا دروازہ اور چھت انتہائی خوبصورتی سے بنائے گئے ہیں، اعلیٰ قسم کی لکڑیوں پر بہترین نقش نگاری کی گئی ہے۔ مسجد کے متصل ایک حجرہ بھی اپنی پرانی حالت میں موجود ہے اور ساتھ ہی راجہ گوہر آمان کا قلعہ بھی ہے، حجرہ اور قلعہ اپنی اصلی کیفیت میں باقی ہے، حجرہ تین سو سال پرانا ہے اور عجیب و غریب طرز تعمیر کا یہ عظیم شاہکار بڑا دلفریب لگ رہا ہے۔ اس حجرے میں سات بڑے بڑے ستون انتہائی نقش و نگار اور اعلیٰ کشیدہ کاری کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ راجہ نے یعنی کہ راجہ دستگیر مرحوم نے تین شرائط کے ساتھ یہ قلعہ، پرانی مسجد کے ساتھ متصل زمین اور حجرہ، یاسین کے مسلمانوں کے لئے وقف کیا ہے۔

۱۔ یہ عیدگاہ ہی رہی گی۔

۲۔ پرانی مسجد اور دفتر کو اپنی اصلی حالت میں برقرار رکھا جائے گا۔

۳۔ کہیں سے بھی پرانی دیوار کو نہیں گرایا جائے گا۔

پرانی مسجد کے ساتھ متصل ایک نئی مسجد امِ عبداللہ کے نام سے بنوائی گئی ہے

تاہم اب بھی یہ مسجد قلعہ والی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ راجہ کی اجازت سے یاسین کے مقامی علماء کرام نے تنظیم اہل سنت والجماعت کی دفتر بھی یہاں قائم کی ہے۔ پاک فوج کے ریٹائرڈ خطیب مولانا عبدالرحیم (فاضل علامہ بنوری ٹاؤن کراچی) بتارہے تھے کہ اہل سنت کے اکثر معاملات یعنی نماز جمعہ، نماز عید وغیرہ یہی پہ سرانجام دیے جاتے ہیں۔ اس مسجد کے ساتھ ایک چنار کا درخت ہے، بقول محمد نواز صاحب جنرل سکریٹری تنظیم اہل سنت والجماعت گلگت بلتستان) کے ' یہ درخت عمر اور تنے کے) اعتبار سے گلگت بلتستان میں چنار کا سب سے بڑا درخت ہے۔ اس کی موٹائی یقینا دیکھنے کے قابل ہے۔ موٹا تنا رکھنے والا یہ درخت اب بھی موجود ہے۔ پرانی مسجد میں ' میں اور قاضی صاحب داخل ہوئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ دو رکعت پڑھو، اور خود بھی پڑھنے لگے۔ میں نے دو رکعت پڑھ کر اس پرانی مسجد کی چند تصویریں لی اور باہر نکل گیا۔ قلعہ ، نئی مسجد، عیدگاہ، حجرہ اور دیگر چیزوں کا تفصیلی جائزہ لے کر دوبارہ پرانی مسجد میں داخل ہوا تو قاضی صاحب ابھی تک دعا میں مصروف تھے۔ میں نے کہا کہ حضرت اتنا کافی ہے، انہوں نے دعا ختم کی اور مجھے کچھ احوال بتانے لگے۔ مجھے یہی یاد پڑھتا ہے کہ اس پرانی مسجد کو ابھی قرآن کی درسگاہ بنایا گیا ہے۔ قافلہ کے دوسرے احباب اور سیکورٹی پر مامور پولیس اہلکار باہر کھڑے تھے۔ خیر اپنے اکابر واسلاف کی ان یاد گاروں پر حسرت بھری ایک نظر ڈال کر دوبارہ آنے کا قصد لیے باہر نکلے۔

طاؤس میں دارالعلوم یاسین کا افتتاح

یاسین یوتھ اسٹوڈنٹ) Y.Y.S.O راجہ گوہر آمان کے قلعے اور مسجد سے واپسی پر آرگنائیزیشن) کے عہدہ داروں کے ساتھ میں اور قاضی نثار صاحب کی ایک خاص نشست کرائی گئی۔ اس کے بعد موٹر سائیکلوں کے جلوے میں مرکزی شاہراہ طاؤس پہ ہم منعقدہ جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔پہلی نشست سے مقامی علماء کرام نے بیانات کیے۔ دوسری نشست ۱۱ بجے شروع ہوئی ،تلاوت قرآن اور حمدیہ و نعتیہ کلام سے خوب محظوظ ہوئے۔ بعض مقامی علماء کی تقریریں اور خطبات بڑے اچھے لگے۔ اپنے دوست برادرم مولوی عرفان صاحب ،صاحب المنصۃ (اسٹیج سیکریٹری)کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ خوب بولتے ہیں، زمانہ طالب علمی سے یہ کام بڑے ذوق سے کرتے آرہے ہیں۔ایک ڈائری میں مخصوص اشعار اور ضرب الامثال و محاورے نوٹ کرلیے ہیں۔ اور کچھ اشعار یاد بھی ہیں۔ ان کو اکثر محفلوں اور جلسوں میں قند مکرر کے طور پر سناتے رہتے ہیں۔ جب ہم جلسہ گاہ پہ پہنچے تو ہزاروں لوگ موجود تھے۔ روڈ کے برلب مدرسہ کے پلاٹ میں افتتاحی پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ۲۳ اکتوبر اتوار کا دن تھا، پہلی نشست سے مقامی علماء بات کرچکے تھے۔ دوسری نشست سے گلگت اور دارالعلوم گاہکوچ سے آئے ہوئے علماء نے بیانات کرنے تھے۔ بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تنظیم اہل سنت والجماعت کے جنرل سیکریٹری جناب محمد نواز صاحب نے حالات حاضرہ پر بے حد شگفتہ گفتگو کی۔

انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز جلسہ گاہ میں معلق ایک بینر پر مرقوم اس شعر سے کی۔

کسی بھی گُل کی حق تلفی نہ ہوگی اس گلستان میں
ملے گی خشک پتوں تک بھی شبنم دیکھتے رہنا

محمد نواز صاحب نے اہل سنت اور اسماعیلی برادری سے گزارش کی کہ ایک دوسروں سے شفقت و ہمدردی والا معاملہ کریں۔ آپ کی برادریاں ایک ہیں، رشتہ داریاں بھی ہیں۔ لہٰذا امن و محبت سے رہیں۔ تاہم ہم یہ بتلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی کو ہمارے اکابر اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر انگلی اُٹھانے کی کوئی اجازت نہیں ہوگی۔ ایسے خبث باطن رکھنے والوں سے نمٹنا ہم خوب جانتے ہیں۔ اس کے بعد ناچیز کا بیان تھا تاہم اچانک موسم ابر آلود ہوا۔ ہلکی پھلکی بوندا باندی شروع ہوئی۔ مگر کوئی سامع اپنی نشست سے نہیں اٹھا۔ بوڑھے جوان اور بچے سبھی شامل تھے، اپنے مہمانوں پر محبت و عقیدت کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ اہلیان یاسین نے سیکورٹی کے بڑا مؤثر انتظام کر رکھا تھا۔ تمام سرکاری اور پرائیوٹ اداروں کے ملازمین موجود تھے۔ پولیس کی ایک بڑی نفری بھی موجود تھی بلکہ تمام پولیس اہلکار جلسہ گاہ میں اہتمام سے بیٹھ کر علماء کرام کے خطبات سن رہے تھے۔ میڈیا کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اگلے دن کی اخبارات میں پروگرام کی بڑی بڑی تصاویر کے ساتھ خبریں لگی تھی۔ دل کی بات یہ ہے کہ ابھی

تک مجھے پورے گلگت بلتستان میں اتنے منظم انتظامات اور نظم و ضبط کی پابندی کسی بھی منعقدہ دینی پروگرام میں دیکھنے کو نہیں ملی جو اہل یاسین کے ہاں نظر آئی۔ قاضی نثار احمد کاخطاب ہوا'چونکہ جلسہ کا بنیادی عنصر دینی ادارے کی بنیاد تھا اس لیے قاضی صاحب اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تاریخ وسیرت بیان کررہے تھے۔آسمان سے بارش ہورہی تھی' لوگ اپنے امیر کی باتیں سن رہے تھے۔ مجال ہو کہ اس سردی اور بارش میں کوئی بچہ بھی اپنی نشست سے سرک گیا ہو' پہاڑوں پر اولے برسنے شروع ہوچکے تھے۔ بہت سے مہمان علماء کرام کو بیانات کرنے تھے' جو نہ ہوسکے۔ عوام کا ایک جم غفیر تھا' دارالعلوم غذر سے مفتی شیر زمان صاحب علماء کی ایک پوری ٹیم لے کر آئے تھے۔آخر میں دارالعلوم یاسین کی بنیاد رکھی گئی ۔دراصل دارالعلوم یاسین وہاں کے مقامی علماء کے اتحاد واتفاق کا مظہر ہے۔یاسین کے علماء وقراء اور بزرگان دین نے مل کر اتحاد ویلفیئر کے نام سے ایک ٹرسٹ بنائی ہے، اور دارالعلوم یاسین اسی ٹرسٹ کے زیر انتظام ہے۔ٹرسٹ کے ذمہ داروں نے آپس کی مشاورت سے دارالعلوم یاسین کی ذمہ داریاں' مفتی حسین شاہ صاحب کو سونپی ہیں۔ مفتی صاحب جامعہ فاروقیہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ خدا مفتی صاحب اور ادارے کو سلامت رکھے۔ ہم نے بھی اکابر کے ساتھ بنیادی اینٹ رکھ دی، شاید اللہ اسی بہانے مغفرت کا سامان کردے۔اگرچہ ہم اس قابل نہیں۔بہترین طعام کا بندوبست تھا۔اس کے فوراً بعد گلگت کی راہ لی۔ عصر کی نماز بستی نوح میں مولانا شریف والی مسجد میں ادا

کی گئی۔اور یہاں بھی ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ناچیز کو تلاوت کلام پاک کا شرف حاصل ہوا۔حضرت قاضی صاحب اور میں نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ساتھ ہی ایک تگاری بھی۔پھر دیگر علماء اور مہمانوں نے بھی اپنے اپنے حصے کا پتھر رکھ دیا۔یہاں لوگوں نے دیسی گھی اور گرم چائے سے تواضع کی۔اور حضرت قاضی صاحب پر پھولوں کی مالا چڑھائی اور گلاب کی پتیاں نچھاور کی۔ایک تفصیلی دعا کے بعد میزبانوں سے اجازت لی اور رخت سفر باندھ لیا۔گلمتی میں اپنے دوست مولانا غفران صاحب کے دولت کدے میں خشک فروٹ اور چائے سے شکم پروری کی۔بہر صورت یہ سفر خالص دینی واصلاحی اور فکری نوعیت کا تھا۔بڑوں کے ساتھ رہ کر بغیر سیکھے بھی بہت کچھ سیکھا جاتا ہے۔سو ہمیں بھی اپنی وسعت کے مطابق بہت نہیں تو کچھ کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔قلیلک لا یقال لہ قلیل کے مصداق۔

اسماعیلی اور اہل سنت برادری' کچھ توقعات و مشاہدات

مجھے ضلع غذر کے اکثر وادیوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، ضلع غذر میں اکثریت اسماعیلی برادری کی ہے۔اور گلگت بلتستان کے اسماعیلی برادری کے سرکردہ احباب اور دوسرے عام لوگوں اور اہل قلم سے بھی مل ملاپ کا سلسلہ کافی عرصے سے ہے۔سچی بات یہ ہے کہ ان میں رواداری اور اخوت کا بڑا اچھا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ اپنے ہمسائیوں اور علاقہ کے لوگوں سے پیار محبت سے رہنا

پسند کرتے ہیں، شاید ان کے مذہبی پیشوا یعنی پرنس کریم آغاخان کی بھی یہی ہدایات ہیں۔ میں نے ضلع غذر میں گھومنے پھرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ اہل سنت اور اسماعیلی برادری آپس میں بڑے پیار وسلیقہ اور امن وآشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ اہل سنت اور اسماعیلوں کے اعتقادات اور دینی امور میں اختلافات صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ بہت ہی کم چیزوں پر دونوں مکاتب فکر کا اتفاق ہے، مگر مشاہدہ اور زمینی حقائق یہ بتلاتے ہیں کہ اہل سنت اور اسماعیلوں میں یہاں کبھی کشیدگی نہیں ہوتی ہے۔ اگر جانبین سے کوئی اس قسم کی کوشش کرتا بھی ہے تو علاقے کے عمائدین اس کا فوری نوٹس لے کر معاملہ رفع دفع کرتے ہیں۔ ہلکے پھلکے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں مگر کبھی بھی باقاعدہ تصادم ہو کر دیگر علاقوں کی طرح انسانی جانوں کا ضیاع اور املاک کا برباد ہونا اور نفرت کی لکیریں نہیں کھنچی گئی ہیں۔ کم سے کم مجھے یہی لگتا ہے کہ ضلع غذر اور گلگت بلتستان کے دوسرے علاقوں میں اسماعیلی مکتبہ فکر کے لوگ اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے دوران دوسروں کو ایذا رسانی پہنچانے اور دوسرے کے عقائد کے ساتھ چھیڑنے کی مذموم کوششیں نہیں کرتے ہیں، بالخصوص دوسروں کے اکابر پر سب وشتم اور تضحیک کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، اگر کوئی ناہنجار اس قسم کی غلیظ کوشش کرتا بھی ہے تو اسماعیلی مکتبہ فکر کے سرکردہ لیڈران فوری اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں، گذشتہ سالوں کی تاریخ پر نظریں دوڑائی جائے تو اس طرح کو کافی ساری مثالیں مل جائیں گی۔ ضلع غذر کے

اسماعیلی اور اہل سنت کے اکثر افراد رواداری کے قائل ہیں اور ان کا عملی مظاہرہ بھی ہے، بہت ہی کم لوگ شرپسندی کرتے ہیں مگر ابھی تک انہیں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ دونوں مکتبہ فکر کے لوگ آزادی سے اپنے اپنے مذہبی امور انجام دیتے ہیں۔ ضلع غذر کے اسفار میں مجھے اندازہ ہوا کہ اسماعیلی برادری کے لوگ اہل سنت کے مذہبی پروگراموں میں تشریف لاتے ہیں، اہل سنت علماء کے ساتھ محبت سے ملتے ہیں۔ ان کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں، میں اہل سنت اور اسماعیلی برادری کے احباب سے گزارش کرتا ہوں کہ اس عمدہ اور معاشرتی رواداری کے ماحول کو زندہ وتابندہ رکھیں۔ اس میں دونوں کی سلامتی ہے۔ تشدد سے ایک دوسروں کو قائل کرنے کے بجائے اپنے کردار، اخلاق، رواداری، محبت اور حسن سلوک سے قائل کریں، اور جو اس طرح دلوں کو فتح کریں وہی فاتح عالم ہے۔ آپ ہادی دو عالم کی سیرت واُسوہ کی روشنی میں کردار ادا کریں، آپ محبت سے اپنا پیغام پہنچائے اور سلامتی کی دعوت دیں، ایک اہم وضاحت یہ کہ تبلیغی احباب کے لئے ضلع غذر کی سرزمین بے حد زرخیز ہے، تھوڑی سے تخم ریزی سے کئی پھلدار باغ وجود میں آسکتے ہیں، اور اس پر مستزاد یہ کہ اگر ان باغوں کے مالی ان کو شفاف پانی سے سینچے اور کھاد کا استعمال بھی بروقت مناسب طریقے سے کریں تو کوئی بات نہیں کہ یہاں محبت و مودت اور اسلام کی بہاریں دیکھنے کو نہ ملیں، کئی لوگوں سے ملنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اہل تبلیغ کی کاوشوں کے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں مگر افسوس کہ ان کی یہ کوششیں اور

کاؤشیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا گلگت بلتستان کے دیگر علاقوں بالخصوص ضلع گلگت میں اس طرح کا ماحول پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے؟۔کیا اس طرح کا کوئی عمرانی معاہدہ ممکن نہیں ہے؟ شاید جواب نفی میں ہو کیونکہ اس کے لئے دوسروں کے مذہبی اعتقادات و عبادات کا مکمل احترام اور معاشرتی اقدار و روایات کی پاسداری ضروری ہے جو یہاں دور دور بھی نظر نہیں آتی ہیں۔امن کے علمبرداروں اور حکومتی اہلکاروں کو گلگت کو قتل گاہ بننے سے بچانا چاہئے، ان عناصر پر ہاتھ ڈالنا چاہیے جو امن کو تاراج کرتے ہیں اور کسی کے لیے استعمال ہوتے ہیں؟۔ چند ٹکوں کی خاطر دھرتی ماں اور دین کو بیچنے والوں کو چوراہے پر لٹکائے بغیر امن کے خواب دیکھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ امن اسطرح قائم نہیں ہوتا ہے جس طرح تم قائم کرنا چاہتے ہو۔ معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ تم راہ مستقیم سے دور ہو، بہت ہی دور۔

امن و آمان اور رواں زندگی کی وجوہات

گلگت بلتستان کے مختلف اضلاع جہاں مختلف مذہبی مکتبہ فکر کے لوگ رہتے ہیں ' ان تمام اضلاع سے ضلع غذر میں بہتر امن و آمان اور رواں دواں زندگی پائی جاتی ہے۔ دیگر اضلاع کے مقابے میں جہاں کے لوگ سکون اور آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی دو مختلف الخیال و فکر اور عقیدے کے لوگ صدیوں سے بستے

ہیں۔ وہ کون سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے یہاں کا سکون اور معاشرتی زندگی برباد اور تاراج نہیں ہوئی ہے۔ میرے ناقص خیال کے مطابق اس کی چند وجوہات ہیں جن کا مشاہدہ وادیِ غذر کے بار بار کے اسفار میں ہوا۔ یہاں اہل سنت اور اسماعیلی برادری کے لوگ رہتے ہیں مگر چند چیزوں سے مکمل اجتناب کرتے ہیں۔

۱۔ مختلف مذہبی ایام اور ثقافتی وعلاقائی تہواروں میں ایک دوسروں کے اکابر اور بزرگوں کا مکمل احترام کرتے ہوئے فریق مخالف کے بڑوں کے خلاف زبان درازیاں ' لعن وطعن اور سب وشتم سے اجتناب کرتے ہیں۔ بالخصوص صحابہ کرام اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے مکمل احترام پایا جاتا ہے۔

۲۔ ایک دوسروں کے مذہبی مقامات کا مکمل احترام کرتے ہیں اور اپنے اپنے عبادات اور رسومات اپنے مذہبی معبدوں میں ہی انجام دیتے ہیں۔

۳۔ فریق مخالف کے خلاف کوئی کیسٹ' کتاب' پمفلٹ' جو اشتعال انگیزی پر مبنی ہو ' کی تقسیم سے گریز کرتے ہیں۔

۴۔ ایک دوسروں کو حراساں کرنا' نوگو ایریاز بنانا' غیر موزوں اور مشتعل کرنے والے نعروں کی چاکنگ سے پرہیز کرنا۔

۵۔ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے اپنے اعمال وافعال میں لگے رہنا' دوسروں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے ' اور پگڑیاں اچھالنے سے گریز کرنا یعنی'' لکم دینکم ولی دین'' کا عملی پرتو۔

ان جیسی بے شمار روایات و معاشرتی عادات ہیں جنھوں نے وادیِ غذر کی سوشل لائف کو ابھی تک ڈسٹرب نہیں کیا۔ ہمارے ہاں تو اس وقت تک مذہبی پروگرام حتیٰ کہ اکابرین کی یاد میں منعقد کی جانے والی بابرکات محفلیں بھی اس وقت تک کامل نہیں سمجھی جاسکتی ہیں جب تلک فریق مخالف کے بڑوں حتی کہ صحابہ کرام تک کو لعن طعن نہیں کیا جاتا ہے۔ مہذب اور غیر مہذب لوگوں اور معاشروں میں یہ خطہ امتیاز ہے۔ تو پھر کیا ہم مہذب لوگ ہیں یا ہمارا معاشرہ مہذب ہے ؟۔ قطعاً نہیں۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ گلگت بلتستان میں رہنے والے مختلف الخیال و فکر اور عقیدہ کے لوگ نہ پہلے ایک تھے نہ اب ایک ہو سکتے ہیں نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔ یک دم ایسا ناممکن ہے کیونکہ ہر ایک کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ ضابطہ حیات ہے۔ دلائل و براہین ہیں۔ اعتقادات و نظریات ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک دوسروں کے گلے کاٹے جائے۔ لعن و طعن کا بازار گرم کیا جائے۔ اور ایک دوسروں کو مباح الدم سمجھا جائے۔ اپنے مخالف کو ہر جائز و ناجائز نقصان پہنچانے کو دینداری سمجھا جائے۔ غیروں کا آلہ کار بلکہ کارندہ بن کر اپنوں کا خون کیا جائے۔ باہر کے اشاروں پر ناچا جائے۔ معاشرے کو تہس نہس کیا جائے۔ نو گو ایریاز بنائے جائے۔ شعوری اور لاشعوری طور پر دین و دنیا

کے لیے سوہان روح بن جائے۔ دانستہ اور نادانستہ طور پر اپنے آپ کو افضل و اعلیٰ اور مد مقابل کو حیوانوں سے بھی بدتر خیال کیا جائے۔ مثبت ڈائیلاگ کو فروغ دینے کے بجائے تلواری کلچر کی آبیاری کی جائے۔ ٹیبل ٹاک کے بجائے اسلحہ ٹاک کو رواج دیا جائے۔ ظلم کرنا اپنا حق سمجھا جائے بلکہ مذہبی فریضہ۔ بہر صورت ایک عمرانی معاہدے کے ذریعے پُرسکون زندگی کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے کوئی تیار نہیں۔ نہ کوئی سنجیدہ کوشش کی جا رہی ہے۔ امن معاہدے اور ضابطے اخلاق بنتے ہیں اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ امریکہ' برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں کفار اور مسلمان ایک مثالی معاشرتی زندگی گزار سکتے ہیں تو ایک خدا اور رسول کو ماننے والے ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ جب ذات خدا اور محمد بھی آپ کو ایک معاشرے میں سکون سے رہنے کے لیے تیار نہیں کر سکتی تو تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔

حسین یادیں

میں جب بھی محبتوں کی سرزمین وادیِ غذر میں داخل ہوتا ہوں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ ہمارے ہاں بھی اتنی خوبصورت وادیاں' سرسبز شاداب علاقے' کالے پہاڑ' شفاف پانی کی آبشاریں' درختوں کے جھنڈ اور بے شمار دل لبھانے والے خطے بھی ہو سکتے ہیں۔ اہلیان غذر کے لیے ویسے بھی میرے دل میں محبت کی فراوانی ہے۔ نرم گوشہ ہے کیونکہ یہ امن اور

سکون سے رہ لینے والے لوگ ہیں' یہاں محبت عام ہے۔ایذا رسانی سے اجتناب ہے۔آپس کا احترام ہے۔ زبان میں لطافت و شیرینی ہے۔لوگ خوش اخلاقی کے پرتو ہیں۔ وادیِ غذر کا عمیق مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے مجاہدین اہلِ حق کے لیے جان و مال اور دل و دماغ کے دریچے واہ کیے ہوئے تھے۔یہاں کے بہادر لوگوں کی کڑیاں سید احمد شہید اور شاہ ابدالی مرحوم سے بھی جاملتی ہیں۔یہ حسین یادیں جو ذہن کے دریچوں سے جھانک کر مجھے روزانہ بے کل کر دیتی ہیں اس لیے آپ کے ساتھ شیئر کررہا ہوں کہ شاید واقعات' مشاہدات' تجربات اور تاثرات پر مبنی یہ چند ٹوٹی پھوٹی باتیں کسی کو بھالیں۔وگرنہ من آنم کہ من دانم۔

وادی غذر کے سفر کے دوران مجھے خیال آیا کہ مجھ جیسا حقیر فقیر اور بے مایہ و بے سہارا انسان کو وقت کی نامور شخصیات اور رجال کار کیساتھ گھومنے پھرنے اور تجربات و مشاہدات اور تعلیم و تعلم کا نادر موقع مل رہا ہے تو دل بے اختیار آبدیدہ ہوگیا' لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید''کا وِرد کیا اور زبان پر یہ اشعار اگئے۔''

نشیلی فضا ذہن پر چھا رہی ہے
کَلی میرے دل کی کھِلی جا رہی ہے
میں شاداب ہوں ایک جوئے رواں سے

مری کشتِ ہستی نمو پا رہی ہے

راستے میں بہت کچھ کا مشاہدہ کیا۔ روڈ کی حالت خستہ تھی۔ سیاحوں کے کچھ قافلے بھی دیکھے۔ دریائے غذر کے لہروں اور موجوں کی شوریدہ سری اور شور بھی کم ہوتا جارہا تھا کیونکہ آگے موسم سرما کی آمد آمد تھی۔ ہمیں ضلع غذر میں سکون بھی نظر آیا اور بے کلی بھی۔ سادگی بھی نظر آئی اور فیشن ایبل کلچر کی بربادی بھی، حسن فطرت کی بے ساختگی بھی اور تصنع اور بناوٹ کی بے ہودگی بھی، پھل دار درختوں کی زیادتی بھی اور بے پھل پودوں کی فراوانی بھی۔ سبزہ اور مرغزار بھی اور بنجر اراضی بے آباد بھی۔ بارش اور اولوں کی برسات بھی اور چاند و سورج کی یلغار بھی۔ ضلع غذر کے مختلف اسفار سے مایوسی بھی ہوئی اور اطمنان بھی۔ مایوسی اس طرح کے نوجوان اپنی تہذیب و ثقافت اور رہن و سہن اور علاقائی کلچر کو خیرآباد کہہ کر مغربی کلچر کے دلدادہ بن چکے ہیں۔ ان کا لباس، طرز تکلم، چال چلن اور معاشرتی زندگی مغرب کا ٹشو ایبل کلچر کی غمازی کرتا ہے اور خیالات کا بھی یہی حال ہے۔ اور بوڑھے اپنی سادگی اور تہذیب و ثقافت کے مکمل پرتو نظر آتے ہیں۔ وہی دیسی ٹوپی اور چغہ (شوکا) اور رس بھری گفتگو اور مہمان نوازی کے نرالے ڈھنگ۔ وادی غذر کے در و دیوار' کالے پہاڑ اور نیلے پانی اور قدیم مکینوں کو زبانِ حال سے نوحہ کناں پایا' ماتم کرتے دیکھا' روتے بسورتے پایا کہ ہم کیا تھے اور کیا بن گئے۔ خدا کا فرمان ہے

کہ وتلک الایام نداولہا بین الناس۔

اسلام کی بہاریں اور شیطانی قوتیں

افسوس ہم میں اسلام تو رہا مگر روح اسلام کی شدت سے کمی ہے، یہ اٹل ہے کہ بہت جلد اسلام کی روحانی بہاریں دنیا کو نصیب ہونگیں، کیونکہ یہ خدا کا وعدہ ہے، آنے کو ہے بہار، اور بہت جلد ہی آنے کو ہے، مسلمان خزاں کے موسموں میں دن گزار گزار کر تنگ آ چکے ہیں، جلد یا بدیر خدائے ذوالجلال اسلامی بہاریں اور شریعت محمدی کی رونقیں دکھلائیں گے۔ یہ ہمارا وجدان اور عقیدہ ہے اور اس میں دو رائے نہیں۔ دعا یہ کرو کہ ہماری مختصر سی زندگی میں ہی بہار کی یہ رُتیں آ جائیں۔ کتب حدیث بالخصوص وہ احوال جن کے بیان آپ نے آج سے چودہ سو سال پہلے کیا ہے اور موجودہ حالات و اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ و مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ بے حیائی کو مٹنا ہے، ظلم و ستم کو ختم ہونا ہے، کفر اور الحاد نے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہونا ہے، دجالی قوتوں اور شیطانی طاقتوں نے اپنی موت آپ مرنا ہے۔ ان کو کون مٹائے گا؟ کون نیست بابود کریگا؟ کون آئیگا اس کو ختم کرنے کے لئے؟ کوئی نہیں کوئی نہیں، میرا اللہ، صرف اور صرف میرا اللہ، اللہ آئیگا اللہ۔ اللہ کفر کو مہلت دیتا ہے مگر ظلم کو نہیں، سود کو نہیں، شرک کو نہیں، تشدد کو نہیں، ناانصافی کو نہیں، بربریت کو نہیں، چنگیزیت کو نہیں۔ دجالیت و شیطنیت کو نہیں۔ پرویزیت

کو نہیں، زرداریت کو نہیں۔اور نہ ہی میرے اللہ بے حیائی کو مہلت دیتا ہے۔ رحمانی اور شیطانی تصادم کے بعد بالآخر فتح وکامرانی اہل ایمان اور رحمانی قوتوں کو نصیب ہوگی اور اہل دنیا کو اسلام کی بہاریں اور رونقیں نصیب ہونگیں۔

میں موضوع سے ہٹ کر کہیں دور جاچکا ہوں' خیر یہ قلم کارستانی ہی سمجھو! وادی غذر میں بار بار جانے کا موقع ملا۔ علماء کرام کے ساتھ بھی اور اپنے کالج کے پروفیسروں کے ساتھ بھی۔ اور اکیلے بھی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ دل نہیں بھرا۔ بتھریت اور شندور کی سیاحت سے محروم ہوں' نہ جانے کب موقع ملے۔ یہ زمیں ہی ایسی ہے کہ ہر آنے والے کو دوبارہ آنے پر مجبور کرتی ہے۔ بلکہ اپنی محبوب اداؤں سے دعوت دیتی ہے۔

یہاں کے پانی' بادل' ژالہ باری،اولے' برف' نہریں'ندیاں' جھیلیں' آبشار'نیلا پانی' پانی میں تیرتی مچھلیاں،پانی کی شیرینی اور مٹھاس' شفافیت' آبِ مصفٰی کی ٹروٹ مچھلیاں' پھول' پھولوں کی اقسام اور ان کی رنگت اور شکلیں، رنگ۔برنگ بیل بوٹے اور ان کی خوشبو' پہاڑ اور ان کا کالاپن اور بلندیاں' اور ان میں موجود ہیرے کی موتیاں،اور لعل وجواہر' پہاڑی راستوں کے نشیب وفراز، گلیشیر اور گلیشیروں سے بہتا ہوا نیلا پانی، گھاس اور سبزے کے میدان پھل اور پھلوں کی اقسام اور ان کا ذائقہ' غرض کس کس چیز کا ذکر کیا جائے۔ میری رب سے دعا ہے کہ وہ مجھے بھرپور سیاحت

کا موقع دیں۔ اگرچہ سیر و سیاحت کے لیے ہزاروں رکاوٹیں ہیں اور ہزاروں آسانیاں بھی۔ سمندر اور صحراء حائل ہیں اور پھر ان سمندروں پر بنے پل اور صحراء پر بنے روڈ' ان مشکلات کا حل بھی ہیں۔ رب کی عجیب رنگینیاں ہیں' سو رب ہی جانے۔ زندگی رہی تو اگلی دفعہ کسی اور سفر میں ملاقات ہو گی۔ وماعلینا الا البلاغ

کیریئر پلاننگ

آج ایک انوکھا ''ٹاپک '' لیے بیٹھا ہوں۔ خصوصاہم نوجوانوں کا یہ مسئلہ گھمبیر سے گھمبیر بنتا جارہا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آج کا ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی آرام' راحت' عزت و وقار سے گزرے، یعنی انسان فطرتاً تعیش پسند ہو گیا ہے۔ وہ دنیاوی جھمیلوں میں رہتے ہوئے بھی اپنا دنیا کے دیگر لوگوں سے الگ اور ممتاز مقام چاہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ کیفیت پڑھا لکھا نوجوان طبقے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس چاہت کے باوجود کوئی بھی اپنی منزل کو نہیں پہنچ پاتا۔

زندگی میں عجب حالات و کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے، دولت منداپنی دولت سے خوش نہیں ہیں یعنی ان کی دولت ان کو چین و ذہنی سکون دینے سے قاصر ہے، تعلیم یافتہ نوجوان اپنی تعلیم اور ڈگری سے نالاں ہے۔ انسانی زندگی کا عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ نسبتاً ہر انسان اپنی حالت و کیفیت سے خوش نہیں ہوتا ہے' ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ انسان اپنی موجودہ حالت' کیفیت' مقام و مرتبہ سے مطمئن ہو، یہ کیفیت مجھ سمیت دنیا کے ہر ذی شعور آدمی میں پائی جاتی ہے۔ ہم اپنے ارگرد کے ماحول کا جائزہ لیتے

ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے روزگار اور پیشے میں فٹ نہیں ہوتی ہے، اس کی واحد اور بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم میں سے جو بھی آدمی اپنے پیشے میں سوچ و سمجھ اور پلاننگ کے بغیر زندگی کی مجبوریوں اور چانس کی وجہ سے آیا ہے۔ظاہر ہے اس طرح خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے ہیں۔آج کے ان چند سطور میں کوشش کی جائی گی کہ ''کیریئر پلاننگ'' کے عنوان پر افراد کو انفرادی طور پر اور سرپرستوں کو اپنے ماتحتوں کے لئے 'استاد کو اپنے تلامذہ کے لئے اور دیگر باصلاحیت افراد کو قومی ترقی و تعمیر میں کردار ادا کرنے کے لئے گائیڈ لائن دی جائے ، شاید اس طرح ہمارے کچھ مسائل کم ہی ہو جائیں۔اللہ کرے۔

ہم یہ جائزہ لیں گے کہ کیریئر ہے کیا؟ماہرین نے عملی زندگی گزارنے کے لیے اپنے اپنے طور پر جو تعریفیں کیریئر کے حوالے سے بیان کی ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ کسی پیشے کا انتخاب کرنا' یعنی اپنے ذوق کے مطابق کسی بھی شعبے میں عملی کام شروع کرنا جس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع ہوں اور ظاہری راستے موجود ہوں۔ظاہری بات ہے کہ ہمارے ہاں اس طرح کا خیال پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں گئی ہے۔

ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم وتربیت اور کامیاب زندگی گزارنے کے گُر بتلائے جانے کے بجائے ڈگری کا حصول اور نوکری کا حصول ہی سکھایا جاتا ہے' حصول ڈگری اور حصول نوکری کے لئے ہمارے ہاں

تمام ''چور راستے'' مہیا کئے جاتے ہیں۔ اور ان راستوں کو فخریہ اختیار بھی کیا جاتا ہے۔ کسی بھی ادارے کے اندر یہ کوشش نہیں کی جاتی ہے کہ آدمی اپنے لئے اچھا کیرئیر منتخب کرے۔ کہ وہ ایسا ذریعہ معاش اختیار کرے جو اس کی صحت 'صلاحیت' ذوق و رجحان اور حالات و کیفیات کے مطابق ہو، اور منتخب کردہ پیشے میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرسکے اور اس میں اکتاہٹ' پریشانی' تھکن' بوجھ اور بار نہ سمجھے بلکہ دل کی طمانیت اور مسرت و تسکین سے وہ اپنے ''کیرئیر'' میں آگے بڑھتا چلا جائے۔

یہ سمجھنا چاہیے کہ کیریئر پلاننگ بہت زیادہ ضروری ہے۔ انسان کی زندگی جہد مسلسل سے تعبیر ہے۔ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے مادی وسائل کی اشد ضرورت ہوتی ہے ان کے حصول کے لیے انسان کاروبار کرتا ہے یا ملازمت کرتا ہے۔ یہ معاشی سرگرمیاں ہی اس شخص کے کیریئر کا نام ہے اس کیریئر کی وجہ سے معاشرے میں اس کی پہچان ہوتی ہے اور ایک مقام پاتا ہے۔ اپنے والدین ' بچوں اور دیگر متعلقہ افراد کی ضروریات زندگی کے لیے وسائل فراہم کرنا ایک ایسی ذمہ داری ہے جس سے بچنا کسی صورت ممکن نہیں اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنا ضروری ہے جس پر چل کر باعزت مقام حاصل کیا جاسکے۔

ہر شخص کو چاہئے کہ ابتدا میں ہی اپنی منزل متعین کریں' منزل کا خواب غریب

امیر دونوں دیکھتے ہیں، مگر اس کے حصول کا طریقہ کار مختلف ہونا چاہیے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک ہی منزل کے راستے اور انداز مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ انسان کا کام ہے کہ اپنے حالات اور وسائل کو دیکھ کر، اپنے مشکلات کا جائزہ لے کر خوفزدہ ہونے کے بجائے اپنے موجودہ وسائل کو بہتر طور پر استعمال کرنے کا سوچے اور اور یقینی طور پر استعمال بھی کریں۔ تمثیلاً یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ انسان کی منزل ''مکہ مکرمہ '' ہے۔ اب مکہ مکرمہ پہنچنے کے لیے ذرائع ہوائی جہاز، ریل، بس، بیل گاڑی، اونٹ یا پیادہ۔ اب ان میں کسی کو بھی اپنی حیثیت کے مطابق اختیار کر کے مکہ مکرمہ پہنچا جاسکتا ہے۔ اگر منزل تک پہنچنے /ٹارگٹ پانے کے لئے عزم مصمم ہو تو رکاوٹیں کچھ معنی نہیں رکھتی۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی منزل تک پہنچنے یا ٹارگٹ کو پانے کے ذرائع کا اچھی طریقے سے جائزہ لیں۔ بہترین پلاننگ کریں۔ منزل کا تعین، منزل تک پہنچنے کے راستوں اور وسائل کا علم اور طریقہ کار کا ادراک و فہم ہونا ازبس ضروری ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اگر منزل کی طرف رخت سفر باندھا جائے تو کسی درخت کے چھاؤں میں ستانے کی گنجائش ضرور ہوتی ہے مگر گھوڑے بیچ کر سونے کی گنجائش قطعاً نہیں ہوتی۔ آپ کچھوے کی چال ضرور چلیں مگر خرگوش کی طرح آرام ہر گز نہ کریں۔ سچ یہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کے خواہش مند لوگ آرام کی نیند کبھی بھی سویا نہیں کرتے۔ مجھے ایسے موقعوں پر اکثر یہ شعر یاد آتا ہے

ومن رام العلی من غیر کدِ

اضاع العمر فی طلب المحال

کہ جو لوگ بغیر محنت اور جہد مسلسل کے بلندیوں کا خواب دیکھتے ہیں یقینا وہ محال چیزوں میں اپنی عمر گنوا دیتے ہیں اور اس حوالے سے عربی کا یہ مقولہ بھی معروف ہے

ومن طلب العلی سہر اللیالی

یعنی جو لوگ اونچے مرتبوں اور بلندیوں کے طالب ہوتے ہیں وہ راتوں کی نیندیں ضرور حرام کرتے ہیں یعنی راتوں کو جاگا کرتے ہیں۔انتہائی معذرت سے عرض ہے کہ آج کے جدید اور مقابلے کے دور میں اپنی منزل کے تعین وسائل و راستوں اور طریقۂ کار کا درست فہم و ادراک اور ساتھ ہی بے تحاشا محنت کے بغیر کوئی مناسب اور ذوق کے مطابق مقام پانا ناممکن ہے اور ایسا خیال بھی عبث ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ اپنی صلاحیتیں، تعلیم، ذہانت ،رجحان وذوق یا میلان طبع یا خواطرات دل،حالات و ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے لئے مناسب کیریئر کا انتخاب کریں اور کیریئر کے انتخاب کے بعد ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہے '' کو ذہن میں لاتے ہوئے جہد مسلسل شروع'' کریں۔اور اتنی محنت کریں کہ جب بھی آپ کے پیشے کا ذکر ہو تو لامحالہ انگلیوں کا رخ کامیابی و مہارت کی مثال پیش کرنے کے لئے آپ کی طرف اُٹھے۔اتنا کافی ہے۔ اس، حوالے سے جتنی باتیں دل و دماغ میں آپ سے شیئر کرنے کے لئے ہیں اتنی جگہ کاغذ کے ان صفحات

میں کہاں ہیں۔ یہ کالم ''کامیابی کا راز'' والا کالم کا تسلسل ہے۔ ایفائے عہد ہوا۔ خدا ہم
سب کا حامی و ناصر ہو۔

آہ صد آہ! گلگت جل رہا ہے

مبارک ہو! اے وہ جنہیں اس علاقے کا امن کبھی نہیں بھاتا، آج تمہاری روحیں آسودہ ہیں، تمہارا دل خوش ہے اور تمہاری مرادیں پوری ہونے کو ہیں اور تمہارے آقا بھی تمہیں تھپکیاں دے رہے ہیں۔ بس تم خوش رہو۔ کوئی بات نہیں کہ گلگت میں آگ لگے، دھواں اُٹھے، عورتیں بیوہ ہوجائیں، بچے یتیم ہو جائیں اور سہاگ لُٹیں۔ آج تین اپریل شام کا وقت ہے۔ دن بھر گلگت اور چلاس میں انسانوں کا خون بہتا رہا اور میری آنکھوں سے بھی خون کے آنسو بہتے رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں فطرتاً بزدل واقع ہوا ہوں۔ سارا دن گھر میں ہی کبیدہ خاطر حالات پر کُڑھتا رہا۔ ضلع دیامر سے تعلق ہونے کے باوجود فائرنگ اور اسلحہ سے ڈر لگتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے قلم اور کاغذ کے ساتھ واسطہ پڑا ہے اور عنفوان شباب کے سب سے خوبصورت ایام کراچی میں تعلیم و تعلم میں بیتایا ہے۔ ۳ پریل ۲۰۱۲ء کو سارا دن گھر میں ہی گزارا، پَل پَل کی خبر سے باخبر رہا۔ اتحاد چوک گلگت میں دستی بم حملہ اور فائرنگ میں شہید ہونے اور زخمی ہونے والوں کی دلخراش نیوز ہو یا چلاس (یشوکَل داس) میں وحشت زدوں کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں کی دلدوز خبروں نے مجھے ذہنی طور پر مفلوج کر رکھا ہے۔ میں ان کا نوحہ لکھنے بیٹھا ہوں۔ معلوم نہیں لکھ پاؤنگا

کہ نہیں ۔ بس ملول طبع اور آزردہ دل کی آہیں ہیں قبول کر لیجئے گا، مستحضر ہی سمجھ کر۔ نفرت کی لکیریں کھینچی جا چکی ہیں، بے سود جنگ میں سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کے بیانات، تقریروں، احتجاجی مظاہروں، ہڑتالوں اور مطالبوں میں شدت آ چکی ہے۔ مختلف مسالک اور علاقوں میں محاذ آرائی کا سلسلہ چل نکلا ہے جس کے باعث علاقائی نظم و نسق ابتری کا شکار ہے۔ شہریوں کی زندگی اجیرن بن چکی ہے جبکہ زرداروں اور شاہوں'' (کرم شاہ اور مہدی شاہ) کے لئے عیش و طرب کے نئے نئے راستے کھل'' گئے ہیں اور ان کے پٹھوں بھی بغلیں بجا رہے ہیں اور میڈیائی ذرائع سے ملنی والی اطلاعات پر انحصار کرکے کسی میڈیا کے نمائندے کو فون کرکے سپرلیڈ لگانے کی تلقین کرکے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے فریضہ ادا کیا۔ تضادات و اختلافات نے معاشرے کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہر آدمی حالات سے شاکی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی بڑی افتاد پڑنے والی ہے۔ عوامی نمائندوں پر سے اعتماد آٹھ چکا ہے اور ان کی عوام دوستی کا سارا بھرم کھل گیا ہے۔ لوگ منافقت کی سیاست سے تنگ آ چکے ہیں ۔ انہیں شدید احساس ہو چکا ہے کہ گلگت بلتستان کی بقا سیاسی راست بازی، سیاسی شائستگی اور مذہبی لیڈروں کی وسعت ظرفی اور کشادہ دلی میں مضمر ہے مگر سیاسی و مذہبی رہنما ان اوصاف حمیدہ سے عاری نظر آتے ہیں۔ دل و دماغ میں انگاروں کی مانند سوالات اُمڈ رہے

ہیں۔ہر ایک اپنی راگ الاپ رہا ہے۔ مشترکات کی بات کرنا جرم بن گیا ہے۔اور ایک طبقہ جس کا نام لینا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے ان تمام سیاسی ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں اور مسلکی ٹائیں ٹائیں فشوں پر ہنس رہا ہے اور ان کی بچگانہ حرکتوں سے محظوظ ہو رہا ہے۔ ہے کوئی خلقِ خدا میں ؟کہ ان کو لگام دے ۔اور ہے کوئی سچا راوی؟ جو جان ہتھیلی پر رکھ کر ان کے خبث باطن کو ظاہر و باہر کرے اور ہے کوئی اعلیٰ ادارہ؟ جو اُن کی انسان کشی پر سو یو موٹو ایکشن لے۔شاید بالکل بھی نہیں۔

میرے ہمسائیگی میں ایک لاش ہے۔آہ !!! مجھ میں لاش دیکھنے کی ہمت کہاں اور وہ بھی ۱۲ سالہ معصوم بچے کی۔ ۳ اپریل کو اتحاد چوک میں دستی بم حملے میں شہید ہونے والے ۱۲ سالہ ندیم کے عزیز و اقارب کی آہیں سنی تو کلیجہ منہ کو آگیا اور دل پھٹنے لگا۔ندیم ولد عبدالحکیم ساکن بارگو گلگت آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔اُف ! آج کا دن کتنا بدقسمت دن ہے۔اب تک کی اطلاعات یہ ہیں کہ کشروٹ ہسپتال میں چالیس زخمی کراہ رہے ہیں اور سات معصوم لوگ داعی اجل کو لبیک کہ چکے ہیں۔چلاس ہسپتال میں ۹ بے گناہ مسافروں کی بے یار و مدگار لاشیں چیخ چیخ کر دہائیاں دی رہی ہیں کہ ہے کوئی اس دھرتی میں جو انصاف مہیا کر سکیں۔چلاس اور گوہر آباد کے علماء و سرکاری انتظامیہ نے سینکڑوں محصور مسافرین کو لے کر گلگت روانہ ہو چکے ہیں،امید ہے کہ ان کو عافیت سے ان کے

مسکن تک پہنچایا جائیگا۔ اور کتنے ہیں جو ضلع ہنزہ نگر اور دیامر میں محصور ہیں۔ ان کے بارے میں درست معلومات کسی کے پاس نہیں۔ اور نہ ان کی حفاظت کا کوئی مناسب بندوبست۔ آہ ندیم شہید ! تم تو خوش قسمت ہو کہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے مگر لواحقین کو تم وہ بھاری زخم و گھاؤ دے گئے کہ جو کبھی مندمل ہونا والا نہیں۔ یہ ایک ندیم کی بات نہیں۔ آج ایسے کئی ندیم ہیں جو اپنے اپنے اقارب کو گہرے زخم دیکر کہی دور جاچکے ہیں۔ بہت ہی دور جہاں ملاقات موت کے بعد ہی ممکن ہے۔ قارئین میں لکھتے لکھتے یہاں پہنچ گیا تھا کہ ندیم کی لاش ایمبولنس میں دروازے کے سامنے پہنچائی گئی۔ میں نے قلم کاغذ چھوڑا اور بھاگ کر ان کی میت تک جا پہنچا اور صرف تین سیکنڈ اُن زیارت کی۔ اس سے زیادہ کی مجھ میں تاب کہاں۔ ۱۳ سالہ شہزاد عالم ولد عبد الرحمٰن ساکن گونر فارم بھی بم حملہ اور فائرنگ میں شہید ہوئے۔ ہائی سکول نمبر 1 گلگت کے ہفتم کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کتنے معصوم چہرے، حساب کتاب سے بالکل پاک و صاف، میں اس وقت لکھ رہا ہوں مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہیں۔ عجب تفاوت ہے کہ چلاس میں ایس پی جمشید صاحب مسافروں کی حفاظت کرتے کرتے شدید زخمی ہوئے اور گلگت میں اس بھتیجا شہزاد عالم سفاک قاتلوں کے ہاتھ جام شہادت نوش کر گئے، کنوداس قبرستان میں شہزاد عالم کا والد میرا ہاتھ تھام کو دعا کی درخواست کر رہے ہیں اور میرے ہمسائیگی سے ندیم کے ماؤں ، بہنوں ،دادیوں ، نانیوں، خالاؤں کی آہ و بکا کی آوازیں آرہی ہیں۔ کہی دور

سے راشد ولد جمعہ خان کے اقارب کی روح فرسا آوازیں بھی مجھے بیقرار و بے کل کر رہی ہیں۔اور کتنے شہیدوں کے پسماندگان کی گریہ وزاری مجھے بے دل و دماغ اور بے دَم کرنے کے لئے مچل رہی ہیں۔ بے شک اسلام میں آہ و بکاء کی کہاں گنجائش ہے مگر پیارے حبیب بھی تو اپنے نابالغ بیٹے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میت دیکھ کر روئے تھے اور فرمایا تھا کہ ''یا ابراہیم انا لمحزونون بفراقك'' یعنی اے ابراہیم ہم تیری جدائی پر مغموم ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ'' لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب و دعا بدعویَ الجاھلیۃ'' یعنی نہیں ہے ہم میں سے وہ شخص جو مارے (کسی میت پر) رخساروں کو اور پھاڑے گریبانوں کو اور چیخے ،چلّائے اہل جاہلیت کی طرح۔ مگر فطرت کو کہاں لے جائے۔ کیا انسان فطرت سے لڑ سکتا ہے؟ ناممکن ۔آنسوؤں نے گرنا ہے۔ گریبانوں نے چاک ہونا ہے اور فغاں و بکاء کی دل سوز آہوں نے بلند ہونا ہے۔آہوں کے دھوئیں نے نکلنا ہے ،نکلنا ہے ،نکلنا ہے۔ آج کے دن کتنی مائیں اپنے پیاروں پر آنسوؤں کی سوغات نچھاور کر رہی ہونگیں۔ کتنی سہاگنیں لٹ چکی ہونگیں اور کتنے باپ اپنے بیٹوں سے محروم ہو چکے ہونگے اور کتنے بھائی اپنے بھائیوں کی جدائی میں دھاڑے مار مار کر رو رہے ہونگے۔آہ صد آہ! انسانیت پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والو! اور انسانی خون کے بیوپاریو! کیا کبھی تم نے سوچا ہے کہ اس کا درد کتنا سخت ہوتا ہے۔تم کیوں سوچو گئے۔ تمہارا تو کچھ نہیں بگڑا ہے نا۔ تمہارے کسی عزیز کا خون تو نہیں بہا ہے نا۔اے وہ حکمرانو! اسلام آباد

کے نرم گرم بستروں پر تمہیں نیند کیسے آتی ہے؟کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟کیا تم انسانی فطرت سے انکاری ہو؟کیا خلق خدا کو اس طرح کٹتے دیکھ کر تمہار دل نہیں پسیجتا ہے؟کیا سرخ و سفید معصوم چہروں پر لگا حنائی خون تمہیں جھنجھوڑنے کے لئے کافی نہیں؟کیا جان بحق ہونے والے اور موت و حیات کی کشمکش میں پڑے بے گناہ لوگوں کا دکھ، درد اور آہیں آپ کی نیندیں اُڑانے کے لئے کافی نہیں ہیں؟کیا یہ خونی تماشے دیکھ کر تمہارا دل اکتا نہیں گیا ہے؟کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان خونیں معاملات و واقعات کا اعلیٰ ترین سطح پر غور کیا جائے اور اپنی حدوں سے تجاوز کرنے والوں کا کڑا محاسبہ کیا جائے اور دن دہاڑے لوگوں کو مارنا اور اسلحہ کی نمائش کرنے والے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے جیسی مکروہ روایات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ گلگت بلتستان کو مقتل بنانے والوں کو بے نقاب کیا جائے اور عوام کو بتلایا جائے کہ اس دھرتی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والا اصل طبقہ کون ہے۔حکومت، عوام، عدلیہ و انتظامیہ اور فوج کو مل کر ان پُر تشدد واقعات کے حوالے سے بے لاگ تحقیق کا اہتمام کرنا چاہیے اور جو بھی ملوث ہو اس کا محاسبہ ہونا چاہیے اور آئندہ اس سے حدود میں رکھنے کے لئے سخت اقدامات کرنے چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ اب تو آگ اور خونی کھیل کا ابتداء ہے انتہا کیا ہو گی۔ فاعتبروا یااولی الابصار

کامیابی کا راز

شیراز عالم عرف پپو کو میں بچپن سے جانتا ہوں،آج اس کے چہرے پر مایوسی کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ ہرپل مسکرانے والے، قہقہے لگانے والے شخص پر یاسیت کے بادل عجیب دکھائی دے رہے تھے۔ روز بات بے بات پھلجھڑیاں چھوڑنے والے شیراز عرف پپو نے جب دوستوں کی مجلس میں کسی بات میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ کیفے ٹیریا میں جب اس سے آج کی غیر معمولی کیفیت کے بارے میں دوبارہ پوچھا تو وہ پھٹ پڑا''کیا پوری زندگی تعلیم اسی لیے حاصل کی تھی، کیا اسی ذلت کے لیے ڈگریوں کے حصول میں اپنا وقت ضائع کیا؟کیا مختلف فورم میں جاکر بارہا پرفامنس اس لیے کی تھی ؟، کیا تھیسز اور اسائیمنٹ کی تیاری میں مہینوں اس لیے ضائع کیے تھے ؟، یار حقانی !تم ہی بتاؤ کہ کیا راتوں کی نیند اس لیے آڑادی تھی ؟،کیا باپ کی کمائی کا بڑا حصہ اس لیے تعلیمی مصارف میں خرچ کیا تھا؟،وہ رکے بغیر ایک ہی سانس میں بولتا جارہا تھا''۔ اس کے پاس سوالات کا انبار تھا اور زمانے کی نیرنگیوں کا شکوہ بھی،ارباب حل و عقد کی موج مستیوں کا فسانہ بھی تھا اور صاحبان بست وکشاد کی کارستانیوں کا پلندہ بھی۔

اس کی باتوں نے بے ساختہ مجھے ہنسنے پر مجبور کردیا''کیا انہی باتوں نے

تمہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے، میں سمجھا خدانخواستہ کوئی نا خوشگوار واقعہ رونما ہوا ہے'' میری بات سن کر وہ مزید سیخ پا گیا'' یہ ناخوشگوار واقعہ نہیں تو اور کیا ہے۔ پورے ایک سال کا عرصہ بیت گیا اور میں یوں ہی جوتیاں چٹخاتے پھر رہا ہوں۔ درجنوں جگہ درخواست دی کہیں ڈھنگ کا کام نہ ملا، ہر جگہ تجربہ اور ایکسپیرنس مانگتے ہیں، بھئیا اگر کہیں جاب ملے تو ہم ایکسپیرنس سرٹیفیکیٹ دیں گے نا۔'' یہ لہنے اسے ٹھنڈی ہوتی چائے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا'' پپو بھائی! اس میں آپ کی غلطی نہیں اور نہ ہی یہ آپ کا اکیلا مسئلہ ہے، آپ ارد گرد نظریں دوڑائیں، آپ کو اپنے جیسے ہزاروں ملیں گے۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم تاریخ سے سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، ہم اپنے بڑوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ آپ کسی بھی فیلڈ میں مہارت حاصل کرنے والے کی تاریخ کے اوراق پلٹیں، اس کی مہارت اور کامیابی کے پیچھے انتھک محنت، بے شمار تکالیف اور جہد مسلسل کے واقعات بکھرے ہوں گے۔ اگر آپ ان واقعات کو اپنے لیے مشعل راہ بناؤ تو کوئی بات نہیں کہ کامیابی آپ کے قدم نہ چوم لے، آپ ان کی آپ بیتاں ورق ورق پڑھیں اور دیکھیں کہ زمانے نے ان کے ساتھ کون کون سی ستم ظریفیاں نہیں کی ہے، تپتی سورج پر وہ اپنا کام کرتے دکھائی دیں گے، '' یخ بستہ ہواؤں میں بھی وہ اپنی جہد مسلسل کو جاری رکھے نظر آئیں گے
امریکا کے صدر ابراہام لنکن کے نام سے کون واقف نہیں۔ برطانیہ نے اس کی''

شخصیت سے متاثر ہو کر اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ویسٹ منسٹر ایبے میں اس کا مجسمہ نصب کیا۔ لیکن آپ اس کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالیے تو ناکامیوں سے اٹی دکھائی دے گی۔ وہ انتخابات میں کھڑا ہوا تو شکست فاش سے دوچار ہوا، تجارت کرنا چاہی تو بری طرح ناکام ہوا، ایک حسینہ سے محبت ہوئی جس کا جلد انتقال ہوگیا، جس عورت سے شادی کی وہ عمر بھر اسے ستاتی رہی، سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، کانگریس کی طرف گیا تو شکست خوردہ ہونا پڑا، سینیٹر بننے کی کوشش کی، رائیگاں گئی۔ مگر ان تمام ناکامیوں کے باوجود وہ ہمت نہ ہارا، مایوسی کو اپنے قریب آنے نہیں دیا، بالآخر امریکا کا صدر بن کر ہی دم لیا۔ آج اس کا نام صرف امریکا نہیں عالمی تاریخ میں ثبت ہو چکا ہے''۔

عمران خان سے اصولی اختلاف مجھ سمیت سینکڑوں لوگوں کو ہو سکتا ہے اور ہونا بھی'' چاہیے کیونکہ اختلاف میں حسن ہے۔ مگر اس نے جس جگہ ہاتھ ڈالا، لوگوں کی باتوں کا پرواہ کیے بغیر نا مساعد حالات میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتے گئے۔ پاکستان کی نا تجربہ کار ٹیم کو عالمی سطح پر کھڑا کیا، شوکت خانم ہسپتال جو خواب و خیال ہی لگتا تھا اسے تعبیر دی، پندرہ سال '' بے دل سیاست ''کے اکھاڑے میں ہارتا رہا، پر ہمت نہ ہاری۔ آج لگتا ہے پورا پاکستان اس کا گرویدہ ہے، لوگوں کا جم غفیر اس کی طرف امڈتا چلا آ رہا ہے، کل تک جو آدمی

لوکل سیاستداں نہیں مانا جاتا آج عالمی سیاستدان کا روپ دھار چکا ہے اسٹیبلشمنٹ کے مہرے بھی اس کے حق میں استعمال ہوتے نظر آ رہے ہیں''۔

پندرہ ہزار سے زائد دینی مدارس و جامعات اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والے'' اٹھائیس لاکھ سے زائد طلبہ کے وفاق، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان لمبے عرصے تک مدارس میں پڑھاتے رہے، ہندوستان اور پاکستان کے نامی گرامی جامعات میں درس دیا، مگر پھر ایک کمرے پر مشتمل اپنے مدرسہ کی بنیاد رکھی ۔اور للٰہیت کے ساتھ خلوص دل سے محنت کو اپنا شعار بنایا۔ ۵۵ سال کی جہد مسلسل کے بعد جامعہ فاروقیہ نے ایک عالمی اسلامی یونیورسٹی کا روپ دھار چکی ہے۔ جامعہ کے تین کیمپس کام کر رہے ہیں۔ فیز 2 میں ایک انٹرنیشنل یونیورسٹی کے تعمیراتی کام مکمل ہونے کو ہے جہاں ایک آئی ٹی ڈیپارمنٹ، ڈھائی سو بیڈ پر مشتمل ہسپتال، گرلز اینڈ بوائی سیکینڈری اسکول انیڈ کالج اور ٹیکنکل کالج کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے۔ دس ہزار نمازیوں کے لیے ایک جامع مسجد اور دار القرآن اور دار الحدیث اور درس نظامی کی بلڈنگ اور اساتذہ اور طلبہ کے قیام کی بے حد بڑی رہائشی سوسائٹی وجود میں آچکی ہے، آنے والے دنوں میں جامعہ فاروقیہ عالم اسلام کی مایہ ناز دینی اداروں میں ایک ہوگا۔ آج یہ جامعہ چار ہزار سے زائید طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھی

کر رہی ہے۔ مولانا سلیم اللہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں، ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے پاکستان کی بے پناہ خدمت کی ہے، مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع عثمانی اور علم طب کے بے تاج بادشاہ حکیم سعید شہید کی زندہ وتابندہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ کیا ان کی زندگیوں اور نقوش حیات میں ہمیں کامیابی کے راز نہیں ملے گے ؟۔

شیراز بھائی ! مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر میں نے آپ کے سامنے چند مثالیں'' پیش کیں۔ آپ کسی بھی کامیاب شخص سے اس کی کامیابی کا راز پوچھیے، اسی فیصد کی کہانی کی تان انتھک محنت ، تکالیف اور راہ عمل پر اپنوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں پر آ کر ٹوٹے گی۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے بہت کم ہوں گے۔ دیکھو پو میاں ! بھوپال کا ایک مہاجر بچہ '' عبدالقدیر ''پاکستان کے ایٹمی سائنسدان اور پاکستانیوں کا ہیرو ، ایک لوہاری کا بیٹا''احمدی نژاد'' ایران کا صدر ، امریکا کے ایک سکول کا ٹیچر'' اوبامہ'' صدر امریکہ ، کراچی کے فٹ پاتوں پر سونے والا'' نعمت اللہ خان'' دنیا کا پانچواں بیسٹ میئر ، کراچی کے گلیوں میں ریڑھی چلانے والا'' عبدالستار ایدھی'' دنیا کی سب سے بڑی ایمبولنس سروس کا چیئرمین بن سکتا ہے تو پھر ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آج کے نوجوانوں کو ان کامیاب اشخاص کی سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں کامل یکسوئی اور غور وفکر سے پڑھنا

چاہیے اور اپنے لیے کامیابی کے راستے ڈھونڈنے چاہیے۔ اور دوسری طرف وہی لوگ ناکام دکھائی دیں گے جو کام چور، محنت سے جی چرانے والے اور سست وکاہل قسم کے ہوں گے۔ بے شک ان کے پاس مال کی فراوانی ہو مگر کامیابی ان کے قریب سے بھی نہیں گزرے گی۔ یاد رہے کہ! اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ بیشک تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔ آج اگر ہر پاکستانی محنت، جہد مسلسل اور تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والا بن جائے اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز میں نبھانے والا بن جائے تو وہ وقت دور نہیں جب پاکستان بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا نظر آئے اور پاکستانی نوجوان بھی خوشحالی کے دن نہ دیکھ سکے۔ یاد رہے کہ خدا کے تمام برگزیدہ پیامبر نے بھی محنت کو اپنا شعار بنالیا اور اپنے اہداف کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہے ہیں، سمجھ داروں کے لیے ان کی سیرتوں اور زندگیوں میں بہت کچھ پنہاں ہے، فاعتبرو یا اولی الابصار''۔

خدارا ! داریل تانگیر کو وزیرستان نہ بناؤ

دیامر گرینڈ جرگہ میں ضلع دیامر کے انتہائی ذہین و فطین علماء کرام اور دانشوران شامل ہیں' بالخصوص جرگے کے چیئرمین مولانا عنایت اللہ' جناب ملک مسکین' جناب حاجی امیرجان اور عنایت اللہ شمالی انتہائی زیرک ' علاقائی معاملات پر گہری نظر اور سلجھانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔اور سلجھاتے رہتے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی اموراور نشیب وفراز سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔انہوں نے حکومت کے رویے کی بھرپور مخالفت کی جو انہوں نے داریل وتانگیر کے حوالے سے اپنا رکھا ہے۔حالانکہ جرگہ نے ہمیشہ مشکل کے حالات میں حکومت اور انتظامیہ اور عوام کے معاملات سلجھانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ مگر حکومت نے ان لوگوں کو نظر انداز کرکے اپنی من مانی چلائی جس سے حالات سدھرنے کے بجائے بگڑ گئے جو افسوس کن کے ساتھ حیرت کن بھی ہے۔

مولانا لقمان حکیم صاحب جمعیت علماء اسلام کے گلگت بلتستان کے امیر ہیں اور جید عالم دین ہیں۔ گزشتہ چار عشروں سے گلگت بلتستان کے سیاسی و مذہبی حالات اور علاقائی امور سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ مولانا کی صدارت میں بشمول مولانا قاضی عنایت اللہ اور جے یو آئی گلگت بلتستان کے تمام ذمہ داروں کی

طرف سے ایک مشترکہ اخباری بیان میں کہا گیا کہ '' داریل تانگیر میں محبِ وطن عوام کے گھروں کو دھماکوں سے اڑانے سے نتائج بھیانک ہونگے۔ حکومت داریل تانگیر کو سوات اور وزیرستان بنانے سے باز رہے، ایک منظم سازش کے تحت فوجی اپریشن کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو کہ قابل مذمت ہے۔ مطلوب ملزمان کو گرفتار کرنے کے بجائے ایک منصوبہ کے تحت فرار کرایا گیا ہے، ایک ملزم کی سزا پوری عوام کو دینا کہاں کا انصاف ہے''۔ سابق ممبر جناب حمایت اللہ خان مرکزی رہنماء اہل سنت والجماعت نے اپنے اخباری بیان میں کہا کہ '' دیامر کے عوام محب وطن ہیں، غریب لوگوں کے گھروں کو دھماکوں سے اڑانے کے نتائج بھیانک ثابت ہونگے، صوبائی حکومت دیامر کے محبِ وطن عوام کے ساتھ زیادتیں بند کریں ورنہ اہل سنت والجماعت کرپٹ حکمرانوں کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہوگی۔ کسی ایک دہشت گرد کو بنیاد بنا کر دیامر کے علماء اور عوام کو تنگ وہراساں کرنا بند کردیا جائے۔ عالمی طاقتیں اپنے مقاصد کے لیے آپس میں لڑانے کی سازش کررہی ہیں۔ صوبائی حکومت بھی اس میں ملوث ہے۔ جنرل ریٹائرڈ حمید گل کے بیان سے اتفاق کرتے ہیں''۔ خطیب مرکزی جامع مسجد جناب قاضی نثار احمد نے کہا کہ ''مفروروں کے نام پر غریبوں کے گھروں کو بموں سے اڑانا' حالات کو مزید خراب کرانیکی سازش ہے، بے گناہ انسانوں پر ظلم ڈھانا اسلام کسی صورت اجازت نہیں دیتا، حکمران یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دیامر کے عوام محب وطن ہیں۔ حکومت اور انتظامیہ اپنا رویہ درست

کرے ورنہ اہلسنت عوام احتجاج کا حق محفوظ رکھتی ہے جو بھرپور طریقے سے استعمال کی جائے گی''۔ مولانا عطاء اللہ شہاب نے کہا کہ سانحہ تانگیر، حکومت اپریشن میں مطلوب افراد کی گرفتاری تک محدود رہے، پاؤں کے بجائے اگر دل کے اپریشن کی کوشش کی گئی تو کوئی قبول نہیں کرے گا''۔ گلگت بلتستان ورلڈ فورم کے چیئرمین ڈاکٹر محمد زمان نے کہا کہ '' دھماکہ خیز مواد سے گھروں کو مسمار کرنا انسانی حقوق کے خلاف ورزی ہے، حکومت نے انتہائی غلط اقدام کیا۔ بارود سے گھروں کو اڑانا، علاقے کا گھیراؤ کرنے اور عوام کو تنگ کرنے والے پولیس فورس کے ذمہ داروں کے خلاف اور اس بدترین ظلم کے خلاف اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کی کمیشن میں آواز اٹھائیں گے''۔ جماعت اسلامی گلگت بلتستان کے امیر مولانا عبدالسمیع نے کہا کہ '' ملزمان کو جواز بنا کر آپریشن اور عوام کو تنگ کرنا زیادتی ہے، ضلع دیامر کے عوام کو اسلام پسند اور محب وطن ہونے کی سزا دی جارہی ہے۔ ایسے اقدامات سے مسائل حل نہیں کیے جاسکتے، بلکہ حکومت کے لیے مزید حالات گھمبیر ہوجاتے ہیں۔ جماعت اسلامی ہر غلط کام کی بھر مزاحمت کرے گی''۔ پروگریسو یوتھ فرنٹ کے چیئرمین کامریڈ باباجان نے کہا کہ ''حکومت داریل تانگیر میں دھماکوں سے گھر اڑا کر اسرائیل کا چہرہ دکھا رہی ہے، اقدام قابل مذمت ہے''۔ مذکورہ بالا تمام افراد نے شہید ڈی ایس پی جناب عطاء اللہ صاحب کے قاتلوں کو فی الفور گرفتار کرکے کیفر کردار تک پہنچانے کی تاکید کی مگر اس کے آڑ میں بے گناہ عوام کی زندگی اجیرن بنانے سے حکومت کی

بھرپورانداز یں مذمت بھی کی۔

ہم یہاں یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ضلع دیامر کے عوام نہ انتہاپسند ہیں نہ دہشت گرد، کسی بھی سنجیدہ آدمی نے ڈی ایس پی عطاء اللہ شہید کے قتل کی حمایت نہیں کی بلکہ سخت الفاظ میں مذمت کی،دیامر جرگہ نے ہمیشہ مثبت کردار اداکیا' حالیہ دنوں میں سنگین مقدمات میں ملوث آٹھ (۸) ملزمان نے دیامر جرگہ کی تعاون سے گرفتاری پیش کی اور خود کو قانون کے حوالہ کیا۔ گزشتہ سال بھی دیامر جرگے کے عمائدین نے حکومت کے نامزد کردہ دس بے گناہ انسانوں کو حکومت کے حوالہ کیا جو آج تک ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔کیا اس طرح اپنے ہی بے گناہ لوگوں کو امن کی خاطر حکومت کے شکنجے میں دینے کی مثال ،گلگت بلتستان کے کسی دوسرے علاقے یا پورے ملک میں کہیں پائی جاتی ہے؟ یقینا نہیں۔ اس سے دیامر کے عوام کی امن پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ گزشتہ دنوں داریل تانگیر میں دھماکوں سے اُڑائے جانے والوں گھروں کی انتہائی غمناک' اندوہناک اور وحشت ناک خبریں پورے ملک اور بیرون ملک رہائش پذیر اہل دیامر نے بڑے دکھ درد اور کرب والم میں سنی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اہل دیامر اس سب کے باوجود بھی پرامن رہیں گے۔ سیرت نبوی کی روشنی میں صبر وتحمل سے کام لیں گے۔ ضلع دیامر کے عوام جانتے ہیں کہ امن انسانی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے۔امن کے بغیر ترقی کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں

ہو سکتا۔امن ہر مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور امن ہی زندگی کی بقا کی ضامن ہے۔ غور سے جائزہ لیا جائے تو ضلع دیامر کے ساتھ ہر انداز میں زیادتی کی جاتی ہے۔ حکومت کا کونسا شعبہ ہے جس میں بہتر کارکردگی دکھائی جاتی ہے۔ حالیہ واقعات پر پورا دیامر افسردہ اور غمگین ہے مگر سنگ دل اور بے حس حکمران ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں۔ اور ضلع دیامر کے کٹھ پتلی ممبران بھی کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں بلکہ وہ تو غاصبوں کی لَے میں لَے ملا رہے ہیں۔ہماری مقتدر طبقوں سے گزارش ہوگی کہ امن و آمان برباد کرنے والے دہشت گردوں' جرائم پیشہ افراد اور انسانیت و معاشرت سوزوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے۔ پورے گلگت بلتستان میں ان کو بے نقاب کیا جائے اور سرعام انہیں پھانسی دی جائے ،مگر ان کی آڑ میں غریب اور مظلوم طبقے کو تنگ نہ کیا جائے ۔اگر حکومت لا اینڈ آرڈر اور دیامر کو قومی دھارے میں شامل کرنا اور معاشرت کی تبدیلی میں اتنی ہی مخلص ہے تو کیا یہ کام نوک خنجر کے بجائے نوک قلم سے انجام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ ایک سال سے کے کے ایچ اور بزعم خویش دیامر کے لوگوں کا قبلہ درست کرنے کے لیے جو فنڈ خرچ کیا گیا بلکہ بٹورا گیا اس سے دیامر میں تعلیمی انقلاب نہیں لایا جاسکتا تھا؟اور لوگوں کو گڈ گورننس کے ذریعے رام نہیں کیا جاسکتا تھا؟ کاش اس نہج پہ کوئی سوچے۔اے کاش !۔ ارباب اقتدار سنجیدگی سے اس معاملے کو نمٹائے۔ نقارہ خلق کو سنے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گلگت بلتستان کے وزیر اعلیٰ اور ارباب بست وکشاد' دیامر کے محب وطن عوام کو دہشت گرد کہہ رہے ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل مترادف ہے۔ دہشت گردی کے اصل مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے اسباب وعلل اور محرکات کا عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دہشت گردی ایک ''سیاسی کینسر'' ہے جو بنیادی انسانی حقوق سے محرومی اور ظلم وستم کی انتہا سے لیعنی بربریت' چنگیزیت 'اوباميت اور پرویزیت وزرداریت سے) ، مغلوب ' محکوم) اور مظلوم لوگوں کے اندراز خود پرورش پاتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے' ان مظلوم لوگوں کا تعلق کسی بھی مذہب' علاقہ یا رنگ ونسل سے ہوتا ہے' پوری دنیا ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس سیاسی کینسر کا علاج مریض کو دھمکانا' ڈرانااور لعن وطعن اورسب و شتم کرنااور ان کے گھروں کو اڑانے سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی مسلسل محرومیوں اور معاشرتی ناانصافیوں کے ازالے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان حقیقی مسائل کو نظر انداز کرکے غریب عوام کو دھونس دھمکی' جبر واکراہ سے زیر کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ سیاسی کینسر'' دبنے اور ختم ہونے کے بجائے مزید قوت حاصل کرے گا اور توانا ہوگا'' اور اس کا رد عمل شدید سے شدید تر ہوجائے گا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ضلع دیامر کے ساتھ دوغلا رویہ اپنایا جاتا ہے جس سے شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر چیف سکریٹری اور دیگر ارباب

اقتدار چاہیے تو ضلع دیامر میں تعلیمی انقلاب کے ذریعے سو فیصد تبدیلی لا سکتے ہیں مگر یہ تو ان کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں۔

مضاربت اسکینڈل، اکابر علماء کو بدنام نہ کیا جائے

گزشتہ چند ہفتوں سے مضاربت و مشارکت اسکینڈل کو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ اس قسم کے مالیاتی اسکینڈلز ماضی قریب میں بھی پیش آئے ہیں تاہم اس دفعہ ہاجم طبقے نے ایک مختلف انداز میں غریبوں کو لوٹا ہے۔ طریقہ واردت کے لیے جن لوگوں کو استعمال کیا گیا ہے وہ مسجد ومنبر سے تعلق رکھتے ہیں تاہم یہ لوگ نیچلی سطح کے لوگ ہیں جو اس مکروہ دھندے میں استعمال ہوئے ہیں۔اس حوالے سے میں نے کافی تحقیقی موادجمع کیا ہے جو وقت آنے پر پیش کیا جائے گا۔یہاں عام و خواص بالخصوص میڈیائی احباب مضاربت اسکینڈل کی آڑ میں اکابر علماء اور مسجد و محراب کے بزرگوں کو جس بری طریقے سے طعن و تشنیع اور سب وشتم کا نشانہ بنارہے ہیں وہ بہت ہی ناعاقبت اندیشی اور عدم معلومات پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے حقائق سے صَرف نظر کرکے چند قسم کے عامیانہ لوگوں کی آڑ میں اکابر علماء و بزرگان دین کو بدنام کرنا کسی صورت مناسب نہیں۔آج کی نشست میں چند حقائق لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تاکہ آپ پر یہ بات واضح ہوجائے کہ جس باتوں کا رونا آج رویا جارہا ہے انہی باتوں کی نشاندہی پاکستان کے جید علماء کرام نے آج سے سال ڈیڑھ سال پہلے کی تھی۔ مضاربت کے اس مکروہ کاروبار کی نہ صرف نشاندہی کی تھی بلکہ طاقت کے

ساتھ اس کی مخالف بھی کی تھی اور سادہ لوح عوام سے اپیل کی تھی کہ حتی الواسع ان سے احتراز کیا جائے۔ دلائل اور حوالہ جات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

مجھے اکابر علماء کرام کی دوراندیشی اور دیدہ وری پر ایمان کی حد تک یقین ہے۔ ارباب اختیار اور دنیاکے لٹیرے اپنے ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لیے ان بوریہ نشیں علماء کو وقتا فوقتا کسی نہ کسی شکل میں استعمال کرنے کے مختلف اوچھے ہتھکنڈے اپناتے رہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ سوائے سطحی قسم کے چند مولویوں کے کوئی نہیں آتا۔ اکابر علماء بصیرت کی آنکھ سے ایسی چیزوں کو سمجھتے ہیں اور'' اتقوا من موضع الشبہ '' کے مصداق نہ صرف اپنا دامن بچاتے ہیں بلکہ طاقت اور دلیل کے ساتھ مخالفت بھی کرتے ہیں۔

مضاربت اسکینڈل میں پورے ملک کی طرح گلگت بلتستان کے بھی غریب عوام بالخصوص دیندار طبقے کے اربوں روپے ضائع ہو چکے ہیں۔ میری محتاط معلومات کے مطابق ضلع دیامر، ضلع غذر اور ضلع گلگت کے ڈھائی ارب سے زیادہ رقم مضاربت اسکینڈل کے ذریعے ڈوب گئی ہے۔

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور جامعہ فاروقیہ کے بانی و وائس چانسلر اور شیخ الحدیث ہیں۔ حضرت نے ایک سال قبل اس مکروہ دھندے کی سخت مخالف کی اور مختلف اخبارات و رسائل میں ایک

مکتوب شائع کروایا اور عوام الناس سے اپیل کی کہ وہ ان لٹیروں سے بچے۔ شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان کے حکم پر علماء کرام کی ایک مجلس مذکراہ بتاریخ 13-12-2012 کو منعقد ہوئی جس میں مختلف کمپنیوں کے حوالے سے تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ جامعہ اشرفیہ لاہور، لاہور کا قدیم دینی ادارہ ہے جس میں پانچ ہزار سے زائد طلبہ ہمہ وقت دینی علوم سے مستفید ہوتے ہیں۔ جامعہ کے نائب مہتمم جناب مولانا فضل الرحیم صاحب نے حضرت شیخ کے حکم کی تعمیل پر جامعہ اشرفیہ لاہور میں، لاہور اور اس کے گرد و نواح کے تمام جید علماء کرام اور مفتیان دین کو جمع کرکے ان مختلف کمپنیوں کے کاروبار کی اصلیت، اصل مالیت، طریقہ کار، شرعی حیثیت، کارکردگی اور ان کمپنیوں کے حوالے سے حکومت پاکستان کے بعض انویسٹی گیشن اداروں کی شائع کردہ رپورٹس کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور تمام تفصیلات جامعہ اشرفیہ لاہور کے ترجمان ماہنامہ الحسن میں تفصیل سے شائع کیا۔ ان تمام کمپنیوں کے فراڈ و دجل اور مکروفریب پر مبنی کاروبار کی تفصیل اور ان کا اصلی چہرہ کھول کر بیان کیا۔ فروری 2013ء کے شمارے میں صفحہ نمبر 51 سے 63 تک یعنی بارہ صفحات پر ان تمام مضاربت و مشارکت کے نام پر حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کی تفصیلات شائع کردی۔ آپ ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ اور عوام الناس سے درمندانہ اپیل کی کہ جب تک یہ تمام کمپنیاں مستند مفتیان کرام اور معتبر دارالافتائوں سے اپنے کاروبار کا مکمل شرعی آڈٹ نہ کروائے، ان سے بچیں۔ اور مفتیان کرام نے ان کمپنیوں کے مالکان اور

کام کرنے والے ایجنٹوں سے طویل سوالات بھی پوچھے۔ ان کمپنی والوں نے اتنا طویل عرصہ گزرنے تک ان سوالات کے جوابات بھی نہیں دیے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی پاکستان کی معروف دینی جامعہ ہے۔جامعہ دارالعلوم کراچی سے 17 دسمبر 2012ء کو ایک تفصیلی فتویٰ ان کمپنیوں کے حوالے سے شائع ہوا جس میں ان پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا اور عوام الناس سے بچنے کی تلقین بھی کی۔اس فتویٰ میں دارالعلوم کے تمام مفتیان کرام کے دستخط ثبت ہیں۔جب مضاربہ ومشارکہ کمپنیوں نے جامعہ دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث ، جناب جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا نام بطور نگران پیش کرنے کی کوشش کی تو حضرت نے اخبارات میں ایک تفصیلی خبر دی جس سے ان کمپنیوں سے واضح برأت کا اظہار کیا اور سختی سے تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ ''بعض کمپنیاں ملک کے مختلف حصوں میں مضاربت کی بنیاد پر لوگوں سے رقمیں لے کر اور انہیں کاروبار میں لگا کر نفع تقسیم کرنے کا دعویٰ کررہی ہیں اور لوگوں کی یہ بتارہی ہے کہ یہ کاروبار میرے مشورے سے ہورہا ہے یا میں نے اس کے شرعی کاروبار ہونے کا فتویٰ دیا ہے اس لیے میں یہ وضاحت کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی بھی کمپنی یا اس کے چلانے والوں کو نہ میں جانتا ہوں نہ ان کے طریق کار سے واقف ہوں اور نہ ہی میں نے ان کے شریعت کے مطابق ہونے کا فتویٰ دیا ہے، لہٰذا جس کسی نے بھی میرا نام لیا ہے وہ غلط ہے۔ میرا ان کمپنیوں کے کاروبار

سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔(رونامہ اسلام 20 نومبر 2012ئ) یہ وضاحت کئی اخبارات اور دینی رسائل میں بھی شائع ہوئی ہے۔ حد تو یہ ہوئی کہ ایک گروپ نے جامعہ دارالعلوم کراچی کی طرف منسوب کرکے باقاعدہ فتویٰ نمبر بھی لگا کر، دارالعلوم کے تمام مفتیوں کے دستخطوں سے مزین کرکے ایک کمپوٹرائزڈ فتویٰ تیار کیا جو بالکل اصلی فتویٰ لگتا تھا کی فوٹوکاپیاں شائع کروائی اور عوام ہیں تقسیم کی ۔جب دارالعلوم والوں کو پتہ چلا تو انہوں نے اخبارات کے علاوہ اپنے ماہنامہ البلاغ انٹر نیشنل میں بھی اس جعلی فتویٰ کا بھانڈا پھوڑا اور مارچ 2013ء کو البلاغ میں اس کے برعکس فتویٰ جاری کیا اور ان کمپنیوں والوں کو آگاہ کیا کہ اگر اس غلط بیانی اور دھوکہ دہی سے اجتناب نہ کیا تو دارالعلوم کراچی کی انتظامیہ اور دارالافتاء ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

جامعۃ الرشید کراچی ایک معروف دینی ادارہ ہے۔ اس میں بڑے مفتیاان کرام تشریف رکھتے ہیں۔ جامعہ کے دارالافتاء سے دوسال قبل 20 ربیع الاول 1432ء کو ایک تفصیلی فتویٰ ان کمپنیوں کے حوالے سے شائع کیا گیا جس میں ان کمپنیوں کے کاروبار پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا اور عوام الناس سے بچنے کی تلقین کی۔ معروف کالم نگار اور جامعۃ الرشید کے مفتی جناب ابولبابہ صاحب تو روز اول سے ان کمپنیوں کے کاروبار کے سخت مخالف تھے، انہوں نے ہر فورم میں اس

کی وضاحت کی۔

پاکستان کے اکثر جامعات کے شیخ الحدیثوں کے استاد حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے مختلف اخبارات و رسائل میں ایک تفصیلی مکتوب شائع کروایا جس میں ان کمپنیوں کے کاروبار کو دجل وفریب پر مبنی کاروبار قرار دیا۔ ہفت روزہ ختم نبوت میں حضرات والا کا مکتوب شائع ہوا اور پوری دنیا میں پہنچ گیا۔ مختلف لوگوں کے استفسارات پر بھی حضرت شیخ نے سختی سے بچنے کی تلقین کی۔ حضرت نے تبلیغی مرکز رائیونڈ کے ذمہ داروں کے نام بھی تحریر فرمایا اور پرزور انداز میں اس فتنے کے سد باب کی ہدایت فرمائی جس پر تبلیغی مرکز رائیونڈ کی طرف سے بھی اخبارات میں اس کاروبار سے مکمل برأت کا اظہار کیا گیا۔ حضرت والا کے تمام تفصیلی احکامات وشائع شدہ خط دوسرے اخبارات و جرائد کے علاوہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے ماہنامہ الحسن نے بھی فروری 2013ء کو تفصیل سے شائع کیا۔ حضرت نے انتہائی سخت الفاظ استعمال کیے اور عوام کو اور خصوصی طور پر علماء کرام کو بچنے کی وصیت کی۔

ان اکابر علماء کے علاوہ بھی دیگر معروف دارالافتاؤں نے وقتاً فوقتاً ان کمپنیوں کے کاربار پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور عوام سے دور رہنے اور اپنا سرمایہ بچانے اور جنھوں نے لگایا ہے انہیں فوری واپس لینے کی تلقین

کی۔

ماہنامہ الحسن فروری 2013 ء میں علماء کرام کی ایک مشترکہ التماس بھی عوام الناس کے نام شائع ہوئی جو اس طرح ہے''تمام لوگوں سے کہ وہ مندرجہ ذیل کمپنیز (کیپبل ایشاء الیگزر گروپ آف کمپنیز، آصف جاوید ٹریڈنگ کمپنی، پاک ونر، الغفار ایسوسی ایشن، گرین سوئٹر کارپوریشن، حبیب کاروپوریشن، میزبان ٹریڈنگ کمپنی، المسلم ٹریڈنگ کمپنی، شفیق کیبل مرچنٹ، ایم ایم قریشی پرائیوٹ لمیٹڈ، مسیحاانٹرپرائز، شفیق انٹرپرائز،البرکہ مضاربہ کمپنی، الحاشر مضاربہ کمپنی) کے کاروبار میں انویسٹ کرنے سے اجتناب کریں اور جن لوگوں نے اپنی رقم لگارکھی ہے وہ کی گئی انویست منٹ کی حدتک اپنی رقم واپس لے لیں اور جب تک کسی معتبر دارالافتاء یا مستند علمائِ کرام سے یہ لوگ اپنے کاربار کا مکمل شریعہ آڈٹ نہیں کروالیتے اس وقت تک ان سے معاملہ کرنے سے احتیاط کیا جائے۔(الحسن فروری2013ء صفحہ نمبر 63)۔

قارئین اس تمام تر تفصیل کے بعد یہ بات عیاں ہوچکی ہے کہ مضاربہ و مشارکہ اسکینڈل سے جید علماء کرام اور ملک کے بڑے دینی اداروں ، جامعات، دارالافتاؤں اور شخصیات کا دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ ان حضرات نے تو دلیل اور قوت کے ساتھ ان مکروہ دھندوں کی مخالفت بروقت کی ہے۔اب جن لوگوں نے

عامیانہ قسم کے لوگوں کے ذریعے اپنی رقم مضاربہ و مشارکہ کمپنیوں میں جمع کروائی ہے اور اس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں تو اس کا تعلق اکابر اور بزرگان دین اور مسجد و محراب کے ساتھ جوڑنا نہایت ناانصافی ہے۔ میرے پاس ذکر کردہ معلومات کے علاوہ بھی کافی معلومات موجود ہیں کہ علماء کرام کے ایک بڑے طبقے نے شدت کے ساتھ اس کی نفی کی تھی۔ گلگت بلتستان سے جن جن لوگوں کی رقوم ضائع ہوئی ہے ان کی تمام تر معلومات بھی میرے پاس جمع ہیں اور کئی جمع کنندگان کو ذاتی طور پر جانتا بھی ہوں ۔ان میں سے کسی کا بھی تعلق ان بزرگوں سے نہیں ہے۔ یہی صورت پورے ملک کی ہے۔ ہاں چند ایک سادہ مفتیان کرام اور علمائ دین ان لٹیروں کے دام میں پھنسے ہیں اور ان کے مکروہ دھندے میں نادانستہ معاون بھی بنے ہیں لیکن اب کفِ افسوس مل رہے ہیں۔ بہر صورت چند لوگوں کی آڑ میں اکابر علماء کو قصوروار ٹھہرانے اور ان پر سب وشتم سے گریز کیا جائے۔ لوگوں کی رقوم، تو مئی 2013 سے دلدل میں پھنس گئ ہیں مگر علماء نے تو ڈیڑھ سال قبل ہی اس کی نشاندھی کی تھی ۔ پھر بھی یہ قصور وار اور سزاوار کیوں؟۔۔۔یاللعجب! کیا پورے ملک میں کسی بھی دارالافتاء نے ان کمپنیوں کے کاروبار کے جواز کا فتوی صادر کیا تھا؟ یا کسی نے بھی ان اکابر علماء سے اجازت لے کر اپنی رقوم بغیر کسی رسید، اشٹام یا کسی معاہدے کے ان کمپنیوں میں جمع کروائی تھی؟ یقینا نہیں۔ علماء کرام اور بزرگان دین کے علاوہ صحافیوں، قلم کاروں اور مختلف کاروباری شخصیات نے بھی عوام الناس کو

آگاہ کیا تھا کہ یہ سلسلہ ٹھیک نہیں مگر کسی کو عقل ہی نہیں آئی۔ تو پھر اپنی غلطیوں کا خمیازہ علماء کرام پر نہیں ڈالنا چاہیے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

''قتلِ مسلم''

ملک کے موجودہ حالات کو دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔ چار سو قتل مسلم عام ہوچکا ہے، آج میں ان آیات وروایات کو لے بیٹھا ہوں جن میں اللہ تعالیٰ اور آقائے نامدار حضرت محمد کے ارشادات ہیں کہ ایک مسلم کا قتل کتنا بڑا ''جرم عظیم'' اور ''گناہ کبیر'' ہے۔ سورۃ النساء آیت نمبر ۹۳ میں خدائے ذوالجلال کا واضح ارشاد ہے:]ومن یقتل مؤمنا متعمداً فجزاہ جھنم خالداً فیھا و غضب اللہ علیہ ولعنہ اعدلہ عذابا عظیما[جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو عمداً یعنی قصدا جان بوجھ کر قتل کرڈالے تواس کی سزا ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے' اللہ رب العزت کا غضب ہے' اس کی لعنت اور پھٹکار ہے' اور ایسے لوگوں کے لئے بڑا دردناک والمناک عذاب تیار ہوچکا ہے۔امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ایک حدیث نقل کی ہیں جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے:] لایشیر احدکم علی اخیہ بالسلاح فانہ لایدری لعل الشیطان ینزع مافی یدہ' وفی روایۃ ینزع بالعین فیقع فی حفرۃ من النار[یعنی فرمایا کہ کبھی بھی اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو' ممکن ہے کہ ہتھیار میں جو کچھ ہے وہ لگ جائے تو تم جہنم کے گڑھے میں گرپڑو یعنی آپ کے اشارہ کرنے سے تلوار چل گئی اور مسلمان کا خون ناحق ہوگیا تو ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائیگا جس کے

پاداش عذاب جہنم ہے۔ قارئین کرام! آپ نے آیت کریمہ اور حدیث مبارکہ ملاحظہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قتل مسلم کو کتنا بڑا جرم قرار دیا ہے اور اس آدمی کا انجام جہنم بتایا ہے اور اس پر لعنت و پھٹکار کی ہے اور آپ نے بھی واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ مسلم کا خون کتنا قیمتی ہے۔ حدیث مذکورہ سے تو واضح ہو جاتا ہے کہ از روئے مزاق اور دل لگی کے لئے بھی کسی مسلمان بھائی کی طرف اسلحہ اٹھانا یا اس کو ڈرانے کے لئے کسی بھی قسم کا ہتھیار کا رخ اس کی جانب کرنا یا اشارہ کرنا شرعا جائز نہیں ہے۔ ذرا ہمیں اپنی حالت زار کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم نے خون مسلم کو کتنا ارزاں سمجھا ہوا ہے۔ ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمر نے مرفوعا مروی ہے:] زوال الدنیا کلھا اھون علی اللہ عن قتل رجل مسلم '[اسی روایت کی تخریج امام نسائی نے ان الفاظ میں کی ہے] قتل المؤمن اعظم عنداللہ من زوال الدنیا[یعنی آقائے نامدار نبی رحمت سرور کائنات نے فرمایا ہے کہ '' اللہ کے نظروں میں تمام دنیا کے زائل یعنی نیست و نابود ہو جانے نے بھی بڑھ کر جو چیز ہے وہ ایک مؤمن مسلمان کا قتل ہے۔ قارئین دل کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں قتل مسلم مزاق بن چکا ہے، خدا تعالیٰ کے ارشادات اور نبی کریم کے فرمودات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اور کفر نہیں

ہو سکتا کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے خون ناحق سے اپنے ہاتھ رنگین کرے۔ روشنیوں کا شہر کراچی غریبوں کے خون سے سرخ ہو گیا ہے۔ کراچی ایک شہر ہے جہاں پورے ملک کے باسی رہتے ہیں۔ پورے ملک کے ہر علاقے کے نام سے کراچی میں کالونیاں بنی ہوئی ہیں مثلاً گلگت کالونی، کشمیر کالونی' پنجاب کالونی' مانسہرہ کالونی' بلوچ کالونی' غرض ہر صوبے کے مختلف علاقوں کے ناموں والی کالونیاں کراچی میں ہیں اور وہاں اس علاقے کے لوگ فروکش ہیں مگر لسانیت، علاقائیت پر روزانہ کی بنیاد پر سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے۔ نہ قاتل کو معلوم نہ مقتول کو۔ بلوچستان تو مشرفی آمریت کے دور سے مسلسل جل رہا ہے اور جلانے کے لئے ایندھن مہیا کرنے والے کوئی بھی ہوں مگر ماچس کی تلی سے آگ بھڑکانے والے اپنے مسلمان بھائی ہیں۔ گلگت بلتستان بھی کبھی امن کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ سالوں میں کوئی قتل ہوتا تھا، اگر کوئی ذاتی دشمنی میں قتل ہوتا تو قاتل کبھی بھی اپنے آپ کو چھپاتا نہیں تھا بلکہ وہ فخریہ اعلان کرتا کہ جی ہاں ! میں نے قتل کر دیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ اذیت اور خوف وہراس سے بچ جاتے تھے۔ مگر چند سالوں سے یہ پر امن علاقہ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے بھر چکا ہے، خون آشامی کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ خونیں وارداتیں روز کا معمول بن چکیں ہیں۔ گلگت میں بھی قتل و خون کی ہولی کھیلنے کے لئے پلان جو بھی تیار کرتا ہو اور اس کے لئے فنڈنگ کوئی بھی کرتا ہو مگر ایک دوسروں

کے گلے کاٹنے کی '' خدمت عالیہ '' مقامی لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔ پتنگ کی ڈوری جہاں کہیں سے بھی ہلائی جائے مگر پتنگ گلگت سے ہی اُڑے گا اور گلگت کا ہی پتنگ کٹے گا' اور کٹ کر کرچی کرچی ہو کر ہواؤں کے دوش بکھر جائے گا۔

انتہائی غور سے جائزہ لیا جائے تو ہم نے خدائی فرمودات اور نبوی تعلیمات سے روگردانی کی ہوئی ہے۔ یہ اٹل ہے کہ شریعت اسلامی نے مسلمانوں کی جمیعت و قومیت کی اساس و بنیاد باہمی مؤاخات پر رکھی ہے' یعنی ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا رشتہ ہے۔ قرآن کریم کا دو ٹوک مؤقف ہے کہ]فاصبحتم بنعمتہ اخوانا' انماالمؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم [یعنی مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں' پس جب دو بھائیوں میں رنجش پیدا ہو جائے تو ان کے مابین صلح کرادو۔ اللہ تعالی نے مسلمانوں کی قومی سیرت و کردار جابجا بیان فرمایا ہے' سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۵۴ میں صاف ارشاد ہے] اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین [اور سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۲۹ میں بھی اسی قسم کا ارشاد ہے]اشداء علی الکفار رحماء بینھم [۔ دونوں آیات کا مفہوم بتلاتا ہے کہ مسلمان میں جس قدر بھی نرمی و محبت ہے مسلمانوں کے ساتھ ہے' اور جس قدر بھی سختی اور درشتی ہے غیروں کے لئے یعنی کفار کے لئے۔ ایک کامل مسلمان کی علامت یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ نرم بھی ہے اور سب سے زیادہ سخت بھی یعنی اپنوں کے لئے ابریشم اور غیروں کے لئے سخت جان' مسلمانوں کے پاس محبت بھی ہے

اور عداوت بھی' ان کی محبت پرستارانِ حق کے ساتھ اور عداوت دشمنانِ حق کے ساتھ۔ تو کیا ہم مسلمان ہیں ؟۔ ہمیں اپنی اداؤں پر غور کرنا چاہیے۔

سیرت نبوی اور احادیث نبوی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قتل مسلم سے بڑھ کر کون سا فعل ہے جو خدا کے عرش جلال و غیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں بارش کی طرح آسمانوں سے نہ برسے' جس مؤمن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو اور لائق و فائق ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ بتلائے' اسی کا خون خود ایک مسلمان کے ہاتھوں سے ہو' اس سے بڑھ کر شریعت الٰہی کی کیا توہین ہو سکتی ہے؟ جس بدبخت انسان کا احساس ایمانی یہاں تک مسخ ہو جائے کہ باوجود دعوائے مسلم و مؤمن کے مسلمانوں کا خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرے بلکہ اس کو کار خیر بھی سمجھے' تو یاد رہے کہ وہ یقینا مسلمانوں کا خون نہیں بہاتا بلکہ وہ تو پروردگار عالم کے کلمہ توحید کو ذلیل و خوار کرتا ہے اور شانِ کبریائی کو بٹہ لگانا چاہتا ہے۔ سو' ایسوں کو] ان عذابِ شدید کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ وماعلینا الا البلاغ۔]

شادی خانہ آبادی یا خانہ بربادی

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ عائلی زندگی انسانی معاشرے کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگر معاشرے میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ توڑ پھوڑ، تتر بتر، انتشار و اضطراب اور افرا تفری کا شکار ہو، تو خواہ زمیں سونا اگل رہی ہوں، لہلہاتے کھیت جنت عارضی کا منظر پیش کر رہے ہوں، فلک بوس پہاڑ معدنی ذخائر کے منہ کھول رہے ہوں۔ گلاب اور چنبیلی اپنی لازوال خوشبوئوں سے فضاء معطر کر رہی ہوں، دریا اور سمند اپنی لہروں سے انسانی جذبات کو ابھار رہے ہوں، علم و دانش کے علمبردار اپنی قوت بیانی و حکمت و دانش کے موتے بکھیر رہے ہوں، جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے آسائش و آرائش کی تمام ضروریات پوری ہو رہی ہوں یا مشینوں سے لعل و جواہر برآمد ہو رہے ہوں، زندگی سکون سے محروم ہوجاتی ہے۔ محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اقدار مٹتی ہیں۔ جذبات ناپید ہوتے ہیں۔ خواہشات دم توڑتی ہیں حوصلے شکست خوردہ ہو جاتے ہیں۔ امیدیں ٹوٹ کر بکھر جاتی
ہیں۔ خوشبوئیں متعفن ہو جاتی ہیں۔ دلکشیاں ویرانیاں سی لگتی ہیں۔ ترقی تنزلی کا منظر پیش کرتی ہیں دوست دشمن سے لگتے ہیں، زندگی عذاب سی ہوتی ہے، دل کی حالت کباب کی سی ہوتی ہے، انسانی معاشرہ کی حالت خانہ خراب کی سے ہوتی ہے۔ چہروں پر منافقت کے دبیز پردے اوڑھ کر محبت و دوستی اور اقدار و

اطوار اور تعلق و رشتہ کی دور رس کڑیاں ملانے والوں کی کیفیت کھلی کتاب کی سی ہوتی ہے، بس دوست یہ سمجھ لیں کہ زندگی ایک مشکل نصاب کی سی لگتی ہے۔

میرے اکثر قاری مجھ سے یہی امید اور مطالبہ کرتے ہیں کہ یں معاشرے میں رستے ہوئے ناسوروں کے خلاف آواز حق بلند کروں مگر میرا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ نقارے میں طوطی کا کون سنتا ہے؟ یہ بات کس سے مخفی ہے کہ ہمارے ہاں خاندانی نظام روز بروز تباہ ہوتا جارہا ہے۔ شادی جیسے مقدس فریضے کی تکمیل کے لیے کتنی کڑی شرائط و رسم ورواج کے آہنی طوق کو گلے کا ہار بنایا جاتا ہے مگر آقائے مدنی، سردار کل جہاں، نبی آخرالزمان حضرت محمد نے کتنا خوبصورت ارشاد فرمایا کہ سب سے برکت والی شادی (نکاح) جس میں زیر باری کم سے کم ہو یعنی جس میں انسان نہ مالی طور پر زیر بار ہو، اور نہ رسم و رواج اور ذات پات اور قوم و خاندان کی لت میں جکڑا ہوا ہو۔ ہمارے معاشرے میں روز بروز اقدار مٹتی جا رہی ہیں ایک زمانہ تھا لوگ اپنی بیٹیوں کا رشتہ شریف گھرانوں میں کرنا پسند کرتے تھے۔ لڑکے کی دینداری اور تعلیم و کردار کو دیکھا جاتا تھا۔ مگر بد قسمتی سے رفتہ رفتہ یہ ساری چیزیں بھولی بسری کہانیاں بنتی جا رہی ہیں۔ آج لڑکی کے لیے رشتہ کا معیار مالداری اور سرکاری ملازمت میں محدود ہو کر رہ گیا اگرچہ گریڈ ون کا ملازم ہی کیوں

نہ ہو۔ لڑکے کی عادات و اطوار، قول و عمل، حسن صورت و سیرت، اخلاق و تعلیم اور اس جیسی دیگر اوصاف حسنہ کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ لڑکے والوں کے پاس وافر مقدار میں مال وزر ہو اور لش پش گاڑی ہو، چاہے لڑکا شرابی و کبابی یا لوفر لفنگا ہو عام طور پر یہ بات سنائی دیتی ہے کہ ایک اچھی سی گاڑی ہو اور سرکاری ملازمت ہو تو پھر کہیں بھی رشتہ کرنا کوئی مشکل نہیں اگر ان تلخ حقائق کو تسلیم کرکے ان کی بیخ کنی نہ کی جائے تو آنے والا کل مزید بگڑا ہوا ہوگا۔

اسلام ایک دین فطرت ہے۔ اسلام کے آفاقی اور لازوال قوانین کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے کسی قانون اور آوامرو نواھی میں کوئی سقم نہیں۔ اسلام نے شادی، بیاہ اور بالخصوص نکاح کو جتنا آسان بنایا ہے ہمارے موجودہ معاشرے کے ڈھانچے نے اس اتنا مشکل اور پیچ درخم بنایا ہے۔ نکاح کے بابرکت اور مسنون معاہدے پر ہم نے لامتناہی رسموں، غیر اخلاقی شرطوں، غیر مسنون تقریبات اور بے جا اخراجات، مصارف کا ایسا بوجھ اپنے کندھوں لاد رکھا ہے کہ ایک غریب بلکہ مڈل کلاس آمدنی والے شخص کے لیے بھی وہ ایک ناقابل عبور پہاڑ بلکہ جیتا جاگتا "ننگا پربت" بن کر رہ گیا۔ جو خون آشام پہاڑ کے نام سے معروف ہے۔ ہم نے بھی نکاح جیسے مقدس فریضہ کو خون آشامی کا عادی بنایا ہے۔

ہمارے ملک عزیز پاکستان میں مختلف ثقافت اور رہن سہن کے لوگ رہتے ہیں۔
اکثریت مسلمانوں کی ہے اور بزعم خویش خود کو نیک اور پارسا بھی سمجھتے ہیں مگر دینی احکام کی بات آتی ہے تو وہاں ساری دینداری پاﺅں تلے روندھی جاتی ہے۔نہ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،نہ مشرقی روایات اور اعلیٰ اقدار و کردار کا پاس رکھا جاتا، صرف اور صرف اپنی انا اور اپنی رسم و رواج اور ثقافت کو پرموٹ کیا جا رہا ہے اگرچہ وہ اسلام اور اعلیٰ اقدار کے منافی و متصادم ہی ہو۔
یہ بات بھی ہم سے چھپی ہوئی نہیں کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو محض خادمہ یا شئی مستعملہ سمجھا جاتا ہے جب اس کے رشتے کی بات آتی ہے تو اسے اسکی مرضی تک معلوم نہیں کی جاتی حالانکہ اس کی مرضی اور اجازت لینا سنت نبوی ہے مگر ہمارے معاشرے میں اس کو عار بلکہ بے غیرتی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور شادی کے بعد بھی عورت کے ساتھ رویہ مناسب نہیں ہوتا ہے میاں بیوی کا تعلق بہت گہرا اور انمٹ ہوتا ہے۔ایک دوسرے کے دم دم کے ساتھی ہوتے ہیں۔اور ان کی زندگی میں بے شمار نشیب و فراز آتے ہیں بہت سی ناگواریاں اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور بعض دفعہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ انسان ناگواریوں کے رد عمل میں ظلم و ستم پر اتر آتا ہے۔ایسے وقت میں آدمی کو اپنی عورت کو اپنی بہن کا درجہ

دیکر سوچنا چاہیے کہ اگر اس کی جگہ میری بہن ہوتی تو میں اس کے لیے کون سا فیصلہ پسند کرتا؟اور دھیان بھی ہونا چاہیے کہ میرے عمل کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ کہیں میں زیادتی اور ناانصافی تو نہیں کر رہاہوں ہمارے لیے اسوہ حسنہ کے طور پر ہمارے نبی ہی کافی ہیں۔آپ نے اپنی تمام عمر کبھی اپنی ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین کے ساتھ طبعی غصے اور ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ نہیں فرمایا۔ عورت اور مرد کے نشیب وفراز اور اتار وچڑھاؤ میں اللہ کے احکامات اور سنت نبوی کی طرف توجہ نہ دی جائیں تو عموماً اس کا نتیجہ حق تلفی، ظلم وستم، تشدد اور ناانصافی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو دونوں کے لیے دو جہانوں میں نقصان و خسران کا سبب بنتا ہے۔

میں اپنے قریبی احباب کے نکاح کی ایک تقریب میں مدعو تھا۔ عین وقت نکاح فریقین میں دنگا شروع ہوا، سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں نکاح خواں اور ایک فریق کا جھگڑا ہوا۔ لڑکی والے ایک ایسی فاسد شرط پر مصر تھے جو منگنی میں طے ہوئی تھی۔اب وہ الفاظ نکاح کے درمیان اس شرط کا اقرار بھی چاہتے تھے اور نکاح خوان (مفتی صاحب) کا ارشاد تھا کہ یہ شرط فاسد ہے مگر اس کی بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ نوبت ہاتھاپائی تک پہنچنے والی تھی کہ میں درمیان میں آیا، نکاح خواں سے عرض کیا کہ آپ خاموش رہیں، پھر فریقین کے درمیان صلح کرائی اور ایک مختصر سی تحریر ہرجانہ کے نام سے لکھ کر

جانبین کے دستخط لیے پھر مفتی صاحب سے عرض کیا کہ اب آپ کا اشکال بھی دور۔ بسم اللہ کیجیئے۔ یوں عقد نکاح کی بابرکت محفل بغیر دنگا فساد کے پایہ تکمیل کو پہنچی۔ قارئین! یقین جانیں! یہ ایک خالص دینی گھرانے کی روئیداد ہے۔ آپ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ ہم رسم و رواج کے قعر مذلت میں کس طرح گرے ہوئے ہیں۔ یہی صورت حال منگنی، دعوت ولیمہ، مایوں، ابٹن، مہندی اور شب زفاف، دیگر مواقع پر دیکھی جارہی ہے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

اسلام ایک معتدل تعلیمات پر مبنی دین ہے۔ جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی، جس کا ماخذ و منبع وحی الٰہی ہے۔ اسلامی تعلیمات و احکامات ایک ایسی ذات کی وضع کردہ ہیں جو ہر دور کے معاشرتی ضروریات و حوائج سے مکمل طور پر باخبر ہے۔ لہٰذا ہمارا کام جدید دور کی بگڑی ہوئی رسومات اور فیشن کی پیروی کرنا نہیں بلکہ آج کے تمام رسومات، کلچر اور فیشنوں اور دیگر لوازمات کو قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی کسوٹی پر رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ہمارے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں؟ جب تک ہمارے اندر یہ جراءت اور بصیرت پیدا نہ ہوگی ہم مغربی، ہندوستانی اور خود اپنی ناجائز ثقافتی و تمدنی یلغار کے لیے ایک ترنوالہ بنتے رہیں گے اور ہماری اجتماعی زندگی کی رہی سہی دینداری و اقدار بھی رفتہ رفتہ غیروں کی جلائی ہوئی آگ اور اپنوں کی بے حسی بلکہ بے بہرہ

تقلید کی وجہ سے مٹتی چلی جائیں گی آج ہمارے ہاں جہیز نام کی ایک اور لعنت نے جڑیں پکڑ لی ہے معاشرے میں یہ لعنت ایسی چھا گئی ہے کہ اس کا خاتمہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ متوسط طبقہ کے لوگوں کے لیے یہ عذاب الیم سے کم نہیں ہے۔ اگر آپ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کو دیکھیں گے تو ان کے زلف سیاہ میں چاندنی کی سفیدی نظر آئے گی۔ جب ان کے والدین سے پوچھا جاتا ہے تو ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ جہیز تیار نہ ہونے کی وجہ سے شادی نہیں ہو رہی ہے۔ یہاں بھی ہمیں رہنمائی کے لیے کائنات کے سردار جناب رسول اللہ اور ابو بکر صدیق کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جب رسول نے فاطمۃالزھرا کا نکاح شیر خدا حضرت علی سے اور حضرت ابو بکر نے ام المومنین حضرت عائشہ کا عقد رسول اللہ سے کیا تھا۔ تو انھوں نے اپنی لخت جگروں کو کتنا سامان جہیز کے نام پر دیا تھا۔ یقینا ہم اگر سنت رسول اور صحابہ پر عمل کریں گے تو ہماری بچیاں بھی شادی کے خواب وانتظار میں اپنے شباب کے حسین ایام یاس وحسرت میں نہیں گزاریں گی۔ اور ہمیں ایک لعنت سے چھٹکارہ مل جائے گا۔

شادی بیاہ اور رشتے ناطے کے معاملے میں بھی لوگ ابھی تک اپنے خود ساختہ خیالات کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات سے غفلت، کوتاہی اور ناواقفیت عام ہو چکی ہے۔ شریعت نے نکاح کے معاملے پر ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ

زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے اس لیے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو۔ ان کے رہن سہن اور مزاج میں اتنا دوری نہ ہو کہ بقیہ زندگی گزارنے میں مشکلات پیش آئے۔ مگر ہمارے ہاں ان تمام احکام کو یکسر نظر انداز کیے جاتے ہیں اور ایسے ایسے خرافات کا ڈھول پیٹا جارہا ہے جس میں نکاح جیسا مقدس فعل شطرنج کا کھیل بن جاتا ہے، رشتے ناطے اور نکاح کے لیے ایسی کڑی شرائط اور ناز برداریوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ ایک شریف انسان عش عش کر جاتا ہے جب کہ آقائے نامدار، تاجدار انبیاء سید الرسل سرور کونین کا کتنا مبارک ارشاد ہے کہ "اذا جاء کم من ترضون دینہ وخلقہ فزوجوہ الا تفعلوا تکن فتنتہ فی الارض وفسادا کبیرا" ترجمہ: جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہو تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کردو، اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین میں بڑا فساد برپا ہوگا۔ اس جیسے بیشمار احکامات قرآن وحدیث میں موجود ہیں مگر دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیئے کہ ہم ان قدسی احکامات کی کتنی تعمیل کرتے ہیں۔ ہم تو ذات پات، غریب امیر، کالا، گورا، عربی وعجمی، سید غیر سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، مشرقی، مغربی، پٹھان، بلوچ، سندھی، پنجابی، بلتی، شینا، شین، یشکن، ڈوم، کمین اور قوم وقبیلہ کے چکروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کو کفو کا نام بھی دے رہے ہیں۔ جو سراسر غلط اور زیادتی ہے۔ احادیث وروایات میں ضرور ترغیب دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ دونوں

خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھا سکیں لیکن یہ سمجھنا اور کہنا قطعاً غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً بالکل ناجائز ہے آج اگر علمائے کرام، شیوخ، واعظین اور معاشرے کے سرکردہ اور با اثر حضرات اپنی بہنوں ، بیٹیوں، پوتیوں اور اپنے بھائیوں، بیٹوں اور پوتوں کے رشتے ناتے، منگنی تقریب ولیمہ، نکاح اور شادی بیاہ کے دوسرے علاقائی رسم و رواج کو ترک کرکے اسلامی طریقہ کار کو اپنائیں تو مجھے اللہ کی ذات پر کامل بھروسہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی تقلید کریں گے۔ یہی اپر کلاس لوگ اگر اپنے بیٹے، بیٹیوں کا رشتہ اوصاف حسنہ کو بنیاد بنا کر مڈل کلاس اور لوئر کلاس کے گھرانوں میں کریں تو معاشرے سے بے شمار برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور یہ لوگ "الدال علی الخیر کفاعلہ" کا مصداق بن جائیں گے۔ بہر صورت ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں بالخصوص شادی بیاہ، نکاح، ولیمہ، اور طلاق وغیرہ میں اسلام کے ابدی و سرمدی احکام پر مکمل عمل کرنا چاہیے تاکہ شادی خانہ بربادی کا سبب نہ بنے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

صدیق اور حیدر کے متوالو... خدا کے لیے

میرے گزشتہ کالم پر کچھ اپنوں نے اور تھوڑا کچھ غیروں نے ناک بھوں چڑھایا۔ چند احباب تو باقاعدہ احتجاج ریکارڈ کروانے لگے۔ ایک صاحب تو نماز کے بعد مسجد کے باہر لتاڑنے لگے۔ مجھے اکثر ایسا فیڈ بیک ملتا رہتا ہے مگر اس دفعہ تو بزدلی کا طعنہ بھی دیا گیا بلکہ کتمانِ حق کا مرتکب قرار دیا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے واقعی کچھ غلط تو نہیں لکھا ہے۔ دوبارہ اپنی تحریر پڑھ کر مطمئن ہوا کہ ایسا کچھ نہیں لکھا جس پر پیشمانی ہو۔ میں نے تو صرف محبت و مودت سے معاشرتی زندگی گزارنے کی درخواست کی تھی مگر مجھ پر فتویٰ لگانے کا الزام بھی لگایا گیا۔ حالانکہ نہ میں نے ایسا کوئی جملہ لکھا ہے نہ میں فتویٰ لگانے کی مسند پر براجمان ہوں۔ یہ یاد رہے کہ اہل بیت عظام پر درود و سلام بھیجے بغیر نہ میری نماز مکمل ہوتی ہے نہ ایمان کامل۔ اہل بیت عظام بالخصوص حسن و حسین، شیر خدا حضرت علی، جنت کی عورتوں کی سردار حضرت فاطمۃ الزہراء اور تمام ازواج مطہرات کے ساتھ جتنی جذباتی لگاؤ اور محبت ہے اتنی ہی اصحاب نبی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ بھی محبت و عقیدت ہے۔ اہل بیت اور اصحاب نبی سے محبت میرے عقیدے کا حصہ ہے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑھتا ہے کہ آج اہل بیت اور اصحاب نبی کے مقدسوں ناموں پر ہم نے جنگ شروع کر رکھی ہے۔ حالانکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں بے حد محبت تھی۔ میں آپ کی خدمت میں وہ تمام تاریخی حوالے اس لیے پیش نہیں کرسکتا کہ کاغذکے ان اوراق ییں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ یہ انتہائی اعلیٰ درجے کی اخلاص، ورع اور للّٰہیت کا رزلٹ تھا کہ اہل بیت عظام، اصحاب نبی اور ائمہ مجتہدین باہمی اختلاف کے باوجود ایک دوسروں کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ جنگ جمل ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس جنگ میں حضرت عائشہ صدیقہ کے مقابلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جیت ہوئی۔ حضرت علی کی جماعت کے چند افراد نے اصرار کیا کہ تمام مخالفین کو قتل کیا جائے تو شیر خدا نے انکار کیا۔ کچھ شدت پسندوں نے اصرار کیا کہ ان کو قیدی بنایا جائے تو حضرت علی نے ایک تاریخ ساز جملہ ارشاد فرمایا کہ '' تم میں کون ہے جو اپنی ''ماں'' حضرت عائشہ کو باندی بنا کر اپنے حصے میں لے جائے؟ تو سب نے کہا نستغفراللہ'' یعنی ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں تو حضرت علی نے بھی ارشاد کیا کہ '' وانا'' استغفراللہ'' یعنی میں بھی اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ اپنے متشدد دل پر ہاتھ رکھ کر بتلاؤ کہ کیا آج ہم بھی اپنے مخالفین کے ساتھ اس سلوک کے روادار ہیں۔ وہ لوگ ایک دوسروں کے خلاف تلوار اٹھانے والوں کے ادب واحترام کا جتنا خیال رکھتے تھے آج ہم دلیل کی بنیاد پر اپنی پالیسی سے اختلاف کرنے والوں کو بھی اتنا احترام دینے کے لیے تیار نہیں بلکہ ان کو گزند پہنچانے

کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسی جنگ جمل میں ام المؤمنین حضرت عائشہ کا اونٹ زخمی ہو کر گرا، تو شیر خد حضرت علی فرمانے لگے کہ دیکھو کہیں "ام المؤمنین کو تکلیف تو نہیں پہنچ رہی ہے"۔ ام المؤمنین کا بھائی محمد بن ابی بکر جو حضرت علی کے طرف دار تھے نے دیکھا تو امی عائشہ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی، پھر خود شیر خدا وہاں تشریف لائے اور خیریت دریافت کی، جانبین سے مغفرت کی دعا ہوئی اور شیر خدا نے حفاظتی دستے کے ساتھ ام المؤمنین کو گھر پہنچا دیا۔

شیر خدا حضرت علی خلفائے راشدین سے حد درجہ پیار و محبت کرتے تھے۔ اپنے کئی بیٹوں کے نام خلفائے راشدین کے نام پر رکھے تھے، حضرت امام حسین کے ساتھ میدان کرب و بلا میں حضرت علی کے جو بیٹے شہید ہوئے تھے کیا کوئی ان کے نام بتلائے گا۔ ہم ہی بتلاتے ہیں۔ ان کے نام یہ تھے ۔ حضرت ابوبکر بن علی، حضرت عمر بن علی، حضرت عثمان بن علی، حضرت عبداللہ بن علی، حضرت عبیداللہ بن علی۔ یہ سب شہید کربلا کے بھائی تھے جو ان کے ساتھ راہ حق میں ہمیشہ کے لیے امر ہوگئے۔ کیا دس محرم کو ہمیں یہ نام یاد رہتے ہیں؟۔ اس طرح حضرت علی ابن حسین زین العابدین کے فرزند حضرت زید بن علی ایک دفعہ پھر اپنے بزرگوں کی تاریخ دھرانے کے لیے کوفہ پہنچے تو چالیس ہزار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جب ان کا نمائندہ اہل سنت کے امام اعظم ، امام ابو حنیفہ کے پاس

پہنچا تو آپ نے ایک قیمتی جملہ ارشاد کیا تھا کہ ''خروجہ یضاھی خروج رسول اللہ علیہ وسلم یوم البدر'' زید بن علی کا اس وقت راہ حق کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ایسا ہے جیسے کائنات کے سردار حضرت محمد یوم بدر میں اٹھے تھے'' اور پھر امام اعظم کا قول سچ ثابت ہوا کہ چالیس ہزار کے متبعین ندارد، صرف 313 لوگ باقی تھے۔

حضرت امام حسن کو بھی زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ زہر کس نے دیا ہے۔ آخری حالات میں متعلقین نے اصرار بھی کیا مگر حضرت نے نام نہیں بتایا اور ارشاد کیا کہ '' جس پر مجھے شک ہے اگر وہی ہے تو اللہ جل وعلا کا انتقام کافی ہے اور اگر وہ نہیں ہے تو میرے بعد میری وجہ سے کسی بے گناہ کو تنگ کیا جائے یہ مجھے منظور نہیں''۔ یہی حضرت حسن پر زہر کا اثر زیادہ ہونے لگا تو اپنے بھائی حضرت حسین کو ام المؤمنین حضرت عائشہ کی خدمت میں بھیجتے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں کہ وہ ان کے گھر یں اپنے نانا حضور کریم کے قریب، گھر یں دفن ہونا چاہتے ہیں تو ام المؤمنین باوجود لڑائی جمل کے) بخوشی اجازت مرحمت فرماتی اور ایک تاریخ ساز جملہ ارشاد) کرتی ہے'' نعم وکرامۃ'' یعنی بڑے اکرام واعزاز کے ساتھ۔ حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی کے درمیان جو جنگ ہوئی وہ بہت معروف ہے۔ اس جنگ میں رومی بادشاہ نے حضرت علی کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہ کی مدد کرنی چاہا تو حضرت امیر معاویہ نے وہ

تاریخی جملہ کہا جو آج تک زبان زد عام ہے۔ حضرت معاویہ نے ارشاد کیا کہ '' اے رومی کتے! ہمارے اختلاف سے تم دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر تم نے حضرت علی کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو حضرت علی کی فوج کا پہلا سپاہی میں بنوں گا''۔

حضرت عمر نے تو اپنے قاتل تک کو معاف کیا۔ ابو لؤلؤ جو نصرانی غلام تھا، نے حالت نماز میں آپ کو شہید کیا۔ اس نے پہلے بھی خلیفہ وقت کو قتل کی دھمکی دی تھی مگر آپ نے کوئی انتقام نہیں لیا بلکہ احسان کا معاملہ فرمایا۔ حضرت علی نے بھی اپنے قاتل کے ساتھ بے حد رحم والا معاملہ کیا۔ ابن ملجم جو حضرت کا قاتل تھا ایک دفعہ اپنی کوئی حاجت لے کر حضرت علی کے پاس پہنچا تو حضرت نے اس کی حاجت پوری کر دی اور ارشاد کیا کہ '' یہی میرا قاتل ہے'' کسی نے کہا کہ آپ اس کو قتل کیوں نہیں کرا دیتے تو حضرت علی نے کیا خوبصورت ارشاد فرمایا'' فمن یقتلنی'' یعنی پھر مجھے کون قتل کرے گا۔ جب یہ شقی القلب نے حملہ کیا اور پکڑا گیا تو حضرت نے ارشاد کیا کہ ابھی اس کو کچھ مت کہو بلکہ '' واطیبوا طعامہ والینوا فراشہ '' اچھا کھانے کو دینا اور ملائم بستر دینا۔ اگر حملے میں، میں اللہ کا پیارا ہوا تو اسلامی قانون کے مطابق قصاصاً قتل کر دینا اگر میں روبہ صحت ہوا تو میں اپنے معاملے میں خود مختار ہوں گا۔ چاہے تو معاف کر دوں چاہے تو بدلہ لے لوں۔

تاریخ کے ادنی طالب علم کو یہ بات معلوم ہے کہ کفار مکہ نے اسلام کے ابتدائی دنوں میں آنحضرت کو بے انتہا تکالیف پہنچائی مگر فتح مکہ کے بعد آپ نے سب کو معاف فرما دیا اور ایک عظیم الشان جملہ ارشاد کیا'' لاتثریب علیکم الیوم، یغفراللہ لکم '' آج تم پر کوئی ملامت نہیں ۔ کوئی مواخذہ نہیں اللہ آپ کو معاف فرمادے۔آپ نے تو اپنے چچا کے قاتل کو بھی معاف فرمادیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ گستاخی جہالت کی علامت ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے کہ '' اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین'' کہ میں اللہ سے پناہ ڈھونڈتا ہو کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔مجھے میرے اکابر کی سوانح عمریوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمام تر علمی و سیاسی اور مذہبی اختلاف کے باجود انہوں نے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا۔گستاخی، استہزاء و ٹھٹھ سے حتی المقدور گریز کیا۔ یہ ان کی تواضع للہ تھا۔وہ اپنے معاندین کی بے قدری نہیں کرتے تھے۔میرے نزدیک موجودہ دور میں ہماری داخلی پستی وزوال کے بہت سارے اسباب کے ساتھ یہ بھی ہیں کہ نفس پرستی، فضول کی ضد وعنااور حسد، نام نہاد رسموں پر اصرار، توازن و اعتدال کا فقدان، نام نہاد خوش فہمیاں، شخصیت پرستی، تنگ نظری، لسانی، علاقائی اور مذہبی اختلافات، بالخصوص فروعی اختلافات کی پرزور تبلیغ۔ یہ وہ عناصر ہیں جنہوں نے ہمیں اندرونی طور پر کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے۔

یہاں ایک سچ سن ہی لینا مناسب ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اہل تشیع اور اہل سنت میں اختلافات ہزار سال سے چلے آرہے ہیں۔ یہ محال ہے کہ یہ دونوں فریق ایک ہوجائیں۔ اس اختلافی موضوع پر میرے سامنے ایران، عرب ممالک اور پاکستان وہندوستان سے شائع ہونے والی سینکڑوں کتب موجود ہیں۔ آج کے دور میں اس موضوع پر جتنا مواد عربی اور فارسی میں موجود ہے اتنا ہی اردو میں بھی موجود ہے۔ انگریزی میں بھی کافی مواد ملتا ہے۔ سی ڈیز، کیسٹس، اور موبائل کلپ اس کے سوا ہیں۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے مگر کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ ان تمام اختلافات کے باوجود معاشرتی زندگی ہمیشہ سکون کے ساتھ گزری ہے۔ برصغیر میں صدیوں تک فقہ حنفی کا راج رہا۔ تمام ریاستی فیصلے فقہ حنفی کے مطابق ہوتے رہے مگر اس طرح مذہب بلکہ مسلک کے نام پر قتل و غارت نہیں ہوئی جو بٹوارے کے بعد ہمارے ہاں در آئی۔ کیا ہم معاشرتی طور پر بھی سکون کے ساتھ نہیں رہ سکتے؟۔ یہ کتنا مقام افسوس ہے کہ ہم جن لوگوں کے مقدس ناموں سے قتل و غارت کا بازار گرم رکھتے ہیں وہ آپس میں بہت ہی محبت واحترام کا رواج رکھتے تھے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے۔ کیا ہم اپنا چہرہ اپنے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آؤ ذرا دیکھ ہی لیتے ہیں۔ اے گلگت والو! تم وہ ہیں جنھوں نے اسکردو میں انجمن اہل سنت کا مرکز اور قرآن پاک کو جلا کر خاکستر کردیا۔ تم نے گلگت اور مضافات میں بے گناہ لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین

کیے۔ بم دھماکے کر معصوم بچوں کی جان لی۔ کوہستان میں لوگوں کو شُوٹ کیا، لالو سر کی جھیل انسانوں کے خون سے سرخ کردیا۔ چلاس میں مسافروں کو اتار اتار کر پتھروں سے مارڈالا۔ اور اب کی بار تعلیم القرآن میں بے گناہ شہریوں کے ساتھ معصوم طلبہ کو بھی ذبح کردیا اور مسجد و مدرسہ کو جلا کر بھسم کردیا۔ تمہارا ضمیر تمہیں قرآن پاک جلانے سے بھی نہ روک سکا۔ اور اس کے نتیجے میں جو بے سکونی پورے ملک میں پھیلی ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ پورا گلگت بلتستان نوحہ کناں ہے۔ اپنے پتھر دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ کیا صدیق اکبر اور حیدر کرار کی یہی تعلیمات تھیں؟ کیا ان کی اولاد نے تمہیں یہی کچھ سکھایا تھا۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ کی دربار میں اتنی سی گزارش کرتا ہوں کہ تم بے شک جو ہے وہی رہو مگر خدارا انسان بھی رہو۔ اگر نہیں تو پھر میرے پیارے صدیق اکبر اور حیدر کرار کا نام بھی نہ لو۔ اور نہ ہی شہیدانِ کرب و بلا کا۔ وہ تو اسلام کی عظمت کے لیے کٹ مرے اور تمہیں پتہ ہی نہ ہو کہ انہوں نے کیوں قربانی دی تھی۔ ان مقدس ناموں کے واسطے آپ سے معاشرتی سکون اور بھائی چارے کی بھیک مانگتا ہوں۔ کیا یہ بھیک آپ مجھے دے سکوگے؟۔ خدارا۔ جوش کے بجائے ہوش سے کام لو۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

ارباب تعلیم وصحت سے

مجھے اکثر اپنی تحریروں پر فیڈ بیک موصول ہوتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک ای میل نے مجھے بے حد مغموم کر دیا۔ میرے ایک نوجوان فاضل دوست جو ہائی کوالیفائیڈ ہیں اور علم دوست ہیں اور ادب شناس ہیں۔ انہوں نے موجودہ نظام تعلیم پر بہترین قسم کی تنقید کی ہے اور اس کی ناکامیوں پر ایسی مضبوط گرفت کی ہے کہ دل ان کو دعائیں دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ تعلیم ہی کے ذریعے کسی بھی قوم نے ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ تعلیم گاہیں ایسی فیکٹریاں ہیں جہاں سے معاشرے کے دوسرے تمام کارخانوں، فیکٹریوں صنعتوں کو خام مال مہیا کیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی دنیا تعلیم کو ہی بنیاد بنا کر بام عروج پر پہنچا ہے۔ ایک معتمد سروے کے مطابق اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ پی ایچ ڈی اسکالرز ترکی میں ہیں۔ ترکی پر ایک الزام ہے کہ وہ مغرب پسند ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ ترکی میں ایک نظام تعلیم ہے اور ایک ہی نصاب تعلیم ہے اور اپنی قومی و مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہیں۔ ترکی کا ایک سکول ٹیچر امامت اور خطابت کے فرائض بھی انجام دے رہا ہوتا ہے جبکہ ہمارے پروفیسروں تک کو نماز

کا سبق درست تلفظ میں نہیں آتا۔ ہمارے ہاں تقسیم در تقسیم کے عمل نے ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا ہے۔انگریزی کو ماویٰ و ملجا سمجھنے والے قومی ومادری زبان سے اتنے دور ہوئے ہیں کہ اب وہ پیشاب بھی'' انگریزی'' میں ہی کرتے ہیں۔

ایک تعلیمی ورکشاپ میں مجھ سے پوچھا گیا کہ معاشرے کا سب سے مظلوم طبقہ کون ہے؟ میں نے بے دھڑک کہہ دیا کہ استاد، چاہیے دینی مدارس کا ہو یا سکول و کالجز کا۔

سامعین ورطہ حیرت میں رہ گئے۔ وضاحت طلب کی تو میری گزارشات یہ تھی کہ'' دیکھیں بھائی مدارس میں طلبہ کو آگے بڑھنے کے بے حد مواقع ہوتے ہیں۔ ان کا قیام و طعام اور تعلیم وتدریس کا سارا بندوبست مدرسہ کرتا ہے۔بڑے جامعات میں تو بھاری مد میں وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔کتابیں تک مدرسہ و جامعہ سے مل جاتیں ہیں، مگر مجموعی طور پر مدارس کے طلبہ ان مواقعوں سے فائدہ اُٹھانے سے رہ جاتے ہیں۔ وہ سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ رہی بات مدارس کے مہتمم حضرات کی تو ان کی پانچویں انگلیاں گھی میں ہوتیں ہیں۔ اور بے چارے اساتذہ دس دس پریڈ پڑھانے اور انتظامی وتربیتی فرائض انجام دینے کے باوجود بھی چار یا پانچ ہزار کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔کاش کوئی دل رکھنے والا انسان ان کے بارے میں سوچتا۔ کالج اور اسکول کے اساتذہ کی حالت بھی کوئی مثالی نہیں ہے۔ان کو دفتروں میں جس طرح ذلیل و خوار کیا جاتا ہے وہ کسی سے

مخفی نہیں ہے۔

اسی ورکشاپ میں ایک اور سوال داغا گیا کہ جناب ! سب سے زیادہ آسان کس محکمے میں نوکری حاصل کرنا آسان ہے؟ تو بھی میں بے دھڑک جواب دیا کہ محکمہ ایجوکیشن میں۔ یعنی استاد بننے کی نوکری۔ میں پورے گلگت بلتستان کی بات نہیں کروں گا، نہ کاچو فیاض کا حوالہ دونگا اور نہ ہی وہ حوالے جو محکمہ ہذا میں بھاؤ تاؤ کی شکل میں ہوتا ہے۔ میں صرف اپنے چھوٹے سے گاؤں کی بات کرونگا جہاں ایم اے،ایم ایڈ اور ایم اے بی ایڈ اور ایل ایل بی اور ایم اے اکنامکس جیسے ہائی کوالیفائیڈ لوگ پولیس میں بھرتی ہوئے ہیں اور میٹرک پاس لوگ دس دس سال کینٹین اور جنرل اسٹور چلانے کے بعد استاد لگے ہیں۔ اور ایسی ایسی لیڈی ٹیچر ہیں جو گلگت اور چلاس میں بیٹھ کر بھاری تنخواہ کھا رہی ہیں۔ ان کی تقرری گاؤں میں اس شرط کے ساتھ ہوئی ہے کہ وہ تین سال تک وہاں پڑھاتیں رہیں گیں۔ انہوں نے بھاری رقم دے کر اس شرط کو قبول کرتے ہوئے نوکری تو لے لیں مگر صرف ایک مہینہ ڈیوٹی دینے کے بعد ایفائے عہد سے مکر گئیں۔ اور کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ کاش ان کی جگہ وہاں کی مقیم استانیوں کو نوکری دی جاتیں جو گزشتہ کئی سال سے نوکری کی امید میں مفت پڑھاتیں رہیں۔ بالآخر وہ بھی دلبرداشتہ ہو کر اپنی راہ لیں اور ہوا نونہال بچیوں کو مستقبل برباد۔

آخر میں ایک اور سوال ہوا کہ سب سے معزز پیشہ کونسا ہے تو بھی میرا جواب تھا استادی۔ کیونکہ آقا نامدار سرورکائنات نے فرمایا ہے کہ '' انما بعثت معلماً'' یعنی میں معلم (استاد) بنا کر بھیجا گیا ہوں۔کاش آج کے استاد اپنی اس حیثیت کو سمجھتا اور معلّمی کے فرائض بخوبی انجام دیتا۔ جس طرح محکمہ ایجوکیشن کے اعلی احباب استاد کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں اس سے کئی گناہ بڑھ کر ایک استاد اپنی روحانی اولاد کے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ صرف چند لوگوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور یہ پوری قوم کا ستیاناس کرتا ہے۔

میں اتنی گزارش کرنے کی جسارت کرونگا کہ محکمہ تعلیم اور صحت کو '' موتی بازار'' بننے سے بچایا جائے۔ اگر میرٹ کی پامالی کرتے ہوئے رشوت اور سفارش کی بنیاد پر اساتذہ بھرتی ہوتے رہے اور ملاوٹ شدہ دوائیاں کھلے عام بکتی رہی اور ڈاکٹر ہسپتالوں کے بجائے کلینکوں میں غریبوں کو لوٹتے رہے تو معاشرے کی رہی سہی حالت بھی ختم ہو جائیگی اور ہمارے خرمن میں وہ دانہ بھی نہیں رہیگا جس کی وجہ سے ہم سانس لے رہے ہیں۔ اگر اس بیمار معاشرے سے روحانی و جسمانی غذا جو تھوڑی مقدار میں رہا ہے چھین لیا گیا تو اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ کاش میری یہ نحیف سی آواز اونچی گاڑیوں میں سفر کرنے اور اعلی شان کوٹھیوں میں رہائش پذیر وزیر تعلیم ، وزیر صحت اور محکمے کے دوسرے

صاحبان بست و کشاد تک پہنچتی اور وہ کشادہ دلی سے غور کرتے۔

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے شام غم مگر شام ہی تو ہے

اٹھو کہ بند کریں نفرتوں کے در سارے

20،19 اپریل کو قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی میں AKRSP اور PEN(Publishing Extention Network) کے اشتراک اور یونیورسٹی کے تعاون سے'' دو روزہ'' ایک پروگرام منعقد ہوا۔ منتظمین کی طرف سے'' اٹھو کہ بند کریں نفرتوں کے در سارے'' کے عنوان پر گلگت بلتستان کے تمام شعراء اور خطباء کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنا کلام اور تقاریر (Speachs) پیش کریں۔ تقریری مقابلے میں شرط یہ رکھی گئی تھی کہ گلگت بلتستان کے ہر ضلع سے ایک مقرر شرکت کرے گا مگر عملاً ضلع گلگت اور غذر سے زیادہ مقررین کو موقع دیا گیا۔ ضلع دیامر سے مجھے نمائندگی کا موقع ملا۔ میں نے تقریر کی، الحمدللہ ! مقابلے میں شرف حاصل ہوا۔ ڈاکٹر پروفیسر سہیل امام صاحب سے اعزازی شیلڈ اور کیش پرائز وصول کیا۔ میری تقریر کا لب ولباب کچھ یوں تھا۔

حمد و ثناء کے بعد: ومن یقتل مومنا متعمداً فجزاوہ جہنم خالدا، فیہا، وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعدلہ عذابا عظیما۔، قال النبی صل اللہ علیہ وسلم: لا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تناجشو ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا ولا تنابزو، وکونوا عباداللہ اخوانا۔

سامعین حضرات ! بابا چلاسی کی زبان میں آپ سے مخاطب ہوں۔ انھوں نے '' وعتصموا

بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا'' کو خوبصورت شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ سنیں

کہا رب نے کرو مت تم جدائی
اگر کی تم نے آپس میں جدائی
تمہاری پھر تو طاقت ختم ہو گی
تو کیا بے طاقتی میں ہے بھلائی
تو پھر باطل کو تم دے دو سلامی
کرو کفار کی دل سے غلامی
سلف کے نقش عزت کو مٹاؤ
کرو برباد ان کی نیک نامی

آج انتہائی اہم موضوع پر گفتگو کرنی ہے، آپ دعا کیجیے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں اس موضوع پر چند گزارشات پیش کر سکوں۔ چونکہ ہم امن کے حوالے سے بات کر رہے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ کے فرمان کو سامنے رکھیں گے، ماقبل میں قرآن و حدیث کو تلاوت کیا گیا۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ'' جو کوئی جان بوجھ کر اپنے کسی مومن بھائی کو قتل کرے گا، تو اس کا سزا دائی جہنم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر پھٹکار ہو گی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ نبی کریم کا بھی فرمان ہے کہ'' اے مومنو! ایک دوسروں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو، باہم حسد، کینہ، اور عناد نہ رکھو۔ بدگوئی نہ کرو اور ایسا

کرو کہ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ بہر صورت اسلام ایک مکمل دین حیات ہے۔ اس کی واضح تعلیمات کی ایک جھلک آپ نے سماعت فرمائی۔ اسلام نے ہر برائی سے بچنے اور ہر اچھائی کو اپنانے کو حکم دیا ہے۔

آج مغرب ' اس کے تھنک ٹینک ' ان کا میڈیا اور اسکالرز، اسلام اور اسلام پسند طبقات کو نفرتوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اور ہم بھی شعوری اور لاشعوری طور پر ان کی لے میں لے ملا رہے ہیں۔ جو دار اصل غلط ہے۔ اسلام نے تو امن کو سب سے مقدم رکھا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی دعا تو دیکھیں جو قرآن میں موجود ہے۔ ''رب اجعل ہذا البلد آمنا ورزق اہل من الثمرات'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امن کی بات پہلے کہ اور معیشت کی بات بعد میں کی۔ کیونکہ کہ جب تک امن نہیں ہوگا زندگی کا کوئی شعبہ پھل پھول نہیں سکتا۔ امن کے بغیر نفرتوں کے سارے در بند کرکے محبتوں کے در کھلے رکھنا محال ہے۔ امن کے بغیر زندگی کا کوئی پہیہ چل نہیں سکتا۔ کاروبار زندگی چلانے کے لیے امن سب سے اولین حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ فرقہ واریت پھیلانے میں اندرونی عوامل کے ساتھ اصل ذرائع و عوامل بیرورنی ہیں۔ ان میں ایک اسلام اور مسلم دشمن بین الاقوامی طاقتیں اور دوسرے ان کے گماشتہ مقامی حکمران اور ان کی ایجنسیاں۔

بین الاقوامی طاقتوں کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ '' الکفر ملۃ واحدۃ'' ہمیں کبھی بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمانوں کے اندر بالخصوص پاکستان اور گلگت بلتستان کے اندر بدآمنی میں ان بیرونی عوامل کا کوئی کردار نہیں ہے۔ مختلف واقعات و شواہد اور ذمہ دار لوگوں کے بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ ان عوامل نے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نفرتوں کے در بند کیسے کریں اور محبتوں کے دریچے واہ کیسے رکھیں۔ مجھے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات اور ارباب بست وکشاد' ملک عزیز کے غریب اور اسلام پسند عوام اور بالخصوص گلگت بلتستان کے محب وطن عوام کو انتہا پسند، ترقی کی راہ میں رکاوٹ، دہشت گرد، گنوار جاہل، بدتہذیب، نفرتیں پھیلانے والے اور محبتوں کی راہوں میں رکاوٹ سمجھتے ہیں،، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل مترادف ہے۔ ان تمام باتوں کے اصل مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے اسباب وعلل اور محرکات کا عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک '' سیاسی کینسر '' کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جو بنیادی انسانی حقوق سے محرومی، ظلم وستم کی انتہا (یعنی بربریت' چنگیزیت 'اوباميت اور پرونزیت و زرداریت) ، میرٹ کی پامالی اور بے انتہا کرپشن، اقرباء پروری، رشوت خوری، علاقائیت، لسانیت، بیروزگاری، آئین شکنی، جمہوری اقدار کی پامالی، اسلامی تعلیمات سے

دوری اور ان جیسے خوفناک مسائل کی وجہ سے مغلوب ' محکوم ، مظلوم اور مفلوک الحال لوگوں کے اندر از خود پرورش پاتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے ' ان مظلوم لوگوں کا تعلق کسی بھی مذہب ' علاقہ یا رنگ و نسل سے ہوتا ہے ' پوری دنیا ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس '' سیاسی کینسر '' کا علاج مریض کو دھمکانا، ڈرانا، لعن و طعن اور سب و شتم کرنا اور ان کے گھروں کو اڑانے سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی مسلسل محرومیوں اور معاشرتی ناانصافیوں کے ازالے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ اگر ان حقیقی مسائل کو نظر انداز کرکے غریب عوام کو دھونس دھمکی ' جبر و اکراہ سے زیر کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ '' سیاسی کینسر '' دبنے اور ختم ہونے کے بجائے مزید قوت حاصل کرے گا اور توانا ہوگا اور اس کا رد عمل شدید سے شدید تر ہو جائے گا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ محب وطن عوام اور اسلام پسند طبقات کے ساتھ دوغلا رویہ اپنایا جا رہا ہے جس سے شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے قول اور فعل میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ '' یایھا الذین اٰمنوالم تقولون مالاتفعلون '' اے ایمان والو ! وہ کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ کیا آج ہمارے ارباب اقتدار اس کی کھلی مثال نہیں ہیں ؟۔

آج علماء کرام، جدید تعلیم یافتہ طبقات اور دانشورانِ قوم کی اہم ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بتائیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان پھیلائی جانی والی نفرتیں دراصل بدترین منافقت پر مبنی ہے، آج ہمیں غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح بتانا ہوگا۔ جب تک ہمارے اندر سچ اور حق بولنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو تب تک ہمارے معاشرے میں سکون اورامن نہیں آسکتا۔ ہمارا پورا معاشرتی ڈھانچہ بیٹھ جائے گا۔ آج اصحاب علم ہی کو آگاہی اور روشنی کا باب کھولنا ہوگا۔ انہیں بتانا ہوگا۔ یہی قرآن کا حکم بھی ہے۔ سورۃ المائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ '' لولا ینھٰھم الربانیوں والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت ''۔

آو! ہم سب مل کر نفرتوں کے دروازے بند کریں اور محبت عام کریں مگر کیسے تعلیم عام کرنے سے، ظلم کے خلاف بغاوت کرنے سے، گڈ گورننس سے، میرٹ کی بحالی سے، اقربا پروری، رشوت ستانی سے دور بھاگ کراوردین اسلام کی روشنی سے محبت ومودت کے باغ اگائیں اور نفرت کی تمام فیکٹریاں دریا برد کریں۔ بہر صورت ان اشعار کیساتھ آپ سے اجازت چاہونگا.

تمہارے سود کی خاطر حقانی، آج ہے گویا
خدارا! تم کہو یہ ،اور تم سے چاہتا ہے کیا
حقانی کو نہ دے دو کچھ بھی لیکن

الگ اس کو محبت سے نہ کرلو

کیا یونیورسٹی کو تالا لگا دیا جائے؟

گلگت بلتستان کے کالجز میں شاید میں کم عمر لیکچرر ہوں۔ مجھے اہل علم سے مباحثہ کرنے کا بڑا شوق ہے۔ میں اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے اپنے بزرگ پروفیسروں کے ساتھ ہمیشہ الجھتا رہتا ہوں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ سینکڑوں صفحات کے مطالعہ سے زیادہ اہل علم کی چند نشستوں سے معلومات اور علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھار محفلِ یاراں میں کوئی سوال داغ کر ان اساتذہ کرام کی لڑائی بڑے شوق سے دیکھتا ہوں جو میرے سوال کے بعد وجود میں آجاتی ہے۔ وہ اس علمی لڑائی میں تمام تر قوت کے ساتھ اپنے دلائل اور پسند اور ناپسند کو خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انہی میں ایک بڑا نام پروفیسر بشیر ہنزائی کا ہے۔ وہ بانگ دہل بات کرنے کے عادی ہیں۔ دو سال پہلے قراقرام یونیورسٹی کے قیام پر ان سے میں الجھتا رہتا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ مشرف نے یونیورسٹی کو قبل از وقت منظور کیا۔ ہم لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ہمیں یونیورسٹی دی جائے۔ ہمیں ابھی تک ذہنی بلوغت حاصل ہی نہیں ہوئی، ہم علمی حوالے سے میچور ہی نہیں ہوئے تو ہم خاک علمی درسگاہوں کی قدر کریں گے'' ۔ میں ان سے کسی صورت اتفاق نہیں کرسکتا تھا، میں عرض کرتا کہ سر جی ! آزاد کشمیر رقبے کے لحاظ سے ہم سے سات گناہ کم ہے مگر وہاں چھ ساتھ یونیورسٹی کام کررہی ہیں، آزاد کشمیر یونیورسٹی کے کئی کیمپس ہیں، ہماری طرح وہ بھی آئینی

علاقے نہیں مگر وہاں تعلیمی رجحان بہت زیادہ ہے۔ خیر گلگت کے لوگوں کے حوالے سے میرے پاس معلومات کم تھی۔ میں تو اپنے جذبے کی بنیاد پر جو کچھ سمجھتا تھا اس کو برحق سمجھتا تھا۔ دو سال کے طویل عرصے میں مجھے گلگت میں جو کچھ دیکھنے اور سمجھنے کو ملا، اب اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ واقعی ہم لوگ اس قابل نہیں کہ ہمیں ''جامعہ'' جیسا کوئی ادارہ دیا جائے۔ قراقرم یونیورسٹی کی عمر صرف گیارہ سال ہے۔ اس کے قیام سے گلگت بلتستان کے نوجوانوں کی بڑی امیدیں وابستہ تھی مگر افسوس کہ ہمارے ہی سیاسی و مذہبی لوگوں نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یونیورسٹی میں بہت ہی کم ڈیپارمنٹ ہیں۔ مگر پھر بھی غریب لوگوں کو اعلیٰ تعلیم ان کے گھر میں میسر آ گئی ہے۔ کیا یہ نعمت عظمیٰ سے کم ہے۔ میں یہ سچ بیان کرنے سے قطعاً نہیں شرماؤنگا کہ قراقرام یونیورسٹی کو ابھی تک اہل سنت و اہل تشیع نے تسلیم ہی نہیں کیا۔ ہمارے دونوں مسلک کے لوگ مختلف اوقات میں یونیورسٹی کے خلاف سرگرم رہے ہیں، میں ہزار زاویوں سے سوچنے کے بعد بھی نہ سمجھ سکا کہ آخر ہمارے لوگ ہاتھ دھو کر اس یونیورسٹی کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے سیاسی و مذہبی لیڈروں کے بیانات سن کر میں مبہوت رہ جاتا ہوں کہ آخر یہ لوگ قوم کو کس طرف لے جارہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو یونیورسٹی میں دمادم مست قلندر ہوگا۔ کوئی صاحب اٹھتا ہے اور یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا مژدہ سنا دیتا ہے۔ کوئی صاحب یونیورسٹی کو فحاشیوں کا اڈہ خیال کرتا ہے۔اور

دکھ اس بات کی ہے کہ بظاہر بڑے خوبصورت علمی نام والی سیاسی پارٹیاں اور مذہبی انجمنیں یونیورسٹی کو تالا لگانے کے آپشن پر غور کر رہی ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ ہم پر اللہ کوئی عذاب نازل نہ فرمادے۔ ہم نے مساجد پر تو تالے لگا کر خدائی عذاب کو دعوت دی ہے۔ اب گلگت بلتستان کی اکلوتی نابالغ یونیورسٹی پر بھی تالا لگانے کا سوچ رہے ہیں۔ ہمارے یہ جاہل لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ یونیورسٹی ایک آئینی اور خودمختار ادارہ ہوتا ہے۔ اور وی سی کے عہدے کو بھی آئینی تحفظ حاصل ہے۔ یونیورسٹیوں کے تمام فیصلے سنڈیکیٹ کرتا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ایک خودمختار ادارہ ہوتا ہے۔ مگر ہمارے سیاسی لوگ صرف اور صرف اپنے مفاد کی خاطر قراقرم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے خلاف سازشیں بنتے ہیں اور اخباری بیانات جاری کرتے ہیں۔ میں موجودہ وی سی کی بات نہیں کر رہا ہوں، ہمارے افلاطونی دانشوروں نے تو کے آئی یو کے کسی وی سی کو معاف نہیں کیا۔ ہمارے ان لیڈروں کی اوقات صرف اتنی سی ہے کہ اگر یونیورسٹی میں ان کا کوئی گریڈ ون بھرتی ہوجائے، یا ان کا کوئی رشتہ دار کلرک لگا دیا جائے تو یہ لوگ یونیورسٹی کے گن گانے لگتے ہیں، اگلی دفعہ ان کی کوئی سفارش قبول نہیں کی جاتی ہے تو ان کو پوری دنیا کی خرابیاں قراقرم یونیورسٹی میں نظر آتی ہیں۔ یہ اس قوم کے ساتھ عظیم مذاق ہے۔ قراقرام یونیورسٹی کا ایک کیمپس دیامر میں تعمیر ہونا تھا جو تاحال نہ ہوسکا۔ ان حالات میں اس کا توقع بھی عبث ہے، گوہرآباد کے عوام نے جس طرح کیڈٹ کالج

کے لیے ایک ہزار کنال زمین مفت میں دی ہے اس طرح کے آئی یو کو بھی آفر کریں کہ وہ دیامر گوہرآباد میں کیمپس تعمیر کرے۔ بلتستان میں کیمپس قائم ہو چکا ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ مین کیمپس کہیں بلتستان کو نہ بنا دیا جائے۔ کیونکہ گلگت میں آئے روز کے فتنوں سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا گیا تو یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہوگا۔ اس کے بعد تو گلگت کے شیعہ سنی کفِ افسوس ہی مل سکتے ہیں۔ مگر آج کل یہ دونوں فریق قولاً و فعلاً اس کے لیے ماحول سازگار کر رہے ہیں۔

قراقرم یونیورسٹی کے حوالے سے ہماری لوکل انتظامیہ اور صوبائی کابینہ کے خیالات بھی حد درجہ مایوس کن ہیں۔ لوکل انتظامیہ کو ہر حال میں اپنی رٹ قائم کرنی ہوگی۔ لاء اینڈ آرڈر کا رواج بھر طریقے سے ڈالنا ہوگا۔ منافقت پر مبنی اس روش سے حالات سازگار ہونے کے بجائے مزید الجھ سکتے ہیں۔ ہاں یونیورسٹی انتظامیہ کو بھی اپنے طرز عمل پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کہیں ان کے غیر سنجیدہ فیصلوں کی وجہ سے حالات اس نہج تک تو نہیں پہنچے ہیں۔ آئے روز اپنے ہی فیصلوں پر نظر ثانی کی وجہ سے کہیں ایسا تو نہیں ہو رہا ہے۔ اگر سنڈیکیٹ نے ایک فیصلہ کیا ہے تو پھر تمام تر قوت کے ساتھ اس پر ڈٹ جانا بھی چاہیے۔ لوکل انتظامیہ اور سیاسی لیڈروں کا دباؤ کسی صورت قبول نہ کیا جائے۔ یونیورسٹی کے حوالے سے لوگوں کو سخت قسم کی شکایات ہیں۔ قراقرم یونیورسٹی کسی فرقہ، مسلک، علاقہ، سیاسی پارٹی یا فرد واحد کی ملکیت نہیں

یہ گلگت بلتستان کے غریب عوام کا قومی اثاثہ ہے،اس اثاثے کی حفاظت کے لیے بے ، قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کے تمام راستے روکنے ہونگے۔ میرٹ کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔ حق دار کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ ذاتی پسند اور ناپسند کے بجائے باصلاحیت افراد کو آگے بڑھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ میری یونیورسٹی انتظامیہ سے درمندانہ اپیل ہے کہ اپنے اوپر ہونے والے تمام اشکالات کا سنجیدہ گی سے جائزہ لیں اور ان تمام خدشات کو دور کریں جو یونیورسٹی کے حوالے سے ایک مخلص انسان کے دل و دماغ میں پائے جاتے ہیں۔ سنڈیکیٹ کو ایک موثر ادارہ بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ اور ان سیاسی لیڈروں کی سفارش پر کوئی گریڈ ون بھی بھرتی نہ کریں جو اگلے دن یونیورسٹی کے خلاف زہر اگلتے ہیں،کے آئی یو کے اندر ہی ایک لابی یونیورسٹی کو بدنام کرنے کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دی رہی ہے۔ یہ ٹیم ہے تو مختصر مگر پراثر ہے۔مجھے حیرت ہے کہ آخر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔جس ادارے نے انہیں پہچان دی، بھاری بھر کم معاوضہ دیا پھر بھی ہاتھ دھو کر اس علمی درسگاہ کے پیچھے پڑنا عقل و خرد سے ماورا ہے۔

کسی بھی یونیورسٹی پر لازم نہیں کہ وہ مذہبی بلکہ مسلکی پروگراموں کا انعقاد کرے۔اور نہ ہی مذہبی پروگراموں کے لیے یونیورسٹیاں بنائی جاتی ہیں،کے آئی یو کے قیام سے پہلے بھی اسلام تھا اور بعد میں بھی ہے، حسین اور

عمر کی عظمت اور مرتبہ کے آئی یو کے اندر پروگرام کرنے اور نہ کرنے پر منحصر نہیں، وہ عظیم بلکہ بہت عظیم ہیں۔ ہم جیسے جاہل، اجڈ، گنوار اور کم عقل لوگ ان کی عظمت وقربانی کو کیا جان سکتے ہیں۔ ہم تو ان کے نام پر آپس میں لڑنے کا سامان کر رہے ہیں۔ اگر وہ عظیم ہستیاں زندہ ہوتی تو ہر گز ہر گز ہمیں اس طرح کی بچگانہ حرکتوں کی اجازت نہ دیتیں۔ کاش کوئی ان کے فلسفہ قربانی کو سمجھتا۔اے کاش۔ گلگت بلتستان کے قریہ قریہ میں پھیلی فرقہ واریت کی آگ سے کے آئی یو کو بچانا ہم سب کی ذمہ داری ہے،اس نومولود یونیورسٹی کو سیاسی ومذہبی آماجگاہ بنانے کے بجائے تعلیمی و تحقیقی ادارہ ہی رہنے دیا جائے تو سب کا بھلا ہے۔ہمیں یہ سادہ سی بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی ہے کہ یونیورسٹیاں تحقیق وتدقیق اور فکر و نظریہ اور علم و ادب کی آبیاری کرتیں ہیں۔ یہاں نہ نماز جمع ادا کیا جاتا ہے اور نہ ہی بزرگان دین پر پروگرام کیے جاتے ہیں۔ اگر کیے بھی جائے تو اتفاق و اتحاد اور صبر و تحمل سے کرنے کی گنجائش ہے مگر اس دینی پروگرام کی شرعی حیثیت کیا ہوگی جس کی وجہ سے کئی بے گناہ لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے؟ ہمارے مذہبی نیتاؤں کو اس بارے بھی غور کرنا چاہیے۔ میرے ناقص علم کے مطابق متنازعہ زمین پر تو نماز جیسی اہم عبادت بھی مقبول نہیں، اور جہاں انسانیت کی جان و مال کے ضیاع کا خطرہ ہے، کیا وہاں کسی دینی پروگرام کے انعقاد کی شرعی گنجائش نکل سکتی ہے؟ میری کے آئی یو کے تمام طلبہ وطالبات سے بھی گزارش ہے کہ اپنی اس مادر علمی کو صاف

ستھرا رکھو۔ مسلکی الائشوں کو کھینچ کر یہاں مت لاؤ، یہ تم سب کا مشترکہ گھر ہے۔ آگ لگاؤ گئے تو سب کا گھر جلے گا۔ مت گھراؤ اس گھر کو اس میں نقصان تم سب کا ہے۔ تم نے مقابلہ ہی کرنا ہے تو علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کے میدان میں کود جاؤ، یہی پورے علاقے کے لیے بہتر ہے اور تمہارا کیریئر بھی مضبوط ہوگا۔ آنے والے کل آپ کو اپنے علاقے اور مسلک کی خدمت کا موقع بھی ملے گا۔ کاش یہ پھیکی پھیکی باتیں آپ کو متاثر کرسکیں۔ اللہ نے قراقرم یونیورسٹی کی شکل میں تمہیں ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ودیعت میں دیا ہے۔ تم اس بیں لڑائی جھگڑے کے بجائے علمی و فلسفی مباحثوں کا آغاز کرو، علم و ادب کا رواج ڈالو، تحقیق و تصنیف اور تعلیم و تعلم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناؤ، نظریات و افکار کی آبیاری کرو، انقلابی سوچ کو لے کر آگے نکلو۔ 28 ہزار مربع میل پر پھیلے اس صحرا میں کے آئی یو کی شکل میں ایک ننھا پودا اگا ہے۔ اس کو جڑ سے اکھیڑنے کے بجائے شفاف پانی سے سیراب کرو۔ اور بچو! ان لوگو سے جو اس ننھے پودے کو بموں سے اڑانا چاہتے ہیں اور اس کی تالہ بندی کی میٹنگیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز آپ کے دوست نہیں اور نہ ہی علم و ہنر کے دوست ہیں۔

قومی یکجہتی اور ہماری حالت زار

جب ہم نے لکھنا شروع کیا تو موضوعات کے چناؤ میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔ پھر جن موضوعات پر لکھنے کی ٹھان لیتے وہ مشکل معلوم ہوتے، مگر اب موضوعات کی اتنی کثرت ہے کہ انسان کس موضوع پہ لکھے۔ ہر موضوع قلیل کے بجائے کثیر کا متقاضی ہے۔جب بھی کچھ لکھتا ہوں تو مختلف پیغامات موصول ہوتے ہیں کہ وہ موضوع پر بھی لکھا جائے۔یہ ایشو بھی تو بہت اہم ہے آپ کیوں اس پہ نہیں لکھتے۔ ہمارے ایک رائٹر دوست کی تجاویز تو کافی ساری ہوتیں ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ کے ۔ کے۔ایچ کی سکیورٹی سب سے اہم مسئلہ ہے۔ کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ سماجی ناانصافی پہ زیادہ سے زیادہ لکھا جائے۔ میرے طلبہ کے سوالات و اشکالات سب سے نرالے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کا اصرار ہوتا ہے کہ ملالہ یوسفزئی پر اپنے خیالات پیش کروں۔ کوئی اسلامی ریاستوں میں نظام تعلیم وتربیت اور ادب و ثقافت کی جانکاری چاہتا ہے۔اور بہت سارے ایسے اسٹوڈنٹ بھی ہیں جو کلاس میں صرف اس لیے تشریف لاتے ہیں کہ ہماری چکنی چپڑی باتیں انہیں اچھی لگتی ہیں، ان کا صاف کہنا ہے کہ ہم ان کے ذوق کے مطابق لیکچر ڈیلور کرتے ہیں۔یعنی کتابی لیکچر سے زیادہ ادبی پھلجڑیاں، علمی نوادرات، معاشرتی ناسور، قومی یکجہتی پر اسلامی معلومات اور کیریئر پلاننگ کے حوالے سے انہیں اکسانا

اور بالخصوص عشق و محبت اور شادی بیاں کے حوالے سے دلچسپ معلومات، اساطیر اور لطائف۔ سچ ہے کہ میں کلاس میں پڑھاتا کم ہوں ہنساتا اور رُلاتا زیادہ ہوں۔ یہ حکمت میں نے اپنے استاد ڈاکٹر منظور احمد مینگل سے طویل رفاقت کے بعد سیکھا ہے۔آج ہم قومی یکجہتی اور اپنی حالت زار کو مختصراً ڈسکس کرتے ہیں۔ ہمیں یہ موضوع دیگر موضوعات سے اہم اور اچھوتا لگا۔

دس دسمبر کو ڈگری کالج سے سیدھا کے آئی یو کی طرف روانہ ہوا۔ اللہ اللہ کرکے کے آئی یو کے مرکزی گیٹ تک پہنچ پایا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ اتفاق سے میرا ہی 4th year کا ایک اسٹوڈنٹ بھی کے آئی یو جارہا تھا۔ بہر صورت ہم یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بجائے یونیورسٹی کوسٹر میں بیٹھ کر سیدھا گھر پہنچ گئے۔ پھر ذمہ دار لوگوں کے نمبر کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ حالات کچھ دگرگوں ہے۔یونیورسٹی انتظامیہ نے محرم الحرام میں یوم حسین منانے کا فیصلہ کیا تو نااہل لوکل انتظامیہ نے سختی سے منع کیا اور خبردار کیا کہ جو بھی حرکت کرے گا اس کے خلاف سخت قانونی ایکشن لیا جائے۔پھر یونیورسٹی کی سینٹ کمیٹی نے نوٹیفیکشن کیا کہ یونیورسٹی میں کسی قسم کا پروگرام کی اجازت نہیں ہوگی۔ مساجد بورڈ، پارلیمانی امن کمیٹی نے بھی لوکل انتظامیہ اور یونیورسٹی کے نوٹیفکیشن اور فیصلے کی تائید کی۔ اب سکھ کا سانس لیا جانا چاہیے تھا مگر اخباری

بیانات نے مزید الجھاؤ پیدا کیا۔ دونوں فریق تیز و تند بیانات کے ذریعے ایک دوسروں کو لتاڑ رہے تھے۔ پروگرام کے انعقاد اور عدم انعقاد کو اسلام اور کفر کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ میرا جیسا طالب علم حیران تھا کہ اسلام تو اس یونیورسٹی کے قیام سے پہلے بھی موجود تھا مگر..... دس دسمبر کو یونیورسٹی میں اچانک پروگرام شروع کیا گیا۔ طلبہ و طالبات اور یونیورسٹی عملے کو فوری یونیورسٹی خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔ حیرت ہوئی کہ بیس منٹ میں پوری یونیورسٹی خالی تھی۔ انتظامیہ نے پولیس کی بھاری نفری متعین کی تھی تاکہ پرامن طریقے سے یہ پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ ادھر گھڑی باغ اور چنار باغ کے پاس روڈ بلاک کر دیے گئے۔ جب پروگرام کے انعقاد کے بعد لوگ منتشر ہوئے، ادھر احتجاجی گروپ بھی گھروں کو سدھار گیا تو پھر پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آ گئے۔ پھر اگلے دن مشاہدہ میں آگیا کہ پوری یونیورسٹی کے ادھر گرد پولیس کے سپاہی چوکس نظر آئے۔ رینجرز اور اسکوٹ کے جوان بھی الرٹ تھے۔ سبحان اللہ۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اب ان کا چوکس ہونا چہ معنی دارد۔ اب تو جو ہونا تھا پرامن طریقے سے ہوگیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو مزید بدامنی پیدا کرنے کا موقع فراہم کیا جائے، اگلے دن یونیورسٹی میں معمول کے مطابق تمام امور انجام دیے جا رہے تھے مگر یونیورسٹی کے دائیں بائیں فوج ظفر موج تھی۔ کیا یونیورسٹی عملہ یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں کہ یہ چوکس لوگ کسی کام کے نہیں۔ میرے خیال میں اس معاملے کو

یہی دبنا چاہیے، مزید الجھانا غیر ضروری اور غیر مفید ہے. یونیورسٹی کو یونیورسٹی ہی رہنے دیا جانا چاہیے نہ کہ اس کو سیاسی، مذہبی اور ذاتی اکھاڑہ بنایا جائے۔ کیا مغرب میں بھی اس کے عوام اور سیاسی لیڈر یونیورسٹیوں اور ان کے عملے کو اس طرح یرغمال بنا لیتے ہیں جیسے ہم نے بنایا ہوا ہے؟ کیا وہاں بھی یونیورسٹیوں کے دائیں بائیں قانون نافذ کرنے والے لوگ الرٹ رہتے ہیں؟ میری اطلاعات کے مطابق تو جنگ عظیم دوم میں برطانیہ اور جرمنی کے مابین طے ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے تعلیمی اداروں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور جو بھی ان یونیورسٹیوں میں پناہ لے گا اس کو امان دیا جائے گا۔

میں جب بھی ان حالات کو دیکھتا ہوں تو دل برداشتہ ہو جاتا ہوں۔ ہمارے ہاں مثال کا قومی انتشار پایا جاتا ہے۔ ہمارے ان رویوں سے ملک ابھی تک مستحکم نہیں ہو سکا اور نہ آئندہ ہمارا ملک خوشحالی کی راہ پر گامزن دکھائی دیتا ہے۔ ہم پورے ملک کی تو کیا بات کریں ہمیں تو گلگت بلتستان کے حالات سلجھتے نظر نہیں آتے۔ گلگت بلتستان کی تباہی و تنزلی میں دیگر عوامل کے ساتھ اندورنی خلفشار، آپس کی منافرت اور اور علاقہ پرستی و زبان پرستی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ گلگت بلتستان میں قومی یکجہتی کے لیے عدل و انصاف، مابین اشتراک و تعاون، تہذیبی و ثقافتی، ادبی اور صحافتی یکسانیت اور ایثار و محبت

انتہائی ضروری ہے مگر ان تمام باتوں کا یہاں شدید فقدان ہے۔ دیامر بھاشا ڈیم کی رائیلٹی، نوکریوں کی تقسیم اور کے۔کے۔ ایچ کی سکیورٹی میں بھرتیوں کے بارے میں جی بی کونسل اور ممبران اسمبلی کے خیالات دیکھو تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کس طرح سوچتے ہیں۔ اس ماحول میں ہم عوام اور دوسرے طبقات کو کیا الزام دیں۔ جو مسیحا ہیں وہی تمام خرابیوں کی جڑ ہیں۔ لاریب گلگت بلتستان گوناگوں مسائل کا شکار خطہ ہے۔

یہاں معاشی، تعلیمی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور عسکری مسائل مگرمچھ کی طرح منہ کھولے ہوئے ہیں۔ سچ ہے کہ پورے خطے کا مستقبل تباہی کے دھانے پر ہے۔ عوام الناس تذبذب اور مایوسی کا شکار ہیں مگر ہمارے ارباب حل و عقد اور تعلیم یافتہ طبقہ بے خبر اپنے ذاتی مفادات کی جنگ میں دست و گریباں ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں علاقہ اس امر کا متقاضی ہے کہ تمام طبقات علاقائی تحفظ، اس کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے ذاتی مفادات کو دریابرد کرتے ہوئے ایک عظیم نصب العین کے لیے متفق ہوجائیں۔ عظیم نصب العین کی خاطر، بیوروکریسی، لوکل انتظامیہ، عوام و خواص اور تمام سیاسی و مذہبی گروہوں کو ایسے دوٹوک اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جن سے قومی یکجہتی فروغ پاسکے۔

گلگت بلتستان کے موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک عمرانی معاہدہ تشکیل دیا جائے اور اس پر سختی سے عمل درآمد

کروایا جائے۔اگر نیا عمرانی معاہدہ تشکیل دینے میں دشواری ہے تو 2005ء کے امن معاہدہ اور 2012ء کے مساجد ایکٹ کو تمام تر قوت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ان پر عمل درآمد کی صورت میں گلگت بلتستان امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔اگر امن کا گہوارہ نہ بھی بنے تو یقینا پورے علاقے میں امن و سلامتی اور سکون و اطمنان کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے اور یہ ایک اچھے معاشرے کے لیے پیش رفت ہوگی۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی بھی قوم،علاقہ اور ریاست اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہاں پوری قومی یکجہتی نہ ہو اور اس کے نظریہ اور عمل میں ہم آہنگی نہ ہو۔کیا گلگت بلتستان میں قومی یکجہتی ہے؟اور قول و عمل میں مطابقت ہے؟ ہم نے اتنی مشکلات کے بعد امن معاہدہ اور مساجد ایکٹ بنائے مگر خود ہی کمال مہارت سے اس کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔آج اگر وفاق میں ہماری شنوائی نہیں ہوتی۔ الحمراء ہال لاہور میں منعقدہ عالمی ادبی و ثقافتی کانفرنس میں ہمیں نمائندگی نہیں دی جاتی۔ہمارے صحافیوں کو کوریج تک سے روکا جاتا ہے۔ہمارے وزیر اور مشیر سیکٹرز کے دفتروں میں خوار ہوتے ہیں۔ہمارے بارے میں فیصلے کرتے وقت ہم سے نہیں پوچھا جاتا ہے تو اس کا واحد ذمہ دار ہم خود

ہیں۔کیوں؟ کیونکہ علاقوں اور برادریوں میں بھی اس علاقے اور برادری کو قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو اندرونی طور پر یکجا ہو،مستحکم ہو۔ مقاصد اور نصب العین ایک ہو۔کیا گلگت بلتستان کے عوام یکجا ہیں،ہمارا علاقہ مستحکم ہے؟ ہمارے مقاصد اور نصب العین یکساں ہیں؟

یقیناً نہیں۔ کیا کبھی تعلیم ہمارا مقصد اجتماعی رہا ہے؟ ہم نے تو اکلوتی یونیورسٹی کو بھی مذہبی اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ ہم نے تعلیم و تعلم کے بجائے پروگرام کے انعقاد اور عدم انعقاد کو اپنی ترجیحات میں اولین جگہ دی ہیں اور اس کو دین اسلام کا جز لاینفک تسلیم کیا ہوا ہے۔ کیا معاشی انقلاب، سماجی بہتری، عدل کا قیام، میرٹ کی بحالی، امن کی آشا ہماری ترجیحات میں شامل ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنی محرومیوں کا قصوروار کسی کو گردانے اور خود بری الذمہ ہو جائے۔

آج قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے معاشرے کے ہر طبقے کو کردار ادا کرنا ہوگا۔ ان تمام عوامل کو ختم کیا جانا چاہیے جنھوں نے قومی یکجہتی کے عمل میں رخنہ ڈالا ہوا ہے، علاقائی منافرت، لسانی جھگڑے، مسلکی اختلافات، تعصب، حسد، کینہ، عداوت کی جب تک بیخ کنی نہ کی جائے ہم ترقی کی راہ پر کبھی بھی گامزن نہیں ہو سکتے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

میں اسماعیلیوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں

پوری دنیا کی طرح پاکستان اور گلگت بلتستان میں بھی اسماعیلی کمیونٹی اقلیت میں ہے۔ مگرانتہائی منظم ہیں۔ان کے حوالے سے میں نے کافی '' علمی اسٹڈی'' کی ہے۔آج میں نے نہ ان کے عقائد کو زیر بحث لانا ہے اور نہ دیگر مسالک کے ساتھ ان کے علمی و نظری اختلافات کی بحث چھیڑنی ہے۔میں آج اسماعیلی کمیونٹی کو قبل از وقت بلکہ بہت ہی پہلے مبارک باد پیش کرنے چلا ہوں۔یہ میری پیش گوئی ہے۔میں ہواؤں میں گھوڑے دوڑانے کا قائل ہوں نہ ہی قیافہ شناس ہوں، اور نہ ہی علم نجوم کا ماہر۔ تاہم قوموں کی تاریخ اور معاشرتی زندگیوں کے عمیق مطالعہ سے کچھ نتائج اخذ کرکے یہ پیش گوئی کرنے میں حق بجانب ہوں۔میں اپنی بات پر مصر ہوں نہ ہی اسے حرفِ آخر سمجھتا ہوں۔عمرانی زندگیوں کے مطالعہ سے جو منظر مجھے سمجھ آیا ہے صرف وہی آپ سے شیئر کرتا ہوں۔آپ مجھ سے مکمل اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔میں مایوس ہرگز نہیں ہوں مگر حقیقت سے انکار بھی تو نہیں کرسکتا۔زمینی حقائق کو جھٹلانا اپنے ساتھ ظلم سے کم نہیں۔

اس میں دو رائے نہیں کہ آنے والا کل اسماعیلی برادری کا ہے۔مجھے ان کا ایک

جیتا جاگتا حسین مستقبل نظر آتا ہے بالعموم پاکستان میں اور بالخصوص پورے گلگت بلتستان میں۔ مستقبل قریب میں ہر میدان میں ان کی اجارہ داری نظر آتی ہے۔آپ ائندہ بیس پچیس سال بعد گلگت بلتستان میں فاطمی دور کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔کیوں ؟ اس کیوں کے پیچھے بہت سارے دلائل ہیں مگرایک دلیل جو روزروشن کی طرح عیاں ہے وہ ہے ان کا نظام تعلیم، نصاب تعلیم۔آج سے کچھ دہائیاں پہلے گلگت بلتستان میں اسماعیلی.برادری انتہائی مفلوک الحال تھی۔زندگی کے ہر شعبے میں بہت پیچھے تھے ،مگران کے روحانی پیشوانے پورے گلگت بلتستان میں تعلیمی اداروں کا جال بچھایا۔بنیادی طور پر یہ شریف قسم کے لوگ ہیں، اپنے کام سے کام لیتے ہیں، دوسروں سے الجھنا ان کی روایات میں نہیں، اس لیے ان لوگوں نے تعلیمی میدان میں رینگتے رینگتے وہ کامیابیاں حاصل کی کہ آج گلگت بلتستان کے ہر شعبے میں ان کی اکثریت ہے۔ تعلیم کے ساتھ صحت اور رفاہی کاموں کے جال بھی بچھا دیے گئے۔آپ حیران ہوجائیں گے جب آپ ان کے نظام تعلیم و نصاب تعلیم کو اسٹڈی کریں گے تو۔آج گلگت بلتستان میں آغاخان فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے ایسے اسکول موجود ہیں جن کا معیار یورپ کے.بڑے اسکولوں سے کسی بھی طور کم نہیں۔آپ جب آغاخان ہائی اسکینڈری اسکولوں کے طلبہ وطالبات سے گفتگو کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان میں کس قسم کے Skills پائے جاتے ہیں۔آپ پاکستان کی تمام معیاری یونیورسٹیوں میں گلگت بلتستان کے طلبہ کے پروفائل جمع کرکے دیکھ لیں، ان میں اکثریت اسماعیلی

کمیونٹی کے طلبہ کی ہوگی۔ آپ کے ائی یو بورڈ، فیڈرل بورڈ اور آغاخان بورڈ میں پوزیشن ہولڈر طلبہ وطالبات کو دیکھ لیں وہ اسماعیلی کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہونگے۔ گلگت بلتستان کا سب سے پہلا پی ایچ ڈی اسکالر اور سب سے زیادہ پی ایچ ڈیز اسماعیلی کمیونٹی سے ہیں۔ سب سے زیادہ اسکالرشپ وصول کرنے والے بھی اسماعیلی کمیونٹی سے بلانگ کرتے ہیں۔ جو بھی نئی ٹیکنالوجی اور ہنر جی بی میں آجاتا ہے اس کو اپنانے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ سب سے زیادہ رفاہی ادارے ان کے پاس ہیں۔ اس کے بعد کیا میں یہ کہنے پر حق بجانب نہیں ہوں کہ آنے والا کل ان کا ہی ہوگا۔ ہاں اور ہم! ہم ہر ڈیپارٹمنٹ کو درخواست دیں گے کہ ہمیں چوکیداری دی جائے اور ہماری Boss پیں ہراجمان اس درخواست مسترد کی جائے گی اور ہمیں کہا جائے گا کہ آپ کو چوکیداری بھی میرٹ پر ملے گی۔ کیوں؟ اس کیوں کے پیچھے بھی بہت سارے دلائل ہیں مگر ایک بات واضح ہے کہ جب گلگت بلتستان میں اہل سنت اور اہل تشیع لڑ رہے تھے، اس وقت اسماعیلی تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے اور اپنا مستقبل سنوار رہے تھے۔ ہم آخر کب تک مساجد و امام بارگاہوں سے اعلانات کرکے، سرکاری آفیسروں کو ڈرا دھمکا کر اور رشوت دیکر چھوٹی چھوٹی نوکریاں حاصل کرتے رہیں گے۔ ہم ہر روز میرٹ اور عدل کی بات کرتے ہیں لیکن وہ وقت قریب آنے والا ہے کہ جب گلگت بلتستان کے ہر محکمے کا بڑا اسماعیلی ہوگا اور وہ ہر کام میرٹ پر کرے گا تو اہل سنت اور اہل تشیع میرٹ کے قریب سے بھی نہیں گزر سکیں گے۔ کیوں کہ میرٹ پر وہی آئے گا

جس کی تعلیم و تربیت بہتر انداز میں کی گئی ہو، اور ہم ان دونوں سے کوسوں دور ہیں۔ ہم نے مار دھاڑ، قتل و غارت، ظلم و ستم، معاشرتی بگاڑ اور تمام لایعنی کاموں کو اپنا شعار بنا کر رکھا ہے۔ حقیقت پسندی، مقتضائے وقت، استعمال عقل، زمینی حقائق سے دور بھاگنا اپنے فرائض منصبی میں داخل کرر کھا ہے، ہم نے اپنی دنیا اور عاقبت کی فلاح صرف اور صرف ان لایعنی باتوں میں محدود کرر کھا ہے۔ ہمارے پاس کوئی تعلیمی پلان نہیں ہے۔ ہم نے نوجوانوں کی فکری و نظری کوئی تربیت ہی نہیں کی ہے۔ ہم فکر دینے سے قاصر ہیں۔ شعور ہمارے قریب سے بھی چھو کر نہیں گزرتا، ہمارے پاس آنے والے کل کا کوئی منصوبہ نہیں۔ ریاست کی ضروریات کا ہمیں علم ہی نہیں۔ اسلامی تعلیمات، جدید نظام تعلیم، میڈیا اور اس کے لوازمات، بزنس منیجمنٹ، سیاحت و تفریح سول سوسائٹی اور پبلک پالیسی، بین الاقوامی تعلقات، معاشیات و اقتصادیات، صحت، عامہ، مسائل و وسائل کا درست استعمال، خوبصورت مستقبل کے لیے پلاننگ اور عدل و انصاف پر مبنی ایک خوبصورت اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ہمارے پاس کوئی منصوبہ بندی نہیں اور نہ ہی اس پر سوچنے کے لیے کوئی ذہنی و فکری طور پر تیار ہے، ہماری حالت اس دیوالیہ رئیس کی طرح ہے جو بھیک مانگ کر گزارہ کرتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ اہل سنت واہل تشیع کے پاس کسی چیز کی کمی ہے، سوال یہ ہے کہ ہم عقل کو استعمال کرنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ ہماری پشت پر بڑے بڑے امیر

ممالک کھڑے ہیں۔ ہمیں کسی نہ کسی مد میں تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔ ہم خود بھی معاشی حوالے سے مضبوط ہیں۔ ہمارے بڑے اس ملک میں، اس علاقے میں کسی تعلیمی پلان کو ترتیب دینے کے لیے تشریف نہیں لاتے ہیں۔ کسی کالج، یونیورسٹی اور دینی درسگاہ کا افتتاح کے لیے نہیں آتے۔ کسی رفاہی ادارے کی داغ بیل ڈالنے کے لیے نہیں آتے، اگر وہ ہماری پشت بانی کرے بھی تو ایسے کاموں میں جن سے نہ دنیا کا فائدہ نہ آخرت کا۔ لا محالہ ہمارا نوجوان خسارے کی گھاٹیوں میں جا گرتا ہے۔ جبکہ اسماعیلی برادری کا روحانی پیشوا جب بھی آتا ہے تو کسی تعلیم پلان کو لے کر آتا ہے۔ اب کی بار بھی ان کے روحانی پیشوا نے پاکستان کا وزٹ کیا تو ایک تعلیمی ادارے کا کانوو کیشن بنیادی سبب بنا۔ انہوں نے کراچی میں آغا خان یونی ورسٹی کے 30 ویں کانوکیشن کے موقع پر خطاب کیا۔ آپ ان کے خطاب کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجیے، پھر بتائے کہ میں اپنی پیش گوئی پر حق بجانب ہوں کہ نہیں۔

پرنس کریم آغا خان نے کہا ہے''

کہ تعلیم ہی معاشرے میں ترقی کا بہترین ذریعہ ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ بین الاقوامی سطح کے اسکالر پیدا کریں جو مستقبل کے چیلنجز کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ آج ملک اور یونی ورسٹی کے لئے تاریخی موقع ہے، تمام پاسنگ آٹ گریجویٹس کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں، تمام طلبہ کے بہتر مستقبل کے لئے پر امید ہوں اور مستقبل میں طلبہ سے معاشرتی ترقی کی توقع

ہے۔ تعلیم معاشرے میں بہتری کا سب سے بہترین ذریعہ ہے، یہ ادارہ جذبہ خدمت سے سرشار ہے اور بہترین میعار ہی ہماری پہچان ہے۔ دنیا کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، بہت سے معاملات میں سول سوسائٹی کا اہم کردار ہوتا ہے اور تعلیم ہی معاشرے میں میں مہارت اور قائدانہ صلاحیتیں پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے اس لئے طلبہ میں چیلنجز کا سامنا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ترقی پذیر خصوصا مسلم ممالک میں میڈیا، بزنس منیجمنٹ، ٹورزم اور پبلک پالیسی، بین الاقوامی تعلقات، معیشت اور ایگری کلچر کے شعبوں میں نئے ادارے تعمیر کرنا چاہتے ہیں تاکہ طلبا معاشرے کے چیلنجز کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔

انہوں نے مزید کہا کہ

ہمارا ادارہ جذبہ خدمت سے سرشار ہے۔*

تعلیم اور خدمت ہمارا ورثہ ہے۔*

تعلیم معاشرے کی بہترین خدمت ہے۔*

اپنے ادارے ترقی پذیر ملکوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔*

گریجویشن کے لئے 7 نئے ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں۔*

''آغا خان یونیورسٹی کے 30 سال مکمل ہونے پر فخر ہے۔*

یہ تمام باتیں آپ ملکی اور بین الاقوامی میڈیا میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ کاش

آج کے بعد اہل سنت اور اہل تشیع بھی تعلیم کو اپنا پہلا اور آخری ہدف بنائے۔اپنی ترجیحات میں اولین ترجیح قرار دیں۔ تعلیم کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے اور اعلان کریں کہ آج کے بعد ہم لڑائی کے بجائے تعلیم و تربیت کو اپنا موٹو بناتے ہیں۔ ہم بھی اسماعیلیوں کی طرح تعلیم اور صرف تعلیم پر توجہ دیں گے۔ تو پھر گلگت بلتستان میں کتنی خوبصورت معاشرتی زندگی کا آغاز ہوگا. اگرایسا ہوا تو یقین جانیں لوگ پیرس اور واشنگٹن سے گلگت بلتستان میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔ کیوں کہ گلگت بلتستان کے ان کالے پہاڑوں ، بہتی ندیوں، آبشاروں، دریاؤں ، گھنے جنگلوں ، خوبصورت جھیلوں اور رس بھرے پھلوں میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ پیرس اور دیگر مغربی ممالک ان کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور پھر یہاں علم و ادب کے ذریعے سونے کے وہ محل تعمیر کیے جائیں گے کہ دنیا ورطہء حیرت میں رہ جائے گی۔ میں مقرر اسماعیلی کمیونٹی کو روشن مستقبل پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سو مبارک ہو۔ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے مگر طول نہیں دینا چاہتا۔کاش ہم بھی تعلیمی اداروں پر فخر کرسکیں، نئے ادارے قائم کرنے کا بیڑہ اٹھائیں، تعلیم اور خدمت کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھیں، جدید چیلنجز سے نمٹنا ہمارا بھی منشور ہو، نوجوانوں میں قائدانہ صلاحتیں پیدا کرنا ہمارا دستور ہو اور تعلیم کو معاشرے میں عام کرنا اور اس کو بہترین معاشی، سماجی، معاشرتی خدمت قرار دینا ہمارا فرض ہو۔کاش اس نبی جس پر ہم ایمان لائے ہیں پر اول دفعہ اترنا والا یہی پیغام''اقراء

باسم ربک الذی خلق،، ہمیں سمجھ آجائے اور ہم عملی تفسیر بن جائے۔

شینا لکھنے کی ورک بک

کتاب کا نام: شینا لکھنے کی ورک بک

تدوین و تشکیل: شکیل احمد شکیل

سن اشاعت اول: 2013

ضخامت: 66 صفحات

قیمت: 200 روپے

پیشکش: شینا لینگویج اینڈ کلچر پروموشن سوسائٹی گلگت، قلندر پلازہ، سنیما بازار گلگت

ڈسٹری بیوٹرز: نارتھ بکس، مدینہ مارکیٹ گلگت، المرتضیٰ بک ڈپو، اتحاد چوک گلگت

زبان کسی بھی قوم کی پہچان ہوتی ہے۔ اختلاف السنہ کا ذکر تو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی کیا ہے۔ زبانوں کا مختلف ہونا ہی حسن ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض دفعہ اختلاف السنہ ہی کی وجہ سے ملک ٹوٹتے ہیں اور کبھی کبھار کسی انقلاب کا باعث بھی یہی زبانیں بنتی ہیں۔ ہمارے سامنے شینا لکھنے کی ورک بک ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب ''زبانی کلامی'' معاشرے کے لیے ورک بک ہے۔ شینا

زبان چونکہ اپنی مکمل لطافت و شیرینی اور پس منظر رکھنے کے باوجود ابتدائی ارتقائی مراحل میں ہے۔زبان دانی کی ترقی کیسے پیدا کی جانی چاہیے اس کتاب کو اسی تناظر میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس کتاب کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ زبانی ، کلامی سماج کو شینا لکھنے کی روایت سے آشنا کروانے کے لیے اور بالغان کے لیے یہ ورک بک زیادہ مفید لگ رہی ہے بلکہ اسی بات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ہماری دانست کے مطابق سکینڈری کلاسز اور اس سے اُوپری درجے کے طبقات اس کتاب سے بہتر طریقے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ لسانیات پر کام کرنے والوں کے لیے بھی اس ورک بک سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ اردو رسم الخط لکھائی و پڑھائی کے وہ مسائل جو شینا زبان کی لکھائی و پڑھائی میں بھی پیش آرہے ہیں انہیں بھی کچھ کچھ حل کی طرح راہ سجھائی دیتی ہے۔

بہر صورت یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی کا راز اس کے تعلیمی نصاب و نظام میں مضمر ہے۔ جن قوموں نے اپنے تعلیمی نظام کو درست بنیادوں پر استوار کیا ہے وہ قومیں آج ترقی یافتہ قومیں کہلاتی ہیں۔ علمی و تعلیمی ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچے کو ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جائے تو وہ بہتر طریقے سے علمی منازل طے کرتا جاتا ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان کے علاقہ جھنگ کے رہنے والے ہیں۔ جنھیں نوبل انعام ملا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے ایف ایس سی کی کوئی بک ساٹھ دفعہ اردو اور انگلش

میں باقاعدہ مختلف استادوں سے پڑھی مگر کتاب کا اصل مفہوم دل میں نہیں اترا، جب انھوں نے 61ویں دفعہ اپنے کسی استاد سے پنجابی زبان میں پڑھی تو کتاب کی تمام جزئیات وکلیات دل و دماغ میں اتریں۔ یہ ہے کرشمہ اپنی مادری زبان میں تحصیل علم کا۔ پاکستان کے تمام صوبوں میں صوبائی زبانیں داخل نصاب ہیں سوائے گلگت بلتستان کے۔ شومئی قسمت گلگت بلتستان کے ارباب حل وعقد اس بات کی طرف توجہ ہی نہیں دے پا رہے ہیں۔ ہماری درمندانہ اپیل ہوگی کہ گلگت بلتستان کی مختلف بولیوں کو ابتدائی نصاب میں جگہ دی جائے۔ یہ کام چونکہ اتنا آسان نہیں ،تاہم اگر سنجیدگی سے اس امر کے لیے کمر کَس لی جائے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ حکومت اس ضمن میں حکومت سندھ اور پنجاب سے رہنمائی لے سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی علاقائی بولیوں کو کیسے اپنے تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا۔ حکومت اگر سنجیدہ ہو تو صرف ان اضلاع ، جہاں ''شینازبان'' بولی جاتی ہے کے لیے ابتدائی نصابی کتب تیار کروا کر تجربہ کر سکتی ہے۔ اگر یہ تجربہ مفیداور خوشگوار ثابت ہوا تو، شینا کی طرح بلتی، کھوار،بروشسکی اور وخی وغیرہ کو بھی نصاب کا حصہ بنا سکتی ہے۔ گلگت بلتستان کی اکلوتی یونیورسٹی میں بھی علاقائی لسانیات کا ڈیپارٹمنٹ قائم کیا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں شینا لینگویج اینڈ کلچر پروموشن سوسائٹی گلگت ، محکمہ تعلیم گلگت اور قراقرام انٹرنیشنل یونیورسٹی کے لیے بہتر خدمات انجام دے سکتی ہے۔اور یہ تینوں شعبے مل کراس حوالے سے کوئی مرکزی کردارادا کر سکتے ہیں۔ دل کی ایک ارمان ہے کہ کتنی

خوبصورت بات ہوتی جب ''قرآن کریم اور احادیث مبارکہ'' کی معروف کتب کا شینا زبان میں ترجمہ کیا جاتا اور لوگ اپنی مادری زبان میں قرآن و احادیث کی لطافت و شرینی سے محظوظ ہوتے۔ آج نہیں تو آنے والا کل ایسا ہوگا، انشاء اللہ

☆☆☆

سہ ماہی ''فکر و نظر'' گلگت بلتستان

میگزین کا نام: سہ ماہی ''فکر و نظر'' گلگت بلتستان

چیف ایڈیٹر: عبدالکریم کریمی

جلد نمبر: 03

شمارہ نمبر: 10,11

مہینۂ اشاعت: جنوری تا جون 2013ئ

ضخامت: 96 صفحات

پبلشر: عبدالکریم کریمی، کریم منزل ضلع غذر

زیر نظر میگزین '' سہ ماہی فکر و نظر'' کا دسواں اور گیارہواں شمارہ ہے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں ہی ملک بھر کی طرح گلگت بلتستان میں اچانک صحافتی انقلاب آیا ہے۔ اس ملک گیر صحافتی انقلاب کا پس منظر تفصیل طلب ہے، تاہم ہمارے زیر نظر فکر و نظر وہ کے شمارے ہیں جو ادارہ نصرۃ الاسلام کو تواتر کے ساتھ پہنچ رہے ہیں۔ فکر و نظر کے دو حصے ہیں۔ ا. حصہ اردو، ۲. حصہ انگریزی۔ سہ ماہی فکر و نظر کے عناوین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ادبی مجلے میں ادب کی تمام اصناف کو سمو دیا گیا ہے۔ ایک نظر '' آئینہ فکر'' کے عنوانات پر ڈالتے

ہیں تاکہ اس مجلے کی ادبی راہ متعین ہوسکے۔ اداریہ' نظم' یادِ رفتگاں' ادب در ادب' تاریخ بولتی ہے' حالات حاضرہ' زبان وادب' غور و فکر' کھوار ادب' نئے قلم کار' طرحی غزلیں' خطوط' طنز و مزاح' تبصرہ کتب' تعارف کتب' غزلیں، نظمیں' سفر نامہ' افسانہ' ناول' یہ ہیں عنوانات' اور ان عنوانات کے ذیل میں گلگت بلتستان کے نامور ادبی و علمی شخصیات نے اپنے اپنے خوبصورت مقالات پیش کیے ہیں' جو یقیناً ادبی و صحافتی اور علمی معیار میں ملک کے دیگر حصوں میں لکھنے والوں سے کسی بھی طور پر کم نہیں ہیں۔

اس شمارے کے چند مضامین جو انتہائی دلکش اور دل بھا لینے والے ہیں۔ شہر تمنا میں اجنبی کے عنوان سے احمد سلیم سلیمی کا مضمون جو بطور اداریہ پیش کیا گیا ہے پڑھنے کے لائق ہے جس میں شہر گلگت کا منظر نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔، میرے ادبی تجربات و مشاہدات کے عنوان سے پروفیسر الہامی صاحب کی آپ بیتی بھی منفرد ہے۔ گلگت بلتستان کا مزاحمتی ادب کے عنوان سے خوشی محمد طارق کی تحریر جو انہوں نے مختلف شعراء کے مزاحمتی اشعار یکجا کرکے ترتیب دی ہے قابل دید ہے۔ قاضی نثار' حقانی اور نصرۃ الاسلام کے عنوان سے فکر و نظر کے چیف ایڈیٹر کا تبصرہ نہ صرف تبصرہ ہے بلکہ ایک البیلا اخباری کالم بھی ہے شامل اشاعت ہے۔ یارانِ محفل کے ساتھ ایک دن اشکومن میں ،کے عنوان سے راقم (امیر جان حقانی) کا سفر نامہ تصاویر کے ساتھ مزین ہے۔ شمینا

زبان میں لغت نگاری کے عنوان سے شیر باز برچہ کی مختصر مگر پراثر تحریر اور ظرافت نامہ کے عنوان سے عبدالخالق تاج کی تحریر بھی شامل ہیں۔

حصہ انگریزی میں چار مضامین شامل ہیں۔ فکر و نظر کا ایک سلسلہ نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیا جارہا ہے' جس کا عنوان '' طرحی غزلیں'' ہے۔ جس میں شعراء کرام کو ایک طرحی مصرع پر طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی ہے اور اس طرح پر گلگت بلتستان اور ملک و بیرون ملک سے شعراء کرام حصہ لیتے ہیں۔ یقینا یہ ایک خوبصورت سلسلہ ہے۔ '' سخن ور ہمارے'' کا حصہ بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ خطوط کا سلسلہ بھی انوکھا ہے۔ فکرو نظر کے قارئین طویل طویل خطوط لکھتے ہیں۔ خطوط میں ایڈیٹنگ کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے 'ایڈیٹنگ سے خطوط کا اصل رنگ پھیکا پڑجاتا ہے جو مناسب نہیں۔ فکر و نظر کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان میں ٹھیک ٹھاک ایڈیٹنگ کی جارہی ہے۔ مجموعی طور پر فکر نظر کے تمام شمارے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ بلکہ بڑی محنت کے ساتھ ترتیب دیے گئے ہیں۔ کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو یقینا قابل رشک ہیں۔ مثلاً ا۔ فکر و نظر کی ڈیزائنگ، ۲۔ پروف ریڈنگ، ۳۔ پیج میکنگ، ۴۔ ٹائٹل کی خوبصورتی پر محنت۔ ۵۔ گلگت بلتستان کے تمام قلم کاروں اور شعراء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔ ۶۔ تصاویر کو مناسب جگہ لگانا۔

اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو یقینا قابل توجہ بلکہ قابل اصلاح ہیں۔ مثلاً ا۔ ٹائٹل پر ہمیشہ کسی خاتون کا تصویر دینا، ۲۔ چیف ایڈیٹر کا فرنٹ ٹائٹل / بیک ٹائٹل یا دونوں پر اپنی تصاویر چسپاں کرنا، ۳۔ مجلس مشاورت کی فوج ظفر موج کو کم کرکے مجلس تحریر میں چند جید قلم کاروں کو شامل کرنا اور ان سے مستقل علمی اور تحقیق وادبی امور کے حوالے سے رہنمائی لینا، ۴۔ کیونکہ فکر و نظر کسی خاص مکتب فکر یا کسی ادارے کا ترجمان نہیں ہے اس لیے بعض غیر ضروری مذہبی چیزوں سے پرہیز کیا جانا ہی ادارے کے لیے مفید ہے۔

غرض مجموعی طور پر فکر و نظر نے گلگت بلتستان کی میگزینی صحافت میں ایک نیا اسلوب متعارف کروایا ہے جو اس سے پہلے ناپید تھا۔ ادارہ سہ ماہی نصرۃ الاسلام ''فکر و نظر'' کی علمی وادبی کاوشوں کو سراہتا ہے۔ اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس ادبی میگزین میں مزید نکھار پیدا کیا جائے گا۔

مآثر ومکاتیب

کتاب کا نام: مآثر ومکاتیب

مؤلف: حضرت مولانا محمد عبدالمعبود مدظلہ

پیش لفظ: مولانا عبدالقیوم حقانی

ترتیب: حافظ محمد طیب حقانی

سن اشاعت اول: مارچ 2012ئ/ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

ضخامت: 352 صفحات

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

مولانا محمد عبدالمعبود اسلامی رسائل کی دنیا میں کوئی نیا نام نہیں۔ وہ مختلف اوقات میں دینی مجلات میں علمی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی کئی علمی وادبی تالیفات وتصنیفات اہل علم وقلم سے داد وصول کرچکی ہیں۔ یہ کتاب بھی انہیں میں سے ایک ہے۔کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔باب اول مقالات ومضامین، باب دوم بحث ونظر، تحقیق و تنقید اور تعارف وتبصرہ کتب ہے۔ ان ابواب سے کتاب اور مضامین کے موضوعات کا اندازہ لگایا جاسکتاہے۔ زبان بڑی دلچسپ ہے، موضوعات خوب ہیں۔ مشکل الفاظ کا استعمال خوب کرتے ہیں۔

کتاب مختلف علمی کتابوں کے مطالعہ و مشاہدہ اور تحقیق اور ذوق لطیف کا مجموعہ ہے۔ اس میں مشائخ کے تذکرے اور خطوط بھی ہیں' درس وتدریس کی ضوافشانیاں بھی ہیں'کتب و رسائل پر آراء و تبصرے بھی ہیں' مدارس دینیہ کے انتظام و انصرام کے لیے رہنمائی کے اصول بھی'بعض علمی مسائل اور وقیع کتب پر سیر حاصل گفتگو بھی۔ مجموعی طور پر کتاب مفید ہے' ٹائٹل دیدہ زیب ہے' ورق بھی مناسب استعمال ہوا ہے۔کتاب کا بغور جائزہ بتاتا ہے کہ مولانا تواضع 'بردباری اور صاحب تقویٰ نظر آتے ہیں اور ان کی علمی و قلمی رسوخیت کا اندازہ بھی خوب ہوتا ہے۔اسلوب میں سلاست و سادگی اور استدلال و استنباط اور زبان اورادب شرینی و چاشنی بھی دل کو بھا لیتی ہے۔

والد کا پیغام اولاد کے نام

کتاب کا نام: والد کا پیغام اولاد کے نام

مؤلف: مولانا عبدالقیوم حقانی

اشاعت: اکتوبر، 2012ء /ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ

ضخامت: 252 صفحات

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

زیر نظر کتاب مولانا عبدالقیوم حقانی کی گرانقدر تصنیفات میں ایک ہے۔ مولانا موصوف نے ادبی اصناف کے ہر صنف میں قدم رکھا ہے اور اس کا حق بھی ادا کیا ہے۔ر صغیر میں اسلامی و مذہبی ادب کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو مولانا کا مقام وقیع اور بلند ہوگا' بلکہ صف اول کے لکھاریوں اور ادبی شہ پارے تخلیق کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہوگا۔ والد کا پیغام......اولاد کے نام مولانا کی اچھوتی کتاب ہے۔اگر کتاب ہذا کو ناول کا نام دیا جائے تو قطعاً ناول نہیں مگر ناول وافسانے کی چاشنی اور رنگ بدرجہ اتم موجود ہے۔اگر کہانی یا آپ بیتی خیال کیا جائے تو مکمل آپ بیتی و حکایت نامہ بھی نہیں۔(میرا ذاتی مشاہدہ اور کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولانا نے کتاب کا مرکزی رخ اپنی یعنی اپنے گھرانے کی طرف ہی پھیرا ہے یعنی کردار انہیں اپنے

گھر سے ہی ملے ہیں)۔انداز کبھی عالمانہ اور محققانہ ہوتا ہے تو کبھی مکالمانہ اور بیانہ' کبھی خود کسی کو جان پدر کرکے مخاطِب کرتے ہیں تو کبھی اپنی '' اماں جی'' مرحومہ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ کبھی اولاد صالح کو نقشہ کھینچا جاتا ہے تو کبھی باغی اولاد کی تصویر۔ کبھی جگر گوشوں کے سامنے اصحاب رسول اور امہات المؤمنین اوراکابر و سلف کے قصے و نمونے سامنے رکھتے ہیں اور ساتھ تلقین بھی کرتے ہیں کہ ان رہنماء خطوط سے انحراف کسی بھی طور مفید نہیں بصورت دیگر خیر کے تمام ابواب مغلق اور شر و فتن کے تمام دروازے مفتوح۔ نور چشموں کو صالحین و سالکین اور اہل علم و فضل اور اصحاب تقویٰ و ورع کی کہانیاں اور اوصاف حمیدہ بھی سناتے ہیں تو جانِ منوں کو قناعت و طلب معاش وحلال کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور اس کے لیے قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی سے مزین دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ کبھی تو جان پدروں کے دلوں کو اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات و مشاہدات بلکہ مشکل حالات سے پسیجنا چاہتے ہیں اور انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ بغیر محنت و مشقت کے نسب و نسبت کچھ کام نہیں آتا۔اور کبھی تو مولانا بہت دکھی ہوتے ہیں اور اس شعر کا حقیقی منظر پیش کرنے لگتے ہیں کہ :

عارفی ممکن نہیں عنوان کوئی اظہار کا
کیا کہوں کیسی تمنا، کیسی حسرت دل میں ہے

بہر صورت کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس میں نئی نسل کے لیے کامیابی کے راز' دانائی و حکمت اور عقلمندی کی باتیں' صبر و قناعت کی تعلیم' استقامت کے نتائج و فوائد 'اور تبلیغی و اصلاحی اور سماجی و معاشرتی اور جہادی سرگرمیوں کے لیے واضح نقوش ملتے ہیں۔ اپنے طرز اور نئے انداز کی البیلی کتاب ہے۔

(عکس تمنا (مجموعہ نعت

کتاب کا نام: عکسِ تمنا (مجموعہ نعت)

شاعر: الحاج مسرور کیفی

ناشر: محمد رمضان میمن

تاریخ طباعت دوازدہم: ۱ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ/ جنوری 2013ئ

ضخامت: 48 صفحات

قیمت: 50 روپے

یہ مختصر سا کتابچہ جناب مسرور کیفی مرحوم کے جذبات کا مظہر ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جلالی کے حوالے سے بہترین کلام پیش کیا گیا ہے۔ مسرور کیفی صاحب کا انداز بڑا پیارا ہے۔ شاعری میں تسلسل ہے۔اس مجموعے میں اپنے دلی جذبات کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کی ایک نعت کے چند اشعار پیش ہیں۔

دِرِ حبیب سے وابستگی ہوئی جب سے

اَنا کے خول سبھی ہم اُتار بیٹھے ہیں

حضور! حال عجب ہوگیا ہے اب اپنا

قرار بھی ہے مگر بے قرار بیٹھے ہیں
ہم اپنی جیت پہ مسرور کیوں نہ ہوں نازاں
ہم اپنے آپ کو قدموں میں ہار بیٹھے ہیں
☆☆☆

اسلامی معاشرہ کے لازمی خدو خال

کتاب کا نام: اسلامی معاشرہ کے لازمی خدو خال

افادات: شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق صاحب

جمع وترتیب: مولانا مفتی عبدالمنعم حقانی

پیش لفظ: مولانا عبدالقیوم حقانی

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

تاریخ طباعت اول: اگست ۲۰۱۲ئ/رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

ضخامت؛ ۴۰۰ صفحات

یہ کتاب مولانا سمیع الحق صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے جامع السنن للترمذی ''ابواب البر والصلۃ'' کے احادیث مبارکہ کی کلاس میں کی گئی تقاریر و تفسیر کی درسی امالی ہیں جنھیں مولانا عبدالمنعم حقانی صاحب نے عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔معاشرتی زندگی کے حوالے سے بیان کردہ احادیث کے یہ مفاہیم بالکل آج کے حالات وضروریات کے عین مطابق ہے۔مولانا صاحب کی تحریر کے ساتھ ان کی تقاریر اور دروس بھی جاندار اور علمی ہوتے ہیں جن کا بین ثبوت ان کی بے شمار علمی وتحقیقی اور ادبی کتب ہیں۔زیر نظر کتاب میں ایک انسان کی زندگی میں جن جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان تمام کے

حوالے سے بہترین معلومات مدلل اور واضح انداز میں نہیں آسان اسلوب میں دستیاب ہیں۔کتاب کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ حسن معاشرت ' اوصاف حسنہ اور سماجی و معاشرتی زندگی' گھرداری' فیملی کے ساتھ تعلقات' دوست احباب' امیر و غریب ' چھوٹا بڑا اور اعلیٰ ادنی غرض ہر آدمی کے متعلق انتہائی خوبصورت انداز میں معلومات دستیاب ہیں۔کتاب کا سائز' سرورق' کمپوزنگ بھی کمال حد تک بہترین ہے۔ کاغذ بھی عمدہ استعمال کی گئی ہے۔ صاحب ذوق انسانوں بالخصوص ان قلم کاروں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے جو معاشرتی' سماجی مسائل پر لکھتے ہیں۔ مولانا عبدالقیوم حقانی کا ایک خوبصورت پیش لفظ بھی مرقوم ہے۔ظاہری و باطنی اعتبار سے کتاب بہترین ہے۔

☆☆☆

حُسنِ انتخاب

کتاب کا نام: حُسنِ انتخاب

مؤلف: مولانا عماد الدین محمود

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

سن اشاعت اول: مارچ 2012ئ/ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

ضخامت: ۱۸۲ صفحات

زیر نظر کتاب دراصل مولانا عمادالدین محمود صاحب کی مطالعہ اور اس مطالعہ دوران نوٹ کئے گئے دلچسپ واقعات اور سبق آموز حکایات اور اقوال زریں کا مجموعہ ہے۔ مطالعہ کی اہمیت قدیم دور سے مسلم ہے۔ جس کو بھی مطالعہ کی عادت پڑ گئی وہ سرخرو ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مطالعہ معیاری اور مستند کتب کا ہو تو دین دنیا کی بھلائی ہے اور یہ عبادت اور امت کی نفع رسانی کا سبب بن جاتی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے کافی ساری مستند اور معیاری کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ اہم اور دلچسپ واقعات' دل آویز اور مفید باتیں نوٹ کرکے اس کتاب کی بنا رکھی ہے۔ یہ کوئی نہیں روایت نہیں بلکہ ہمارے اکابر اس طرح کرتے آئے ہیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب تراشے اور

مولانا ابن الحسن عباسی کی کتاب کتابوں کی درسگاہ میں بھی اس قبیل کی کتابیں ہیں۔ اس کتاب کو بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے کافی عرق ریزی سے مرتب کی ہے۔ ادب عربی اور اردو کی اچھی کتب سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ یہ ایک مفید اور علمی ، ادبی اور تاریخی مجموعہ ہے۔

منزل کی تلاش

کتاب کا نام: منزل کی تلاش

مؤلف: مولانا عطاء اللہ شہاب

ناشر: دارالکتاب ' کتاب مارکیٹ ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

سن اشاعت: جنوری 2005ئ

قیمت: 140روپے

منزل کی تلاش اپنے موضوع پر انوکھی کتاب ہے۔ یہ سرگزشت ہے ان سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی جنہوں نے وادی بے آئین گلگت بلتستان کی شناخت اور وادی جنت نظیر کشمیر کے ساتھ شمالی علاقوں کی تاریخی و ثقافتی اور مذہبی اورآئینی و قانونی اور جغرافیائی اتحاد واشتراک اور اٹوٹ انگ اور شہِ رگ کا رشتہ تلاش کرنے کے لیے تگ و دو کی ہیں۔ یہ کتاب روئیداد ہے گلگت بلتستان (سابق شمالی علاقہ جات) کے تمام سیاسی و مذہبی اور قوم پرست پارٹیوں کے اتحاد واشتراک سے بنی جی بی این اے (گلگت بلتستا نیشنل الائنس) کی اس جدوجہد کی جو انہوں نے دو نکاتی ایجنڈے پر اتفاقیہ طور پر کی ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ گلگت بلتستان کی اہل سنت عوام کی اکثریت اس ایجنڈے سے متفق نہیں ہے اور اہل سنت عوام کی نمائندہ جماعت '' تنظیم اہل سنت والجماعت گلگت بلتستان و کوہستان''

نے روز اول سے اس ایجنڈے سے بھرپور اختلاف کیا ہے اور کھل کر اپنے خدشات و اشکالات اور پالیسی کا اظہار بھی کیا ہے۔ باوجودیکہ جی بی این اے میں اہل سنت عوام رہنماؤں کی ایک معقول تعداد شامل رہی ہے۔ بلکہ چیئرمین شپ اور وائس چیئرمینی بھی اہل سنت کے حصے میں آئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے گلگت بلتستان کی تاریخی اور تاریکی حیثیت کھل کر نظر آتی ہے۔ عمیق نظر سے کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر کشمیر پاکستان کا شہِ رگ ہے تو گلگت بلتستان کشمیر کا شہِ رگ ہے۔ یہ کتاب گلگت بلتستان کے نامور قلم کار' مفکر عالم دین' خطیب'کتاب دوست انسان اور علاقائی و ملکی حالات و سیاسیات پر نظر رکھنے والے عالم دین مولانا عطاء اللہ شہاب صاحب کے قلم معجز رقم کی تراوش ہے۔ انہوں نے بے حد خوبصورتی سے وفاق میں دھرتی بے آئین کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ حالیہ دنوں میں مولانا موصوف نے گلگت بلتستان کی ائینی و جغرافیائی اور تاریخی حیثیت کے حوالے سے کچھ ایسے اخباری بیانات دیے جس اہل سنت عوام کو تو مایوسی ضرور ہوئی البتہ اپنی کتاب میں بیان کردہ اپنے موقف سے بھی واضح انحراف نظر آرہا ہے۔ مولانا نے گلگت بلتستان کے متنازعہ علاقوں کو پاکستان کا باقاعدہ پانچواں صوبہ بنانے کی واضح حمایت کی اور کھل کر اس امر کا اعلان بھی کیا۔ یہ موقف گلگت بلتستان کے کسی بھی اہل سنت پارٹی و آدمی کا نہیں' اگرچہ ایک مخصوص سیاسی مکتبہ فکر اس آس میں جی رہا ہے اور وقت بے وقت اس کا راگ بھی الاپ رہا ہے۔

مولانا شہاب ایک منجھے ہوئے سیاستدان ہیں، انہوں نے وقتی ضرورتوں اور مصلحتوں کی بناپر یہ اعلان کیا ہوگا، ورنہ نہ جمیعت علمائے اسلام گلگت بلتستان کا یہ مؤقف ہے نہ مرکزی قیادت وپارٹی کا یہ مؤقف ہے۔ گلگت بلتستان کے حوالے سے مجھے ذاتی طور پر پاکستان کے نامور سیاسی ومذہبی لیڈروں کو سننے کا موقع ملا ہے۔ میں برملا کہہ سکتا ہوں کہ ان علاقوں کی علاقائی' ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے جو واقفیت قائد جمیعت مولانا فضل الرحمان کو ہے وہ کسی کو نہیں۔ غالبا 2010ء میں کراچی یونیورسٹی کے آڈیٹوریم ہال بحیثیت چیف گیسٹ مولانا نے کشمیر' گلگت بلتستان 'پاکستان اور اقوام متحدہ کی گزشتہ ساٹھ سالہ کارکردگی کو بیان کیا تھا اور اس متنازعہ علاقے کا جو حل پیش کیا تھا وہ نہ کسی سیاسی رہنماء کی بس کی بات ہے نہ ہمت۔ مجھے امید ہے کہ مولانا شہاب صاحب جلد اپنے اس مؤقف سے برأت کا اظہار کریں گے۔ بہر صورت ''منزل کی تلاش'' میں آپ کو بہت کچھ ملے گا۔ اگر بنظر غائر اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو گلگت بلتستان کی محرومیوں میں اپنوں کی ریشہ دوانیاں بھی نظر آئیں گی اور غیروں کی خرمستیاں بھی۔ علاقے کی سیاسی قیادت کی سستی ' نااہلی اور وفاقی قیادت و حکمران طبقے کی بدنیتی اور آفر شاہی کی ستم کاری اور اہلیان کشمیر اوران کی عوامی و سیاسی سیادت کی بے مروتی اور ہر دور کے کشمیری حکام کا دوغلا پن بھی نظر آئے گا۔ کتاب کا انتساب بہت ہی نرالا ہے لو آپ بھی ملاحظہ فرمائے۔'' ہمالیہ' قراقرم اور ہندوکش کے دامن

میں بسنے والی ''نئی نسل'' کے نام! جن سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں''۔ تو اس کتاب کا مطالعہ پیروں کے ساتھ جوانوں کو بھی کرنا ہوگا اور جوانوں میں مرد وزن کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر ایک خوشے سے مئے کشید کر سکتا ہے۔

☆☆☆

القاسم قلم وقرطاس نمبر

کتابچے کا نام: القاسم قلم وقرطاس نمبر

زیر سرپرستی: مولانا عبدالقیوم حقانی

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

اشاعت: ۲۱۰۲ئ

ضخامت: ۱۷۶ صفحات

قلم وقرطاس ماہنامہ القاسم کی انیسویں خصوصی اشاعت ہے۔ اس خصوصی نمبر میں اہل علم وادب کے مضامین کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی کی قلمی کاوشوں پر بھی کافی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ملک عزیز میں اسلامی ادب دم توڑتا جارہا ہے۔ ترقی پسند مصنفین اور ادباء ادب کے نام پر نوجوانوں کی بے راہ روی کی دعوت دے رہے ہوتے ہیں۔ اور ان کا پلہ کافی بھاری ہے۔ سرکار کا تعاون بھی حاصل ہے اور میڈیا کا بھی۔ ایسے تعفن زدہ ماحول میں دینی ادب کی آبیاری لازم ہو جاتی ہے۔ قلم و قرطاس نمبر اس حوالے سے کافی مفید ہے جس میں تحریر' کتاب' ادب اور قلمی کاوشوں میں ایک پیش رفت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ماہنامہ القاسم کی اس خصوصی اشاعت کے مطالعہ کے بعد کتاب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور کتاب دوستی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

دفاع امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

کتاب کا نام: دفاع امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

تالیف: مولانا عبدالقیوم حقانی

ضبط و ترتیب: مولانا قاری رمضان

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

تاریخ طباعت دوازدہم: ' رجب المرجب ۱۴۳۱ھ/ جولائی 2010ئ

ضخامت: 361 صفحات

قیمت: درج نہیں

امام اعظم امام ابو حنیفہ وہ عظیم انسان ہیں جوامت مسلمہ کے سب سے بڑے فقیہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے الامام الاعظم سے وہ عظیم الشان کام لیے جو نہ ان کے ہم عصروں سے لیے نہ ان کے بعد کے فقہاء و محدثین سے۔امام صاحب کی فقاہت وجلالت اور علمی عظمت کا اعتراف اکابر علمائ' مجتہدین وقت' اور آج تک کے فضلاء و صلحاء اوراہل علم نے کیا ہے اور قیامت تک ان کی عظمت علم و عمل کے جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان علمی عظمت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکتے۔فقہ حنفی آج عالم اسلام کی تمام معروف دینی درسگاہوں

میں شامل نصاب ہے۔امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شان و منقبت' وسعت علمی'حسنات و صفات وحق گوئی'علمی تبحر' دیانت' شجاعت' استقلال و طرز استدلال' مجاہدہ و ریاضت'حکیمانہ بصیرت' ذوق مطالعہ ویکسوئی قلب و دماغ'شب بیداری اور آہ سحر گاہی' تزکیہ نفس' اصلاح احوال'جذبہ تعمیر انسانیت'استغنائ' سیاسی و سماجی بصیرت' ان کے مستحکم اور پائیدار اصول' اور دیگر صفات حمیدہ اور اوصاف حسنہ کے بارے میں سالوں سے لکھا جارہا ہے اور ہر زبان میں لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری و ساری رہے گا۔ جس نے بھی لکھا ہے سب نے خوب لکھا ہے۔ اردو زبان میں بھی حضرت امام صاحب پر بہترین کام ہوا ہے۔آج کی جدید دنیا کی جدید یونیورسٹیوں میں حضرت امام کے فقہ اور اصول فقہ پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جارہے ہیں۔ لاکھوں صفحات لکھے گئے ہیں اور کروڑوں لکھے جائیں گے۔زیر نظر کتاب دفاع امام ابو حنیفہ معروف قلم کار' نامور عالم دین حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی تالیف کردہ ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے مختلف ابواب باندھے ہیں اور ہر باب میں انتہائی شگفتگی سے اپنے مدعا کو بیان کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حق ادا کیا ہے۔ آخری باب میں دور جدید کے جدت پسندوں کی خوب علمی گرفت کی ہے، اجتہاد مطلق کی شرعی حیثیت اور نظریہ نیم تقلید اور بے جا توسع کی مذمت میں کمال مہارت دکھائی ہے۔کتاب کے شروع میں محدث کبیر حضرت مولانا عبدالحق حقانی کا افتتاحی مضمون'جناب مولانا سمیع الحق صاحب حقانی کا پیش لفظ' حضرت مولانا قاضی

زاہد الحسینی صاحب کا مقدمہ بے حد خوبصورت ہے۔ حرف آغاز کے عنوان سے خود مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کا ایک تفصیلی مضمون شامل ہے جو ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ میرے خیال میں مولانا حقانی صاحب کی جملہ تصانیف میں اہل علم و قلم میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب دفاع امام ابو حنیفہ ہی ہے۔ میں نے کئی جید علماء کو اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کئی پی ایچ ڈی مقالوں میں اس کتاب کو ریفرنس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کئی معروف لائبریریوں میں بھی مولانا کی یہ کتاب پڑھتے دیکھا ہے۔ مولانا موصوف کی یہ علمی کاوش اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے اور علمی کتب خانے ییں ایک دلچسپ اضافہ اور ایک گراں قدر علمی تحفہ ہے۔امام صاحب علیہ الرحمۃ کے زندگی کے تمام گوشوں کو خوبصورتی سے سمیٹا گیا ہے گویا یہ امام صاحب پر دائرۃ المعارف و انسائیکلوپیڈیا ہے۔اور مخالفینِ فقہ حنفیہؒ کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ ہے۔ خواہ مخواہ امام کبیر کی مخالفت کرنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ایک دفعہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ ان کے چودہ طبق روشن ہوجائے۔

سہ ماہی نوائے انوار کراچی

رسالے کا نام: سہ ماہی نوائے انوار کراچی

زیر سرپرستی: مولانا منظور احمد مینگل صاحب مدظلہ

نگران اعلی: مولانا شفیق الرحمان صاحب گلگتی

مدیر: مفتی صباح الدین غذری

معاون مدیر: مولانا محمد سلمان

ناشر: شفیق الرحمان گلگتی

مطبع: آرٹ ورلڈ

ہمارے سامنے ''سہ ماہی نوائے انوار کراچی'' کا پہلا مجلّہ موجود ہے۔ یہ مجلّہ بالخصوص جامعہ انوار العلوم شاد باغ ملیر کا ترجمان ہے اور بالعموم تمام مسلمانوں کا۔ ۵۲ صفحات پر مشتمل یہ مجلّہ دینی صحافت میں ایک مثبت پیش رفت ہے۔ متنوع دینی مضامین ہیں، مفتی صباح الدین (مدیر مجلّہ) کے قلم سے جامعہ انوار العلوم کا تعارف ' منہج فکر خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ جامعہ انوار العلوم اور اس کے ذیلی اداروں کی تصویری جھلکیاں بھی نظر آ رہیں ہیں۔ چونکہ '' سہ ماہی نوائے انوار'' کے نگران اعلی اور مدیر صاحب دونوں کا تعلق گلگت بلستان سے ہے اور جامعہ انوار العلوم کراچی بھی کراچی میں گلگتیوں

کا ادارہ سمجھا جاتا ہے' باوجودیکہ اس مجلے میں گلگت بلتستان کے حوالے سے کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔ ہماری طالب علمانہ گزارش ہے کہ مجلے کا ادھا حصہ گلگت بلتستان کے سماجی' رفاہی ودینی واصلاحی خدمات کے لیے مختص کیا جانا چاہیے۔ گلگت بلتستان کے علماء وفضلاء جہاں کہیں بھی خدمات انجام دیں ان کا اجمالی ذکر کیا جانا چاہیے' گلگت بلتستان کے دینی اداروں کی خدمات' علماء کرام کی سماجی 'رفاہی' دینی و تحقیقی اور علمی خدمات کو فراخدلی سے پیش کیا جانا چاہیے۔ بالخصوا اہل سنت کے ساتھ ارباب حل و عقد کی طرف سے کیاجانا والا ناروا سلوک کو بھی ببانگ دہل بیان کیا جانا چاہیے۔اور جتنا ممکن ہو سہ ماہی نوائے انوار کو گلگت بلتستان کے کونے کونے تک پھیلانا چاہیے۔ گلگت بلتستان سے دینی' اصلاحی اور تحقیقی وادبی رسالے کے اجراء کا اولین سہرا جامعہ نصرۃ الاسلام کے نام جاتا ہے۔ اور گلگت بلتستان سے متعلق دینی رسالوں کی بھی کوئی بہتات نہیں' سہ ماہی خیر کثیر لاہور' جوکہ مولانا حبیب اللہ راشدی (بلتستانی) کی ادارت و انتظام اور ناچیز کی معاونت سے جامعہ علی المرتضی گوجر خان سے نکلتا تھا۔کچھ مدت سے بحران کا شکار ہے۔ اور ماہنامہ شہاب مولانا عطاء اللہ شہاب اور راقم تحریر کی ادارت سے گلگت سے شائع ہوتاہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مذکورہ مجلات کے مابین ایک بہترین رابطہ قائم کرکے ' بروقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق دینی صحافتی کام کو آگے لے جانے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ان تمام رسائل کے درمیان ہم

آہنگی کے لئے سہ ماہی نوائے انوار کے ارباب و ذمہ دار ''پل ''کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔
بہر صورت اولین مجلے کے مضامین دلچسپ ہیں' فضائل رمضان پر انوار العلوم کے فضلاء
کے مضامین بھی معلومات افزا ہیں۔مجلے کا سائز اگر تھوڑا بڑا رکھا جائے تو مناسب ہے۔
اور ڈیزائینگ اور پیج میکنگ بھی کسی ماہر سے کروایا جائے تو بہتر ہے تاکہ باطنی حسن
کے ساتھ ظاہر حسن بھی ہو

ملجا و ماوا

کتاب کا نام: ملجا و ماوا

شاعر: مسرور کیفی

ناشر: محمد رمضان میمن

مطبع: آفتاب برادرز نزد میمن ہسپتال اردو بازار کراچی

سن اشاعت: باردوم' جنوری 2012ئ

قیمت: 50روپے

ملجا و ماوا محترم مسرور کیفی صاحب کا نعتیہ کلام ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ حمدیہ و نعتیہ کلام سے مزین و مرصع ہے جو ادارہ جہانِ نعت نے خوبصورت انداز میں چھاپا ہے۔ مسرور کیفی صاحب کے اس مجموعے نعت پر معروف شاعر احسان دانش، بانو قدسیہ، حفیظ تائب اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اصحاب علم و قلم نے تقاریظ اور تبصرے لکھے ہیں۔ مجموعی طور پر مسرور کیفی صاحب کی نعتیہ کلام دل گرما دینے کے لئے کافی ہے، ویسے بھی مسلمان نبی کریم کا نام سنتے ہی والہانہ محبت سے دور شریف پڑھتے ہیں اور یہی حکم خداوندی بھی ہے۔ اور آپ کی مدح سرائی اور ثنا میں لکھا ہوا کلام تو پڑھنا مزید فرط عقیدت کا سبب بن جاتا ہے اور یہ تمام لوازمات مسرور کیفی صاحب کے کلام میں موجود ہے۔ نعت خواں حضرات کو ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ مسرور کیفی

صاحب کے اشعار کا لہجہ نرم، زبان پاکیزہ، رنگ روپ سادہ، بیان دلفریب اور انداز عقیدت مندانہ و والہانہ ہے۔ان کا ایک شعر آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

کیسے خدا پاک کو پہچان پائے گا
وہ شخص جو حضور کو پہچانتا نہ ہو ☆☆☆

تفسیر سورۃ الفاتحہ ' تحفۃ الاسلام

کتابچے کا نام: تفسیر سورۃ الفاتحہ ' تحفۃ الاسلام

مؤلف: مولانا حافظ محمد اکرم

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

اشاعت: بار اول' جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ/ مئی 2011ئ

ضخامت: 96 صفحات

تفسیر سورۃ الفاتحہ ' تحفۃ الاسلام میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورۃ الفاتحہ کی تشریح و تفسیر بہت ہی تفصیل سے کی گئی ہے۔ ہر آیت کے ذیل میں تشریحات و توضیحات کو مفصل اور سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے' بسم اللہ کی تفسیر میں کئی عنوانات لگائے گئے ہیں ' ملاحظہ ہوں۔ ☆.... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ☆.... بسم اللہ سے آغاز کیوں ؟ ☆.... باکا معنی ☆.... بامیں سرافگندگی ☆.... بسم اللہ مہر خداوندی ☆.... بسم اللہ کی برکت ☆... کتاب اللہ کا دروازہ ☆.... بسم اللہ کے انیس حروف ☆..... بسم اللہ میں وفور رحمت ☆..... بسم اللہ کی خاصیت۔ یہی انداز سورۃ الفاتحہ کے ہر ہر آیت کی تشریح و تفسیر کے لئے اپنایا گیا ہے۔ بہر صورت کتاب اہل ذوق کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے کتاب کے آغاز میں پیش لفظ بھی لکھ کر

کتاب کا حسن دو بالا کیا ہے۔

کتاب کا نام: خطبات حقانی

افادات: مولانا عبدالقیوم حقانی

ضبط وترتیب: مولانا قاری رمضان

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

تاریخ طباعت: بار ہفتم' رمضان ۱۴۳۲ھ/ اگست 2011ئ

ضخامت: 333 صفحات

قیمت: درج نہیں

زیر نظر کتاب جید عالم دین' معروف سوانح نگار حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے خطبات کا مجموعہ ہے۔مولانا عبدالقیوم حقانی کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔انہوں نے جس خلوص دل کے ساتھ دینی خدمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔دارالعلوم حقانیہ میں ایک طویل عرصہ درس وتدریس اور تحقیق وتالیف کے ساتھ وعظ ونصیحت کا جو سلسلہ انہوں جاری رکھا تھا یہ کتاب انہی دنوں کی حسین یادگار ہے۔یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے کہ پٹھان علماء میں مولانا سمیع الحق صاحب کے بعد سب سے خوبصورت اردو لکھنے کا سہرا مولانا عبدالقیوم حقانی کو جاتا ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب جتنا اچھا لکھتے ہیں شاید اس سے اچھا بولتے ہیں۔یہ کتاب اس بات

پر دال ہے۔ شیخ الحدیث مولانا مفتی فرید صاحب مرحوم نے پیش لفظ لکھ کر کتاب کے حسن کا دوبالا کر دیا ہے' اس پر مستزاد مولانا انوار الحق صاحب نائب مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک و نائب صدر وفاق المدارس العربیہ کی تقریظ ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں مولانا حقانی صاحب کے سولہ (١٦) خطبات شامل ہیں۔ خطبات کیا ہیں علم و فن کا ایک دریا موجزن ہے۔ان خطبات کو دیکھ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت و تعلق اور جہاد فی سبیل میں لگن و دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔کتاب کو جس خوبصورتی سے مرتب کیا گیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ مختلف مدارس' سیمینارز' اجتماعات اور جمعہ کے خطبات پر مشتمل یہ کتاب علوم دینیہ سے تعلق رکھنے والے علماء اور طلباء کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر اتنا سلیس اور مزین و مربوط اور مدلل مواد' خطبات کی شکل میں معدوم نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ قرآن وحدیث اور سیرت رسول و صحابہ کی زندگیوں سے جہاد کا مفہوم سمجھانے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ بیشک 'عبدالقیوم حقانی کی کتاب خطبات حقانی' خطبات حکیم الامت قاری طیب' خطبات فاروقی' خطبات قاسمی' خطبات شیخ القرآن' خطبات حیدری اور ندائے منبر و محراب کی صف شامل ہونے والی کتاب ہے۔ خطبہ کرام 'ائمہ مساجد' طالبان علوم نبوت اور بالخصوص خطابت میں ذوق رکھنے والے احباب سے گزارش کی جاتی ہے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں یہ کتاب آپ کا تھوڑا وقت لے کر آپ کو بہت کچھ دے گی۔انشاء اللہ

قدرِزر

کتاب کا نام: قدرِزر

رشحات قلم: شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد زر ولی خان صاحب

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

ترتیب: حافظ محمد قاسم

تاریخ طباعت: بار سوم، فروری ۲۰۱۱ئ/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

ضخامت؛ ۱۰۸ صفحات

قدر زر حضرت مولانا مفتی زر ولی خان صاحب دامت فیوضہم (شیخ الحدیث و مہتمم جامعہ احسن العلوم کراچی) کے رشحات قلم کا مجموعہ ہے۔کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔

باب اول'' مکاتیب ''پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مکاتیب حضرت مولانا مفتی صاحب نے مولانا عبدالقیوم حقانی کے نام لکھے ہیں۔ یہ خطوط کسی نہ کسی کتاب پر تبصرہ اور تجزیہ پر مشتمل ہیں۔ باب دوم مفتی صاحب کے مختلف ''خطبات '' پر مبنی ہے جس میں کئی خطبے ہیں اور باب سوم ''تعارف و تبصرہ کتب '' پر مشتمل ہے۔ یہ تمام خطوط، تبصرے اور خطباب ماہنامہ الاحسن اور القاسم میں شائع ہو چکے ہیں۔تاہم استفادہ عامہ کے لئے حافظ محمد قاسم صاحب نے ان کو کتابی شکل دے دی ہے۔کتاب کے ابتدا میں مولانا ابراہیم فانی صاحب نے اردو

اور فارسی میں منظوم کلام سے خراج تحسین پیش کی ہے اور تقدیم کے عنوان سے مولانا حقانی صاحب کی ایک خوبصورت تحریر بھی ہے۔ مولانا زر ولی خان صاحب ایک معروف علمی شخصیت ہیں۔ اللہ تعالی نے انہیں فن علم حدیث و قرآن کے ساتھ ساتھ بولنے اور لکھنے کے فن سے بھی خوب نوازا ہے اور یہ کتاب اس کا بین ثبوت ہے

☆☆☆

یادگار روح پرور اجتماع

کتابچے کا نام: یادگار روح پرور اجتماع

زیر سرپرستی: مولانا عبدالقیوم حقانی

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ کے۔پی۔کے

اشاعت: خاص، ماہنامہ القاسم ۱۴

ضخامت: ۸۴

۸۴ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ دراصل زین المحافل شرح الشمائل للترمذی کی تقریب رونمائی کے حوالے سے منعقدہ پروگرام کی روئیداد ہے۔ یہ کتاب حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ کے درسی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ اس حوالے اس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے شریعت ہال دارالحدیث میں ملک کے کبار علماء و مشائخ کو مدعو کرکے ایک عظیم الشان اجتماع کا انعقاد کیا گیا تھا اس میں علماء کرام و مشائخ عظام نے کتاب زین المحافل شرح الشمائل للترمذی اور حضرت مولانا سمیع الحق صاحب اور جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اس کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔یادگار روح پرور اجتماع میں نقش اول کے عنوان سے مولانا عبدالقیوم حقانی کی ایک اچھی تحریر بھی مرقوم ہے۔ جید علماء کرام کے خیالات بھی کتابچے کا حصہ ہیں۔

کرپشن میں لت پت گلگت بلتستان: ایک تجزیہ

گزشتہ چار سالوں سے گلگت بلتستان کی موجودہ گورنمنٹ بالخصوص نام نہاد پارلیمانی حکومت اوراس کے مخصوص چیلے کرپشن کے قعر مذلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ گلگت اسمبلی میں ارکان اسمبلی ایک دوسروں کی کرپشن کا کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ وہ اس امر کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے حکمران پارٹی کی کرپشن کو کسی بھی فورم میں ثابت نہ کیا تو انہیں جو سزا دی جائے قبول ہے۔ وزیر اعلیٰ کہتے ہیں کہ میں نے ارکان اسمبلی کے کہنے پر کرڑوں روپے کی کرپشن معاف کردی ہے اس طرح کی ملی جلی کیفیات یہاں روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے زیادہ جس ادارے میں کرپشن ہوتی رہی ہے، میرٹ کا قتل ہوتا رہا ہے وہ محکمہ تعلیم ہے۔ محکمہ تعلیم میں اعلیٰ سطح سے لے کر نیچلی سطح تک ہر دوسرا آدمی رشوت اور کرپشن کی لَت میں پت ہے۔ باخبر ذرائع کی اطلاعات ہیں کہ محکمہ تعلیم میں بعض ذمہ دار لوگ کئی فرضی ملازمین کے ناموں سے تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ یہ بات عوامی حلقوں میں گردش کررہی ہے کہ محکمہ تعلیم میں نوکریاں فروخت کی جاتیں رہیں ہیں۔ استادی کی ایک سیٹ کم از کم چار لاکھ اور بعض کارندے پرانی تاریخ سے تقرری آرڈر جاری کرواکے چھ لاکھ تک رقم وصول کرتے رہے ہیں۔ اس چھینا جھپٹی میں اوپر سے لے کر نیچے تک سب کا حصہ ہوتا ہے، حصہ بقدر جثہ ملتا رہاہے۔ محکمہ تعلیم

نے ایسے ایسے لوگوں کو بھی استاد بھرتی کیا ہے کہ اگر ان سے پرائمری سطح کی امتحان بھی لیا جائے تو وہ پاس نہیں ہو سکتے ہیں۔اساتذہ کی ایسو سی ایشن بھی اس مکروہ دھندے میں بری طرح ملوث ہے۔ایک باخبر ذرائع کے مطابق ایسو سی ایشن کے ایک مرکزی ذمہ دار نے اپنے ایک ایسے بھائی کو استاد بھرتی کروایا ہے جو گزشتہ دس سال سے پنجر وین چلاتا ہے۔اس طرح کے کئی اور لطیفے قسم کے لوگوں کو بھی استاد بھرتی کیا گیا ہے اور کئی ساروں کو گریڈ ۱۴اور ۱۶ میں بھرتی اور ترقی دینے کا انکشاف ہوا ہے۔ محکمہ تعلیم میں ہونی والی کرپشن کے حوالے سے نیب کی تحقیقات بھی دورس ثابت نہیں ہوئی۔ بلتستان میں تو کرپشن کی تحقیقات کرنے سے نیب کو وزیر اعلیٰ نے روک دیااور کچھ وزراء کرپشن کو تحفظ دینے کے لیے میدان میں کود چکے ہیں۔

سر راہ یہ باتیں گردش کر رہی ہیں کہ ایسے لوگوں کو بھی بھرتی کیا گیا جن کے پاس مطلوبہ سرٹیفیکٹ ہی نہیں تھا۔ یا ان کے پاس بی ایڈ، سی ٹی اور اے ٹی سی کی اسناد ہی نہیں تھے، تاہم جعلی اسناد تیار کروا کے انہیں بھرتی کیا گیا۔ اور انہیں تنبیہ کیا گیا کہ جلد از جلد مطلوب اوریجنل اسناد کسی بھی طریقے سے حاصل کرکے جمع کروادیا جائے۔ عوام کا کہنا ہے کہ سرکاری کالجوں کی بھی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ لیکچراروں کی کمی ہے۔ اس وجہ سے چلاس کالج کے طلبہ نے تین دن تک پوری کالج کو تالا لگائے رکھا یہاں تک کہ ڈائریکٹر

کالجز نے وہاں جاکر جھوٹی تسلیاں دے کر کالج واگزار کروایا۔ان طلبہ کا ایک ہی مطالبہ تھاکہ چلاس کالج سے تنخواہ لینے والے تمام لیکچراروں اور پروفیسروں کو چلاس بھیج دیا جائے۔طلبہ سے وعدہ کیاگیا تھا کہ ڈگری کالج چلاس کو مطلوبہ اساتذہ فراہم کیے جائیں گے جو ہنزہ نگر،، بلتستان، گلگت اور غذر میں ڈیوٹیاں دیتے ہیں مگر دیامر کے بجٹ سے تنخواہ وصول کرتے ہیں۔تاحال عملا ایسا نہیں ہوسکا۔ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ضلع دیامر کو تعلیم سے دور رکھاجاتا ہے اور ساتھ ہی اخباری مہم چلائی جاتی ہے کہ دیامر والے جاہل اور تعلیم کے دشمن ہیں۔اسکولوں کا بھی یہی حال ہے۔ضلع دیامر کے سینکڑوں استاد اور استانیاں گلگت اور مضافات میں ڈیوٹیاں دے رہی ہیں جبکہ ان کی پوسٹ دیامر میں ہوتی ہے۔انہیں شرائط کے ساتھ دیامر ہی کے لیے بھرتی کیا گیا ہے مگر یہ لوگ تنخواہ میں سے پانچ ہزار کسی لوکل آدمی کو دے اپنی جگہ ڈیوٹی پر متعین کردیتے ہیں اور پھر سال بھر آزاد ہوکر تنخواہ وصول کرتے ہیں۔یاللعجب

طلبہ اور عوامی شکایت ہے کہ گلگت بلتستان کی کالجز میں ایک انتہائی مایوس اور اسلام دشمنی پر مبنی سازش گزشتہ کئی سالوں سے روا رکھی گئی ہے وہ ہے گلگت بلتستان کی تمام کالجز سے عربی،اسلامیات اختیاری،تاریخ اسلام کو عملا ختم کردیا گیا۔ کسی کالج میں ان تینوں مضامین کے استاد موجود نہیں،اور نہ ہی

ان مضامین میں نئے لیکچررز کو بھرتی کیا جاتا ہے۔بی اے کی کلاسوں میں تو اردو اختیاری بھی عملاً ختم کرکے فارسی کو تقریباً لازمی قرار دیا ہے۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد جب متعلقہ مضامین کے حوالے سے داخلہ لینا چاہتے ہیں تو انہیں کہا جاتا ہے کہ اس مضمون کا استاد نہیں ہے۔ایک طویل عرصے سے ان مضامین کے لیے لیکچررز کی آسامیاں ہی مشتہر نہیں کی گئی ہیں، حالانکہ گلگت بلتستان میں ایم اے عربی، اسلامیات اور ایم اے تاریخ اسلام میں ڈگریاں حاصل کرنے والے سینکڑوں نوجوان ہیں۔ قراقرم یونیورسٹی کا بھی یہی حال ہے۔ عوام اور طلبہ کا کہنا ہے کہ تعلیم پر قابض ایک طبقہ جان بوجھ کر ان اسلامی ومشرقی مضامین کو مسلمانوں سے محروم کرنا چاہتا ہے۔لوگ قرآنی زبان کو سمجھنا چاہتے ہیں، اسلامی علوم حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ اسلامی روایات وتاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر ہمارے ارباب دانش اور تعلیم پر قابض مافیا ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق انہیں اپنی تعلیمات، ماضی سے جڑا خوبصورت رشتہ سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ایک باوثوق ذرائع کے مطابق اس سال قراقرم یونیورسٹی بورڈ کے امتحانات میں صرف انٹر میں چھ سو سے زائد طلبہ وطالبات نہیں عربی مضمون میں حصہ لیا، امتحان دیے اور ۹۹ فیصد نے کامیابی حاصل کی۔انہوں نے عربی کی تعلیم اپنے طور پر مختلف لوگوں سے حاصل کرکے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔کاش ہمارے کالجز میں اس کا اہتمام ہوتا تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں عربی زبان سیکھتے مگر انگریز کی اولاد ایسا نہیں چاہتی ہے۔ محکمہ تعلیم بیں عربی

اور اسلامی علوم و اسلامی تاریخ کے دشمن آفسر شاہی کل روز قیامت اللہ اور رسول کو کیا منہ دکھائیں گے۔

عوام بالخصوص غریب طبقات کی اطلاعات ہیں کہ حالیہ صدارتی پیکج ۲۰۰۹ء کے ذریعے سیکرٹیریٹ کا صرف (CS) اسمبلی میں براجمان ممبران اور وزراء روز کئی چکر سی ایس اس لیے لگاتے ہیں کہ مختلف سیکرٹریوں پر پریشر ڈال کر اپنے رشتہ داروں کو بھرتی کروا سکیں۔ محکمہ تعلیم کے علاوہ دوسرے محکموں میں بھی یہی صورت حال گزشتہ کئی سالوں سے عروج پر ہے۔ محکمہ برقیات و تعمیرات اینڈ واٹر سپلائی میں بھاری رشوت کھا کر جعلی بھرتیاں کی گئی ہیں اور جو حق دار تھے ان کو سکروٹنی کا نام دے کر نوکریوں سے نکالا گیا ہے۔ اور جن سے رشوت لے کر بھرتی عمل میں لائی گئی تھی ان کو بچانے کے لیے سیلف گورننس پیکج کی مہربانی سے بننے والے وزراء متحرک عمل ہیں۔ یہی ہے سیلف پیکج کے جاندار ثمرات۔ جس سے ایک مخصوص مافیا نہایت سرعت سے مستفید ہوتا جا رہا ہے۔ ایک مخصوص طبقے کو نوازنے کے حوالے سے سیلف گورننس آرڈر کا ایک اور کرشمہ ملاحظہ کیجیے۔ ''سیلف گورننس آرڈر میں قانونی پیچیدگیاں، نیشنل بینک کے کروڑ کے نادہندگان گرفتاری سے بچ گئے۔ نیشنل بینک کے نادہندگان میر غضنفر، محمد علی 90 اختر، میرزہ حسین، شبیر ولی، جاوید حسین کو چیف کورٹ گلگت نے گرفتاری کا حکم دیا تھا تاہم نادہندگان نے چیف کورٹ میں پیشی سے قبل اپنے وکیل امجد حسین

ایڈوکیٹ (ممبر جی بی کونسل) کے ذریعے اپیلٹ کورٹ سے رجوع کرتے ہوئے مؤقف اختیار کیا کہ گورننس آرڈر 2009ء کے تحت چیف کورٹ کو ہائی کورٹ کا درجہ حاصل نہیں ہے لہٰذا چیف کورٹ کو سماعت سے روکا جائے۔ جس پر اپیلیٹ کورٹ نے فریقین کو نوٹس جاری کیا۔سیلف گورننس آرڈر میں پیچیدگیوں، ناکامیوں، ابہام اور خامیوں کی وجہ سے قوم کے کروڑوں لوٹنے والے گرفتاری سے بچ نکلے۔سیلف گورننس میں خامیوں کی وجہ سے نادہندگان لمبے عرصے کے لیے قرضوں کی ادائیگی سے بچ (گئے۔'' (روزنامہ رہبر، جمعۃ المبارک 13 ستمبر 2013ئ

گلگت بلتستان میں تعمیرات وترقیات کے ایسے کاغذی منصوبے اور پروجیکٹ تیار کیے گئے جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ ان کاغذی منصوبوں کی آڑ میں پیکج کے مداحین نے کرڑوں ہضم کرلیے۔بلدیاتی افراد کا فنڈ چند افراد میں بانٹنے کی وجہ سے گلگت بلتستان کے دیہاتوں میں میں عوامی ضروریات کے کئی منصوبے بری طرح متاثر ہوئے، گلگت بلتستان میں کوئی دیانت دار آفیسر کرپشن اور میرٹ کو پامال کرنے والوں کے خلاف حرکت میں آکر کاروائی شروع کرتا ہے تو پیکج کی بدولت اقتدار کی راہداریوں پر قابض لوگ ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ان کے خلاف سازشیں کی جاتیں ہیں۔اخبارات میں ان کے خلاف بیانات دیے جاتے ہیں اور انہیں تبدیل کروایا جاتا ہے۔یہ سب صرف اس لیے کہ کہیں ان کی اپنی خرمستیاں سامنے نہ آجائے۔ کہیں ان کے رشتہ دار جن کو انہوں نے رشورت

اور سفارش کے ذریعے بھرتی کروایا تھا کو نکالا نہ جائے۔نیب اور چیف سیکرٹری اور چند ایماندار سیکٹرز اگر اس علاقے کا وقار بڑھانے کے لیے کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو بھی یہی نام نہاد سیاسی لیڈر رکاوٹ بن جاتے ہیں۔اسلام آباد میں بیٹھ کر ان کے خلاف سازشیں بنتے ہیں اور انہیں مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ایک اور المیہ بھی ہے کہ ماضی میں وفاق سے اکثر کرپٹ آفیسران کو یہاں بھیجا جاتا رہا ہے، وہ یہاں کے کرپٹ آفیسروں اور عوامی نمائندوں سے مل کر لوٹ مار کا بازار گرم کرتے رہے ہیں تاہم مرکز میں س نئی حکومت کے قیام کے بعد گلگت بلتستان میں بھی خوشگوار تبدیلیاں آنی شروع ہوئی ہیں۔

سلک روٹ فیسٹول کے نام سے گلگت بلتستان میں فحاشی کا ایک نیا باب کھول دیا گیا ہے۔ خواتین اور نوجوان لڑکیوں کے دیسی ناچ پیش کیے گئے ہیں۔ ہمارے وزراء کو غیر ملکی سفیروں کے سامنے ڈانس کرنا پڑا۔ایک بڑا فنڈ مہمان سفیروں کے نام پر اڑایا گیا۔ اور تو اور وفاقی حکومت نے گلگت اسمبلی کے نیچلے ملازمین کے لیے بقر عید پیکج کے نام سے رقم بھیجا تھا۔پیکج سے مستفید ہونے والے عوامی نمائندوں نے ان غریبوں کا فنڈ بھی اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا۔ اور غریب ملازمین ان کا منہ تکتے رہے۔احتساب بیورکے ذمہ داروں نے کچھ عملی مظاہرہ کیا ہے۔ انہیں چاہیے کہ کرپشن میں لت پت تمام ٹولے کی گردنوں میں مضبوط طوق ڈالے۔آٹا بحران پیدا کرنے والوں کا بھی کڑا احتساب ہونا چاہیے۔ نیٹکو

کے اعلیٰ عہدہ داروں کے ساتھ ملکر گزشتہ پانچ سال سے گلگت بلتستان کو سبسڈی کے طور پر دی جانے والی گندم کو چوری کرنے والوں کو طوقِ سلاسل پہنانا چاہیے۔تاکہ آئندہ کوئی نانجار غریبوں سے نوالہ چھیننے کی جرأت نہیں کرے گا۔نیٹکو کا ایم ڈی نیا آیا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ وہ نیٹکو میں ہونے والی کرپشن کی شفاف تحقیقات کروائیں گے اور اس قومی ادارے کو مزید منافع بخش اور اسٹیبلش کریں گے۔

اخبارات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آخر عوامی نمائندوں اور کرپٹ آفیسران نے مل جل کر اس علاقے کا ایسا برا حال کیوں بنا رکھا ہے۔اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان کے ان افعال رذیلہ پر کوئی ایکشن لینے والا بھی موجود نہیں۔عدالتیں بھی چپ سادھ لیئے بیٹھی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ہم کس طرف جارہے ہیں۔وفاقی وزیر امور کشمیر جناب برجیس طاہر ان کرپٹ لوگوں کے احتساب کی باتیں تو روز روز کرتے ہیں مگر عملی طور پر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔انہیں بھرپور عزم کے ساتھ کرپٹ
وزرائ، ممبران اسمبلی اور آفیسران کو کٹھمرے میں لانا ہوگا۔ ورنہ یہ علاقہ مزید تباہی کی جانب بڑھے گا اور یہ ملک اور علاقہ دونوں کے لئے نیک شگون نہیں۔حالیہ دنوں میں چیف سیکڑی نے کرپشن کے حوالے سے کافی مثبت اقدام اٹھائے ہیں بالخصوص محکمہ ایجوکیشن میں انہوں نے کمیٹیاں تشکیل دی ہیں تاکہ وہ جعلی طریقوں سے بھرتی ہونے والے

تمام لوگوں کی تحقیقات کریں اور میرٹ پر بھرتیاں عمل میں لائیں۔ان تحقیقات کا دائرہ پورے گلگت بلتستان میں پھیلا ہے جو بہت اچھی بات ہے۔اخباری اطلاعات کے مطابق مقامی کابینہ کے اختیارات کو کم کردیا گیا ہے،تاکہ ان کی کرپشن کو روکا جاسکے۔ کرپشن اور جعل سازی میں ات پت کچھ آفیسران کو بھی معطل کیا گیا ہے اور کافی ساروں کے محکمے بھی تبدیل کیے جاچکے ہیں۔ ان اقدامات سے عوام مطمئن نظر آرہی ہے کہ آئندہ بہت جلد اچھے نتائج نکل لیں گے۔

F.M,99، ایک شام کے ساتھ

تمام اسلامی مہینے مقدس و متبرک ہیں۔ اسلامی مہنیوں میں ربیع الاول کو انتہائی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس ماہ میں سرورِ کائنات حضرت محمد کی ولادت باسعادت بھی ہوئی ہے اور آپ اسی مہینے میں ہی اللہ رب العزت کے پیارے ہوگئے ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آپ کی ذات عالم انسانیت کے لیے مینارۂ نور ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت بلکہ خَلقُ اللہ کے محسن ہیں۔ یہ ایک بدیہی سچ ہے کہ آنحضرت نے اپنی تعلیمات کے ذریعے دنیائے انسانیت کو امن کا گہوارہ بنایا۔ مغرب کا تیار کردہ موجودہ انسانیت کا عالمی چارٹر تعلیمات نبوی اور اعمال نبوی کا چربہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کی کاپی کی گئی ہے۔ اس آفاقی خطبے کو مغرب نے اپنی مرضی سے اپنی خواہشات کے مطابق کچھ ترمیمات کرکے انسانی بنیادی حقوق کا چارٹر کے نام سے دنیا میں متعارف کروایا ہے۔

بارہ ربیع الاول دن ڈیڑھ بجے کا وقت تھا، میں اپنے تدریسی مشاغل سے فارغ ہوکر گھر پہنچا تھا کہ برادرم عثمان کا فون آیا کہ ایف ایم 99 کے کچھ دوست آج تین بجے سے پانچ بجے تک سیرت رسول پر آن آئیر پروگرام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی کیا رائے ہیں۔ چونکہ پروگرام بہت طویل تھا جس کے لیے باقاعدہ تیاری

بالخصوص سکرپٹ کی تیاری ضروری تھی۔ تاہم میں نے انہیں بیس منٹ میں جواب دینے کو کہا۔ اگلے بیس منٹ میں، میں نے خود کو ذہناً تیار کیا اور انہیں ہاں میں جواب دیا۔ یوں ایف ایم 99 کے برادر نوید (آر جے) مجھے لینے آئے اور ہم ڈھائی بجے جوٹیال میں واقعہ ایف ایم 99 کے مرکزی آفس پہنچ گئے۔ ہمیں کنٹرول روم میں بٹھادیا گیا۔ اور برادر نوید کچھ ضروری ہدایات دے کر پروگرام کی تیاری میں مصروف ہونے لگے۔

میرے ساتھ مولانا ذاکراللہ عزیزی صاحب بھی تھا۔ یوں ٹھیک تین بجے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہماری گفتگو شروع ہوئی، جو پانچ بج کر پانچ منٹ تک چلتی رہی۔ ہم نے اپنی دانست کے مطابق سیرت پر کافی تفصیلی بات کی۔ مولانا ذاکراللہ عزیزی صاحب نے زیادہ بات کی، انہوں نے شستہ اور موثر گفتگو کی۔ ان کا انداز مروجہ مبلغانہ تھا۔ یعنی اپنے ایک مخصوص انداز میں بات کو طول دینا اور گھمانا۔ تاہم آئن لائن اور الیکٹرونک میڈیا کے تقاضے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔

دو گھنٹوں کی طویل نشست میں سامعین نے کافی سوالات بھی پوچھے۔ ہم نے اپنی علمی بساط کے مطابق جوابات دینے کی کوشش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے کافی پہلو زیر بحث آئے۔ بالخصوص غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات، مسلم ریاستوں میں ان کے حقوق وفرائض اور اسلامی نصاب میں ان کا تذکرہ، سیرت طیبہ اور قوانین عالم، گلگت بلتستان کے معاشرے کے بنیادی تقاضے اور قرآن وسیرت

کی روشنی میں ان کا حل، تعلیم و تربیت اور زندگی گزارنے کے دیگر طریقے سیرت نبی کی روشنی میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت وشفقت کے کافی قصے بھی موضوع بحث رہیں۔ مجموعی طور پر اس نشست کو کافی سراہا گیا۔ دوران نشست ہی فیس بک اور فون کے ذریعے تہنیت کے کافی پیغامات موصول ہوئے اور کچھ اہم سوالات بھی پوچھے گئے۔ سامعین کی طرف سے اس نشست کو ''موسٹ انفارمیٹیو'' قرار دی گئی ۔ برادرم نوید (آر جے ایف ایم 99) بھی ٹھہر ٹھہر کر بہت اچھی گفتگو کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی خوبصورت سوالات کیے۔ پروگرام کے بعد کئی اہل علم نے اس کوشش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور آئندہ اس مساعی جمیلہ کو تیز کرنے کی حمایت بھی کی اور مخلصانہ مشوروں سے بھی نوازا۔ مجھے پہلے سے ریڈیو پاکستان گلگت میں اس طرح کے پروگرامات میں حصہ لینے کا تجربہ رہا ہے۔ وہاں کے پروڈیوسرز بھائیوں کی توجہ پر کئی دفعہ علمی و ادبی نشستیں ان کے ساتھ ہوچکی ہیں اور مختلف موضوعات پر میری چند ایک ریکارڈنگ ریڈیو پاکستان میں محفوظ ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً نشر کی جاتیں ہیں۔

اس تحریر کا اصل محرک ماہ ربیع الاول کے حوالے سے ہونے والی تقریبات اور پرنٹ و الیکٹرونک میڈیا کی نشریات ہیں۔ ہم مسلمان دنیا میں عجیب قوم ہیں۔ ہم بھی مغرب کی طرح اپنے محسنوں کو مخصوص ایام میں یاد کرتے ہیں۔ یہ رواج تو مغرب کا عطاء کردہ ہے۔ وہاں نوجوان اپنے بوڑھے والدین کو سال میں ایک دفعہ

کہنے کے لیے اولڈ ہاوسز جاتے ہیں۔ کسی کی یاد میں کسی ''Happy Birth Day'' خاص دن شمعیں جلاتے ہیں اور بس......۔ ہم بھی اس نقالی میں ان سے آگے نکل چکے ہیں۔ ماہ محرم میں حضرت فاروق اعظم اور نواسے رسول،جنت کے نواجوانوں کے سردار، جگر گوشہ بتول اور میدان کرب وبلا میں دادِ شجاعت دینے والے حضرت حسین کو یاد کرتے ہیں اور پھر سال بھر ان دونوں کی تعلیمات، ایثار وجذبہ اور آفاقی مشن بھول جاتے ہیں۔ پھر ربیع الاول میں ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں محلے گلیاں سجاتے ہیں، کھیر اور حلیم کی دگیں پکاتے ہیں۔ مساجد اور پبلک مقامات میں اجتماعات منقعد کرتے ہیں اور ساتھ ہی الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا بارہ ربیع الاول کو خصوصی نشریات کا اہتمام کرتی ہیں اور پھر پورے سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بھول جاتے ہیں اور ان کی جاندار تعلیمات کو بھی۔ کیا محمد کا ہم پر صرف اتنا ہی حق ہے؟۔

میری ان تمام حضرات جو سیرت نبوی پر آنحضرت کی شان ومنقبت اور سیرت و صورت اور تعلیمات پر اجتماعات کا اہتمام کرتے ہیں اور ریڈیو اور ٹی وی میں محافل سجاتے ہیں سے گزارش ہے کہ وہ ان پروگراموں کو صرف اس ایک مہینہ اور ایک دن کے ساتھ مخصوص نہ کریں۔ کیونکہ نبی ساری زندگی ہمارے لیے نبیِ رحمت ہیں۔اس کے لیے باقاعدہ انتظامات ہونی چاہیے۔ ہنگامی بنیادوں پر کی جانے والی تقاریر سامعین کو کچھ بھی نہیں دے سکتی،الٹا مقرر کی کمزور باتوں

سے سامعین اکتا جاتے ہیں اور دین سے دور بھی ہوتے ہیں۔ اور ایک اہم بات یہ ہے کہ ان عوامی اجتماعات اور میڈیائی پروگراموں کو شرعی اور اسلامی بھی بنانے کی ضرورت ہے۔ سیرت کے پروگرام میں ڈھول، ناچ، بھنگڑا اور قوالیوں کا کیا تُک ہے۔ اور ہاں میڈیائی پروگراموں میں سیرت نبوی کے بیان کرنے کے دوران بیک گراؤنڈ میں میوزک کی کیا ضرورت ہے۔ میں اکثر ایسے پروگرامات دیکھ کر کڑھنے لگتا ہوں کہ ایک طرف سیرت بیان ہورہی ہے اور ساتھ ہی قوالی، بیک گراؤنڈ میں انڈین سُر اور لَے میں کئی مخصوص قسم کی سونڈ چلائے جاتے ہے۔ جو یقینا خیر کے بجائے شر کا سبب ہیں۔ اس سے اجتناب بہت ضروری ہے۔ اجتماعات اور میڈیائی پروگراموں کے ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ وہ ان پروگراموں کو ہنگامی بنیادوں پر ترتیب دینے کے بجائے باقاعدہ ہوم ورک کرکے انجام دیں۔ ہفتہ قبل ہی وسیع المطالعہ، وسیع النظر، تجربہ کار، عربی وعلاقائی زبانوں پر دسترس اور بالخصوص قرآن و حدیث اور قدیم وجدید علوم سے واقفیت رکھنے والے علماء کرام، مفتیان عظام، شیوخ، اسکالرز اور محققین سے رابطہ کریں اور انہیں کسی ایک خصوصی موضوع پر لب کشائی کرنے کی دعوت دیں تو یقینا نتائج بہت ہی بہتر اور مثبت نکلیں گے۔ اور اکثر موضوعات پر جب تحقیقی گفتگو سامعین کے سامنے مختلف صورتوں میں آجائے گی تو انہیں عملی زندگی میں اپنانے کے لیے سہولت بھی ہوگی۔ رٹی رٹائی باتوں پر اکتفا کرنا قطعاً مفید نہیں اور نہ ہی قوم کو اس کی ضرورت ہے۔ ایک اور اہم گزارش ایف ایم 99 کے ذمہ داروں سے کرنی ہے۔ میں

خود اس ایف ایم کا سامعی ہوں۔ ایف ایم 99 کو گلگت بلتستان کے ہزاروں لوگ شوق سے سنتے ہیں۔ اس پیں سال بھر انڈین اور دیگر سونگ (گانے) چلائے جاتے ہیں اور کبھی کبھبار کوئی دینی پروگرام بھی کیا جاتا ہے۔ تو کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہفتہ میں تین پروگرام دینی ہوں۔ ایک سیرت نبی کے مختلف پہلوں کے لیے مخصوص ہو اور دو پروگرام دیگر قرانیات و احادیث کے لیے ہوں۔ کیا ہفتے کے 168 گھنٹوں میں صرف تین گھنٹے جناب محمد اور اس کی تعلیمات کا حق نہیں ہے؟۔ یقینا حق ہے اگر کسی کے دل میں محمدیت اور حسینیت کی تھوڑی سی رمق بھی موجود ہے تو۔ ورنہ مسلمانی اور دینداری کی باتیں تو کوئی بھی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہی چھوٹا سا فیصلہ ایم ایف 99کے فیصلہ ساز لوگوں کی بخشش کا سبب بنے اور دو جہاں میں آقائے کل کی برکتوں سے کامیابیاں ملے۔ آر جے نوید نے آخریں مجھ سے پوچھا کہ ایف ایم 99 میں آکر آپ کو کیسے لگا؟ تو میرا برجستہ جواب تھا کہ ''ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ، وجادلھم بالتی ھی احسن'' اللہ کا فرمان ہے کہ دین کی باتیں حکمت، موعظت اور خوبصورت دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے، تو میں نے بھی یہاں آکر آج ہواؤں کے دوش، دین اسلام کی کافی باتیں ہزاروں لاکھوں میل دور بیٹھے لوگوں تک حکمت، بصیرت اور خوبصورت دلائل کے ساتھ پہنچایا ہے۔ اس ابلاغ میں ایف ایم 99کا مرکزی کردار ہے تو مجھے یہاں آکر بہت اچھا لگا ہے۔ اللہ قبول فرمائے۔

گلگت بلتستان کی حکومت، تمام تعلیمی اداروں اور مذہبی رہنماؤں سے ایک درمندانہ گزارش ہے کہ وہ گلگت بلتستان میں سیرت نبوی پر بہترین کانفرنسوں کا اہتمام کریں۔ پھر ان کانفرنسوں میں ارباب علم و دانش اور صاحبان فکر وبصیرت کو علمی و تحقیقی مقالے پیش کرنے کی دعوت دیں۔ یہ کوئی نئی بات بھی۔ پاکستان کے دیگر صوبوں میں یہ طریقہ کافی عرصے سے مروج ہے جس کا علمی دنیا میں بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ گلگت بلتستان میں اس کی ایک مثال اسماعیلی ریجنل کونسل کی طرف سے سیرت پر سالانہ کانفرنس کے انعقاد کی شکل میں موجود ہے۔ ان سے بھی معلومات لی جاسکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دوسرے مسالک کے ذمہ دار بھی باقاعدہ پالیسی کے تحت سالانہ سیرت کانفرنسوں کے انعقاد کو یقینی بنائے۔ کم علم اور غیر مستعد لوگوں کے ذریعے ہنگامی طور پر منعقد ہونے والے اجتماعات ہرگز مفید نہیں ہوتے۔ ایسے پروگرومات میں مقررین سیرت کے بیان سے زیادہ اپنی سیاسی گفتگوؤں سے فارمیلٹی پوری کرتے ہیں۔ ان علمی کانفرنسوں کے ذریعے اسلامی تعلیمات نکھر کر سامنے آئیں گی اوراہل علم کو علمی مواقع بھی میسر آئیں گے اور انہیں دادِ تحقیق دینے کا موقع بھی ملے گا۔ اور عوام کی کم علم، اُجڈ اور منافرت پھیلانے والے مذہبی نیتاؤں سے جان بھی چھٹے گی۔

خلاصہ کلام کہ ان علمی کانفرنسوں ،میڈیائی نشریات اور اجتماعات کے ذریعے

سماجی انصاف اور بہترین قیام عدل پر مبنی ایک دیندار معاشرہ تشکیل پائے گا۔ فی الوقت جس کی سب سے اشد ضرورت ہے۔ اللہ کا ہی فرمان ہے''وما کنا مہلک القری الا واھلہا ظٰلمون'' (۴۵) یعنی: '''اور ہر گز نہیں غارت کرنے والے بستیوں کے مگر جبکہ وہاں کے لوگ گناہ گار ہوں. ''۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں تمام گناہ بدرجہ اتم موجود ہیں جو قہرالٰہی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی ترویج اور عدل وانصاف کا قیام خواب بن کر رہ گیا گا۔ قانونی اور معاشرتی مساوات کا جنازہ نکل گیا ہے۔ مذہبی آزادی کی جگہ مذہبی دل آزاری نے لے لی ہے۔ مال وجان ، عزت وآبرو اور بنیادی انسانی حقوق بری طرح پامال ہورہے ہیں۔ شخصی آزادی ختم ہو کر رہ گئ ہے۔ تعلیم وتعلم اور روشن خیالی وفکری کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اطاعت حکومت، قانون کی پابندی، آئین کی بالادستی، لاءاینڈ آرڈر اور باہمی تعاون ایثار، اخلاقی صفات، رواداری، رفاہ عامہ اور ان جیسی بے شمار باتیں مفقود ہیں۔ معیشت کی گاڑی بیٹھ چکی ہے۔ احتساب، سزاو جزا کا تصور دور دور تک نظر نہیں آتا۔ چوروں کا راج ہے۔ اندھیر نگری ہے۔ ڈاکوؤں کے موج ہیں۔ لٹیرے مسلط ہیں۔ حرام حلال کی تمیز ختم ہے۔ غربت
بیروزگاری، کرپشن، اقرباء پروری اور افراتفری شیش ناگ کی طرح پھن نکالے ڈسنے، کو تیار بیٹھے ہیں۔ نمود ونمائش عام ہے۔ تجارتی اور معاشرتی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ ذخیرہ اندوزی جڑیں پکڑ چکا ہے۔ جوا بازی معمول کا حصہ ہیں۔ سماجی، فلاحی اور معاشی انصاف خواب بن کر رہ گیا ہے۔

ہم بار دگر عرض کرتے ہیں کہ خدائی احکامات اور سنت نبوی کے مطابق جو نظام ہوگا، جو ریاست چلے گی اور جو حاکم اس کا عملی نمونہ بنے گا، جو تاجر اس کی تعلیمات کے مطابق تجارت کرے گا اور جو تعلیمی نظام تعلیمات الٰہی و نبوی پر مشتمل ہوگا، غرض زندگی کے تمام پہیے دین اسلام کے مطابق چلنے لگیں گے تو اس ریاست و معاشرے میں زمین اپنے چھپے ہوئے قیمتی خزانے اُگل دے گی۔ ایسے معاشروں میں آسمان اپنی بے انتہا نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے۔ افلاس و تنگی، ظلم وجبر، تشدد و دہشت اور انتہا پسندی اور دیگر سماجی و معاشرتی مکروہات ختم ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اور ہر طرف امن و آمان، خوشحالی و خوش بالی اور سماجی انصاف قائم ہوجاتا ہے۔ نعمتوں اور رحمتوں کا دورہ دور ہوتا ہے۔ ''وما ارسلناك الا رحمة للعلمين'' اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

سہ ماہی نصرۃ الاسلام گلگت کا باقاعدہ اجرائ، ایک مثبت قدم

الحمدللہ، گلگت بلتسان سے پہلی دفعہ ایک مکمل دینی ، تحقیقی اور ادبی و تبلیغی مجلّہ کا آغاز گلگت بلتستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت سے کیا جاچکا ہے۔ لاریب کہ سہ ماہی نصرۃ الاسلام گلگت محض ایک مروجہ مجلّہ / رسالہ نہیں بلکہ یہ ایک تحریک کا آغاز ہے۔ایک مقدس مشن کی تکمیل کے لیے سنگ بنیاد ہے۔ گلگت بلتستان جیسے دور افتادہ علاقے سے ایک اذان حق ہے جو بہت پہلے شروع ہونی تھی مگر نہ ہوئی، تاہم دیر آید درست آید کے مصداق آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔مجلے کے مدیر اعلی اور مدیر کی دلی خواہش ہے کہ گلگت بلتستان کے تعلیم یافتہ نوجوان اس کا حصہ بنے، قاری کی شکل میں اور لکھاری کی شکل میں۔ اگر آپ میں قوم کی فلاح و رہنمائی کی تڑپ ہے اور اپنی تحریر کے ذریعے نظریاتی اور فکری انقلاب بپا کرنا چاہتے ہیں تو قلم اُٹھایئے اور حق گوئی و بے باکو اپنا شعار بناتے ہوئے قلمی جہاد کے اس سفر میں ہمارے ساتھ شریک سفر ہو جایئے۔

بے شک سہ ماہی نصرۃ الاسلام فکر و شعور ہے عدل و انصاف کا، آواز حق ہے مظلوم انسانیت کا، تمنا و آرزو ہے اہل حق کا، بازوِ شمشیر ہے باشندگان گلگت بلتستان کا اور شمشیر بے نیام ہے ظالمان گلگت بلتستان کے لئے۔ لاریب کہ ترجمان ہے جامعہ نصرۃ الاسلام کا، تو حق اور سچ کو اپنا نصب العین بناتے ہوئے غیر جانبداری سے دینی، اصلاحی، فکری و نظریاتی اور تحقیقی و خالص ادب اسلامی کے کے حامل اہل قلم اس سفر مبارک میں ہمارے رفیق سفر بنیں، لکھنے سے پہلے چند امور کو ملحوظ خاطر رکھے۔

۱۔ بغیر تحقیق و تفتیش اور حوالہ جات کے کوئی علمی تحریر نہ بھیجے۔

۲۔ موضوع کے انتخاب سے پہلے اس کی افادیت، اہمیت اور ضرورت پر کامل نظر رکھیں۔

۳۔ اپنی تحریر کو حقائق، دلائل و براہین اور اعداد و شمار اور تحقیق و مراجعت سے مزین کریں تاکہ قاری ابہام کا شکار نہ ہو۔

۴۔ قوم پرستی، مفاد پرستی، فرقہ پرستی، لسان پرستی اور بہت ساری پرستیوں کو چھوئے بغیر حق پرستی کا عملی ثبوت دیتے ہوئے تحریر تیار کرکے ارسال کریں۔

۵۔ سہ ماہی نصرۃ الاسلام کے موضوعات بے شمار ہیں کہ ملکی سالمیت و حفاظت، دین و دنیا کا حسین امتزاج، طرز معاشرت و حکومت، مضبوط اسلامی معیشت، تاریخ عالم، تاریخ عالم اسلامی، تاریخ گلگت بلتستان، اصلاح معاشرہ، عالم اسلام کی تنزلی اور اس کے اسباب، قرآنیات، دینیات، دنیا بھر کے اسلامی تحریکوں کا

تعارف، عالم اسلام کو درپیش چیلنجز، تعلیمی اصلاحات، اکابر علماء کی آپ بیتیاں و سوانح عمریاں، اور دیگر فکری و نظریاتی موضوعات خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔

یاد رہے! آپ خود بھی مجلے کے خریدار بنیے اور اپنے دوستوں کو بھی ترغیب دیں، نو آموز لکھاری تحریر، مراسلہ نگاری، کالم نویسی، فیچر رائٹنگ، میگزینی صحافت اور دیگر امور کے لیے براہ راست ایڈیٹر سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں، ایڈیٹر نمبر

03462974626 اور ای میل ibshaqqani@gmail.com اور ادارے کی

ایڈرس پر بذریعہ خط۔

وزیر تعمیرات بشیر احمد، اب بھی موقع ہے

کتنی ماتم کروں؟ سچ یہ ہے کہ تھک گیا ہوں، گوہرآباد کا وہ کونسا مسئلہ ہے جو محترم وزیر صاحب کے آنکھوں سے اوجھل ہے۔اور کونسا گوشہ ہے جس کے مسائل انہی اخبارات کے ذریعے ان کی بارگاہ عالی تک نہیں پہنچائے گے ہیں۔سچ ہے کہ نقارے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ڈگری کالج کے ایک سٹوڈنٹ نے ہلا کر رکھ دیا کہ: سر آپ کے علاقے کا ممبر کتنا لائق ہے، میں کیا کہتا، سر پیٹتے رہ گیا، کونسی قابلیت و پارسائی؟اُف! اس انجان کے سامنے گوہرآباد کی اصل صورت حال نہیں تھی،تب تو ایسی سیدھی سادھی بات کہہ دی۔ قارئین!یوں گلگت بلتستان کے وزیر تعمیرات بشیر احمد کو صرف اتنا جانتا ہوں جتنا آپ جانتے ہیں، میں کبھی ان سے نہیں ملا ہوں اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی ہے تاہم ایک دفعہ گوہرآباد کے غصب شدہ جنگلات کے حوالے سے ان کی رائے جاننے کی ضرورت پیش آئی تھی مگر رابطہ کرنے پر وہ ٹال کر گئے کیونکہ وہ خود غاصبین کی فہرست میں سرفہرست ہیں۔

دل کی بات یہ ہے کہ میں گوہرآباد کے دوسروں لیڈروں سے زیادہ ان کا لحاظ رکھتا ہوں مگر کیا کروں کہ مجھ سے خواہ مخواہ ان کی مدح نہیں لکھی جاسکتی

ہے۔میں نے گوہرآباد کی پسماندگی کو جب بھی مختلف فورم میں بیان کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وزیر محترم نشانہ بنے۔ کیونکہ وہ اس علاقے ایک نمائندہ ہیں اور قوم بلکہ غریبوں کے ساتھ اس نے وعدے کیے ہیں۔جب سے وہ اسمبلی ممبر بنے اور اب تو وزیر تعمیرات بھی بنے۔ میں انتظار میں رہا کہ گوہرآباد کے لیئے کوئی چھوٹا سا کارنامہ انجام دیں اور میں اس کو ہائی لائٹ کروں مگر افسوس ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔کیا وزیر محترم گوہرآباد کے مسائل سے اتنا انجان ہیں کہ سب ٹھیک ہے۔ لگتا ہے یا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔کیا گوہرآباد کے تباہ شدہ پل، سکولوں کی بربادی، واحد ڈیپنسری کی زبوں حالی، واٹرچینل کی شکستگی، اور روڈ کی تباہی جیسے بڑے بڑے مسائل جو منہ کھولے ہوئے ہیں، ان کی نظر کرم سے عنقاء ہیں۔اصل صورت کیا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر ناچیز اس تحریر کے توسط سے وزیر تعمیرات جناب بشیر احمد صاحب سے صرف اتنی گزارش کرتا ہے کہ خدارا! گوہرآباد کی حالت زار پر رحم کریں۔اب تو آپ کے پاس بہترین موقع ہے۔ اللہ نے ایک اہم وزارت آپ کے سپرد کیا ہے۔اس سے فائدہ اُٹھاؤ اور پسماندگی میں ڈوبے علاقے کے لئے کچھ تو کر جاؤ۔ مجھے آپ سے کوئی ذاتی عداوت نہیں بلکہ بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ، میں آپ کا خیر خواہ ہوں، انہوں نے مصر کے گورنر اشتر کو ہدایات جاری کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جو لوگ آپ پر تنقید کرتے ہیں ان کے قریب ہو جاؤ اور ان کی بات کو غور سے سنو۔ کیونکہ وہ آپ کے خیر خواہ ہیں۔اور آپ کی بہتری چاہتے ہیں۔ اور جو چاپلوسی

کرتے ہیں ان سے دور بھاگو، کیونکہ وہ دراصل آپ کے دشمن ہیں۔ ناجائز تعریفوں سے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ گوہرآباد کا ایک وزٹ کیا جائے اور لوگوں کے مطالبات سن کر صرف اور صرف ایک ،ایسا کام کریں جو آنے والی نسلیں آپ کو یاد کرنے پر مجبور ہوجائیں، کیا آپ کو یاد نہیں کہ ووٹ کے دنوں آپ نے لوگوں سے کتنے وعدے کئے تھے؟ کیا پیارے حبیب کی وہ حدیث یاد نہیں کہ من لا عہد لہ لا ایمان لہ، تو اُٹھو، قدم بڑھاؤ اور صرف ایک انقلابی کام کر دکھاؤ، یاد رہے یہ عہدے آنی جانی والی چیزیں ہیں۔ آج آپ کے پاس تو کل کسی اور کے پاس، مگر آپ کا کیا ہوا کام دیرپا ہوگا۔ اور آپ کو زندہ رکھے گا، کیا آپ کو زندہ رہنے کی خواہش ہے، یقینا ہے ،تو پھر گوہرآباد کے کسی ایک گھاؤ کو مندمل کرکے عوامی محبت کو سمیٹ لو۔ دونوں ہاتھوں سے، ورنہ پارٹیاں بدلتے رہوگے مگر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

انداز بیاں گرچہ میرا شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات

آرٹیکل63,6، حقیقت کے آئینے میں

میرے سامنے '' آئین پاکستان '' کی آرٹیکل نمبر63,62 کھلی ہوئی ہے۔ یہ دونوں آرٹیکلز کافی طویل ہیں۔ چونکہ آج کل پورا ملک ان دونوں آرٹیکلز کی ذیلی دفعات میں الجھا ہوا ہے اس لیے مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر ذرا کھل کر تبصرہ و تجزیہ کیا جائے۔سب سے پہلے ان دونوں آرٹیکلز کی ذیلی دفعات سے چند اہم دفعات نوٹ کرتے ہیں پھر ان کا عمیق تجزیہ۔

آرٹیکل نمبر63,62 ۔ یہ آرٹیکلز بنیادی طور پر پاکستانی پارلیمنٹ (ایوان زریں وبالا) جس سے بد قسمتی سے مجلسِ شوریٰ بھی کہا جاتا ہے کی رکنیت کے لئے اہلیت اور نااہلیت کی شرائط پر مبنی ہیں۔

آرٹیکل نمبر63,62 کی اہم ذیلی دفعات:

☆...اہلیت والی شرائط: یعنی ان شرئط کا خصوصی طور پر پایا جانا ضروری ہے۔

ا۔پاکستان کا شہری ہونا۔

۲۔اس کا کردار اچھا ہو' وہ عام طور پر اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی شہرت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ اسلام کا مناسب حد تک علم رکھتا ہو اور اسلامی فرائض کی بجا آوری کرتا ہو اور کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتا ہو۔

۴۔ دیانتدار' نیک' سمجھ دار اور امین ہو۔ فضول خرچ اور عیاش نہ ہو۔

۵۔ کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں سزا نہ پائی ہو اور نہ ہی جھوٹی گواہی کا مرتکب پایا گیا ہو۔

٦۔ پاکستان بننے کے بعد ملک کی یکجہتی کے خلاف کام نہ کیا ہو اور نہ ہی نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہو۔

☆ . . نااہلیت والی شرائط: یعنی ان تمام شرائط کے پائے جانے سے کوئی بھی پاکستانی پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بن سکتا ہے۔

۱۔ پاکستان کا شہری نہ ہو، یا کسی اور ملک کی شہریت حاصل کر چکا ہو۔

۲۔ وہ کسی ایسی آراء کا پرچار کر رہا ہو یا ایسی حرکات کا مرتکب ہو جن سے پاکستان کے نظریے' اقتدارِ اعلیٰ' سالمیت یا سیکیورٹی پر زد پڑتی ہو یا جس امن عامہ قائم کرنے یا اخلاقیات کی نفی ہو یا جس سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوتی ہو یا افواج پاکستان بدنام ہوتی ہوں یا طنز و تحقیر کا نشانہ بنتی ہوں۔

۳۔ غلط رویے (Misconduct) کے سبب حکومت کی نوکری سے برخاست ہوا ہو۔ البتہ اگر اس دوران پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہو تو اس پابندی کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۴۔ رائج الوقت قوانین کے تحت کرپشن کا مجرم پایا گیا ہو یا کوئی غیر قانونی

حرکت کا مرتکب ہوا ہو۔

☆.. لیگل فریم ورک آرڈر مجریہ 2002ء میں اراکین شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب کے مطابق ایسا شخص (q) ہونے کے لیے کچھ شرائط کا اضافہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ شق نمبر 63 مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب ہونے کا اہل نہیں جس نے خود، یا بیوی یا اپنے کسی زیر کفالت کے نام پر کسی بینک' مالی ادارے، یا کوآپریٹو سوسائٹی/باڈی سے بیس لاکھ یا زیادہ قرضہ لیا ہو جو واجب الادا تاریخ سے ایک سال تک کے عرصے میں ادا نہ کیا ہو یا پھر اس نے یہ قرضہ معاف کروایا لیا ہوا، ان دونوں صورتوں میں اسے نااہل تصور کیا جائے گا۔

قارئین انتہائی اختصار کے باوجود دفعات کافی طول پکڑ گئی۔ ذیل کے سطور میں اب ان دفعات کا ایک تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔

میں اپنے قارئین سے پیشگی معذرت چاہونگا کہ میں اس قانوں اور آئین کو اسلامی نہیں کہہ سکتا جو آئین صدر کو استشنیٰ عطا فرماتا ہے' کیونکہ آئینِ اسلام ،توخدا کا ائین ہوتا ہے اور خدا، اُس میں اپنی مرضی چلانے کی اجازت محمد اور خلفائے راشدین کو بھی نہیں دیتا۔کیا رسول اللہ اسلام کا ادنی سا حکم میں تغیر کر سکتا ہے؟کیا رسول اللہ کی بیٹی فاطمہ کسی جرم کا ارتکاب کرے تو محمد ان کو معاف کرنے کے مجاز ہیں ؟ کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا

کہ '' خدا کی قسم اس عورت کی جگہ میری بیٹی فاطمہ بھی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا؟۔ یہاں تو صدر پاکستان آئین کے تناظر میں بھارتی جاسوسوں ' ملکی غداروں اورخطرناک مجرموں کو بھی معاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آئین پاکستان کے تناظر میں آئین کو توڑنا اور اس کی خلاف ورزی کرنا آئین اورملک سے غداری کے مترادف ہے تو ان لوگوں کے بارے کیا جائے جو دہری شہریت کے حامل تھے مگر بڑا عرصہ وہ پارلمنٹ کے رکن رہے ؟اور پھر ان کے کاغذات نامزدگی بھی شرف قبولیت سے نوازے گئے۔

☆... کردار اچھا ہو' وہ عام طور پر اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی شہرت نہ رکھتا ہو۔تو اب کردار کی تعریف کون کرے گا' اسلامی قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے والا کیا اس ملک میں کوئی موجود بھی ہے ؟۔ اسلام کا مناسب حد تک علم رکھتا ہو '' اس حد کی مقدار کون تعین کرے گا؟ آئین ' عدلیہ یا ریٹرنگ آفیسر ؟ کیا یہ حد مقرر کرنے کے شرعی مجاز بھی ہیں ؟ پھر بینک ڈیفالٹرز کی تعداد تو ان گنت ہیں جو بار بار ممبر بن چکے ہیں۔ اور جنھوں نے این آر او کیا وہ کیا ہیں ؟۔ عدلیہ !آزاد عدلیہ کی تضحیک میں وہ عدلیہ اور جج بھی آتے ہیں جنہوں نے فوجی آمروں کو بار بار محفوظ راستہ عنایت کیااور آئین کو روندنے کی اجازت دی ؟افواج پاکستان !افواج پاکستان کی بدنامی و تحقیر میں وہ فوج

اور جرنیل بھی آتے ہیں جنہوں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے' لال مسجد کو صفحہ ہستی سے مٹانے'معصوم شہریوں کے قتل عام کو عوامی طاقت گردانتے' اور منتخب نمائندوں کو سولی پر چڑھانے اور ملک بدر کرنے میں صف اول کا کردار ادا کیا؟۔یقینا عدلیہ اور افواج پاکستان کی محبت ہر محب وطن پاکستانی کے رگ رگ میں رچ بس گئی ہے مگر.....ایسے کالے بھجنگ!

☆...اسلامی فرائض کی بجا آوری کرتا ہو اور کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتا ہو۔اسلامی فرائض کون کون سے ہیں کون گنوائے گا۔اگر معلوم بھی ہوں تو ریٹرنگ آفیسر ان اراکین سے یہ فرائض پوچھنے کے مجاز ہیں؟یقینا آئین اور عدلیہ کے مطابق مجاز نہیں ہیں بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے تو منع کر رکھا ہے۔اور پھر گناہ کبیرہ کی بات کی جائے تو سب کے سب ننگے ہو جائیں گے۔کیا ڈاڑھی کاٹنا گناہ کبیرہ نہیں ہے؟شاید اتنا ہی کافی ہے، اگر شراب نوشی' بیانگ دہل زنا'لوٹ کھسوٹ، کرپشن' قتل عام' مسجدوں کو بموں سے اڑانے کی بات کی جائے گی تو احباب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔

☆... دیانتدار' نیک' سمجھ دار اور امین ہو۔فضول خرچ اور عیاش نہ ہو۔فاسق و فاجر نہ ہو اور پارسا ہو۔یہ بھی شرائط ہیں ماشاء اللہ۔پارسائی کا دعویٰ تو اللہ کے برگزیدہ لوگ یعنی صحابہ کرام اور اولیاء عظام بھی نہیں کرتے چہ

جایں کہ پاکستانی ارکان پارلمنٹ۔اس شق کے مطابق تو ہزاروں کے لگ بھگ فوج ظفر موج کو اپنے آپ کو پارسا ثابت کرنا لازم ہوگا اور پھر ان کی پارسائی کی سند دینے والے خود بھی پارسا ہیں ؟۔ میری ناقص خیال کے مطابق اس ''خصوصی پارسائی'' پر تو بانی مملکت قائدِ اعظم اور حکیم الامت اقبال بھی نہیں اترتے' اور نہ ہی دونوں پارسائی کا دعویدار ہیں۔ تو پھر ریٹرننگ آفیسر آن کو ان کے کاغذات کو بھی مسترد کرنا پڑتا۔ فاسق و فاجر نہ ہو۔ عجیب ! ٹھیٹ اسلامی تعلیمات کے مطابق ' یعنی قدیم اور موجودہ دور کے جید علماء اسلام کی دینی تشریحات کے مطابق ڈاڑھی منڈوانا فسق اور اس عمل کا کر گزر نے والا فاسق ہوتا ہے۔ تو پھر عدلیہ کے قاضی القضاۃ' چیف الیکشن کمشنر اور صدر مملکت کی حیثیت کیا ہو گی۔

☆.. رکن پارلیمنٹ کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں سزا نہ پائی ہو اور نہ ہی جھوٹی گواہی کا مرتکب پایا گیا ہو۔ کیا آج تک وہ لوگ ہماری اسمبلی کے ممبر نہیں بنے جنھوں نے اخلاقی جرائم کی فیکٹریاں کھول رکھیں ہیں ؟ کل کے جیلوں کو آباد کرنے والے آج کے وزیر اور وزیرِ اعظم نہیں ہیں ؟۔

☆.. پارلیمنٹ کا ممبر بننے والا کسی ایسی آراء کا پرچار کر رہا ہو یا ایسی حرکات کا مرتکب ہو جن سے پاکستان کے نظریے' اقتدارِ اعلیٰ' اخلاقیات کی نفی

ہو یا جس سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوتی ہو یا افواج پاکستان بدنام ہوتی ہوں یا طنز و تحقیر کا نشانہ بنتی ہوں۔کیا نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنا کفر ہے؟برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ اور مطالعات پاکستان تو بتاتا ہے کہ نظریہ پاکستان کی بنیاد تو شیخ سرہندی' شاہ ولی اللہ 'سرسید احمد خان اور 1906 سے تو باقاعدہ رکھی گئی ہے اور اس وقت سے اس کی پرچار ہورہی ہے۔پھر پھر قائداعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے؟ہمارے یہ دونوں بزرگ ایک لمبے عرصے تک نظریہ پاکستان کے قائل نہیں تھے ۔قائداعظم تو مسلم لیگ میں شمولیت سے قبل کانگریس کے ذمہ دار رکن' متحدہ ہندوستان کے حامی اور اور دو قومی نظریے کے مخالف تھے۔اور پھر کیا نظریہ پاکستان کی تعریف آئین پاکستان میں موجود ہے ؟اگر ہے تو کیا ہے؟یا پھر کسی مجاز عدالت نے اس کی وضاحت کر رکھی ہے؟۔اگر اس کو لازم گردانا جائے تو پاکستان میں بسنے والے دیوبندی مکتبہ فکر کے تمام افراد الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ وہ آج بھی حضرت حسین احمد مدنی ' شیخ الہند محمود الحسن اور عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنا پیشوا مانتے ہیں ' اور یہ حضرات ڈنکے کے چوٹ پر نظریہ پاکستان کے مخالف تھے۔پھر تو ''سرحدی گاندھی'' کے متبعین اور باقیات بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کے رکن نہیں بن سکتے کیونکہ ان کا نظیریہ بھی نظریہ پاکستان سے بالکل مخالف ہے لیکن وہ تو روز اول سے اسی مجلس شوریٰ سے مستفید ہوتے چلے آرہے ہیں بلکہ اب کی دفعہ تو پورے ایک صوبے

کا کنٹرول بھی ان کے پاس رہا۔ہاں تو ترقی پسند تنظیموں کے احباب بھی تو نظریہ پاکستان کے مخالف ہیں۔ کسی کی وجہ سے ملکی سالمیت یا سیکیورٹی پر زد پڑتی ہو یا جس سے امن عامہ قائم کرنے میں خلل آتا ہو تو وہ بھی ممبر نہیں بن سکتا ہو۔کیا ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں کی وجہ سے ملکی سالمیت تباہ و برباد ہو کر نہیں رہی۔کیا جنگ دہشت گردی کو پوری قوم کے سروں پر مسلط کرنے سے کوئی ملکی سالمیت بھی رہ گئی ہے؟کیا مشرقی پاکستان میں قتلِ عام' بلوچستان کے حقوق پر ڈاکہ' آئین کا بار بار معطل کرنا' بے گناہ شہریوں کا قتل عام کرنا' ' بار بار وردی میں صدر بننے، پورے ملک کو وار آن ٹیرر میں دھکیلنے' شمسی آئر بیس اور دیگر مقامات بہادر امریکہ کے لیے چراغاہ کے طور پر دینا' آئین کو بار بار پاؤں تلے روندنا ملکی سالمیت کے خلاف نہیں؟۔ پھر عجیب بات کہ ! یہ کیسا سسٹم ہے جو مشرف کو کراچی اور ملک کے دوسرے حصوں سے تو نااہل قرار دے لیکن چترال سے اہل قرار دے۔یاللعجب ! یہ کیسا آئین اور سسٹم ہے جو ملک کے سب سے غریب سیاستدان جمشید دستی کو جیل کی سلاخوں میں بھیجتا ہے جنھوں نے صرف ایک بار جیت کر اپنے حلقے کے تمام افراد کا دل جیت لیا تھا اور گورننس کا انداز ہی بدل کر رکھ دیا تھا،اور وہ موٹی موٹی آسامیاں بار بار بھی پارلیمنٹ کی رکنیت بلکہ وزارتوں پر براجمان ہونے کے باوجود عوام کے دل تو کیا جیتتے عوام کا خزاں لوٹتے ہیں وہ الیکشن کے لیے مستحق قرار پاتے ہیں۔ مجھے اس نظام پر حیرت ہے کہ یہ ایک شخص کو دوربین لگا کر دیکھتا ہے

جبکہ دوسرے شخص کو عینک لگا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ایک تلخ حقیقت یہ کہ جس شخص کو آئین اور دستور پارلیمنٹ کی ممبر شپ کی اجازت نہیں دیتا کیاوہ شخص کسی اور قباء میں اسی پارلیمنٹ میں داخل ہو سکتا ہے یعنی مشیر خاص۔اور پھر وہ شخص جس پر باقاعدہ پاکستان کے مقتدر طبقات کی طرف سے الزامات ہوں' بھارت کے تعاون سے این جی اوز چلاتا ہو وہ کسی صوبے کا نگران چیف ایگزیکٹو ہو سکتا ہے۔یقیناً ہمارے ہاں سب کچھ ممکن ہے تو پھر جینوئن قلم کار آیاز میر کو بھی اجازت دینے میں کیا قباحت ہے۔ اگرچہ بے چارے نے جام نوشی کا اعتراف کیا ہے نا' منافقت تو نہیں کی ہے۔اور شراب پینے والے تو ہمارے قومی ہیرو بن جاتے ہیں، اگر یقین نہیں آ رہا ہے تو ۱۳ اپریل ۱۹۷۱ء کو پاک آرمی کوئٹہ گیریژن سے فرار ہونے والے اولین بنگالی افسر اور بنگلہ دیش میں بہادری اور شجاعت کا سب سے بڑا اعزاز'' بیر اُتم'' پانے والے میجر شریف الحق دالیم کا حالیہ انٹریو ضرور پڑھے۔تاکہ کچھ حقیقت کا آشکارا بھی ہو جائے۔ بہر صورت ہمیں آئین کو مشرف بہ اسلام بنانے کے بجائے خود کو مشرف بہ اسلام ہونا چاہیے۔اب کی بار اس پہ گزارہ کیجیے۔

قیام امن کے لئے معاشرتی مہم کی اشد ضرورت

گزشتہ کئی دنوں سے دل چاہ رہا ہے کہ گلگت بلتستان میں امن و آمان کے حوالے سے چند معروضات پیش کروں مگر دماغ اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ کسی کے کانوں جوں تک نہیں رینگتی ہے، لکھ لکھ کر قلم کا نب اور انگلیوں کے پُورے کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ دل اور دماغ کی اس لڑائی میں بالآخر دل جیت گیا، کیونکہ دل کے پاس دلیل مضبوط ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ امن آج گلگت بلتستان کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ امن کے بغیر نہ معاشی ترقی ممکن ہے نہ سماجی۔ امن کے لئے صرف حکومت پر انحصار کرکے نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اس کے لئے عام معاشرتی سطح پر ایک کامیاب مہم چلائی جانی چاہیے جو عدم تشدد، رواداری، بردباری، صبر و تحمل، احترام اور مکالمے کے کلچر کو عام کرنے کا سبب بنے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ سول سوسائٹی کے تمام شعبے ادارے اور طبقات یکسو ہوں ، اور مخلصی سے اپنا کردار ادا کریں۔ امن کے لیے معاشرتی اور سماجی انصاف انتہائی زیادہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر امن کا خواب دیکھنا عبث ہے۔ آج میرے مخاطب تمام معاشرتی افراد، گروہ، طبقات اور ادارے ہیں۔

اہل سیاست سے گزارش ہے کہ امن کے لئے کردار ادا کریں یعنی تمام سیاسی جماعتیں چاہیے حزب اقتدار میں ہوں یا حزب اختلاف میں، ایک آئیڈیل معاشرے کے قیام کو اپنے منشور و دستور کا لازمی حصہ بنائیں اور ایک ایسا کلچر کا فروغ دیں جو عدم تشدد، صبر و تحمل اور احترام و بردباری پر مشتمل ہو۔ اخباری بیانات اور جلسہ ہائے عام میں بازاری زبان سے گریز کریں اور ایسا لب و لہجہ اختیار کریں جو مہذب بھی ہو اور معاشرتی و جمہوری و اسلامی اقدار پر مبنی بھی ہو۔ ذاتی اختلاف کو نہ اچھالا جائے، اگر اختلاف کرنا بھی ہو تو نظری، سیاسی اور اختلاف برائے اصلاح ہو، اپنے کارکنوں کو معاشرتی و سماجی سطح پر رواداری اور مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ میل ملاپ کی تلقین کریں بلکہ ایسے پروگراموں کی تشکیل کریں۔ سیاسی لیڈر اور کارکن سیرت نبوی، خلافت راشدہ، صحابہ کرام اور اسلامی و مشرقی تعلیمات و روایات کو اپناتے ہوئے اسلامی و فلاحی ریاست و نظام حکومت کے لئے ماحول پیدا کریں۔ سیاسی ورکرز کی فکری بنیادوں پر مضبوط تربیت کی جانی چاہیے۔

علماء کرام سے دست بدست عرض ہے کہ علمی و فکری مسائل کو فرقہ واریت کا سبب نہ بننے دیں اور تحقیقی و تدریسی باتوں کو چوک چوراہوں میں بیان کرنے سے گریز کریں۔ مذہبی اختلافات بالخصوص مسلکی اختلافات کے آداب میں اکابر علماء و اسلاف امت کی روایات کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں جو باہمی احترام و

تعاون سے موسوم و عبارت ہیں۔ اور مذہبی اختلافات کو اشتعال انگیز اور شعلہ بار بنانے سے حتی الامکان بچا جائیں، ایک دوسروں کی برگزیدہ شخصیات کے احترام کو پیش نظر رکھ کر لعن طعن، دشنام طرازی، سب و شتم اور بازاری زبان کے استعمال سے مکمل اجتناب کریں۔ علمی، تبلیغی اور اصلاحی اسلوب کو اختیار کرکے فکری ارتقاء کو پروان چڑھائیں۔ مسجد اور منبر کو مرجع خلائق بنانے کے لئے استعمال کریں اور اسلاف کی تابندہ علمی، اصلاحی، فکری، تحقیقی، نظریاتی اور رواداری جیسے اوصاف و روایات کو ازسر نو زندہ کیا جائے۔

اہل صحافت اور میڈیائی دوستوں سے دل کی دُوہائی وفریاد ہے کہ خدارا! مذہب و مسلک کے خول سے نکلیں اور ایسے بیانات، مضامین، کالم، فیچر، نیوز رپورٹیں شائع کرنے سے گریز کریں جس سے کسی کی پگڑی اچھلتی ہو، مکمل غیر جانبداری کا ثبوت دیں، یک طرفہ ٹریفک چلانے سے گریز کریں، کسی بھی خبر کو قابل اشاعت قرار دینے کے لئے لازم قرار دیا جائے کہ اس کا مواد باہمی احترام کی مسلمہ تعبیرات سے متصادم نہ ہو، اور قومی ومعاشرتی اور علاقائی نقصان و فائدہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں اور اس کے لئے ایک کامیاب صحافتی ضابطہ اخلاق تیار کیا جانا چاہیں۔ نیز خبروں میں سنسنی خیزی، اشتعالانگیزی اور زرد صحافت سے اجتناب کیا جانا چاہیں۔ گزشتہ دنوں کے سانحات میں میڈیائی نمائندوں کی جانبداری اور مسلک پرستی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ بہر صورت اس حوالے سے

ہمارے صحافی بھائیوں اور اخبارات کے مالکان کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور ایک نقطے پر متفق ہونا چاہیے۔ اس طرح کی شتر بے مہاری سے گلگت بلتستان کی صحافت کو پروان چڑھایا جائے تو آنے والے دن اہل صحافت کے لئے نیک شگون ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے، اس کالاج رکھنا سب سے پہلے ارباب صحافت ہی پر لازم ہے۔

اہل علم و دانش اور صاحبان قلم و قرطاس سے مودبانہ استدعا ہے کہ تعلیمی اداروں میں برداشت کا ماحول پیدا کیا جائے، علمی درسگاہوں میں مکالمے اور مباحثے کا خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے، اپنے طلبہ و طالبات کو ایسی تربیت دی جائے جو سماجی ومعاشرتی روایات پر مبنی ہو، طلبا اور اساتذہ کی ایسو سی ایشنوں میں کمیونیکیشن گیپ کو ختم کیا جائے۔ دینی اور عمومی و عصری درسگاہوں کے طلبہ کے درمیان فاصلوں کو جتنا ممکن ہوسکے کم سے کم کیا جائے اور ان میں مثبت ڈائیلاگ کے کلچر کو عام کیا جائے۔ اپنی بات پر ہٹ ڈھرمی کے بجائے قرآن و سنت کی تعلیمات اور مسلمہ دانش وروں کے افکار و نظریات کو بنیاد بنا کر تعلیمی نظم و نسق چلایا جائے۔ اساتذہ ادب ایسے ادبی کلچر کو فروغ دیں کہ عوام و خواص اس کو تسلیم کئے بغیر رہ نہ سکے۔ اور نوجوان شعراء واُدباء کی خلوص نیت کے ساتھ رہنمائی کریں اور ایسے پروگراموں کی تشکیل و تنظیم کریں کہ آپس میں جوڑ واتحاد کی فضا پیدا ہوسکے۔ میری دانست کے مطابق گلگت شہر کے ادباء و شعراء یہ کام کر بھی رہے ہیں تاہم مزید بہتر سے بہترین

کا سوچا جانا چاہیے اور مابین کی اختلافات اور رنجشوں کو بالائے طاق رکھ کر امن کی اس مہم کو مزید فعال کرنا چاہیے۔سب کو مل بیٹھ کرکام کرنا چاہیے اور ایک دوسروں کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہیے۔

معاشرے سے تعلق رکھنے والے دیگر افراد، گروہ، طبقات اور اداروں سے بھی عرض ہے کہ وہ امن کی اس مہم میں اپنا حصہ ادا کریں، سرکاری آفیسر اور ملازمین کرپشن، کام چوری، اور میرٹ کی پامالی سے اجتناب کریں اور امانت و دیانت،فرض شناسی اور رواداری کا عملی ثبوت دیں۔ گلگت بلتستان کی پولیس پر جانبداری کا الزام ہے، جس کا اعتراف وزیر اعلیٰ،اسپیکر سمیت دیگر حکومتی ارباب نے کیا ہے۔ لہٰذا پولیس ڈیپارٹمنٹ کے سپاہی سے لیکر آفیسر تک کو اپنا رویہ درست کرنا چاہیے اور مسلکی وعلاقائی خول سے نکل کر اپنے فرائض کی بجاآوری کرنا چاہیے، بصورت دیگر مہدی حکومت کو ان کے خلاف سخت ایکشن لینا چاہیے۔

بہر صورت امن کے لئے ماوؤں بہنوں اور بیٹوں کو بھی کردار ادا کرنا ہوگا، انہیں اپنے نونہالوں کی درست تربیت کرنی ہوگی اور امن کے لیے دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ تنگی داماں کی وجہ سے تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے اگرچہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ معاشرے کے تمام نمائندہ طبقات کو مذکورہ بالا امور کا لحاظ رکھنا چاہیے اور ان کو عملی

جامہ پہنانا چاہیے تاکہ ہمارا یہ پیارا سا علاقہ امن و آمان کا گہوارہ بن جائے اور ناچیز کی امن کی اس آشا کو خون آشامی سے بچایا جائے تاکہ سب کے بنیادی حقوق محفوظ ہوں اور کسی کی مال ، جان ، عزت و آبرو کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ یوں ایک خوش حال اور سماجی ترقی پر مشتمل معاشرہ قائم ہو۔ رب الارباب سے التجاء خاص ہے کہ امن کی اس معاشرتی مہم کو چلانے کے لیے ہم سب کو توفیق دیں اور اس کار خیر میں ہماری معاونت و نصرت فرمائیں۔ آمین

''آزادی''

قارئین حیرت کی بات یہ ہے کہ جب میرا گزشتہ کالم ''کرفیو اور پابندی'' میرے معزز قارئین نے پڑھا تو وہ سرُ دھنتے ہی رہ گئے، اور انھوں نے اپنا فیڈ بیک یوں بیان کیا کہ ''ہمیں آج معلوم ہوا کہ آپ اتنے بڑے مفکر ہیں اور آزاد خیال مفکر'' ایک انتہائی پڑھے لکھے اور ذمہ دار دوست نے کہا کہ '' آپ کی تجویز کردہ تمام پابندیوں سے مجھے اتفاق ہے، بالخصوص قرآن حدیث اور فقہ اسلامی پر پابندی کی جو بات کی ہے وہ میرے دل کی بات کی ہے۔ پلیز آپ نے وعدہ کیا ہے کہ کن کن چیزوں کی آزادی ہونی چاہیے ان پر لکھنے کا، تو آپ اپنے وعدے کا جلد وفا کریں، کیونکہ بہت جلد ہی ایک اعلی سطحی میٹنگ تجاویز دینے کے لئے بلائی گئی ہے تو میں آپ کی تجویز کردہ
''پابندیاں'' اور'' آزادیاں'' ارباب حل و عقد اور صاحبان بست وکشاد کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کی تجاویز من و عن نافذ کریں گے، پھر دیکھ لینا کہ ہم ترقی کے منازل کیسے طے نہیں کرتے اور گلگت بلتستان کیسے امن کا گھوارہ نہیں بن جاتا ہے'' مجھے قارئین کے فیڈ بیک پر حیرت تو ہوئی، تاہم ایفائے عہد کے لیے بیٹھا ہوں۔ اختصار سے کام لیا جائے گا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ دنیا کے سب سے عظیم و کامیاب حکمران فاروق اعظم نے فرمایا تھا کہ '' انسان بنیادی طور پر آزاد پیدا ہوا ہے''۔ اور مغرب کا عظیم دانشور روسو نے کہا تھا کہ '' انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے''۔ میں کوشش کرونگا کہ ان فرمودات کی روشنی میں آج کے دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے چند آزادیاں تجویز کروں، تاہم ان دونوں اکابر کا زمانہ بہت پرانا تھا، اور مجھے معلوم بھی نہیں کہ ان کے خیالات کیا تھے آزادی کے متلعق، لہٰذا میں تو اپنے انداز میں آج اور آنے ولے کل کی بات کرونگا۔ تاکہ ہم ان تجویز کردہ آزادیوں سے فائدہ اٹھا کر آرام و سکون سے ترقی کے منازل طے کرتے چلے جائیں۔ ہماری حکومتی دانش گاہوں میں مکین احباب سے گزارش ہے وہ مذکورہ آزادیوں کو عملی جامہ پہنانے کی مکمل کوشش کریں۔ ہمیں مغرب کی آندھی تقلید کی آزادی ہونی چاہیے، قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی و اکابر و اسلاف کی علمی توضیحات کی من مانی تشریحات کی آزادی ہونی چاہیے، الحاد و کفریہ نظریات کی تبلیغ و ترویج کی مکمل آزادی اور سرمایہ دارانہ نظام کے تمام زریں اصولوں کی آزادی ہونی چاہیے، مثلاً حلال حرام کی تمیز کئے بغیر مال و دولت بنانے کی آزادی، مزدور کے حقوق غصب کرنے کی آزادی، سرکاری اداروں میں کرپشن کی آزادی، نااہل افراد کا اعلیٰ عہدوں پر تقرری کی آزادی، پڑھے لکھے بالخصوص پوسٹ گریجوٹ کی پولیس میں بھرتی کی

آزادی، کذب وافتراء سے بھرے متنوع اخباری بیانات کی آزادی، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی آزدای، خواہ مخواہ کی ترقی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی آزدای، مخلوط تعلیمی اداروں کی آزادی، سرکاری خزانے کو لوٹنے کی آزادی، ایمان دار آفیسروں کے تبادلے اور انہیں ذلیل کرنے اور بے ایمان، کمزور اور مفاد پرست آفیسروں کو آگے لانے کی آزادی، اے جی پی آر کے لونڈوں کے سامنے پروفیسروں اور علم کی روشنی سے منور کرنے والے استادوں اور لیکچراروں کا جھک کر سلام کرنے اور ان کی مٹھیاں بھرنے کی آزادی، امن کے نام پر بے تحاشا روپیوں کو بٹورنے کی آزادی، مختلف مسالک کے بے گناہ لوگوں کو چن چن کر مارنے کی آزادی ہونی چاہیے، دیکھنے میں آیا ہے کہ ہماری موجودہ حکومت یہ تمام آزادیاں خوب استعمال کر رہی ہے۔ ماشاء اللہ۔ میری گزارش ہے کہ وہ اپنے حوصلے پست نہ کریں بلکہ اس تسلسل کو جاری و ساری رکھیں، اور مزید آزادیوں کے لئے عملی اقدام کریں، مثلاً ہمارے ہاں جنسی ملاپ کی آزادی، شراب وکباب کی آزادی، ہم جنس شادی کی آزادی، معبد خدا سے مکمل بیزاری کی آزادی، شیخ وملا کی تضحیک کی آزادی، انڈین کلچر اور مغربی بود وباش کی ترقی کی آزادی، فحش لٹریچر کی آزادی، فحش فلموں کی آزادی، فحش لباس کی آزادی، فحش کلام کی آزادی، انسانوں کی سمگلنگ کی علی اعلان آزادی، معصوم بچوں کو بیرون ممالک منتقل کرنے کی آزادی، افیون، چرش، بھنگ، پاؤڈر اور نشئی انجکشن کی کھلے عام آزادی، نائٹ کلبوں کی آزادی، بازار حسن کی آزادی، مجرے اور مخلوط ڈانس کی

آزادی، مساج سینٹروں کی آزادی، عصمت نسواں کو تار تار کرنے کی آزادی، شرفاء کی پگڑیوں کو اچھالنے کی آزادی، ہسپتالوں میں غیر انسانی حرکتوں کی آزادی، مردوں کے گردے، آنکھیں، دل اور دیگر اعضاء سرے عام بیچنے کی آزادی، مساجد و مکاتب کو گرانے کی آزادی، علمی کتابوں کی ضبطی کی آزادی، روشن خیالی کے نام پر حلقہ احباب دین و دانش کے خیالات، طرز زندگی، لباس اور زھد و تقویٰ کا ٹھٹھے کی آزادی، طزو اور کومیڈی پروگراموں کے نام پر نوجوان بیٹوں، بہنوں اور بچیوں کو Jock مزاح اور نامحرم مردوں کے تلذذ و تلطف کے لئے اسٹیج میں مسخرے کرنے کی آزادی، ان کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ رکھنے کی آزادی بلکہ کن انکھیوں سے انہیں دعوت گناہ اور اس پر عملی جامہ پہنانے کی آزادی اور عورت کو مرد کے شانہ بشانہ بلکہ سینہ بسینہ کام کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ یقین کریں کہ اگر ہمیں مغرب کی ایجاد کردہ ان آزادیوں سے مکمل استفادہ کرنے کا موقع ملا تو ہم آن کی آن میں تیسری دنیا کے ممالک کی صف سے اُٹھ کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ امریکہ، روس اور برطانیہ کی مسلسل ترقی کا راز ہی ان آزادیوں کا مسلسل استعمال ہے، اور ہماری تنزلی اور انحطاطی کا سبب 73ء کا اسلامی آئین، قرار داد مقاصد، دینی لٹریچر، سیرت نبوی، اسلام کا سنہرا ماضی، آباو اجداد کا علمی ورثہ، آپس میں اتحاد و محبت، ہمدردی، اسلامی و مشرقی معاشرتی اقدار، قرآن کی آفاقی تعلیمات اور فقہ اسلامی ہے۔ آپ قوم کو ان تمام سے آزادی دلا کر دیکھیں، پھر ہم کیسے آسمان سے تارے توڑ کر نہیں لاتے

ہیں۔رہی بات اب تک ہم زندہ ہیں تو اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں، مثلاََ اسلام کی تقسیم در تقسیم، آپس کا تفرقہ بازی، دین کی من مانی تشریح، کبھی کبھار مسجد و ملا کی تضحیک، اسلامی علوم سے پہلو تہی، مدارس اسلامیہ کی انہدامی، مغربی کلچر کی آبیاری، امریکہ کی چاپلوسی، برطانوی روایات کا آزادی کے بعد بھی تسلسل سے جاری، منہ ٹیرھا کرکے انگریزی دانی، اپنے مسلم بھائیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے مختلف آئیر بیسوں کی فراہمی، امریکی ڈالروں کی فراوانی وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ باتیں نہ ہوتی تو ہم کب کے پتھر کے دور میں جاچکے ہوتے۔ میں نے شروع میں ہی کہا تھا کہ اختصار سے کام لونگا ورنہ میرے پاس آزادیوں اور پابندیوں کی ایک لمبی تفصیل ہے، اگر پالیسی میکر ضرورت محسوس کریں تو میں کسی بھی وقت ان کی خدمت عالیہ میں پیش کرنا فخر سمجھونگا۔ مکرر عرض ہے کہ میری تمام تجویز کردہ ''پابندیاں'' اور ''آزادیاں'' نیک نیتی پر مبنی ہیں اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں لہٰذا کسی کو ان میں فتور نکالنے کی قطعی آزادی نہیں ہے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ اس کا فتور عقل سمجھا جائے گا اور اس پر ''پابندی ''نہیں'' کرفیو'' لگایا جائے گا ایسا کرفیو کہ اس میں نرمی بھی نہیں ہوگی۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین

گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسوسی ایشن

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں نے ایک ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا۔ جب میں نے اخباروں میں یہ خبر دیکھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس میں دو رائے نہیں کہ گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوان ملک کے ہر علاقے میں اپنی صلاحتیوں کے جھنڈے گاڑھے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اتحاد نہیں ہے' ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں جس کی وجہ سے ان کو کئی مسائل کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم گلگت بلتستان یونین آف جرنلسٹ کراچی کے پلیٹ فارم سے کام کرتے تھے تو ہمیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں نے اس یونین کا قیام عمل میں لایا تھا۔ اس کے ابتدائی ارکان میں ڈیلی اسلام کے چیف رپورٹر' سنیئر صحافی وکالم نگار محترم عبدالجبار ناصر صاحب، روزنامہ بانگ سحر کے چیف ایڈیٹر جناب ڈی جے مٹھل صاحب اور برادرم شہاب الدین غوری صاحب' وائس آف گلگت بلتستان کے چیف ایگزیٹیو جناب ایس ایس ناصری اور دیگر شامل تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اس یونین کو زندہ رکھا۔ ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء کو اس یونین میں بطور سینئر نائب صدر کی حیثیت سے راقم الحروف کو

بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور کتنی سخت گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب بھی یہ یونین فعال ہے۔اب بھی اس یونین میں میرے کئی جونیئر دوست سرگرم ہیں۔ فیض اللہ فراق' ثمر عباس قذافی' اسلم انقلابی' فیروز خان' عباس وفا' ایس ایس ناصری'ریاض الدین'جان عالم اور اسلم شاہ ہنزائی وغیرہ اس یونین کے اہم حصہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع عثمانی' قاسم شگری' ریاض علی یاسینی' صادق حسین صادق' رحمت کریم' تعلیم شاہ' علی غلام اب بھی کام کر رہے ہیں۔

ملک کے دوسرے حصوں کی طرح اسلام آباد میں بھی گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے صحافی' بہترین صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ گلگت بلتستان کے اکثر اخبارات اسلام آباد/راولپنڈی کے طباعتی مراکز سے پرنٹ ہوتے ہیں اور ان کے ہیڈ آفس بھی عملاً اسلام آباد/راولپنڈی میں واقع ہیں۔ اور ایک محتاط اندازے کے مطابق گلگت بلتستان کے صحافیوں کی اکثریتی تعداد بھی وہاں پر مقیم ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا فورم ہو جہاں گلگت بلتستان کے اہل قلم اور صحافی حضرات جمع ہوں اور آپس کے اشتراک وتعاون سے صحافتی امور کو انجام دیں۔اس حوالے سے گزشتہ کافی عرصے سے مشاورت جاری تھی۔جب میں اسلام آباد میں تھا تو اس حوالے سے صحافی دوستوں سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اب جب

گلگت بلتستان کے صحافیوں کی ایسو سی ایشن کے قیام کا علم ہوا تو دل خوشی کے بلیوں اچھل
پڑا۔بڑی خوش کن بات یہ ہے کہ اس میں باخبر صحافی شامل ہیں۔ گلگت بلتستان کے
صحافیوں کی ایک بڑی ٹیم جمع ہوئی ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ اسلام
آباد/راولپنڈی میں گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کو قدر کی نگاہ سا نہیں
دیکھا جاتا تھا' وجہ صاف ظاہر تھی کہ ان میں اتحاد و یکجہتی نہیں تھی۔ بکھرے پڑے تھے۔
ان کی آواز اسلام آباد اور اس کے گرد نواح میں دب کر رہ جاتی تھی۔ ثمر عباس قذافی
اور برادرم عالم نور حیدر (سینئر نائب صدر ایسو سی ایشن) کے ساتھ کئی دفعہ اسلام آباد
پریس کلب میں اس حوالے سے بات چیت رہی' وہاں کے صحافیوں کا رویہ بھی دیکھا
ان کا رویہ مجموعی طور پر کوئی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ تاہم اب ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔'
گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسو سی ایشن کے پلیٹ فارم سے گلگت بلتستان کے صحافی اب جہاں
کہیں بھی جائیں گے تو ان کو ان کا جائز مقام مل جائے گا۔ ایسو سی ایشن کے قیام میں
برادرم رشید ارشد (ایڈیٹر روزنامہ ہمالیہ ووائش چیئرمین ایسو سی ایشن) کا مرکزی کردار
ہے۔ میں ایسو سی ایشن کے تمام عہداروں جناب اکبر حسین اکبر' رشید ارشد' کریم مدد'
عالم نور حیدر' شبیر حسین' شفقت حسین' زوہیب اختر' علی شیر' منظور حسین اور گورنگ
باڈی کے تمام ممبران کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام تحسین پیش کرتا ہوں اور ان
سے امید کرتا ہوں کہ وہ صحافتی اقدار کو کبھی بھی پامال نہیں ہونے دیں گے اور صحافت
میں شرط اول غیر جانبداری ہے'

انشاء اللہ وہ غیر جانبداری سے اپنے فرائض کو انجام دیں گے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھونگا کہ گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسوسی ایشن کو اپنے لیے ایک الگ ضابطہ اخلاق اپنے علاقائی ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دینا چاہیے۔ کیونکہ ہمارا علاقہ ہر لحاظ سے مختلف حیثیت کا حامل ہے۔ راقم الحروف نے ۲۰۰۹ء کو گلگت بلتستان یونین آف جرنلسٹ کراچی کے لئے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا تھا اس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس ' مدیران اخبار اور دیگر صحافتی انجمنوں سے اپنی ساکھ کو برقرار رکھتے ہوئے مثبت (CPNA) کی تنظیم تعلقات استوار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ گلگت بلتستان کی حکومت سے بھی گزارش کرونگا کہ اس نوخیز صحافتی ایسوسی ایشن کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرے' یاد رہنا چاہیے کہ انہی صحافیوں کی وجہ سے بہت سے عام لوگ معروف و مشہور ہوئے ہیں ورنہ ان کو ان کے محلے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا، اب وہ بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں ' لہٰذا اچھے دنوں میں اپنے دوستوں کو ضرور یاد کیا جانا چاہیے۔ میں جب کراچی میں تھا تو گلگت میں مقیم صحافیوں اور اہل قلم سے مستقل رابطے میں تھا' ایک دلی خواہش تھی کہ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے علاقے میں جاکر صحافتی و ادبی برادری کے ساتھ مل کر کوئی خدمت انجام دوں گا تاہم یہاں آکر مجھے اس حوالے سے کافی مایوسی ہوئی' بے مروتی و بے التفاتی پر مبنی انداز کو دیکھ کر دلبراشتہ ہوا اور دل نے کہا کہ ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں' کیونکہ کچا

تیرا امکان ہے تو خیال کر'' تاہم گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسوسی ایشن کو چاہیے کہ گلگت بلتستان میں مقیم تمام صحافتی و ادبی انجمنوں سے مضبوط بنیادوں پر تعلقات استوار کرے اور کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے نوجوان صحافیوں سے بھی روابط میں رہے اور ان کے ساتھ اپنے مسائل شیئر کرے اور ان کی بھرپور رہنمائی کرے۔ مجھے امید ہے کہ اس حوالے سے گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسوسی ایشن اسلام آباد اہم کردار ادا کرے گی' اور لیڈری اور رہبری کا تاج اپنے سر لے گی۔ کیونکہ اس یونین میں میرے دوست رشید ارشید' جناب اکبر حسین اکبر (ریجنل انچارج پی ٹی وی) جناب کریم مدد (سینئر رپورٹر اے ٹی ٹی) اور برادرم عالم نور حیدر جیسے پڑھے لکھے لوگ شامل ہیں جو صحافتی رموز و اوقاف کو اچھے طرح جانتے ہیں۔

میں اپنے ان دوستوں سے گزارش کرونگا کہ وہ صحافت کی اعلی اقدار کا ہر حال میں پاس رکھے' صحافت ایک مقدس پیشہ ہے' اور اس پیشے کا لاج رکھنا بھی صحافیوں کی ذمہ داری ہے۔ مرحوم الطاف حسین حالی نے مسدس حالی میں بے ضمیر قلم کاروں اور صحافیوں کے لیے ایک نظم رقم کی ہے۔ تو صحافی برادری سے گزارش کرونگا کہ وہ حالی کے بیان کردہ مذموم نکات سے بچتے ہوئے اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ ملاحظہ ہو۔

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی

جگر جس سے شق ہو، وہ تحریر کرنی
گنہ گار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تذلیل کرنی
یہ ہے صحافیوں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

نوجوان شاعر، عبدالکریم کریمی

عبدالکریم کریمی صاحب گلگت بلتستان کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں۔ سچ پوچھے تو کئی نقاد دوستوں کے کریمی کی شاعری پر اشکالات ہیں اور بجا ہیں۔ مگر اس میں دو رائے نہیں کہ کریمی نے بہت جلد ہی گلگت بلتستان میں اپنا امیج بنایا ہے۔ دل کی بات یہ ہے کہ کریمی کی نظم و نثر سے زیادہ کریمی کے لب و لہجہ نے ان کو '' پالولر'' بنا دیا ہے۔ ان سے فون میں بات کرو یا بالمشافہ، کریمی دلوں کو جیت لیتا ہے۔ میں خود اس کے انداز ملن اور گفتار لین سے متاثر ہوں۔

عبدالکریم کریمی کے فن پر تو اہل علم و ارباب قلم اور صاحبان فکر و اساتذہِ نقد و نظر ہی روشنی ڈالیں گے۔ تاہم مجھے جو سمجھ میں آیا وہ کچھ یوں ہے کہ لب و لہجہ کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کی صداقت ہے، یعنی کسی بھی جذبہ خواہ وہ ارفع ہو یا نیچلی سطح کا، اس طرح ظاہر کرنا کہ حقیقت آشکارا ہو جائے اور سامع ایسا محسوس کرے کہ گویا اس (شاعر یا قلم کار) نے اس (قاری یا سامع) کی دل کی باتیں کرید کرید کر وہی باتیں خوبصورت انداز میں طشتری میں رکھ دیا ہے یعنی اس کے دل کی بات کہہ دی ہے۔

اور ایسا لب و لہجہ اور انداز بیاں کا

مبالغہ اور تصنع سے پاک و صاف ہونا از بس ضروری ہے۔ اور میرے دوست عبدلکریم کریمی کے لب و لہجہ اور انداز بیاں میں یہ خصوصیات نمایاں اور ظاہر و باہر ہیں۔

کریمی شاعر بھی ہیں۔کالم نویس بھی ہیں۔ افسانہ نگار بھی ہے اور ایک بہترین مقرر بھی ہے۔ ایک مذہبی طبقہ کے ذمہ دار آدمی ہے۔ ان کی شاعری، نثری نگاری اور خطابت میں نہ فلسفہ طرازی ہے نہ معنی آفرینی، نہ بلند خیالی ہے نہ جدت بیان۔ کریمی آسمان سے تارے توڑ لانے کی باتیں نہیں کرتے بلکہ وہی عمومی باتیں بے دھڑک کہتے چلے جاتے ہیں جو عام طور پر سب کے دل و دماغ سے گزرتی ہیں لیکن کہتے اس انداز سے ہیں کہ دل میں اتر جاتی ہیں۔ یہاں ایک راز'' اوٹ'' کردوں کہ میرا کریمی کے بارے اس طرح لکھنا بعض دوستوں کو نہیں بھاتا ہے مگر میں کیا کروں کہ میں صاف لکھنے کا عادی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کریمی کے فن پر یہ چند الفاظ بھی ایک ''طفل مکتب'' کی طرف سے کچھ زیادہ ہی ہیں، کیونکہ جہاں اساتذہ ادب بالخصوص محترم شیر باز علی برچہ، جمشید خان دکھی، امین ضیائ، عبدالخالق تاج، استاد حفیظ شاکر، پروفیسر الہامی، حسن حسرت، عنایت اللہ شالی، حبیب الرحمان مشتاق اور میرے دوست پروفیسر احمد سلیم سلیمی جیسے لوگ کریمی کے فن پر نقد و نظر کریں گے وہاں طفلانِ مکتب اور مبتدئین ادب کے لئے ڈینگیں مارنا مناسب نہیں ہے۔ میرے جن احباب کو کریمی صاحب کے فن میں سرقہ

باری نظر آتی ہے ان کو چاہیے کہ وہ اس کا کھل کر اظہار کریں تاکہ آئندہ اس کی تلافی کی جاسکے۔

یہ چند الفاظ کریمی نمبر کے لیے بطور مختصر کے طور پر کاغذ کے دل پر اتارا ہے۔ خصوصی نمبر میں میرے سفر نامے کا آخری قسط بھی شامل ہے جو بہت طویل ہے لہذا مجھے طوالت سے گریز کرنا چاہیے۔ عبدلکریم کریمی کے سب سے پسندیدہ اشعار آپ کو بھی سناتا چلا جاؤں ۔ گلگت بلتستان کو خوبصورتی بالخصوص ضلع غذر کی ہیئت، حسن جمال کو سامنے رکھ کر میرے دوست کریمی نے ایک دل آویز غزل کہی ہے جس کے چند بند یہاں آپ کو محظوظ کرنے کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔ان کی یہ غزل ان کی نئی کتاب تیری یادیں'' کے صفحہ نمبر ۱۳ پر ''یہ میرا گلگت بلتستان'' کے عنوان سے مرقوم'' ہے۔ملاحظہ ہو

فلک کے ماہ و اختر بولتے ہیں
پہاڑوں کے یہ پتھر بولتے ہیں
اسے کہتے ہیں سیاحوں کی جنت
یہاں کے سب گُل و تر بولتے ہیں
پہاڑی سلسلوں میں ہر قدم پر
زمرد لعل و جوہر بولتے ہیں
اچھلتی کودتی نہروں کی مستی

چمن میں اب کوثر بولتے ہیں
لب دریا پہ ٹیلے ریت کے ہیں
ذرا تو دیکھیے زر بولتے ہیں
ذرا اٹھ کر یہاں کے ٹو کو دیکھو
پرندوں کے کھلے پر بولتے ہیں
کھڑا کس شان سے ہے ننگا پربت
مناظر اس کے اکثر بولتے ہیں

کیا وزیر بیگ صاحب ٹھیک کہتے ہیں؟

وزیر بیگ صاحب گلگت اسمبلی کے اسپیکر ہیں۔ میری دانست کے مطابق اسپیکر صاحب موجودہ گلگت اسمبلی میں سب سے زیادہ سیاسی بلوغت رکھنے والے آدمی ہیں۔ میں کئی سیاسی رہنماؤں سے مل چکا ہوں اور کئی سے انٹرویو بھی کرچکا ہوں، جب بھی ان کی باتوں کو سنتا ہوں تو دل گرفتہ ہوتا ہوں۔ بعض تو فقط ''سیاسی بونے'' کہلانے کے مستحق ہیں اور بعض صرف اور صرف اخباری بیانات کی حد تک مقبول و معروف ہیں۔ وہ اخباری صنعت کا خوب استعمال کرتے ہیں اور ایسی بھڑکیں اور ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ حقیقی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی عوامی ساخت اتنی کمزور ہے کہ وہ اپنے محلے کے ووٹ بھی نہیں لے سکتے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اعلیٰ ترین عہدوں پر براجمان ہیں بلکہ براجمان کئے گئے ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کا سامان کیا جاسکے۔ تاہم وزیر بیگ صاحب کا معاملہ ان سیاسی بونوں اور ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں سے مختلف ہے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز کے منازل آتے رہتے ہیں، پوری انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ زوال آمادہ اقوام نے اپنی

کوتاہیوں اور نااہلیوں کے درست تجزیے اور بروقت اصلاحی تدابیر اختیار کرکے دوبارہ عروج حاصل کیا ہے اور مثالی اصول زندگی اپنا کر زندگی کو قابل رشک بنانے میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اپنے ارگرد گرد نظریں دوڑانے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بہت سے ممالک جو کبھی غلامی، بدامنی، کرپشن، قتل و غارت، بے راہ روی اور جرائم کی پستیوں اور خوں ریزیوں میں سر تک ڈوبے ہوئے تھے آج ان کا شمار ترقی یافتہ اقوام اور ریاستوں میں ہوتا ہے۔ ہمسایہ ملک چین اس کی واضح مثال ہے جو بلند ہمت اور تیز رفتار اور خود دار ملک کے طور پر جانا اور مانا جاتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ ماحول اور سوچ نہیں ہے۔ ہم میں یہ روش سرایت کر گئی ہے کہ ہم تمام خرابیوں اور برائیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں اور حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ جب تک اس اجتماعی بیماری سے نجات نہ پایا جائے تب تک امن و ترقی کی امید کرنا اونٹ کو رکشے میں سوار کرنے کے مترادف ہے۔

تین اپریل کے اتحاد چوک کے بم دھماکے کے بعد اگر قومی رہنماؤں اور سیاسی بونوں کے اخباری بیانات اُٹھا کر دیکھے جائیں تو انسان حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ قوم کیا سوچتی ہے، زمینی حقائق کیا ہیں اور لیڈران کے بیانات کس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ ہر آدمی سچ بولنے سے گریز کرتا ہے، کچھ سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر، کچھ ذاتی مفادات کی خاطر، کچھ معتدل رہنے کی زعم میں، کچھ وقتی عہدوں کی لالچ کی خاطر۔ سچ کہا وزیر بیگ صاحب نے کہ ''اس

حمام میں سب ننگے ہیں''۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جو باتیں اہل تشیع اور اہل سنت سے تعلق رکھنے والے سیاسی و حکومتی رہنماؤں کو کرنی چاہیے تھیں آج وہ اسماعیلی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے وزیر بیگ صاحب کرتے ہیں۔ دل کرتا ہے کہ دل سے انہیں مبارک باد دیا جائے۔ ان کے چند ایک حقائق پر مبنی بیانات پڑھ لیں اور ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں کہ انھوں نے کتنی سجیدگی اور جرأت کے ساتھ سچ بولنے کی ہمت کی ہے۔ مثلاً ''حکومت ناکام ہوچکی ہے، فوج آخری امید ہے۔ میں وزیر اعلی سے بار بار کہتا رہا کہ گلگت کے حالات خراب سے خراب تر ہو رہے ہیں، بڑے نقصان سے بچنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔ بدقسمتی سے انتظامیہ اور پولیس میں افسروں کے ساتھ ساتھ اہلکاروں میں میں تعصب ہے اس لیے وہ قانون اور میرٹ کے تحت کام نہیں کرتے ہیں اور جانبداری سے کام لے رہے ہیں۔ گلگت میں ریلی پر گرنیڈ (دستی بم) سے حملہ کیا گیا اور اس کے رد عمل میں چلاس کا سانحہ رونما ہوا، پولیس اہلکاروں نے لوگوں کی حفاظت کے بجائے انہیں قاتلوں کے حوالے کیا اور خود بھی ان پر گولیاں برساتے رہے'' بحوالہ روزنامہ کے ٹو ۱۸ اپریل ۲۰۱۲ئ)۔

یوم مزدور سے سٹی پارک گلگت میں عوامی اجتماع سے کئی حقائق پر مبنی ایک غیر جانبدار خطاب میں کہا کہ '' سانحہ چلاس سانحہ گلگت کی وجہ سے پیش آیا، آدھے سے زیادہ سرکاری ملازمین جعلی ڈگریوں سے بھرتی ہوئے ہیں، میں نے

وزیر اعلیٰ سے کہا ہے کہ ان کے بارے میں تحقیق کروایا جائے۔ ہم ایک ایسی قوم ہے جو آزادی کو پسند نہیں کرتی بلکہ آزادی کی نعمت کا غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لوگ ملازمتوں بلکہ تبادلہ کے لئے بھی ملا و شیخ کے پاس جاتے ہیں۔ سیاسی قیادت نااہلی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ بحوالہ روزنامہ کے ٹو یکم مئی اپریل ۲۰۱۲ئ)۔

وزیر بیگ صاحب کی حقائق پر مبنی چند باتیں آپ نے ملاحظہ کیا۔ تنگی داماں کی وجہ سے ان کی تمام باتیں درج نہیں کی جا سکتی ہے تاہم حکومتی رٹ اور گڈ گورننس کا چہرہ اسپیکر محترم کی باتوں سے واضح نظر آتا ہے۔ کاش ! غریب لوگوں کے فنڈ کو ہڑپ کرنے والے اور جھوٹے وعدے اور دعوے کرنے والے ارباب اقتدار بالخصوص وہ لوگ جو اسلام آباد میں بیٹھ کر نرم گرم بیانات جاری کرکے قوم کے غم والم میں اضافہ کرنے والے وزیر بیگ صاحب کی طرح اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا کھلے دل سے برملا اظہار کریں اور آئندہ درست و راست اقدامات کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ قوم کو بہت جلد اذیت اور تکلیف سے نجات دلا جا سکتا ہے۔

ہماری موجودہ حکومت دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے دینے کے اعلانات اور اس کے لئے ناکارہ کوششیں تو کر رہی ہے، مگر وہ حقیقت کا ادراک نہیں کر پا رہی ہے یا

نہیں کرنا چاہتی ہے۔ میری دانست اور مشاہدے کے مطابق سیاسی لیڈر اور حکومتی احباب خود وہ تمام روٹس مہیا کر رہے ہیں جن سے بدامنی اور دہشت گردی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پھلتی پھولتی ہے۔ میرٹ کا قتل عام، بے انتہا کرپشن، اقربا پروری، مسلک پروری، مذہبی و علاقائی سیاست، ناانصافیاں، رول اینڈ لاء کی دھجیاں اڑانا، سیاسی بنیادوں پر نوازنا اور مسلکی آقاؤں کو سر پر چڑھانا، ٹیلنٹ کی بے قدری، لوٹ کھسوٹ، کھوکھلے سیاسی بیانات، اداروں کو پامالی، یک طرفہ سیاسی و مذہبی فیصلے اوران جیسے بے شمار وہ مسائل ہیں جو روز بروز قوم اور علاقے کو لاقانونیت کے دلدل کی طرف دھکیلنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

ہمارے علمائے کرام کو معاشرے میں پھیلائے ہوئے پروپیگنڈوں اور غلط باتوں کا ادراک کرکے اتفاق رائے سے ان مغالطوں اور گمراہیوں کی نشان دہی کرنی چاہیے۔ اسلام کی اصل روح اور حقیقی تعلیمات کو عوام تک پہنچانا ہوگا اور اس کے لئے علمی اور تحقیقی مکالمے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے نوجوانوں بالخصوص ناراض نوجوانوں کو علمی اور فکری کاموں اور کاوشوں میں شامل کرنا ہوگا اور معاشرتی رویوں اور دینی واسلامی فہم وتدبر کو احسن طریقے اور دلیل کے ساتھ سمجھانا ہوگا۔ ایک مضبوط عمرانی معاہدے کو تشکیل دینا ہوگا۔ کم سے کم وزیر بیگ صاحب کی تسلیم کردہ خرابیوں کو درست کرنا ہوگا اور از سر نو امن اور ترقی کے راستے ڈھونڈنے ہونگے۔ کاش ہمارے سیاسی لیڈران، ارباب اقتدار، مذہبی

علماء و دانشور اور سر کردہ افراد تمام مسلکی نمائندوں، سیاسی رہنماؤں اور علاقائی و وفاقی حکومت کا منظور کردہ امن معاہدہ پر عمل درآمد کروانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اے کاش

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے شام غم مگر شام ہی تو ہے

''نوائے انوار کراچی ''

بسم اللہ الرحمان الرحیم

محترم المقام مفتی صباح الدین غذری صاحب، مدیر سہ ماہی نوائے انور کراچی' حفظہ اللہ ورعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

بعد تسلیمات واداب:

بروز ۲۵ جولائی ۲۰۱۲ء کوآپ کا والانامہ موصول ہوا۔اورسہ ماہی '' نوائے انوار کراچی '' کا اولین شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ دل کی بات یہ ہے جامعہ انوارالعلوم کی طرف سے اس کار عظیم کا اجراء خوش آئند بھی ہے اورنیک شگون بھی۔ بحیثیت مدیر رسالہ مولانا مفتی صباح الدین غذری کا نام گرامی دیکھ کر دل خوشی کے بلیوں اچھلنے لگا۔جناب والا! آپ کے حکم پر ایک عدد مضمون میل کیا ہے۔امید ہے کہ آپ اور نوائے انوار کے قارئین پسند فرمائیں گے۔ محترم المقام! لکھنے کے لیے دل و دماغ میں بہت ساری باتیں ہیں' پر کاغذ کے ان صفحات پر اتنی گنجائش کہاں ؟۔ پھر بھی چند طالب علمانہ گزارشات پیش ہیں۔ اس

امید کے ساتھ کہ '' سہ ماہی نوائے انوار'' کی ادارتی و مشاورتی ٹیم ان پر سنجیدگی سے غور کرے گی۔

ا۔ مجلے کو غور سے دیکھا۔ بے حد مفید پایا' تاہم یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ آج کے دور کا جدید طبقہ 'ہم سے جو تقاضہ کرتا ہے اور ہم اس پر پورا اترنے سے قاصر ہیں۔ مجھے گزشتہ ایک سال سے فیڈرل ڈگری کالج گلگت میں پڑھاتے ہوئے اور کئی سالوں سے اصحاب صحافت و قلم کیساتھ گزارتے ہوئے اس بات کا خوب اندازہ ہوا ہے۔ روز بروز جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہم سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اس طبقے کے پاس ایک '' کیوں '' ہے اور بدقسمتی سے اس '' کیوں '' کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمیں اس '' کیوں '' کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ یہ باتیں تلخ ضرور ہیں مگر حقائق پر مبنی ہیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنے انداز کو بدلنا ہوگا یعنی اس معیار تک لے جانا ہوگا جس کا زمانہ متقاضی ہے۔ سہ ماہی نوائے انوار کی انتظامی وادارتی ٹیم سے التماس ہے کہ وہ اپنے اس ''کار عظیم'' کو معروف عالم دین حضرت العلامہ سیدِ مناظر احسن گیلانی کی اس نصیحت کو سامنے رکھتے ہوئے انجام دیں، انشاء اللہ ' اللہ کامیابیوں سے نوازے گا' یہی اسلامی مزاج بھی ہے۔ حضرت العلامہ فرماتے ہیں کہ ''ہر زمانے کا ایک ماحول ہوتا ہے، زبان ہوتی ہے، طریقہ تعبیر ہوتا ہے، جب تک ماحول کی ساری خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہی اصطلاحات اور تعبیرات میں آپ اپنی معلومات پیش نہیں

کریں گے (جو اس عہد کا قالب ہے) تو آپ کی طرف نہ کوئی توجہ دے گا نہ آپ کی باتوں میں وزن ہوگا''۔

۲۔ مجلے کو مروجہ مدارس کی طرح مدرسے کا اشتہار بنانے سے گریز کریں۔

۳۔ مضامین میں تنوع ہو۔ اور تحقیقی اور ادبی و دینی نوعیت کے ہونے چاہئیں' بے شک خالص اسلامی تحقیقی و ادبی ہی ہوں۔

۴۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے تک مجلے کا پھیلاؤ یقینی بنایا جانا چاہیے۔

۵۔ اگر ممکن ہو تو جلد دوئم سے ایک حصہ عربی کے لئے مختص ہو' اگرچہ تحقیقی قسم کے دو مضامین ہی کیوں نہ ہوں۔

۶۔ گلگت بلتستان میں دینی سرگرمیوں اور مسلمانوں کے مسائل کے حوالے سے ہر مجلے میں کوئی نہ کوئی تحقیقی نوعیت کا مضمون / فیچر /کالم یا سروے رپورٹ لازمی ہو۔

بہر صورت اس دفعہ اتنا کافی ہے۔ '' سہ ماہی نوائے انوار کراچی '' کی ادارتی و انتظامی ٹیم اور جملہ معاونین و کارپردازان اولین کامیاب اشاعت پر تحسین و سپاس کے لائق ہیں، رب رحمٰن سے دعا ہے کہ وہ ''سہ ماہی نوائے انوار'' کو فکر سلیم ' جہد مسلسل اور امت مرحومہ کی رہنمائی کا سبب بنائے۔ سہ ماہی نصرۃ الاسلام کی جانب سے سلام تہنیت قبول ہو۔ سہ ماہی خیر کثیر لاہور سے نکلتا تھا' اپنا کافی امیج بنایا تھا مگر حالات کا نذر ہوگیا' میرا اس میں ٹھیک

ڈاک کنٹربیوشن تھا' روز اول سے ادارتی کام کا بڑا حصہ میں ہی کیا کرتا تھا۔ اب دوبارہ اس پر کام جاری ہے، جلد منصہ شہود پر آیگا انشاء اللہ۔ سہ ماہی نوائے انوار میں بھی اپنے حصے کا تیل ڈالتا رہونگا انشاء اللہ، میری طرف سے جو بھی قلمی تعاون ہوگا ضرور کیا جائے گا' اور دعا بھی۔ مولانا شفیق الرحمان صاحب کو میرا سلام عرض کریں

والسلام مع الاکرام

امیرجان حقانی المعروف ابن شہزاد حقانی

ایڈیٹر' سہ ماہی نصرۃ الاسلام گلگت

۲۷ جولائی ۲۰۱۲ء بوقت رات گیارہ بجے

حال جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت' گلگت بلتستان

مولانا فضل الرحمٰن کی کرشماتی شخصیت

اپنے ارد گرد نظریں پڑتیں ہیں تو مایوسی کی گھٹا ٹوپ پرچھائیاں نظر آتیں ہیں، اقدار و اخلاقیات کا جنازہ نکل رہا ہوتا ہے۔ نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور تعلیمی ادارے جہاں سے معاشرے کے تمام اداروں کو مال مہیا کیا جاتا ہے تتر بتر کا شکار ہیں اور تعلیم تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر رہا ہے۔ دو طبقے قابل ذکر ہیں، ایک طبقہ قدامت پسندی کی طرف مائل ہے اور حوائج زمن سے قطعاً چشم پوشی کرکے قدیم علوم اور اکابر کے ترکہ کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھا ہے اور اسی میں ملک وملت کی فلاح سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ یقینا لائق صد تحسین ہے مگر معاشرے کی تمام ریکوائرمنٹ پوری کرنے سے قاصر ہے، دوسرا ایک بڑا طبقہ نام نہاد جدیدیت کا پرستار ہے اور صرف اور صرف ٹیکنیکی اور مادی تعلیم پر سارا زور صَرف کر رہا ہے اور اپنی اس روِش پر مصر بھی ہے۔ روحانیت و مشرقیت سے خالی یہ طبقہ صرف مادیت کا دلدادہ بن کر رہ گیا ہے۔

دھرتی عزیز پر نظریں دوڑائیں تو خال خال ایسی شخصیات نظر آئیں گی جو دونوں طریقے کے علوم و تجربوں سے آراستہ ہیں۔ ان میں ایک قابل ذکر نام مولانا فضل الرحمان کا ہے۔ ان کی مکمل تربیت دینی درسگاہوں میں ہوئی ہے، وہ قدیم علوم

سے بہرہ ور ہیں اور جدیدیت میں بھی وہ اپنے ہم عصروں کی طرح ماہر ہیں۔ مولانا فضل الرحمان اپنے ہم عصروں کی طرح صرف ایک ہتھیار سے لیس نہیں ہے۔ وہ بیک وقت معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا سیاست دان بھی ہے اورایک جید عالم دین بھی، قرآن، حدیث، فقہ اسلامی اور منطق و فلسفہ پر ان کی گہری نظر ہونے کے ساتھ عالمی سیاست پر منفرد نگاہ بھی رکھتے ہیں اور پاکستانی سیاست وسیادت تو مولانا فضل الرحمان کے بجز نامکمل ہے۔ ان کا نام حذف کرکے کوئی لاکھ چاہیے کہ پاکستان اور عالم اسلام کی غیر جانبدار ہسٹری لکھیں، ناممکن ہے

مولانافضل الرحمان ایک زبان آور خطیب ہے، سخن فہمی اور سخن سنجی ان کے ہاتھ کی گھڑی ہے اور سخن وری میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ پاکستانی سیاست اور عالمی اونچ نیچ کے حوالے سے ان کی معلومات اور اطلاعات کو باخبر طبقوں میں مستند مانی جاتیں ہیں۔اس پر ان کو جو تبحر حاصل ہے شاید کسی کے حصہ میں آئے۔

دنیائے اسلام کی ہر ساعت فاجعہ اور قیامت آفریں واقعہ پر مولانافضل الرحمان کی صدائیں صدائے صور بن کر بلند ہو جاتیں ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت ان کا دل ڈھرکتا ہے اور کبھی کبھار تودوسروں کے دلوں کو بھی

دھڑکنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا ہے اور اس پر انہیں فخر بھی ہے لیکن وہ مغرب کی تمام چالبازیوں، دجل، مکروفریب اور مکاریوں کو خوب جانتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ان کا دل مشرقی ہے مگر دماغ مغربی۔ ان کی بیداری مغزاور حاضری جوابی کا طوطی ایک عرصے سے بولتا ہے۔ اس نے عراق کا نوحہ کیا اور افغانستان کا غم کیا، مولانا فضل الرحمان ملک وملت کا عزادار ہے، حق یہ ہے کہ اس کو دل سے قبول کیا جانا چاہیے۔

وہ امت محمدیہ مرحومہ کا سوگوار ہے، ستم زدہ کشمیر کا ماتم دار، بکھرے طالبان کے لیے مضطر، جلتا بغداد کے لیے غم زدہ، ڈوبتا لیبیا کے لیے اشکبار اور یہودیوں کے پنجہ ستم میں مقید بیت المقدس کے لیے سوختہ غم، مشرقی پاکستان کے لیے مرثیہ خواں اور عالمی نرغے میں پھنسا پاکستان کے لیے مضطرب ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان کی اس داستان غم کو بلا تفریق لائق صد تحریم کیا جائے۔

مولانا فضل الرحمان صاحب سے لاکھ اختلاف سہی اور ہونی بھی چاہیے کیونکہ اختلاف میں حسن ہے، مگر ان کی نیت پر شک کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ تحفظ دینی مدارس اور آئین پاکستان سے اسلامی شقات اور ناموس رسالت کے قانون کے خاتمہ کی سازشوں کے خلاف وہ جیتا جاگتا ''ننگا پربت'' اور اسلام بیزار اور ملک دشمن عناصر کے لیے سیسہ پلائی دیوار بنے۔ حق یہ ہے کہ حق ادا کیا۔

ملک کی ممتاز یونیورسٹی جامعہ کراچی کے آڈیٹوریم حال میں کشمیر آفیئر پر ایک تقریب سے صدارتی خطاب میں انہوں نے قضیہ کشمیر پر اقوام متحدہ کا کردار، عالمی برادری کا رویہ، انڈیا کا مخاصمانہ انداز، پاکستان کی تلخ و شریں کوششیں اور گلگت بلتستان اور آزاد جموں و کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقہ جات کی آئینی، قانونی، سیاسی،

جغرافیائی، عسکری، سیاحتی اور تجارتی اہمیت اور عالم کفر کی للچائی ہوئی غاصبانہ نظروں کو اس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا کہ پینٹ شاٹ پہن کر داڑھی اور ملا کا مضحکہ اُڑانے والے بھی ششدر رہ گئے اور میرے وہ قوم پرست و ملک پرست دوست بھی جنھوں نے کشمیر، گلگت بلتستان اور پاکستان کا ٹھیکہ لیے ہوئے ہیں کہ ایک ''ملا'' بھی اتنی درست اور وسیع معلومات رکھتا ہے اور خوبصورت پیرائے میں بیان کرتا ہے جو نئی دنیا کی مانگ ہے۔

مولانا فضل الرحمان صاحب اپنوں کے لیے ابریشم اور غیروں کے لیے برہنہ تلوار ہیں، کسی دانا نے سچ کہا ہے کہ ملکی سیاستدانوں اور مذہبی لیڈروں کو الفاظ کے زیر وبم کے گُر اور زبان کے استعمال کا قرینہ اور سلیقہ ان سے سیکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مدعا نہایت سلیقے سے مکمل دلائل و براہین کے ساتھ اور عظیم حقیقتیں نہایت سادگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمان نے ایک ٹاک شو میں کیا خوبصورت بات کہی کہ '' ہم اس ملک میں تھے، ہیں اور رہیں گے ''۔ صرف اس ایک جملے میں پاکستان کی سیادت و سیاست پر کئی پی ایچ ڈی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ اسی ایک جملے میں انہوں نے اپنی پوری تاریخ دہرائی، آئندہ کا نصب العین بتایا، علماء و فضلاء اور دین دار طبقہ کی مکمل وکالت کی اور ان کے خلاف زبانیں دراز کرنے والوں کو ان کا چہرہ ان کے اپنے آئینہ میں دکھایا۔
لاریب کہ ان کے اکابر نے کوئی غیر شرعی اور غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام نہیں کیا کہ وہ اپنی ماضی پر شرمندہ ہو، اور نہ مولانا فضل الرحمان نے ملک کو لوٹا ہے اور انسانی جانوں کا خون بہایا ہے کہ دیار غیر میں پناہ لیں اور نہ ہی آئندہ ملک لوٹنے اور توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ یہاں سے بھاگے۔
ان کی ایک عظیم خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اکابر اور اصاغر کا پورا قدر کرتے ہیں اور ان کے بارے محتاط رہتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے خلاف برملا کچھ کہے بھی تو وہ برا نہیں مناتے ہیں اور نازیبا الفاظ کے استعمال پر بھی مسکت رہتے ہیں۔ ہمارے بعض احباب کی تقریر و تحریر اور نجی مجلسیں اس وقت تک مکمل نہیں ہوتیں ہیں جب تک ان کے خلاف ہرزہ سرائی نہ کی جائے مگر مولانا باخبر ہونے کے باوجود اپنی روایتی مسکراہٹ سے ٹال دیتے ہیں۔ مولانا کے دوسرے

جماعتی ذمہ داروں اور کارپردازوں کو ان کی اس ادا سے یکھنا چاہیے۔ وہ دنیا بھر کے لیے وسعت ظرفی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں مگر اپنے ہی ہم عقاید و ہم پیالہ و مکتب لوگوں کے لیے سخت جاں بن جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو اکابر پر بھی زبانیں دراز کرتے ہیں جو یقینا سیاسی اکٹیویٹیز رکھنے والوں کو زیبا نہیں۔

بہر صورت مولانا فضل الرحمان ایک زیرک سیاستدان ہیں۔ بے خطا خدا کی ذات ہے، ان میں غیر متوسط اور غیر معتدل رویوں میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی صلاحتیں بدرجہ اتم پائی جاتیں ہیں۔ ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ کی رہنمایان قوم وملت کے حوالے سے بیان کردہ اکثر اوصاف پر وہ پورا اترتے ہیں ۔ ان کے پاس پورے ملک میں عوام کا ایک جم غفیر ہے مگر افسوس کہ منظم نہیں، ان کی میڈیا پاور اور شعبہ ابلاغیات نہ ہونے کے برابر ہے۔ جمیعت علمائے اسلام، علمائے دیوبند کی سب سے بڑی نمائندہ سیاسی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے کارپردازوں کو اپنی بکھری ہوئی افرادی قوت اور شعبہ ابلاغیات پر مستقل بنیادوں پر از سر نو ورک کرنے کی ضرورت ہے، کاش ! ہماری یہ امیدیں بھر آئیں۔

علم سیاسیات و پاکستانی سیاست اور مذہبی مکتبہ فکر کا ایک ادنی طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ علماء کرام کو سیاست کے

غلیظ ڈھیر سے پہلو تہی کرنے کے بجائے خذ ما صفا ودع ما کدر کے طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہیے اور ممکن حد تک اس گندگی کو پاک وصاف کرنا چاہیے، کیونکہ تعلیمات خداوندی میں معاشرتی میل ملاپ کی تلقین ہے اور رہبانیت سے گریز۔ معترض احباب سے گزارش ہے کہ وہ بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب رسول اکرم کی سیاسی زندگی اور سید مناظر احسن گیلانی کی کتاب امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی کا عمیق مطالعہ کریں، ہاں آئین پاکستان کا ٹیکسٹ کو بھی بغور پڑھنا ہوگا۔ اپنی کم علمی اور علمی بے مائیگی کا برملا اعتراف کے ساتھ یہ کہنے کا بھرپور حق رکھتا ہوں کہ اسلامی دنیا میں آئین پاکستان جیسا مضبوط دوسرا کوئی آئین نہیں ہے، اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ کوئی قانون قرآن کے متصادم نہیں بنایا جائے گا۔ اسی آئین کو عملی شکل دینے کے لیے اوکسفرڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی کے خوشہ چینوں کو نہیں مدارس اسلامیہ کے تربیت یافتوں اور مشرقی اقدار اور اسلامی علوم کے ماہرین کو کردار ادا کرنا ہوگا، سو اس کے لیے علماء حق کے صفوں کو مضبوط کیا جائے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

میگزین نصرۃ الاسلام گلگت

الحمد للہ گلگت بلتستان کی اولین دینی جامعہ ، جامعہ نصرۃ الاسلام کی طرف سے ایک سہ ماہی مجلہ منصہ شہود پر آگیا۔ یہ مجلہ خالص دینی وادبی اور تحقیقی طرز کا ہے۔ اس کا مزاج و انداز پاکستان بھر کی دینی درسگاہوں کے مجلّوں اور رسائل کا سا ہے۔ اور مقاصد بھی وہی ہے جو دیگر دینی مدارس کے مجلات و میگزین کے ہیں۔ گلگت بلتستان کی تاریخ میں کسی بھی دینی ادارے کی طرف سے یہ پہلی باقاعدہ کوشش ہے۔ جامعہ نصرۃ الاسلام میں کبار علماء کرام نے گزشتہ پانچ عشروں سے اپنی بساط کے مطابق دینی علوم کو جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ یہاں دارالعلوم دیوبند کے دسیوں فضلاء کرام نے کئی سال درس وتدریس کی شمع کو جلا بخشی۔ کئی نامی گرامی حضرات نے یہاں سے کسب فیض کیا۔ آج جامعہ میں ابتدائی عصری تعلیم سے لیکر دورہ حدیث تک کی تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کو مفت دی جاتی ہے۔ جامعہ نصرۃ الاسلام کا مسلک ومشرب وفاق المدارس العربیہ کے اکابرین والا ہے۔ اعتقادات و نظریات میں اکابرین علماء دیوبند کے اندھے پیرو ہے۔ قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتوی کے گلشن و گلستان کے فیض یافتہ علماء نے اس جامعہ کو آبیاری سالوں اپنے خون سے کی ہے۔ اور ان کے نظریات و خیالات کے امین رہے ہیں اور واشگاف انداز میں

ان کی پرچار کی ہے۔آج بھی جامعہ نصرۃ الاسلام اعتقادات و نظریات اور علمی توضیحات واعتقادی خیالات میں انہی اکابر علماء کا ہم خیال و ہم مشرب اور اندھا پیرو ہے۔

جب جامعہ کا اولین شمارہ ملک کی بڑی دینی درسگاہوں اور اہل علم و قلم کے پاس پہونچا تو اکابر علماء اور اہل قلم نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور اپنے جذبات و احساسات کو بذریعہ فون کال، ایس ایم ایس، ای میل اور تحریری خطوط کی شکل میں کیااور اس کوشش کو ایک مثبت قدم سے تعبیر فرمایا۔ جامعہ سے ایک مجلے کے اجراء کے حوالے سے محترم قاضی نثار احمد صاحب کے ساتھ کافی پہلے سے مشاورت چل رہی تھی تاہم حالات موافق نہ ہونے کی وجہ سے اس کام کا باقاعدہ آغاز نہیں کیا جاسکا۔جولائی ۲۰۱۰ء میں جب میں رسمی تعلیم سے فارغ ہوا تو قاضی صاحب کا اصرار تھا کہ میں جامعہ کی طرف سے مجلے کا باقاعدہ کام شروع کروں مگر میں کچھ مجبوریوں کی بناء پر کام کا آغاز نہ کرسکا۔اوائل ۲۰۱۱ء کو کچھ ماہ اسلام آباد میں رہنا کا موقع ملا، مولانا عطاء اللہ شہاب صاحب بھی ان دِنوں اسلام آباد میں قیام پذیر تھے۔ان کے ساتھ بھی زمانہ طالبعلمی سے اچھی علیک سلیک تھی۔وہ مختلف اخباروں میں میری تحریریں باقاعدہ پڑھتے تھے اور فیڈ بیک کے طور پر فوراً کال بھی کرتے۔بہر صورت اسلام آباد قیام کے دوران محترم مولانا شہاب سے اکثر ملاقاتیں رہتیں، بالآخر انہوں نے ایک ادبی

و صحافتی رسالے کے اغاز کا عزم صمیم کرلیا، طویل مشاورت کے بعد یہ طے پایا گیا کہ مجلے کا نام ماہ نامہ شہاب ہوگا۔ اور اس کی تمام ذمہ داری میرے سپرد کی گئی تاکہ میں اولین شمارے کا کام کروں، سخت کھٹن حالات میں، میں نے گلگت بلتستان کے تمام ادباء و صحافیوں سے رابطہ کیا اور ان سے تحریرن جمع کرکے بہت ہی کم عرصے میں پہلا شمارے کا کام مکمل کیا تاہم کافی دیر سے یہ میگزین منظر عام پر آیا، اس میگزین کی ایڈیٹری کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا، اگرچہ میرے بہت سے دوست دلی طور پراس سے خوش نہیں تھے۔ مگر وہ کام کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ مجھے خواہ مخواہ کا ایڈیٹر صاحب بننے کا شوق تھا۔ مولانا شہاب کی شخصیت ہی کچھ ایسی ہمہ جہت ہے کہ بادل نخواستہ مجھے ماہنامہ شہاب کے لیے بعض دفعہ غیر ضروری کام بھی کرنے پڑے۔ انہی ایام میں مولانا کے سفر ہندوستان کا بڑے حصہ کو بھی ناچیز نے پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ کے مراحل سے گزارا۔ مولانا شہاب صاحب کو اس تمام تر محنت کا اندازہ بھی ہے اور وہ اس کا کریڈیٹ بھی دیتے ہیں، کھلے دل و دماغ کے مالک مولانا شہاب اب تو ادبی و صحافتی دنیا سے ہجرت کرکے مکمل سیاسی دنیا میں رنجہ قدم فرما چکے ہیں مگر احمد سلیم سلیمی کا کہنا ہے کہ وہ جلد ہی کوچہ قلم میں واپس آئینگے۔

اوائل جولائی میں قاضی نثار احمد صاحب ترکی تشریف لے گے، جانے سے پہلے

انہوں نے ایک دن کے لیے مجھے اسلام آباد طلب کیا۔ میں انہی دنوں گوجر خان میں ایک دینی ادارے میں عربی زبان کا کورس کروا رہا تھا۔ اسلام آباد میں قاضی صاحب سے ایک لمبی نشست ہوئی، اور اس میں باقاعدہ طے پایا گیا کہ میں رمضان المبارک کے بعد مجلے کا کام شروع کروں، یوں اکتوبر ۲۰۱۱ء کو جامعہ نصرۃ الاسلام میں درس وتدریس کے ساتھ مجلے کا م بھی شروع کیا۔ یہاں بھی تمام کام تن تنہا کرنے پڑے تاہم قاضی صاحب کا انداز مشفقانہ رہا، اور امید ہے کہ آئندہ بھی یہی طرز عمل رہے گا۔ میں یہ بات اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں کہ ایک طالب علم کو گلگت بلتستان کے سب سے بڑی دینی درسگاہ سے شائع ہونے والے اولین مجلے کا ایڈیٹر بننے کا موقع ملا ہے۔اللہ نے چاہا تو جب تک مجھے موقع ملتا رہے گا میں اپنی بساط کے مطابق مکمل ذمہ داری سے یہ دینی کام کرتا رہونگا۔ انشاء اللہ

لاریب کہ سہ ماہی نصرۃ الاسلام گلگت محض ایک مروجہ مجلّہ / رسالہ نہیں بلکہ یہ ایک تحریک کا آغاز ہے،ایک مقدس مشن کی تکمیل کے لیے سنگ بنیاد ہے۔ گلگت بلتستان جیسے دور افتادہ علاقے سے ایک اذان حق ہے جو بہت پہلے شروع ہونی تھی مگر نہ ہوئی، تاہم دیر آید درست آید کے مصداق آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔مجلے کے مدیر اعلی اور مدیر کی دلی خواہش ہے کہ گلگت بلتستان کے تعلیم یافتہ نوجوان اس کا حصہ بنے، قاری کی شکل میں اور لکھاری کی شکل میں۔ اگر آپ

میں قوم کی فلاح و رہنمائی کی تڑپ ہے اور اپنی تحریر کے ذریعے نظریاتی اور فکری انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو قلم اُٹھایئے اور حق گویائی و بے باکو اپنا شعار بناتے ہوئے قلمی جہاد کے اس سفر میں ہمارے ساتھ شریک سفر ہو جایئے۔

بے شک سہ ماہی نصرۃ الاسلام فکر و شعور ہے عدل و انصاف کا، آواز حق ہے مظلوم انسانیت کا، تمنا و آرزو ہے اہل حق کا، بازوِ شمشیر ہے باشندگان گلگت بلتستان کا اور شمشیر بے نیام ہے ظالمان گلگت بلتستان کے لئے، لاریب کہ ترجمان ہے جامعہ نصرۃ الاسلام کا، تو حق اور سچ کو اپنا نصب العین بناتے ہوئے غیر جانبداری سے دینی، اصلاحی، فکری و نظریاتی اور تحقیقی و خالص ادب اسلامی کے کے حامل اہل قلم اس سفر مبارک میں ہمارے رفیق سفر بنیں، لکھنے سے پہلے چند امور کو ملحوظ خاطر رکھے۔

۱۔ بغیر تحقیق و تفتیش اور حوالہ جات کے کوئی علمی تحریر نہ بھیجے۔

۲۔ موضوع کے انتخاب سے پہلے اس کی افادیت، اہمیت اور ضرورت پر کامل نظر رکھیں۔

۳۔ اپنی تحریر کو حقائق، دلائل و براہین اور اعداد و شمار اور تحقیق و مراجعت سے مزین کریں، تاکہ قاری ابہام کا شکار نہ ہو۔

۴۔ قوم پرستی، مفاد پرستی، فرقہ پرستی، لسان پرستی اور بہت ساری پرستیوں کو

چھوئے بغیر حق پرستی کا عملی ثبوت دیتے ہوئے تحریر تیار کرکے ارسال کریں۔

۵۔سہ ماہی نصرۃ الاسلام کے موضوعات بے شمار ہیں کہ ملکی سالمیت و حفاظت، دین ودنیا کا حسین امتزاج، طرز معاشرت و حکومت، مضبوط اسلامی معیشت، تاریخ عالم، تاریخ عالم اسلامی، تاریخ گلگت بلتستان، اصلاح معاشرہ، عالم اسلام کی تنزلی اور اس کے اسباب، قرآنیات، دینیات، دنیا بھرکے اسلامی تحریکوں کا تعارف، عالم اسلام کو درپیش چیلنجز، تعلیمی اصلاحات، اکابر علماء کی آپ بیتیاں و سوانح عمریاں، اور دیگر فکری و نظریاتی موضوعات ،حالات حاضرہ پر جاندار تجزیے، مغربی تہذیب وتمدن اور انکے اسلام دشمن افکار و عزائم کا کامیاب اپریشن، اسلامی دنیا اورملت اسلامیہ پر جبر واستبداد پر مبنی رپورٹیں و تحریریں اور ملک عزیز بالخصوص گلگت بلتستان میں قیام آمن کے لیے آراء و تجاویز اور دیگر موضوعات خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔

یادرہے! آپ خود بھی مجلے کے خریدار بنیے اور اپنے دوستوں کو بھی ترغیب دیں،نو آموز لکھاری تحریر، مراسلہ نگاری، کالم نویسی، فیچر رائٹنگ، میگزینی صحافت اور دیگر امورکے لیے براہ راست ایڈیٹر سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں، ایڈیٹر نمبر 03462974626 اور ادارے کی ای میل ibshaqqani@gmail.com ایڈرس پر بذیعہ خط۔فی آمان اللہ

یارانِ محفل'' میں معرکہ آرائیاں''

میرے استاد ابن الحسن عباسی نے کہا تھا حقانی ! دو قسم کے لوگوں کو اپنی بات سمجھانا بے حد مشکل ہے۔ میرے استفسار پر کہنے لگے کہ ایک ریٹائرڈ فوجی اور ایک پروفیسر، ساتھ ہی علت بھی بیان کردی کہ فوجی اس لئے نہیں مانتا کہ اس کی تربیت اس نہج میں کی جاتی ہے ، وہYes Sir کا عادی ہوچکا ہوتا ہے۔ ایک خاص مائنڈ سیٹ کے تیار ہونے کے بعد وہ یہی بہتر اور درست سمجھتا ہے جو اس کو کھوپڑی میں ہوتا ہے۔ اور پروفیسر صاحبان اپنی مطالعہ کی بنیاد پر ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں، ان کو ہزار دلائل دو، قرآن و حدیث کے دلائل کے انبار لگاؤ اور علم و منطق کو مختلف زاویوں میں پیش کرو، غور سے سنیں گے اور آخر میں کہیں گے کہ '' پھر بھی بات یوں ہے''کیونکہ وہ بھی وسعت مطالعہ کے مالک ہوتے ہیں اگرچہ اکثروں کا مطالعہ درست سمت میں نہیں ہوتا ہے۔''

میں استاد محترم کی بعض باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر خاموش ہوتا، تاہم مجھے ان کافی ساری باتیں وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ میں آنے لگی ہیں۔آج کل مجھے بھی ڈگری کالج میں پروفیسروں کے ساتھ پالا پڑ رہاہے۔ ڈگری کالج گلگت ، گلگت

کی سب سے قدیم ڈگری کالج ہے۔ یہاں چالیس کے قریب لیکچررز اور پروفیسرز ہیں۔ ان اصحاب کے ساتھ روزانہ محفل جمتی ہے، مختلف طبائع کے مالک یہ پروفیسران جب مل بیٹھتے ہیں تو کُھل جاتے ہیں بلکہ کھلتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھار کِھلتے بھی ہیں۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر فضل محبوب صاحب ہیں جو ایک خاموش طبع انسان ہے، صوبہ سرحد سے ان کا تعلق ہے، گذشتہ ۳۵ سال سے گلگت بلتستان میں مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ سارا دن اپنی کرسی پر براجمان رہتے ہیں۔ گاہے بگاہے کلاسوں اور دیگر شعبوں کا چکر بھی لگاتے ہیں۔ ان کی آفس میں عمومی طور پر رش کم ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ پرنسپل ہیں، لاریب وہ بھی ایک استاد ہیں تاہم آج کل مدرسی ذمہ داریوں سے زیادہ ان کے کندھوں پر بیوروکریسی کا بوجھ سوار ہے، جب ان کی آفس میں کوئی دیر تک بیٹھیتا ہے تو وہ حاضرین سے کہہ دیتے ہیں کہ آج فلاں صاحب سے چائے نہ پی لی جائے، بس یوں لینے کے دینے پڑتے ہیں، وہ اپنے سٹاف کے ساتھ خوش رہتے ہیں، جب کوئی ویلکم پارٹی یا فیرویل پارٹی ہوتی ہے تو وہاں پرنسپل صاحب کی عاجزی وانکساری دیکھنے کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے جانے والے ساتھیوں سے تلخیوں کی کھلے انداز میں معذرت کرتا ہے اور آنے والوں کو دلی خوش آمدید! یہ ان کا بڑا پن ہے۔

پروفیسر صاحبان کی سب سے دلچسپ محفل '' انکل ٹائم پاس یعنی انکل مراد '' کی

کینٹین میں لگتی ہے۔پروفیسر صاحبان اپنے پریڈ پڑھانے کے بعد وقفے وقفے سے یہاں تشریف لے آتے ہیں۔ اس محفل یاراں کے مستقل ممبران میں بڑی خوش گوار گفتگو ہوتی ہے۔ہر ایک کی اپنی ایک مکمل فلاسفی ہے اگرچہ دلیل اور عقل سے ماورا۔۔۔۔ سب سے جاذب النظر فضل عباس ہیں، بعض دفعہ بڑی سنجیدہ باتوں اور گفتگو کو بھی ٹال دیتے ہیں اور کبھی رائی کا بھی پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ سوشلسٹ نظریات کے مالک عباس صاحب اسلام کی تمام خوبیوں اور مسلمہ اصولوں کو لفظ اسلام کے بغیر قبول کر لیتے ہیں جبکہ دوران گفتگو کہا جائے کہ یہی بات تو اسلام بھی کہتا ہے تو ان کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے، یعنی چہرہ متغیر، پروفیسر اویس، صاحب مطالعہ آدمی ہے، مختلف سوالوں کے جوابات خوب دیتے ہیں، جب مخالف ماننے کے لئے تیار ہی نہ ہو تو دھیمے دھیمے انداز میں ان کی لے میں لے ملاتا ہے۔ کبھی کبھار تو سنجیدگی سے اتنی '' لمبی لمبی '' چھوڑ دیتے ہیں کہ محفل میں بعض احباب کو تکلیف ہونی شروع ہوتی ہے، شاید وہ ایسا جان بوجھ کر کرتے ہیں۔پروفیسر عرفان صدیقی بھی اکثر حاضر ہوتے ہیں اور '' کھپے کھپے '' کا نعرہ مستانہ بلند کرکے زمان صاحب کو چڑانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بھی تو '' صدر '' ہیں کہ کہاں چڑتے ہیں بلکہ عرفان صدیقی کو چودھری شجاعت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہاں تمام احباب ایک دوسروں کو '' صدر صدر '' کہ کر مخاطب کرتے ہیں، میرے استفسار پر پروفیسر زمان گوجالی بریف کرتے ہیں کہ بے مروتا اور ناکارہ آدمی کو صدر کے لقب '' سے موسوم کیا جاتا ہے، اور پھر بڑے بڑے '' صدور

کے نام اور کام بھی بتاتے ہیں۔ اور اچھی تجزیہ بھی ۔ صدیقی صاحب اچانک عباس صاحب کی لے میں لے ملا کر لادین اکبر بادشاہ کو ''Akbar is the Great'' کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں تو دوسرے احباب ان کے ذوق سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ عبید صاحب بلا ناغہ '' محفل یاراں'' میں حاضر ہوتے ہیں تاہم بحث و مباحثہ میں حصہ کم لیتے ہیں کیونکہ کہ اکثر ان کے ''سر میں درد'' رہتا ہے، اچانک بول بھی لیتے ہیں تاہم عموما کھلکھلانے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

مراد انکل کی بے مراد کینٹین میں طلبہ کا بھی ہجوم رہتا ہے تاہم وہ اپنے استاتذہ سے فاصلے پر ہی بیٹھنے پر اکتفاء کرتے ہیں تاکہ بیلنس برابر رہے، کالج کے بعض طلبہ تو بڑے ملنسار اور باادب ہیں۔ محفل یاراں کے قریب میں قاری سبنل اور آئی ٹی کے لیکچرر فرید اللہ بھی اکثر محفل لگاتے ہیں، بعض احباب طنزاً انہی پر کوئی جملہ کس بھی لیتے ہیں ۔وہ دونوں باریش ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ایک طرف لبرل پسندوں اور قدامت پسندوں کی محفل جمال آرا لگی ہوئی ہے اور ساتھ ہی رجعت پسندوں خوش گپیاں بھی جاری ہیں۔ شکر ہے کہ محفل یاراں میں کوئی مکمل جدت پسند نہیں ہے ،ورنہ تو رنگ میں بھنگ پڑ جاتا۔ اپنے کولیگ نصیر کریم بھی ہمیشہ جلوہ افروز ہوتے ہیں، خواہ مخواہ کی اُڑانے سے پرہیز کرتے ہیں اور مخاطب کی بات غور سے سنتے ہیں، اگر معقول اور دلائل پر مبنی ہو تو قبول کرلیتے ہیں، آخر پولیٹیکل سائنس پڑھاتے ہیں۔ اشتیاق یاد اور عبید

کے '' سگریٹی مرغولوں '' سے تو سب نالاں ہیں، سگریٹ کے مضرات بھی بیان کرتے ہیں اور '' شغل سرگیٹی '' سے پرہیز بھی نہیں کرتے۔ اُف ۔۔۔ قول اور فعل میں تضاد۔

محفل یاراں میں پروفیسر انور ناصر بھی کبھی کبھی رنجہ قدم فرماتے ہیں۔ وہ پاک آرمی سے محکمہ تعلیم میں آئے ہیں، اب آپ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک آدمی بیک وقت فوجی بھی ہو اور پروفیسر بھی تو اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ عبید صاحب کا اصرار ہے کہ انور ناصر بڑے بڑوں کے سامنے دل کی بات ببانگ دہل کہہ جاتے ہیں، آخر ایک فوجی اور پروفیسر سے اس کے علاوہ توقع بھی کس چیز کی کی جا سکتی ہے۔ سینئر پروفیسر بشیر صاحب بھی بڑھاپے کی دہلیز میں کھڑے ہیں مگر باتیں نوجوانوں کی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ '' مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا ہے '' اپنے راجہ صاحب تو بس کھلکھلانے کا ٹھیکہ ہی لے چکے ہیں سلام بعد میں مسکراہٹ پہلے، پروفیسر زمان گوجالی کا کہنا ہے کہ اگر راجہ صاحب کبھی کسی کی تعزیت کے لئے جائینگے تو پہلے بھرپور تبسم فرمائیں گے اور بعد میں تعزیت شروع ہوگی۔ مضبوط جسم و جثہ کے مالک اردو کے انور جمیل کے ساتھ اٹکھیلیوں کا سلسلہ بس آتے جاتے کالج وین میں ہوتا رہتا ہے باقی پتہ نہیں وہ کہاں رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ شاید '' مرادی کینٹین '' میں اس لئے تشریف نہیں لاتے کہ کمزور کرسیاں ان کا بوجھ برداشت نہ کر پائے۔ ارشاد شاہ بھی کبھی کبھار

اپنے لٹریری الفاظ کے ساتھ محفل یاراں میں آ دھمکتے ہیں۔اشتیاق یاد اپنی نرم خوئی کے ساتھ محفل یاراں کے لئے اپنی موجودگی سے زینت بخشتے ہیں،آخر شاعر جو ہوئے۔
پروفیسر ایسو سی ایشن کے سیکریٹری جناب راحت شاہ بھی '' کالے عینک '' پہن کر اپنی وجد آفریں گفتگو یاراں محفل سے شیئر کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے ہیں۔ان سب پر مستزاد انکل ٹائم پاس کے '' برتن '' بڑے اجلے اور شفاف ہوتے ہیں۔
کالج کی لائیبریری میں علی مدد بگور لائیبریرین ہوتے ہیں۔کتاب دوست ہیں۔جب بھی ان کے پاس جاؤ تو وہ مذہبی تبلیغ شروع کردیتے ہیں،آپ جب تک اکتا کر نکل نہ جاؤ وہ اس کار خیر کو جاری رکھتے ہیں۔ عبدالسلام ناز بھی اکثر لائیبریری میں پائے جاتے ہیں، ان کی عجیب جبلت ہے نہ کسی کے ساتھ سلام نہ کلام، بس کتاب بغل میں دابے، الگ تھلگ اپنی دھن میں مگن، اگر رہبانیت کی کوئی زندہ مثال پیش کرنے کو کہا جائے تو ناز صاحب موزوں ہیں۔پروفیسر کمال نور کے پاس کوئی بھی کسی کاغذی کام لے کر جائے تو پہلے بھرپور طور پر افسر شاہی کے تمام لوازمات بروئے کار لاتے ہیں،پوری تندہی سے کہی دور ٹرانسفری کا مژدہ سناتے ہیں اور ساتھ ہی اگلے لمحوں میں کام مکمل کرکے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ابتدائی دنوں میں ناچیز کی کافی مدد کی، عبدالرزاق سینئر تو اکثر چھٹیوں ہوتے ہیں، جب بھی چھٹی لیتے ہیں تو خرابی موسم کی وجہ سے

فلائیٹ نہیں ہوتی۔ نثار رنگین اور شائستہ انسان ہیں اور عبد الرزاق جونیئر سے بھی کالج وین تک گفتگو رہتی ہے، ای ڈی کے گل زمان بھی اس وقت تشریف لاتے ہیں جب سب جارہے ہوتے ہیں۔کچھ احباب کا ذکر خیر رہ گیا ہے اور کچھ کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔
بہر صورت گزشتہ پانچ ماہ سے مجھے ڈگری کالج میں کافی سیکھنے کو ملا ہے، اپنے اسٹوڈنٹ کے ساتھ اور کالج مدرسین کے ساتھ، دل و دماغ میں کافی باتیں ہیں جو اگلی دفعہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ تب تک کے لئے اجازت

"سلگتا گوھر آباد اور منتخب نمائندے"

گزشتہ چار سال سے لکھتے لکھتے تھک چکا ہوں، مگر کہیں سے کوئی شنوائی نہیں ہو رہی ہے۔ گوھر آباد کی حالت زار پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ گلگت بلتستان کا کونسا اخبار ہے یا کونسا میگزین ہے جس میں گوھر آباد کے مسائل اور محرومیوں کے حوالے سے میرے تحقیقی فیچر، ذاتی کالم اور خبری و تجزیاتی رپورٹیں شائع نہیں ہوئی ہیں؟ گوھر آباد کا ایسا کونسا مسئلہ تشنہ رہ گیا ہے جس کی نشاندھی میں نے نہیں کی ہے۔ گوھر آباد کے جنگلات کی پیچیدہ صورتحال اور اسکا حل، تعمیراتی و ترقیاتی صورتحال، بگڑتی ہوئی تجارتی کیفیات، روڈ اور پلوں کی کسمپرسیاں، شعبہ صحت کی تنزلیاں، بجلی کی نیرنگیاں، غربت، پسماندگیاں، مفلوک الحالی، لٹی پٹی بستیاں، ناسازگار موسموں کی سنولاہٹیں، بیماریوں کا سیلاب، غربت اور مشقتوں کی ستائی ہوئی نیک بیبیاں، معاشی ناہمواریاں، متوازن غذا کی ناپیدیاں اور تعلیم و تربیت کی فقدانیاں غرض کونسا پہلو تشنہ لب رہا ہے جس پر خامہ فرسائی نہیں کی گئی ہے۔ گزشتہ 4 سال سے گلگت بلتستان کے تمام اخبارات و جرائد کا ریکارڈ طلب کیا جائے اور عقل سلیم اور نظر عمیق سے دیکھا جائے تو کہیں مبینہ طور پر اور کہیں بین السطوری انداز میں گوھر آباد کی محرومیوں اور مسائل کا تذکرہ ملے

گا۔ گوھر آباد کی تنزل پذیر تعلیمی صورتحال پر تو اتنا مواد ملے گا کہ مقتدر طبقہ ششدر رہ جائے گا۔ تعلیمی کیفیت، اساتذہ کے مسائل، بلڈنگ کی تزئین و ارآئش نئے اساتذہ کی تقرری میں میرٹ کی پامالی، فرنیچر کی عدم دستیابی، کھیل کود کے ساز وسامان کی ناپیدی، محکمۂ تعلیم کی زیادتیاں سر فورم پر بیان کی گئی مگر کمال ہے کہ ہمارے منتخب نمائندہ کے کانوں میں پر جوں تک رینگے۔ کتنی ذلت کی بات ہے کہ گلگت اسمبلی میں گزشتہ 4 دھائیوں میں گوھر آباد کے نمائندوں کو چھ دفعہ مرکزی عہدوں پر متمکن رہنے کا موقع ملا۔ مگر 25 سال قبل قائم ہونے والا مڈل سکول اب تک باقاعدہ ہائی سکول کا درجہ نہ پا سکا۔ آج بھی گلگت اسمبلی میں چھوٹے سے گوھر آباد کے دو نمائندے ہیں۔ ایک اپوزیشن لیڈر بشرا حمد اور دوسری حکمران طبقہ کی محترمہ گل میرا صاحبہ، گزشتہ سال میں نے اپنے '' گوھر آباد'' نامی کالم میں تمام مسائل کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے ان سے گزارش کی تھی کہ خدارا! گوھر آباد کی خبیر لیجئے۔ لوگوں کی محرومیوں کو بانٹ لیجئے۔ پھر سیلاب کی موج مستیوں نے گوھر آباد کی مفلوک الحالی اور محرومیوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا مگر قوم کے مسیحا گلگت اور اسلام آباد کے نرم گرم بستروں میں بیٹھ کر ٹی وی پر چلنے والے ٹیکروں اور اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے دل بہلانے لگے کہ آج گوھر آباد کے فلاں نمائندے نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی۔ اور آج فلاں مسیحا نے ٹیلی فون پر لواحقین سے تعزیت کی اور عنقریب علاقے کا دورہ کیا جائیگا۔ واہ! دکھ در

دبانے کا کیا نرالا اسٹائل ہے؟ آج بھی گیس پائپ و بالا کی تباہ شدہ املاک اور یتیم و بے کس بچے دونوں مرحوم پل، تباہ شدہ سڑک، گوھر آباد کی واحد نہر جس سے پورے گوھر آباد کی زرعی زمین سیراب ہوتی ہے، اسکول، ہسپتال اور مقبوضہ جنگلات اور دیگر تمام گوھر آباد کے تمام بزعم خویش مسیحاؤں اور دونوں منتخب نمائندوں کو دہائی دے رہے ہیں کہ خدارا! ایک نظر کرم ادھر بھی کیجئے ورنہ ہماری رہی سہی حال بھی جل کر بھسم ہو جائیگی۔ مگر کمال آفرین ان کو کہ وہ اپنے پر تعیش مسکنوں میں تھوڑی دیر کیلئے مضطرب بھی ہو جائیں! اس پر مستزاد کہ غریب اور مسکین، مفلوک الحال لوگوں کو صبر و شکر کی تلقین فرمارہے ہیں۔ یاد رہے کہیں ان کا صبر و تحمل اور شکر آپکے لہلاتے ہوئے کھیت وکھلیان کو جلاکر راکھ کر دیں۔ اور انکی محرومیاں آپکے لئے وبال جان بن جائیں۔ اور ڈرو اس وقت سے جس کی وعیدیں قرآن و حدیث میں جابجا موجود ہیں۔ قارئین آپ نے میر جعفر اور میر صادق کا نام سنا ہوگا اور انکا کردار سے واقفیت رکھتے ہونگے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ غداری کی تھی اور انکے انجام سے بھی واقف ہیں۔ آج بھی جو آدمی اپنی قوم کی عزت، غیرت و حمیت کو بیچتا ہے اور آج کے جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے معاشرتی ڈاکو بن کر قوم کو دھوکہ دے رہا ہے تو وہ میر جعفر اور میر صادق سے کم نہیں اللہ رب العالمین ہمیں ان میر جعفروں اور میر صادقوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

گیس بالاپر قیامت صغریٰ' ذمہ دار کون؟

ہاں ! گراڑی نے ٹوٹنا تھا ٹوٹ گئی، لوگوں نے جاں جان آفریں کے سپر کرنا تھا سو انھوں نے کیا۔ گیس بالاپر کون سی افتاد ہے جو نہیں ٹوٹی۔ ۲۰۱۰ء کے سیلاب نے کھربوں کی جائیداد کو بہالے گیا اور رہی سہی کسر آسمانی بجلی نے پوری کردی۔ گیس کا اکلوتا پل ۲۰۱۰ء کے سیلاب میں بہہ گیا۔ متاثرین کے نام پر بیرونی امداد بے شمار آئی مگر ان تک پہنچنے سے پہلے ہڑپ کر لی گئی۔ سیدزادہ ملتان نے آسمانی بجلی سے جام شہادت نوش کرنے والوں کے لواحقین سے جھوٹے وعدے کیے جو ابھی تک وفا نہ ہوسکے۔ گیس کا پل بہہ جانے کے بعد پل کے ساتھ ایک انتہائی ناقص گراڑی (چیئر لفٹ) بنائی گئی تھی۔ جولائی ۲۰۱۱ء کو جب میں اس گراڑی کے ذریعے دریا کراس کررہا تھا تب ہم صرف تین نفری تھے' دو ساتھی گراڑی کا رسہ کھینچ رہے تھے اور یہں حالت اضطرار میں آنکھیں بند کرکے کلمہ طیبہ کا ورد کررہا تھا' مجھے نہیں معلوم کہ کیسے پار کیا۔ تب میں نے واپسی پر اس ناگفتہ بے حالت پر اخبار کے انہیں صفحات پر لکھا تھا۔ اور کئی نیوز بھی اس حوالے سے اخبارات کی زینت بنی تھی۔ ۲۰۰۹ء سے اپریل ۲۰۱۲ء تک میرے گوہرآباد کے دونوں پلوں کے حوالے سے چار کالم مختلف اخبارات میں شائع ہوئے ہوئے اور کئی نیوز سٹوریز بھی۔ دیامر ڈیم کے افتتاحی پروگرام کے حوالے سے چلاس میں جب

ارباب اقتدار جھوٹے وعدوں سے عوام کو گمراہ کررہے تھے تو ٹھیک اسی ٹائم ریڈیو پاکستان سے پروڈیوسر ڈاکٹر شیر دل کے ساتھ دیامر ڈیم اور اہل دیامر کے مسائل کے حوالے سے میرا ایک تفصیلی لائیو انٹرویو نشر ہورہا تھا جس میں ڈیم کے افتتاحی پروگرام کو بھی کوریج دی جارہی تھی۔ ناچیز نے دیامر کے بڑے بڑے مسائل کے علاوہ گوہرآباد کے دونوں ''پلوں'' کا تذکرہ بار بار کیا تھا اور اپنے گوہرآباد کے منتخب ممبر جناب بشیر احمد صاحب سے فریاد کی تھی کہ جناب والا آپ کیوں لوگوں کی موت کا انتظار کررہے ہیں۔ قارئین میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اپنے ان دریا برد بھائیوں کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کروں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ۲۰۱۰ء کو آسمانی بجلی گری اور آج ہمارے وزیر تعمیرات صاحب' ایکسیئن صاحب' اسسٹنٹ انجینئر' سب انجینئر' ٹھیکیداران اور محکمہ کے دوسرے افراد کی ملی بھگت کے نتیجے میں آٹھ قیمتی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سانحہ کے جتنے ذمہ دار محکمہ کے لوگ ہیں اس سے زیادہ ذمہ دار وزیر اعلیٰ گلگت بلتستان اور جناب وزیر تعمیرات صاحب ہیں۔ اپنے ایک گزشتہ کالم میں ان دونوں صاحبان کی توجہ اس نازک صورت حال کی طرف دلایا تھا۔ اس کالم کا صرف آدھا پیراگراف ملاحظہ ہو۔ ''کیا وزیر محترم گوہرآباد کے مسائل سے اتنا انجان ہیں کہ انہیں سب ٹھیک ہے، لگتا ہے یا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں؟ کیا گوہرآباد کے تباہ شدہ پل (کسی بھی وقت کوئی جان لیوا حادثہ پیش آسکتا ہے)، سکولوں کی بربادی، واحد ڈسپنسری کی زبوں

حالی، واٹر چینل کی شکستگی، اور روڈ کی تباہی جیسے بڑے بڑے مسائل جو منہ کھولے ہوئے ہیں، ان کی نظر کرم سے عنقاء ہیں۔اصل صورت کیا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر ناچیز اس تحریر کے توسط سے وزیر تعمیرات جناب بشیر احمد صاحب سے صرف اتنی گزارش کرتا ہے کہ خدارا! گوہرآباد کی حالت زار پر رحم کریں۔ کم سے کم تباہ شدہ دونوں پلوں کی تعمیر کا بندوبست کرکے انسانی جانوں کے ضیاع سے بچائیے'' (فروری ۲۰۱۲ روزنامہ صدائے گلگت و ہمالیہ)۔ قارئین جن حادثات کا ذکر گزشتہ کئی سالوں سے' میں کر رہا ہوں ان کی شروعات ہیں، ابھی تو بڑا حادثہ ''گوہرآباپل'' میں ہونا ہے۔ یاد رہے کہ کسی بھی وقت گوہرآباد کا پل مسافر گاڑی سمیت ٹوٹ کر دریابُرد ہوسکتاہے۔ اس پل سے روزانہ مسافروں سے بھری ۴۰ سے زائد بار گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ روزانہ کی بنیاد پر ہر آنے جانے والی گاڑی سے پسنجر اور لوڈ اتارا جاتا ہے۔ ابھی دو ماہ پہلے مسافروں سے بھری ایک وین بال بال بچ گئی ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ان پر توجہ دیا جائے۔

دریائے سندھ کا بہاؤ اتنا تیز ہے کہ تادم تحریر کوئی لاش نہیں ملی ہے۔ہمارے وزیر باتدبیر نے تمام ذمہ داری ایکسیئن اور ٹھیکداروں پر ڈال کر اپنے آپ کو بچانے کوشش کی ہے۔ یاد رہے کہ آپ اس علاقے کے منتخب نمائندہ بھی ہیں اور وزیر تعمیر بھی، آپ پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہاں تو آپ بچ نکلوگے مگر خدا کی عدالت میں آپ کے پاس کیا جواب ہوگا؟۔ آج گیس بالا میں ہر آنکھ پر

نم ہے۔ان پر قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔گلگت بلتستان کے تمام اخبارات میں اس سانحہ کی خبریں تفصیل سے لگی ہیں، سپر لیڈ ہی ہیں۔تمام ٹی وی چینلز اور ملکی اخبارات نے بہترین کوریج دی ہیں۔اللہ تعالٰی نے اہلیان گیس پر بار بار آزمائش کرکے انہیں دو باتوں کا پیغام دیا ہے' ایک یہ کہ گوہرآباد کے لوگ بالعموم اور گیس بالا کے لوگ بالخصوص اجتماعی توبہ واستغفار کریں۔اللہ سے اپنے گناہوں کو معاف کروائیں اور اپنے ان اعمال سے باز آجائے جو اللہ تعالٰی کو ہرگز پسند نہیں، بالخصوص ڈیم سے متاثر ہونے والی بنجر زمینوں' اجتماعی شاملاتی اراضی میں حد سے زیادہ کرپشن اور خرد.برد' غریبوں کی حق تلفی اور آپس کی ناچاکیاں اور حلال حرام کی تمیز کیے بغیر مال ودولت کا ارتکاز۔اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ چور' لیٹرے اور ڈاکو قسم کے سیاسی لیڈروں اور سرکاری آفیسروں سے اپنا جائز حق مانگنا نہیں بلکہ چھیننا۔اب بھی اگر اپنے حق کے لیے ان چوروں کی گریبان نہیں پکڑوگے' ان کا دامن تار تار نہیں کروگے تو پھر یہ لٹیرے قسم کے لوگ آپ کے منہ سے لقمہ بھی چھین لیں گے۔یاد رہے جو لوگ اپنے لیے نہیں جیتے ہیں اللہ تعالٰی کو ایسے لوگوں پر ترس نہیں آتا ہے۔میری گوہرآباد کے لوگوں سے دردمندانہ گزارش ہے کہ آپس کی ناچاکیاں ختم کرکے ان لٹیروں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاو، پھر آپ کے دونوں پل بھی بروقت ٹھیک ہوسکتے ہیں' آپ کا روڈ' واٹر چینل اور سکول وہسپتال کے گھمبیر مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں۔اگر آپ کی حالت یہی رہی تو یاد

رہے یہ لوگ عنقریب آپ پر زندگی کی تمام سہولیات حرام کردیں گے۔ گوہرآباد والو ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ان چوروں نے آپ کے ملکیتی جنگلات میں روڑے اٹکا کرآپ کو اب تک کتنا نقصان پہنچایا ہے؟ میں بتاتا ہوں ' 1985 سے اب تک چھ (٦) کھرب روپیوں کو نقصان ہوا ہے۔ کیا ہے کوئی عبرت پکڑنے والا؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ بہر صورت میں تمام مرحومین کے پسماندگان سے دلی تعزیت کرتا ہوں اور اللہ سے دعاگو ہوں کہ اللہ ان کی اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور آپ کو صبر جمیل عطا کریں۔ بے شک اللہ رب العزت بڑے رحیم و کریم ہے' اپنے بندوں پر خصوصی شفقت فرماتے ہیں۔ اللہ سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اس سانحہ کی اعلی سطحی بنیادوں پر شفاف انکوائری ہونی چاہیے ' جو بھی ملوث ہوگا اس کو کیفر کردار تک پہنچایا جانا چاہیے۔

قاضی نثار اور مولانا شہاب کی ایک خوش گوار ملاقات

اسلام آباد میں جنوری کی ایک خنک شام میں "رنگ رنگ" سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف گلگت بلتستان کونسل کے ممبر مولانا عطاء اللہ شہاب صاحب محو گفتگو تھے۔ علیک سلیک کے بعد کہنے لگے کہ ابھی ہم آپ کے ادارے کی طرف آرہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ خوش آمدید! مگر میں ادارے سے باہر ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ کیوں تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ قاضی نثار آئے ہوئے ہیں تو ان سے ملاقات کرنی ہے۔ مولانا شہاب کی اس خواہش کو دل ہی دل میں بہت سراہا، اس لیے کہ گلگت بلتستان کی دو نامور مذہبی و سیاسی شخصیات کا اس طرح خوشگوار ماحول میں ملاقات کا کافی عرصہ بعد امکان ہو رہا تھا۔ جب میں نے قاضی نثار صاحب سے عرض کیا تو وہ بھی دیدہ دل فراش کیئے ہوئے تھے۔ کہ ہاں ملاقات ہونی چاہیے تاکہ مل بیٹھ کر علاقائی امور پر گفت و شنید ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گلگت بلتستان سیاسی و مذہبی اور آئینی اعتبار سے پورے پاکستان سے مختلف ہے۔ یہاں ہمیشہ مذہبی کشیدگی رہتی ہے۔ ماحول ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ ڈسٹرکٹ گلگت اور مذہبی فسادات سے پورے خطے کے لوگ تنگ آچکے ہیں۔ کسی بھی مکتبہ فکر کے لوگ قتل و غارت اور امن وامان کے سبوتاژ سے خوش

نہیں ہے۔ جس سے بھی بات کریں تو وہ اندر اندر سے کڑہن میں مبتلا ہے کہ آخر میری دھرتی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں نے گلگت بلتستان کے لوگوں میں دوریاں پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ان کا شعلہ ہی اسی سے جلتا ہے کہ وہاں ہمہ دم مذہبی کشیدگی ہو۔ امن و امان سبوتاژ ہو۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک ہی مسلک کے لوگوں میں بھی نفرت کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔ ان کو ایک دوسروں سے دور کیا جا رہا ہے۔ غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ ان میں کسی قسم کے اختلافات نہ ہونے کے باوجود قربتوں کے بجائے دوریوں کی روش ہے۔ قریب آنے کے بجائے دور ہو رہے ہیں۔ اور کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔

مولانا عطاء اللہ شہاب گلگت بلتستان کی سیاست کے جھومر ہیں۔ ان کی سیاسی بصیرت کی گواہی غیر بھی دیتے ہیں۔ گلگت بلتستان میں نظریاتی سیاست متعارف کروانے میں ان کا کلیدی کردار ہے۔ جمعیت علماء اسلام کو گلگت بلتستان میں مولانا عطاء اللہ شہاب کی وجہ سے کافی پذیرائی ملی ہے اور مرکز سے بھی مولانا شہاب کی وجہ سے مضبوط تعلقات استوار ہوئے ہیں۔ اگرچہ مولانا لقمان حکیم اور قاضی عنایت اللہ کی خدمات بھی جمیعت علمائے اسلام کے لیے گرانقدر ہیں۔ اگر آج جمعیت علماء اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمان صاحب، مولانا محمد خان شیرانی صاحب، مولانا عبدالغفور حیدری صاحب اور اعظم سواتی صاحب

جیسے مرکزی ذمہ داران اور وزیر اعظم گیلانی، منظور وٹو ار قمرالزمان کائرہ جیسے قومی رہنماں گلگت بلتستان پر توجہ دے رہے ہیں تو گلگت بلتستان کی جغرافیائی، مذہبی، سیاسی اور آئینی و دفاعی اہمیت کے ساتھ ساتھ مولانا شہاب کی انتھک محنتیں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے تقریر و تحریر اور اپنی مسلسل کوششوں سے ہی اکابر علماء اور قومی و سیاسی لیڈروں کو گلگت بلتستان کی طرف توجہ مبذول کروایا ہے۔ ان کی بے شمار خدمات ہیں ان کا تذکرہ پھر کبھی ہوگا۔ جسطرح گلگت بلتستان میں تحریکی سیاست کے حوالے سے شہاب صاحب سرگرم میں اسطرح دینی و مذہبی اور اصلاحی خدمات کے حوالے سے قاضی نثار احمد بھی ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاضی نثار احمد گلگت بلتستان کے اہلسنت عوام کے بے تاج بادشاہ ہیں ان کو جو احترام و مقام عوامی حلقوں سے ملا ہوا ہے۔ شاید ان کے والد مرحوم قاضی عبدالرزاق کے بعد آج تک کسی سیاسی و مذہبی لیڈر کو ملا ہو۔ قاضی نثار صاحب کے نانا قاضی عبدالرحیم صاحب اور والد گرامی قاضی عبدالرزاق کی گلگت بلتستان کی جنگ آزادی میں بنیادی کردار ہے۔ ان دونوں کا شمار گلگت بلتستان کے اولین فضلائے دارالعلوم دیو بند میں ہوتا ہے، قاضی عبدالرزاق صاحب وہ واحد شخصیت ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان کا سبز ہلالی جھنڈا جامع مسجد گلگت میں سب سے پہلے لہرانے کا شرف انہیں حاصل ہوا۔ ڈوگرہ راج اور گوروں کے ساتھ ان کی لڑائیاں تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں۔ بلتستان اور استور کے مضافاتی علاقوں سے ڈوگرہ کو مار بھگانے کے حوالے سے

قاضی عبدالرزاق کی پالیسیاں اور کوششیں تاریخ کا وہ سنہری باب ہے جس سے کوئی بھی مورخ نظریں نہیں چرا سکتا۔ صوبیدار بابر خان اور قاضی عبدالرزاق کی مشاورتیں اور ڈوگرہ کے خلاف کوششیں کس سے پوشیدہ ہیں؟ قاضی عبدالرزاق صاحب کے ہونہار بیٹے قاضی نثار صاحب نے بھی اپنے والد گرامی اور ناناجی مرحوم کی خدمات وافکار کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا ہوا ہے۔ وہ رخصتوں کے بجائے عزیمتوں کی راہ پر گامزن ہیں۔ جامعہ مسجد کی خطابت کے ساتھ ساتھ گلگت بلتستان کی سب سے قدیم اور بڑی دینی درسگاہ جامعہ نصرۃ الاسلام کا انتظام وانصرام بھی انہی کے ناتواں کندھوں پر ہے۔ تنظیم اہلسنت والجماعت گلگت بلتستان و کوہستان کے مرکزی امیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھارہے ہیں۔ اور پاکستان کے سب سے بڑے اسلامی وفاقی بورڈ ''وفاق المدارس العربیہ ''پاکستان کے مجلس عاملہ و شوریٰ کے رکن بھی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ عالم اسلام کے عظیم مفکر اور شہید پاکستان مولانا یوسف لدھیانوی صاحب کے خلیفہ مجاز ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے نامور فاضل مولانا قاضی مظہر حسین صاحب مرحوم اور ختم نبوت پاکستان کے امیر مرکزیہ مولانا خواجہ خان محمد صاحب مرحوم کے بھی خلیفہ و مرید ہیں۔ اکابرین علماء دیوبند ان پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ علامہ بنوری ٹاؤن، جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک جیسے دینی اداروں سے تعلیم کی تکمیل کی ہے۔ اور گلگت بلتستان کے اہلسنت عوام کے واحد غیر متنازعہ دینی رہنماء ہیں ہماری دعا ہے کہ ان دونوں حضرات کو اللہ تعالیٰ عمر خفر عطاء

فرمائیں اور ان کو اپنے خصوصی امن و سلامتی میں رکھیں۔ گزشتہ دنوں ان دونوں صاحبان نے اسلام آباد میں ایک سرد شام کو ایک خوشگوار ملاقات کی۔ علاقے کے حوالے سے مختلف امور پر گفت و شنید کی اور جو بھی لائحہ عمل ہوگا وہ آپس کی مشاورت سے کرنے کا عزم کیا۔ یاد رہے کہ تنظیم اہلسنت والجماعت اور جمعیت علماء اسلام گلگت بلتستان نے گزشتہ دنوں گلگت میں تحفظ ناموس رسالت کے حوالے سے ایک شاندار جلسہ منعقد کیا تھا۔ اور دونوں کے مرکزی عہدہ داروں نے ایک ہی اسٹیج سے تحفظ ناموس رسالت اور دیگر اہم مسائل میں مکمل مشاورت اور یکجہتی سے کام کرنے کا واضح عزم کا اظہار کیا تھا۔ حالت پر نظر رکھنے والے احباب کے لیے یہ ایک خوشگوار ہوا کے جھونکے سے کم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ قاضی صاحب اور شہاب سے کہ وہ آئے روز قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ مجھے اگر قاضی نثار صاحب سے عقیدت واحترام اور مودت کا تعلق ہے تو مولانا شہاب صاحب سے محبت و منزلت اور رفاقت کا تعلق بھی ہے۔ ان کے ساتھ یہ تعلق سالوں پر مشتمل ہے۔ دونوں حضرات نے ہمیشہ میری حوصلہ آفزائی کی ہے۔ اپنے اہم امور میں مجھے بھی شامل مشاورت کی ہے۔ مولانا شہاب صاحب سیاسی حوالے سے کبھی مشاورت کرے یا نہ کرے مگر ''دارالعلوم گلگت ''اور ماہانہ " شہاب "کے حوالے سے ہمیشہ مشاورت کرتے ہیں بلکہ شاید ہی ماہانہ شہاب کے حوالے سے میرے بغیر انہوں نے کوئی اہم میٹنگ کی ہو، یہ ان کا بڑا پن ہے کہ ایک طالب علم کو اتنا اعزاز دے رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح قاضی صاحب بھی بعض اہم امور میں

مشاورت کرتے ہیں۔ وہ بھی عنقریب کوئی میگزین نکال رہے ہیں تو اس حوالے سے ہمیشہ گفتگو رہتی ہے۔ میں اپنے پر اعتماد کرنے کی بنیاد پر ان دونوں حضرات سے ایک مخلصانہ گزارش کرونگا کہ چند ایسے شرپسند عناصر ہیں جو آپس کی محبتوں کو دوریوں میں بدل رہے ہیں۔ وہ لوگ ان دو حضرات سے علیحدہ ملاقاتیں کرتے ہیں اور ان میں رنجشیں بڑھاتے ہیں۔ کبھی کسی کے پاس غلط بیانی کی کبھی کسی کے پاس ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر قاضی صاحب اور شہاب صاحب ایسے بدنما لوگوں کی حوصلہ شکنی نہ کریں تو یہ لوگ آنے والے دنوں ناسور بن سکتے ہیں۔ یہ لوگ کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ ان کا صرف ایک ہی ایجنڈا ہے کہ ان بڑوں کے پاس جاکر اپنی چرب زبانی سے چھوٹی سی بات پر لیپاپوتی کرکے نفرتیں پھیلائیں ۔ اور رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں،ان کے دلوں میں محبتوں کو رواج دینے کا کوئی پلان نہیں اور میرے نزدیک اللہ کی تمام مخلوق اور انسان میں صرف ایک فرق ہے وہ لفظ ''محبت '' اگر یہ لفظ انسان سے ہٹا دیا جائے تو انسان میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ خدا سے محبت رسول سے محبت ، صحابہ و اسلاف سے محبت ، والدین بہن بھائیوں ، عزیزوں ، رشتہ داروں اور ہمسائیوں سے محبت اور پھر انسانیت سے محبت ، جو ان تمام محبتوں کا قائل نہیں وہ انسان کہلانے کے قابل نہیں ۔ بہر صورت مجھے امید واثق ہے کہ دونوں حضرات اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے جمعیت علماء اسلام اور تنظیم اہلسنت والجماعت کو قریب کرنے میں کوشش کرینگے۔ یہ عوام کے لیے ایک بہترین تحفے سے کم نہیں ۔ اور عوام کو

ان کا یہ بہترین تحفہ جلد از جلد ملنا چاہیے۔

انسانی زندگی میں ''وقت کا پچھتاوا'' سب سے افسوس ناک ہے۔ آپ نے بے شمار لوگوں کو حسرت ویاس کے عالم میں یہ کہتے ہوئے ضرور سنا ہوگا کہ '' اے کاش ! کہ مجھ تھوڑا سا اور وقت مل جاتا تو میں مزید کچھ اہم امور نمٹا لیتا''۔ وقت انسانی زندگی کا سب سے قیمتی شئی ہے مگر ہم مسلمان آج کے اس تیز ترین دور میں سب سے بے دریغ جو چیز ضائع کرتے ہیں وہ وقت ہے۔ میں نے کہی سنا ہے کہ امریکہ میں لوگوں کی زندگی وقت سے دو سیکنڈ آگے چلتی ہے۔کاش ہم آگے نہ بھی چلتے مگر وقت کے ساتھ ساتھ تو چلتے۔ وقت اور زمانے نے ہمیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی میرے دو کالم شائع ہو چکے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے یہ موضوع قلیل کے بجائے کثیر کا متقاضی ہے۔ وقت دو دھاری تلوار ہے ، آپ اس تلور کو کاٹ نہیں سکتے بلکہ خود اس کا شکار ہو سکتے ہیں اور ہم مسلمان تو روزانہ کی بنیاد پر اس کا شکار ہو رہے ہیں ۔ وقت کو درست استعمال کرکے زندگی اور معاشرے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے سٹیفن آر۔ کووے نے ''First things first '' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ پروفیسر اعجاز اے محمود نے ''ضروری کام پہلے '' کے نام سے کیا ہے۔ سٹیفن آر۔ کووے ایک امریکی مصنف ہے۔اس کی دو مشہور کتابیں ''پراثر لوگوں کی سات عادات اور ''لیڈر شپ'' نے دنیا میں دھوم

مچا رکھی ہیں ۔ مغربی دنیا یں کووے کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ کووے کو پوری دنیا میں لیڈر شپ، خاندانی معاملات ، درس وتدریس اور انسٹیٹیوٹ کی کامیابی و عروج اور ترقی کے ماہر کی حیثیت سے بے پناہ احترام واکرام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت پر میں نے اردو اور عربی میں کافی مطالعہ کیا ہے۔علامہ ابو فتاح ابو غدہ کی کتاب ''قیمۃ الزمن عندالعلمائ'' علمی دنیا میں ایک معروف کتاب ہے۔ میرے استاد گرامی ابن الحسن عباسی کی کتاب ''متاع وقت اور کاروان علم'' نے میری زندگی کی ترجیحات بدل کرکے رکھ دی ہیں۔زمانہ طالب علمی میں اس کتاب کو بالاستیعاب پانچ دفعہ پڑھی ہے۔ اب بھی گاہے گاہے پڑھتا رہتا ہوں۔ محمد بشیر جمعہ کی کتاب ''شاہراہ زندگی پر ترقی کا سفر'' ایک وقیع اور دلچسپ کتاب ہے۔ میں اپنے دوستوں اور طلبہ کو بھی تاکید کرتا ہوں کہ یہ کتابیں ضرور پڑھ لی جائے۔اج اپنے قارئین کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ مندرجہ بالا کتابوں کو کم از کم ایک دفعہ ضرور پڑھیں۔ یہ کتابیں آپ کا تھوڑا وقت لے کر آپ کو بہت کچھ دیں گی۔

اس میں دو رائے نہیں کہ انسان ایک کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے۔کامیاب زندگی اور خوشحال زندگی کس سے کہا جاتا ہے ، وہ کیا چیزیں ہیں جن سے ایک زندگی کو کامیاب اور خوشحال کہا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہم پروفیسر کووے کے نظریہ کو اپنے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں ۔انسان کی زندگی کے بنیادی

ضروریات اور تقاضے چار ہیں۔ان چار ضروریات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔جب تک ایک انسان کو یہ چار بنیادی ضروریات حاصل نہیں ہوتی تب تک وہ اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتا ہے۔انسان طبعی طور پر خوش رہنا چاہتا ہے۔یعنی وہ ایک کامیاب اور پرکشش زندگی گزارنا چاہتا ہے، یہ طبعی تقاضہ ہے۔انسان معاشرتی طور پر بھی خوش رہنا چاہتا ہے، یعنی چاہتا ہے کہ وہ لوگوں سے محبت کریں اور لوگ اس سے بے انتہا محبت کریں۔انسان ذہنی طور پر خوش رہنا چاہتا ہے۔اور یہ خوشی اور سکون اسے علم و عمل اور تربیت کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔ انسان روحانی طور پر خوش رہنا چاہتا ہے، روحانی خوشی کیسے مل سکتی ہے اس کی کئی صورتیں ہو سکتیں کہ، مثلا انسان کا روح متقاضی رہتا ہے کہ وہ ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی گزارے اور لوگ آئندہ کے دنوں میں جب بھی کامیاب اور پر عزم زندگی کا ذکر کریں تو لا محالہ اس کا نام لیں۔یعنی وہ دوسروں کے لیے مثال بننا چاہتا ہے۔اگر آپ انگلش میں اس تفصیل کو سمجھنا چاہیے تو ''To live, to love, to learn, to leave a legacy'' آپ اس محاورے کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔

آج کی تحریر میں ان لوگوں کو مخاطب کیا جائے گا جو طبعًا، جسمًا، ذہنًا، عقلًا، روحًا اور معاشرتی و سماجی اعتبار سے نوجوان ور فکر مند ہوں۔اور ایک کامیاب معاشرتی، سماجی اور ذاتی زندگی گزارنے کے خواہش مند ہوں۔ جو طبعی، معاشرتی، ذہنی اور روحانی کامیابی کی تمام لذتیں حاصل کرنا چاہتے

ہوں۔لازمی نہیں کہ یہ جوانی، فکرمندی اور تندہی صرف کم عمر لوگوں کو حاصل ہو بلکہ بعض بوڑھے اور ضعیف العمر لوگ بھی نوجوانوں سے زیادہ پر عزم اور فعال ہوتے ہیں۔ہمارے استاد محترم شیخ سلیم اللہ خان مدظلہ فرمایا کرتے تھے کہ میں بظاہر ضعیف ہوا ہوں مگر عزم وجزم اور حوصلے میں آپ سے جوان ہوں، وہ واقعی جوان تھے۔آج گلگت بلتستان کی سطح پر تعلیم یافتہ نوجوانوں اور پر عزم ضعیف العمر ویل ایجوکیٹڈ اور ویل ایکسپیریئنسڈ احباب پر مشتمل ایک فورم تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔آپ اس فورم کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔آپ گلگت بلتستان یوتھ تھنکر فورم ہی کہہ لیں۔یا اشتراک رائے سے کوئی بھی نام تجویز کرلیں۔یہ فورم غیر سیاسی، مذہبی و مسلکی اور غیر منافع بخش بنیادوں پر قائم ہو۔اس فورم کے دیگر اغراض و مقاصد کے ساتھ چار چیزیں ترجیحی بنیادوں پر شامل ہوں۔یہ فورم معاشرے کے تمام طبقات بالخصوص نوعمر یعنی طلبہ وطالبات میں چار چیزیں اُجاگر کریں۔ا۔خودآگہی (Self awareness) اپنی ذات سے آگاہی کا شعور، کہ رب العزت نے ہمیں کس مقصد و غایت کے لیے پیدا کیا ہے۔مقصد تخلیق انسانی کیا ہے۔خودآگہی میں معرفت الہی اور تخلیق انسانی دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔خودآگہی ہماری آنکھوں سے دبیز پردوں کو ہٹا دیتی ہے اور یہی خودا گہی سے ہی ایک انسان کی تمام ظاہری وباطنی خوبیاں اور خامیاں عمیق مطالعے کے بعد روزروشن کی طرح عیاں کی جاسکتی ہیں۔دوسرا ضمیر کی آواز، ضمیر (Conscience) کی آواز بہت اہم چیز ہے۔انسان اپنی عملی زندگی میں جو بھی کام کرتا ہے۔

ضمیر اس کو اچھے کام پر تحسین کے پھول نچھاور کرتا ہے اور غلط اور برے کام پر ملامت کے پتھر برساتا ہے۔ ضمیر ایک خفیہ طاقت ہے جو کسی بھی باضمیر انسان کو ایک اچھے کام کی اجازت دیتا ہے اور تحسین بھی کرتا ہے جبکہ بے اصول، لایعنی اور غیر منفعت اور بے ہودہ کاموں سے روکتا ہے اور ملامت بھی کرتا ہے۔ یہ انسانی ضمیر ہی ہے جو اپنی مخصوص صلاحیتوں پر منعم حقیقی کا شکر کرنے اور مقصد، ہدف اور ٹارگٹ کا تعین، ادراک اور فہم عطا کرتا ہے۔دنیا میں وہی لوگ، معاشرے اور ممالک کامیاب ہیں جو باضمیر ہیں۔آج ضمیر سازی کی اشد ضرورت ہے۔ تیسرا خود مختار مرضی (Independent Will)، انسانی زندگی میں خود مختار مرضی بھی بہت اہم چیز ہے۔یہ ایک عظیم ودیعت ہے، جو اللہ رب العزت کے فضل سے عطا کی جاتی ہے۔اس صلاحیت و دیعت سے ہم میں انقلابی کام کو انجام دینے کی آمادگی ظاہر ہوتی ہے۔اس خود مختار مرضی کی وجہ سے ہی ہم اپنے ارد گرد کے رہتے ہوئے مسائل کاآزادانہ جائزہ لے سکتے ہیں اور اپنے مروجہ لائحہ عمل اور انداز فکر میں نئے اصول اور جدید ضروریات اور مقتضائے حال کے مطابق تصحیح، تبدیلی اور تجدید کر سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی اچھی صفت ہے کہ اسے ہم وقتی اور دائمی جذبات و حالات کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔یہ صلاحیت ہمیں بتاتی ہے کہ ہم صرف ماضی کی پیداوار نہیں بلکہ حال اور ایک بہترین مستقبل کا نمائندہ بھی ہیں۔یہی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے ہم اپنے مزاج، طبع، رجحان، علم و حلم اور فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے بہترین مواقع اور پروفیشن کا

تخلیقی سوچ و (Creative imagination) انتخاب کر سکتے ہیں۔چوتھا تخلیقی تصور تصور کو آپ قوت متخیلہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔قرآن کریم میں اس کاذکر کئی قسم کے صیغوں کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً، یعقلون، تعقلون، تفھون،

تتفکرون، تعلمون،یسخرون، تسخرون، تتخیلون ۔یہ بھی خالق کونین کی طرف سے بہت ہی کم لوگوں کو تحفۃً عطاء کی جاتی ہے۔مذکورہ بالا چار صفات سے انسان اور دیگر مخلوقات میں تمیز کی گئی ہے۔ہر انسان میں کم اور زیادہ کی بنیاد پر یہ صفات موجود ہوتیں ہیں مگر بات صحیح سمجھنے اور استعمال کرنے کی ہے۔ قوت متخیلہ ہی کے ذریعے ہم اپنے مستقبل کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی عمل کے وجود میں لانے سے پہلے ہم قوت متخیلہ کے ذریعے اس کام کے تدریجی مراحل، اس عمل کا انجام، اس کے نقصانات و فوائد کو دیکھ سکتے ہیں اور اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کو خوبصورت طریقے سے (manage) مینج کرکے مجوزہ کام کو مکمل تکنیک اور خوبصورت طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ اسی تخلیقی صلاحیت ہی کے ذریعے ہم دوسرے انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز بنا سکتے ہیں۔ یہی وہ عظیم صلاحیت ہے کہ ہم اعلیٰ مقاصد پر مبنی ایک جاندار لائحہ عمل تشکیل دے سکتے ہیں۔ اور اسی قوت متخیلہ کی ہی مدد سے ہم اپنے تشکیل کردہ پروگراموں کا تفصیلی جائزہ لے سکتے ہیں اور خود احتسابی کی اہلیت بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ تخلیقی سوچ کے حامل فرد کسی بھی ادارے کو عروج تک پہنچا سکتا ہے۔

ہم واضح طور پر اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ مذکورہ بالا چار صفات کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے سے ہی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔اس فورم کے ذریعے ہی سے ہم نے اپنے اندر یہ صلاحتیں پیدا کرنا ہے کہ ہم خود کو شک کی نگاہوں سے نہ دیکھیں اور نہ ہی دوسروں پر الزام تراشی کا خوگر ہوں۔اہداف کے مکمل تعین کے بغیر کوئی کام سرانجام نہ دیں، فوری اور ضروری نوعیت کے کاموں کو پہلی فرصت میں کریں۔ اور یہ سوچ جو ہمارے معاشرے میں بری طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم خوف زدہ ہو کر زندہ رہ رہے ہیں۔انسان پریشانی اور خوف کے سائے میں لازمی طور پر بہتری اور اعلیٰ مقاصد سے کنارہ کش ہوتا ہے۔اس کی بیخ کنی کرنی ہے۔ہم خود کو قصوروار نہ سمجھیں اور نہ ہی دنیا کے مسائل سے ڈر کر مصالحت اور فرار کی راہ اختیار کریں بلکہ ہمیں پوری تندہی اور ہمت و عزم سے اپنے وسائل کو یکجا کرکے مسائل کا بہتر انداز میں مقابلہ کرنا ہے۔ دباؤ اور بحرانوں کی کیفیت سے نکل کر رہنمائی اور لیڈرشپ کی راہ لینا ہے۔ہر انسان اپنے گھر میں، اپنے خاندان میں، فیکٹری اور دفتر میں، کمپنی میں اور پھر ریاست میں ایک سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اپنی حیثیت کے مطابق اصول طے کرنے ہیں۔پھر ان اصولوں پر کاربند رہ کر کامیابی سے ہمکنار ہونا ہے۔ قل ربی اللہ ثم استقم، سے ہمیں یہی درس ملتا ہے۔زندگی کے تمام شعبوں میں لیڈری اور رہنمائی اپنا وجود اور اثر دونوں دکھاتی ہے۔ہر انسان کے اندر سے لیڈری چیخ چیخ کر اس کو پکار رہی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس

پکار کو سمجھنا ہے۔اگر آپ سمجھے تو آپ ایک کامیاب سربراہ گھر، سربراہ ادارہ اور سربراہ ملک ہیں۔

ایک انسان کی کامیاب زندگی، ایک کامیاب معاشرہ اور ایک کامیاب ریاست کے شہریوں کے لیے ان مقاصد کا حصول بدون تعلیم کے ممکن ہی نہیں۔ یہ ہم پر عیاں ہے کہ ہم ایک ایسی دین کے داعی ہیں کہ اس کا اولین موٹو ہی تعلیم ہے۔ تعلیم ہی ہمارا ورثہ ہے۔ ہم نے صدیوں تعلیم ہی کو بدولت پوری دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ اگر آج ہم زوال پذیر ہیں تو بھی اس کا واحد سبب ہمارا تنزلِ تعلیم ہے۔ہم نے علم کو اتنے خانوں میں تقسیم کیا ہے کہ اب ہم خود حیرت میں مبتلا ہیں۔ اور ہم جس ریاست میں رہتے ہیں وہ ریاست بھی علم کا مدعی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم مدعی بھی ہیں اور اپنے دعویٰ کے خلاف دلیلیں بھی اپنے قول و عمل سے دے رہے ہیں۔ہم ریاستی طور پر علم کے مدعی کیسے ہیں تو آئے ہم ریاستی آئین کی ایک لائن پڑھتے ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی ریاست کو نظامِ عمل آئین دیتا ہے۔ تعلیم کے بارے میں آئین پاکستان کیا کہتا ہے ملاحظہ کیجیے۔

"The state of Pakistan shall remove illiteracy and provide free and compulsory secondary education within minimum possible period."

میں اس حقیقت سے خوب واقف ہوں کہ تعلیم میں شنویت نہیں ہے۔ مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں تقسیم کی لکیر کھینچ لی گئی ہے۔ قدیم اور جدید کا تصور نے مضبوطی سے جڑیں پکڑ لی ہیں مگر اس قدیم اور جدید کے حسین امتزاج پر میں اکابر اہل علم کے سینکڑوں دلائل پیش کر سکتا ہوں۔ علامہ اقبال، سید قطب اور حکیم الامت اشرف علی تھانوی کی تعلیمات اور حسین احمد مدنی کا مجوزہ تعلیمی خاکہ اور شیخ الہند کی تعلیمی فکر میرے سامنے ہے۔ انہوں نے قدیم اور جدید تعلیم کے حوالے سے 1920 ء کو جامعہ اسلامیہ اسلامی دہلی کے تاسیسی جلسے میں جو تقریر فرمائی تھی وہ میرے کانوں میں رس گھولنے کے لیے کافی ہے۔ اس وقت ان کے مخاطب صرف اور صرف تعلیم یافتہ لوگ تھے۔

ہمیں تلخ حقائق کا ادراک کرنا ہی ہوگا اور اعتراف بھی۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ آج ہمارے معاشرے میں سینکڑوں نوجوان بڑی بڑی ڈگری لیے پھرتے ہیں۔ اس میں تخصیص نہیں کہ انہوں نے جدید تعلیم حاصل کی ہے یا قدیم۔ دونوں کے حاملین سرگرداں پھر رہے ہیں۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب صرف یہ ہے کہ ہم نے جو تعلیم حاصل کی ہے اس نے ہمیں وہ راہ ہی نہیں دکھائی جو دکھانی تھی۔ ہماری تعلیم نے ہمیں خود آگاہی نہیں سکھائی ہے۔ ہماری تعلیم ہمارے ضمیر کو نہیں جھنجوڑ رہی ہے۔ ہماری تعلیم نے ہمیں کبھی بھی خود مختاری کا سبق نہیں پڑھایا۔ اور نہ ہی ہماری تعلیم نے ہمیں تخلیقی تصور دیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کون ہیں اور

کس مقصد کے لیے اس دنیا میں موجود ہیں۔ ہماری مروجہ تعلیم ان جیسے بے شمار سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ میں جب بھی ڈگری کلاسز میں اپنے طلبہ سے یہیں باتیں کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس طرح تو کوئی نہیں بتاتا، ہمیں تو صرف نصابی کتابوں سے چند باتیں بتلا کر فارغ کردیا جاتا ہے۔آج تک ہمارے تعلیمی اداروں میں ہمیں مثال بننے کی ترغیب نہیں دی ہے اور نہ ہی ہمیں جدید دور کے ضروری تعلقات اور کمیونیکیشن کے ذریعے اور نہ مشاورت و ہدایت کے ذریعے اپنے آپ کو باکمال بنانے کا گُر سکھایا ہے۔ ہم مشینی طور پر تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں۔ ایک مخصوص پیریڈ کے بعد ہمیں ڈگریاں تھمادی گئی ہیں اور بس ......۔ کوئی میری بات تسلیم کرے یا نہ کرے مگر یہ تلخ حقیقت ہمیں ماننا پڑھے گا کہ ہم نے بار ہا یقینی طور پر غفلت، سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کیا ہے۔اگر کبھی ہمارے ضمیر نے ہمیں جھنجوڑا بھی ہے تو ہم نے آن سنی کردیا اور اس کی صدا فراموش کردی ہے۔ہماری زندگی میں بیسویں دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ہم نے انسانی سیرت و کردار کے برعکس کام کیا۔اور دیسویں دفعہ ہم نے حکمت و بصیرت اور تصور و تخیل اور فکر و نظر کو نظرانداز کرکے عاقبت نااندیشی کا واضح مظاہرہ کیا ہوتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان صورتوں سے نکلنے کہ لیے ہمیں ہنگامی بنیادوں پر کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی تو ہو جو ہمیں خود آگاہی سے متعارف کروائے۔ہمارے ضمیروں کو زور سے جھنجھوڑے اور ہمیں اچھے اور برے، صحیح اور غلط اور حق اور باطل میں تمیز کا سبق سکھائے۔

لازمی طور پر کوئی نہ کوئی ہمارے اندر قوت متخیلہ اور خود مختار مرضی کی صلاحیت پیدا کریں اور ان میں زنگ لگا ہوا ہے تو پالش کریں۔ طول و عرض میں نظریں دوڑائیں تو بھی کوئی طبقہ درست معنوں میں یہ کام کرتا نظر نہیں آتا۔ حکومت اور منافع بخش اداروں سے بھی اس کام کی توقع عبث ہے۔ اگر کوئی صاحب دل آدمی اس کردار سازی کا بیڑہ اٹھائے تو شاید کوئی تبدیلی آجائے۔ میں واضح طور پر بتلانا چاہتا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی سی بڑی تبدیلی بھی ہمارا مقدر نہیں بدل سکتی۔ کوئی سا انقلاب ہمارے زخموں کا مرہم نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم ہمیں فرد اور معاشرے کی مکمل اصلاح کرنی ہوگی اور وہ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ آپ قرآنی تعلیمات اور قرن اول کے مسلمانوں کی زندگیوں کا عمیق مطالعہ کرو تو ان میں یہ تمام چیزیں بدرجہ اتم موجود ہونگی۔ آج نئے سرے سے، جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلاف کے ان روایات کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے دل و دماغ میں جو خاکہ بن رہا ہے شاید درست انداز میں میرے الفاظ ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ اگر آپ کو سمجھ نہیں آرہا ہے یا میں آپ کو مکمل سمجھانے سے قاصر ہوں تو آپ اس کو میری تحریر میں جھول کا نام دے سکتے ہیں۔ اگر آپ پھر بھی سمجھنے کے لیے مصر ہیں تو جن کتابوں کا حوالہ پہلے پیرگراف میں دیا ہے ان کے مطالعہ ٹھنڈے دل و دماغ سے ضرور کیجیے گا۔ اور مصر کے جید اسکالر سید قطب کی کتاب معالم الطریق (عربی) جس کا اردو ترجمہ ''جادہ و منزل ''کے نام سے ہوئی ہے اور ہندوستان کے علامہ ابوالحسن علی ندوی کی

کتاب'' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' (عربی) جس کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا میں مسلمانوں کا عروف وزوال'' کے نام سے ہوئی ہیں بھی ملاحظہ کیجیے۔

جو معاشرے اور افراد خود آگہی کی صفت سے محروم ہوں، ضمیر کی آزادی ان کے نصیب میں نہ ہو۔ خود مختاری کے بجائے غلامی کے خوگر ہوں، تخلیقی تصورات کے بجائے انجماد کا شکار ہوں ایسے معاشروں اور افراد سے خیر کی توقع عبث ہے۔ زوال لازمی ہے۔ ایسے معاشروں میں ضیاع وقت، معاشرتی بگاڑ، سماجی ناانصافی، کرپشن، میرٹ کی پامالی، بدامنی، قتل و قتال، قیل و قال، لڑائی جھگڑے، چوری چکاری، کساد بازاری، قول و فعل میں تضاد، ظلم و جبر، غفلت و سستی، کاہلی و کسالت پسندی، خود غرضی و لالچ، افراتفری، فکری بے راہ روی، غیروں کی خوشامد، اپنوں سے دشمنی، تعلیمی افلاس، زنا، شرب الخمر، کذب، ابن الوقتی اور ان جیسی بے شمار بری صفات خود رو پودوں کی طرح اُگ آتی ہیں۔ ان بری صفات کو اصول فقہ کی اصطلاح میں افعال حسیہ کیا جاتا ہے۔ خدا تعالٰی کی طرف سے ان افعال سے مطلق نہی وارد ہوئی ہے۔ ان افعال کی برائی کا سمجھنا شریعت پر موقوف نہیں۔ ہر آدمی سنتے ہی ان افعال کی برائی سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی دنیا کے آفاقی اور مسلمہ اصول ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب، کوئی اصول، کوئی قانون، کوئی روحانی تعلیمات، کوئی پیشوا اور کوئی معاہدہ ان برے کام کی حمایت نہیں کرتا، بلکہ شدید الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ تمام برائیاں

خودرو سبزہ کی طرح روز بڑھ رہی ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے ہمیں کردار ادا کرنا ہوگا۔
وہ بھی ہنگامی بنیادوں پر۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

''عکسِ گلگت بلتستان کا عکس''

عکسِ گلگت بلتستان میرے۔بزرگ دوست شیر باز علی خان۔برچہ کی نئی تصنیف ہے۔آپ یہ نہ سمجھے کہ۔بزرگ اور جوان کی دوستی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے تو اصل راز کی بات ہے کہ۔برچہ صاحب مجھے اپنے دوست سمجھتے ہیں۔میں تو ان کو گلگت بلتستان کے معدوے سنجیدہ اور معتدل لوگوں میں سے ایک فرد خیال کرتا ہوں اور سنجیدگی میرے قریب سے بھی چُھو کر نہیں گزرتی تو بے ہودگی اور سنجیدگی کا کیا اتصال و اقتران ؟۔ اگر دنیا میں۔برے اور بے ہودہ لوگ نہ ہوتے تو صرف اچھے اور سنجیدہ لوگوں کی قدر و منزلت کون کیوں کر جانتا اور کرتا۔دنیا کے تمام اچھے لوگوں کو۔برے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔اگر۔برے لوگ نہ ہوتے تو اچھے لوگوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔خیر ! میرے سامنے۔برچہ صاحب کی خوبصورت کتاب عکسِ گلگت بلتستان کھلی ہوئی ہے۔اس کتاب کی پہلی زیارت نار تھ نیوز میں ہوئی جس دن یہ کتاب وہاں پہنچی تھی۔دو گھنٹوں تک کتاب کے مختلف مقامات دیکھتا رہا۔بالآخر۔برچہ صاحب کو نئی نویلی دلہن پر مبارکباد دینے کے لیے فون کیا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے ابھی تک کتاب نہیں دیکھی ہے اور نہ مجھے اطلاع ہے کہ کتاب

طباعت کے بعد گلگت پہنچی ہے۔ خیر بقول برچہ صاحب کے میں اولین مبارکباد دینے والوں میں ایک ہوں۔ انہوں نے بعد میں فون کرکے بتایا کہ کتاب کا نسخہ آپ کے لیے رکھا ہوا ہے، جب بھی موقع ملے وصول کیجیے گا۔ یوں کافی دیر سے میں نے یہ خوبصورت کتاب برچہ کے مزین دستخطوں کے ساتھ ان کے ید مبارک سے وصول کیا۔ کتاب کو بہت غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ گلگت بلتستان کے حوالے سے اتنی مفید اور تازہ ترین معلومات کسی کتاب میں یکجا نہیں۔ اگر گلگت بلتستان سروس کمیشن قائم ہوا تو برچہ صاحب کی کتاب مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے سب سے اہم اور لازمی قرار دی جائے گی۔ پوری کتاب کی ورق گردانی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ معلومات کی فراہمی میں محترم برچہ صاحب نے قطعاً خیانت سے کام نہیں لیا ہے۔ ورنہ تو ہمارے ہاں مذہب، مسلک، قومیت اور علاقائیت کی بنیاد پر تواریخ اور کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی مکروہ کوششیں تو معمول کی بات ہے۔ انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ فراہمی معلومات میں بھول چوک کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ اور بھول چوک کی پکڑ تو خدا بھی نہیں کرتے، لہٰذا اگر کسی صاحب کو ایسی کوئی کمی نظر آئے تو حرفِ تنقید کے بجائے اصلاح کی غرض سے بذریعہ تحریر برچہ صاحب کو مطلع کریں، مجھے امید ہے کہ وہ اگلی اشاعت میں اس کمی کو پورا کردیں گے۔ عکسِ گلگت بلتستان میں انتہائی اختصار کے ساتھ گلگت بلتستان کے حوالے سے تمام معلومات دی گئی ہیں۔ سیاحت، مشہور جھیلیں، گلیشئر، درے، صحت، پولیس،

معدنیات، فلک بوس پہاڑ، مقامی زبانیں، آثار قدیمہ، مواصلاتی نظام، جمہوری و سیاسی ادارے اور شخصیات و پارٹیاں، گلگت بلتستان اسمبلی کا ارتقائی سفر، مذہب، عسکریات و انتظامیہ، نظام عدل، ادبی انجمنیں و سرگرمیاں، اخبار، میگزین، صحافی، مشہور قلعے و مساجد، تعمیراتی ورثے، غرض ہر چیز کو مختصرا سمیٹا گیا ہے۔ دو چیزوں کی معلومات تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ایک مطبوعہ مواد کی جامع فہرست، جس میں گلگت بلتستان کی تمام روزنامہ و ہفتہ روزہ اخبارت کی فہرست، ایڈیٹر، رپوٹر اور تمام عملہ اور دیگر تمام لازمی معلومات دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ماہ نامے و سہ ماہی رسائل، ڈائجسٹ، اور کتابچوں کی بھی مختصر معلومات بمع عہدہ داروں کے بیان کی گئی ہیں۔ سرکاری صحافیوں اور عامل صحافیوں کے نام، عہدہ اور ادارے کے تعارف کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ انگریزی اخبارات کی فہرست اور عہدہ داروں کا ذکر بھی شامل کتاب ہے۔ برچہ صاحب نے بخل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے رپوٹروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ دوسری چیز کتاب کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ حصہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ 134 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صاحب کتاب نے گلگت بلتستان سے متعلق آٹھ سو کے قریب کتابوں کا مختصر تعارف انتہائی جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے جب اس حصہ کو پڑھنا شروع کیا تو ورطہء حیرت میں مبتلا ہوا کہ گلگت بلتستان کے حوالے سے اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ برچہ صاحب نے انگلش، اردو اور اردو تراجم پر مبنی تمام کتابوں کی تعداد و تفصیل دی

ہے۔اس حصہ کو بغور پڑھنے کے بعد یہاں بھی مجھے اندازہ ہوا کہ محترم برچہ صاحب نے کسی قسم کے تعصب کو اپنی کتاب کا حصہ نہیں بنایا ہے۔ اور ڈنڈی مارنے کے مکروہ عمل سے حتی الواسع کوشش کی ہے۔ ہر مکتبہ فکر وعلاقے اور زبان کے لوگوں نے جو بھی جس نام سے بھی لکھا ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔ آفاقی لوگوں کی یہی خصوصیت باقی تمام خصوصیات پر بھاری ہوتی ہے۔ وہ انسانیت کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ ''الخلق عیال اللہ'' کے مصداق تمام انسانوں سے بلا تفریق محبت کرتے ہیں اور بغیر تعصب و جانبداری کے معلومات فراہم کرتے ہیں۔ جن شخصیات نے دامے درمے قدمے سخنے کتاب کی تیاری میں ان کی مدد کی ہے ان کا بغیر تامل کے شکریہ ادا کیا ہے۔ اور جن کتابوں اور رسائل وجرائد اور اداروں سے معلومات و تصاویر لی ہیں ان کا بھی واضح حوالہ دیا ہے۔ البتہ تین چیزوں نے مجھے متحیر کر دیا ہے۔ ایک اس کتاب کا لمبا چوڑا انتساب ہے، میری دانست میں انتساب مختصر مگر پر اثر ہونا چاہیے۔ دوسری چیز گلگت بلتستان کی معروف سیاسی و مذہبی تنظیمیں، تنظیم اہل سنت والجماعت گلگت بلتستان و کوہستان اور انجمن امامیہ کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے بانیان اور مرکزی رہنماؤں کا۔ اور تیسری چیز جو ہے وہ کتاب کے صفحہ نمبر 196 سے 199 تک تعلیقہ الف کے ماتحت '' گلگت بلتستان کیوں اہم ہے؟ کے عنوان سے نمبروار چند اہم پوائنٹ گنوائے گئے ہیں، جہاں گلگت بلتستان کی عظمت واہمیت اور حساسیت وافادیت کے حوالے سے تفصیلات مندرج ہیں۔ ان نمبروار

معلومات سے اس علاقے کی ہر چیز عیاں ہو جاتی ہے۔ میں پڑھتا جاتا اور محظوظ ہوتا جاتا مگر شق نمبر ۳۵ سے ۳۸ تک پڑھ کر میں انتہائی مغموم ہوا۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔ شق نمبر ۳۵۔ دنیا کا یہ واحد خطہ ہے جس کی کوئی مسلمہ سیاسی حیثیت نہیں۔ شق نمبر ۳۶ ۔ دنیا کا یہ وہ خطہ جو آج تک دو ممالک پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ ہے۔ شق نمبر ۳۷۔ دنیا کا یہ انوکھا خطہ ہے جو قانونی طور پر پاکستان میں شامل ہے اور نہ اس سے باہر۔ شق نمبر ۳۸۔ دنیا کا یہ ایک ایسا بد قسمت خطہ ہے جو آبی وسائل سے مالا مال ہوتے ہوئے اپنے عوام کو وافر بجلی دینے سے قاصر ہے۔ اور جب پڑھتے پڑھتے آخری شق پر پہنچا تو میں کافی دیر تک اپنی انگلیاں منہ میں دابے رہ گیا۔ اور خیالات کی دنیا میں اتنا دور گیا کہ وہاں سے واپسی کافی دیر بعد ہوئی۔ جب دیکھا تو خود کو لکھتے پایا۔ برچہ صاحب نے دو سطروں کے اندر اتنی عظیم سچائی کا اعتراف کیا کہ بس کیا کہیں۔ آپ بھی پڑھیں اور سر دھنیے۔ شق نمبر ۵۴۔ یہاں کے لوگوں کی بد قسمتی ہے کہ بیرونی عناصر کے اشاروں پر ایک دوسرے پر کفر کے فتویٰ لگاتے اور قتل وجدال کرتے ہیں جس سے مقامی معیشت ختم ہوتی جا رہی ہے ورنہ ہماری سرزمین جنت سے کم نہیں۔ قارئین آپ خود انصاف فرمائیں۔ آپ کو سوچنے اور مبہوت کرنے کے لیے اپنے ایک پرانے کالم کا ایک پیراگراف درج کر رہا ہوں جو برچہ صاحب کے خیالات کی مکمل ترجمانی وتشریح کرتا ہے، ملاحظہ کیجیے۔ ''کاش ! آج کے بعد اہل سنت اور اہل تشیع بھی تعلیم کو اپنا پہلا اور آخری ہدف بنائے۔ اپنی ترجیحات میں

اولین ترجیح قرار دیں۔ تعلیم کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے اور اعلان کریں کہ آج کے بعد ہم لڑائی کے بجائے تعلیم و تربیت کو اپنا موٹو بناتے ہیں۔ ہم بھی اسماعیلیوں کی طرح تعلیم اور صرف تعلیم پر توجہ دیں گے۔ تو پھر گلگت بلتستان میں کتنی خوبصورت معاشرتی زندگی کا آغاز ہوگا، اگرایسا ہوا تو یقین جانیں لوگ پیرس اور واشنگٹن سے گلگت بلتستان میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔ کیوں کہ گلگت بلتستان کے ان کالے پہاڑوں، بہتی ندیوں، آبشاروں، دریاؤں، گھنے جنگلوں، خوبصورت جھیلوں اور رس بھرے پھلوں میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ پیرس اور دیگر مغربی ممالک ان کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور پھر یہاں علم و ادب کے ذریعے سونے کے وہ محل تعمیر کیے جائیں گے کہ دنیا ورطہء حیرت میں رہ جائے گی''۔

بہر صورت کتاب کا مکمل مطالعہ سے گلگت بلتستان کا واضح عکس نظر آتا ہے۔ آپ بھی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ آنے والے وقتوں میں کام آئے گی۔ شیر باز علی برچہ صاحب ایک معتبر قلمی نام ہے۔ ان کا لکھا ہوا مستند مانا جاتا ہے۔۔ برچہ صاحب کی کئی اور تصانیف اور علمی مقالے پہلے ہی زیور طبع سے آراستہ ہوکے دادِ عام پا چکے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ عکسِ گلگت بلتستان ان کا اچھوتا کارنامہ ہے۔ جو انہیں صدیوں تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ عکسِ گلگت بلتستان میں آپ کو وہ سب کچھ پڑھنے کو ملے گا جو آپ گلگت بلتستان کے بارے میں پڑھنا چاہتے ہو یا جاننا چاہتے ہو۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

کنٹریکٹ ملازمین اور بیوروکریسی میں نورا کشتی

اس حقیقت کو ہم جھٹلا نہیں سکتے کہ موجودہ دور فائلوں کا دور ہے۔ایک زمانہ تھا کہ کسی بھی حاکم کا منہ سے نکلا ہوا لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا اور بس فوری اس پر عمل کیا جاتا مگر آج طاقتور آمروں کو بھی اپنے احکامات منوانے اور نافذالعمل کروانے کے لیے لمبی لمبی فائلیں تیار کروانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان فائلوں کی تیاری اور بڑوں کی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے جو عملہ موجودہ دور میں تخلیق کیا گیا ہے اس کو انگریزی میں بیوروکریسی اور اردو میں آفسر شاہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ فائلوں کی تیاری اور ڈرافٹنگ میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو بھی جھٹلا نہیں سکتے کہ ہمارے تعلیمی ادارے صرف کاغذ کی ڈگریاں بانٹتے ہیں۔ مروجہ سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں سے بہت ہی کم تعداد میں لوگ خود آگہی حاصل کرتے ہیں اور مختلف سرکاری و غیر سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے مطلوبہ قابلیت اور ہنر، ان تعلیمی اداروں میں قطعاً نہیں سکھایا جاتا ہے۔ کسی بھی یونیورسٹی کا ٹاپر جب کسی محکمے میں بڑی پوسٹ پر بھرتی ہوتا ہے تو اس کو چھوٹے چھوٹے کاموں کی تیاری اور انجام دہی میں بھی اپنے ماتحت عملے بالخصوص کلرک اور سپریٹنڈنٹ سے رہنمائی لینے پڑتی ہے، کافی سالوں کے بعد وہ اعلیٰ آفیسر کام سیکھ جاتا ہے اور پھر اپنا

ادارہ بہتر طریقے سے چلانے کی مطلوبہ صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

مجھے گزشتہ کچھ عرصے سے ملک کی بڑی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے سات آٹھ سال سے گلگت بلتستان کے مختلف محکموں میں اعلیٰ آسامیوں پر کام کرنے والے احباب سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے اپنے متعلقہ ادارے کے کام کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی تو خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اس عرصے میں کافی تجربہ بھی حاصل کرچکے ہیں۔یہ تمام آفیسر گریڈ 16 سے 18 تک کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔اب بہترین آفیسر اور بیوروکریٹ بن چکے ہیں۔ اس عرصے ہیں مطلوبہ مہارت بھی حاصل کی ہے جو ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔تاہم یہ تمام آفیسر اس تمام عرصہ میں عارضی ملازمین کی حیثیت سے کام کرتے آئے ہیں۔ اب گلگت بلتستان کی انتظامیہ بالخصوص بیوروکریسی ان آفیسروں کو مستقل کرنے کے بجائے فارغ کرنا چاہتی ہے۔ میں نے ان سے تفصیلات جاننے کی کوشش کی تو انہوں نے تمام تفصیلات میرے سامنے رکھی۔ ان کے پاس مستقل ہونے کے حوالے سے مضبوط دلائل موجود ہیں۔آیئے، ان کی کہانی ان کی زبانی سنتے ہیں۔انہوں نے زبانی کلامی جو کچھ مجھے بتایا اور تحریراًاپنی کہانی مجھ تک جن الفاظ میں پہنچائی اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

ہم گلگت بلتستان کے گریڈ16، 17اور18کے آفیسران گلگت بلتستان کے مختلف''

محکموں میں گزشتہ کئی سالوں سے اپنی خدمات بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ان محکموں میں ہماری تقرری گورنمنٹ آف پاکستان کے مروجہ رول ریگولیشنز کے مطابق باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اشتہارات کی اشاعت، ٹیسٹ ،انٹرویوزاور ڈی ،ایس ،سیز کے ذریعے آرمی مانیٹرنگ ٹیم کی موجودگی میں عمل میں آئی ہے۔وزیراعظم پاکستان نے وفاقی کیبینٹ اوراسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے ذریعے سے 2011ء میں عارضی ملازمین کی مستقلی کے حوالے سے باضابطہ طور پر ایک کمیٹی تشکیل دی تھی اور اس کمیٹی کے ذمے تمام عارضی ملازمین کو مستقل کرنا تھا اور مذکورہ پالیسی کے تحت تمام صوبوں بشمول وفاقی اداروں نے عمل کرتے ہوئے باقاعدہ طور پر پورے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں عارضی ملازمین کو مستقل کیا ہے۔اس پالیسی کے تحت حال ہی میں (مورخہ 12-11-2013) کو Ministry of Education نے 2943 عارضی ملازمین کو مستقل کیا ہے۔اسی طرح وزیراعلیٰ پنجاب نے پنجاب حکومت کو واضح احکامات جاری کرتے ہوئے تمام محکموں میں کام کرنے والے عارضی ملازمین کو مستقل کرنے کے احکامات جاری کیے ہیں۔ جس پر پنجاب حکومت نے عمل کرتے ہوئے ہزاروں عارضی ملازمین کو مستقل کیا ہے۔اسی پالیسی کی بنیاد پر گلگت بلتستان میں بھی مختلف سرکاری اداروں میں کام کرنے والے چند عارضی ملازمین کو بھی مستقل کیا گیا۔اسی دوران وزیراعظم سیکرٹریٹ ،اسٹبلشمنٹ ڈویژن اور وزارت امور کشمیر نے گلگت بلتستان حکومت کو کئی خطوط ارسال کئے جن ہیں واضح طور پر گلگت بلتستان حکومت کو احکامات جاری

کیے گئے تھے کہ عارضی ملازمین کی مستقلی کے تمام کیسز مذکورہ کمیٹی کو بھجوایں دیں جس پر اس وقت کے سیکرٹری سروسز نے اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کو خط لکھا کہ ان تمام عارضی ملازمین کو جو ریگولر پوسٹوں میں کام کررہے ہیں گلگت بلتستان کی صوبائی حکومت مستقل کررہی ہے۔

اسی طرح گلگت بلتستان کابینہ نے بھی ایک کمیٹی اس وقت کے وزیر قانون کی سربراہی میں تشکیل دی جس کے ذمے گلگت بلتستان کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے عارضی ملازمین کو مستقل کرنا تھی۔ وزیر اعلی گلگت بلتستان نے اس کمیٹی کے سفارشات اور گلگت بلتستان اسمبلی کی قرارداد کی روشنی میں مورخہ 12-9-2012 کو واضح احکامات جاری کیے جن میں واضح طور پر لکھا تھا کہ سروسز ڈیپارٹمنٹ ان تمام ملازمین کی مستقلی کا کیس بنا کر فوری ارسال کریں۔ علاوہ ازیں سپیکر گلگت بلتستان اسمبلی نے قانون ساز اسمبلی کے 31 واں اجلاس جو کہ 23-10-2013 کو منعقد ہوا تھا، میں باقاعدہ اسی موضوع پر رولنگ بھی دی ہے۔ یاد رہے کہ سپیکر کی رولنگ پر عمل کرنا حکومت گلگت بلتستان پر لازم ہے تاہم سروسز یپارٹمنٹ نے بغیر کسی وجہ کے اس کیس کو کئی ماہ سے التوا میں رکھا ہوا ہے۔

گلگت بلتستان پبلک سروس کمیشن رول کی شق نمبر 5 کے تحت وزیر اعلی اور گورنر

کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ مفاد عامہ کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے سے ریگولر پوسٹوں پر کام کرنے والے باصلاحیت اور تجربے کے حامل افراد کو بغیر FPSC بھجوائے مستقل کر سکتے ہیں۔ اور اسی شق کے تحت وزیر اعلی گلگت بلتستان نے محکمہ سیاحت، محکمہ معدنیات اور محکمہ صحت کے چند عارضی ملازمین کو مستقل بھی کیا ہے۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مورخہ 25-10-2013 کو سپریم ایپلٹ کورٹ کے چیف جسٹس نے ازخود نوٹس بھی لیا ہے۔ اگرچہ یہ قضیہ سر دست گلگت بلتستان کی سب سے بڑی عدالت میں زیر سماعت ہے اس کے باوجود سروسز ڈیپارٹمنٹ نے عارضی ملازمین کے کیس کو FPSC بھجوا کر توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے۔"

گلگت بلتستان کے مختلف محکموں پر کام کرنے والے آفیسران نے اپنے خلاف ہونے والے سلوک کے حوالے سے گزشتہ دنوں گلگت بلتستان کی اسمبلی کے سامنے احتجاج کیا جس پر وزیر اعلی، کابینہ اور ممبران اسمبلی نے ان کا جائز حق دلانے کی یقین دھانی بھی کرائی اور ایک کمیٹی بھی اس حوالے سے تشکیل دی ہے۔ ان آفیسران نے سخت احتجاج کیا اور قلم چھوڑ ہڑتال کیا، بعد ازیں کمیٹی اور کابینہ کی یقین دھانی پر اپنے کام جاری رکھنے کا اعلان کیا اور کہا کہ وہ اپنا کام مستعدی سے کریں گے۔ اس کے فوراً بعد ایک ایسوسی ایشن بھی بنائی گئی جس کا نام گلگت بلتستان آفیسر ویلفیئر ایسوسی ایشن رکھا گیا، ان کے ساتھ

گلگت بلتستان کی مختلف کالجز کے لیکچرر بھی شامل ہو گئے جو گزشتہ تین سالوں سے مختلف کالجز میں بطور کنٹریکٹ لیکچرر کے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔
گلگت بلتستان آفیسر ایسوسی ایشن کی کابینہ اور تمام ممبران بشمول مجلس عاملہ نے انتہائی دکھ کے ساتھ کہا کہ! ''کیا یہ نہایت ستم ظریفی نہیں ہے کہ کئی سالوں سے انتہائی خوش اسلوبی سے خدمات انجام دینے والوں کو اچانک بے دخل کر کے ان کے ساتھ غیر انسانی رویہ اپنا جارہا ہے اور ان کا جائز روزگار چھین کر ان کے گھروں کا شعلہ بجھا رہے ہیں۔ گلگت بلتستان آفیسر ایسوسی ایشن کے تمام ممبران سمجھتے ہیں کہ ''ہم بھی اس ملک کے مخلص شہری ہیں اور مکمل وفادار بھی ہیں، ہم نے بھی پاکستان کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں سے نامساعد حالات کے باوجود اپنی محنت اور کاوشوں سے پروفیشنل ڈگریاں حاصل کی ہیں اور ہماری تقرریاں، شفارشوں اور بیک ڈور چینلوں سے نہیں ہوئی ہیں ہم نے تمام سروس رولز اور ضابطوں کو عبور کرتے ہوئے ملازمت حاصل کی ہے اسکے، باوجود ہمارے ساتھ تاحال ناروا سلوک روا رکھا جارہا ہے، ہم گلگت بلتستان کی تمام سیاسی ومذہبی اور سماجی تنظیموں اور کارکنوں سے انتہائی عاجزانہ اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے نہایت جائز مطالبات حکام بالا تک پہنچانے اور ہمیں انصاف دلوانے میں مرکزی کردار ادا کریں اور ہمارے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچایا

جائے اور جو پالیسی پورے ملک کے لیے اپنائی گئی ہے اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے ان ملازمین کو مستقل کیا جائے جو ریگولر پوسٹوں پر گزشتہ کئی سالوں سے کام کر رہے ہیں۔ہم جناب وفاقی وزیر امور کشمیر گلگت بلتستان ، گورنر گلگت بلتستان، وزیر اعلیٰ ، فورس کمانڈر، چیف سیکرٹری،کابینہ کے اراکین، ممبران اسمبلی اور دیگر اہم سیاسی شخصیات اور رہنماؤں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں انصاف دینے میں بھرپور کردار کا عملی مظاہرہ کریں گے''۔

یہاں بات ساری باتوں کے ساتھ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان تمام عارضی آفیسران کی عمریں ختم ہوئی ہیں۔اب وہ ایف پی ایس سی بھی جوائن نہیں کر سکتے ہیں۔ اور اگر حکومت نئے لوگوں کو کنڈکٹ کرتی ہے تو ان نئے ملازمین کو کام سیکھتے کافی عرصہ لگے گا جو یقیناً حکومت اور علاقے کے مفاد میں نہیں ہے۔اگلی بات یہ ہے کہ اگر پورے ملک میں عارضی ملازمین کو ریگولر کیا گیا ہے تو پھر یہاں کرنے میں کیا حرج ہے؟ ۔کیا عوامی اور جمہوری حکومتیں اپنے شہریوں کے ساتھ یہ سلوک کرتیں ہیں؟۔ میں نے ان تمام آفیسران میں مضبوط اتحاد و اتفاق دیکھا ہے، وہ اپنے جائزاور بنیادی حقوق کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہیں اور انتہائی خوشگوار بات یہ ہے کہ تمام مکاتب فکر اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اس آفیسر ایسوسی ایشن میں شامل ہیں۔یاد رہے کہ ملک بھر میں کنٹریکٹ ملازمین کو ریگولر کرنے کی سینکڑوں مثالیں موجود

ہیں ۔اطلاعات کے مطابق گلگت اسمبلی ان ملازمین کو ریگولر کرنے کے لیے باقاعدہ قانون سازی کر رہی ہے۔امید ہے کہ مثبت خبر مل جائے گی۔چیف سیکرٹری کو بھی اپنا رویہ نرم کرنا ہوگا۔ورنہ انتظامیہ، مقننہ، بیوروکریسی اور عارضی ملازمین کے درمیان نورا کشتی کا یہ کھیل بھیانک ہوگا، جس کا نقصان یقیناً عوام کو اٹھانا پڑے گا۔

حدیثِ دل'' کی بات ''

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اٹھائیس ہزار مربع میل پر پھیلا پورا گلگت بلتستان ادبی و علمی حوالے سے مکمل بانجھ ہے۔ اگر دو چار لوگ ادب بالخصوص خالص ادب لکھتے ہیں تو اس کا اطلاق پورے علاقے پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عربی اور انگریزی ادب تخلیق کرنے والے تو شاید دو چار بھی نہیں، البتہ اردو ادب لکھنے والے چند احباب ہیں بھی تو ان کی پذیرائی نہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ پورا معاشرہ بے ادب ہو چکا ہے۔ ہمارے دوست احمد سلیم سلیمی ایک اچھے استاد ہونے کے ساتھ ایک اچھے ادب دوست بھی ہیں۔ادبی کتابیں جمع کرنا ان کا خاص مشغلہ ہے۔گلگت بلتستان کے نثری ادب میں ان کا بھرپور حصہ ہے۔ ''حدیثِ دل'' کے نام سے ان کی تیسری کتاب منظر عام پر آئے کافی دن ہو چکے ہیں۔لاریب کہ اس کتاب کا لب ولہجہ یعنی اسلوب ادبی ہے۔ سلیمی صاحب ادبی ذوق رکھتے ہیں اس لیے وہ اخباری خبروں اور نیوز سٹوریز کو بھی ادبی رنگ و بو میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں لوکل اخبارات دیکھتے اور پڑھتے ہوئے سخت کڑھن محسوس ہوتی ہے حالانکہ اخبار میں خبر ادبی سے زیادہ صحافتی زبان بلکہ عوامی زبان کا تقاضہ کرتی ہے۔جس طرح سلیمی صاحب کو اخبارات دیکھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے کہ ان کا اسلوب ادبی نہیں، بالکل اسی طرح عام قاری تو چھوڑو کالج کے لیکچراروں اور پروفیسروں تک کو بھی سلیمی

صاحب کی کتاب ''حدیثِ دل'' پڑھ کر یہ تکلیف بلکہ شکایت ہے کہ ان کی کتاب مشکل الفاظ و تعبیرات اور ادبی اصطلاحات سے بھری پڑی ہے جو عام انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ میرے لیے مشکل یہ ہے کہ جس طرح سلیمی صاحب کو صحافت کے حوالے سے سمجھانا مشکل ہے اس طرح زندگی میں غلطی سے کسی کتاب کی ورق گردانی کرنے والے احباب کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ادبی زبان اور صحافتی زبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عوامی یا بازاری زبان تو بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ''خالص ادب'' بازاری یا صحافتی زبان میں تخلیق نہیں ہوسکت۔ ادب کے لیے ادبی اسلوب ضروری قرار پاتا ہے،اصطلاحات اور ٹرمینالوجیز کا استعمال ادب کا جز لاینفک ہے ورنہ پھر ادیب ایسی کتابوں کو ادبی حیثیت دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب

حدیثِ دل'' ایک خوبصورت ومزین کتاب ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔'' باب ''عشق نامہ'' سے لے کر باب'' سفر نامہ'' تک پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ شہر بے اماں میں بھی ادب لکھنے والے موجود ہیں۔ ہمارے ہاں تو الحمدللہ ایسے ایسے ادیب بھی موجود ہیں جو تاریخ کو بھی ادب میں لکھتے ہیں، نتیجتاً تاریخ اور ادب دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ہمارے ممدوح سلیمی کی تحریر میں تازگی کے ساتھ ساتھ زندگی بھی ہے اور زندگی بھی رواں رواں۔ خیالات میں ندرت ہے توجملوں میں شگفتگی اور الفاظ

یں روانی بھی ہے۔ان کا اسلوبِ بیاں اچھا ہے ادبی چاشنی کے ساتھ تحریر میں فطری بے ساختگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کا بسمل فکری ہمیشہ ان کو نئے خیالات سے روشناس کرواتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ گزشتہ کئی عرصے سے اس ظالم بسمل فکری نے مظلوم سلیمی کی فکری، نظری اور تخلیقی سوچ کو ایک مخصوص خول کے اندر بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ خول ہے '' خالص ادب''۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے۔ابھی ادب کے امتحاں اور بھی ہے-

موضوعات چننے میں سلیمی کو اچھی مہارت ہے۔ مثلاً اور کافری کیا ہے....؟ کے عنوان سے ایک شگفتہ تحریر قلم بند کی ہے۔اس تحریر میں نوجوانوں کو اکسانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کو کھول کر بیان کیا ہے۔ نام نہاد ملکی لیڈروں کو خوب کوسا ہے۔اس تحریر میں بھی وہی نامراد بسمل فکری چھایا ہوا ہے جو آخر میں تین فرشی سلام کر کے رفو چکر ہو جاتا ہے۔ذرا کتاب کو پڑھتے ہوئے '' ادب نامہ'' تک پہنچا تو ''شام اور بسمل فکری کا کہرام'' کے ٹائٹل سے ایک تحریر دیکھنے کو ملی۔ مظلوم سلیمی کا قنوطی بسمل فکری تو یہاں اچانک گیٹی داس سے وارد ہوتا ہے اور وہ کچھ اہل چلاس کو سنا ڈالتا ہے جو کبھی ان کو کسی نے کہنے کی ہمت نہیں کی۔ اگر واقعی میں اہل چلاس والوں کو بسمل فکری کی ان حرکتوں کا علم ہوا تو سانحہ لالوسر کی طرح بسمل فکری کے ساتھ '' سانحہ گیٹی داس'' پیش آسکتا ہے۔ان دونوں مقامات میں

-قرب مکانی بھی ہے

حدیث دل میں مختلف عنوانات سے بہترین تحریریں شامل ہیں۔ سلیمی صاحب کے بقول وہ سدا بہار ادبی تحریریں لکھتے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے اس دعوی۔ کا سچ ثابت ہونا قوی لگتا ہے۔ اس کا ایک ذاتی تجربہ یہ بھی ہے کہ سلیمی صاحب اپنا ایک مضمون مختلف اخبارات وجرائد میں بار بار شائع کرواتے ہیں۔ ہر بار پڑھنے سے الگ لطف و سرور ملتا ہے۔ ہم چونکہ یہ دعوی۔ نہیں کر سکتے کہ ہم سدا بہار تحریریں لکھتے ہیں لہذا ہماری تحریریں بھی سدا بہار کے بجائے صرف بہار ہی ہوتیں ہیں۔ اور سدا بہار ہوتو شاید مزا بھی نہ آئے۔ کیونکہ ہمیشہ بہار ہو تو بھی یکسانیت اور ایک جیسی کیفیت انسان کو اکتا دیتی ہے۔ بہار کے ساتھ خزاں ضروری ہے جیسے پھول کے ساتھ کانٹے۔ محبت کے ساتھ نفرت، اچھائی کے ساتھ برائی، حق کے ساتھ باطل، وگرنہ صرف خوبی والوں کا -قدردان کون ہوسکتا ہے جب تک خامیوں والے انسان نہ پائے جائے

سلیمی صاحب جتنے خوش شکل، خوش ادا اور خوش خوراک آدمی ہیں اس سے زیادہ بامروت انسان بھی ہیں۔ وہ آسانی سے کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ ادب و مروت ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ بعض دفعہ مروت میں انسان مارا جاتا ہے۔اس مروت میں وہ بعض دفعہ ادبی بونوں کو ادبی مینارے بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بے

مائیوں کو دیو قامت علمی مجسمہ کی شکل دیتے ہیں۔ تحریر کے مابین السطور سے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ رطب اللسانیاں محض کسی کی خاطر میں کی جارہی ہیں۔ ورنہ ایسے ادبی میناروں اور علمی مجسموں کی مارکیٹ ویلیو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حدیث دل میں دیوانے کی بڑ کے عنوان سے ایک خوبصورت تحریر موجود ہے۔اس تحریر سی اپنی معاشرتی حالت کا جائزہ لینا کوئی مشکل نہیں کہ معاشرہ کس حد تک بگڑا ہوا ہے اور حکمران کن خرمستیوں میں مبتلا ہیں، اس تحریر میں بھی وہی بسمل فکری مکمل تلخی لیے موجود ہے۔

سلیمی دیکھنے میں معصوم ضرور لگتے ہیں مگر لکھنے میں تو پورے بسمل فکری کے ہمزاد لگتے ہیں۔اور وہ خود کو بسمل فکری کا ہمزاد ہونے پر فخر بھی کرتے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ بسمل فکری ان میں سرایت کرگیا ہے۔ البتہ بولنے میں بھلے لگے یا نہ لگے مگر ناکام تصنع اور معاشرتی وسماجی مجبوریوں کا شکار ضرور ہوتے ہیں اور اپنی سفید پوشی کے ساتھ معتدل کلامی کا بھرپور بھرم قائم رکھتے ہیں بلکہ رکھنے کی سعی ناتمام کرتے ہیں۔ جس کا تجربہ روز ہوتا ہے۔ سلیمی لکھنے میں کیسے لگتے ہیں اس کا فیصلہ تو ان کی پہلی کتاب دشت آرزو پڑھ کر ہم نے لگایا تھا کہ ان کی ذاتی زندگی جتنی سماجی ناہمواریوں (یعنی ناکامی عشق ونامرادی) سے بھری پڑی ہے اتنی ہی ان کی کتاب بھی دل ہلادینے کے لیے کافی ہے۔ان کی کتاب شکست آرزو بھی سماجی بالخصوص ازدواجی ناہمواریوں

کے مسائل سلجھاتے سلجھاتے مکمل ہوتی ہے۔ ان کی نئی کتاب ''حدیثِ دل'' کے مطالعے سے بھی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کی نثر میں معاشی، سماجی، سیاسی اور مذہبی بکھیڑوں کا رونا رونا ہے۔ ہم اس مختصر تحریر میں ان تمام خوبیوں کو بیان تو نہیں کر سکتے جو ان کی کتابوں اور نثر میں موجود ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ایک دفعہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ گارنٹی دینے کے لیے میں تیار ہوں کہ اگر یہ کتاب آپ کو کچھ دے نہ سکے تو آپ کا کچھ بگاڑے گی بھی نہیں۔

اسلام دین امن ہے

(یہ مقالہ ریڈیو پاکستان گلگت میں '' اسلام دین امن ہے '' کے عنوان سے منعقدہ سیمنار میں پڑھ کر سنایا گیا۔ جو ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے قومی نشریاتی رابطہ کے ذریعے نشر کیا گیا)

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اسلام دین امن ہے۔اسلام کا اولین سنہری دور کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام نے معاشرتی امن اور سماجی انصاف کے لیے جتنی فکری اور عملی کوششیں کی ہیں اس نظیر کہیں نہیں ملتی ہے۔اسلام کبھی بھی فکری طور پر مفلوج اور مبہم نہیں رہا ہے۔ اسلام کا پیغام کسی مخصوص علاقہ ، نسل یا زبان اور مسلک و مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ تمام انسانیت کے لیے عام پیغام ہے اور اہل کتاب کے لیے تو خصوصیت کے ساتھ قرآن و حدیث میں احکامات صادر ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ '' قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمتہ سواء بیننا و بینکم ، الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا '' اس ایت کی روشنی میں ہمیں یہ پیغام واضح طور پر ملتا ہے کہ قرآن نے اہل کتاب کو توحید کی دعوت دی ہے اور شرک سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے۔ یہ دونوں موضوعات اہل کتاب اور اسلام کے مابین مشترک ہیں ، تاہم

بعد میں ان کے مذہبی پیشواؤں نے اس آفاقی پیغام میں تحریف کی ہے۔ قرآن نے اس مشترک پہلو کی طرف بے حد خوبصورت پیرائے میں دعوت دی ہے۔ اور اسلام نے اسلامی مملکت و ریاست کے اندر بھی اہل کتاب اور دیگر غیر مسلم کی حفاظت کا صرف حکم نہیں دیا بلکہ حفاظت کی ذمہ داری بھی اٹھائی ہے۔ میثاق مدینہ، بہترین حکمرانی اور سماجی انصاف کے لیے یادگاہ معاہدہ ہے، مدینہ منورہ میں پہنچ کر آنحضرت نے سماجی انصاف اور معاشرے میں قیام امن کے لیے جملہ اقوام سے ایک عمرانی معاہدہ بین الاقوامی اصول پر کیا تاکہ معاشرتی اور مذہبی اختلافات اور تنازعات میں قومی وحدت قائم رہے۔ اور سماجی انصاف کا قیام ہو سکے۔ اس معاہدہ میں مختلف مسالک، مذاہب زبان و نسل اور علاقہ کے لوگوں کے درمیان قیام امن اور آشتی کے ساتھ رہنے کے لیے بہترین رہنمائی ملتی ہے۔ اس معاہدے کے جستہ جستہ فقرے یہ ہیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری، اپنی مشہور کتاب ''رحمۃ اللعالمین'' میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔۔۔ انہم امۃ واحدۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب لوگ ایک ہی قوم سمجھے جائیں گے۔

۲۔۔۔ وان بینہم النصح و النصیحۃ والبر دون الاثم۔۔۔۔۔۔۔ معاہدہ اقوام کے باہمی تعلقات، باہمی خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کے لیے ہونگے ضرر اور گناہ کے نہ ہونگے۔

۳۔۔۔ وأن النصر للمظلوم۔۔۔۔۔۔ مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی۔

۴۔ وان یثرب حرام جرفہا لاہل ہذہ النصیحۃ۔۔ مدینے کے اندر کشت و خون کرنا اس

(معاہدے کرنے والے سب قوموں پر حرام ہے۔ (ص ۹۲،۹۱،ج نمبر اول
کی اصطلاح چلی ہے۔ گڈ(Good governance) موجودہ دور میں گڈ گورننس
گورننس اور اچھی طرز حکمرانی کی بے شمار مثالیں اسلامی تاریخ کے صفحات سے بھری
:پڑی ہیں۔ ہم ایک مثال عرض کیے دیتے ہیں۔علامہ کوثر نیازی صاحب لکھتے ہیں
امیرالمؤمنین حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ گشت کررہے تھے کہ انہوں نے ایک غیر''
مسلم کو دیکھاجو بھیک مانگ رہا تھا۔آپ نے اس سے پوچھا، تم بھیک کیوں مانگ رہے
ہو؟اس نے جواب دیا کہ اب میں کمانے کی سکت نہیں رکھتا، امیرالمؤمنین نے یہ سن
کرفرمانے لگے کہ'' افسوس ہے عمرپر جس سے اس کی جوانی کے زمانے ییں‌جزیہ تو لیا
لیکن بوڑھا ہوگیا تو اس سے اپنے حال پر چھوڑ دیا'' حکم دیا کہ اس کا وظیفہ بیت المال سے
مقرر کیا جائے (کتاب: اسلام ہمارا رہنما ہے، ص، ۹۳)۔
اس واقعہ سے ہم آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مسلمان حکومت غیر
مسلموں کے ساتھ جس رواداری اور سماجی انصاف دینے کے فراخدالانہ مظاہرہ کررہی
ہے دنیا کا کوئی دوسرا نظام حکومت اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔
مسلم ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق بھی بہت ہی واضح طور پر موجود ہیں۔

سماجی انصاف مہیا کرنے میں مسلم ریاست اور مسلمان حکومت و حکمرانوں کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں، اگر ایک مسلمان کسی ذمی (غیر مسلم) کو قتل کرڈالے تو فقہ حنفی کے رو سے اس مسلمان کو قصاص میں قتل کردیا جائے گا۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا کہ قاتل مسلم ہے اور مقتول غیر مسلم ہے کہہ کر کوئی ناانصافی کی جائے یا امتیاز روا رکھا جائے۔ آنحضرت نے فرمایا'' من قتل معاھداًلم یرح رائحۃ الجنتہ '' (. محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب اثم بن قتل معاہداًبغیر جرم: جلد اول، ص ۴۴۸،۱) یعنی: '' ذمی کو قتل کرنے والا مسلم کبھی جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا''۔ جان بہت عزیز چیز ہے۔اسلام نے تو غیر مسلموں کی شراب، صلیب اور سور (خنزیر) کے گوشت تک کو نقصان نہ پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری اور بدائع الصنائع فی الترتیب الشرائع میں مذکور ہے کہ ''ولو اتلف مسلم اَوذمی علی ذمی خمراًاور خنزیراًیضمن '' اگر کوئی مسلمان کسی ذمی (غیر مسلم) کی شراب ضائع کریں یا کسی عیسائی کی صلیب توڑ دیں تو بطور جرمانہ اس سے شراب اور صلیب کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ (جلد ۷، ص ۱۶۷)۔

معاہدہ بیت المقدس:ذمی رعایا کے حقوق کی ایک مقدس دستاویز ہے۔ حضرت عمر نے بیت المقدس کے فتح کرنے کے بعد وہاں کے شہریوں سے ایک معاہدہ کیا۔ ذمیوں کو جو سماجی حقوق حضرت عمر نے عطا کیے وہ اس زمانے کی غیر مسلم سلطنتیں غیر

قوموں کے لیے سوچنا بھی ناگوار کرتیں تھی۔بیت المقدس کا معاہدہ خود حضرت عمر کے الفاظ میں ترتیب دیا گیا،اس کے چند جملے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق (سوانح عمری حضرت عمرفاروق) میں لکھا ہے

ہذا ما اعطی عبداللہ عمر امیر المؤمنین اھل ایلیا من الامان اعطاھم امانا لأنفسھم''

واموالھم وکنایسھم وصلبانھم وسقیمھا وبریھا و سایر ملتھا انہ لایسکن کنایسھم ولاتھدم ولا ینتقص منھا ولا من خیرھا ولا من صلبھم

ولا من شئی من اموالھم ولایکرھون علی دینھم ولا یضار احدھم''یعنی:''یہ وہ امان ہے جو اللہ کے غلام امیر المؤمنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی' یہ امان ان کی جان ومال' گرجا' صلیب' تندرست' بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے اس طرح کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی' نہ ڈھائے جائیں گے' نہ ان کو یا نہ ان کے احاطے کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا۔نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو (نقصان پہنچایا جائے گا''۔(ص ۲۵۸

غیر مسلم رعایا کے شرائط کو پورا کرنے کا حکم بھی اسلامی احکام میں واضح طور پر ملتا ہے۔شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق میں لکھا ہے کہ'' حضرت عمر نے شام کی فتح کے بعد حضرت ابو عبیدہ کو غیر مسلم رعایا کے حوالے سے

جو خصوصی حکم جاری کیا اس میں یہ یادگار اور بے مثال الفاظ مرقوم تھے ''وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار بھم واکل اموالھم الا بحلھا' ووف لھم بشرطھم الذی شرطت لھم فی جمیع ما اعطیتھم ''یعنی ''مسلمانوں کو منع کرنا کہ ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں' نہ ان کو نقصان پہنچائے' نہ انکے مال بے وجہ کھانے پائیں اور جس قدر شرطیں تم نے ان سے کی ہیں سب وفا کرو''۔(ص ۲۶۱)

اسلام سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی انسان نہ سفاک ہو سکتا ہے نہ دہشت گرد اور نہ ہی درندہ صفت، اور نہ ہی بے گناہ انسانوں کے قتل عام سے اسے کوئی ذہنی و قلبی راحت مل سکتی ہے۔ اسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ امن و معاشرتی رواداری کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے اسی طرح اسلام آپس میں بھی اتفاق او اتحاد اور امن وآشتی کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

سورۃ النساء آیت نمبر ۹۳ میں خدائے ذوالجلال کا واضح ارشاد ہے:]ومن یقتل مؤمنا متعمداً فجزاہ جھنم خالداً فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ اعدلہ عذابا عظیما[جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو عمداً یعنی قصدا جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے' اللہ رب العزت کا غضب ہے' اس کی لعنت اور پھٹکار ہے' اور ایسے لوگوں کے لئے بڑا دردناک والمناک عذاب تیار ہو چکا ہے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ایک حدیث نقل کی ہیں جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے:] لایشیر احدکم علی اخیہ بالسلاح فانہ لایدری لعل الشیطان ینزع مافی یدہ' وفی روایۃ ینزع بالعین فیقع فی حفرۃ من النار [یعنی فرمایا کہ کبھی بھی اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو' ممکن ہے کہ ہتھیار میں جو کچھ ہے وہ لگ جائے تو تم جہنم کے گڑھے میں گرپڑو یعنی آپ کے اشارہ کرنے سے تلوار چل گئی اور مسلمان کا خون ناحق ہوگیا تو ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائیگا جس کے پاداش عذاب جہنم ہے۔

قارئین کرام ! آپ نے آیت کریمہ اور حدیث مبارکہ ملاحظہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قتل مسلم کو کتنا بڑا جرم قرار دیا ہے اور اس آدمی کا انجام جہنم بتایا ہے اور اس پر لعنت و پھٹکار کی ہے اور آپ نے بھی واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ مسلم کا خون کتنا قیمتی ہے۔ حدیث مذکورہ سے تو واضح ہو جاتا ہے کہ از روئے مزاق اور دل لگی کے لئے بھی کسی مسلمان بھائی کی طرف اسلحہ اٹھانا یا اس کو ڈرانے کے لئے کسی بھی قسم کا ہتھیار کا رخ اس کی جانب کرنا یا اشارہ کرنا شرعا جائز نہیں ہے۔ ذرا ہمیں اپنی حالت زار کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم نے خون مسلم کو کتنا ارزاں سمجھا ہوا ہے۔

ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمر نے مرفوعا مروی ہے:] زوال الدنیا کلھا اھون علی اللہ عن قتل رجل مسلم'[اسی روایت کی تخریج امام نسائی نے ان الفاظ میں کی ہے] قتل المؤمن اعظم عنداللہ من زوال الدنیا[یعنی آقائے نامدار نبی رحمت سرور کائنات نے فرمایا ہے کہ '' اللہ کے نظروں میں تمام دنیا کے زائل یعنی نیست و نابود ہوجانے نے بھی بڑھ کر جو چیز ہے وہ ایک مؤمن مسلمان کا قتل ہے۔ قارئین دل کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں قتل مسلم مزاق بن چکا ہے، خدا تعالیٰ کے ارشادات اور نبی کریم کے فرمودات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اور کفر نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے خون ناحق سے اپنے ہاتھ رنگین کرے۔ روشنیوں کا شہر کراچی غریبوں کے خون سے سرخ ہوگیا ہے۔ کراچی ایک شہر ہے جہاں پورے ملک کے باسی رہتے ہیں۔ پورے ملک کے ہر علاقے کے نام سے کراچی میں کالونیاں بنی ہوئی ہیں مثلاً گلگت کالونی، کشمیر کالونی' پنجاب کالونی' مانسہرہ کالونی' بلوچ کالونی' غرض ہر صوبے کے مختلف علاقوں کے ناموں والی کالونیاں کراچی میں ہیں اور وہاں اس علاقے کے لوگ فروکش ہیں مگر لسانیت، علاقائیت پر روزانہ کی بنیاد پر سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے۔ نہ قاتل کو معلوم نہ مقتول کو۔ بلوچستان تو مشرفی آمریت کے دور سے مسلسل جل رہا ہے اور جلانے کے لئے ایندھن مہیا کرنے والے کوئی بھی ہوں مگر ماچس کی تلی سے آگ بھڑکانے والے اپنے مسلمان بھائی ہیں۔ گلگت

بلتستان بھی کبھی امن کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ سالوں میں کوئی قتل ہوتا تھا، اگر کوئی ذاتی دشمنی میں قتل ہوتا تو قاتل کبھی بھی اپنے آپ کو چھپاتا نہیں تھا بلکہ وہ فخریہ اعلان کرتا کہ جی ہاں! میں نے قتل کر دیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ اذیت اور خوف وہراس سے بچ جاتے تھے۔ مگر چند سالوں سے یہ پرامن علاقہ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے بھر چکا ہے، خون آشامی کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ خونیں وارداتیں روز کا معمول بن چکیں ہیں۔ گلگت میں بھی قتل و خون کی ہولی کھیلنے کے لئے پلان جو بھی تیار کرتا ہو اور اس کے لئے فنڈنگ کوئی بھی کرتا ہو مگر ایک دوسروں کے گلے کاٹنے کی '' خدمت عالیہ '' مقامی لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔ پتنگ کی ڈوری جہاں کہیں سے بھی ہلائی جائے مگر پتنگ گلگت سے ہی اُڑے گا اور گلگت کا ہی پتنگ کٹے گا' اور کٹ کر کرچی کرچی ہو کر ہواؤں کے دوش بکھر جائے گا۔

سیرت نبوی اور احادیث نبوی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قتل مسلم سے بڑھ کر کون سا فعل ہے جو خدا کے عرش جلال وغیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں بارش کی طرح آسمانوں سے نہ برسے' جس مؤمن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو اور لائق و فائق ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ بتلائے' اسی کا خون خود ایک مسلمان کے ہاتھوں سے ہو' اس سے بڑھ کر شریعت الہی کی کیا توہین ہو سکتی ہے؟ جس بدبخت انسان کا احساس ایمانی یہاں تک مسخ

ہو جائے کہ باوجود دعوائے مسلم ومؤمن کے مسلمانوں کا خون سے اپنے ہاتھ رنگین
کرے بلکہ اس کو کار خیر بھی سمجھے' تو یاد رہے کہ وہ یقینا مسلمانوں کا خون نہیں بہاتا بلکہ
وہ توپروردگار عالم کے کلمہ توحید کو ذلیل و خوار کرتا ہے اور شانِ کبریائی کو بٹہ لگانا چاہتا
ہے۔ سو' ایسوں کو] ان عذابِ اشدید [کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ وماعلینا الا البلاغ۔

عطاء اللہ شہاب کی ادبی کاوش

مولانا عطاء اللہ شہاب گلگت بلتستان میں ادب و سیاست کا ایک معروف نام ہے۔ ساتھ ساتھ انہیں ایک مذہبی رہنماء ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ مولانا کے ساتھ میری رفاقت کافی پرانی ہے۔ میں چونکہ ایک طالب علم ہوں مگر مولانا ہمیشہ مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔ مولانا کے ساتھ کافی عرصہ علمی و ادبی کام کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ انہوں نے گلگت بلتستان سے '' ماہنامہ شہاب'' کے نام سے ایک مجلّہ نکالنا شروع کیا تھا، اس کی ایڈیٹری کے لیے مولانا کی انتخاب نظر مجھ پر پڑی، الحمد للہ بے بضاعتی اور بے سروسامانی کے باوجود، حتی المقدور اس ذمہ داری سے عہدہ برآہ ہونے کی کوشش کی۔ مولانا کے ساتھ دیگر امور میں بھی ہمیشہ سے مشاورت ہوتی رہتی ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ میں مولانا کے ہر کام و فکر میں ہمنوا ہوں اور اندھا مقلد ہوں۔ میں نے احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے مولانا کے ساتھ ہمیشہ نظری و سیاسی اختلاف کی ہے اور انہیں صفحات میں اپنا مدعا واضح لکھا بھی ہے اور مولانا کی محفل میں بھی اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ مگر الحمد للہ ہمارے تعلقات اور احترام میں کمی نہیں آئی۔ میں ان کی بے احترامی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔اور مختلف فورم میں ان کا وکیل بھی بن جاتا ہوں۔اور شہاب صاحب بھی

دھیمے انداز میں اپنی بات مجھ تک کسی نہ کسی پیرائے میں پہنچاتے ہیں۔ مجھے یہی امید ہے کہ میری اس نالائقی اور واضح اختلاف پر وہ مجھ سے خوش نہیں تو، ناراض بھی قطعاً نہیں ہیں۔

آج کی محفل میں مولانا کی ایک ادبی کاوش کا ذکر کرنا ہے۔ مولانا صحافتی اور ادبی حلقوں میں اچھی طریقے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ تاہم ان کی سیاسی سرگرمیوں نے انہیں اس میدان سے دور نہیں رکھا ہے، تو قریب آنے سے بھی روکا ہے۔ پروفیسر غلام حسین سلیم مجھے بتارہے تھے کہ مولانا دن کو سیاسی اکٹیویٹیز میں مشغول ہوتے ہیں اور رات کو انہیں قلم بند کرتے ہیں اور ہم سے یہ نہیں ہوتا، یہی بات مولانا کی اولین کتابی کاوش '' منزل کی تلاش '' کے منظر عام پر آنے کے بعد عنایت اللہ شمالی نے کہی تھی مجھ سے۔ دیگر سیاستدانوں اور شہاب صاحب میں یہ امتیازی فرق ہے۔ اس وقت شہاب صاحب کی تیسری ادبی کاوش '' شیخ الہند کے دیس میں سات دن '' میرے سامنے ہیں۔ شہاب صاحب نے 2011ء میں مولانا فضل الرحمان کی معیت میں ایک پارلیمانی وفد کے ساتھ ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ یہ کتاب اس پارلیمانی وفد کے دورہ ہندوستان کی روئیداد ہے۔ اس وفد میں جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے چوٹی کے رہنماء شامل تھے۔ غالباً مولانا سب سے کم عمر اور پھر چھوٹے سیاستدان بھی تھے۔ اس لیے ان سات دنوں میں بڑے لوگوں کے ساتھ انہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ گلگت

بلتستان ہاؤس اسلام آباد سے میں نے خود مولانا کو سفرِ ہندوستان کے لیے رخصت کیا تھا۔ شہاب صاحب کو لینے شیرانی صاحب (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل)، عطاء الرحمان صاحب (وفاقی وزیر) اور گل نصیب صاحب (ممبر قومی اسمبلی) جی بی ہاؤس پہنچے تھے۔ واہگہ بارڈر پہنچ کر، پھر دارالعلوم دیوبند پہنچ کر بھی اس ناچیز کو احوال سفر سے مطلع کیا تھا۔ واپسی پر دیکھا تو مولانا نے دو ڈائروں میں ہندوستان کے سفر کی روئیداد کے ٹپس اور ضروری نوٹس لکھے تھے، اور اہم مقامات کی تصاویر بھی اپنے کیمرے میں محفوظ کی تھی۔ جب مجھے دکھایا تو ازحد خوشی ہوئی۔ ہندوستان کے کچھ سفر نامے بھی ساتھ لائے تھے اور کافی سارے پرانے سفر نامے برادرم شبیر میواتی نے بھی مہیا کیے تھے۔ جی بی ہاوس میں سکونت کے دنوں میں، میں اکثر ماہنامہ شہاب کے امور کی غرض سے شہاب صاحب کے پاس جاتا، ساتھ ہی ان سے سفرنامہ لکھنے کا اصرار بھی کرتا، یوں مولانا نے سفرنامہ لکھنا شروع کیا اور میں نے اپنی نگرانی میں کمپوز کراکر پروف ریڈنگ کرنا شروع کیا۔ چند ہفتوں میں کتاب کمپوز اور پروف ریڈنگ کے مراحل سے گزر کر تیار ہوئی۔ اس جہدِ مسلسل اور عرق ریزی کا اعتراف مولانا نے کتاب کے دیباچے میں بھی خوبصورت پیرائے میں کیا ہے اور خصوصی شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ دوستوں کی خدمات کا اعتراف کرنا اور تحریری شکل میں ہمیشہ کے لیے ثبت کرنے میں مولانا قطعاً کنجوسی سے کام نہیں لیتے جیسے کتاب تحفتہً دینے اور کھانا کھلانے میں کرتے ہیں۔ میں نے کتاب کو دوران پروف ریڈنگ پڑھی تھی۔

اور اب کی بار دوبارہ بھی پڑھی، ہاں تصاویر کے انتخاب میں برادرم فہیم کے ساتھ میری چوائس کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ مولانا کی کتاب کا ایک حصہ نثر ہے اور دوسرا حصہ تصاویر پر مشتمل ہے۔ شہاب صاحب ایک مضبوط نثر نگار ہیں۔ ایک دور میں شاعری کی بھی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نثر میں ہی ملی۔ ابتدائِ سفر سے لے کر اختتام سفر تک کی تمام معلومات رومانی انداز میں اکٹھی کر رکھی ہے۔ کہیں چائے نوشی کا ذکر ملے گا تو کہیں اخبارات کے بیڈ ٹی کا۔ کہیں علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی گفتگو ہوتی نظر آئے گی۔ تو کہیں ہندوستان کے مقدس مقامات بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے عقیدت و محبت جگہ جگہ مختلف پیرائیوں میں دیکھنے کو ملے گی۔ مسجد خیرالدین، امیر شریعت، سکھ فلسفی اور پھر معروف جلیانوالہ باغ کا خونیں منظر کی منظر کشی مولانا نے نرالے بلکہ جذباتی انداز میں کی ہے۔ دوران سفر لطیفے، علمی پھلجڑیاں اور پھر اکابر علماء کا دلکش مناظر دیکھ گنگانا بھی قاری کو محظوظ کیے بغیر نہیں رہنے دیتا۔ میر کارواں کی معیت میں جب دیوبند پہنچتے ہیں تو منظر دیدنی کے ساتھ عقیدت کا جام سے لبریز نظر آتا ہے۔ پھر مولانا آگے چل کر گلگت بلتستان کی دارالعلوم دیوبند کے ساتھ والہانہ عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے دیوبند سے فیضاب ہونے والے گلگتی اکابر کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ شہاب صاحب اور اس کے رفقاء کبھی تو اکابر دیوبند کی قبروں میں زیارت کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی ہندوستان کے بازاروں میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ دلی کا لال قلعہ، جمیعت علماء ہند

کا مرکزی سکرٹریٹ اور پھر جامع مسجد دلی میں ان کی بیٹھکیں ہوتیں ہیں۔ ان کی تاریخ اور رومانویت میں کھو جاتے ہیں۔ جب دلی کا سیر کرنے نکلتے ہیں تو پھر قطب مینار، عظیم بزرگ خواجہ بختیار کاکی کا مزار، مسلمانوں کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا محفل اور مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مفتی سعید دہلوی کی قبور پر حاضر ہو کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ اور ہونا بھی چاہیے، کون اپنے شاندار ماضی پر فخر نہیں کرتا اور پھر اس کے مفقود ہونے پر حزن و ملال کا پیکر نہیں بنتا۔ دنیاے اسلام کے عظیم مفکر، اردو ادب کے واحد ادیب جس کی مثال مشکل ہے کی قبر کی زیارت سے محرومی کا اثر شہاب صاحب کی قلب تک پہنچ جاتی ہے اور حرکات قلب بند ہوتے ہوتے اللہ کا کرم ہو جاتا ہے۔ یہ ابوالکلام کا حق ہے کیونکہ ساری زندگی شہاب صاحب ان سے سیاسی سوچ اور ادبی غذا لیتے رہے ہیں۔ مولانا فضل الرحمان صاحب کی وزیر اعظم من موہن سنگھ کے ساتھ ملاقات، خانوادائے شاہ ولی اللہ کے مزارات کی زیارت اور پھر تاریخی مدرسہ رحیمہ کی زیارت احباب سفر کے سفر کو دوبالا کر دیتی ہے۔ ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ نشست بھی سفر کی رونق بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ گولڈن ٹمپل امرتسر، چندی گڑھ، مولانا مودود مدنی، مولانا ارشد مدنی، قاسمی قبرستان، مملوک علی، حضرت قاسم نانوتوی، حضرت مدنی، قاری طیب، شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر اور یگر اکابر پر بھی معلومات کتاب کا زینت بنی ہے۔ کہیں پر مولانا فضل الرحمان ایوان صدر کا وزٹ کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں اقلیتوں کے

وزیر سے وفد کی ملاقات ہوتی اور کہیں پاکستان کے سفیر شاہد ملک وفد اور مولانا فضل الرحمان کو ہندوستان کے بارے میں بریفنگ دیتے نظر آتے ہیں۔کتاب کو بے جا طوالت سے بچایا گیا ہے۔ اسلام آباد کے معروف پبلیشر Nararatives نے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ شائع کیا ہے۔روزنامہ بادشمال نے قسط وار شائع کیا ہے۔ماہنامہ الجمیعۃ میں بھی شائع ہوئی ہے۔ظاہری تمام خوبیوں سے مزین یہ کتاب گلگت بلتستان کے کتب خانوں میں ناپید ہے۔ ادبی حلقوں میں کتاب نے جگہ بنا لی ہے۔ میرے دوستوں نے ملک کے مختلف حصوں سے کتاب پڑھنے کے بعد فون کیا کہ اس میں آپ کا ذکر بھی ہے۔کتاب کے دوسرے حصے میں تصاویر کا چناؤ اور تزئین اور کیپشنز اعلی معیار کے ہیں۔ میرے دوست مفتی نذیر احمد خان نے ''سنگ ریزے'' کے عنوان سے ابتدائیہ لکھا ہے۔ان کی تحریر مکمل ادبی ہوتی ہے۔ انہوں نے احترام استاد میں کچھ قلابازیاں بھی کھائی ہے۔ مگر اپنے منصب کا خیال رکھتے ہوئے کتاب کا دوسرا حصہ '' ذی روح تصاویر کی بھر مار'' سے اختلاف نہیں کی مگر اتفاق بھی نہ کر سکے ۔اور شاید اتفاق نہ کرنا بہترین اختلاف ہی ہے۔ مگر مجھے تو ان تصاویر پر اختلاف نہیں کیونکہ میں '' مفتی ہی نہیں تو اختلاف چہ معنی دارد۔ میں نے اس سے قبل بھی مولانا شہاب کے متعلق '' لکھا ہے۔ ان کی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نظیریات و بیانات کے اتار چڑھاؤ کا ذکر کیا تھا جس پر شہاب صاحب شاکی تھے بلکہ اب تک ہیں۔ اس لیے زیر نظر کتاب پر لکھنے سے گریز کیا تھا مگر نہ لکھنا ناانصافی تھی ، لکھ دیا جو کتاب کا حق

ہے۔ شہاب صاحب نے ایک اور کتاب ''گلگت سے اڈیالہ تک'' بھی تبصرے کے لیے کافی پہلے ارسال کی ہے۔ اس پر تبصرہ صرف اس لیے نہیں ہو سکا کہ شہاب صاحب کے متبعین بھی ہماری تحریر سے غضبناک ہوتے ہیں۔ اگرچہ شہاب صاحب شاکی ہو بھی جائے تو انہیں غصہ پینا خوب آتا ہے۔ وہ اختلاف ضرور کریں گے مگر یہ ہمیں ماننا پڑھے گا کہ ان میں سیاسی ''ٹالیرنیس'' سب سے زیادہ ہے۔ اس سفرنامہ پر احمد سلیم سلیمی نے بھی خوب لکھا ہے۔ شہاب صاحب مناسب سمجھے تو ایک تجویز پیش خدمت ہے۔ اس کتاب کی ایک تقریب رونمائی گلگت میں بھی ہونی چاہیے۔ اسلام آباد میں ہونے والی تقریب رونمائی لوکل باسیوں اور ادباء کی پہنچ سے بہت دور تھی اس لیے وہ شریک نہ ہوسکے اگرچہ فارمیلٹی پورا کرنے کے لیے '' دعوت نامے'' تقریب رونمائی سے ایک دن قبل پہنچائے گئے تھے اور ہمیں تو اس دن جس دن اس تقریب نے ہونا تھا۔ اسلام آباد والی تقریب رونمائی میں کچھ ناہنجاروں نے رنگ میں بھنگ بھی ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ تقریب تھی تو ملکی لیول کی اور بڑی قدر آور شخصیات نے شرکت کی تھی۔ بہر صورت یہ کتاب گلگت بلتستان لیول کی نہیں بلکہ ملکی لیول کی ہے۔ اور اس لیول پر پذیرائی بھی ملی ہے۔

برچہ صاحب کی الوداعی تقریب کے لیے

بسم اللہ الرحمان الرحیم

(یہ مقالہ حلقہ ارباب ذوق گلگت کی طرف جناب شیر باز علی.برچہ کی بڈلف لائیبریری سے ریٹائرمنٹ کے حوالے سے منعقدہ تقریب بمقام پیلس ہوٹل گلگت میں پڑھ کر سنایا گیا)

میں حلقہ ارباب ذوق گلگت کا خصوصی مشکور ہوں کہ انہوں نے گلگت بلتستان کے عظیم دانشور جناب شیر باز علی.برچہ صاحب کی ریٹائرمنٹ پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے یہ خوبصورت محفل سجائی۔ اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے طالب علم کو جناب .برچہ صاحب کی عقیدت میں محبت کے پھول نچھاور کرنے کا موقع دیا۔اس محفل میں بڑے.بڑے علمی لوگ تشریف فرما ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔پروفیسر عثمان علی جیسے لوگوں کی موجودگی میں مجھ جیسے بے مایہ طالب علموں کا کچھ کہنا کیا وقعت رکھتا ہے۔آج.برچہ صاحب اپنی پروفیشنل زندگی کو خیر باد کہہ گئے۔ وہ گلگت بلتستان کی تاریخ میں ایک کامیاب

لائیبریرین کے نام سے اَمر ہو چکے ہیں۔
جناب شیر باز علی.برچہ صاحب میرے دوست ہیں۔.برچہ صاحب صرف میرے دوست نہیں بلکہ ہر کتاب دوست انسان کے دوست ہیں ۔ اس کا ثبوت آج کی یہ محفل دے رہی ہے۔ ہاں ! آپ یہ نہ سمجھے کہ.بزرگ اور جوان کی دوستی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے تو اصل راز کی بات ہے کہ.برچہ صاحب مجھے اپنے دوست سمجھتے ہیں۔ میں تو ان کو گلگت بلتستان کے معدودے سنجیدہ اور معتدل لوگوں میں سے ایک فرد خیال کرتا ہوں اور سنجیدگی میرے قریب سے بھی چھُو کر نہیں گزرتی تو بے ہودگی اور سنجیدگی کا کیا اتصال و اقتران ؟۔اگر دنیا میں .برے اور بے ہودہ لوگ نہ ہوتے تو صرف اچھے اور سنجیدہ لوگوں کی قدر و منزلت کون کیوں کر جانتا اور کرتا۔دنیا کے تمام اچھے لوگوں کو.برے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔اگر.برے لوگ نہ ہوتے تو اچھے لوگوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔
آج کی اس خوبصورت محفل اتنے عظیم لوگوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محترم .برچہ صاحب کی نئی دلہن پر کچھ کلمات عرض کرنا چاہونگا۔یہ تو ہم سب کے علم میں ہیں کہ ان کی ادبی و صحافتی خدمات بہت ساری ہیں۔ وہ انسان ساز انسان ہیں۔ان کی نئی کتاب عکس گلگت بلتستان پہلی زیارت نارتھ بک ڈپو میں ہوئی ،جس دن یہ کتاب وہاں پہنچی تھی۔اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے

اپنے ایک گزشتہ کالم میں لکھا تھا اس کے چند الفاظ آج کی اس عظیم ادبی محفل کے باوقار سامعین کے گوش گزار کرتا ہوں۔ ''بالآخر برچہ صاحب کو نئی نویلی دلہن پر مبارکباد دینے کے لیے فون کیا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے ابھی تک کتاب نہیں دیکھی ہے اور نہ مجھے اطلاع ہے کہ کتاب طباعت کے بعد گلگت پہنچی ہے۔ بقول برچہ صاحب کے میں اولین مبارکباد دینے والوں میں ایک ہوں۔ انہوں نے بعد میں فون پر بتایا کہ کتاب کا نسخہ آپ کے لیے رکھا ہوا ہے، جب بھی موقع ملے وصول کیجیے گا۔ یوں کافی دیر سے میں نے یہ خوبصورت کتاب برچہ صاحب کے مزین دستخطوں کے ساتھ ان کے ید مبارک سے وصول کیا۔ کتاب کو بہت غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ گلگت بلتستان کے حوالے سے اتنی مفید اور تازہ ترین معلومات کسی کتاب میں یکجا نہیں۔ اگر گلگت بلتستان پبلک سروس کمیشن قائم ہوا تو برچہ صاحب کی کتاب مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے سب سے اہم اور لازمی قرار دی جائے گی۔ پوری کتاب کی ورق گردانی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ معلومات کی فراہمی میں محترم برچہ صاحب نے قطعاً خیانت سے کام نہیں لیا ہے۔ ورنہ تو ہمارے ہاں مذہب، مسلک، قومیت اور علاقائیت کی بنیاد پر تواریخ اور کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی مکروہ کوششیں تو معمول کی بات ہے۔

برچہ صاحب نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ فراہمی معلومات میں بھول چوک کی

گنجائش ہو سکتی ہے۔اور بھول چوک کی پکڑ تو خدا بھی نہیں کرتے، لہٰذا اگر کسی صاحب کو ایسی کوئی کمی نظر آئے تو حرفِ تنقید کے بجائے اصلاح کی غرض سے بذریعہ تحریر برچہ صاحب کو مطلع کریں، مجھے امید ہے کہ وہ اگلی اشاعت میں اس کمی کو پورا کردیں گے۔عکسِ گلگت بلتستان میں انتہائی اختصار کے ساتھ گلگت بلتستان کے حوالے سے تمام معلومات دی گئی ہیں۔سیاحت، مشہور جھیلیں، گلیشئر، درے، صحت، پولیس، معدنیات، فلک بوس پہاڑ، مقامی زبانیں، آثار قدیمہ، مواصلاتی نظام، جمہوری و سیاسی ادارے اور شخصیات و پارٹیاں، گلگت بلتستان اسمبلی کا ارتقائی سفر، مذہب، عسکریات و انتظامیہ، نظام عدل، ادبی انجمنیں و سرگرمیاں، اخبار، میگزین، صحافی، مشہور قلعے و مساجد، تعمیراتی ورثے، غرض ہر چیز کو مختصراً سمیٹا گیا ہے۔دو چیزوں کی معلومات تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ایک مطبوعہ مواد کی جامع فہرست، جس میں گلگت بلتستان کی تمام روزنامہ و ہفتہ روزہ اخبارات کی فہرست، ایڈیٹر، رپوٹر اور تمام عملہ اور دیگر تمام لازمی معلومات دی گئی ہیں۔ساتھ ہی ماہ نامے و سہ ماہی رسائل، ڈائجسٹ، اور کتابچوں کی بھی مختصر معلومات بمع عہدہ داروں کے بیان کی گئی ہیں۔سرکاری صحافیوں اور عامل صحافیوں کے نام، عہدہ اور ادارے کے تعارف کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔انگریزی اخبارات کی فہرست اور عہدہ داروں کا ذکر بھی شامل کتاب ہے۔برچہ صاحب نے بخل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے رپوٹروں کا ذکر بھی کیا ہے۔دوسری

چیز کتاب کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ حصہ بہت دلچسپ ہے۔یہ 134 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں صاحب کتاب نے گلگت بلتستان سے متعلق آٹھ سو کے قریب کتابوں کا مختصر تعارف انتہائی جامع انداز میں پیش کیا ہے۔میں نے جب اس حصہ کو پڑھنا شروع کیا تو ورطہء حیرت میں مبتلا ہوا کہ گلگت بلتستان کے حوالے سے اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔۔برچہ صاحب نے انگلش ، اردو اور اردو تراجم پر مبنی تمام کتابوں کی تعداد و تفصیل دی ہے۔اس حصہ کو بغور پڑھنے کے بعد یہاں بھی مجھے اندازہ ہوا کہ محترم.برچہ صاحب نے کسی قسم کے تعصب کو اپنی کتاب کا حصہ نہیں بنایا ہے۔اور ڈنڈی مارنے کے مکروہ عمل سے حتی الواسع کوشش کی ہے۔ ہر مکتبہ فکر وعلاقے اور زبان کے لوگوں نے جو بھی جس نام سے بھی لکھا ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔آفاقی لوگوں کی یہی خصوصیت باقی تمام خصوصیات پر بھاری ہوتی ہے۔وہ انسانیت کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ الخلق عیال اللہ'' کے مصداق تمام انسانوں سے بلا تفریق محبت کرتے ہیں اور بغیر '' تعصب و جانبداری کے معلومات فراہم کرتے ہیں۔جن شخصیات نے دامے درمے قدمے سخنے کتاب کی تیاری میں ان کی مدد کی ہے ان کا بغیر تامل کے شکریہ ادا کیا ہے۔اور جن کتابوں اور رسائل وجرائد اور اداروں سے معلومات و تصاویر لی ہیں ان کا بھی واضح حوالہ دیا ہے''۔

سامعین ذی وقار، یہ تو آپ سب کے علم میں ہے کہ ہم مولویوں کو ہمیشہ وقت کم

دیا جاتا ہے اور ہم بھی وقت کی پروا کیے بغیر تقاریر اور مقالوں کو طول دیتے ہیں۔ قلت وقت کی وجہ سے میں مزید تفصیلات بتانے سے رہ گیا۔ کتاب کا مکمل مطالعہ سے گلگت بلتستان کا واضح عکس نظر آتا ہے۔ آپ بھی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ آنے والے وقتوں میں کام آئے گی۔

جناب والا یہ کون نہیں جانتا کہ شیر باز علی برچہ صاحب ایک معتبر قلمی نام ہے۔ ان کا لکھا ہوا مستند مانا جاتا ہے۔ برچہ صاحب کی کئی اور کتابیں اور علمی مقالے پہلے ہی زیور طبع سے آراستہ ہوکے دادِ عام پا چکے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ عکسِ گلگت بلتستان ان کا اچھوتا کارنامہ ہے۔ جو انہیں صدیوں تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ مجھے کئی علمی شخصیات نے بتایا کہ برچہ کا لکھا ہوا اکثر سچ ہوتا ہے۔ برچہ صاحب کے تراجم اور صحافتی خدمات سے تو پوری قوم واقف ہے۔ روزنامہ نوائے وقت اور روزنامہ جنگ جیسے معتبر اخبارات میں برچہ صاحب نے گلگت بلتستان کے مسائل اور علمی وادبی سرگرمیوں کو اجاگر کیا۔ برچہ صاحب کے علمی مقالات تو بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے سلیبس میں شامل ہیں۔ بڈلف لائبریری گلگت کی تعمیر و ترقی میں برچہ صاحب کے پیشرو جناب اشرف صاحب کا بھی بڑا مرکزی کردار ہے۔ اس بوسیدہ عمارت کو دونوں صاحبان نے عروج تک پہنچایا۔

آج ہم سب .برچہ صاحب کی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے جمع ہیں۔میں اس پر انہیں قطعاً مبارک باد نہیں دونگا۔مجھے تواب سے فکر لاحق ہوئی ہے کہ اگر ہم پبلک لائیبریری میں جائیں تو کس کے پاس جائیں اور اگر کوئی صاحب.برچہ صاحب کی سیٹ پر.براجمان ہو بھی تو، کیا وہ مجھ جیسے طالب علموں کو اتنا مقام و عزت دے گا جو میرے.بزرگ دوست.برچہ صاحب دیتے تھے۔یقناً جواب نفی میں ہے۔میں نے کئی دفعہ قلمی امور میں.برچہ صاحب سے رہنمائی لی۔.برچہ صاحب کہ ریٹائرمنٹ پر آپ سب کو مبارک مگر میرے لیے یہ ایک تکلیف دہ عمل سے کم نہیں۔مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں پبلک لائیبریری جانے اور استفادہ اور عزت حاصل کرنے سے قاصر رہا۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔آمین، وآخر دعوانا عن الحمدللہ

واہگہ بارڈر کے اُس پار

لاہور میں آئے تین ہفتے بیت چکے ہیں،ان تین ہفتوں میں یہاں بہت کچھ دیکھا، سیکھا اور سمجھا۔کافی ساری اچھی یادیں ہیں ، گلگت کے نامور بزرگوں سے اہم ملاقاتیں ہوئی وہ آپ سے کسی موقع پر ضرور شیئر کرونگا تاہم آج بروز منگل ۹ جولائی کو واہگہ بارڈر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک عرصے سے وہاں جانے کی خواہش تھی جو آج پوری ہوئی۔ برادرم مولانا عتیق صاحب نے مژدہ سنایا کہ آج دوسرے پہر واہگہ بارڈر جانا ہے ، کہیں نکل نہ جاؤ۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم بیگم پورہ سے ٹھیک چار بجے نکلے۔ بیگم پورہ سے بذریعہ جی ٹی روڈ واہگہ بارڈر پہنچے۔ مولانا عبدالمتین ،برادرم حماد، عزیزم منیب الرحمان اور نعمان بھی شامل سفر ہیں۔ بیگم پورہ لاہور سے واہگہ بارڈر تک اٹھارہ کلومیٹر کا سفر ہے۔آج موسم بھی بڑا عمدہ ہے ورنہ تو لاہور کی طرح لاہور کی گرمی اور حبس بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ سو برادرم عتیق الرحمان صاحب نے سواری کے ساتھ واہگہ بارڈر میں دیگر انتظامات بھی پہلے سے کر رکھے ہیں۔جب ہم وہاں پہنچے تو پروٹوکول نمبر ۳۴ کے ذریعے پروٹوکول دیا گیا، ہماری گاڑی اندر محفوظ جگہ چھوڑی دی گئی۔ وہاں کسٹم مسجد کے خطیبب سعید صاحب نے ویلکم کہا، ان کی مسجد میں نماز عصر ادا کی گئی۔ واہگہ بارڈر کی

پرانی مسجد کو شہید کرکے وہاں مارکیٹ بنائی گئی ہے جہاں آج کل انڈیا سے سمگلنگ ہو کر آنے والی چوڑیاں اور دیگر اشیائے زنانہ فروخت کی جاتیں ہیں۔رینجرز کے جس آفسیر نے مسجد شہید کرکے مارکیٹ بنانے کا حکم دیا تھا، وہ عین اسی وقت دریائے ستلج میں بیٹے سمیت طیارہ حادثہ میں ڈوب گیا۔اب ایک چھوٹی جامع مسجد نئی تعمیر کی گئی ہے۔

واہگہ بارڈر جانے کے لیے لاہوریوں اور دوسرے سیاحوں کا ایک دریا اُمڈ آیا ہے۔سیکورٹی پر مامور حضرات ان کو اندر جانے کے لئے لائنوں میں کھڑا کیے جارہے ہیں اور غیر قانونی طور ان سے رقم بھی بٹور رہے رہیں۔جب ہم مخصوص نشستوں پر پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چند قدم اُس پار ہندوستانیوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔بالکل سامنے ہی گاندھی جی کی تصویر اور ہندوستانی جھنڈا نظر آیا۔مڑ کر دیکھا تو اپنے بالکل اوپر پاکستان کا سبز ہلالی جھنڈا اپنی پوری شان کے ساتھ بلند ہے۔عورتوں بچوں اور جوانوں کی ایک بڑی تعداد اِس پار اور اُس پار موجود ہے۔ہمارے دیگر ساتھی نیچے پروٹوکول والی نشستوں پر بیٹھ گئے، میں اور برادرم عتیق صاحب اوپری نسشتوں کی طرف گئے۔کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے بالکل سامنے ہندوستان ہے۔ایک ہلکی سے تار سے ہندوستان اور پاکستان کی سرحد کا اندازہ ہوتا ہے۔سیکورٹی حضرات اور کسٹم عملے کی ایک بڑی تعداد اپنی ذمہ داریوں میں مگن ہے۔نعرے لگ رہے ہیں۔اُس پار ہندوستانی

عوام جذبات کی رو میں بہہ رہی ہے اور ادھر پاکستانی بھی مختلف نعروں سے اپنے دلوں کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ایک نعرے نے مجھے مبہوت کر دیا جو '' پاکستان زندہ باد'' یونیفارم پہنے عملے کی طرف سے بار بار لگایا جا رہا تھا کہ ''ہاتھ اُٹھا کے جیب بچا کے'' کہو پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ اللہ''۔ادھر انڈیا والے بھی ناچ گانوں میں مصروف ہیں۔پریڈ اور پرچم اترائی والے بھی مگن ہیں۔ محفل کا آغاز پاکستان کی طرف سے تلاوت قرآن سے کی گئی جبکہ انڈیا کی طرف سے کوئی خاص کلام پڑھا گیا جو یقیناً ناقابل فہم ہے۔شاید ہندی میں کوئی مذہبی منتر ہو۔کچھ چیزیں دونوں مجمعوں میں یکساں ہیں مثلاً وہاں کے نوجوان بھی ناچ رہے ہیں تو یہاں بھی ڈھول پِٹ رہا ہے اور بیہودگی نظر آ رہی ہے، نوجوان غل غپاڑہ کر رہے ہیں۔ عورتیں بے پردگی میں تالیاں پیٹ رہی ہیں، جب تلاوت کلام کا آغاز ہوا تو احتراماً سب نے دوپٹے سروں تک کھینچ لیے۔واہ مظلوم اسلام۔

جی ہاں میرے بالکل سامنے انڈین ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ میں ان کو دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی مجھے دیکھ رہے ہیں۔وہ جذبات سے نعرے لگا رہے ہیں تو صاف سنائی دے رہا ہے اور ہمارے جذبات بھی وہ ملاحظہ کر رہے ہیں۔ عجیب کیفیت کا سماں ہے۔ میرے دل میں بے تحاشا خیالات آ رہے ہیں میرا خیالات اس ہنگامہ خیزی سے کہیں دور جا چکے ہیں۔ میں جسماً وہاں موجود ہوں مگر ذہناً نہیں۔ عین اسی

وقت میرے سر کے عین اوپر سے دو سفید پرندے گزر گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مختلف پرندوں کے کئی جھنڈ اُس پار سے اس پار آ رہے ہیں۔ انہیں اِدھر اُدھر جانے کے لیے کوئی ویزہ، کوئی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں۔ امیگریشن والے بھی ان سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے۔ دنیاوی جھنجھٹوں سے آزاد یہ پرندے کتنے خوش قسمت ہیں کہ جہاں جی چاہیے وہاں اپنا بسیرا بنائے۔ ان کی دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ بے شمار جھمیلوں سے آزاد بالکل آزاد۔ کاش انسان نے دنیا کو خود اپنے ہاتھوں سے دوزخ نہ بنایا ہوتا! دل چاہ رہا ہے کہ ابھی ہی بے ساختگی سے حالت جنونیت میں ہندوستان کی سیر کرنے نکلو۔ کیوں؟ اس لئے کہ میری علمی و نظیر تاتی عقیدت گاہ دارالعلوم دیوبند یوپی ہندوستان اور موجودہ انڈیا میں ہے۔ مسلم علیگڑھ یونیورسٹی کو دیکھنے کے لیے دل ترس رہا ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی، مظاہر العلوم سہارنپور، جامعہ امنیہ دہلی اور نہ جانے کتنے علوم و فنون اسلامی کے مراکز وہاں اب بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی دیواروں میں میرا ماضی، ہندوستانی مسلمانوں کا ماضی، مسلمانوں کی ہر طرح کی ترقی و خوشحالی کا راز پوشیدہ ہے۔ لال قلعہ، جامع مسجد دہلی، قطب مینار، نظام الدین اولیا اور نہ جانے کیا کیا انڈیا میں ہیں جن سے ہمارا ماضی جڑا ہوا ہے۔ یاد ماضی عذاب ہے یا رب۔

قارئین! جب میں واہگہ بارڈر میں انڈین اور پاکستانیوں کے جذبات، دونوں

دروازے کا کھلنا، بند ہونا، نمائشی پریڈ، پرچم اُترائی کا عمل، بارڈر کے اس پار اوراِس پار کا جائزہ لے رہا ہوں تو دل و دماغ میں سوالات کا نہ تھمنے والا ایک سلسلہ شروع ہوا۔گاندھی جی فرقہ وارانہ تشدد کے سخت خلاف تھے اور قاید اعظم ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا۔کیا تقسیم بندی میں مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافیاں نہیں کی گئی ۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کمزور تھے اور مختلف النوع مصائب اور آلام میں پھنسے ہوئے تھے۔ لامحالہ انہیں انگریز سرکار کے سامنے جھکناپڑااور تاج برطانیہ نے شاطرانہ انداز میں حد بندی میں اپنی مرضی کی۔انگریز نے راس کماری سے ہمالیہ تک برصغیر کو ایک متحدہ شکل دی اور نظام حیات قائم کیا مگر جاتے جاتے بٹوارا کرکے مسلمانوں کو نقصان عظیم سے دوچار نہیں کیا؟کیوں ! اس لیے کہ بٹوارے کے وقت مسلمانوں کی آبادی ایک چوتھائی سے زیادہ تھی اور بٹوارے کے بعد دسواں حصہ بن گئی۔ مسلمان ایک چوتھائی ہونے کے باجود ہندو اکثریت سے خوف زدہ تھے تو دسواں حصے کا خوف آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔کیا بٹوارے کے بعد مسلمانوں کی طاقت اور تعداد پانچ حصوں میں تقسیم ہو کر نہیں رہ گئی؟ یعنی پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، آزاد جموں و کشمیر اور گلگت بلتستان کی شکل میں۔کیا تقسیم کے بعد پانچ کروڑ سے زائد مسلمانوں کو ہندو بنئے کے رحم وکرم پر بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا؟کیا بٹوارے کے بعد قاید اعظم نے آئی آئی چند ریگر اور چودھری خلیق الزمان کو بھارتی مسلمانوں کی رہنمائی و نصرت کے لیے ہندوستان

یہیں رہنے کی ہدایت نہیں کی تھی؟ پھر بٹوارہ چہ معنی دارد؟ کیا ہم نے غور کیا کہ بٹوارے کی برکت سے ہندوستانی مسلمان بے آسرا، کشمیری محصور و مقہور، گلگت بلتستان کے لوگ بے آماں و دھرتی بھٹک نہیں رہے ہیں اور مشرقی پاکستان تو ہم سے کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا حالانکہ تحریک پاکستان کا آغاز تو وہاں سے ہوا تھا، کیا بٹوارے کا نقشہ سر ظفراللہ خان نے نہیں تیار کیا تھا؟ کیا ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کے بعد خون خراب اور فسادات نہ ہونے کا یقین دھانی نہیں کرائی تھی پھر کیوں مسلمانوں کے خون سے صحرا و سمندر کو لال کر دیا گیا اور عزتیں و عصمتیں تار تار کی گئی؟ کیا بٹوارے کے عمل سے مسلمانوں کی عظیم درسگاہ مسلم علی گڑھ یونیورسٹی، دارالعلوم دیوبند، جامعہ ملیہ یونیورسٹی، جامعہ امنیہ دہلی، لال قلعہ قطب مینار اور دیگر مقامات مقدسہ سے یک جنبش رشتہ نہیں ٹوٹا؟ کیا ہم نے جس مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا وہ پورا ہوا؟ اور تو اور ہم ابھی تک ایک قوم بھی نہیں بن سکے۔ ہم پہلے پٹھان، پنجابی، بلوچی، سندھی، گلگتی اور کشمیری ہیں بعد میں شیعہ سنی اور پھر کہیں جا کر شاید پاکستانی۔ بہر صورت اللہ ہم پر رحم کامل کریں۔
ہم نے اللہ سے ایک کمٹمنٹ کرکے پاکستان لیا تھا کہ ہم یہاں قانون اسلام نافذ کریں گے جب ہم نے اپنے وعدے کا ایفاء نہیں کیا تو اللہ نے ہم پر بے شمار عذاب نازل کر دیے جو آج ہم اجتماعی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ ویسے نظریہ پاکستان کے مخالف احباب پر ایک سوال اٹھتا ہے۔ ہمارے اکابر حضرت مدنی اور تھانوی گروپ میں جو اصولی

اختلاف تھا وہ یہ کہ متحدہ ہندوستان کے قائل احباب کا کہنا تھا کہ ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ بنے گا جہاں تمام ادیان والوں کو یکساں آزادی ہوگی اور صوبوں کی خود مختاری کا مکمل پاس رکھا جائے گا مروجہ جمہوری اقتدار اپنائے جائیں گے، جبکہ منقسم ہندوستان والوں کا خیال تھا کہ یہ تو عین مخالف اسلام ہے، اگر تھوڑا سا علاقہ بھی نفاذ اسلام کے لیے ملتا ہے تو اس کو ضرور حاصل کیا جائے تاکہ اسلام کو باقاعدہ اسٹیٹ کی صورت میں بنیادی شکل دی جاسکے، خیر یہ ایک علمی سوال ہے جس کا فیصلہ اصحاب علم ہی کر سکتے ہیں۔تاہم مذکورہ بالا سوالات کے جوابات اگر کوئی موصوف دینا چاہیے تو میں اس کا مہربان وممنون رہونگا۔

بہرصورت میں انہیں سوالات کے نرغے میں پھنسا ہوں، سلجھ کے بھی سلجھائے نہیں دے رہا، اچانک برادرم عتیق صاحب نے کہا کہ ٹائم اَوور ہوا ہے چلتے ہیں۔ ہم واہگہ بارڈر سے باہر نکلے۔برادرم سعید الرحمان صاحب کا گھر جو بارڈر سے متصل ہے میں خالص دودھ کی نمکین چائے کے ساتھ ہندوستان سے منگوائی ہوئی سوغات ''پتیسہ ہلدی رام'' نوش کی۔طبیعت میں اضمحلال ہے جو چائے نوشی سے دور ہوا۔ سو ہم واپسی کے لیے پابہ رکاب ہوئے۔ویسے لاہور جانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں دو نئی چیزیں کھانے کا موقع ملا، قاری کثیر کے ساتھ گارڈن ٹاؤن میں دھی بھلے اور انڈیا کا پتیسہ ہلدی رام، جیوے پاکستان۔

''عوامی ایکشن کمیٹی اور ''خفیہ ہاتھ

قارئین اتنے اہم ایشو پر ابھی تک نہ لکھنے پر معذرت ! اصل میں ہر انسان اپنی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ میں بھی اب تلک صرف اس لیے خاموش رہا کہ ایکشن کمیٹی اور دھرنا گروپوں کے خلاف لکھنا ممکن نہیں تھا اور ان کے جائز مطالبات کی حمایت پر لکھ کر خواہ مخواہ ''خفیہ ہاتھ '' کا الزام اپنے سر لینے کی ہمت نہیں تھی۔ میں سلام پیش کرتا ہوں اس گندم کے دانے کو جس نے امام غائب و امام حاضر کے ماننے والے اور نہ ماننے والوں کو ایک چٹائی پر بٹھایا دیا۔ہماری بھی عجب حالت ہے کہ نہ ہم اللہ کے نام پر ایک ہو سکے نہ کلام اللہ پر، اور نہ محمد عربی جیسی عظیم شخصیت پر۔ مگر گندم اے گندم........ہاں یاد آیا اسی گندم کی وجہ سے تو دنیائے انسانیت کی آفرینش شروع ہوئی تھی۔ باوا آدم گندم کا دانہ نہ کھاتے تو کیا اولاد آدم آج اتنی تعداد میں اس معمورِ بے آباد میں آباد ہوتے؟

قارئین ! یہ کون نہیں جانتا کہ اشیائے خورد و نوش میں سبسڈی (یعنی فوجی تعاون کے بدلے امداد) گلگت بلتستان کے عوام کا آئینی حق ہے۔ یہ حق عالمی قانون بھی دیتا ہے۔ یاد رہے کہ 13 اگست 1948 ء کو اقوام متحدہ نے تا تصفیہ

قضیہ کشمیر، گلگت بلتستان، آزاد کشمیر اور جموں کشمیر کی اس حق کو تسلیم کیا تھا۔ جب تمام اقوام کا یہ فورم ایک حق کو تسلیم کرے اور پھر اپنے اس حق کو چھین لیں تو پھر اس دکھ کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو مبتلا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ چند دنوں سے پورا گلگت بلتستان حالت احتجاج میں ہے مگر کسی کچھ اثر ہوتا نہیں۔

اس راز سے ہم سب واقف ہیں کہ گلگت بلتستان کا علاقہ ایک کالونی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اپنے نوآبادیات میں ہمیشہ گڈ گورننس سے عوام کا دل جیتا ہے۔ گلگتی عوام بھی پاکستانیوں سے صرف یہی چاہتے ہیں کہ گڈ گورننس سے ہمارا دل جیتو، باقی کل بھی آپ آقا تھے آج بھی آپ آقا ہیں۔ مگر یہ آقا بھی ظالم قسم کے ہیں کہ خون بھی چوستے ہیں اور آزاد بھی نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک خفیہ ہاتھ کی بات ہے تو اس راز سے ہم سب واقف ہیں کہ جب بھی کسی نے حقوق کی بات کی ہے اس پر خفیہ ہاتھ کا الزام لگتا رہا ہے۔ بلوچوں پر خفیہ ہاتھ کا الزام اور پھر ان کی حق میں لکھنے والوں کو بھی سی آئی اے اور را کا ایجنٹ کہا جاتا ہے جیسے جنگ گروپ و حامد میر، طالبان کے ساتھ مذاکرات کی بات کرنے والے بھی خفیہ ایجنسیوں کے گماشتے کہلاتے ہیں اور پھر طالبان پر تو پوری قوم بالخصوص مغربی برانڈڈ صحافیوں، دانشوروں اور لبنکر پرسنوں اور پرسنیوں کا اجماع ہے

کہ وہ ہر حال میں ملک وملت کے دشمن ہیں، بیرونی ایجنٹ ہیں بلکہ باقاعدہ تنخواہ خوار ہیں۔ اب اگر یہ الزام عوامی ایکشن کمیٹی والوں پر لگے تو شاید ان کو دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کو جو ان کی خاموش حمایت کرتے ہیں۔بڑے مقاصد کے حصول کے لیے کچھ برداشت بھی کیا جانا چاہیے۔ کیا ہم سب نہیں جانتے کہ گلگت بلتستان میں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے والے لوگ کون ہیں اور بڑے بڑے حادثات کرواکر ہاتھوں سے دستانے اتار کر ہمارے درمیان کون لوگ موجود ہیں بلکہ ہمارے مصلح بھی ہیں۔ خون مسلم سے ہاتھ رنگین کرنے والے یہ لوگ ایک مکمل آمرانہ سوچ رکھتے ہیں، ان کے اذہان کاملہ کے الٹ یا برعکس سوچنے والے یہودیوں، عیسائیوں اور موساد و رااور سی آئی اے کے ایجنٹ کہلاتے ہیں، اور ان کا کمال دیکھیں کہ یہ لوگ اپنے پالتو جانوروں کو کھڑا کردیتے ہیں کہ عوامی مفاد اور قومی دائرے کی بات کرنے والوں کو لتاڑنے کے لیے، اور علی الاعلان کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خفیہ ہاتھوں کی کارستانی ہے۔ حضور والا، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کن ہاتھوں کی کارستانی ہے۔ آپ بھی تو کسی کے اشارے پر اس طرح کی راگ الاپتے ہیں۔ آپ بھی تو وہی ہے کہ دن میں کئی بار اپنے آقاؤں کے در پر حاضری دیتے ہیں۔ اور اسی حاضری میں بعض دفعہ آپ کی سخت سرزنش بھی ہوتی ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر ایک سیکنڈ ہی سوچ لیں، کیا میں سچ نہیں کہہ رہا۔

یہ راز بھی اب راز نہیں رہا کہ گلگت بلتستان دھرتی عالم میں واحد خطہ ہے جس کی کوئی مسلمہ سیاسی و آئینی حیثیت نہیں۔اٹھائیس ہزار مربع میل پر پھیلا یہ خوبصورت علاقہ دنیا کا وہ خطہ ہے جو آج تک پاکستان اور انڈیا کے مابین متنازعہ ہے اور نزع کے عالم میں ہے۔بالاور دیس کا یہ حسین خطہ ہے جو قانونی طور پر پاکستان میں داخل بھی ہے اور باہر بھی یعنی نہ داخل ہے نہ شامل،جی بی دنیا کا واحد خطہ ہے جہاں ہر قسم کا پانی وافر مقدار میں ہے مگر اس کے باوجود یہاں کی عوام پانی اور بجلی سے محروم بھی۔کیا اب بھی یہ راز ہے کہ گلگت بلتستان کے ان کالے پہاڑوں ، بہتی ندیوں، آبشاروں، دریاؤں ، گھنے جنگلوں ، خوبصورت جھیلوں اور رس بھرے پھلوں میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ پیرس اور دیگر مغربی ممالک ان کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر اے کاش اس میں وہ خوبصورت ماحول کب وجود میں آئیگا۔طول دینے کے بجائے آج کی محفل میں آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

''مولانا لقمان حکیم'' یادوں کا تاج محل

مولانا لقمان حکیم جے یو آئی گلگت بلتستان کے امیر ہیں۔ انہوں نے 1968ء کے اوائل میں گلگت میں قدم رکھا۔ تب سے اب تک کی پینتالیس سالہ زندگی کی نرم و گرم یادیں ان کی متاعِ عزیز ہیں۔ مولانا نے ایف سی آر کے کالے قوانین بھی دیکھے اور ان کا شکار بھی ہوئے اور پھر ان کالے قوانین کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کا حصہ بھی بنے۔ جامعہ نصرۃ الاسلام کے سالانہ پروگرام تقریبِ ختمِ بخاری میں وہ صدر مجلس تھے میں طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ رئیس الجامعہ کی خواہش تھی کہ وہ شریک ہوں مگر انہوں نے معذرت کی، کیونکہ اس دن وہ شدید علیل تھے۔ جامعہ کی طرف سے انہیں خصوصی تحفہ دیا گیا جو ان کے بیٹے نے وصول کیا۔ میں ان کی عیادت کے لیے آج ان کے دولت کدے میں حاضر ہوا، مولانا نے ہمیشہ کی طرح خندہ پیشانی سے اھلًا و سھلًا کہا، اپنے پاس بیٹھے مہمانوں کے سامنے اس ناچیز کا ایک جاندار تعارف کروایا اگرچہ مجھے اپنی حقیقت کا خوب علم ہے مگر لقمان حکیم صاحب کا حسن ظن ہے کہ وہ ہمیں علماء کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔ قارئین ان کے دل و دماغ میں گلگت بلتستان کی پینتالیس سالہ تاریخ کا ایک نہ ختم ہونے والا معلوماتی سلسلہ محفوظ ہے۔ آج کی محفل میں مختصراً چند باتیں عرض کیے دیتے ہوں۔

لقمان حکیم صاحب کو وہ وقت بھی اچھی طرح یاد ہے جب گلگت میں چھ ماہ تک انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے روٹی پکا کر کھائی تھی، ان کی رہائش کا کوئی بندوبست نہیں تھا، دن بھر دینی کاموں میں مگن رہنے کے بعد رات کو وہ کسی کی چارپائی میں سوجائے کرتے تھے، مولانا لقمان حکیم نے کبار اکابر علماء دیوبند سے تعلیم پائی ہے، وہ قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند کرنے کے لیے اپنے ابائی گاؤں گوہرآباد گئے اور توحید کی اشاعت شروع کی، پھر کیا تھا کہ ایف سی آر کے دو حوالدار، تمام نمبرداران، جرگہ داران، عوام اور بدعت پسند مولوی ان کے جانی دشمن بن گئے، یہاں تک کہ مولانا کے سگے بھائی بھی مخالفت پر اتر آئے۔ یہ سچ ہے کہ توحید کی دعوت بہت گراں ہوتی ہے۔ اسی دعوت توحید پر تو آپ سے تمام قبائل اور خاندان نے بائیکاٹ کیا تھا اور اذتیں پہنچائی تھی۔ جب انہیں گوہرآباد کی ہوا راس نہ آئی تو پھر گلگت شہر کا رخ کیا، آج سے پینتالیس سال قبل شہر گلگت صرف نام کا شہر تھا باقی تو زندگی کی تمام ضروریات کا فقدان تھا۔ پھر ایک غریب الدیار کے لیے شہر ہو بھی تو شہری رونقیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ انہوں نے شہر گلگت میں عقیدہ توحید کی پرچار شروع کی، غیروں کی ریشہ دوانیوں کے ساتھ اپنوں کی بے رعنائیاں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے کام آئی مگر ہوتا وہی جو منظور خدا ہو۔ احقاق حق اور ابطال باطل کی وجہ سے مولانا لقمان حکیم کی کئی پیشیاں پولیٹیکل ریذیڈنٹ

اور بڑے تحصیلدار کے پاس ہوئی مگر وہ اپنے کام سے کہاں باز آنے والے تھے۔
قاضی عبدالرزاق مرحوم (فاضل دارالعلوم دیوبند) کی محبتیں مولانا لقمان حکیم کے ساتھ تھی۔بقول لقمان حکیم صاحب کے کہ پورے گلگت بلتستان میں قاضی عبدالرزاق کے پائے کا کوئی عالم دین نہیں تھا، قاضی صاحب نے آخری دم تک حکومت کی کوئی پیشکش قبول نہیں کی۔ وہ بے نفس آدمی تھے''۔ قاضی عبدالرزاق کے ساتھ ملکر مولانا لقمان حکیم نے سینکڑوں مشکل قضیے نمٹائے۔ علاقائی عدالتیں شرعی فیصلہ کرنے کے لیے عوام الناس کو قاضی عبدالرزاق کے پاس بھیجتی تو قاضی صاحب مولانا لقمان حکیم کو شرعی فیصلوں میں معاونت کے لیے ساتھ بٹھاتے اور دونوں مل کر یہ فیصلے صادر فرماتے۔ لقمان حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ'' وہ تو کتابی کیڑا تھا، کتابوں کے حوالے از بر تھے اور علمی کتابوں کو انتہائی حد تک سمجھتے تھے۔ایک وقت تک قاضی کی آواز جامع مسجد کے دیواروں تک محدود تھی، کوئی ان کے ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ شروع شروع میں بہت نرم دل تھے مگر شرکیات و بدعات اور رذیلات اور خرافات فی الدین نے انہیں سختی پر ابھارا اور پھر قاضی صاحب نے دینی معاملات میں انتہائی سختی شروع کی۔ اللہ نے اس حوالے سے انہیں شرح صدر فرمایا تھا، وہ حق کی آواز بن کر ابھرے اور مجھے بھی اپنے ساتھ ملایا، آج دور دور تک بھی اس کا سایہ نظر نہیں آتا''۔

جامعہ نصرۃ الاسلام کی تعمیر و ترقی میں بھی مولانا لقمان حکیم کا مرکزی کردار ہے۔ خود قاضی عبدالرزاق نے انہیں اولین ناظم تعلیمات مقرر کیا تھا۔ مولانا لقمان حکیم کے ایک ساتھی بلتستان میں ایک دینی ادارہ بنارہے تھے اس کی افتتاح کے لیے اسلام آباد سے مولانا عبداللہ شہید کو بلایا تھا اور گلگت سے قاضی عبدالرزاق اور ان کے رفقاء کو بلایا تھا۔ مولانا لقمان حکیم کے اصرار پر عبداللہ شہید اسکردو سے گلگت آئے اور پانچ دن یہاں رہے۔ یہاں انہوں نے قاضی عبدالرزاق کی خدمت میں گزارش کی کہ ہر حال میں مدرسہ کا کام شروع کیا جائے۔ یوں قاضی عبدالزاق صاحب نے جامعہ نصرۃ الاسلام میں درس نظامی کا افتتاح کیا اور جس بے سروسامانی کے ساتھ شروع کیا اس کا مزہ تب آئے گا جب کوئی مولانا لقمان حکیم کے الفاظ و زبان سے سنے گا۔ قارئین آپ کو حیرت ہوگی کہ قاضی عبدالرزاق کے پہلی شرط یہ تھی کہ '' جو بھی مدرسہ میں درس و تدریس یا کوئی اور خدمت کرے گا وہ تنخواہ نہیں لے گا'' ۔ اور قاضی صاحب کی آواز پر سب سے اول لبیک کرنے والے مولانا لقمان حکیم تھے۔ یہ مولانا لقمان حکیم کا حق ہے کہ ان کے جذبات و خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں پھر گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ گلگت بلتستان کی سیاسی نشیب و فراز سے خوب واقف ہیں۔ پاور پالیٹکس کے گُر سے مولانا لقمان حکیم اچھی طرح آگاہ

ہے۔ ان کا سینہ معلومات سے بھرا پڑا ہے۔ ایک طویل عرصہ انہوں نے تنظیم اہل سنت میں گزارا، جے یو آئی گلگت بلتستان کے امیر کی حیثیت سے آج بھی ان کا کردار واضح ہے۔ گزرے دنوں کی یادیں ان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ ان کے پاس تلخ یادیں بھی ہیں اور نرم گوشے بھی۔ وہ آج بھی اپنے اندر ایک جوان دل رکھتے ہیں اور تازہ عزم۔ ان کے عزم میں کمی نہیں دکھائی دیتی۔ وہ اپنے اکابر کا اخلاص، للّٰہیت اور فراست دینی کا متلاشی ہے مگر گلگت بلتستان میں یہ عظیم صفات ان کو نہیں ملتی۔ انہیں اس بات کا سخت قلق ہے کہ عوام میں فراست دینی اور اخلاص موجود نہیں ہے۔ وہ ایک دردناک آہ کے ساتھ گویا ہوتے ہیں کہ '' علماء میں قناعت، فراست دینی، اخلاص اور تقویٰ ناپید ہے''۔

قدیم علماء سے ملنا اور ان کی یادیں قلمبند کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ مجھے دکھ اس وقت ہوتا ہے کہ جب اس کارِ خیر کے لیے مجھے وقت نہیں ملتا۔ اور ان کو کیوں وقت ملے جو دنیا کی بھول بھلیوں میں کھو جائیں۔ میری کتاب ادھوری ہے۔ میں مولانا لقمان حکیم کی طرح سختیوں میں کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ جامعہ نصرۃ الاسلام نے تعلیم و تعلم کے لیے کافی آسانی پیدا کی ہیں مگر میں اتنا مستفید نہیں ہو رہا ہوں جتنا ہونا چاہیے تھا۔
مولانا لقمان حکیم گلگت بلتستان کی معلومات کا ایک حسین انسائی کلوپیڈیا ہے۔ غضب کا حافظہ پایا ہے۔ جب وہ شرکیات و بدعات کی بات کرتے ہیں تو دل کرتا ہے کہ انسان سنتا

جائے۔ان کے پاس تفصیل سے اتنی حسین یادیں ہیں کہ ان کو یادوں کا تاج محل کہا جاسکتا ہے۔ لقمان حکیم کا سیاسی وژن بالکل کلیر ہے۔ وہ جے یو آئی کو ایک نظریاتی جماعت دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بہتوں سے شاکی بھی ہیں کہ نظریاتی و قومی مفادات کی بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دی جارہی ہے۔ مولانا لقمان حکیم نے اس وقت درس قرآن عام کیا جب اس کا رواج نہیں تھا۔انہوں نے بے شمار خفیہ گوشوں سے اس فقیر کو آگاہ کیا۔ کچھ باتیں اور یادیں ایسی بھی ہیں جو قرطاس کے سپرد نہیں کی جاسکتیں۔ اور بہت کچھ ایسی بھی ہیں کہ فی الحال ان کا موقع محل نہیں ہے۔ مولانا لقمان حکیم گلگت بلتستان میں علماء دیوبند کی ایک یادگار ہے۔ مجھے سمیت ہر ایک کو ان کی سیاسی باتوں سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی دینی خدمات، اور ان کی نیت پر شک کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ وہ تو شیخ القرآن غلام اللہ خان، مولانا احمد علی لاہوری، حافظ الحدیث عبداللہ درخواستی اور قاضی عبدالرزاق کے علمی ورثے کا ایک نرالا باب ہے۔ قاری طیب اور مفسرِ قران شمس الحق افغانی سے شرف تلمذ حاصل ہے اور ان کی خدمت کا موقع ملا ہے۔ایسے بزرگوں کی زیارت بھی کار ثواب ہے۔خدا ان کو سلامت رکھے۔آمین

دعوتِ تبلیغ اور مولانا زبیر الحسن

یہ بات اب راز کی بات نہیں رہی کہ تبلیغی جماعت نے اسلام کی اشاعت میں وہ کارنامے انجام دیے ہیں کہ کھربوں کے بجٹ رکھنے والے تعلیمی و نشریاتی ادارے نہیں دے سکتے۔ تبلیغی جماعت والوں کا کوئی لمبا چوڑا مینو فیسٹو نہیں ہے اور نہ ہے کوئی انقلابی دستور شائع کیا ہے۔ بس خلوص دل کے ساتھ اللہ کا نام لے کر گلی گلی قریہ قریہ گھومنا اور توحید کی دعوت دینا ان کا پہلا اور آخری نصب العین ہے۔ ہندوستان کے محلّہ میوات سے شروع ہونے والا یہ کام اب ایک عالمی تحریک کا روپ دھار چکا ہے۔ تھوڑی سے عمر میں ، مجھے سینکڑوں لوگ دیکھنے کو ملے جو تبلیغی جماعت کے ساتھ جُڑ کر ولی اللہ بن چکے ہیں۔ کل تک جو لوگ ناچ گانے اور عریانیت میں مبتلا تھے آج وہ داعی دین برحق بن گئے ہیں۔ اس تحریک کا عالمی روپ دھارنے کی واحد ایک وجہ ہے کہ اس کے بانیان نے بلا خوف وخطر اور کسی لالچ و طمع کے بغیر، انتہائی قناعت و للّٰہیت کے ساتھ دعوت کا بیڑا اٹھایا اور پھر یہ کام اتنا پھیلا کہ اب نہ کسی انجمن کا محتاج ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی بجٹ کی ضرورت ہے اور نہ ہی ملکوں کے آئین اور قوانین اس کام کو روکنے کی سکت رکھتے۔

مولانا زبیر الحسن صاحب ان مخلص تبلیغی رہنماؤں میں ایک تھے۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ ایک زمانہ ان کا طوطی پورے ہند میں بولتا رہا، وجہ صاف ظاہر تھی کہ وہ صرف ایک داعی الی الحق نہیں تھے بلکہ ایک عظیم محدث، ولی کامل اور اکابر علماء دیوبند کی حسین روایات کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ اللہ نے انہیں شریعت کے ساتھ طریقت کا فہم بھی عطاء کیا ہوا تھا۔

اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اسلام کی بقاء واستحکام اور نشرواشاعت کے لیے جن لوگوں نے سب سے زیادہ قربانی دی وہ علمائے دیوبند تھے۔ ان کے کئی سلسلے تھے ان میں ایک سلسلہ دعوت و تبلیغ کا تھا۔ اور مولانا زبیر الحسن ان عظیم سلسلوں کو جاری وساری رکھنے کے لیے ایک مینارہِ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان تبلیغی بزرگوں کی مساعی جمیلہ سے کتنے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے اور کتنوں نے فسق و فجور کی راہ کو ترک کرکے دین حق کی طرف لوٹ آئے اور داعی حق بن گئے۔

حضرت مولانا زبیر الحسن کی سوانح پر تو اکابر علماء و شیوخ لکھیں گے۔ میری دانست کے مطابق حضرت رحمہ اللہ ایک جلیل القدر بزرگ ہونے کے ساتھ ایک جید مدرس بھی تھے۔ وہ سفر اور حضر میں ایک ہی کام میں منہمک رہتے تھے وہ تھا مخلوق کا خالق سے رشتہ جوڑنا، صلح کرانا اور دوستیاں پیدا کرانا، جہاں بھی

مولانا رحمہ اللہ کا بیان ہوتا وہاں تشگانِ دین دور دور سے چلے آتے اور خاموشی سے حضرت کی بات سنتے اور اپنی حیثیت اور فہم کے مطابق ان کے علمی و عملی اور اخلاص کے دریائے سے سیراب ہوتے۔ان کا ایک ہی مشن تھا کہ ملت میں بیداری کی روح پھونک دی جائے۔ عام آدمی کے دل و دماغ میں اعمال صالحہ اور اخلاق اسلامیہ کا طوفان کھڑا کیا جائے ، ان کی بھرپور دینی تربیت کا انتظام ہو اور ان کی عملی زندگیوں میں اسلامی روح پیدا ہو جائے۔ بغور جائزہ لیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تبلیغی جماعت نے اسلامی ریاست کے لیے لاکھوں مہذب شہری فراہم کیے ہیں جن کے اعمال کے ساتھ اخلاق بھی اعلی ہیں۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور پوری دنیا میں اسلام کا اصلی پیغام عام آدمی تک جس انداز میں تبلیغی جاعت اور اس کے بزرگوں نے پہنچائی ہے اس کی مثال ماضی قریب میں کہیں پر بھی نہیں ملتی۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ تبلیغی جماعت عام آدمی کے لیے ایک عظیم دینی درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ ہے جہاں سے ہر کوئی مے کشید کر سکتا ہے ۔یہ جماعت پوری دنیا میں اسلام کی نشرو اشاعت اور اخلاق حسنہ کی ترویج کا سب سے سستا اور مشہور سرچشمہ ہے۔ یہ ایک ایسا چشمہِ صافی ہے جس کی نلیاں مغرب تا مشرق جنوب تا شمال پھیلی ہوئی ہیں۔اس چشمہ کی ایک خاص انفرادیت ہے۔اس کا دائرہ فیض و محبت کسی حد کا محتاج نہیں بلکہ عرب

وعجم میں بلا تفریق مذہب و مسلک ، رنگ و نسل اور غریب و امیر اس کا فیض پہنچ رہا ہے
۔

اس جماعت کے ایک عظیم روحانی پیشوا حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب اٹھارہ مئی دوہزار چودہ کو علی الصبح دہلی میں اللہ کے پیارے ہوئے ہیں۔ حضرت نے پسماندگان میں تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں چھوڑی ہیں مگر سچی بات یہ ہے انہوں نے لاکھوں متبعین و سالکین ااور اہل دل و درد چھوڑے ہیں۔آج ان کے انتقال پر ملال پر ہر آنکھ اشک بار ہے۔ان کی دینی خدمات صدیوں تک یاد رہیں گی اور جب تک قیامت بپا نہیں ہوتی ان کا روحانی و تبلیغی فیض انسانیت کو پہنچتا رہے گا۔جب بھی تبلیغی جماعت کی تاریخ مرتب کی جائے گی مولانا زبیر الحسن کا نام سرفہرست ہوگا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ راحتیں و لذتیں نصیب کرے۔آمین

نئے فضلاء کرام، متوجہ ہوں

دینی مدارس و جامعات ہوں یا کالج و یونیورسٹیاں جو کبھی طاقت کا سرچشمہ اور بھرپور زندگی کے مراکز اور حیات نو کی نوید ہوا کرتیں تھیں بالخصوص دینی مدارس اور اسلامی جامعات مسلم امہ کیلئے ہر پریشانی، غم، دکھ، مصیبت اور تکلیف میں خضر راہ ہوا کرتیں اور جہاں سے انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوا کرتیں تھیں۔اپنے تو اپنے غیر بھی ان کا دَم بھرتے نہ تھکتے تھے، انکی علمی، تحقیقی،اعتقادی، نظریاتی، ذہنی، فکری، قلبی،ذوقی، روحانی،اور عملی مثالیں دی جاتیں۔ماضی قریب کے چند نام ملاحظہ ہو جن کا دم بھرتے دنیا نہیں تھکتی ہے، مثال کے طور پر حضرت

نانوتوی،گنگوہی،مدنی، تھانوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر عثمانی، بنوری، بخاری، لاہوری،ہزاروی، مفتی شفیع عثمانی، مفتی محمود، مولانا عبدالحق اور مفتی رشید احمد لدھیانوی اور یوسف لدھیانوی قدس اللہ اسرارہم قابل ذکر ہیں۔مگر آج افسوس کے ساتھ کہنا اور لکھنا پڑتا ہے کہ انہی اداروں سے وابستہ حضرات وفضلاء مایوسی،افسردگی پژمردگی اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔

یہ بات ہم پر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آج دینی مدارس و جامعات کی تعداد

میں، انکے طلبہ و طالبات کی تعداد میں، درس وتدریس کی تعداد میں، لائیبریریوں اور کتب خانوں کی تعداد میں اور بالخصوص جدید طرز کی نئی نویلی بلڈنگوں اور بلند و بالا عمارتوں کی تعداد و چمک میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی نبض سست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے۔ علمی و عملی بے راہ روی ہے۔ نظم و ضبط کا فقدان ہے،زمانے کے تقاضوں سے عاری اور غیروں کی تقلید کے پجاری ہیں۔ کوئی حساس، درد منداورانسانیت کیلیۓ نرم دل رکھنے والا کبھی کبھی اسطرح نکل جاتا ہے تو اسکا دل گھٹنے لگتاہے۔مایوسی کے بادل چھا جاتے ہیں۔پچیس ہزار مدارس و جامعات میں بہت ہی کم تعداد میں ایسے مدارس ہونگے کہ شاید ان کا نظم و ضبط مثالی ہو ورنہ تو سچی بات یہ ہے کہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔

خدارا! آپ برا نہ مانیں، ان زمینی حقائق اور واقعات و حوادثات کو قبول کیجیۓ اور ان سے نبرد آزما ہونے کا سوچیں۔آپ کی خدمت میں گزارش کرنے والا کوئی غیر نہیں آپ ہی کے صفوں میں سے ایک ادنی طالب علم ہے۔جو بات اپنائیت میں دل سے کہی جائے تو اثر ضرور رکھتی ہے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ عرصہ دراز سے مدارس و دینی جامعات ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔ اکابر و سلف کے تمام اوصاف حمیدہ سے آئے دن نابلد ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں آنکھیں کھول کر، کلیجہ تھام کراور دل پر پتھر رکھ کر سننے ،کہنے اور لکھنے

کی ہمت کرنی چاہئے اور برملا اعتراف کرنا چاہیے۔ کہنے والے نے کہاں تک حقائق کی منظر کشی کی ہے۔اس کو دل پر ہاتھ رکھ کر خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر پڑھ لیں۔ بہت کچھ عیاں ہوگا۔

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک

نہ زندگی نہ محبت،نہ معرفت نہ نگاہ

یہاں یہ بات واضح ہو جائے کہ میرے مخاطب دینی مدارس و جامعات کے طلبہ بالخصوص نئے فضلاء کرام ہیں قطع نظر اس کے کہ عصری اداروں کی بات کی جائے۔ وہاں کا انتظام انصرام تو حکومت کے پاس ہے اور حکومتی اداروں کی زبوں حالی سے کون واقف نہیں۔ اور نہ ان عصری تعلیمی اداروں کے ساتھ دینی مقدس اداروں کا تقابل کروانا ہے۔ کیونکہ ان کی ساکھ و بنیاد مادیت پر ہے جبکہ مدارس و جامعات کی بنیاد روحانیت پر ہے۔

آپ کیلئے یہ قابل فخر بات ہے کہ آپ کا نظام تعلیم کا ایک سرا نبوت سے ملا ہوا ہے اور دوسرا سرا زندگی سے جو نبوت کے چشمہ صافی سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے ان کشت زاروں، ویرانوں صحراؤں اور بیانوں بیں ڈالتا ہے، وہ اگر اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت اور سرسبز وشادابی سوکھ جائیں اور انسانیت تباہی کے دہانے کھڑی ہو جائے۔ میں آپ سے دستہ بستہ عرض کرونگا کہ آپ ان الفاظ

پر غور کریں کہ آپکی نسبت و علمیت کا ایک سرا نبوت اور ایک زندگی سے ملتا ہے۔ یہی آپ کے کام کی اہمیت، نزاکت افادیت، حساسیت اور آپ کی عظمت و منزلت کا ببانگ دہل اعلان اور دلیل و برہان ہے، آپ کے دل کو اپنی عظمت اور اہمیت پر فخر سے لبریز ہونا چاہیے۔

یہ بات بڑی دلخراش حقیقت ہے اور منظر بڑا افسوس ناک ہے کہ جو سوچ، فکر، ہنگامے، انتشار و اضطراب، تشدد و نالائقی اور مادیت پرستی سرکاری کالجز و یونیورسٹیوں اور دنیاوی تعلیم گاہوں میں نامعقول اور کہنہ مشق سمجھے جانے لگے ہیں وہ یہاں باریاب ہیں۔ (مجھے ذاتی طور پر اسکا مشاہدہ ہوا ہے) اور جن لوگوں کو زمانے کا امام، لیڈر، قائد، محتسب، خود صاحب دعوت و عزیمت اور خود صاحب مقام ہونا چاہیے تھا وہی آج انہی یونیورسٹیوں، عصری اداروں اور الحادی انسٹیٹیوٹ اور لادینی و لامذہبی درسگاہوں کا متبع، مقلد اور ہمنوا ہونے پر فخر کر رہے ہیں اور پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ یہ آج کا سب سے بڑا فتنہ، طاعون اور احساس کمتری ہے جو گھن کی طرح اپنا کام دکھاتا ہے اور ہماری بنیادوں کو متزلزل کرتا جا رہا ہے اور ہمارے پاس اس کے تدارک کا کوئی پلان نہیں۔

دینی مدارس و جامعات میں تعلیمی سال آخری مراحل میں ہے، ہزاروں طلبہ و طالبات دستار فضیلیت سے مزین ہونگے اور اپنے تعلیمی دور کے اختتام کو

پہنچیں گے۔ ناچیز اس طویل تعلیمی سفر کو ''محبتوں کا طویل سفر'' سے تعبیر کرتا ہے۔ محبتوں کے اس طویل سفر میں کسی نے اٹھارہ سال لگائے ہیں اور حفظ قرآن سے لیکر مختلف تخصصات (اسپیسلائیزیشن) تک کی تعلیم حاصل کی ہے اور بعضوں نے 10اور 8 سال کے طویل دورانیہ میں‌دینی مدارس و جامعات کے بوریہ ،16،12 نشیں علماء سے کسب فیض کیا ہے اور انکے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا ہے۔اب ان فارغ التحصیل طلبہ کی اکثریت کو اپنا مستقبل کی فکر لگی ہوئی ہے۔ ان میں بعض دور اندیشوں نے طالبعلمی میں ہی اپنے لیئے اہداف اور ٹارگٹ چن لیئے ہیں، ان میں بعض درس و تدریس اور فن خطابت میں اپنی جولانیاں دکھلانا چاہتے ہیں، کوئی اپنے ذاتی کاروبار کو وسعت دیکر بلامعاوضہ دینی خدمات انجام دینا کا سوچ رہا ہے۔ کوئی دعوت تبلیغ وجہاد اور دعوت اصلاح و تزکیہ کا بیڑہ اٹھانے کا پر تول رہاہے۔ کوئی آج کے دور کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دینی مدرسہ اور اسکول وکالج کھولنا چاہتاہے۔ یہ تعداد بہت کم مقدار میں ہے۔ نئے فضلاء میں بہت سارے حیراں و سرگرداں ہیں،انکی تعداد ہزاروں میں‌ہے۔ انکے سامنے کوئی واضح ہدف و ٹارگٹ اور مستقبل کا کوئی پلان نہیں ہے۔ یقیناً یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دوران تعلیم غیر نصابی اور لااُبالی کاموں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کیاہے اور اب خون کے آنسو رو رہے ہیں کیونکہ منظر دھندلایا ہوا ہے، کشتی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔یقیناً ایسے فضلاء رہنمائی کے محتاج ہیں اور انکی صحیح سمت گائید کی اشد ضرورت ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ایسے تمام

فضلاء اور وہ بہترین صلاحیتوں والے فضلاء جو صرف درس نظامی کے کورس سے فارغ التحصیل ہیں کو مخاطب کرتے ہوئے چند طالب علمانہ گزارشات انکی خدمت پیش کریں گے اس امید کے ساتھ کہ وہ ہماری باتوں کو سنجیدگی سے لیں گے۔

یہ بات کسی بھی طور کسی بھی صاحب فکر اور دانشمند آدمی پر مخفی نہیں ہے کہ آج اسپیشلائیزیشن (تخصصات) کا دور ہے۔ایک زمانہ تھا کہ اگر کوئی بی اے یا ایم اے کرتا تو فخریہ طور پر اپنے نام کے ساتھ '' بی اے فلاں'' یا ''ایم اے فلاں'' لکھتا اور اسی طریقے سے کوئی ایم بی بی ایس کرتا تو پھولے نہ سماتا مگر آج فضا یکسر بدل گئی ہے۔ بی اے، ایم اے اور ایم بی بی ایس کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز کر گئی ہے کسی بھی معروف ادارے میں ان کو کوئی خاطر خواہ پروٹوکول نہیں دیا جاتا کیونکہ آج اسپیسلائیزیشن کا دور ہے۔آج ایم بی بی ایس کے پانچ سالہ کورس کے بعد کسی خاص شعبے میں اسپیسلائیزیشن نہ کریں تواسکو کوئی نہیں پوچھتا۔ بی اے اور ایم اے کی ڈگری ہاتھوں میں لیئے آج لاکھوں نوجوان بیروزگاری کا شکار ہیں اور در در کے ٹھوکرے کھارہے ہیں اگرانہیں کوئی جاب ملتی بھی ہے تو ان کے اسٹیٹس کے مطابق نہیں ہوتی کیونکہ آج اسپیسلائیزیشن کا دور ہے۔

ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد طلبہ وطالبات ایم ایس، ایم فل، پی ایچ ڈی

یا اپنے سبجیکٹ میں کوئی اسپیشل کورس ضرور کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

بالکل یہی صورت حال دینی مدارس و جامعات کے فضلاء کے ساتھ بھی ہے۔اس سال وفاق المدارس العربیہ سے ۵۷ہزار حفاظ اور ۱۵ہزار سے زائد علماء سند فراغت حاصل کر رہے ہیں۔کل اگر یہ کسی شعبہ سے منسلک ہو کر دینی خدمات انجام دینے کا ارادہ کرکے کسی ادارے کا رخ کرتے ہیں تو ان سے پہلا سوال تخصصات کے متعلق کیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تخصصات کروائے کہاں جاتے ہیں تو آیئے ہم آپ کو چند تخصصات کروانے والے مدارس وجامعات کی نشاندہی کرواتے ہیں اور اس حوالے سے آپ اپنے اساتذہ و شیوخ سے بھی بہتر رہنمائی لے سکتے ہیں۔جن دوستوں کو افتاء نویسی کا شوق ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ مفتی بن کر اس میدان میں قابل قدر خدمات انجام دینا چاہتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ ملک کے تمام بڑی دینی جامعات بالخصوص جامعہ دارالعلوم کراچی، جامعہ فاروقیہ، جامعۃ الرشید، جامعہ بنوریہ، علامہ بنوری ٹاؤن، جامعہ اشرف المدارس، یاسین القرآن، جامعہ انوارالقرآن، جامعہ اشرفیہ

لاہور، خیرالمدارس، جامعہ نصرۃ العلوم، جامعہ امدادیہ، جامعہ مخزن العلوم، جامعہ عبداللہ مسعود، دارالعلوم کبیر والا، جامعہ باب العلوم، جامعہ فریدیہ، جامعہ محمدیہ، دارالعلوم حقانیہ، تعلیم القرآن راولپنڈی، جامعہ عثمانیہ پشاور، مفتی احمد ممتاز صاحب اور دیگر جامعات

میں بہترین تخصص فی الفقہ کروایا جاتا ہے۔ اس طرح حدیثی ذوق رکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ جامعہ فاروقیہ، دارالعلوم کراچی اور علامہ بنوری ٹاؤن کا رخ کریں۔

عربی زبان قرآن و حدیث اور اسلامی علوم کا اصل ماخذ ہے اور عربی زبان اس وقت زندہ اور طاقتور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج اور شباب پر ہے، وہ تصنیف و تالیف، تحقیق و ریسرچ، خطابت و تقریر، سیاست و صحافت، علم و فلسفہ اور دستور و قانون کی زبان ہے۔ کوئی بھی صائب رائے آدمی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ عربی زبان پر مکمل دسترس اور عبور رکھے بغیر قرآن و حدیث اور اسلامی علوم وفنون پر مہارت تامہ حاصل ہوتا ہے۔ آج کے عالمی منظف پر عربی زبان پورے طور پر نکھر گئی ہے، آج لاکھوں اخبارات و جرائد اور ویب سائٹ عربی زبان میں اپنے جوبن پر ہیں۔ ہمارے ہاں ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوئی ہے کہ عربی کی کوئی خاص ضرورت نہیں، بڑے بڑے علماء عربی نہیں جانتے مگر انکا نام و کام جاری ہے، تو عرض ہے کہ یہ دھوکہ اور فریب ہے، زمینی حقائق بتلاتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں۔ تو عربی ادب و انشاء اور تحریر و تکلم کے حوالے سے عربی ادب کے نامور استاد ادیب لاریب مولانا ولی خان المظفر بہت متحرک ہیں، انکی نگرانی میں ملک میں کئی عربی لینگویج سینٹر اور عربی ادب کے تخصصات ہو رہے ہیں۔ صاحب ذوق فضلاء ان سے ضرور رابطہ کریں۔ جامعہ فاروقیہ، جامعۃ الرشید، جامعہ فریدیہ میں بھی عربی کے تخصصات شاندار انداز میں کروائے جاتے ہیں۔ کراچی کے مدرسہ ابن عباس میں سب سے بہترین تخصص فی

الادب العربیہ کا اہتمام کیا گیا ہے جہاں مصر اور سعودی عرب کا ماہر اساتذہ و شیوخ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور مبلّغ اسلام مولانا طارق جمیل صاحب کا مدرسہ بھی اس حوالے سے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

I.T یعنی کمپوٹر کی آج گلوبلائیزیشن کا دور ہے، اس دور کی سب اہم ضرورت انگلش اور تعلیم ہے۔ ہمارے فضلاء کرام کو آج کی دنیاکے تقاضوں کو سمجھنے کیلئے ان دونوں میں کماحقہ مہارت حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ آج کی دنیا کی اصطلاحات، انداز، باتیں، فکر و تخیّل کے زاویے، سوچ، نظریہ و فلسفہ اور انکی ٹرینالوجیز کو سمجھنے اور انکا منہ توڑ جواب دینے کیلئے انگلش زبان وبیان اور تحقیق وریسرچ پر مکمل عبور حاصل کرنا اور اپنے کاموں کو منظم کرنا، مدارس کے نظم و نسق کو مستحکم کرنا، حساب وکتاب، آڈیٹ، نتائج اور بہترین منیجمنٹ کیلئے اور اسطرح تحقیق و تصنیف اور مراجعت اور حوالہ جات کیلئے کا صحیح استعمال جز لاینفک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ عصری اداروں اور نجی انسٹیٹیوٹس کی بھاری بھر کم فیسوں کی ادائیگی کی استطاعت نہ رکھنے والے طلبہ و فضلاء اور دین طبقہ کیلئے دینی جامعات کے دور اندیش حضرات علماء نے انگلش اور کمپوٹر کے کورسز اور ڈپلومے ترتیب دیے ہیں اور قناعت کے ساتھ مفت میں بہترین تعلیم دے ہیں، جامعۃ الرشید، اور جامعہ عمر کراچی میں ایک سالہ انگلش ڈپلومہ ممتاز اساتذہ کی نگرانی میں بھرپور محنت کے ساتھ

کروا جاتا ہے اور ملک کے دور دراز علاقوں میں مفتی ابو لبابہ صاحب کے کئی شاگردان کی نگرانی میں انگلش لینگویج سینٹرز چلا رہے ہیں ،اب تک سینکڑوں فضلاء ان سے مستفید ہو چکے ہیں۔ استاد محترم نوار لبشر صاحب کی مدرسہ معہد عثمان بن عفان ہیں بھی عربی اور انگلش کا بہترین انتظام ہے۔اور بھی بہت سارے مدارس و جامعات ہیں جہاں جدید ہنر سکھائے جاتے ہیں۔راولپنڈی اسلام آباد کے مدارس و جامعات بھی مختلف جدید علوم کے کورس بڑے خوش اسلوبی سے ترتیب دے چکے ہیں۔ مولانا عدنان کاکاخیل صاحب بھی بہت متحرک ہیں۔

جدید علوم و فنون اور اقتصادیات کے حوالے سے جامعۃالرشید میں بہترین تعلیم دی جاتی ہے ، علماء کرام اور دین دار طبقہ کیلئے بی بی اے {B.B.A} اور ایم بی اے {M.B.A} کی ڈگریاں کروائی جاتی ہیں۔آج مسلمانوں کیلئے سب سے بڑے چیلنج اقتصادیات اور میڈیا ہیں۔ جو فضلاء بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں، معیشت اور بینکنگ کا ذوق بھی رکھتے ہیں اور مستقبل میں اس میدان میں خدمات انجام دینے کے متمنّی ہیں وہ جامعۃ الرشید اور دارالعلوم کراچی سے بی بی اے ، ایم بی اے اور بینکنگ کے دوسرے کورسز کی تعلیم ضرور حاصل کریں۔ تصنیف وتالیف کے حوالے سے بڑی جامعات کے دارالتصانیف سے استفادہ کیا جاسکتا ہے بالخصوص جامعہ فاروقیہ، جامعہ ابوھریرہ اور دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مبتدی مصنّفین کیلئے بہترین تربیت کے عوامل موجود ہیں۔ جدید صحافت اور کالم

نگاری میں روز نامہ اسلام اور اسکے برادر مطبوعات نے ایک نئی داغ بھیل ڈالی ہے، سینکڑوں طلبہ و فضلاء استفادہ کرچکے ہیں اور مزید محنت جاری ہے۔ تحریر میں سلاست و سادگی، پختگی اور دلکشی پیدا کرنے کیلئے ان سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔الشریعہ اکیڈمی میں مولانا زاہد الراشدی صاحب کی نگرانی میں مغربی افکار کا مکمل تعارف، عالمی انسانی حقوق کے عالمی منشور کا پس منظر اور پیش منظر کا ناقدانہ جائزہ اور نام نہاد جدیدیت کی تردید کے حوالے سے بہترین فکری و نظریاتی کام ہو رہا ہے۔صوت الاسلام کراچی والے بھی فضلاء کیلئے مختلف تربیتی پروگرام تشکیل دے چکے ہیں،اور بالکل نئے خطوط اور مقتضائے حال کے مطابق ان کا کام جاری ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کا کام پورے ملک بشمول کشمیر و گلگت بلتستان پھیلا ہوا ہے۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے گلگت بلتستان کو نظر انداز نہیں کیا۔

اور ان مذکورہ اداروں کے علاوہ بہت سارے ادارے قناعت کے ساتھ جدید علوم وفنون کے چھوٹے بڑے کورسز کروا رہے ہیں۔جو فضلاء مذاہب باطلہ کی سرکوبی اور راہزن کے روپ میں دین اسلام کا چہرہ مسخ کرنے والوں کا مقابلہ اور ان سے مناظرہ و مباہلہ کرنا چاہتے ہیں وہ استادی المحترم ڈاکٹر منظور مینگل، مولانا الیاس گھمن، مولانا رب نواز حنفی سے رشتہ تلمذ جوڑ سکتے ہی اور قاضی مظہر حسین،علامہ نعمانی،علامہ تونسوی، علامہ حیدری شہید اور علامہ صفدر اوکاڑوی صاحب کے جانشینوں اور شاگردوں سے رابط اور استفاد کیا جاسکتا ہے۔جو فضلاء تکملہ کتب کرنا چاہتے ہیں دارالعلوم

حقانیہ، اور کوہستان اور ضلع دیامر کے علماء سے علوم وفنون کی تمام کتابیں اپنی استطاعت اور ذوق کے مطابق درساً درساً پڑھ سکتے ہیں اور اپنی علمی تشنگی بجھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ حفاظ کرام سے گزارش ہیکہ وہ قرآن کریم کو صحیح تجوید و قرآت کے ساتھ پڑھنے کیلئے ضرور وقت نکالیں، انکے لیئے جامعۃ دارالعلوم، جامعۃ الرشید، دارالقرآن، قاری احمد میاں تھانوی کی مدرسہ دارالعلوم اسلامیہ، دارالعلوم مدنیہ لاہور اور دیگر مدارس و جامعات میں تجوید و سبع عشرہ کا اہتمام ہے۔ بہر صورت ہم نے اپنی دانست کے مطابق مذکورہ بالا چند مقامات کی نشاندہی کی ہے ویسے بھی دینی مدارس و جامعات میں ایک رجحان ہے کہ طلبہ فراغت کے بعد اپنے آپکو اپنے دور اندیش اساتذہ و شیوخ کو سونپ دیتے ہیں اور وہ انکو جہاں چاہیے انکی استعداد اور ذوق کے مطابق تشکیل کر دیتے ہیں، انکے لیئے مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ یہ ایک قابل مبارک سلسلہ ہے جس کے شاندار اور دورس نتائج برآمد ہو رہے ہیں اللہ جل وعلا کے حبیب بھی اپنے جانثار صحابہ کو انکی استعداد اور قابلیت کے مطابق ذمہ داریاں سونپتے اور جہاں انکی ضرورت پڑتی تشکیل فرماتے۔ اسی طریقہ نبی میں امت کی بھلائی ہے اور ہمارے اسلاف و اکابر میں بھی یہی طریقہ جاری رہا ہے اور اسکے واضح اور قابل رشک نتائج و اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

مدارس وجامعات کے فضلاء اگر صاحب ثروت ہیں تو اپنے تعلیمی سفر کو فراغت تک

محدود نہ رکھیں بلکہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں اور ضروریات اور انکے انداز و اطوار اور سسٹم کو سمجھنے کیلئے عصری درسگاہوں کارخ ضرور کریں، اگر کوئی گریجویٹ ہے تو کسی اہم سبجیکٹ میں ریگولر ماسٹر کریں اور اگر پوسٹ گریجوٹ ہے تو ایم ایس، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی کوشش کریں اور اگر کوئی L.L.B کرنا چاہتا ہے اور یہ نیت رکھتا ہے کہ وہ اس میدان میں اسلام، علماء ومدارس اور دینی تحریکات کی خدمت کرسکتا ہے تو بھی بہت ہی مستحسن ہے۔

یہ ہم سب پر عیاں ہے کہ ہر زمانے کی عقلی سطح اور اصطلاحات کے مطابق دین کی ترجمانی اور تشریح اور دینی حلقوں کا دفاع کرنا اور اس زمانے کی نفسیات وضروریات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے تو آپ کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے کیلئے زمانے کی تمام ٹرمینالوجیز، اصطلاحات، نقطہ ہائے نظر، رجحانات، فلسفہ کی موشگافیوں، عقلیات کی دقیقہ سنجیوں، بدلتے اطوار وافکار کو کماحقہ سمجھنا ہے۔ آج آپ نے نئے دلائل، نئے اجتہاد، نئے طرز استدلال اور تازہ دماغی اور بیدار مغزی کے ساتھ امام ابوالحسن اشعری، امام محمد شیبانی، امام رازی، امام غزالی، شاہ ولی اللہ، مجدّد الف ثانی اور نانوتوی کا کردار ادا کرنا ہوگا اور وقت کے تمام تر اسلحہ سے لیس ہو کر اہلسنّت والجماعت کا مذہبی، مسلکی، نسبتی اور علمی تفوّق کو قائم ودائم رکھنا ہے مگر ایک بات یاد رکھے آپ جس شعبہ میں بھی کام کریں، وقت کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق جہاں کہی بھی جائیں

مگر یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ آپ کے پاس حقائق و عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سرمایہ ہے اس وابستگی سے آپ پر چند بھاری ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں کہ آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہیے،آپ میں وہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہیے کہ دنیا کی کوئی طاقت، دلیل، کوئی لالچ، کوئی گروہ، کوئی باطل آپ کو اپکے عقائد اور آپکی اصل سے ذرہ برابر بھی ہٹا نہ سکے۔ استادالمشائخ حضرت شیخ الحدیث استاد محترم مولانا سلیم اللہ خان دامت فیوضہم ہمیشہ اپنے ملفوظات میں اکثرایک بات کہا کرتے ہیں کہ ''میں عقائداوراصول ونصوص میں اپنے اکابر علماء دیوبند کا اندھاپیرو و مقلّد ہوں'' آپ بھی اس اصول اور ضابطہ کو اپنی حیات مستعار کا جز لاینفک بنائیں اور اپنے اصل و مرکزکے ساتھ پیوستہ رہے تو زندگی کے ہر میدان اور موڑ میں کامیابی آپ کے قدم چوم لے گی۔ بس یوں سمجھ لے میرے دوست کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ، اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مولانا عطاء الرحمان کا دورہ گلگت، تلخ حقائق

جمیعت علماء اسلام گلگت بلتستان کے 2014ء کے انتخابات انتہائی خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچے۔ انتخابات کے انعقاد کے لیے سابق وفاقی وزیر اور جے یو آئی صوبہ خیبر پختون خواہ کے امیر مولانا عطاء الرحمان ممبر قومی اسمبلی (برادر صغیر مولانا فضل الرحمان) اپنے رفقاء کے ہمراہ تین روزہ دورہ کے لیے گلگت تشریف لائے تھے۔ جے یو آئی کے تحصیل اور ضلع سطح کے انتخابات تو کافی دن پہلے ہوئے تھے تاہم یہ انتخابات پورے گلگت بلتستان سطح کے تھے۔ ان میں جے یو آئی گلگت بلتستان کے صدر اور جنرل سیکرٹری نے منتخب ہونے تھے۔ صدارت (امارت) کے لیے مولانا سرور شاہ (ممبر گلگت اسمبلی) بلامقابلہ منتخب ہوئے جبکہ جنرل سیکرٹری (ناظم عمومی) کے لیے مولانا عطاء اللہ شہاب (ممبر جی بی کونسل) اور میر بہادر کے درمیان ووٹنگ ہوئی جس میں مولانا شہاب کے مقابلے میں میر بہادر کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ مولانا لقمان حکیم سرپرست اعلیٰ جبکہ مولانا قاضی عنایت اللہ (چیئرمین دیامر گرینڈ جرگہ) مولانا حق نواز (بلتستان) اور حاجی محمد عظیم (دیامر) کو سرپرستی کا فریضہ سونپ دیا گیا۔ سال 2014ء کو جے یو آئی کے لیے گلگت بلتستان میں ریکارڈ رکنیت سازی ہوئی۔ 59 عمومی ممبران منتخب ہوئے جن

دیامر، 4استور، 4بلتستان، 19 گلگت اور ایک غذر کا ممبر منتخب ہوا۔ تین سو افراد کی 28 رکنیت سے ایک عمومی کا ممبر بن جاتا ہے۔ اٹھارہ ہزار کے قریب پڑھے لکھے نوجوان اور باشعور عوام نے جے یو آئی میں رکنیت اختیار کی۔ ابھی مرکزی کابینہ اور مجلس عاملہ نے تشکیل پانا باقی ہے۔

یہ ایک خوش کن خبر ہے مگر اس کے ساتھ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جے یو آئی گلگت بلتستان میں بھی دو دھڑے قائم ہو چکے ہیں۔ جلد یا بدیر یہ ذاتی اختلافات طول پکڑ سکتے ہیں۔ کچھ باخبر ذرائع سے ایسی مصدقہ اطلاعات ملی کہ جماعت میں اختلافات الیکشن سے تین مہینے پہلے شروع ہوئے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ اختلافات شخصی عہدوں کی وجہ سے ہوئے حالانکہ جمیعت علمائے اسلام کا منشور اس بات کی قطعی نفی کرتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بھی عہدہ کے لیے اپنے آپ کو پیش کرے۔ اور نہ ہی منشور اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ عہدہ ہمیشہ کے لیے ایک ہی سرکل میں گھومے۔ یہ حقیقت بھی اٹل ہے کہ جہاں زیادتیاں ہونگی، ناانصافیاں اور شخصی مفادات کی آبیاری ہوگی وہاں تبدیلیاں اور بغاوتیں جنم لیں گی، بقول شخصے جہاں عہدے ملیں گے وہاں ایسا ہونا فطری ہے۔ جے یو آئی ایک فکر، نظریہ اور تحریک کا نام ہے۔ اس کے پیچھے ایک انقلابی سوچ ہے۔ میری تمام ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ ذاتی اور شخصی مفادات کے لیے اس خوبصورت پس منظر کو زک نہ پہنچائے اور کمال وسعت ظرفی اور حکمت عملی سے

تمام احباب کو یکجا کیا جائے۔ میرے لیے ذاتی مسرت کا امر یہ ہے کہ بلتستان سے اس دفعہ زبردست رکنیت سازی ہوئی۔ وہاں کے علماء نے الیکشن اور سیاسی حرکیات میں بھرپور حصہ لیا۔ انہیں کابینہ اور مجلس عاملہ و شوریٰ میں مناسب بلکہ کچھ زیادہ ہی نمائندگی دی جانی چاہیے تاکہ انہیں اپنی موجودگی کا احساس بھی ہو اور پولیٹکل ایکٹیویٹیز میں کوآرڈینیشن بھی ہو۔

مولانا عطاء الرحمان چار دفعہ گلگت بلتستان کا تفصیلی دورے کر چکے ہیں۔ 2000ء میں جماعتی امور کے حوالے سے گلگت آئے تھے تو ان کے رفقاء میں قاضی حمید اللہ جان (ممبر قومی اسمبلی) جیسے اہل علم بھی تھے۔ کے کے ایچ میں طویل سفر سے تھکن میں چور ہو کر گلگت پارک ہوٹل میں فروکش تھے تو اسی رات لوکل انتظامیہ نے انہیں گرفتار کرکے راتوں رات علاقہ بدر کیا۔ یہ تھی مشرفی آمریت کی مہربانیاں۔ 2009ء کے لوکل انتخابات کی کمپئین کے لیے بھی انہوں نے گلگت بھر کے دورے کیے۔ جس کی بدولت جے یو آئی، گلگت بلتستان کی دوسری بڑی پارلیمانی پارٹی بن گئی۔ مولانا عطاء الرحمان کا کہنا ہے کہ '' ان کا حالیہ دورہ بہت اچھا رہا۔ ذمہ دار لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی۔ گلگت بلتستان کے تمام جماعتی ممبران سے تفصیلی نشستیں ہوئی۔ اپنے مسائل مل بیٹھ کر بانٹنے کا ایک خوبصورت موقع ملا''۔ بقول ان کے کہ '' صدر اور جنرل سیکرٹری لائق اور مخلص کارکن ہیں۔ ان سے گلگت بلتستان میں جماعتی نظم و ضبط اور تعمیر و ترقی کے

لیے نیک امیدیں وابستہ ہیں۔ جے یو آئی کی حالیہ رکنیت سازی اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت ملک بھر کی طرح گلگت بلتستان میں پھیل رہی ہے اور اپنا وجود قوت کے ساتھ برقرار رکھتی ہے''۔ مولانا کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ الیکشن کے بجائے سیلکشن کے قائل بلکہ خواہش مند تھے مگر مقامی ساتھیوں کے اصرار پر انہیں مجبوراً صدر اور جنرل سیکرٹری کے لیے الیکشن کروانے پڑے،انہیں خوف تھا یا خوف دلایا گیا تھا کہ الیکشن کی صورت میں انتشار اور لڑائی جھگڑے کا قوی امکان ہے مگر گلگت بلتستان کے مجلس عمومی کے ممبران نے کمال حکمت سے الیکشن کا مرحلہ احسن طریقے سے پایہ تکمیل کو پہنچایا جس پر انھوں نے کہا'' جس نظم و ضبط سے انتخابات پایہ تکمیل کو پہنچے اس پر تمام کارکن اور عہدہ داران خراج تحسین کے مستحق ہیں''۔

قارئین ! وزیر اعلیٰ سید مہدی شاہ نے مولانا عطاء الرحمان اور انکی جماعت کے ایک بڑے وفد کو وزیر اعلیٰ ہاؤس میں عشائیہ کا اہتمام کیا جس پی پی پی کے ممبران اسمبلی بھی شامل تھے،۔ عشائیہ سے فراغت کے بعد رات گیارہ بجے وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچے تو میری ان سے ڈیڑھ گھنٹہ طویل ملاقات ہوئی ، جس میں گلگت بلتستان کی آئینی، قانونی، جغرافیائی، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حوالے سے بہت سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ آج کی محفل کا اصل عنوان یہی گفتگو ہے۔ آیئے ! ایک وفاقی سیاسی پارٹی کے مرکزی رہنماء گلگت بلتستان کے حوالے

سے کیا کہتے ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ '' سیلف امپاور منٹ اینڈ گورننس آرڈر 2009ء ایک انتظامی پیکج ہے، جس کے ذریعے یہاں کے لوگوں کو بااختیار بنانا ہے۔ حکومت پاکستان اور حساس ادارے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں کا صوبے کی طرف رجحان کیا ہے۔ ''صوبائی سیٹ آپ '' کے لیے ابھارنے کی ایک کوشش ہے۔ مکمل آئینی صوبہ اس لیے بھی ناممکن ہے کہ بین الاقوامی قراردادیں حائل ہیں۔ پھر یہاں کا قضیہ کشمیر کے ساتھ ایک قریبی تعلق ہے۔ اگر کچھ لوگ اس تعلق کی نفی کرتے ہیں تو پھر ان کے گروہی یا سیاسی مفادات ہو سکتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ گلگت بلتستان کی آئینی صوبے کی طرف پیش رفت کا معاملہ ہو یا پھر فاٹا طرز کا کوئی فارمولا پر غور کیا جانے پر، جمیعت علماء اسلام کی مرکزی قیادت گلگت بلتستان کی قیادت سے تفصیلی مشاورت کرے گی اور اگر پورے جی بی کی جے یو آئی اتفاق رائے سے کسی بھی فارمولے کو قبول کرتی ہے تو مرکزی قیادت ان کے ایجنڈے کا احترام کرتے ہوئے اس کو قوت سے آگے بڑھائے گی۔ یہاں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک بڑا طبقہ گلگت بلتستان کو کشمیر سے الگ کرکے پاکستان کا آئینی صوبہ بنانے پر مصر ہے اور اس سے بھی ایک بڑا طبقہ تمام تر قوت کے ساتھ گلگت بلتستان کو کشمیر کے ساتھ نتھی کرکے آئینی و سیاسی سرگرمیوں کا حامی ہے۔

اب جمیعت علماء اسلام اپنے جماعت کے ساتھ مشاورت اور

پھر تحقیق کرے گی کہ آیا یہاں کے عوام واقعی طور پر کشمیر کو بائی پاس کرکے پاکستان کا آئینی حصہ بننا چاہتے ہیں یا پھر کشمیر کو بھی ملا کر ایک زبردست اور مضبوط آئینی سیٹ آپ چاہتے ہیں۔ اگر گلگت بلتستان کی عوام پاکستان کا حصہ بننے کی خواہش مند ہے تو پھر جے یو آئی ان کی اس خواہش کا احترام کرے گی مگر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ آئینی صوبہ کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم کرنے، بیرونی ایجنڈے، یا پھر کسی اور قوت کے کہنے پر نہیں بنانے دیا جائے گا۔ ہم آنکھیں بند کرکے کسی کے پیچھے نہیں چل سکتے۔ جمیعت علماء اسلام کی مرکزی قیادت ایسے عوام اور علاقہ دشمن ایجنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔ جے یو ائی ایک اسلامی جمہوری سیاسی پارٹی ہے۔ یہ ہمیشہ عوامی امنگوں کے مطابق پالیساں بناتی ہے۔ عوام اور علاقہ دشمنی اور فرقہ واریت کے دلدل میں پھنسانے والی کسی بھی سوچ فکر اور طرز عمل سے ہمیشہ گریز کیا جائے گا اور وحدت کی بات کی جائے گی۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جے یو آئی نے ہمیشہ تمام مسالک کو ایک پلیٹ فارم میں جمع کیا ہے۔ ملک بھر میں جتنے بھی اسلامی پارٹیوں کا کسی بھی ایجنڈے پر اتفاق رائے قائم ہوئی ہے تو جے یو آئی اس میں سرفہرست رہی ہے اور قیادت بھی جے یو آئی کے ہاتھ میں ہی رہی ہے۔ پورے ملک میں بالعموم اور گلگت بلتستان میں بالخصوص، اگر ہم اتفاق رائے اور عوامی رجحانات سے ہٹ کر کوئی پالیسی بناتے ہیں، کوئی سٹریٹیجی اپناتے ہیں تو پھر قومی وحدت اور اتفاق رائے ایک مذاق بن جائے گا اور تنازعات پر مبنی ایک نہ

ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔۔ ہمیں خوب سمجھنا چاہیے کہ یہ وقت تنازعہ کا نہیں ۔ ہمیں ایک صفحے میں جمع ہو کر کوئی مشترکہ حکمت عملی اور نظام کو چلانے کے لیے متفق پلان تیار کرنا ہوگا۔وزیر اعلیٰ سید مہدی شاہ کو بھی ان کی مرکزی پارٹی کی ہدایت ہے اور انکی بھی یہی خواہش ہے کہ گلگت بلتستان یں باہمی یکجہتی اور قیام امن کے لیے تمام سیاسی و مذہبی وعلاقائی پارٹیوں کے ساتھ کوارڈینشن کی جائے اور مشترکہ حکمت عملی تیار کی جائے۔ اس حوالے سے وہ ابتداء جمیعت علماء اسلام سے کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہماری جماعت کے لیے نیک شگون ہے اور علاقے میں ایک خوبصورت پر امن ماحول کے لیے خیر سگالی کا پیغام بھی ہے۔ ہم نے ان کی دعوت پر لیبک کہا ہے اور میری جماعت کارکنوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنا بھرپور کردار ادا کریں ہر اس بات کو تسلیم کیا جائے گا جس میں ملک وملت اور علاقے کا مفاد شامل ہوگا۔ اور بدقسمتی سے یہ بھی یہاں دیکھنے کو ملا کہ کچھ لوگ شعوری اور لاشعوری طور پر علیحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔یقینا یہ غلط فہمیوں اور ناانصافیوں کا نتیجہ ہے۔ ایسے احباب کو محبت سے سمجھانے کی ضرورت ہے''۔ جمیعت کے اراکین اسمبلی و کونسل کی پانچ سالہ ''کارکردگی'' کے سوال پر مولانا نے سکوت اختیار کیا اور اس سوال پر بھی مکمل خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا کہ سیلف امپاور منٹ اینڈ گورننس آرڈ 2009ء بھی اہلسنت کش رہا ہے۔اور اہلسنت نے اس کے خلاف ملک بھر میں ریکارڈ احتجاج کیا ہے اور کئی روز شاہراہ

قراقرم کو بند کیا ہے۔جب جامعہ نصرۃ الاسلام کا ترجمان مجلّہ ''سہ ماہی نصرۃ الاسلام''
ان کی خدمت میں پیش کیا تو مولانا بے حد خوش ہوئے اور دعائیں دی۔ مولانا کیساتھ
کچھ خوشگوار باتیں بھی ہوئی اور کچھ ذاتی بھی ۔ اور کچھ مزید تلخ حقائق بھی سامنے آئے،
ان کو کسی اور مجلس کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

گلگت اسمبلی، مخلوط نظام تعلیم اور قراقرم یونیورسٹی

آج کل گلگت بلتستان میں ایک بحث طول پکڑ رہی ہے۔ گزشتہ دنوں گلگت اسمبلی میں ارکان اسمبلی نے قراقرام انٹرنیشنل یونیورسٹی میں مخلوط نظام تعلیم (Co-education) کو علاقائی رسم و رواج اور تہذیب و تمدن اور روایات کے متصادم قرار دے کر قراقرم یونیورسٹی میں طالبات کے لیے الگ کیمپس بنانے کی تجویز پیش کی۔ اسمبلی میں تمام اراکین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ واقعی طالبات کے لیے الگ کیمپس ہونا چاہیے۔ آمنہ انصاری نے تو یہ تجویز بھی دی کہ ہر ضلع میں طالبات کے لیے ایک کیمپس بنایا جائے۔ جیسے ہی یہ خبر اخباری دنیا سے نکل کر عوامی دنیا میں آئی تو ایک نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہوئی۔ ہر ایک نے اپنی دانست کے مطابق اس موضوع پر لب کشائی کی اور کچھ نے تو ہرزہ سرائی تک بھی کی۔ دل میں سوچا کہ کیوں نہ مختصراً اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے۔ سچ یہ ہے کہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ آج کی محفل میں مخلوط نظام تعلیم پر چند مختصر گزارشات پیش خدمت ہیں اس امید کے ساتھ کہ آپ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔

یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ مخلوط نظام تعلیم مغربی

استعماری اثرات کی پیداوار اور سماجی مسائل کا ایک اہم پہلو ہے۔ تعلیم ایک سماجی عمل ہے اور قومیں اپنی سماجی اعمال سے ہی پہچانی جاتیں ہیں۔ ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کے نام سے ہمارے اس سماجی عمل کا جنازہ نکالا گیا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم ذہناً، فکراً اور عملاً سیکولر بن چکے ہیں۔ ہماری اقدار ملیامیٹ ہوچکی ہیں، مسٹر اور مُلاکے نام سے جو تفریق گزشتہ ڈیڑھ صدی میں پیدا کی گئی ہے اس کا پاٹنا ناممکن نظر آ رہا ہے۔ مرعوبیت نے ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا ہے۔لادینی مغربی تصور علم و نظام تعلیم جو ہمارے لیے قطعاً غیر موزوں ہے نے ہمیں اوج ثریا سے زمین پر دے مارا ہے۔ ایک زمانے میں مغربی دنیا میں دو قسم کے تعلیمی ادارے تھے۔ سرکاری تعلیمی ادارے اور چرچ کے تعلیمی ادارے۔ سرکاری درسگاہوں میں تو مخلوط تعلیم تھی مگر چرچ کے تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم نہیں تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ چرچ کے تعلیمی ادارے معیار تعلیم و تربیت کے اعتبار سے سرکاری تعلیمی اداروں سے زیادہ بہتر اور اشرافیہ و حکمران طبقے کے لیے زیادہ کشش کا درجہ رکھتے تھے۔اسٹریلیا کا 1983ء تک یہی حال تھا۔

اس بات میں بھی دو رائے نہیں کہ تمام آسمانی مذاہب میں مخلوط تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں۔اسلام سمیت عیسائیت و یہودیت مخلوط نظام تعلیم کی فکری، نظری اور عملی پہلوں سے سخت تر مخالف ہیں۔الحمدللہ، مجھے اس موضوع پر کافی

تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ اس مختصر کالم میں ان تمام مسلم اور غیر مسلم تعلیمی ماہرین کی آرا کو جگہ دینے کی گنجائش تو نہیں مگر کوشش کرونگا کہ چند ایک کے حوالہ سے اپنی بات مکمل کروں۔ جان میکلاسکی (Jan Michalski) نام کے ایک عیسائی ماہر تعلیم ہے۔ ان کے مطابق سماجی و خاندانی نظام زندگی اور مختلف اصناف میں کافی ساری تفریق پیدا ہوئی ہے ،ہم جنسی تعلقات کو باقاعدہ شادی کا درجہ دیا گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عورت عورت نہیں رہی اور مرد مرد نہیں رہا جس سے خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھرتا گیا ہے۔ اس نظام میں چلنے والی نیو جنریشن ڈرگ کا استعمال، خمر کا عادی، خودکشی، شادی سے قبل حمل، پھر اسقاط حمل،زنا بالجبر جیسے ناروا کاموں کا موجب بنتی ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ مخلوط نظام تعلیم ہے۔ یہ مخلوط نظام تعلیم فطری قوانین کے عین خلاف ورزی ہے اور اسی مخلوط تعلیم کے برے اثرات پورے سماج میں پھیل جاتے ہیں۔ اس نظام کا کوئی علاج نہیں بجز اس کے اس کی مکمل بیخ کنی کی جائے۔علامہ ابن حزم ایک مشہور اسلامی اسکالر ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب طوق الحمامہ میں اس طرح کی مخلوطی نظام پر خوبصورت گفتگو کی ہے۔ مخلوط نشتوں سے ابھرنے والے عوارض و اسباب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ مخطوط مجالس اسلامی دنیا کے لیے اجنبی ہیں اور ان مخلوط مجلسوں سے ایسے رویہ پیدا ہوتے ہیں جو اسلامی سماج تو کیا کسی بھی مہذب سماج کے لیے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔اور اگر ہم سیکولر یا لبرل نقطہ نظر سے بھی جائزہ لیں تو یہ بات

باسانی سمجھ آجاتی ہے کہ مخلوط نظام تعلیم سے بہت سارے نفسیاتی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل وجود میں آتے ہیں جو گھمبیر ہونے کے ساتھ فساد کا موجب بھی بنتے ہیں۔ مخلوط نظام تعلیم سے پیدا ہونے والے چند نقصات کا ذکر مناسب لگتا ہے۔ اس نظام سے طلبہ و جنسی بے راہ روی،طالبات کی ،(Study distraction)طالبات مطالعاتی انتشار تعلیمی حق تلفی،خاندانی نظام کی تباہی، والدین کا اولاد پر عدم کنٹرول، طلاق کی بڑھتی شرح، ٹوٹے گھروں اور خاندانوں کے نہ ختم ہونے والے مسائل، معاشرتی و سماجی انتشار، اکیلی ماؤں کا کلچر، عدم برداشت، شوہر کو غلام سمجھنے کی روش، مخلوط کلاس میں استاد (مرد/ عورت) کا بعض موضوعات کھل کر بیان نہ کرنا اور ان جیسے ان گنت مسائل ہیں جو بڑھتے چلتے جاتے ہیں۔ڈیئر قارئین ! ایمانداری سے بتاؤ کہ ہمارے مخلوط نظام تعلیم میں کیا وہ سب کچھ طلبہ و طالبات کر نہیں گزرتے جو انہیں انڈین فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ رہی بات انٹرنیٹ کی جھولانیاں۔ بدقسمتی سے یہ سب کچھ گناہ سمجھ کر نہیں بلکہ فیشن سمجھ کر انجام دیا جاتا ہے۔

سماجی و معاشرتی زندگی میں عورت کو مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا دیکھنے اور لڑکی اور لڑکے کو باجود صنفی اختلاف کے ایک کلاس روم اور ایک یونیورسٹی میں تعلیم دلوانے والوں سے گزارش ہے کہ وہ قرآن کریم سے معلوم تو کریں کہ وہ کیا ارشاد کرتا ہے:

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض، للرجالِ''

نصیب مما اکتسبوا وللنسا نصیب مما اکتسبن، واسئلو اللہ من فضلہ ان اللہ کان بکل شی علیم ''یعنی اللہ تعالی نے تم میں سے ایک دوسرے کو جو فطری برتری عطا فرمائی ہے، اس کی تمنامت کرو! مردوں کے لیے ان کے اعمال میں حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال میں اور اللہ تعالی سے اس کا فضل و کرم مانگتے رہو، بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ (سورہ نساء آیت نمبر ۳۲)

ہم نے غریب مُلا کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ گردانا ہوا ہے جو قطعاً غلط ہے۔اس مخلوط نظام کی مخالفت صرف مُلا نے نہیں کی ہے بلکہ خدا، تمام انبیاء اور محمد رسول اللہ سے لے کر مصر کا جدید تعلیم یافتہ سید قطب، ہندوستان کے لسان العصر اکبر آلہ آبادی اور شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے جس قوت اور دلیل کے ساتھ اس نظام کی مخالفت کی ہے اور دلائل و براہین کے انبار لگائے ہیں وہ غریب مُلا کے حصے میں کہاں آئے ہیں۔اور تو اور گلگت اسمبلی کے تمام مسٹروں نے بھی اس مخلوط نظام تعلیم کو اپنا کلچر، روایات اور تہذیب و تمدن کے برعکس قرار دے کر غیر مخلوط نظام تعلیم کا مطالبہ کر دیا۔علامہ اقبال نے متعدد مقامات پر مخلوط سوسائٹی اور مخلوط طریقہ تعلیم پر انتہائی نفرت و بیزاری کا اظہار کیا ہے؛ چنانچہ ضرب کلیم میں ارشاد فرماتے ہیں۔ دل تھام کر سن لیں۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن

کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اس حقیقت میں بھی ابہام نہیں رہنا چاہیے کہ اسلام نے عورتوں کی تعلیم پر قدغن لگایا ہے۔ بلکہ اسلام اول دین ہے جس نے نہ صرف عورتوں کی تعلیم کی اجازت دی بلکہ میرے ناقص مطالعے میں سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ فاطمۃ الزھرۃ بہت بڑی عالمات و فاضلات تھیں اور اگر ان دونوں کا علم حدیث و قرآن اور فقہی مسائل کو الگ کر دیا جائے تو دین اسلام کے کئی اہم پہلو تشنہ لب رہیں گے۔ اور اسی طرح جماعتِ صحابیات اور بعد کی مسلم خواتین میں بلند پایہ اہل علم خواتین کے بے مثال ذکر سے تاریخ اسلام کا ورق ورق بھرا پڑا ہے؛ چنانچہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امہات المومنین میں حضرت عائشہ وحضرت ام سلمہ فقہ وحدیث و تفسیر میں رتبہ بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ تحقیق وتدقیق ودرایت کے میدان کی بھی اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب الاستعیاب میں حضرت ام سلمہ کی صاحبزادی زینب بنت ابو سلمہ جو سید العلماء جناب رسول اللہ کی پروردہ تھیں کے متعلق لکھا ہے کانت افقہ نساءِ اہلِ زمانِہا، یعنی وہ اپنے زمانے میں سب سے بڑی فقیہہ تھیں۔ اسلام صرف طریق کار کی مخالفت کرتا ہے، تعلیم وتدریس کی قطعاً نہیں۔ اور اسلام نے تمام جدید

علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی معروف کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں ''باب العلوم المستنطہ من القرآن'' کی ذیل میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں بہت ساری آیتوں سے مختلف علوم مستنبط ہوتے ہیں۔اس کی تفصیل درج بھی کی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خالص دینی علوم کے ساتھ رائج الوقت تمام ضروری علوم کی نہ اجازت دی بلکہ اپنے زمانے میں ان کی تدریس و حصول کو بھی ممکن بنایا اور بعد میں تمام اسلامی خلفاء کا بھی یہی حال رہا۔

بہر صورت بات نکلی تھی گلگت اسمبلی کے مطالبے پر، کہ قراقرام یونیورسٹی طالبات کے لیے الگ کیمپس بنائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقریبا ناممکن ہے۔کیونکہ ہمارا معاشرہ بشمول حکومت و ریاست) کو ایجوکیشن کے دلدل یں سر تا پا دھنس چکا ہے۔الگ) کیمپس کے قیام کے لیے بہت ساری دشواریوں کے ساتھ ایک بڑا بجٹ بھی انوال ہے۔ ہاں اگر گلگت اسمبلی، وزیر اعلی و گورنر، فورس کمانڈر، چیف سیکرٹری، وائس چانسلر قراقرم یونیورسٹی اور یونیورسٹی سینٹ ایک پیج پر جمع ہوجائے اور ہر ایک مخلصی سے کردار ادا کریں تو طالبات کے لیے الگ کیمپس بنانا بہت ہی سہل کام ہے۔ اس صورت میں صدر پاکستان اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن سے منظوری بھی آسانی سے لی جاسکتی ہے۔خاندانی نظام اور سماجی و اسلامی روایات کا جنازہ نکلنے سے پہلے مثبت اسلامی سوچ رکھنے والا ایک طبقہ

قوت کے ساتھ تحریک چلا کر ان تمام حکومتی و ریاستی اتھارٹیز کو مجبور کریں اور والدین کو بھی مخلوط نظام تعلیم کی تباہ کاریوں سے روشناس کرائیں تو بعید نہیں کہ گلگت بلتستان کی خواتین کے لیے الگ تعلیمی ادارے قائم نہ ہوں۔اور ہمارے مردوں کے ساتھ خواتین بھی علم نافع سے مستفید ہو سکیں۔آیئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیاری دعا کے ساتھ اپنی بات کی تکمیل کرتے ہیں۔ '' اللھم انی اعوذبک من علم لاینفع و من قلب لایخشع ''۔یعنی اے پروردگار عالم ! میں پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نافع نہ ہو اور اس قلب سے جو اللہ سے ڈرنے والا نہ ہو''۔اگر کوئی صاحب اس بحث کو مزید آگے بڑھانا چاہیے تو میں اس پر تفصیل سے لکھنے کے لیے خوشی محسوس کرونگا۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مولانا اصلح الحسینی کے ساتھ ایک ملاقات

الحمدللہ ! اپنے مشاغل کا ایک بڑا حصہ اکابر علماء دیوبند سے ملاقاتیں،ان سے انٹرویوز اور مرحوم اکابرین کی آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں پڑھنے اور جن جن سے ملاقاتیں ہوئی ہیں ان کے اوصاف حمیدہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود لکھنے کا اہتمام کرتا ہوں۔ اس خوبصورت مشغلے سے اپنی اصلاح بھی ہوتی ہے اور اکابر کی خدمات بھی کسی نہ کسی پیرائے میں عامۃ الناس تک پہنچتی ہے۔ ان ملاقاتوں میں ایک ملاقات سید الطائفہ حضرت مدنی کے ایک تلمیذ رشید کے ساتھ 14 جولائی 2010ء کو بروز بدھ کراچی میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں جامعہ فاروقیہ کراچی میں دورہ حدیث میں زیر تعلیم تھا اور ساتھ ساتھ یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیش (ایم اے صحافت) بھی کررہا تھا اور سہ ماہی خیر کثیر لاہور کے کافی سارے ادارتی کام میرے ذمے تھے، اس لیے اساتذہ کرام سے بڑی اچھی دوستانہ تھی۔ جامعہ فاروقیہ کے شعبہ تخصص فی الحدیث میں ایک نگران استاد تھے۔ ان کا نام مولانا ساجد صدوی تھا۔ میری غیر نصابی یعنی تحریری ایکٹیوٹیز پر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور ساتھ ساتھ میری باغیانہ سوچ پر برہم بھی ۔ اکثر و بیشتر مجھے سمجھاتے اور اکابر کی یادگار باتیں بھی سنایا کرتے تھے۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں میں پٹری سے کھسک نہ جاؤں۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ اگلے دن وفاق المدارس العربیہ

کے سالانہ امتحانات میں شمائل ترمذی کا پرچہ تھا۔ حضرت مولانا ساجد صاحب نے نماز کے بعد ہاتھ پکڑ کر کہا کہ چلیں، آج آپ کو ایک ایسے عالم دین سے ملاتا ہوں جو بہت بڑے ادیب، شاعر اور صحافی بھی ہیں۔ حضرت مدنی کے خادم خاص ہیں اور شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ماہنامہ الجمیعۃ انڈیا میں ادارتی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اس سب سے کرڑھ دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، شیخ الاسلام حضرت مدنی کے افکار و نظریات کے امین ہیں اور ان کے مرید خاص بھی۔ اپنے اندر ایک نرم دل رکھتے ہیں۔ امت کے لیے درد ہے۔ اس متعفن دور میں سیاسی آلائشوں سے اپنے آپ کو دور رکھ کر صرف دعوت و ارشاد کے لیے صرف کر رکھا اپنی زندگی کو۔ میں نے جب یہ سب کچھ سنا تو حضرت سے ملنے کے لیے بے تاب ہونے لگا مگر ظاہری تصنع اپناتے ہوئے کہا کہ حضرت کل پرچہ ہے کیا ہوگا، تیاری کرنی ہے۔ مولانا نے کہا کہ آپ کے لیے کونسا مشکل ہے۔ جو ذہن میں آیا لکھ ڈالو۔ کونسا تم نے سال بھر پڑھا ہے تو آج ایک رات میں پڑھ لوگے۔ خیر ہم ٹیکسی پکڑ کر حضرت مولانا اصلح الحسینی کی رہائش گاہ گلشن اقبال کی طرف چل پڑے۔ حضرت مدنی کے جن جن تلامذہ سے ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ بہت شاندار تھیں۔ دل میں ایک چھپا احترام تھا، اپنی ایک محبت تھی کہ حضرت مدنی کے شاگرد کیسے بے نفس لوگ ہیں۔ انہی خیالات میں مگن حضرت مولانا سید اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے سکونت پر پہنچ گئے۔ اللہ اللہ کیا دیکھتا ہوں کہ جامعہ علوم اسلامیہ علامیہ بنوری ٹاؤن کے استاد الحدیث و

نگران تخصص الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی صاحب ایک طالب علم کے ساتھ موٹر سائیکل پر تشریف لا رہے ہیں۔ میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کے اتنے ضعیف العمر اور صاحب علم و عمل انسان ایک طالب علم کے ساتھ موٹر سائیکل میں اتنا دور کا سفر کررہے ہیں۔ دل نے گواہی دی کہ یہی اکابر دیوبند کی خصوصیات ہیں۔ علیک سلیک کے بعد ہم سب مولانا اصلح الحسینی کے حجرہ خاص میں پہنچ گئے۔ بات چیت شروع ہوئی۔ مولانا ساجد صاحب نے حضرت سید الحسینی سے مجھ ناچیز کا اچھا تعارف کروایا اور ساتھ ساتھ دعا کی درخواست بھی کی۔ حضرت نے اپنے کانپتے ہاتھ اٹھا کر اللہ کے حضور دعا کی کہ '' اے اللہ ان طالب علم سے دین کا کام لیں''۔ مولانا سید اصلح الحسینی نے اپنے بیتے دنوں کی یادیں معطر کرکے ہماری سامنے رکھ دیں۔ حضرت مدنی کا ذکر کرکے رو پڑے۔ مجھ گناہ گار سے بھی آنسو نکلنے لگے۔ یہ مجلس بہت طویل ہوئی۔ نماز مغرب حضرت کے حجرہ میں مولانا ساجد صاحب کی اقتداء میں میں ادا ہوئی۔ حضرت الحسینی صاحب دارالعلوم دیوبند میں گزرے ایام بھی رقت آمیز انداز میں سناتے۔ تحریک ریشمی رومال، جمیعۃ الانصار اور جمیعۃ علماء ہند کی حسین یادیں اب تک ان کے دل ودماغ میں محفوظ تھیں وہ ان تمام اداروں ، پارٹیوں اور شخصیات سے کٹ کر محبت کرنے والے تھے۔ ماہنامہ الجمیعۃ کے حوالے سے کافی ساری باتیں مجھے خصوصی طور پر بتائی تاکہ میں ائندہ عملی صحافتی زندگی میں اکابر کی روش اختیار کرکے راہ مستقیم سے نہ ہٹوں۔ ہمارے اکابر اور اساتذہ کو فکر دامن گیر ہوتی

ہے کہ ان کے پیروکار اور متعلقین دینی علوم کے حصول کے بعد دنیاوی چکا چوند دیکھ کر اپنا اصل مشن اور مطلب چھوڑ کر، کہیں دور نکل جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات اتنا دور نکلتے ہیں کہ واپسی ممکن نہیں ہوتی ہے۔ایک بات میں نے اس مجلس میں خاص طور پر نوٹ کی کہ مولانا سید اصلح الحسینی اپنے باقیات (یعنی اولاد) کے دنیاوی انداز زندگی اور دین سے دوری پر حد سے زیادہ شاکی تھے۔ اس کا انہیں بے حد سخت قلق تھا۔ مولانا رحمہ اللہ اتنی اچھی اردو بولتے تھے کہ دل کرتا تھا سنتے چلے جاؤ، دوران گفتگو عربی اور فارسی کے اشعار بھی پڑھتے تھے۔ کراچی میں دینی خدمات کے حوالے سے اور مدارس کے کردار کے حوالے سے بھی بہت خوش نظر آرہے تھے۔ بے راہ روی اور بے حیائی پر دل گرفتہ تھے۔ اور چاہتے تھے کہ علماء کی کوئی زبردست جماعت بے حیائی اور بے راہ وری کے خلاف زبردست تحریک چلائے۔ وعظ و نصیحت کے ذریعے عامۃ الناس میں اس کے نقصانات بیان کریں۔

مولانا اصلح الحسینی رحمہ اللہ نے حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی صاحب کا ایک واقعہ بھی سنایا۔ کہنے لگے کہ ''وہ مدینہ منوراہ میں تھے، علماء وطلباء کا بڑا ہجوم ان سے درس لیا کرتا تھا، ایک دن میں بھی عصر کے بعد ان کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اتنے میں حضرت مولانا بنوری تشریف لائے۔ حضرت میرٹھی نے حضرت بنوری کو خاص عزو شرف سے بخشا اور ان سے خلوت میں بھی لمبی بات کی۔ مجھے یہ

سب کچھ ناگوار گزرا اور دل میں ارادہ کیا کہ آئندہ ان کی مجلس میں نہیں آؤنگا۔ خیر آخر میں، حضرت میرٹھی میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں نے آپ کا ٹائم لیا مگر آپ کو زیادہ وقت نہیں دے سکا۔ اگلے دن میں نے اپنے اوپر جبر کرکے ان کی محفل میں حاضری دی۔ وہ صاحب کشف بزرگ تھے۔ اختتام مجلس پر تمام احباب و متوسلین کو رخصت کیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ جب سب چلے گئے تو مجھے کہا کہ قریب آجاؤ۔ میں ان کے قریب گیا تو زور سے بھینچا اور اپنے سینے انور کے ساتھ میرا سینہ لگایا اور عربی میں کوئی وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ دیر تک پڑھتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ وعدہ کرو کہ حرم مبارک کا کپڑا پکڑ کر میرے لیے دعا کریں گے۔ ان کے اصرار پر میں نے وعدہ کیا اور پھر حرم کا کپڑا پکڑ کر ان کے لیے دعا بھی کی''۔

قارئین! اس ملاقات کے تیسرے دن بعد میں کراچی سے اپنے گھر روانہ ہوا اور پھر مستقل یہی کے ہو کر رہ گیا۔ دوبارہ اب تک کراچی کا سفر نہیں ہوا۔ اللہ کا کرنا دیکھو کہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آخری آیام میں حضرت مدنی کے ایک تلمیذ رشید کے ہاتھ چومنے کو ملے اور دعائیں لینے کا موقع ملا۔ مولانا سید اصلح الحسینی وہ عظیم انسان ہیں جس سے حضرت تھانوی اور حضرت انورشاہ کشمیری جیسے عظیم اولیاء اللہ اور اصحاب علم کی زیارت کے ساتھ ان کی اچھی صحبت بھی انہیں نصیب ہوئی ہے۔ الحمدللہ فی زمانہ اتباع سنت میں علماء دیوبند

کا کوئی ثانی نہیں۔ راہ مستقیم اور درست عقائد میں سخت جان ہیں۔ زیغ و ضلالت اور نئی نئی فتنوں کا جس کاریگری سے ہمارے اکابر دفاع کرتے آئے ہیں اس کا مظہر کہیں نہیں ملتا۔ دیوبند کے ایک ایک تربیت یافتہ کی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہر میدان میں نا قابل فراموش خدمات ہیں۔ دین اسلام کو غلبہ دین یعنی لیظہرہ علی الدین کلہ کے لیے یہ حضرات ہمہ دم میدان عمل میں رہتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی اور جہادی فیضان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اس کا ہر ہر تربیت یافتہ تحریک کا درجہ رکھتا ہے۔ مولانا اصلح الحسینی بھی اسی فیضان کا ایک حصہ تھے۔ حضرت والا کا انتقال ہوچکا ہے۔ ہم جیسے گناہ گار لوگوں کے لیے حضرت اصلح الحسینی رحمہ اللہ کا وجود ایک مشعل کی طرح تھا۔ وہ اللہ کے پیارے ہوچکے ہیں۔ اللہ انہیں علیین میں اپنے اخص الخاص لوگوں میں جگہ دے اور ہمیں بھی ان بزرگوں کی طفیل سے معاف فرمادے۔ آمین یارب العالمین

''گوہر آباد''

گوہر آباد وہ گاؤں ہے جو گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ پسماندہ ہے۔ اس گاؤں کا رقبہ اراضی بہت طویل ہے۔ گیس پائن، گیس بالا، رائیکوٹ، تھلیچی پر مشتمل ہے۔ پورے گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ جنگلات گوہر آباد میں پائے جاتے ہیں
جسمیں کائل، فر، چیڑھ، دیار، بنئی، کائو اور قسم ہائے قسم درخت وافر مقدار میں موجود ہیں۔ فیری میڈو جیسی معروف اور خوبصورت جگہ بھی گوہر آباد کے حصہ میں آئی۔
اور نانگا پربت بھی اسی گوہر آباد میں ہے۔ گوہر آباد کی زمین زرخیز اور درخت پھلدار ہیں۔ جلغوزے کے درخت پورے گلگت بلتستان میں سب زیادہ یہی پائے جاتے ہیں۔
جلغوزے کا کاروبار لوگوں کی معیشت کا بہترین وسیلہ ہے۔ اور لوگ مال مویشاں کثرت سے پالتے ہیں۔ مارتل، تھلیمئی، سگھر، بھری، چھلو، ہومل، سلومن بھوری، مطیرا، دساہ، چانگھا، دروگاہ، ملپٹ، جبار دار، مٹھاٹ اور تتو گوہر آباد کی
چراگاہیں میں جہاں لاکھوں مال مویشاں چرتے ہیں۔ گوہر آباد کے لوگ ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ شادی بیاہ بہت سہل ہے۔ لوگ دیندار اور صلح جو ہیں۔ اسی فیصد سے زائد لوگ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ گوہر آباد میں آبشاروں، چشموں اور گلیشیئرز کا شفاف پانی وافر مقدار میں ہے مگر نہری نظام نہ ہونے کی وجہ سے وسیع اراضی بنجر پڑی ہوئی ہے اور فصلیں

قلت آب کا شکار ہیں۔ تناسب آبادی کے اعتبار سے گوہرآباد میں سب سے زیادہ حفاظ کرام اور علماء ہیں اور سب سے زیادہ گریجویٹ بھی گوہرآباد کے ہی ہیں۔

صحت اور تعلیم کے حوالے سے گوہرآباد ابتری کا شکار ہے۔ ایک ڈسپنسری ہے مگر دوائی اور ڈاکٹر ندارد۔ ۲۵ سال قبل بوائز مڈل سکول تھا جو آج تک ہائی سکول کا درجہ نہ پا سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ گوہرآباد کے لوگ سب زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے ابتداء سے انتہا تک تعلیم چلاس، گلگت، ایبٹ آباد، اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے حاصل کی ہے۔ کراچی میں سب سے زیادہ گوہرآباد کے طالب علم ہیں۔ اکثریت غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ قابل مبارک ہیں وہ طلبہ جو رات کو سیکورٹی کمپنیوں اور ہوٹلوں میں نوکری کرتے ہیں اور دن کو سکول، کالج، یونیورسٹی اور کوچنگ سینٹروں میں جاکر زیور تعلیم سے آراستہ ہورہے ہیں اور اپنی تمام تر تعلیمی اخراجات خود برداشت کرتے ہیں۔ بعض جوان تو اپنے گھروں کو بھی رقم بھیجتے ہیں مگر ہمارے مخیر حضرات کے پاس ان کے لیئے کوئی پلان نہیں ہے اور نہ کوئی ویلفیئر سوسائٹی۔ گوہرآباد کے کسی بھی اسکول میں کمپیوٹر کی کلاس نہیں ہے۔ تعلیمی انفرااسٹرکچر برباد ہے۔ اساتذہ کی اکثریت میٹرک پاس ہیں اگرچہ بعض نے تنخواہ اور گریڈ بڑھانے کیلئے اوپن یونیورسٹی سے ایف اے اور بی اے مشکل سے کلیر کیا ہے اور ایسے ٹیچرز بھی ہیں جن کے میٹرک میں چار چار مضامین فیل ہیں۔ انکی بھرتیاں رشوت اور سفارش کی بنیاد پر

ہوتیں ہیں۔ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ لائق اور محنتی اساتذہ گوہرآباد سے کہیں اور ٹرانسفر کیے جاتے ہیں۔ جسکی ایک واضح مثال سابق ہیڈ ماسٹر نقیب اللہ صاحب اور حاجت خان صاحب اور دیگراساتذہ کی ہے۔ دینی تعلیم کے اعتبار سے بھی گوہرآباد بہت درماندہ ہے۔پورے گوہرآباد میں درس نظامی کے کسی ایک درجہ کی بھی تعلیم نہیں دی جاتی، قاری اشرف صاحب نے تیس سال لوہے کے چنے چبا کر درجنوں حفاظ پیدا کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ ہیں۔ گوہرآباد کی یہی ایک کولٹی ہے کہ بہترین حفّاظ قرآن پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیئے تو احقر نے گوہرآباد کو حافظ آباد نام رکھنے کی تجویز دی تھی مگر نقارخانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ آج پورے گوہرآباد میں حفظ کی ایک کلاس نہیں۔ قاری صاحب اور اس کے شاگردوں کے وہ قرآنی جلوے بھی نہیں رہے۔

گلگشت گوہرآباد مسائلستان بنا ہوا ہے۔ یہاں کے جنگلات کی عجیب روگ کہانی ہے۔ چند وڈیروں کی کارستانیوں کی وجہ سے اب تک غریبوں کا پانچ ارب سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے مزید اربوں کے نقصانات کا قوی امکان ہے۔ دو دہائیوں سے گوہرآباد کے ملکیتی جنگلات اٹکے ہوئے ہیں۔ غریب عوام نہ کسی نئے ٹھیکدار کو بیچ سکتے ہیں نہ پرانے کمیشن خور کوئی حل نکالتے ہیں۔اب تو یہ ایک لاینحل اور گنے چنے چند شخصیات کی اَنا کا مسئلہ بن گیا ہے۔

گوہر آباد میں ایک عجوبہ بھی ہے جو '' ہیپرنگ '' کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بارے بہت سی اساطیر اور من گھڑت کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ گورنمنٹ اگر '' ہیپرنگ '' اور '' فیری میڈو '' کو سیر گاہ بنائے اور مناسب انتظامات کریں تو یہ دونوں مقامات بین الاقوامی توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں جس سے گلگت بلتستان کی معیشت مضبوط اور کھربوں کی آمدن موصول ہو سکتی ہے۔ فیری میڈو میں بین الاقوامی سیاحوں کی آمدورفت رہتی ہے مگر ناقص انتظامات کی وجہ سے وہ دلبرداشتہ ہوجاتے ہیں اور دوبارہ رخ نہیں کرتے ہیں۔

گوہر آباد میں سڑک اور بجلی کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ بجلی کے ناقص سسٹم نے لوگوں کی زندگی اجیرن بنا کر رکھ دیا ہے۔ جو گوہر آباد کے وزیر جناب بشیر احمد، اکسن صاحبان اور انکی ٹھیکیداران سے ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ روڈ جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے جو نئے روڈ بنائے جارہے تھے وہ ایک بھی مکمل نہیں ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے لوگ تار کول کی امید لگائے بیٹھے ہیں مگر انکی یہ امید بر نہیں آتی۔ سچ پوچھے تو یہاں کے لوگ آج بھی زندگی کے تمام بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں اور پتھر کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ باوجودیکہ گلگت بلتستان میں سب زیادہ سرکاری اور غیر سرکاری آفیسرز کا تعلق گوہر آباد سے ہے اور گلگت بلتستان اسمبلی میں ہر دور میں ایک سے تین ممبران گوہر آباد

کے موجود رہتے ہیں۔ گزشتہ حکومت میں بھی جی بی اسمبلی میں گوہر آباد سے تین شخصیات اعلیٰ عہدوں پر براجمان تھے اور اب بھی اسمبلی میں دو ارکان موجود ہیں۔ گوہر آباد کی زبوں حالی اور بنیادی سہولیات کی عدم موجودگی سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کے سرکاری آفیسران اور سیاسی لیڈر غریب عوام سے کتنے مخلص ہیں۔ یہ لوگ الیکشن کے دنوں اور سمر تعطیلات گزارنے کیلئے گوہر آباد آ دھمکتے ہیں۔ سال کے باقی ایام چلاس، گلگت اور ملک کے دیگر شہروں میں فروکش رہتے ہیں۔ یہی سفید پوش طبقہ گوہر آباد کے جنگلات، گیس داس، کینو داس، رائلٹی اور دیگر بنجر اراضی کی تقسیم میں دیوار چین بنا ہوا ہے۔

شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد یہاں دو پل بنائے گئے تھے۔ ایک پل گزشتہ سیلاب میں بہہ گیا ہے جو انتہائی ناقص میٹیریل سے دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ دوسرا پل اپنی طبعی عمر پوری کرکے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم جمائے انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ کسی بھی وقت بڑے جانی حادثہ کا خطرہ ہے۔ جب گاڑیاں پل کراس کرتی ہیں تو پنجر اور لوڈ اتارے جاتے ہیں یہ سلسلہ گزشتہ دس سال سے جاری ہے۔ گوہر آباد کا یہ ''بوڑھا پل'' گلگت بلتستان کے چیف منسٹر، وزرائ، ارکان اسمبلی، چیف سیکرٹری سے دہائی دے رہا ہے کہ خدارا! میری حالت زار پر رحم کیجئے۔ واقعی باسیان گوہر آباد کی طرح یہ پل بھی رحم و کرم کے مستحق ہے۔

کوئی ہے خلق خدا کی زبان سننے اور سمجھنے والا..............؟ منسٹر بشیر صاحب ! کیا آپ کو گیس بالا چیئر لفٹ کی طرح گوہر آباد پل بھی دریا برد ہو کر درجنوں انسانی جانوں کے ضیاع کا انتظار ہے؟ کچھ تو خوف خدا کیجیے اور اس خستہ پل یا متبادل کے لیے عملی اقدام کیجیے۔ کیوں مظلوموں کی بد دعاؤں کا انتظار ہے۔ کیا پورے گوہر آباد کے عوام نے بلا تفریق رنگ و نسل اور قوم کے آپ کو بھاری اکثریت سے اس لیے جتوایا ہے؟۔
گزشتہ اسمبلی میں گوہر آباد سے تعلق رکھنے والے تین لوگ ایڈوکیٹ فداالله، محترمہ گل میرا صاحبہ اور بشیر احمد تھے۔ بشیر احمد مسلم لیگ ق میں ہونے کی وجہ سے key پوسٹ پر براجمان تھے۔ گلگت بلتستان کی تاریخ میں مشرف دور میں سب سے زیادہ فنڈ آیا تھا مگر یہ لوگ گوہر آباد میں کوئی ترقیاتی کام نہیں کرواسکے۔ محترمہ گل میرا صاحبہ نیک دل اور درد مند خاتون ہے مگر آن پڑھ اور عورت ذات ہونے کی وجہ سے کوئی انقلابی قدم نہ اٹھا سکی۔ ڈسٹرکٹ کونسل کے شاہ میرزا اور طارق اسرار کا کردار بھی زیرو فیصد رہا بلکہ صرف ذاتی گھر کی تعمیر تک محدود رہا اور کچھ کرپشن۔ حالیہ انتخابات میں بشیر احمد بھاری اکثریت سے جیت گیا۔ کیا یشکن کیا شین، کیا ڈوم کیا کمین، کیا جوان کیا بوڑھا، کیا اپنا کیا غیر سب نے اس کو ووٹ دیے۔ یوں وہ GB اسمبلی کے پہلے اپوزیشن لیڈر بن گئے اور اب ایک انتہائی اہم وزارت پر براجمان ہیں۔ اور گل

میرا صاحبہ بھی خواتین کی خصوصی نشست میں سیلکٹ ہو کر اسمبلی میں پہنچی۔ وہ حکمران جماعت کی اہم رکن ہے۔

مجھے خدا کی ذات پر کامل یقین تھا کہ اگر وزیر تعمیرات بشیر احمد اور محترمہ گل میرا صاحبہ خلوص دل سے گوہر آباد کی تعمیر وترقی، مسائل کا حل اور دیگر محرومیوں پر توجہ دیتے تو صرف انہی پانچ سال میں گوہر آباد سونے کی چڑیا بن سکتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا، انہیں صفحات میں گوہر آباد کے مسائل کی طرف بارہا ان کی توجہ مبذول کروائی گئی مگر وہ اپنے اکاؤنٹ بھرتے رہے اور گوہر آباد جلتا رہا۔ یاد رہے! غریب کے چہروں کے تیور بدل رہے ہیں، ان کے بچے اپنی مدد آپ اعلی تعلیم حاصل کرکے اعلی مناصب پر فائز ہو رہے ہیں اگر اب بھی انکے دکھوں کا مداوا نہ ہوا تو آنے والے دن آپ کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ غریبوں کا انقلاب دستک دے رہا ہے لوگوں میں ایک اچھوتا اضطراب پایا جاتا ہے لہٰذا اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے لوگوں کے دکھ درد کو بانٹیں اور عنداللہ وعندالناس سرخرو ہو جایئے۔ لیکن پیٹ کے بچاریوں کے لیے یہ سب کچھ ناممکن ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ پانچ سال پہلے شروع کردہ ہاسپٹل، نالوں میں لنک روڈ اور دیگر تعمیراتی کام آج بھی کسی مسیحا کا انتظار کر رہے ہیں مگر کوئی نہیں کوئی نہیں۔ رہی بات اکلوتا گرلز مڈل سکول کی نئی عمارت کی زمین بوسی کا؟ اللہ ہی محافظ ہے۔ گوہر آباد کے رستے ہوئے ناسور

اور دکھتے زخم بہت سارے ہیں۔ زندگی رہی تو آہستہ آہستہ ان کو منظر عام پر لاتے رہیں گے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

''راکاپوشی کے منظر بولتے ہیں''

میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ راکاپوشی کے مناظر اکثر بولتے ہیں۔ مجھے ان کا اس طرح کہنا عجیب سا لگتا، مناظر کیسے بولتے ہیں، یہ دعویٰ اس وقت درست ثابت ہوا جب مجھ سے خود، راکاپوشی کے مناظر بولنے لگے۔سیر و سیاحت کا شوق کس کمبخت کو نہیں اور وہ بھی گلگت بلتستان کی مختلف وادیوں کا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ میری دھرتی کے مناظر دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ لاکھوں میل کی مسافت طے کرکے پہنچ جاتے ہیں اور ہم ہیں کہ اسلام کی طرح علاقوں کو بھی مذہبی بنا کر رکھا ہے۔ قراقرم یونیورسٹی میں اسمنٹ کرتے کرتے دل کرتا کہ کہیں گھوم پھر کر آجائیں۔ دوستوں سے شیئر کرتا تو کہتے کہ تمہیں گھومنے کا فوبیا تو نہیں ہوا۔ بھیا ! بھلا، کس کو یہ فوبیا نہیں ہے۔ پھر گھومنے پھرنے کا حکم اللہ دے تو یہ فوبیا بھی ''ثوابی فوبیا'' بن جاتا ہے۔آج کی محفل میں ایک ثوابی فوبیا کا ذکر ہوگا۔اور وہ ہے ہنزہ نگر کے خوبصورت ترین وادیوں کا طائرانہ وزٹ اور راکاپوشی اور دیران پیک کا ساحرانہ و والہانہ چکر۔۔برادرم نجات کی معیت میں چاررکنی ٹیم موٹرسائیکلوں میں راکاپوشی اور دیران کے بولتے مناظر سے ہم کلام ہونے کے لیے پابہ رکاب ہوئی۔ دنیور سے راکاپوشی ویو پوائنٹ تک بہت ہی خوبصورت روڈ

ہے۔ خدا چینیوں کا بھلا کرے کہ ہماری سہولت کے لیے کیا خوبصورت روڈ ڈیزائن کیا ہے، مگر ان کے اپنے مقاصد تو سب پر عیاں ہیں کہ روڈ کیوں بنایا ہے۔ جب گلگت کے حدود کراس کرکے ہنزہ نگر داخل ہونے کی جسارت ہو رہی تھی تو چھلت پولیس چوکی کے کانسٹیبل نے رعب سے رکنے کا اشارہ کیا، ہماری ڈاڑھی دیکھ کر، شاید انہیں طالبان یاد آئے ہونگے مگر اگلے لمحے مجھے اور وقاص کو مقامی ساتھی کے جھرمٹ میں دیکھ کر کھسیانا ہوا اور مختصراً کہا کہ اصل میں غیر مقامیوں کی انٹری کی جاتی ہے۔ سو ہنزہ نگر آمد مبارک ہو اور تشریف لے چلیں۔ مناظر ہم سے بولتے رہے اور ہم بولنے کے بجائے مناظر کا منہ تکتے رہے۔ نجات مجھے معلومات اور ویلیوں کے نام اور درختوں کے پھلوں کی خاصیات پر لیکچر دیے جارہے ہیں اور میں اپنی سوچوں میں مگن! کہیں چھلت کالج دکھا رہے ہیں تو کہیں نلتر کی خوبصورت وادی کا راستہ بتلارہے ہیں۔ اچانک بیچ ویرانے روڈ پر موٹر بائیک روکا اور اترنے لگا، میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ ہم ایک یارگار کے پاس رک رہے ہیں۔ اتنے میں وقاص اور ابراہیم بھی رکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ 1966ء سے 1972ء تک شاہراہ قراقرم کو تعمیر کرتے ہوئے جو لوگ چل بسے تھے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک یادگار بنام '' یادگار نمبر ۱۰۳، انجینئر بٹالین '' کے نام سے بنائی گئی ہے۔ ان کی قبور بھی وہی پر ہیں۔ یہ یادگار ان جیالے انجینئروں، مزدوروں اور دیگر عملے کی یاد میں بنائی گئی ہے جنھوں نے قراقرم کے فلک بوس پہاڑوں میں ملکی تعمیر و ترقی میں

حصہ لیتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی ہے اور انہی پہاڑوں میں ہمیشہ کی نیند سوئے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے فاتحہ خوانی کی اور ان کے قبور اور یادگار کے ساتھ تصاویر بنوائی اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے آگے چل دیے۔ راستے میں ایک دو مقامات پر رکے بھی، ٹھنڈے پانی کے مزے لیے، ہاتھ منہ دھوئے، کئی جانے پہچانے چہروں کے ساتھ ٹاکرا ہو، کولڈرنگ پیئے لیکن ٹھنڈے اور شیریں پانی کے سامنے بدیسی کول ڈرنک کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ ہمیں جلدی تھی کہ کسی طرح راکاپوشی پہنچ جائے۔ سو چلتے چلتے پہنچ ہی گئے۔

یہ دیکھو! میرے سامنے راکاپوشی کا عظیم پہاڑ برف کی سفید چادر لیے کھڑا ہے۔ ہم نے اپنی بائیکس راکاپوشی پل کے ساتھ کھڑی کی۔ ہوٹل میں جاکر اپنی خصوصی ڈیمانڈ کے مطابق کھانے کا آرڈر دیا اور راکاپوشی پہاڑ سے بہنے والے ٹھنڈے پانی کی طرف چل دیا۔ میرے ساتھیوں کا اصرار ہے کہ ہم زیادہ آگے نہیں جائیں گے مگر مجھ پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ سو میں چلنے لگا اور کافی آگے جاکر ٹھنڈے پانی کے کنارے ٹھہر گیا۔ میرے سامنے کئی ہوٹل ہیں ان میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کا ایک جم گٹھہ ہے۔ گلگت بلتستان اور پاکستان کے کئی لوگ فیملی کے ساتھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بہت سارے بچے راکاپوشی کے دامن سے بہنے والے شفاف پانی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ میرے استفسار پر ایک معصوم بچی بولی، انکل بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ ہماری فریجر میں میں بھی اتنا

ٹھنڈا پانی نہیں ہوتا۔ میرے ساتھی بھی اب میرے پاس آ چکے ہیں اور مجھے ٹھنڈے پانی کے درمیان دیکھ کر ہنسنے لگے مگر میں تو خوب مزے لے رہا ہوں بالآخر ان سے بھی رہا نہیں گیا۔ انہوں بھی کپڑے اتارے اور نہانے میں میری معیت حاصل کی۔ یوں دیر تک نہاتے رہے۔ ڈبکیاں لگاتے اور ٹھنڈ ٹھنڈک سے عش عش کرتے۔ بہت ساری پکچرز بنوائی۔ دوبارہ راکاپوشی کا پہاڑ دیکھنے لگا، ہر بار اس کے مناظر بولتے ہیں۔ اتنا بڑا گلیشیر پہلی دفعہ قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ سنا ہے کہ یہاں برفیلے ریچھ بھی ہوتے ہیں اور دیگر پہاڑی حیوانات بھی۔ راکاپوشی کا اکثر حصہ برف سے ڈکا ہوا ہے۔ باقی نچلے حصے کے اکثر مناظر خوبصورت ہیں۔ کالے کالے پہاڑ مخصوص ہیبت میں کھڑے ہیں۔

راکاپوشی ضلع ہنزہ نگر میں واقع ہے۔ ہنزہ نگر گلگت بلتستان کا ایک ضلع ہے۔ اور گلگت بلتستان، پاکستان کا انتظامی صوبہ ہے۔ راکاپوشی 25550 فٹ/ 7788 میٹر بلند پہاڑ ہے۔ یہ سلسلہ کوہ قراقرم میں واقع ہے۔ یہ پاکستان میں 12ویں نمبر پر اور دنیا میں 27ویں نمبر پر بلند ترین چوٹی ہے۔ راکاپوشی کو سب سے پہلے 1958 میں دو برطانوی کوہ پیما مائیک بینکس اور ٹام پیٹی نے سر کیا۔ اس کے بعد بھی کئی کوہ پیماؤں نے اس چوٹی سر کیا ہے۔ یہ نانگا پربت کی طرح انسانی جانیں لینے کا قائل نہیں ہے۔ جب راکاپوشی کے مناظر سے خوب محظوظ ہوئے تو کھانے کے لیے ہوٹل کی طرف چل دیے۔ ہوٹل کے اسی ہال میں کھانا کھایا جہاں

چند دن پہلے حافظ حفیظ الرحمان صدر مسلم لیگ نے اپنی پارٹی کے ذمہ داروں کے ساتھ وزیر امور کشمیر برجیس طاہر کی معیت میں کھانا کھایا تھا۔ میرے ہمسفر اس بات پر لطف اٹھا رہے ہیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد راکا پوشی سے کچھ دور دیران پیک کی طرف چل دیے۔ یہ خوبانیوں کا موسم تھا، گندم کی کٹائی کا وقت ہو چکا تھا۔ نگر کے مناظر انتہائی دلکش تھے۔ ہم چلتے چلتے دیران ہوٹل پہنچے۔ یہاں سب سے پہلے ہماری ملاقات ہنزہ کے مشہور لیڈر سید یحییٰ شاہ سے ہوئی۔ بہت ہی محبت سے ملے۔ دیران ویو ہوٹل کا باغیچہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہر قسم کے پھول اور پھلدار درختوں کی بہتات ہے۔ ایک سوئمنگ پول بھی ہے۔ ہوٹل کا اندرونی منظر بھی بہت ہی پیارا ہے۔ کئی اچھی کتابیں اور پرانے راجاؤں، مہاراجاؤں اور مشہور اشخاص کی تصاویر مع مختصر تعارفی کیپشن کے، ہوٹل کے مختلف مقامات پر آویزاں ہیں۔ ہنزہ نگر کی ثقافتی و روایتی اشیاء بھی دیکھنے کو ملی۔ دودھ پتی چائے کا آرڈر دیکر ہوٹل کے لان میں سید یحییٰ شاہ کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ بہت ہی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ کافی بڑی عمر کے آدمی ہیں مگر جوان دکھائی دیتے ہیں۔ پی پی ہنزہ نگر کے بانیوں میں سے ہیں اور بزرگ سیاستدان ہیں، گلگت اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ جب بھٹو گلگت آیا تو سید یحییٰ نے سپاس نامہ بھی پیش کیا تھا۔ راجگی نظام اور ایف سی آر کے کٹر مخالف ہیں۔

بقول ان کے اس ظالم نظام کے خاتمہ میں ان کا بنیادی کردار ہے۔کافی دیر کے بعد ہوٹل کے بیرے نے چائے لائی۔ واقعی دودھ پتی چائے تھی۔۔بڑے بڑے کپ بھر بھر کے پیئے۔بعد میں معلوم ہوا کہ دیران ہوٹل کے مالک بھی سید یحیٰی شاہ ہیں۔ دیران ہوٹل سے کئی خوبصورت مناظر دیکھنے کو ملے۔

دن کافی بیت چکا تھا۔ واپسی کی ٹھان لی۔ بھائی نجات نے موٹر بائیک پر کک مار کر چلنا شروع کیا۔ واپسی پر ایک بڑے ٹیلے پر برلب روڈ ایک گھر دکھایا اور کہا کہ یہ صوبیدار ٹو کا گھر ہے ۔ بہت بڑے جادو گھر ہیں۔ پولو کھیلوں میں ہار جیت میں اس کا بڑا (Two) کردار ہوتا ہے۔ اور دور دور سے لوگ ان کے ہاں تعویذ گنڈے کروانے آتے ہیں۔

چلتے چلتے ایک جگہ رک گئے۔ نجات کہنے لگے کہ یہ جگہ راکاپوشی زیرو پوائنٹ کہلاتا ہے۔ ٹھنڈا پانیوں کا مسکن ہے۔ یہاں نگر کی روایتی ڈش ''چپاشورو'' کھانے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔یوں سمجھو یہ دیسی سینڈوچ ہے۔ ہم نے بھی اس دیسی سینڈوچ کا مزہ لیا۔ ٹھنڈا پانی پیا۔ پہاڑی پودینے سے مضمحل طبیعت کو بحال کیا۔اور سواری سرپٹ دوڑانے لگے۔ چھلت پل کراس کرکے نجات کے محلے میں پہنچے ۔اور تمام ساتھی خوبانیوں کے درختوں پر چڑھ دوڑے اور بازار سے لائے ہوئے تھیلے بھرنے لگے۔آدھا گھنٹے کے قریب کچی پکی خوبانیوں سے چار تھیلے بھر لیے۔ دو میرے حصے میں آئے۔ خوبانی کے تھیلے لیے گلگت روانہ ہوئے۔ نجات کی ایڈوائس کے مطابق نلتر پل کراس کرکے

واپسی نومل کے راستے سے ہوئی۔ ابراہیم اور وقاص کبھی مجھ سے آگے نکلتے کبھی میں ان کو پیچھے چھوڑ دیتا۔ یوں اللہ اللہ کرکے مغرب کو گلگت ہیں اپنے گھر پہنچ گئے۔اس ذہنی و جسمانی سیاحت کے بعد اگلے روز پہلی روزے کے لیے ذہنی طور پر یکسوئی کے ساتھ کمر کس لیا۔ پورے رمضان اس سیاحت کا لطف محسوس ہوتا رہا۔

بہر کیف ہنزہ نگر کا ضلع ایک ایسے خطہ میں واقع ہے جہاں راکاپوشی کے گلیشیر کے علاوہ بھی متعدد گلیشیر واقع ہیں اور اسی لئے ہنزہ نگر کا موسم جون جولائی میں بھی خنکی سے لبریز ہوتا ہے۔ ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ان علاقوں میں گرمیوں کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ سائے میں ہوں تو دھوپ اور حرارت کی خواہش ہوتی ہے اور اگر انسان دھوپ میں کھڑا ہو تو سائے کی۔ سادہ الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دھوپ نہ ہو تو ٹھنڈ ہوتی ہے اور ٹھنڈ ہو تو سویٹر یا آنگیٹھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سنا تھا کہ نگر کے لوگ قدرے سخت مزاج اور تند خو ہیں۔ مگر مجھے تو کسی قسم کی سختی کا تجربہ نہیں ہوا۔ ہر جگہ محبت اور تبسم ہی نظر آیا۔ لوگوں کی عادات و سکنات اور بولتے مناظر اپنے لیے مطمح نظر بن جاتے اور نظریں دور دور تک تعاقب کرتیں۔آج بھی خیالات کی دنیا میں یہی تعاقب جاری ہے۔اللہ ہی ہم سب

کا حامی وناصر ہو۔

گلگت سے کیلاش تک

گلگت سے کیلاش تک کے سفر میں تقریباً پانچ روز صرف ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ملک بھر میں کافی اسفار کرنے کا موقع عنایت کیا ہے۔ ہر سفر کا لطف اور کیفیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ایک عظیم سفر کی چاہت ہمہ وقت رہتی ہے وہ ہے دیار حبیب کا سفر ہے۔ وہ کیا حسین منظر ہوگا جب یہ فقیر تلبیہ پڑھتے ہوئے بیت اللہ کی طرف پابہ رکاب ہوگا۔ فقیرانہ بھیس بدل کر جب شہنشاہ عالمین کی دربار میں حاضری ہوگی۔ وہ شہنشاہ جس کے سامنے محمود وایاز، محتاج و غنی، عربی و عجمی غرض ہر ایک برابر ہوگا۔ مگر عظمت صرف اصحاب تقویٰ کو حاصل ہوگی۔ ان مبارک لمحات ہیں دل کی دنیا آباد ہوگی۔ اب تک جتنے بھی اسفار ہوئے ان میں سب سے خوشگوار سفر ''گلگت سے کیلاش'' تک کا سفر ہے۔ اس سفر میں بے حد لطف و سرور اٹھایا، ہر محفل سہانی تھی، اس سفر جیسا لطف پہلے کبھی نہیں پایا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس سفر کی سب سے اہم بات قاضی نثار احمد اور مولانا حق نواز (اسکردو والے) کی معیت تھی۔ یارانِ محفل میں ان کی خوش گپیاں، ذوق و آگہی، بلند قہقہے، اور لطیفوں سے احباب محظوظ ہوتے اور ان کا جملے چست کرنے اور پھبتیاں کَسنے سے بزم یاراں میں خوشگوار لہروں کا ارتعاش ایک کیف آگیں نغمہ پیدا کرتا۔ سفری رخصتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے

حکایات گوئی اور آپ بیتیوں سے تو ماحول مسحور کن بن جاتا۔ یہ تو جلوت کی بات تھی مگر ان کی خلوت بھی رشک آفریں تھی۔تلاوت کلام اللہ، راتوں کا جاگنا، اذکار و وظائف، پند و نصائح اور سفری معمولات پر پابندی سے عمل کرنا میرے جیسوں کے لیے خوشگوار حیرت سے کم نہیں تھا۔

جمعرات اکیس اگست کو ایک بڑا سفری کارواں جامعہ نصرۃ الاسلام سے پھنڈر گلاغمولی کی طرف روانہ ہوا۔ تین دن پہلے مجھے مطلع کیا گیا تھا مگر میں اپنی پروفیشنل مصروفیت کی وجہ سے بروقت نہیں پہنچ سکا جس کی وجہ سے روانگی میں تاخیر ہوئی۔ تمام احباب کی شکایت کو خوش دلی سے سہہ لیا۔ اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں تھا، کیونکہ جہاں سے قافلے نے روانہ ہونا تھا وہی میری جائے سکونت تھی۔ باقی احباب تو ادھر اُدھر سے جمع ہوئے تھے۔ پولیس موبائل کی معیت میں دو گاڑیوں میں ۱۷ رکنی قافلہ نام خدا لے کر خرامے خرامے روانہ ہوا۔ شیکوٹ کے قریب پہنچ کر ایک گاڑی نے جواب دے دیا جبکہ قاضی صاحب کی گاڑی سیدھا شیکوٹ مسجد کے دروازے پر رکی۔ جامعہ نصرۃ الاسلام کے زیر انتظام یہ مسجد بہت جلد مکمل ہوئی۔اس علاقے کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے۔ قاضی صاحب کی گاڑی میں مولانا حق نواز، بھائی عمر احسن (کراچی) اور ناچیز تھے۔ جب ہمیں دوسری گاڑی کی خرابی کی اطلاع ہوئی تو قاضی صاحب نے دوسری گاڑی کے ساتھی مولانا منیر، مولانا نظیم، محمد نواز (جنرل سیکرٹری تنظیم اہل سنت والجماعت گلگت

بلتستان وکوہستان) اور دیگر ساتھیوں کو لانے کے لیے روانہ کردیا اور خود حق نواز صاحب کو مسجد کی تعمیراتی کام دکھانے لگے اور فورا وضو کرکے دو رکعت صلاۃ المسجد پڑھنے لگے۔ مجبورا ہمیں بھی ان کی اتباع کرنا پڑا۔

ضلع غذر کے مختلف مناظر دیکھتے ہوئے ہم گوپس پہنچے جہاں مولانا حفیظ اللہ کی دادی کی تعزیت پر جانا تھا۔ سیدھا ان کے گھر گئے۔ قاضی نثار احمد نے حاضرین مجلس سے تعزیت کی ، فاتحہ پڑھا، مختصر گفتگو کی اور دوپہر کا کھانا کھا کر قافلہ آگے روانہ ہوا۔ گوپس سے نکلتے ہوئے اچانک ایک مشورہ ہونے لگا کہ پھنڈر سے سیدھا چترال پہنچا جائے۔ قاضی نثار احمد نے کہا کہ ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے اور چترال جانا کوئی اتنا لازمی بھی تو نہیں۔ تاہم مولانا حق نواز صاحب بول پڑے کہ حضرت، چترال جانے کے کئی فوائد ہیں، مثلا ہم گرم چشمہ دیکھیں گے، کیلاشیوں کی تہذیب و تمدن سے آگاہی حاصل کرلیں گئے اور سب سے اہم جو بات ہے وہ چترال کے علماء کرام اور اہل علم کے ساتھ کچھ مخصوص نشستیں کریں گے اور ان کے مسائل سمجھیں گئے اور اپنے مسائل سے انہیں آگاہ کریں گے۔ ہمارے کراچی کے مہمان جناب عمر احسن نے بھی اپنے مخصوص انداز میں چترال جانے کی حمایت کی اور وہاں احبابِ سفر کو کچھ سہولیات دینے کی آفر بھی کی۔ میں بھی کیسے خاموش رہ سکتا تھا، جانے کے لیے اصرار کیا، وہاں کے خوبصورت علاقوں کے گن ،گائے، تب قاضی نثار احمد نے کہا کہ ضرور جائیں گے

اس سفر کے امیر مولانا حق نواز ہونگے جبکہ چیف گیسٹ عمر احسن۔ اب جو ترتیب اور حکم آپ دونوں کا ہوگا وہی کرلیا جائے گا۔ مولانا حق نواز کہنے لگے کہ بے شک سفر کا امیر مجھ بوڑھے کو بناؤ مگر حکم آپ ہی کا چلے گا کیونکہ ہم پورے گلگت بلتستان والے آپ کو اپنا امیر بنا چکے ہیں۔ میں بظاہر باتیں سن رہا تھا مگر دل و دماغ کی اسکرین پر گرم چشمہ، شاہی مسجد چترال اور کافرستان کے مناظر دوڑ رہے تھے۔ بے تابی کھائے جارہی تھی ۔اس گفتگو کے دوران گاڑی ضلع غذر کی مشہور جھیل '' خلتی جھیل '' پہنچ گئی۔ قاضی صاحب نے فیصلہ صادر کیا کہ یہاں رک کر جھیل کا نظارہ کریں گے، ایک کڑک قسم کی چائے پی کر نماز عصر ادا کی جائے گی اور اپنے بقیہ ساتھیوں کا انتظار کریں گے جو ابھی گاہکوچ پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے صاد کیا اور یوں خلتی جھیل ویو ہوٹل میں اتر گئے۔ کڑک چائے کا آرڈر دے کر ہم سب جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔

ضلع غذر میں کئی جھیلیں ہیں۔ ان میں جو مشہور جھیلیں (Lakes) ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ پھنڈر جھیل [Phander Lake]، قرمبر جھیل [Qurumber Lake]، شندور جھیل [Shandur Lake] ، خلتر جھیل [Khaltar Lake] ، گاموجھیل [Gamoo Lake]، تلی مسک جھیل [Tili Musk Lake]، خابر جھیلیں [Khabar Lakes] اور خلتی جھیل [Khalti Lake] ہیں۔ اور میرے خیال میں سب سے لمبی اور شفاف جھیل خلتی جھیل ہے جس کے کنارے ہم کھڑے ہیں۔ خلتی جھیل میں ٹروٹ مچھلیاں وافر مقدار میں پائی جاتی

ہے۔ جھیل کے شفاف پانی سے مولانا حق نواز اور قاضی نثار احمد نے وضوء کیا۔ ہم نے بھی وضو کیا اور جھیل کنارے پکچرز بنوائی اور نماز عصر پڑھنے چل دیے۔ جس جگہ پر بیٹھ کر ہم چائے پی رہے تھے وہاں سے خلتی جھیل کا منظر بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ جھیل کے ایک کنارے مرغابی بھی اڑتے دیکھا۔ قاضی صاحب کے حکم پر غذر پولیس کے جوانوں کو بھی خصوصی چائے دی گئی۔ گفتگو کا دور چلا تو چل ہی پڑا۔ جھیل کی تزئین و آرائش پر احباب نے اپنے خیالات شیئر کیے اور حکومتی نااہلی پر کف افسوس ملا۔ یہ بات زبان زد عام ہے کہ خلتی جھیل قدرتی نہیں بلکہ مصنوعی ہے یعنی عطاء آباد جھیل کی طرح۔

دو پہاڑیوں کے درمیان تنگ سی جگہ پر دریائے پھنڈر کا گزر ہو رہا تھا، ایک پہاڑی سے ایک بڑا حصہ (تودہ) دریا میں گر گیا اور پانی کا راستہ روک لیا تب پانی رک کر جھیل کی شکل اختیار کر گیا اور خلتی گاؤں کا اکثر حصہ ڈوب گیا۔ اب بھی پل کے اس پار کچھ آبادی ہے۔ یوں یہ جھیل خلتی جھیل کے نام سے معروف ہے۔

ضلع غذر میں کئی زبانیں بولی جاتیں ہیں لیکن جو زبانیں سب سے زیادہ اور اکثر علاقوں میں بولی جاتی ہیں ان میں شینا، کھوار، وخی اور بروشسکی قابل ذکر ہیں۔ کئی دریا بہتے ہیں لیکن سب سے بڑا دریا، دریائے گوپس ہے جس کے کنارے ہمارا سفر جاری ہے۔ بہت ہی شفاف دریا بہتا ہے۔ گوپس سے پھنڈر تک درمیان میں کئی گاؤں ہیں جن میں شمرن، چچھی، ہایم اور بھتریت معروف ہیں۔ بھتریت

نالہ کافی لمبا ہے اور اکثریت گجر برادری کی ہے۔ سادات بھی کافی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ شام کی دھندلکیوں میں دائیں بائیں کے مناظر بڑے جاذب النظر لگ رہے تھے۔ متصل روڈ مکئی کے بڑے بڑے کھیت کھڑے کھڑے ہمیں دعوت سخن دے رہے تھے اور ہم خیالات کی وادیوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ''لطف یکتائی'' میں غرق تھے۔

جب ہم چھچھی پہنچے تو قافلے کے استقبال میں عوام الناس کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ جو موٹر سائیکلز اور گاڑیاں لے کر اپنے معزز مہمانوں کے استقبال کے لیے نماز ظہر سے اب تک یہی کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے پچھلے ساتھے بھی ہم سے آکر ملے تھے۔ قاضی نثار احمد نیچے اترے اور فرداً فرداً استقبال کرنے والوں سے معانقہ کیا اور ہم یہ مناظر دیکھ کر مبہوت ہوئے اور رشک بھی آیا اور اپنی حالت زار پر ترس بھی آیا۔ کیونکہ ہمیں کوئی گھاس ڈالنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا، بمشکل چند جاننے والوں نے ہمارا دل رکھنے کے لیے ہنس ہنس کر سلام کیا۔ قاضی نثار احمد نے پولیس موبائل کے انسپکٹر کو بلایا اور ان سے کہا کہ آپ نے بہت خدمت کی، رات آپ کو آگے تک جانے اور وہاں رہنے میں دشواری ہوگی لہٰذا آپ یہاں سے واپس جا سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کو مکمل اجازت ہے۔ پولیس کے جوانوں کے چہرے کھل گئے اور وہ ہنس کر کہنے لگے بہت شکریہ، اگر آپ اجازت نہ دیتے تو واپسی تک تو آپ کے ساتھ ہی ہماری ڈیوٹی تھی مگر آپ نے

(ہمارا کام آسان کر دیا۔ یوں وہ خوشی خوشی ہم سے رخصت ہوئے۔ (جاری

''پھنڈر''

مغرب کی آذان ہو رہی تھی اور پھنڈر کے مناظر شام کی دھندلکیوں میں میرے سامنے رقصاں تھے۔فضا میں خنکی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔دل مستی یں مچل رہا تھا اور دماغ اگلے لمحات کی کڑیوں کو سلجھا رہا تھا۔ہم قافلے کی شکل میں پھنڈر کے حدود میں داخل ہوئے۔پی ٹی ڈی سی ہوٹل پھنڈر کے ابتداء میں ہے۔
گورنر پیر کرم علی شاہ پروٹوکول کے ساتھ ہوٹل سے مین روڈ کی طرف اتر رہے تھے۔ ہمارا قافلہ دیکھ کر ان کی گاڑیاں رک گئیں، ہم آگے بڑھے اور سیدھا جاکر نماز مغرب کے لیے پھنڈر مسجد میں اتر گئے۔یہ مسجد مولانا شفیق الرحمان والی مسجد کے نام سے معروف ہے جس کی بنیاد قاضی عبدالرازق نے نصف صدی پہلے رکھی تھی۔
جب ہم گاڑیوں سے اتر کر مسجد گئے تو گورنر کی گاڑیاں کراس کر گئیں۔انہوں نے بھی چترال کا قصد کیا ہوا تھا جو ہم سے پہلے وہاں روانہ ہوئے۔مسجد میں نماز مغرب ادا کی۔ مقامی لوگوں نے والہانہ عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ایک صاحب نے کھڑے کھڑے مسجد کی کہانی شروع کی کہ کب کیسے یہ مسجد بنائی گئی تھی۔آہ! ان اکابر نے کتنی مشقتیں برداشت کرکے اتنی دور جاکر مسجدوں کی بنیادیں رکھیں تھیں۔اچانک میری آنکھ کے ایک حصے میں آنسو تھرکے اور دائیں رخسار

پر پھسل پڑے۔ میر ولی بتارہے تھے کہ نصف صدی قبل جب قاضی عبدالرازق آئے تو اہل سنت عوام کا جم غفیر جمع ہوا تھا، انہوں نے فرمایا کہ آپ کے دوسرے بھائی کہاں ہے؟ پھر خود کہا کہ جب تک ان کو نہیں بلاؤگے میں نے پروگرام کو آگے نہیں بڑھانا، پھر کیا تھا کہ اسماعیلی برادری کو دعوت عام دی گئی اور بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ سب نے اپنے معزز مہمان کی راہ میں دل فراش کیا۔ قاضی عبدالرازق نے '' لاالہ الااللہ'' پر گھنٹوں وعظ کیا۔اور آج یہی عمل ابن قاضی عبدالرازق دہرانے یہاں وارد ہوا ہے اور ہم جیسوں کو بھی ساتھ لیا ہوا ہے۔ فیاللعجب۔

نماز کے بعد ہمارے میزبانوں نے پھر کارواں کی شکل اختیار کی اور ہم گلاغمولی میں آنریری کپتان حاجی عبدالحنان کے دولت کدے میں پہنچے۔فضاء میں بڑی خنکی تھی۔ ہم سطح سمند سے تقریباگیارہ ہزار فٹ بلندی پر تھے۔گاڑیاں لان میں پارک کرکے حاجی صاحب کے مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ غذر اور چترال کے لوگوں کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی کہ وہ مہمان خانے بالکل الگ تعمیر کرتے ہیں اور رہائشی مکان الگ ہوتے ہیں جس سے مہمان اور میزبان دونوں کو سہولت کار ہوتی ہے۔گلاغمولی تک روڈ پر تارکول بچھا ہوا ہے اس سے آگے روڈ کچی ہے۔پھنڈر کے بعد گاڑیوں نے لڑھکنا شروع کیا تھا اور یہی لڑھکن چترال مستوج تک برقرار رہی۔ رات بیت گئی۔ نماز فجر یخ حالت میں ادا کی۔ وسط اگست میں اتنی

سردی چہ معنی دار۔ جیسے ہی صبح کاذب کے بعد صبح صادق ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے اتنی حسین وادی کھڑی ہے کہ الفاظ میں اس کا حسن بیان کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ حاجی عبدالحنان صاحب کا گھر تقریباً سب سے اونچائی پر ہے۔ یہاں سے گلاغمولی، گلاختوری اور ہندرپ نالے کی آبادی اور مناظر واضح نظر آتے ہیں۔ جس جگہ میں کھڑا ہوں وہاں سے بالمقابل ہندرپ کا نالہ اور پہاڑیاں اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ دکھائی دے رہے ہیں۔ ہندرپ سے جو نالہ اور پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ سیدھا سوات کالام سے جاملتا ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق آٹھارہ گھنٹے کی پیدل مسافت ہے۔ ان بوقلموں پہاڑوں اور بہتے نالوں کو دیکھ کر دل محظوظ ہوتا ہے اور فطرت پر یقین میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہاں کی مختلف تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ بہر صورت یہ رنگ برنگ پہاڑ، بہتے نالے، چمکتی جھیلیں اور شفاف گلیشیئر مرور زمانے کے حوادثات و واقعات کے امین ہیں جنھوں نے ازدم تا ایں دم بے شمار فاتحین و مصلحین کو دیکھا اور بڑے بڑے مغرور بادشاہوں، راجاؤں اور نمبرداروں کی رعونت جن کے سامنے خاک میں ملی۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔

گلاغموی میں ایک مختصر پروگرام کا انعقاد تھا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کو جلدی ناشتہ دیا جائے تاکہ جو ساتھ باہر کا وزٹ کرنا چاہتے ہیں یا فشنگ (Fishing) کرنا چاہتے ہیں وہ پروگرام کے شروع ہونے سے پہلے پہلے

اپنے آپ کو فارغ کرلیں۔ یوں ناشتہ کے بعد میں ، محمد نواز صاحب ،ایک مقامی ساتھی اعظم کو لیے ہندرپ سے بہنے والا نالہ جوکہ گلاختوری سے گزرتے ہوئے دریائے گوپس میں جاگرتا ہے کی طرف چل دیا۔ اعظم نے مچھلیاں پکڑے کی مشین بھی لے آیا۔ یوں اس بہتے نالے کے کنارے پہنچا۔ بہت ہی شفاف پانی تھا اور پھیلتا ہوا نالہ آج تک دل و دماغ میں موجود ہے۔ میں ٹھنڈے پانیوں میں اتر گیا۔ بڑے بڑے سبزے، مویشیوں کا چرنا اور دلدوز پہاڑی منظر۔اس جھیل نُما دریائی کنارے فشنگ (Fishing) کرنے کی اپنی سی کوشش کی، لطف ضرور اٹھایا مگر کوئی ٹروٹ ہاتھ نہیں آیا۔ بالآخر چل دیے۔

یہ مسجد خالد بن ولید ہے۔ اس کی بنیاد 1880ء حاجی عبدالحنان کے والد نے رکھی۔ یہ اپنی ہیئت کی چھوٹی سی خوبصورت مسجد تھی۔ بڑے بڑے پتھروں اور لکڑیوں سے بنائی گئی تھی۔ گزشتہ سال حاجی صاحب نے از سر نو تعمیر کا ارادہ کیا اور قاضی نثار احمد کو دعوت دی کہ از سر نو تعمیر کی ابتداء کریں۔ انہوں نے ابتداء کرکے دعائے خیر کی اور اس سال پھر نئی مسجد کے افتتاح کے لیے دعوت دی ،یوں ہم ایک قافلے کی شکل میں حاضر ہوئے۔ نو بجے با قاعدہ پروگرام شروع ہوا۔ مولانا چراغ الدین نے اسٹیج سکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ مجھے بھی موقع دیا گیا۔ میں نے آیت کریمہ '' لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، وھو علی کل شئی قدیر'' اور حدیث مبارکہ'' ان اللہ یرفع بھذاالکتاب

اقواما ویضع بہ آخرین'' پر چالیس منٹ گفتگو کی۔

قاضی نثاراحمد نے توحید و سنت پر ایک تفصیلی خطبہ دیا۔ تمام تقریر کا خلاصہ یوں بیان کیا کہ '' میری تمام چھوٹی،بڑی کوششیں خلافت کے قیام کے لیے ہے، جو بھی دینی کام کرتا ہوں اس میں رضائے الٰہی اور قیامِ خلافت کی نیت ہوتی ہے اس کے سوا کچھ نہیں''۔

اس پروگرام کی سب سے اہم اور بڑی بات یہ تھی کہ آنریری کپتان حاجی عبدالحنان نے گلاختوری اور گلاغمولی کے اسماعیلی برادری کے سیلکٹڈ چالیس بزرگوں، مکھیوں اور ذمہ دار لوگوں کو مسجد کے افتتاحی پروگرام میں حضرت قاضی صاحب کو سننے کی دعوت دی تھی جو تمام کے تمام حاضر ہوئے تھے۔ ہمارے لکھاری دوست جاوید کاکاخیل بھی صف اول میں تھا، بقول ان کے صف اول کے تمام اسماعیلی ذمہ داروں نے بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ اس مجلس میں حاضری دی تھی''۔ یہ دونوں مکتبہ فکر کے سرکردہ لوگوں کی ایک محفل تھی۔ تمام اسماعیلی برادری کے لوگوں نے قاضی صاحب کو عقیدت سے سن لیا، اور پھر سب نے مسجد میں ہی مل کر ایک ساتھ کھانا تناول کیا۔ چترال سے واپسی پر اسماعیلی ریجنل کونسل کے اراکین نے ملنے کا اصرار کیا تھا مگر قاضی صاحب اگلی دفعہ حاضر ہوکر تمام پھنڈر والوں کے ساتھ تفصیلی نشست کرنے کا وعدہ کرکے گلگت پہنچ گئے۔

رات کو اہل علم اور علاقے کے معززین کی ایک علمی محفل سج گئی۔ سب سے زیادہ جس چیز کو زیر بحث لایا گیا وہ اقراء روضۃ الاطفال کے سکولوں کی خدمات و کردار اور نقصانات تھا، کچھ دوستوں نے تو اقراء اسکول کو سم قاتل قرار دیا لیکن احقر نے مضبوط دلائل کے ساتھ رد کیا۔ کچھ ایسے سوالات اٹھائے کہ انہیں خاموش ہی ہونا پڑا۔ پھنڈر ایک بڑی تحصیل ہے۔ اس کی آبادی انیس ہزار کے قریب ہے۔اس کے مشہور گاؤں پھنڈر، ٹیرو، گلاغمولی، گلاختوری اور برست ہیں۔ مجھے ان سب میں گلاختوری اور ہندرپ کے سنگم پر واقع علاقہ اور اسکا ویو بہت ہی پیارا لگا۔ گندم کی فصلیں پک کر تیار تھی، ہریالی کے درمیان مٹیالی رنگ اور درمیان درمیان میں شفاف پانی کا گزر۔ یقینا دل بھانے کو کافی تھا۔ تحصیل پھنڈر میں اس وقت (25-08-14) انیس مساجد ہیں۔ جس میں صرف گلاختوری کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے اور اتفاق سے جس دن ہم وہاں تھے روز جمعہ تھا۔ قاضی صاحب نے پھنڈر کی اکلوتی جامع مسجد خاتم الانبیاء گلاختوری میں نماز جمعہ پڑھایا۔ ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پھنڈر میں عموما ایک فصل گندم یا مکئی کی کاشت کی جاسکتی ہے۔ چھ ماہ اکثر علاقہ برف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ یہ ٹروٹ مچھلیوں کا مسکن ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا کی سب سے لذیذ ٹروٹ یہاں پایا جاتا ہے۔ پھنڈر میں تین اقراء روضۃ الاطفال کے اسکول ہیں اور چھ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے اسکول بھی ہیں۔ چترال سے واپسی پر بھی پھنڈر میں تھوڑا رکے۔ حاجی عبدالحنان کے گھر دوپہر کا کھانا کھایا۔ مولانا شفیق

الرحمان صاحب کے والد کی زیارت کے لیے ان کے گھر گئے۔ایک سو چھ سال کی عمر کے ایک'' نوجوان بوڑھے'' سے ملاقات ہوئی۔دلچسپ اتنا تھا کہ قاضی صاحب کو سلام کرتے ہوئے پوچھا کہ چترال سے کوئی نئی بھابھی لے کر آئے ہونگے۔پورا مجمع ان کی مزاحیہ باتوں سے سرشار ہوا۔سفر کی تھکن ختم ہوئی۔یہاں سے چند قدم پر واقع بھائی عبدالمراد کے گھر عصرانہ تھا۔وہاں ایک مسجد کی افتتاح تھی۔یہ مسجد پی ٹی ڈی سی ہوٹل پھنڈر کے متصل ہے۔وہ ایک پر تکلف کھانا تھا، تمام احباب اور مقامی لوگوں نے جم کر کھایا اور نماز عصر اس مسجد میں ادا کی گئی۔قاضی صاحب اور دیگر مہمانوں نے مسجد کو خوب اچھی طرح دیکھا، عبدالمراد سے مسجد کو مزید وسیع کرنے کے لیے جگہ دینے کو کہا جو انھوں نے قبول کیا۔قاضی صاحب نے حاضرین سے مختصر خطاب بھی کیا اور مسجد کا نام ''مسجد ابو بکر صدیق'' رکھا۔

پھنڈر کی خوبصورتی مسلم ہے۔پہاڑی ٹیلوں سے نالوں کے بیچوں بیچ پانی بہہ کر دریائے پھنڈر کی شکل اختیار کر رہا ہے۔یہی دریا دریائے گوپس کے نام سے دریائے گلگت سے ہو کر دریائے سندھ جا گرتا ہے اور بد قسمتی سے اس کی رائلٹی پر صوبہ کے پی کے قابض ہے۔پھنڈر میں ندی نالوں اور پہاڑیوں کے ساتھ لپٹی سڑک ایک لکیر جیسی نظر آرہی تھی۔اس پر گاہے گاہے کوئی جیپ یا سوکھی گھاس سے لدی کوئی ٹریکٹر نظر آتی تھی۔گاڑیوں سے بھی نظارہ قابل دید تھا۔کہیں پہاڑ سے

پانی آبشاروں کی صورت میں اس کچی سڑک کے آس پاس گرتا نظر آتا تھا اوراس کی خنکی محسوس ہوتی تھی۔ نظریں اٹھا کر اوپر دیکھیں تو پانی گویا پہاڑ کی چوٹی سے آتا محسوس ہوتا تھا۔ یعنی گلیشئر سے۔ ٹیرو اور برست کے مقامات پر سڑک کے ساتھ ساتھ چند مکانات، پولیس چوکی، بکریوں کے ریوڑ اور گھاس کے بڑے بڑے کھیت نظر آئیں گے جہاں خواتین و حضرات گھاس کاٹتے، جمع کرتے اور محفوظ مقامات تک پہنچاتے نظر آتے تھے۔ چراگاہوں میں مختلف پھولوں کے شگوفے کھل کھل کر اپنی رعنائی کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ اور پھر دریا اور نالوں کو پار کرنے کا مقامی بندوبست۔ دریا نیچے کہیں گہرائی میں منہ زور گھوڑے کی طرح رواں ہے اور کہیں انتہائی سلاست سے۔ ہر دو صورتوں میں پانی کی شفافیت مسلم و باقی۔ چھوٹے دریا اور بہتے نالوں کے اوپر مضبوط رسیوں سے بنائے گئے پل یا پھر بڑے لکڑی کے تختے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پل کا کام دیتے ہیں۔ مقامی لوگ اکثر ان پگڈنڈی پلوں کو میل ملاپ، غمی خوشی اور مویشیوں کو آس پاس لے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (جاری)

''شندور''

یہ دیکھو ! میرے سامنے شندور کا بین الاقوامی معروف پولو گراؤنڈ ایستادہ ہے۔ جو دنیا کی چھت (Roof of the World) سے جانا جاتا ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 3,719 میٹر/ 12,201 فٹ ہے۔ ہم نے گاڑیاں شندور میں روک لی۔ دودھ پتی چائے کا آرڈر دے کر نماز عصر کی تیاری میں لگ گئے۔ دوران نماز پورا علاقہ خوش گوار فضاؤں، دماغ افروز ہواؤں،اور مہکتے پھولوں کی مشک و عنبریں خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ پوری وادی چہک رہی تھی۔ شندور کے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں تو ہر طرف قدرت کی صناعی نظرائے گی۔ پولو گراؤنڈ کے ساتھ شندور جھیل تخلیق فطرت کا عظیم شاہکار لگتی ہے۔ آج تک جتنی جھیلیں دیکھنے کو ملی ، ان میں سب سے بڑی جھیل یہی ہے۔ اس کی لمبائی تین میل اور چوڑائی ایک میل ہے۔ اس جھیل میں نایاب پرندے بستے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس جھیل کے پانی کا ظاہری خراج نہیں ہوتا یعنی پانی جھیل میں ٹھہرتا دکھائی دیتا ہے مگر ماہرین کے مطابق پانی زیر زمین راستہ بنا کر سولاسپور اور لنگر میں جانکلتا ہے۔ چار سو پہاڑیوں اور بہتے یخ پانیوں کے درمیان جھیل اور پولو گراؤنڈ کمال کے خوبصورت لگتے ہیں۔ ہر پہاڑی اور ٹیلے کا رنگ دوسرے سے مختلف ہے۔ شندور پولو کی وجہ سے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ اور یہ چترال اور گلگت بلتستان کے درمیان پہاڑی

پاسنگ کا ایک اہم حصہ ہے۔1936 سے ہر سال یہاں روایتی پولو کھیلوں کا ایک میلہ منعقد کیا جارہا ہے جس کو'' شندور پولو فیسٹول'' کا نام دیا جاتا ہے۔ گلگت اور چترال کے ٹیموں میں کانٹے دار مقابلہ ہوتا ہے۔یہ دنیا کا بلندترین گراؤنڈ ہے۔شندور پولو فیسٹول یہں پولو کے علاوہ علاقائی لوک گیت اور مختلف روایتی مقابلوں بالخصوص ٹریکنگ، کوہ پیمائی اور گھڑ سواری کے مقابلوں کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔ گرواںڈ کے ارد گرد قدرتی ٹیلے ہیں جو کھیلوں کے دوران بطور نشست گاہ کے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اس پولو فیسٹول میں پاکستانی حکمرانوں سمیت پوری دنیا سے سیاح شرکت کرتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹواور جنرل مشرف یہاں پولو میچ دیکھنے خصوصی آئے تھے۔ شندور کی ہسٹری کافی طویل ہے جس کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہم نے کافی ساری پکچرز بنوائی، باجماعت نماز ادا کی، اور قدرتی مناظر سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

پھنڈر میں، چترال جانے کے لیے رخت سفر باندھنے لگے تو برادرم حماد کا گروپ گلگت روانہ ہوا۔ ہم نے ایک اورجیپ رینٹ پر لے لیا۔ نماز جمعہ کے بعد ہم چترال کی طرف روانہ ہوئے۔ گلاختوری سے شندور تک ہماری گاڑیاں دوڑ رہی تھی۔ بھنور کی ڈھولتی کشتی بھی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ جو جیب ہم نے پھنڈر سے رینٹ پر لی تھی اس کی ہیئت کذائی اور ڈرائیونگ کے مختلف اسٹائل کو دیکھ کر ہمارے ہم سفر مولانا منیر انے اس کا نام بھنور کی ڈھولتی کشتی رکھا تھا۔پھنڈر سے

شندور تک کہیں گول پتھروں کا علاقہ آجاتا، کہیں سرخ اور سفید، اور مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے پہاڑ اور ٹیلے ہماری دید کے لیے مخصوص ہیبت میں کھڑے تھے۔ یہ رنگ برنگ پہاڑ قرآن پاک کی تفسیر کا خوبصورت نقشہ پیش کر رہے تھے، '' ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود''۔ان جاذب النظر مناظر کو دیکھ کر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ خالق اکبر کی قوت تخلیق کے نرالے شاہکار ہیں۔برست میں جی بی پولیس کی چیک پوسٹ ہے۔چیک پوسٹ سے بیس منٹ کی پیدل مسافت میں ایک چشمہ ہے جو بوتل والا چشمہ سے مشہور ہے۔ اس کے پانی کا ذائقہ کولڈ رنگ جیسا ہے اور مقامی لوگوں نے بتایا کہ بہت ہاضم ہے۔ موسم صیف میں لوگ برست آتے ہیں اور گھاس کاٹ کر موسم شتاء کے لیے اسٹاک کرتے ہیں اور پھر سردیوں میں ٹیرو آجاتے ہیں۔

شندور کے بعد چترال کا پہلا گاؤں سولاسپور آتا ہے۔ گلگت سے شندور تک 221 میل جبکہ چترال شہر سے شندور تک ایک سو سینتالیس میل کا راستہ ہے۔شندور تقریباً بیس مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔اور اس 20 مربع کلومیٹر میں شندور جھیل کے علاوہ بھی جھیلیں ہیں۔ شندور پر چترال اور گلگت بلتستان کا تنازعہ ہے۔ چترال کا دعویٰ ہے کہ یہ پورا علاقہ اس کا ہے جبکہ گلگت بلتستان والوں کا دعوی ہے کہ یہ جی بی کا ہے۔ شندور پولو گراؤنڈ پر ظاہری قبضہ چترال کا نظر آیا۔ جگہ جگہ چترال بارڈر پولیس اور چترال اسکاؤٹ کی چاکنگ نظر آرہی تھی۔

پولو گراؤنڈ کی نشستوں کے اوپر ایک بڑا سائن بورڈ ہے جس پہ چترال اسکاؤٹ اور مستوج پولیس لکھا ہوا ہے۔اور درمیان سائن بورڈ پر شہدائے پاکستان کو سلام مرقوم تھا اور عین وسط شندور میں چترال بارڈر پولیس کی چیک پوسٹ بھی ہے جبکہ جی بی پولیس کی چیک پوسٹ شندور سے بیس کلومیٹر کی مسافت پر برست میں ہے۔ ایک مقامی ساتھی بتا رہا تھا کہ جی بی اسکاؤٹ اور چترال اسکاؤٹ کا جھگڑا بھی ہوا تھا اس لیے اب یہاں صرف چترال بارڈر پولیس کی چوکیاں قائم ہیں۔ ہمارے سفر میں سیکورٹی پر مامور ایک ایلیٹ سپاہی بتا رہا تھا کہ پہلے جی بی کی چیک پوسٹ لنگر میں تھی اب اس سے بھی آرام دہ جگہ برست میں چیک پوسٹ ہے۔ اس سے گلگت بلتستان والوں کی کاہلی کا اندازہ خوب لگایا جاسکتا ہے۔ اس سرحدی تنازعہ کی وجہ سے امسال شندور پولو ٹورنامنٹ بھی نہ ہو سکا۔

برست سے پانچ کلومیٹر کی مسافت پر ایک بہت بڑی چراہ گاہ ہے جو لنگر کے نام سے معروف ہے۔ جہاں مال مویشیوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ خوش گاؤ، یاک، زوئے اور ان کے ہم نسلوں کے لیے ایک مخصوص جگہ ہے جو بہت بڑی تعداد میں اس چراگاہ میں چرتے دیکھا۔ان کے قریب گائے بیل کی چراگاہ بھی تھی۔ مولانا حق نواز کے مطابق یاک، زوئے اور خوش گاؤ اور ان کی اقسام اپنے چراگاہ میں دوسرے جانوروں کو برداشت نہیں کرتے۔ واقعتاً یاک والے چراگاہ میں سینکڑوں یاک خوش گاؤ دِکھتے اور دور دور تک گائے بیل نظر نہیں آئے۔ شندور اور لنگر میں بھیڑ

بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ چرتے دیکھا، بکریوں کی شکلیں ہرن کی طرح تھی۔ جسامت کے چھوٹے چھوٹے۔ بھیڑ چاروں پاؤں اٹھا کر ایک عجیب چھلانگ لگاتے اور بہت تیز دوڑتے۔ بکریوں اور بکروں کی ظاہری شکل و صورت پر مولانا حق نواز صاحب نے یوں تبصرہ کیا'' چونکہ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ ہرنوں کی تعداد وافر ہے۔ بھیڑ بکریوں کی ظاہری شباہت سے اختلاط نسل کا گمان ہوتا ہے۔ سننے میں آیا ہے گوشت کے ذائقے، چلت پھرت اور شکل و شبہاہت میں ہرن اور بکریوں میں کوئی واضح تضاد نظر نہیں آتا''۔ ان کی وضاحت سن کر قاضی صاحب بولے۔ لگتا ہے کہ آپ نے جنگلی جانوروں پر بڑی تحقیق کی ہے'' انہوں نے سنجیدگی سے اثبات میں جواب دیا جس پر ہماری قہقہوں سے محفل زردزعفران بن گئی۔

عین وسط شندور گراؤنڈ سے تا حد نگاہ ہریالی ہی ہریالی تھی اور چوٹیوں کے ٹاپ پر برف کی سفیدی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کہنہ مشق رنگساز نے تمام چوٹیوں پر سفید رنگ سے رنگا ہے۔ یہ چمکتا سفید رنگ یہاں پڑی برف کا تھا۔ اگست کے مہینے میں اتنی برف اور برفیلی ہوائیں۔ یہ خدائے ذوالجلال کا قدرتی ڈیپ فریزر ہے اور پورا شندور آٹھ مہینے برف سے ڈھکا ہوتا ہے اور روڈ بند ہو جاتا ہے۔ پہاڑی چوٹیوں پر پورا سال برف موجود رہتی ہے۔ فلک بوس پہاڑیاں اور دل و دماغ ماؤف کر دینے والی ٹھنڈ۔ برف، گلیشیر، برفانی دراڑیں، برفانی تودے، میٹھے پانی اور شندور جھیل کی جھلملاہٹ یہاں کی سوغات ہیں۔ اتنے سخت موسم

اور ٹھنڈک ہیں بھی جنگلی جانور یہاں موجود ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ مارخور، ہرن، بارہ سنگا، برفانی چیتا، برفانی گیدڑ اور برفانی لومڑی برفیلے پہاڑوں اور کھائیوں میں بسیرا جمائے ہوئے ہیں۔ لوگ ان کا شکار بھی کرتے ہیں۔ یہ خونخوار درندے اکثر بھیڑ بکریوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور بڑا نقصان کر جاتے ہیں۔

شندور کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا، جو دوست وہاں سے ہو کر آئے تھے یا کبھی وہاں سے ان کا گزر ہوا تھا ان کی بیتیاں بھی سن کر ہم دل ہی دل میں ارمان سجائے بیٹھے تھے۔ یار لوگوں سے سنا تھا کہ شندور میلے کا اپنا رنگ ہوتا ہے مگر مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ یہ میلہ جولائی کے بجائے اگست کے اواخر میں ہو تو شاید زیادہ رنگینی ہو۔ کیونکہ جولائی میں وہاں ٹھیک سے سبزہ بھی نہیں اگتا ہوگا۔ اب میں خود اس کی ظاہری و باطنی خوبصورتی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مجھے بہار کا احساس ہو رہا تھا، کیونکہ شندور میں پھول جھوم جھوم کر معانقہ کر رہے تھے۔ ان کا یوں سرِ راہ گلے میرے لیے تکلیف دہ تھا، میں بھی کوئی گُل ہوں کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ کسی کی یاد میں ایک سرد آہ بھر لی۔ اس بدیہی حقیقت سے کوئی انکاری نہیں کہ مرد کی زندگی میں سرور، لطف اور بہار اس وقت آتی ہے جب اس کا محبوب اس کے پاس ہو۔ وصالِ یار نصیب ہو تو خزاں میں بھی خزاں کی تلخیوں سے طبیعت مضمحل نہیں ہوتی۔ مرد اور عورت لازم و ملزم ہیں۔ جنت میں باوا آدم کا دل نہ لگا تو انہوں نے خالق دوجہاں کی دربار

ہیں ایک ہم جنس کی اپیل دائر کردی، اور اللہ نے آدم کو امی حوا ودیعت کی۔ یار لوگ تو امی حوا کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ ان کی وجہ سے آدم کو باغِ عدن سے نکلنا پڑا مگر یہ تو نری حماقت ہے۔ علت وہ نہیں بنی بلکہ اللہ کو اپنی دنیا بسانی تھی۔ ایسی دنیا جہاں شندور جیسی شاہکار جگہیں ہوں۔ شندور میں مجھے کوئی یاد آ رہا تھا، دل میں ٹیسیں اٹھ رہی تھی۔ حق نواز صاحب تو بار بار اپنے ہم جنس کو یاد فرماتے۔ حیلے بہانوں سے تذکرہِ یار سے محفل کشت زعفران بنا دیتے۔ کسی اچھے مقام پر، ہریالی کے آغوش میں، مختلف النوع کھانوں کے دستر خوان پر، بہتے جھرنوں کے دامن میں، جھیل کنارے اور شگفتہ محفلوں میں انہیں ''وہ'' یاد آتی اور آہیں بھرتے۔ اس بڑھاپے میں بھی یہ ذوق سلیم اور دریا دلی۔ ہمارے جیسے معاشروں میں ایسی روایات متروک سمجھی جاتیں ہیں۔ ہم نے خود کو ایک خول میں بند کر رکھا ہے۔ ہم میں ہر ایک اس مخصوص خول سے نکلنا چاہتا ہے مگر معاشرتی رویوں اور ناہمواریوں کی وجہ سے ہم نے کئی کور پہن لیے ہیں اور ایک بناوٹی تصنع سے دوسروں کو مرعوب کرتے ہیں مگر فطرت سے انکار ممکن نہیں۔ اور ہم تھے کہ یاد کرنے کی بھی جسارت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم سے تو سب کچھ لٹ چکا تھا یا لوٹ لیا گیا تھا۔ اس معنوں میں ہم شندور سے مکمل لطف اندوز نہ ہو سکے۔

آگست کے آواخر میں ہری ہری باریک کونپلیں، ہر طرف کھلے پھول اور سبزہ میں

بہار کا اختتام نظر آیا۔ محسوس ہوتا تھا کہ نارمل موسم ختم ہوتا جارہا ہے اور سردی زور پکڑ رہی تھی۔ لوگوں کو سویٹر اور اور کوٹ پہنتے پایا، چوٹیوں پر برف میں کمی آچکی ہے۔ گلیشیر سے پانی نالوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور یہی نالے دریا کا وجود ہے۔ برف پوش پہاڑی چوٹیوں کی سنگلاخ چٹانیں نظر آتی تھیں اور وہاں سے پانی رواں بہتا دکھائی دیتا تھا۔ ہماری گاڑیوں کے شیشے بھی کھلے تھے۔ نظر اٹھا کر اوپر دیکھیں تو پانی گویا پہاڑ کی چوٹی سے آتا محسوس ہوتا تھا۔ اور پھر شندور سڑک کے ساتھ ساتھ چند مکانات بھی نظر آتے تھے۔ چھوٹی بڑی آبادیاں بھی تھیں۔ کہی کہی پر کوئی مسافر مع فیملی خیمہ زن دکھائی دے رہے تھے۔ لوگ گوبر سکھا کر گدھوں پر لادتے روڈ کنارے چل رہے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ یہ کلمات نکلے۔ '' فبأی آلاء ربکما تکذبان'' اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

چترال سولاسپور سے پھنڈر گلاغمولی تک کے درمیانی جگہوں میں ہم کئی بار اترے، ہر چشمہ اور بہتے پانی کے پاس اترتے اور میٹھے پانی سے شکم سیر ہوتے۔ قاضی نثار احمد صاحب جگہ جگہ وضوء کرتے۔ وہ سفر اور حضر دونوں میں اکثر باوضو رہتے ہیں۔ قدرت کی صناعیوں پر تبصرہ کرتے۔ ہماری گاڑی کے ساتھ ڈھولتی کشتی بھی متصل چلتی۔ مولانا منیر اور محمد نواز بھی مختلف مقامات پر اتر کر، اچھے تبصرے و تجزیے فرماتے۔ حق نواز صاحب کی وجہ سے تو سفر کا مزہ دوبالا

ہوتا۔ جب ہم چترال جا رہے تھے تو ہمارے ساتھ عمر حسن بھی تھا مگر واپسی پر وہ نہیں آئے تھے۔ چترال سے بذریعہ سوات کراچی چلے گئے تھے۔

شندور ٹاپ پر جب مولانا منیر نے آذان دی تو بہت ہی مزہ آیا۔ یخ پانی سے وضو کیا اور کھلے آسمان تلے قاضی صاحب کی اقتداء میں باجماعت نماز ادا کی۔ یہاں ہمیں قبلہ کی شناخت درپیش آئی جو مقامی لوگوں نے حل کر دیا۔ افسوس تب ہوا جب کچھ نوجوانوں سے قبلہ پوچھا تو وہ مبہوت ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم میں مسلمانیت کی رمق کتنی باقی رہی ہے یہ اس بات سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو قبلہ تک کا بھی علم نہیں۔ پھر بھی ہم نصرت خداوندی کے منتظر ہوتے ہیں اور نہ ملنے پر شکوہ بھی کرتے ہیں۔
عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء متشدد ہوتے ہیں۔ جائز سیر و سفر اور سیاحت کے بھی مخالف ہوتے ہیں مگر حقیقت کا اس سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ ہمارے اس سفر میں سیکورٹی کے علاوہ تمام علماء تھے مگر مجھے کہیں پر بھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی کہ سفری رخصتوں پر ہمیں ٹوکا گیا ہو۔ حق نواز صاحب اور قاضی صاحب نماز کے حوالے سے اکثر متفکر رہتے اور جہاں کہیں موقع ملتا نماز کے لیے گاڑیاں رکواتے۔ اب اگر سفر کا نام دے کر نماز بھی ترک کر دی جائے اور الزام بھی علماء اور دینداروں کو دیا جائے تو یہ صریح خیانت

اور ناانصافی ہے۔

ہم شندور سے خریت سے پہنچے مگر میرا دل وہاں کہیں رہ گیا ہے۔ میرا دل زبردستی مجھ سے نکلا اور شندور کی خوبصورت جھیل میں گم ہوا۔ میرے تمام احساسات وہاں کہی رہ گئے ہیں۔شندور سے میرا رابطہ کسی کے ساتھ نہیں ہو رہا تھا اور ہوتا بھی کیسے۔

میرا دھیان موبائل فون کی طرف قطعاً نہیں گیا تھا۔ مجھے کسی کی کال اور مسیج کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ میں جہاں دیکھتا وہاں کھو جاتا ۔آج بھی مجھے وہ مناظر بڑے تنگ کرتے ہیں۔ انشاء اللہ اس خوبصورت حسین پری زاد وادی میں دوبارہ جانے کا بھی موقع ملے گا۔ (جاری)

شاہی مسجد چترال

شندور سے مسلسل سات گھنٹے سفر کرکے رات بارہ بجے چترال شہر پہنچے اور یہاں عالمگیر ہوٹل میں رات گزاری۔ صبح ناشتے کے بعد سب سے پہلے شاہی مسجد جانے کا طے ہوا۔ قاضی نثاراحمد نے کہاکہ '' بمبوریت (کیلاش) اور گرم چشمے کی سیر سے پہلے یہاں کی تاریخی شاہی مسجد دیکھیں گے ۔ دو رکعت پڑھ کر وہاں موجود علماء سے ملاقات کرکے آگے نکلیں گے'' ۔ ہم نے حامی بھر لی اوراپنے لکھاری دوست ڈاکٹر پروفیسر عنایت اللہ فیضی کو کال ملایا اورانہیں بتایا کہ ہم علماء کا ایک وفد قاضی صاحب کی معیت میں چترال آئے ہیں ۔ ابھی ہم شاہی مسجد کا قصد کرچکے ہیں اگر آپ کے پاس فرصت ہے تو وہاں تشریف لائیں۔یقین کریں کہ انہوں نے انتہائی مسرت سے چترال ویلکم کہااور فورا کہاکہ میں شاہی مسجد کے خطیب اور دارلعلوم شاہی مسجد چترال کے علماء کو اطلاع کرتاہوں کہ وہ بھی جمع ہوجائے اور شاہی مسجد کے خطیب مولانا خلیق الزمان کا فون نمبر بھی سینڈ کیااور ان کو ہمارے آنے کی اطلاع بھی کردی۔ مولانا خلیق الزمان صاحب سے بات ہوئی توانہوں نے کہاکہ میں پہنچ جاؤنگا،آپ وہاں تشریف لے چلیں۔یوں ہم شاہی مسجد چترال پہنچ گئے۔

میرے سامنے قدیم طرز کی ایک خوبصورت مسجد اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ موجود تھی۔ یہ چترال کی مشہور'' شاہی مسجد چترال'' تھی۔ وسعت، مضبوطی، گل کاری اور نقاشی سے مزین یہ مسجد 1919ء کو شروع ہو کر 1925 کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس کی تعمیر مہتر چترال جناب سر شجاع الملک مرحوم نے کروائی ہے۔ مسجد کا رقبہ چھ کنال دو مرلہ ہے۔ پکی اینٹوں اور سنگ مرمر سے بنائی گئی اس مسجد میں تین ہزار سے زائد نمازیوں کی گنجائش ہے۔ اس مسجد کے مینارے دور سے نظر آتے ہیں اور بہت ہی خوبصورت ہیں۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر مسجد میں داخل ہوئے، تحیۃ المسجد پڑھا، قاضی صاحب اور مولانا حق نواز مسجد کو دیکھنے میں مصروف ہوئے۔ ہمارے دوسرے ساتھی بھی پہنچ چکے تھے۔ مسجد میں حفظ اور درس نظامی کی کلاسیں لگی ہوئی تھیں۔ مولانا محمد صاحب الزمان صاحب نوراللہ مرقدہ، (فاضل دارالعلوم دیوبند) اس مسجد کے خطیب تھے اور اب ان کے صاحبزادے مولانا خلیق الزمان صاحب خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت مسجد ہے۔ یہ مسجد سرکار کے زیر انتظام ہے۔ مسجد کے متصل گورنمنٹ دارالعلوم چترال ہے اور ساتھ شاہی قلعہ چترال بھی ہے جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مسجد کے ایک طرف بڑے بڑے درخت ہے اوران درختوں کے اوٹ میں دریائے چترال اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اور خوشگوار ہوائیں چل رہی تھی۔ درختوں پر بیٹھے پرندے دریائے چترال کی سروں پر رقص کررہے تھے اور محبت کے گیت گارہے تھے۔ ان پرندوں کو قطعاً اس کی خبر نہیں تھی کہ دریائے چترال کی منزل کیا ہے۔ وہ تو

اپنی ذات میں محبت کے تلاش مسلسل میں مگن تھے۔ اس دریا سے صرف چترال کے پہاڑوں کی نہیں گلگت کی دوشیزاؤں اور افغانستان کی نازنینوں کی بھی مہک آرہی تھی۔
ہمارے احباب گورنمنٹ دارالعلوم چترال کی آفس پہنچ گئے جہاں دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا حفیظ الرحمان نے ''اھلا و سہلا'' کہا، یوں علماء کے ساتھ مجلس شروع ہو گئی ہے۔ مولانا حفیظ الرحمان نے گورنمنٹ دارالعلوم چترال کی ہسٹری بتلانا شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ دارلعلوم 1952ء میں قائم ہوا ہے۔ اس کے صدرالمدرسین اور مدرسین کے لیے شرط یہ ہے کہ فاضل دارالعلوم دیوبند ہوں یا مکتبہ دیوبند کے وفاقی بورڈ وفاق المدارس کے ملحقہ مدارس کا تربیت یافتہ ہوں۔ اساتذہ کی تقرری حکومت کی جانب سے عمل میں لائی جاتی ہے اور تنخواہیں بھی حکومت دیتی ہے۔ صدرالمدرسین سینارٹی کے طور پر چُنا جاتا ہے۔ گورنمنٹ دارالعلوم کے تمام اساتذہ سرکاری ملازم ہیں۔ یہ دارالعلوم وفاق المدارس العربیہ کے ساتھ منسلک نہیں ہے تاہم وفاق کا سلیبس یعنی درس نظامی ہی پڑھایا جاتا ہے۔ روز اول سے آج تک دورہ حدیث تک پڑھایا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے حکومت نے اس کی سند کو باقاعدہ تسلیم کیا ہے''۔ گورنمنٹ دارالعلوم چترال کی طرح پاکستان میں تین مدارس اور بھی ہیں جن کا انتظام سرکاری ہے۔ دو مدارس سوات میں اور تیسرا بھی چترال ہی میں ہے۔ اس دارلعلوم کے

صدرالمدرسین بہت بڑی علمی شخصیات رہی ہیں جن میں مولانا اجلال الدین صدرالمدرسین اول، مولانا یوسف صاحب صدرالمدرسین دوم رحمہم اللہ تھے جو دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے فضلاء تھے۔ جس فرشی نشست پر ہم بیٹھے تھے وہاں چترال کے جید علماء کی ایک بڑی تعداد گلگت سے قاضی صاحب اور دیگر علماء کرام کی آمد کا سن کر ہنگامی بنیادوں پر جمع ہوئے تھے۔ ان کا یہ انداز دلبرانہ بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔ برادرم نور محمد تو علماء کی خدمت کے لیے وقف ہیں خصوصی تشریف لائے تھے۔ جن علماء نے خصوصی طور پر اس نشست میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں مولانا ثناء اللہ، مولانا عبدالاعلی، مفتی شریف اللہ، مولانا محمد رفیق، مولانا شبیر احمد نقشبندی، مولانا فضل حق، مولانا عبدالقیوم حقانی وغیرہ شامل تھے۔ یہ تمام علماء چترال کے چیدہ علماء ہیں۔

گورنمنٹ دارالعلوم چترال کی صدرالمدرسین کی آفس میں ایک مختصر مگر بہت ہی پر اثر نشست ہوئی۔ اس نشست کا تذکرہ چترال کے معروف لکھاری پروفیسر ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی نے اپنے ایک کالم میں ان الفاظ میں کی ہے۔ ''مرکزی جامع مسجد گلگت کے خطیب قاضی نثار احمد صاحب گذشتہ دنوں چترال تشریف لائے۔ برادر گرامی امیر جان حقانی صاحب کے توسط سے قاضی صاحب کی مجلس میں چند لمحے بیٹھنے کا موقع ملا۔ شاہی مسجد چترال سے ملحق مدرسہ جامعہ اسلامیہ چترال کے دار اہتمام میں فرشی نشست تھی۔ مولانا حفیظ الرحمٰن نے قاضی نثار

احمد صاحب کا استقبال کیا۔ مولانا غلام یوسف، مولانا خلیق الزمان خطیب شاہی مسجد اور دیگر علماء موجود تھے۔ چونکہ یہ قاضی نثار احمد کا پہلا دورہ تھا۔ مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ مقامات دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے زیادہ تر گفتگو پروگرام پر مرکوز رہی۔ بحث کے بعد طے پایا کہ بموریت اور گرم چشمہ کا مختصر دورہ ہوگا۔ علماء اور فضلاء کے ساتھ انفرادی ملاقاتیں ہونگی۔ اجتماعی پروگرام یا خطاب کا وقت نہیں ملے گا۔ شاہی مسجد کے خطیب مولانا خلیق الزمان کے والد گرامی مولانا صاحب الزمان مرحوم چترال کے پہلے صحافی اور چترال کے پہلے ہفتہ روزہ اخبار ترچمیر کے ایڈیٹر تھے۔ پدری پیشہ ہونے کے ناطے خطیب صاحب کی رگ صحافت پھڑک اُٹھی اور انہوں نے قاضی صاحب سے گلگت کی صورت حال خصوصاً فرقہ ورانہ کشیدگی کے بارے میں سوال پوچھا۔ سوال کے جواب میں قاضی نثار احمد صاحب نے کہا کہ اللہ کے فضل سے امن برقرار ہے۔ سال سے زیادہ کا عرصہ گذرا کوئی بدامنی نہیں ہوئی۔ اپنی گفتگو میں قاضی نثار احمد صاحب نے تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اہل سنت والجماعت کا مطالبہ یہ کہ گلگت اور بلتستان کو کشمیر کا وحدت قرار دیا جائے۔ یہ علاقہ تاریخی اعتبار سے وحدت کشمیر میں شامل ہے۔ اور اس کا مستقبل بھی کشمیر کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے۔ کشمیر بھی پاکستان کا ناقابل تقسیم حصہ ہے گلگت بلتستان بھی پاکستان کا ناقابل تقسیم حصہ ہے۔ گلگت بلتستان کو الگ کرنے سے کشمیر پر ہمارا قومی موقف کمزور ہو جائے گا۔

ہمارا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ گلگت بلتستان کو اگر کشمیر کی وحدت کا حصہ تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ تو کوہستان ، شگرام اور چترال کے ملحقہ اضلاع کو گلگت بلتستان کے ساتھ ملا کر ملک کا پانچواں صوبہ قرار دیا جائے۔ سپریم کورٹ کا دائرہ کار گلگت بلتستان تک بڑھایا جائے ۔ قومی اسمبلی اور سینٹ میں گلگت بلتستان کو نمائیندگی دی جائے۔ تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ کوہستان ، اور چترال میں سے کسی ایک ضلع کو گلگت بلتستان میں شامل کرکے الگ صوبہ بنایا جائے۔ یہ اہل سنت اولجماعت کا اصولی موقف ہے ہم نے ہر فورم پر گلگت بلتستان کے موجودہ انتظامی ڈھانچے اور موجودہ سیاسی اور آئینی ڈھانچے کی مخالفت کی ہے۔ یہ ڈھانچہ عوامی احساسات اور جذبات کی عکاسی نہیں کرتا۔ اس ڈھانچے میں عوام کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا اس ڈھانچے کی بنیاد بدنیتی پر رکھی گئی ہے۔ اور اس کا تعلق تاریخی حقائق یا عوامی جذبات واحساسات سے ہرگز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس سسٹم نے عوام کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ چند لوگوں کو عہدے ملے ہیں۔ چند گاڑیوں پر جھنڈے لگے نہیں۔ جب وہ جھنڈے لہراتے ہوائے ، بازاروں سے گذرتے ہیں۔ تو لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں جھنڈا لہرانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ ''۔

قارئین یقین جانیں: یہ فرشی نشست چترال اور گلگت بلتستان کے علماء میں

اشتراک عمل اور مذہبی و سیاسی حرکیات کا پیش خیمہ بن گئی۔ چترال کے علماء و خواص نے تین روز جس محبت و اکرام کا ثبوت دیا وہ تاریخ کا انمٹ حصہ ہے۔چترال کے علماء کی یہ چاہت بہت واضح تھی کہ آئندہ گلگت بلتستان اور چترال کے علماء میں قریبی تعلق ہو اور ایک دوسروں کے مسائل اور ضروریات سمجھنے کی کوشش کی جائے گی اور گلگت بلتستان کے حوالے سے آئینی و قانونی جدوجہد کو مشترک پلیٹ فارم سے آگے بڑھایا جائے۔چترال کے معزز علماء نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اس طرح کے دینی و سیاسی دورے وقتاً فوقتاً ہونے چاہیے،انھوں نے وفود کی شکل میں گلگت آنے کی خواہش ظاہر کی جس پر انہیں ویلکم کہا گیا۔امید قوی ہے کہ مابین اشتراک عمل کا یہ تسلسل بہتر طریقے سے آگے بڑھے گا۔ (جاری .....)

کافرستان ایک نظر میں

چترال سے تقریباً دو گھنٹے کا سفر کرکے ہم بموریت پہنچ گئے۔ بموریت کیلاشیوں کا صدر مقام ہے۔جناب ثروت مذہباً کیلاشی ہے مگر سیاسی طور پر جے یو آئی بموریت کا رہنماء ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کافرستان کی تینوں وادیوں بریر، رمبور اور بموریت کی کل آبادی تقریبا بارہ ہزار کے قریب ہے۔لیکن اس میں کالاش قبیلہ یعنی کافروں کی آبادی صرف تین سے ساڑھے تین ہزار کے لگ بھگ ہے۔ باقی اہل سنت آبادی ہے۔ تبلیغی جماعت والوں نے انتہائی حکمت وبصیرت سے کیلاشیوں کو مسلمان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مختلف لوگوں سے بات چیت کے دوران مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کافرستان میں سب سے خوبصورت اور اہم بات یہ ہے کہ یہاں کے اہل سنت اور کیلاشی آپس میں مذہبی تفریق کے بِنا رہتے ہیں۔ ان میں مذہبی منافرت اور جھگڑا بالکل بھی نہیں ہے۔اس میں مسلمان اور کیلاشی دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔ ہونا بھی چاہیے کیونکہ امن ہر ایک کی ضرورت ہے۔کاش یہ ماحول گلگت اور پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی پیدا ہوجاتا۔

دوباش چیک پوسٹ سے بموریت تک 12 میل کا فاصلہ جبکہ رمبور تک بھی دس کلومیٹر کا راستہ ہے۔ بقول بھائی نور محمد کے آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑی وادی

بموریت ہے اور رمبور ایک تنگ وادی ہے۔ لیکن لمبائی میں دیگر دونوں وادیوں سے زیادہ ہے۔ وہاں گھنے جنگلات ہیں اور ایک جھیل بھی ہے۔ رمبور میں ایک چشمہ بھی ہے جو امراض پیٹ، پھوڑے، دانے، پھنسیوں اور دیگر امراضِ جلد کے علاج کے لیے معروف ہے۔ ایک کیلاشی خاتون نے ایک عجیب بات بھی بتائی کہ رمبور سے کیلاش کی ایک خاتون پائلٹ بن گئی ہے جو کیلاشیوں کی پہلی پائلٹ ہے اس کا نام لیکشن بی بی ہے۔ ہم رمبور اور بریر تو نہ جاسکے البتہ بموریت کا لطف دلجمعی سے اٹھاتے رہے۔

بموریت میں پہنچ کر دوپہر کا کھانا پیلس ہوٹل میں تناول کیا۔ بھائی نور محمد نے قبل ازوقت انتظام کروالیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد قافلے کے احباب تین گروپوں میں تقسیم ہوئے۔ میں، بھائی عمر، محمد نواز، مولانا منیر، مولانا نظیم اور ایک مقامی ساتھی اشفاق گاڑی لیے خاص کیلاشیوں کی صدر مقام کے طرف چل دیے جہاں جیسٹک ٹمپل، (جسے کیلاشی لوگ جسٹہ خان کہتے ہیں) بشالینی، کیلاش دوکانیں اور چہلم و تہواروں کی جگہیں ہیں۔ وادی بموریت بہت خوبصورت لگی۔ گندم کے لہلہاتے کھیت، اونچے ہرے بھرے پھلدار درخت، اخروٹ، انجیر اور خوبانی کے ان گنت درخت، بہتے جھرنے، گنے جنگلات، مختلف النوع ملبوسات میں مرد وزن اور ٹہلتے بچوں نے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کیے ہوئے تھے۔ یہ بچے ہر سیاح کے لیے زینت بنے ہوئے تھے اور شاید سیاح بھی ان کی تفریح کا

ذریعہ تھے۔ جانبین سے لطف اندوزی کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

ہمارے احباب کا ایک گروپ پیلس ہوٹل سے پیادہ چلتا ہوا بہت اوپر تک چلا گیا۔ جہاں جنگلات تھے۔ جبکہ قاضی صاحب اور مولانا حق نواز، بھائی نور محمد کی معیت میں کسی کی تعزیت پر گئے۔ بھائی نور محمد کے سسرال وہی بمبوریت میں ہیں۔ انہوں نے ہماری مہمان نوازی کا سارا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ان کے ہاں کوئی فوتگی ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے وہاں نماز عصر کے بعد اصلاحی بیان بھی کیا۔

بہر صورت ہم وہاں پہنچے جہاں کیلاشیوں کی مرکزی جگہ ہے۔ انوکھی رسومات اور انتہائی منفرد و دلچسپ تہواروں کی سرزمین ... وادیِ کافرستان ... جس کے حسن نے ہمیں مسحور کردیا۔ یہاں کے سبز پوش پہاڑ، بل کھاتے پانی، مکئی کے لہلاتے کھیت، خوشبو بکھیرتی فضاؤں نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور زرق برق لباس میں ملبوس کیلاشی حسینائیں، روایتی ٹوپیاں پہنی نوعمر بچیاں، دوکانوں پر کھڑی بوڑھی کیلاشی خواتین، سیاحوں کے منتظر کیلاشی مردوں کا ادھر ادھر گھومنا پھرنا یقیناً دلکشی سے خالی نہیں تھا۔ میں اس خاص گاؤں یعنی کراکال کے پورے علاقے میں پیدل گھومتا رہا۔ میرے ساتھی کبھی میرے ساتھ ہوتے کبھی کہیں دور نکل جاتے۔ مجھے کیلاش کی سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے کہیں پرانی طرز کے لکڑی کے گھروں کی کھڑکیوں، کہیں دو منزلوں، کہیں بالکونیوں سے جھانکتی

سروں پر سیپیوں اور تاج والی ٹوپیاں اور گلوں میں پیلے اور نیلے کلر کی موتیوں کی مالائیں پہنے حسین دوشیزائیں دکھائی دیتی تھیں۔ کہیں دشوار گزار راستوں سے پیٹھ اور کاندھوں پر بوجھ اٹھائے گزرتے ہوئے بوڑھے مرد اور نوجوان خواتین نظر آ رہی تھیں۔ اور کہیں کہیں پر بچپن کے معصوم کھیلوں میں مصروف شفاف گلابی رنگت والے حسین بچے بچیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان سے مل کر مجھے ایک خوشی محسوس ہوتی تھی۔ یہ کیلاشی زبان میں بات کرتے تھے۔ میں ان کی خیریت دریافت کرتا تو وہ ہنستے مسکراتے سرہلادیتے تھے۔ اور کہیں کہیں ''ایش پاتا'' کہتے تھے۔ میرے ساتھ جو وہاں کا مکین اشفاق تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ یہ آپ کی خریت پوچھتے ہیں۔ میں نے اشفاق سے پوچھا کہ ایش پاتا کا کیا مطلب ہے۔ تو اس نے کہا ''تم کیسے ہو''۔ یوں سمجھو یہ آپ کو سلام عرض کررہے ہیں۔ مجھے ان کا اس طرح کہنا بے حد اچھا لگا۔ میں نے کیلاشی بچے بچیوں کے ساتھ بہت ساری تصویری بنوائی۔ میں نے ان سے تصویر بنانے کو کہا تو ان بچوں نے منع کیا۔ اصرار کرنے پر انہوں نے کیلاشی زبان میں کچھ کہا۔ اشفاق نے بتایا کہ وہ پیسے مانگ رہے ہیں۔ تب مجھے سمجھ آیا کہ کیلاشی بچے بھی کمرشل ہوگئے ہیں۔ جس جگہ کیلاشیوں کے تہذیبی فنکشن اور مذہبی تہواور اور چہلم منعقد ہوتے ہیں وہاں دو معصوم بچیوں کے ساتھ تصویریں بنوا رہا تھا تو کافی دور بیٹھی ایک کیلاشی خاتون نے آواز لگائی اور بچیوں سے کچھ کہا۔ ایک بچی نے مجھ سے اردو میں کہا کہ انکل بیس روپے دیجیے۔ بیس روپے ان کو پکڑا کر ان سے

پوچھا کہ وہ کیا پڑھتی ہیں تو وہ دونوں بچیاں کسی انگلش میڈیم اسکول میں تیسری کی طالبات تھیں۔

یہ حقیقت بہر صورت ہمیں ماننی ہوگی کہ کافرستان کہلانے والی وادی کیلاش انسانی تہذیب وثقافت، رسم و رواج اور تمدن کے حوالے سے ایک مکمل عجوبہ ہے۔اس وادی کو کافرستان کہاجاتا ہے۔ سنا یہ تھا کہ یہ لوگ نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کا کوئی مذہب ہوتا ہے!! یا للعجب، مگر مجھے تو ان کا مذہب بھی نظر آیا مذہبی عبادت خانہ بھی۔ اور جن جن کیلاشیوں سے میری گفتگو ہوئی ان کے مطابق وہ عبادت بھی کرتے ہیں یعنی خدا کی پوجا کرتے ہیں۔ تو پھر وہ کیسے خدا کو نہیں مانتے۔ یہاں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کیلاش اور کیلاشیوں کے بارے میں جو سنا تھا اس سے یکسر مختلف پایا۔ ہمارے کچھ سیاح ایک غلط نیت سے وہاں جاتے ہیں مگر وہ مایوس لوٹتے ہیں۔ پھر اس مایوسی کو چھپانے کے لیے من گھڑت کہانیاں گھڑ لیتے ہیں جن کا حقیقت سے تعلق نہیں ہوتا۔کیلاشی لوگ شراب ضرور پیتے ہیں مگر وہ کباب کا استعمال نہیں کرتے۔ بقول نور محمد کے وہ سال بھر مے نوشی نہیں کرتے بلکہ اپنے تہواروں کے دوران مشروب مغرب سے غمِ زندگی بھلاتے ہیں۔اور حالتِ کیف و سرور میں آجاتے ہیں۔میں نے خود مسلمانوں کو ان کے گھروں میں شراب پیتے دیکھا، مگر اس کا لازمی مقصد یہ نہیں کہ وہ شراب کے بعد کوئی غلط کاری کا سلسلہ بھی چلاتے

ہیں۔ یہ نری بہتان ہے کیلاشیوں پر۔

مجھے کیلاش کے مشہور آدمی شہزادہ خان کے گھر جانے کا موقع بھی ملا۔ صدر پرویز مشرف بھی شہزادہ خان کے گھر گئے تھے۔ شہزادہ خان نے مشرف کے ساتھ بنائی گئی اپنی تصاویر بھی دکھائی۔ شہزادہ خان کا گھر تین منزلہ ہے۔ گھر کی تعمیر و تزئین میں لکڑیوں کا استعمال بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے گھر میں کچھ مسلمان بیٹھے مشروب مغرب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شہزادہ خان نے خشک شہتوت اور اخروٹ سے تواضع کیا۔ اپنے گھر کا اندورنی تمام حصے بھی دکھائے۔ ان کی عورت کا نام غالباً رحیماں بتایا۔ انہوں نے ایک رجسٹر پیش کی۔ جس پر میں نے تاثرات بھی لکھ ڈالے اور ان سے ان کا سیل نمبر بھی لیا۔ ان کے ہاں کئی ساری پکچرز بنوائی۔ جناب ثروت نے ان تمام اہم مقامات کی سیر بھی کروائی جہاں کیلاشی لوگ اپنے فنکشن کرتے ہیں۔ اپنا معبد بھی دکھایا۔ مجھے ان کا قبرستان بھی دیکھنے کا تفصیلی موقع ملا۔ بہر صورت آئندہ کی قسطوں میں کیلاشیوں کا مذہب، رہن سہن، طور اطوار، مذہبی و رسومی میلہ جات، مختلف فیسٹول، فوتگیاں اور حائض عورتوں کی آنکھوں دیکھی روایات، بشالینی، ان کے لباس، زیوارات، پرانی روایات اور جدید طور طریقے، تعلیم و صحت اور بہت کچھ جو مجھے کیلاشی مرد و خواتین سے گفتگو کے دوران حاصل ہوا، کاغذ کے سپرد کرونگا۔ یہ تجزیہ بھی کرونگا کہ تبلیغی جماعت والوں نے کیسے ان کو مسلمان

بنایا اور پھر یہ بھی کہ حکومت پاکستان اور دیگر ملکی اور بین الاقوامی این جی اوز کیلاشی کلچر اور پرانی تہذیب کو بچانے کے لیے کتنا فنڈ خرچ کرتی ہے۔ ان کے مقاصد کیا ہیں۔ غرض میری نوٹ بک میں کیلاش اور کیلاشیوں کے حوالے سے کافی نوٹس ہیں۔ اور میرا دماغ بھی معلومات سے مزین ہے۔ آپ دعا کریں اللہ مجھے درست لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کراکال میں ایک مدرسہ روضۃ القرآن کے نام سے ہے۔ جو نیو تعمیر کے لیے ڈھائی گئی ہے۔ کیلاشیوں کے قبرستان کے متصل مسجد قباء اور مدرسہ تقویۃ الایمان کی نئی نئی تعمیر ہورہی ہیں جن کے مدیر و امام قاری یوسف صاحب ہیں۔ کسی مقامی ساتھی نے بتایا کہ کچھ سال پہلے کافی سارے کیلاشی مسلمان ہوئے اور انھوں نے اپنے لیے ایک مدرسہ بنایا ہے۔ جہاں وہ اسلام کے ابتدائی فرائض و واجبات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مغرب کے قریب ہم سب ساتھی اکھٹے ہوئے اور واپس کراکال سے نیچے آنے لگے۔ بتریک بموریت کی مسجد ابوھریرہ یں نماز مغرب ادا کی۔ قاضی صاحب نماز کے بعد مسجد کے برآمد میں براجمان ہوئے۔ ہمارے میزبان بھی تھے۔ وہاں ساتھیوں نے لطیفے بھی سنائے۔ دن بھر کی کارگزاریاں بھی دیں۔ بھائی نور محمد نے رات کا انتظام اپنے سسرالیوں کے پاس کیا تھا ان کا گھر مسجد سے متصل تھا۔ رات گئے تک مختلف موضوعات پر گپ شپ ہوتی رہی۔ حق نواز صاحب اور منیر صاحب کی دلکش باتوں سے اور عمر اسد کی سنجیدہ مگر۔۔۔۔ سے احباب محظوظ

ہوتے۔ رات بہت اچھی بیتی۔ ماہ اگست ہیں کمبلوں سے گزارا ہوا۔ یعنی کافی ٹھنڈ لگی۔

... (جاری)

چترال سے کافرستان تک - 1

دارالعلوم چترال کی فرشی نشست میں اگلے دو دن کا پروگرام طے پایا۔ ہم صرف ایک دن کے سفر کی نیت سے نکلے تھے مگر وہاں کے علماء نے مزید دو دن ٹھہرنے پر مجبور کیا۔
شاہی قلعہ چترال اور شاہی مسجد کی زیارت کے بعد ہم کیلاش کی طرف روانہ
ہوئے۔ کیلاش جس کو کافرستان بھی کہا جاتا ہے۔ بھائی نور محمد نے قاضی صاحب کو اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بٹھایا، ہم نے سیکورٹی کا عذر کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ چترال ہے گلگت نہیں۔ یہاں ہم معزز مہمانوں کو پچھلی نشست میں بٹھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ یوں چترال بازار سے ہوتے ہوئی چھاؤنی پل کراس کرکے کیلاش روانہ ہوئے۔ چترال بازار بہت چھوٹا معلوم ہوا۔ روڈ بھی بہت تنگ۔ جگہ جگہ کھڈے۔ ہمارے احباب کا مشاہدہ یہ تھا کہ گلگت کی نسبت چترال بہت پسماندہ ہے۔ یہاں کے ہوٹل مہنگے ہیں۔ بازاروں کی حالت بھی کوئی قابل ذکر نہیں۔ چترال کے لوگ بہت معتدل ہیں۔ نرم خوئی میں
پورے ملک میں ان کی مثال نہیں ملتی۔۔ بھائی نور محمد چترال کی خوبصورت وادیوں کا تعارف کرواتا جاتا۔ بروز میں برلب روڈ مسجد گنبد میں نماز ظہر ادا کی۔ قاضی صاحب کے رفیق درس مولانا نصیر خان نقشبندی نے ہمارے احباب کا بعدِ نماز اکرام کیا
اور وہاں سے اپنے گھر کی راہ لی۔ وہاں مولانا انعام الحق مہتمم علوم الشرعیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہم پشاور روڈ سے ٹرن لیتے ہوئے

ایون کی طرف مڑے۔۔بروز سے لواری ٹنل تک چالیس کلومیٹر کا سفر ہے۔ لواری ٹنل کا فاصلہ آٹھ کلومیٹر ہے۔اس کا ٹھیکہ کورین کی سامبو کمپنی کے پاس ہے۔ پشاور روڈ سے ایون کا منظر بے حد ہی دلچسپ لگتا تھا۔ گندم کی فصلیں پک کر تیار ہوئی تھیں اور ایون کا پورا علاقہ سبزہ اور گندمی رنگ سے رنگا ہوا تھا۔بڑا ذرخیز علاقہ ہے۔ہرے بھرے کھیت و کھلیان اور لمبے لمبے درخت اور ساتھ ساتھ دریائے چترال کی نیلگوں لہریں دل لبھانے کے لیے مستعد تھیں۔ایون نسبتاً ایک گنجان علاقہ ہے۔ایون میں چترال کا نیا تبلیغی مرکز بھی بن رہا ہے۔پرانا تبلیغی مرکز مین بازار چترال میں ہے۔ ایون سے کیلاش تک کا روڈ کچا ہے۔پرانی وضع قطع اور خوبصورت مٹی سے بنے مکانات تھے۔ ترچ میر چترال کا سب سے اونچا پہاڑ ہے جس کی بلندی 7708 میٹر ہے۔ترچ میر کو پہلی بار ناروے کے ایک کوہ پیمانے 1964 میں سر کیا تھا۔ایون کے ٹاپ سے ترچ میر کی چوٹی صاف دکھائی دیتی تھی۔جہاں سے ہم نے ترچ میر کا نظارہ کیا۔ وہی سے دو قدم پر مولانا مستجاب کی آخری آرام گاہ ہے۔ مولانا مستجاب چترال کی مشہور دینی شخصیت کا نام ہے۔ ایون ان کے گاؤں کا نام ہے جہاں مولانا مرحوم کی مسجد بھی ہے۔ سننے میں آیا کہ مولانا نے چترال میں تصوف کے میدان بڑی محنت کی ہے اور مسلمانوں کی بنیادیں مستحکم کی ہیں۔۔برلب سڑک سے گاڑی روک کر ان کے لیے فاتحہ پڑھی۔ بھائی نور محمد فرما رہے تھے کہ وہ یہاں کی متاثر کن شخصیت تھے۔ قاضی نثاراحمد نے کہاکہ مولانا مستجاب صاحبؒ میرے والد ماجد قاضی

عبدالرزاقؒ کے دوستوں میں سے تھے۔ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں ہیں۔اسی وجہ سے ان کے شاگرد مولانا عبدالرحیم استاد جامعہ اشرفیہ سے والد صاحب محبت فرمایا کرتے تھے۔اسی اثناء مجھے چترال کا ایک اور بڑا نام یاد آیا۔ جس کی شہادت پر پورا ملک رویا تھا اور پھر آج تک ان کے قاتلوں کا سراغ تک نہ لگ سکا۔ وہ ہیں پاکستان کی عظیم علمی شخصیت مولانا عبیداللہ چترالی رحمہ اللہ۔ قاضی صاحب ان کے گھر حاضری دینا چاہتے تھے اور ان کے صاحبزادوں سے ملنا چاہتے تھے مگر قلتِ وقت کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔فون پر انہیں سلام بھیجا۔کہاں وہ علمی شخصیات اور ان کے دبدبے اور کہاں یہ بے رعنائیاں۔ سچ یہ ہے کہ رہے نام اللہ کا، رات دن کا یوں الٹنا اور پلٹنا اور گردشِ ایام تو اسی ذات کبریا کے ہاتھ میں ہے اور گردش روزگار اسی کے تابع فرمان۔

ایون کے اختتام پر دوباش کی چیک پوسٹ آتی ہے۔چھوٹی سی پل ہے۔ ایک طرف چترال بارڈر پولیس جبکہ دوسری طرف چترال پولیس کی چیک پوسٹیں ہیں۔ غیرمقامیوں کی انٹری ہوتی ہے یا شناختی کارڈ رکھ لیے جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایلیٹ فورس کے جوان موجود تھے اور مقامی ساتھی بھی ،جس کی وجہ ہمیں فورا بغیر انٹری کے جانے دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ چترال پولیس اور چترال بارڈ فورس کے نوجوان انتہائی ملنسارہیں۔ خندہ پیشانی سے مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے پولیس اور فورس کی طرح ترش روی سے پیش آنا ان کا شعار نہیں۔ ان کی خوش اخلاقی اور وجیہ طلقی پرقاضی صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جب چیک پوسٹ سے رخصت کرتے ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ ہمیں چائے پلا کر رخصت کرررہے ہیں تو حق نواز صاحب نے کہا کہ نہیں حضرت بلکہ یوں لگتاہے کہ ہم نے انہیں کھانا کھلایا ہے''۔ واقعی جب بیریئر اوپن کرتے تھے تو ان کی مسکراہٹ دل افروز ہوتی۔ دوباش چیک پوسٹ سے بمبوریت تک بارہ میل کا سفر ہے۔ درمیان کی اکثر آبادی اہل سنت کی ہے۔ روڈ کی حالت بہت ہی خستہ تھی ۔ کچی روڈ ہے۔ بعض مقامات تو ڈراؤنے تھے۔نالے کے پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ جنگلی حیات کے اثرات واضح نظر آرہے تھے۔دوباش سے رمبور تک کا فاصلہ آٹھ میل ہے۔ رمبور کیلاشیوں(کافروں) کی دوسری آبادی ہے۔بمبوریت تک کا سفر بہت ہی پرلطف

تھا۔ حسین اور خوبصورت وادیاں اور ان کی قدرتی رنگینی اور فطرتی دلفریبی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

چترال بہت بڑا ضلع ہے۔ چترال کا رقبہ چار ہزار پانچ سو مربع میل ہے۔ شاید رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ چترال کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ ضلع چترال کی سات تحصیلیں ہیں۔ چمبر کن، دار کوت، بروغل وغیرہ چترال کے مشہور درے ہیں۔ شندور، قزیدہ، چاں تار، کان خون بروغیل وغیرہ مشہور جھیلیں ہیں۔ ارکاری، لاسپور، تورکھو وغیرہ اہم گلیشئر جبکہ لاسپور، مولکھو، بموریت، لٹ کھو وغیرہ چترال کے مشہور دریا ہیں اور یہ تمام دریا، دریائے چترال میں جا گرتے ہیں۔ 1885ء تک چترال مکمل طور پر آزاد تھا، چترال کی مختلف ریاستوں کے والیان آپس میں جنگ و جدل کرتے رہتے تھے۔ انگریز نے 1885ء کو چترال پر قبضہ کیا تھا۔ 28 جولائی 1969ء میں ریاست چترال کا پاکستان میں ادغام ہوا جبکہ 1974ء سے چترال میں مکمل پاکستانی قوانین کا اجراء ہوا۔ یعنی چترال کو باقاعدہ پاکستان کا آئینی حصہ بنا کر ضلع بنا دیا گیا۔ چترال میں کئی زبانیں بولی جاتیں ہیں تاہم کھوار سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ چترال کے مشرقی جانب گلگت، سوات اور یاسین کے علاقے، مغربی جانب بدخشاں، چین اور روس جبکہ جنوبی کی طرف سے درہ لواری اور دیر کے علاقے واقع ہیں۔ مستوج سے ایک لنک روڈ تاجکستان جا لگتا ہے۔ چترال کیلاش کے نالے سے ایک روڈ

جا کر افغانستان کا صوبہ نورستان کو لگتا ہے۔ یہی نورستان گرم چشمہ کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ مجاہدین کے زمانے میں افغانیوں کا کثرت سے آنا جانا تھا بلکہ افغان مجاہدین کے لیے امدادی سامان بھی اسی روٹ سے ہی جاتا۔

چترال میں علماء و قراء کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ سیاسی طور جمعیت علمائے اسلام کا ہولڈ ہے۔ تبلیغی جماعت والے بھی طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چترال اکثریت اہل سنت آبادی ہے جبکہ اسماعیلی برادری بھی کافی تعداد میں ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 70 فیصد اہل سنت جبکہ 30 فیصد اسماعیلی آبادی ہے۔ دونوں کی معاشرتی زندگی بہت پرامن ہے۔ چترال کے علماء بالخصوص مولانا حفیظ الرحمان، گرم چشمہ کے مولانا جلال الدین، تبلیغی جماعت کے امیر مولانا نثار احمد اور ان کے احباب مذہبی ہم آہنگی اور معاشرتی امن کے لیے کردار ادا کر رہے ہیں۔ دونوں طبقات میں ان کے کردار کو اچھی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ تین دن کے سفر میں میرا یہ مشاہدہ رہا کہ سخاوت اور مہمان نوازی، اعتدال اور میانہ وری، آپس میں محبت اور اخوت، عفو اور درگزر، خوش اخلاقی اور حسنِ معاشرت، نرم مزاجی اور رفق میں چترال کے لوگ بہت ہی اچھے لگے۔ حدیث میں آتا ہے "من اعطی حظہ من الرفق فقد اعطی حظہ من الخیر" جس کو لطف اور نرمی میں سے اس کا حصہ دیا گیا ہو اس کو بھلائی سے اس کا حصہ دیا گیا۔ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہے کہ " ان اللہ رفیق یحب الرفق فی

الامر کلہ'' اللہ تعالیٰ لطف اور نرمی والا ہے اور تمام معاملات اور معاشرت میں لطف اور نرمی کو پسند فرماتے ہیں۔

چترال کے رسم و رواج، علاقوں اور دیگر چیزوں کے بارے میں معلومات کا ایک حصہ بھائی نور محمد اور مولانا حفیظ الرحمان کی گفتگو سے اخذ کیا۔وہ دینداروں کی خدمت کرنا کارثواب سمجھتے ہیں ۔مہمانوں کی خدمت کے ساتھ چترال کی سیر کرانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے گھر میں بڑے بڑے جید علماء کرام تشریف لاچکے ہیں جن میں مولانا تقی عثمانی صاحب، قائد جمیعت مولانا فضل الرحمان صاحب ،شیخ الحدیث سبحان محمود صاحبؒ،مولانا حسن جانؒ اور اس قبیل

کے کبار علماء شامل ہیں۔ مہمانوں بالخصوص علماء وفضلاء مہمانوں کی ضیافت کرنا چترالی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کی ضیافتیں پٹھانوں جیسے لگتی تھیں۔ مہمانی اور میزبانی کے بھی کچھ قواعد اور اصول ہوتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے ''الضیافۃ ثلاثۃ ایام وجائزتہ یوم ولیلہ'' یعنی ضیافت تین دن تک کی ہوتی ہے اور مہمان کا خصوصی اکرام ایک رات اور دن تک کرنے کا حکم ہے۔۔ اور مہمانوں کے لیے بھی فرمان نبوی ہے کہ'' ولا یحل لہ ان یثوی عندہ حتی یحرجہ'' یعنی مہمانوں کے لیے قطعاً اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ میزبان کے پاس اس حد تک ٹھہر جائے کہ وہ میزبان کو حرج اور تنگی میں ڈال دے یعنی رحمت کے بجائے زحمت بن جائے۔ چترال کے تین روزہ دورے میں بھائی نور محمد، مولانا حفیظ الرحمان اور حاجی سرفراز اور دیگر نے مہمان نوازی کا مکمل حق ادا کیا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ بہر صورت ہم گاڑیوں کے ایک قافلے کی شکل میں چترال شہر سے بمبوریت (کافرستان) پہنچ چکے تھے۔ آئندہ کی قسطوں میں کیلاشیوں کے تینوں علاقوں کا تعارف، ان کی تہذیب، رسوم، رواج، لباس، عادات واطوار، مذہبی عقائد و عبادات اور ان سے متعلق دلچسپ معلومات اور ان سے ہونے والی طویل گفتگوئیں اور اس کے تناظر میں اخذ شدہ خیالات آپ تک بھم پہنچاؤنگا۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (جاری ...)

کیلاشِ مذہب

وادیِ کیلاش میں چلتے چلتے جو کچھ جاننے کو ملا، آج کی محفل میں، اس میں سے کیلاشی مذہب کے حوالے سے چند باتیں، جو ان سے ہی معلوم ہوئی آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اور ان باتوں کی تصدیق مختلف ذرائع، کتابوں اور ویب سائٹس سے بھی کرنے کی کوشش کی۔ میں وادیِ بمبوریت کا مشہور گاؤں کراکال کی مختلف گلیوں سے گزر رہا تھا۔ ان گلیوں میں چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں اور کالاش قبیلے کی دوکانوں پر رنگ برنگ کپڑے، موتیوں کی مالائیں، کنگن، ٹوپیاں اور کمربند تھے جو کیلاشی بوڑھی خواتین فروخت کر رہی تھیں۔ چلتے چلتے میرے سامنے ایک بڑی عمارت آئی۔ اس عمارت کے صدر دروازے کے پاس جاکر جاننے کی کوشش کی تو وہ کیلاشیوں کی مرکزی عبادت گاہ تھی۔ دروازہ مقفل تھا۔ بالکل سیاہ رنگ کا یہ دروازہ بہت ہی قدیمی دروازہ معلوم ہوا۔ دروازے کے متصل ایک لکڑی کے بورڈ پر انگریزی میں ”Jestak's Tample“ لکھا ہوا تھا۔ میں مبہوت نظروں سے اس عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ ایک کیلاشی خاتون نے بتایا کہ یہ ان کی عبادت گاہ ہے اور وہاں بکرے کاٹنے کے بعد لکڑی کی مورتیوں یا بتوں پر خون چھڑکتے ہیں۔ اس معبد خانے میں کیلاشیوں کے سوا جانے کی اجازت نہیں۔ بعد میں کیلاشیوں کے رہنماء ثروت نے مزید معلومات بہم پہنچائی کہ وہ تمام مذہبی

رسومات اس جیسٹکس ٹیمپل میں ادا کرتے ہیں۔ فوتگیوں کے رسوم بھی یہی ادا ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ یہی پر خدا کی عبادت کرتے ہیں ۔
میں نے پوچھا کہ کیا آپ خدا کو مانتے ہیں تو انھوں نے بلا تکلف جواب دیا، جی ہاں۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ تو مذہبی لوگ ہیں۔ یہ روایت غلط ثابت ہوئی کہ کیلاشیوں کے ہاں خدا کا نظریہ نہیں ہے۔ میری پوچھ گچھ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کیلاشیوں کا مذہب مختلف رسومات کا مربہ و مرکب ہے۔ مجھے یہ بھی کسی نے بتایا کہ کیلاشیوں کے مذہبی رسومات قدیم اسرائیلوں سے بھی ملتے ہیں لیکن اس کی تصدیق کیسے کی جائے یہ ممکن نہیں۔ راستے میں ایک پڑھا لکھا نوجوان ملا۔ اس سے جاننے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگا کہ یہ کیلاشی لوگ بیک وقت بت پرست بھی ہیں، توہم پرست بھی ہیں۔ دیوی پرست بھی ہیں اور اجداد پرست بھی۔ یہ لکشمیوں اور دیویوں پر یقین رکھتے ہیں ان کے نام کی قربانیاں کرتے ہیں اور ان کو وسیلہ بھی مانتے اور حاجت روا بھی۔ جنات، بھوت اور پریوں پر بھی ان کا ایمان ہے۔ میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ جنت اور دوزخ کے بھی قایل ہیں تو ان کا کہنا تو یقینا اور یہ صدقہ خیرات بھی کرتے ہیں۔ ان کے مختلف حاجات پوری کرنے کے مختلف دیوتا ہیں، مثلاکت شوئی اولاد، جاکیچ بکریوں کی نسل بڑھانے، اور شیگان صحت عطاء کرنے والے دیوتا ہیں۔ اور بھی بہت سارے.... میں نے اس نوجوان سے تعارف جاننے کی کوشش کی تو ہنس کر ٹال دیا اور رخصت

ہوا۔

ایک طرح دار کیلاشی لڑکی سے ٹاکرا ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ پڑھی لکھی خاتون ہے۔ میں نے دور سے سلام کیا تو ہنس کر جواب دیا۔ معلوم ہوا کہ اسلام آباد کی کسی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ شائستہ اردو میں بات کر رہی تھی اور میرا کیلاش آنے کا سبب پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ بس یہاں کی تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات دیکھنے اور جاننے کے لیے آیا ہوں۔ مجھ سے کہنی لگی

تم مولوی ہو؟۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

تو کہا کہ کوئی مذہبی پیشوا تو نہیں؟

میں نے کہا نہیں مگر فوراً سوال داغا کہ آپ کا مذہبی پیشوا کون ہے؟

کیا میری اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

اس نے کہا کہ ملاقات کا انتظام تو نہیں کر سکتی البتہ ہمارا مذہبی پیشوا ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ کیا وہ موروثی طور پر پیشوا چنا جاتا ہے؟

تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ اور کہا کہ ہم اس کو بٹان یا دیہار کہتے ہیں۔ سمجھو تمہارا مولوی۔

ایک زور دار قہقہہ سے بات جاری کی۔ میں نے کہا کہ آپ کا دیہار تعلیم کہاں سے

حاصل کرتا ہے؟

تو اس نے کہا کہ کوئی خاص تعلیم تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس سینہ در سینہ علمی باتیں چلی آ رہی ہیں۔

قربانی کے کسی خاص پروگرام میں جب کسی کو جوش میں وجد طاری ہوتا ہے تو اس کو دیہار متعین کیا جاتا ہے۔ ہمارا دیہار ہمیں آئندہ کی پیش گوئیاں کرتا ہے۔.برف باری، موسموں کی کیفیات، قحط سالی، جنگ وجدل، شادی بیاہ اور آمن ودوستی کے بارے مین ان کی پیش گوئیاں درست ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے ایک چبھتا ہوا سوال پوچھا کہ کیا آپ کا مذہبی پیشوا مسلمانوں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کا درس نہیں دیتا؟ تو ان کا جواب حیران کن تھا، یہ کام آپ لوگ کرتے ہیں یہی کافی ہے۔ میں کھسیانا ہوا اور انہیں سلام کرکے اپنی راہ چل دیا۔

ظاہری طور پر کیلاشیوں کا کوئی مستند مذہب یا مذہبی کتاب نہیں۔ لیکن ان کے پاس ان کی روایات جاندار طریقے سے موجود ہیں اور سختی سے وہ ان پر عمل پیرا بھی

نظر آئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کیلاشی لوگ اپنے لوگوں کو اپنے مذہب سے خارج بھی کردیتے ہیں۔ کئی وجوہات معلوم ہوئیں، مثلاً اگر کوئی کیلاشی عورت ''بشالینی'' جانے سے انکار کرے تو اس کو مذہب کیلاش سے خارج کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی خاتون غیر کیلاشی مرد سے شادی کرے تو بھی وہ مذہبِ کیلاش سے فارغ کردی جاتی ہے۔ میرے ساتھ جو مقامی لڑکا اشفاق تھا اس نے بھی

ایک کیلاشی کو مسلمان بنا کر شادی کی ہے، بقول ان کے ان کی وائف بہت خوش ہے تین سال سے اپنے والدین کے پاس نہیں گئی ہے۔ یعنی اس کو اوٹ کیا گیا تھا مذہب کیلاش سے۔

بہر صورت کیلاش مذہب پر لکھنے کے لیے بہت کچھ ہے مگر اس پر اکتفاء کیا جائے۔آئندہ کی سطور میں بھی ان کے رسوم، شادی بیاں بالخصوص کفنانے دفنانے اور اظہار و محبت و شادی کے حوالے سے لکھوں گا۔کیلاش کہاں سے وار ہوئے اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔کیلاش پر لکھی گئی کتابوں میں یہ ضرور ملتا ہے کہ وہ سکندر اعظم کی اولاد یا فوجی باقیات میں سے ہیں اور ان کی تہذیب و رسوم اور زبان آج کے یونان والوں سے ملتی جلتی ہے مگر میں تو اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔وجدان اس کی اجازات نہیں دیتا۔

افغانستان کو صوبہ نورستان پہلے کافرستان ہوا کرتا تھا۔افغانستان کے امیر عبدالرحمان کے دور حکمرانی میں یہ علاقہ ان کے زیر نگیں آیا اور اس کا نام نورستان رکھ دیا گیا۔امیر عبدالرحمان کے حوالے سے علامہ ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب دریائے کابل سے یرموک تک کی حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ ”۔امیر شکیب ارسلان اپنی کتاب حاضر العالم الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ ”مشرقی جانب حدود سلطنت کو وسیع کیا، وادی کفرستان کو اپنے زیر نگیں کرلیا، وہاں کے باشندوں

کو انہی کے ذریعے اللہ نے اسلام کی ہدایت دی اور اس کا نام نورستان رکھا''۔

کیلاشیوں کو یہ پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مذہب کو برقرار رکھیں، یہ حق انہیں اسلام اور ریاست پاکستان کا آئین فراہم کرتا ہے۔نہ ان پر جبر کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کی مذہب وثقافت کو بزور طاقت ختم کیا جاسکتا ہے۔کیلاشیوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا ہے اور جن کیلاشیوں نے اسلام قبول کیا اس پر وہ خوش ہیں تاہم یہ بات زبان زد عام ہے کہ آج کل وہاں بہت کم تعداد میں کیلاشی مسلمان ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے اور میرا اپنا مشاہدہ بھی ہے کہ حکومت پاکستان اور بیرونی ممالک اور کفریہ این جی اوز کیلاشی روایات کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے وہ بھاری تعداد میں روپیہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ہر قسم کا لالچ دے کر انہیں اپنے کلچر، روایات اور مذہبی رسومات کو باقی رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ افسوسناک امر ہے۔ کم سے کم مسلم ریاست کو ایسی کفریہ حرکتوں سے گریز کرنا چاہیے۔آخر اس عجیب و غریب ثقافت کو بچا کر ریاست پاکستان کیا لینا چاہتی ہے۔ ایسی صورت حال میں امیر عبدالرحمان جیسے مخلص مسلم حکمران یاد آتے ہیں جنھوں نے انگریزوں سے جنگ اور اسلام کی روشنی سے دور دراز ایسے علاقوں میں اشاعت اسلام کے حوالے سے نمایاں کردار ادا کیا۔اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

کیلاشیوں کی تجہیز و تکفین ،ایک انوکھا انداز

کیلاشیوں کے ہاں کچھ مہینے مقدس جانے جاتے ہیں۔ مثلاً مارچ اپریل مئی کو وہ اشہر مقدس خیال کرتے ہیں اور ان مہینوں میں کوئی مرجاتا ہے تو اس موت کو بھی مقدس موت کا نام دیا جاتا ہے۔ موت یا فوتگی کے حوالے سے بھی ان کی عجیب روایات ہیں۔ ان کی فوتگیوں کے تذکرے سے پہلے ان کے قبرستان کی بات ہوجائے، میں نے ان کے قبرستان کو تین دفعہ دیکھا، ایک دفعہ اکیلے، ایک دفعہ اپنے احباب کے گروپ کے ساتھ ، جن میں مولانا منیر، محمد نواز، مولانا نظیم اور عمر حسن تھے۔قبرستان میں رکھے گئے تابوتوں کے ساتھ ڈھیر ساری تصاویر بنوائی۔ مجھے یہ روایت درجنوں لوگوں سے سننے کو ملی کی کیلاش لوگ اپنی میتوں کو ایک تابوت میں رکھ کر کھلے آسمان تلے اپنے قبرستان میں چھوڑ جاتے تھے اور اس تابوت میں لاش کے ساتھ زیورات اور میت کی دیگر ضروری اشیاء بھی رکھ دیتے تھے مگر بعد میں وہاں سے یہ چیزیں چوری ہونے لگی تو انہوں نے اس رسم کو ترک کردیا اور اب دفنانا شروع کیا ہے۔ ان کے قبرستان میں بہت سارے تابوت رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سوکھی ہڈیاں اور انسان کے جسمانی اعضاء مختلف شکلوں میں پڑے دکھائی دیتے ہیں۔

جب کیلاشیوں کے ہاں موت واقع ہوتی ہے تو ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا

ہوتی ہے جو دنیا کی انوکھی ثقافت اور روایت کہلائے جانے کی سوفیصد قابل ہے۔ کسی کے انتقال پر کیلاش کے باسی اپنا گھر تک لٹا دیتے ہیں یعنی کیلاشی لوگ شادی بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبات سے زیادہ خرچہ فوتگیوں پر کرتے ہیں۔خدا جانے اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ عام طور پر کسی کے انتقال پر بیس سے تیس لاکھ روپے تک خرچ آ جاتا ہے. میت والا خاندان اپنے سارے اسباب حیات ، مال مویشی، گھر بار اور دیگر اشیاء بیچ دیتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں پھر سے ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے انہیں تگ ودو کرنا پڑے گا۔

جب کسی کی موت واقع ہوجاتی ہے تو لاش کو تین دن تک دفنایا نہیں جاتا، بارش یا برف باری ہوجائے تو لاش گھر کے اندر رکھ دی جاتی ہے، حالات کیسے بھی ہوں ، موسم گرم ہو یا سرد، تین دن سے قبل کسی لاش کو قبر نصیب نہیں ہوتی۔ میت کو کسی چبوترے یا چارپائی پر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی پسندیدہ تمام اشیا، مثلاً زیورات، میوہ جات اور سامان آرائش وغیرہ۔ اور میت کی شان میں گانے گائے جاتے ہیں، مرثیے پڑھے جاتے ہیں ، اور دھاڑے مار کر رونے دھونے کا سلسلہ بھی چل نکلتا ہے۔ہمارے رہبر بھائی نور محمد کے بقول گانوں کے ساتھ ڈانس بھی ہوتا ہے۔ جوشاہ کی موت کے تصویری مناظر سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔یہ سمجھنے سے بالاتر ہے کہ یہ خوشی مناتے ہیں یا غم۔اگر کیلاش کے کسی گھر میں میت ہو تو، کیلاش کی مسکراتی وادی غم و حزن میں مبتلا ہو جاتی ہے،

اچھے دنوں کے پروگرام اور تقریبات ملتوی کیے جاتے ہیں۔ اور مصیبت کی اس گھڑی میں ہزاروں لوگ میت والوں کا دل رکھنے کے لیے ان کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

کیلاشیوں کے سردار ثروت نے مجھے تخصیص کے ساتھ بتایا کہ وہ میت کو اپنے معبد خانے لے آتے ہیں اور کئی رسوم یہاں ادا کرتے ہیں۔ان کے معبد خانے کی بیرونی دیواروں پر مارخور کی تصاویر کندہ ہیں۔اسی معبد خانے میں میت لائی جاتی ہے اور رسوم کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک مقامی مسلمان ساتھی نے مجھے بتایا کہ میت کو اس جیسٹک ٹمپل میں لانے کے بعد، پھر مقامی لوگ عجیب و غریب منتریں پڑھنے لگتے ہیں.... جیسے یہ کوئی عبادت ہو.....اس جیسٹک ٹیمپل کا انوکھاپن یہ بھی ہے کہ یہاں روشندان دیوار میں نہیں بلکہ چھت پر ہیں ۔ کیلاشیوں کی ان روایات اور صورت حال کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ لوگ آج کی گلوبل دنیا میں نہی بلکہ قدیم وقتوں کی ثقافت کا حصہ ہیں اور ان کی کہانیاں و قصیں قدیم الیف لیلوی داستانوں کا ایک خاص حصہ معلوم ہوتیں ہیں۔ اکثر کیلاشی اپنے اپنے گھروں سے کھانے اور روٹیاں پکوا کر لاتے ہیں اور پھر اجتماعی کھانے کا ایک رواج بھی میت کے دنوں میں بیان کیا گیا۔جہاں میت ہوتی ہے پہلے دن ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں۔اس لئے لوگوں کو مختلف ٹولیوں کی صورت میں کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ کھانے دیسی ہوتے ہیں۔ مصالحہ جات اور دیگر چٹ

پئے کھانوں کا رواج نہیں ہے۔ بڑی تعداد میں گوشت پانی میں ابال کر پکایا جاتا ہے۔
اشیاء خور نوش کا یہ سلسلہ سورج غروب ہونے تک جاری رہتا ہے اور پھر طلوع افتاب
کے بعد کیلاش کی وادی اندھیرے میں ڈوبتی چلی جاتی ہے۔

میت کے دوسرے دن بھی عجیب رسومات ہوتے ہیں۔ میت پھولنے لگتی ہے اور بدبو
بھی آنے لگتا ہے، دوسرے دن ایک بزرگ آدمی کو میت کے حوالے سے تمام
معاملات کو ڈیل کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔تدفین، دور دراز سے آئے ہوئے
مہمانوں کی ضیافت، اور میت کے رشتہ داروں کے ساتھ معاملات غرض ہر چیز کا یہ
بزرگ مہتمم خیال کرتا ہے۔ بقول نور محمد کے ساٹھ ستر کے قریب بیل، گائے، بکرے
اور دنبے کاٹے جاتے ہیں اور ان کا گوشت مہمانوں کی ضیافت کے لیے استعمال میں لایا
جاتا ہے۔

تیسرے دن میت کو دفنانے کا دن ہوتا ہے. کیلاشی دوشیزائیں اور دیگر اقارب ورشتہ
دار میت کے گرد اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور آہ وزاری اور دیگر رسومات کے بعد میت کو دفنا
دیا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں اکثر میتوں کو بمبوریت میں دفنایا جاتا مگر اب تینوں
وادیوں کی میتوں کو اپنی اپنی وادی میں ہی دفنایا جاتا ہے۔ زیوات قبر میں رکھنے کا سلسلہ
بھی متروک ہوچکا ہے۔ یعنی کیلاشی سمجھ دار ہوگئے ہیں۔ میت کو دفنانے کے بعد حزن
وملال میں ڈوبا مرد وزن کا یہ

قافلہ دوبارہ لکڑی کے ان نئے اور پرانے گھروں کی طرف لوٹتے ہیں جو صدیوں سے ان کی جائے امان ہیں۔جب ایک نوجوان سے تابوتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو اس نے کہا کہ یہاں تابوت بنانے والے نہ اپنی محنت اور ہنر کے پیسے لیتے ہیں نہ لکڑی کے، یوں سمجھ لیجیے کہ لکڑی کے یہ تابوت زندہ لوگوں کی طرف سے مرنے والے کے لئے آخری تحفہ دیا جاتا ہے۔

گزشتہ دنوں وادی بمبوریت کے گاؤں.برون میں 120 سالہ جو شاہ کیلاش کا انتقال ہوا۔اس موت پر عجیب رسومات سامنے آ گئے۔اس کی لاش کو کیلاش قبیلے کے معبد خانے یعنی جسٹیک ٹمپل میں رکھا گیا ہے۔جو شاہ کیلاش کی فوتگی رسومات پر پچاس بکرے ذبح کئے گئے ہیں اور دیسی گھی، پنیر اور دودھ والے پکوان کے پکائے کھانوں کے ساتھ مہمانوں کی ضیافت کی گئی۔سننے میں یہ بھی آیا کہ یہ بکرے مسلمانوں سے ذبح کروائے گئے تاکہ اس کا گوشت مسلمان بھی کھا سکے۔جوشاہ کی میت کو جیسٹک ٹمپل میں رکھ کر اس کے قریبی رشتہ دار ان کے سرہانے بیٹھے گئے اس کے ٹوپی میں سو، پانچ سو اور ہزار روپے کے نوٹ بھی سجا کر رکھے گئے ساتھ ہی اس کے سرہانے اخروٹ، خشک میوہ اور سگریٹ کا ڈبہ بھی رکھا گیا۔جیسٹک ٹمپل میں لاش رکھ کر فائرنگ بھی کی گئی۔بچے کی ولادت اور مردے کی نعش پر فائرنگ کرنا ان کے مذہبی عقیدے میں شامل ہے۔جوشاہ رشتہ دار مرد حضرات ڈھولک نے ڈھولک بجائے جبکہ دیگر رسم فوتگی میں شامل خواتین نے ایک

دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ ڈال کر روایتی رقص پیش کی۔ اور عمر رسیدہ مرد ہاتھوں میں کلہاڑی، تلوار یا کوئی چھڑی لیکر ناچتے رہے اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ جو شاہ کیلاش ولد ترانے خان نے پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیوہ چھوڑا۔ ان کو ایک لکڑی کی تابوت میں رکھ کر ان کے ساتھ اس کے زیر استعمال قیمتی سامان بھی اسی تابوت میں رکھ کر سپرد خاک کیا گیا۔

کیلاشِ ویلنٹائن ڈے

کیلاشِ مذہب اور کیلاشِ تہواروں اور ثقافت پر گفتگو جاری ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کیلاش لوگ تہواروں کو بطور مذہبی فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ وہ تہواریں اس لیے مناتے ہیں کہ ان کے دیوتا ان سے راضی ہوجائیں۔ وہ ان تہواروں میں بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں اور انتہائی شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ کیلاشِ قبرستان کے دامن میں زلفیں بکھرا ایک نوجوان سے میری گفتگوئیں ہوئی۔ جب تہواروں کے بارے میں پوچھا تو ان کا کہنا تھا کہ کیلاشیوں کے ہاں سال کے مختلف مہینوں میں مختلف چہلم یا تہواریں منائی جاتیں ہیں۔ مثلاً ان کا ایک چہلم یا تہوار "چہلم چوشٹ، جوشی یا جوش" کے نام سے معروف ہے۔ یہ چہلم گرمیوں میں چودہ مئی سے سولہ مئی کے دوران منایا جاتا ہے۔ اس چہلم کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کیلاشیوں سے زیادہ ملک اور بیرون ملک کے سیاح شرکت کرتے ہیں۔ اس چہلم کے بعد کیلاشی لوگ بھیڑ بکریوں کو چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ کیلاش کی تینوں وادیوں کے لوگ بمبوریت میں جمع ہوجاتے ہیں۔ اس کیلاشی نوجوان کے گفتگو سے یہ اندازہ لگایا کہ آج کل یہ چہلم کیلاشیوں کی معاشی شہِ رگ کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ اس چہلم کی وجہ سے بمبوریت کے مکینوں کی سال بھر کی کمائی ہوجاتی ہے۔ ہمارے رہبر بھائی نور محمد بتارہے تھے کہ امسال بمبوریت

میں اس چہلم کے دوران نارمل ہوٹلوں میں بھی ایک کمرہ دس ہزار کا بک ہوا ہے ایک رات کے لیے۔ یعنی سیاحوں کا انتارش ہوتا ہے کہ دس ہزار پر بھی کمرہ نہیں ملتا۔

چہلم جوشٹ کے لیے مئی کے ابتداء سے تیاریاں شروع کی جاتیں ہیں اور اس چہلم کو کیلاش کی تینوں وادیوں میں مذہبی تہوار کا درجہ حاصل ہے۔ کئی دنوں سے دودھ جمع کیا جاتا ہے اور اس دن دودھ کی تقسیم وافر مقدار میں ہوتی ہے۔اس چہلم میں کیلاشی خواتین ڈھول کی تاپ پر رقص کرتی ہیں۔ اس چہلم کا آخری دن انتہائی اہم ہوتا ہے۔ کیلاش کی بوڑھی اور نوجوان دوشیزائیں ہر قسم کے روایتی ناچ پیش کرتی ہیں۔کیلاشی مرد اور دیگر سیاح خواتین کا رقص سے دن بھر محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ چہلم جوشٹ کے دن کیلاشی جڑی بوٹیوں کے عرق ملا پانی سے نہاتے ہیں اور زرق برق لباس میں ملبوس دوشیزائیں، موتیوں سے سجی کیلاشی ٹوپیاں، اور ٹوپیوں پر سجے مرغ زریں کے پروں کے گچھوں سے بنے پھول، ان پھولوں کی خوبصورتی، گلوں میں موتیوں کی مالائیں اور پیٹھ میں بندھے کمربند اور لمبے لمبے جبے پہنے کیلاشی خواتین اور ان کا ناچنا، ٹہلنا، مسکرانا، اِترانا، پلٹ کر دیکھنا، دیکھ کر لجانے شرمانے اور معصوم اداؤں سے اس چہلم کو زندہ و جاوید بنا دیا جاتا ہے تب تو ایک دنیا مارے مارے یہاں پہنچتی ہے۔

کیلاشیوں کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ دن کیلاشیوں کا یوم محبت ہے۔ یعنی کیلاشِ ویلنٹائن ڈے۔ میری خیال میں اظہار محبت کا یہ طریقہ پوری دنیا میں انوکھا ہوگا۔ چھلم جوشٹ کے تیسرے دن کیلاشی عورتیں خوب رقص کررہی ہوتی ہیں اور اسی اثنا محبتوں کا اظہار شروع ہوجاتا ہے۔ کیلاش کے نوجوان لڑکے لڑکیاں میدان میں اتر جاتے ہیں اور سرعام اتنے بڑے مجمع کے سامنے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں اور شادی کے بندھن میں بندھنے کا وعدہ ہوجاتا ہے۔ اور پورا میدان میدان شادی بن جاتاہے اور مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ بس یوں سمجھے کہ کیلاشیوں کی شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں۔اور شادی اور اظہار محبت کے بعد بھاگنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے جو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ جب نوجوان لڑکے لڑکیاں میدان عشق وفا میں اتررہے ہوتے ہیں اس وقت ان کا دیہار (مذہبی پیشوا) سبز ٹہنیاں اور پھول ہاتھ میں لیے ان کا استقبال کررہا ہوتاہے اور وہ سرور ومستی کے عالم میں ہاتھوں میں ہاتھ دیے ساری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ چھلم پاکستان کا معروف ترین چھلم ہوتا ہے۔

جہاں چھلم جوشٹ کا میلہ منعقد ہوتا ہے وہاں کھڑے ایک نوجوان سے میں نے سوال کیاکہ کیاآپ شادی شدہ ہے۔ تواس نے کہاکہ دو ماہ پہلے میرا اظہار محبت

ہوچکا ہے۔ سمجھ لو میں شادی کے بندھن میں بندھ چکا ہوں۔ اس کے ساتھ کھڑی ایک نوجوان لڑکی سے پوچھنے کی جسارت کی تو اس کا جواب تھا کہ ہمارا اظہار محبت اگلے سال ہوگا۔ ابھی ہماری درمیان انڈرسٹینڈنگ ہو رہی ہے۔

چہلم جوشٹ کے علاوہ بھی کئی مذہبی تہواریں یا چہلم منائے جاتے ہیں۔ اچال کی تہوار فصلوں کی کٹائی کے لیے منعقد ہوتا ہے۔ یہ چھوٹے پیانے میں منایا جاتا ہے۔ رقص و سرور اور قربانیاں اور دودھ کے نذر و نیاز پیش کیے جاتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ستمبر کے آواخر میں پوڑ /پورل ''Porl'' نامی چہلم بھی منایا جاتا ہے۔ جس میں ایک نوجوان بڈلاک کے نام سے کیلاشیوں کا ہیرو ہوتا ہے۔ یہ تہوار چرواہوں کی پہاڑی چراگاہوں سے خریت سے واپس پر منایا جاتا ہے۔ اس تہوار میں بہت کچھ کے ساتھ اہم بات یہ ہوتی ہے شراب کا استعمال عام ہوتا ہے۔ اس بڈلاک نوجوان کو پہلے سے منتخب کرکے سال بھر پالا جاتا ہے اور اس کی خوب خاطر مدارت اور تواضع کی جاتی ہے اور اس تہوار میں عورتیں اس کے سامنے بچھ بچھ جاتیں ہیں اور بے اولاد خواتین اس نوجوان سے خصوصی طور پر متمتع ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کی مذہبی روایات کے مطابق یہ ان کے لیے خیر کا باعث بن جاتا ہے۔ کیلاشیوں کا ایک اور مشہور چہلم یا جشن چڑماس بھی ہے جو دسمبر میں منایا جاتا ہے۔

میں نے شہزادہ خان کے گھر میں شہتوت کھائے تھے اور ان سے بہت ساری باتیں بھی کی تھی۔ شہزادہ خانے کے بیٹے کے ساتھ اس کے گھر کے اندرونی منظر بھی دیکھا تھا، اس کانام خان باچا ہے خان باچا انٹرپارٹ ون کا طالب علم ہے اس نے سال 2014ء کو نوعمری میں شادی کی ہے۔ چہلم جوشٹ کے آخری دن خان باچا نے ماریہ سے اظہار محبت کیا، ہاتھ پکڑا اور رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ ماریہ بھی کلاس دہم کی طالبہ تھی۔ وہ بروں کے معتبر شخص کامران خان کیلاش کی بیٹی ہیں۔ شادی کے وقت خان باچا اور ماریہ میٹرک کا امتحان دے چکے تھے اب دونوں گیارہویں کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ وہ انتہائی نوعمری میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئے اور نئی زندگی کے سفر کا آغاز کیا ہے۔ اس چہلم یا میلے کو خان باچا اور ماریہ نے لوٹ لیا اور تمام کیلاشی اور مسلمانوں نے ان دونوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اس حقیقت سے کوئی انکاری نہیں کہ کیلاشیوں کے ہاں بھی ان شادیوں میں زیادہ تر ایسی شادیاں ہوتی ہیں۔ کہ ان میں ہر دو طرف والدین کی مرضی اور منشاء شامل نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود والدین اولاد کے اس پسند کو دل سے قبول کرتے ہیں۔ اور ان کی خوشی کو کسی بھی صورت متاثر ہونے نہیں دیتے۔ یعنی کیلاشی بوڑھے بھی اس ویلنٹائن ڈے کا احترام کرتے ہوئے آئندہ ان نوبیاہتا جوڑوں کی خوشی اور شادی کو دل سے قبول کرلیتے ہیں۔ بقول شہزادہ خان کے باچا خان اور ماریہ کی شادی ہوئی مگر جوشی کے دن سے قبل مجھے اور ماریہ خان کے گھر والوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ انھوں نے

انڈرسٹینڈنگ کی اور اظہار محبت کرکے شادی کے بندھن میں بندھ گئے اب دونوں خوش ہیں''۔ماریہ اور خان باچا بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کی محبت کا پہلے سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ سو جیتے رہو ماریہ اور خان باچا۔

وادیِ کیلاش سے گرم چشمہ تک

وادیِ کیلاش سے گرم چشمہ کی طرف علی الصبح نماز فجر کے بعد روانہ ہوئے۔ ناشتے کا انتظام چمرکن چترال میں مولانا حفیظ الرحمان کے ہاں تھا۔ انہوں نے ایک پر تکلف ناشتے کے ساتھ چترال کے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد کو بھی جمع کر رکھا تھا جنہوں نے ہمارے وفد کا پشاور روڈ پر تپاک استقبال کیا۔ وہاں سے ان کے گھر چل دیے۔ جس راستے سے ہمارا وفد مولانا حفیظ الرحمان کے گھر کی طرف جارہا تھا اسی راستے سے جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بھی ان کے گھر تشریف لے گئے تھے۔ تب مولانا کا گھر مکمل دیسی گھر تھا اور اب ماشاء اللہ تعمیرات کے آخری مراحل میں تھا۔ اب تو پورا پورا گیسٹ ہاؤس معلوم ہوتا تھا۔ حفیظ الرحمان صاحب بہت ہی ملنسار اور خوش گفتار انسان ہے۔ اپنے ہاں آنے والے مہمانوں کی کارگزاریاں مزے لے لے کر سنا رہے تھے۔ قصے کہانیوں میں بھائی نور محمد بھی ان کی مدد کر رہے تھے۔ وہ دونوں بیرونی ممالک تبلیغی اسفار میں بھی ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے شب وروز سے خوب واقف ہیں۔ مولانا حفیظ الرحمان صاحب خوبصورت عربی لہجے میں عربی بولتے ہیں۔ سیاسی طور پر جمیعت علماء اسلام کے حامی ہیں مگر ان کا اصل میدان دعوت و تبلیغ ہے۔ وہ عالمی جماعت تبلیغ کے ساتھ ہمہ وقت جڑے رہتے ہیں۔ جب میں نے تبلیغ کے متعلق ان سے سوال کیا تو ان

کا کہنا تھا کہ '' تبلیغ روح کی غذا ہے۔ آخرت کی تیاری کے لیے بہترین نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطانیت اور عالم گیر فتنوں کے مقابلے یں تبلیغی جماعت کا یہ مبارک سلسلہ جاری کردیا ہے۔ یہ وہ عالم گیر نظام ہے جس میں صاحب علم اور اَن پڑھ، کالا اور گورا، امیر اور غریب، مشرقی اور مغربی، حاکم اور محکوم غرض ہر طبقے کے لوگ سہولت کے ساتھ کھپ جاتے ہیں۔ دیکھیں حقانی! اگر تبلیغ کا مقدس سلسلہ نہ ہوتا تو ہم اور آپ بھی یوں اکھٹے نہ پھرتے، یہی ایک رشتے نے ہمیں جوڑ دیا ہے، یہ وہ نظام ہے جو عالمگیر اخوت چاہتا ہے اور اسی کا داعی ہے۔''۔ بہر صورت یہ اٹل حقیقت ہے کہ اسلام کا عالمگیر اخوت والا پیغام دعوت کے ذریعے ہی پھیلا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت و فرضیت مُسَلم ہے۔ ایک مسلمان جہاد کی قطعیت کا انکار نہیں کرسکتا۔ قرآن کا آفاقی پیغام ہے۔ لیکن اسلام اور مسلمان کا اصل ہتھیار دعوتِ دین ہی ہے۔ دعوت دین وہ ہتھیار ہے جو زمینوں کو نہیں دلوں کو فتح کرتا ہے۔ یہ ملکوں اور ریاستوں کو نہیں عقلوں اور دماغوں کو فتح کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسف میں ارشاد کیا ہے کہ '' قل ہٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ اَنا و من تبعنی، و سبحٰن اللہ وماانا من المشرکین '' یعنی تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے''۔ اور سورہ نحل میں مزید وضاحت ہے کہ ''

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ، وجادلہم بالتی ھی احسن''۔ یعنی اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ،اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہتر ہو''۔

ناشتے کے بعد ہم حفیظ الرحمان صاحب کی مسجد چلے گئے جو بہت بڑی اور خوبصورت مسجد ہے۔ان کی مسجد کا نام جامع مسجد تقویٰ ہے۔ وہاں ہم نے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی۔ مسجد کے اندر سے نہر بنا کر صاف جاری پانی کو گزارا گیا۔ اس میں وضو کرتے ہوئے بے حد مزہ آیا۔ مسجد سے دو قدم پر ایک آبشار نُما کھو ہے۔اوپر سے نالے کا پانی آبشار بن کر گرتا ہے اور پانی کی بوندیں دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب جب چترال تشریف لائے تو مولانا حفیظ الرحمان اور ان کے احباب نے ان کے اعزاز میں بڑی مشقت سے اس آبشار نما کھو میں کافی محنت کرکے جلسہ گاہ بنایا۔ مہمانوں کے لیے تخت نما اسٹیج بنا کر گاؤ تکیے لگادیے اور سامعین کے لیے بھی نشستوں کا انتظام کیا۔ حضرت اپنے احباب سمیت اس شاہانہ تخت پر بیٹھ گئے اور پھر اچانک یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ'' یہ انداز خسروانہ''۔ پھر وہاں کانفرنس تو نہ ہو سکی تاہم حضرت کی سادگی اور انکساری کا اندازہ اہل چترال کو ضرور ہوا کہ اللہ والے اس طرح کی شاہانہ تزئین وآرائش کو پسند نہیں کیا کرتے۔ مولانا حفیظ الرحمان کے گھر و مسجد میں جو علماء کرام جمع ہوئے تھے ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ مولانا فضل

مولا صاحب ڈسٹرکٹ خطیب چترال، مولانا اشرف علی صاحب چترال اسکوٹ، حافظ محمد اسماعیل، مولانا رحمت اللہ اور صوبیدار عبدالصمد وغیرہ۔

چرکن چترال کی ایکٹویٹیز سے فارغ ہونے کے بعد ہم گرم چشمہ کی طرف پابہ رکاب ہوئے۔ اب ہمارے راہ نُما بھائی نور محمد کے بجائے مولانا حفیظ الرحمان اور برادرم رحمت اللہ تھے۔ چترال شہر سے گرم چشمہ تک دو گھنٹے کا سفر ہے۔ گرم چشمہ سے ایک دریا، دریائے چترال بیں جا گرجاتا ہے۔ چترال کے تمام دریا جب یکجا ہوتے ہیں تو ان کو دریائے کابل کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمارا قافلہ چرکن سے سیدھا تبلیغی مرکز چترال کے دروازے پر جا کر رکا۔ اتوار کا دن تھا۔ تبلیغی شوریٰ کے ممبران کا اجلاس تھا۔ مولانا جلال الدین بھی وہی پر تھے۔ ان کو بلایا گیا۔ ان سے ہماری مختصراً ملاقات ہوئی اور ہم گرم چشمہ کی طرف نکل گئے۔ جلال الدین صاحب کی خدمات کا ہلکا تعارف آئندہ کی سطور میں آجائے گا۔ ہم چترال آئرپورٹ سے گزر رہے تھے۔ چترال آئرپورٹ اور آئرپورٹ تک جانے والے روڈ کی حالت بہت ہی خستہ تھی۔ اس کی پسماندگی واضح نظر آرہی تھی۔ ایک جگہ خان عبدالولی خان یونیورسٹی کیمپس نظر آیا۔ ایک بے ڈھنگی سی عمارت میں یہ کیمپس قائم کیا گیا ہے جو شکل و صورت سے یونیورسٹی کیمپس کہلانے کا مستحق نہیں تھا۔ گرم چشمہ تک کے درمیانی سفر میں بعض اچھے مقامات بھی دیکھنے کو ملے۔ برادرم رحمت اللہ مختلف جگہوں اور مقامات کا تعارف کرواتا جاتا۔

چترال میں جنگلی جانور کافی زیادہ ہیں۔ گرم چشمہ کے راستے میں دریا کے پار طرف جنگلی جانوروں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ رحمت اللہ کا کہنا تھا کہ تمام جانور مختلف مقامات پر شام کے وقت دریا میں پانی پینے کے لیے آتے ہیں۔ جانوروں کے غول کے غول ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ان کا شکار نہیں کیا جاتا تو ان کا کہنا تھا کہ حکومت کی طرف سے باقاعدہ پابندی ہے، چھاپہ مار ٹیمیں موجود ہوتی ہیں تاہم شکاری لوگ ان سے بچ کر اور چھپ کر شکار کر لیتے ہیں۔

تمام راستے میں کہیں وسیع نیلگوں آسمان کا نظارہ ہو رہا تھا تو کہیں کالے اور سفید بادلوں کے گالے آنکھوں کے گرد گھوم رہے تھے۔ سورج کی شفاف روشنی، بہتے پانیوں کی بے باکی سے راوانی، لال، نیلے، پیلے، جامنی، سبز، سرمئی، دودھیا کلر کے پھول اپنی طرف توجہ مبذول کرواتے نہ تھکتے تھے۔ مکئی کے کھیت، کھیتوں میں پڑے آلو، درختوں میں لگے پھل اور کھلیان میں بکھرے اناج، تاحد نگاہ پھیلی سرسبز وشاداب فصلوں کی ہریالی، اور ان ہریالیوں میں بنے مکانات، کالے، خاکستری، مٹیالے اور ہلکے سبز رنگ پہاڑ اور ٹیلے، جنگلی درختوں پر رنگارنگ چہچہاتی چڑیاں اور طوطے اور دیگر چرند پرند کی خوشنما آوازوں سے دل مسرور ہوتا جارہا تھا۔ مختصر کہ کائنات کے یہ مختلف رنگ اور رنگینیاں خالقِ کائنات کی عظمت، قدرت، جلال و جبروت اور وجود پر دلالت کرتی تھیں۔ قارئین !

یقین جانیں کہ چترال کے اس سفر میں یہ رنگ اتنے زیادہ دیکھے کہ ہم جیسے کوتاہ علموں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور نہ دماغ ان کا احاطہ کر سکتا ہے اور نہ ہی ان رنگوں اور رنگینوں کے لئے کوئی نام وضع کیا جانا ممکن ہے۔خدا تعالی کے ان رنگوں کی بوقلمونی پر صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ''فتبارک اللہ احسن الخالقین'' یعنی پس بابرکت ہے اللہ بہترین تخلیق کرنے والا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اپنے رب کی کون کون سی نعمتیں جھٹلاؤ گے۔

چلتے چلتے برلب دریا گاڑیاں رکوادی گئی۔ مولانا حفیظ الرحمان نیچے اترے۔ان کی معیت میں قاضی صاحب اور دوسرے احباب بھی اترے ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بیچ روڈ برلب دریا ایک پہاڑی سے ایک چشمہ نکل رہا ہے۔ پانی بہت ہی شفاف تھا۔ مگر زیادہ رسیلا نہیں تھا۔ اس کی نسبت گرم چشمہ کے دریا کا پانی شریں تھا۔ وضو بنایا ۔ کافی دیر بیٹھے رہے۔ قاضی صاحب نے مجھے الگ کرکے کہا کہ آپ نوجوان ہے یہاں سے شادی کرلیں۔ اور کہا کہ میں ان سے بات کروں ۔ خوشی میں پھولے نہ سماسکے۔ دل میں چھپا ارمان واضح ہوا، مگر معلوم نہیں انہوں نے کسی سے بات بھی کی کہ نہیں۔ ایسا ایک چٹکلہ انہوں نے گلاغمولی میں بھی چھوڑا تھا۔ اب تلک تو کوئی اثرات نظر نہیں آرہے ہیں۔

ہمارا سفر جاری تھا۔ نماز ظہر کے لیے قافلہ ایک جگہ رک گیا۔ پوچھنے پر

معلوم ہوا کہ علاقہ گرم چشمہ کا پہلا گاؤں ہے۔ احباب نہری پانی سے وضو کرکے مسجد چلے گئے۔ مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی تب دریا میں نہانا شروع کیا۔ مجھے دیکھا دیکھی دوسرے کئی ساتھی بھی دریا میں کودنے لگے۔ نہا دھو کر فارغ ہوئے تو بلاوا آیا کہ جلدی سے مسجد میں آجائیں۔ اوپر جا کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کا نام خسرو مسجد ہے۔ اس مسجد کی بنیاد 1934ء میں رکھی گئی ہے۔ پرانی طرز کی تعمیر ہے۔ نماز باجماعت ادا کی۔ مسجد کے متصل ایک مزار بھی ہے۔ جو پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ مسجد کے صحن سے باہر نکل کر دیکھا تو ایک خوبصورت قلعہ بیچ کھیتوں نظر آیا۔ بہت ہی پیارا منظر تھا۔ دائیں بائیں بڑے بڑے کھیت لہلہاتے نظر آرہے تھے۔ قلعہ اپنی پرانی حالت پر برقرار تھا مگر معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ قلعے کا پرانا دبدبہ نہیں باقی رہا۔

جدید نظام آنے کی وجہ سے نمبر دار، قلعہ دار، جرگہ دار اور راجاؤں مہاراجاؤں کا دور ختم ہوا۔ اب یہ قلعے اور حویلیاں یاد ماضی بن چکیں ہیں اور ان کے مکینوں کا رعب و دبدبہ اور ظلم و ستم قصہ پارینہ بن گئے ہیں۔ واقعی عظمت صرف خدا کی ہے اور ہمیشگی اور ابدیت بھی اسی ذات لازوال کو زیبا ہے۔ باقی سب خس و خاشاک۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم سیدھا پولیس چوکی کراس کرتے ہوئے گرم چشمہ کے مرکزی حدود میں داخل ہوئے۔

گرم چشمہ

ہمارا قافلہ گرم چشمہ کے متصل گراؤنڈ میں رکا۔ یہ گراؤنڈ کھنڈرات کا منظر پیش کررہا تھا۔چترال کے علاوہ بھی کئی مقامات پر گرم چشمے موجود ہیں۔ گلگت بلتستان کے علاقہ گوہرآباد رائیکوٹ کے مقام پر بھی گرم چشمے موجود ہیں۔ جسے سے " تاپانی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔کے کے ایچ میں واقع اس تاپانی میں بھی علاج معالجے کے لیے لوگوں کا تانتا بندھتا ہے مگر مکمل انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے ملک کے دیگر علاقوں سے آمد کم ہے۔رائیکوٹ گوہرآباد میں جو گرم چشمے ہیں ان کی بنیاد نانگاپربت ہے۔ ماہرین بتاتے ہیں کہ ان گرموں چشموں کی اصل وجہ سلفر ہے جو سطح زمین سے تین کلومیٹر نیچے ہے جو ہمہ وقت ابلتا رہتا ہے۔اس کو "تاپانی جیولوجیکل فالٹ" (Geological falt) بھی کہا جاتا ہے۔نانگاپربت گرم چشموں کی لنک استور اور بلتستان میں بھی ہے۔ کئی امراض کے لیے شفا ہے۔گرم چشمے کا منتظم اور لوگوں کو چشمے تک رسائی دینے والے سرکاری ملازم کا کہنا ہے کہ تاپانی گرم چشمے امراض دل، موٹاپا اور دیگر بیماریوں کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔رائیکوٹ گرم چشمے اتنے گرم ہیں کہ انڈہ اور آلو آسانی سے پکایا جاسکتا ہے۔اور ان تمام باتوں کی تصدیق.برادرم غلام نبی رائیکوٹی بھی کررہے ہیں۔

ایک مشہور زمانہ گرم چشمہ تاجکستان میں بھی ہے۔ سیاح لوگ وہاں بھی کثرت سے جاتے ہیں۔ تاجکستان گرم چشمہ میں جو پانی آتا ہے وہ برف نما چیز سے پگل کر آتا ہے۔ یا پانی میں پایا جاتا ہے۔ کوئی گندھک ہوگا۔ ممکن ہے کہ اوپر برف ہو اور نیچے زیر زمین گندھک ہو۔ گرم چشمہ اور گرم فوارے امریکہ میں بھی ہیں۔ امریکہ کے یلو اسٹون نیشنل پارک میں دنیاکے سب سے بڑے گرم فوارے ہیں۔ گرانڈ پر سیمنک چشمہ بھی ہے جو امریکہ کا سب سے بڑا گرم چشمہ ہے۔ امریکہ کا یہ چشمہ قوس قزاح کے رنگوں کا 250 فٹ چوڑا اور 300 فٹ لمبا ہے۔ اس چشمے کے عین وسط میں پانی کا رنگ مکمل نیلا ہے جبکہ چاروں اطراف میں نارنگی، لال اور پیلا رنگ کا پانی ہوتا ہے۔ چشمے کے قلب میں آبی درجہ حرارت اس قدر گرم ہے کہ وہاں پر کسی آبی جانور کی زندگی ممکن نہیں۔ یہ چشمہ معدنیات سے بھی مالا مال ہے۔

چترال گرم چشمہ چترال شہر سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ شہر چترال سے 28 میل یعنی 48 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ گرم چشمہ 1859 میٹر یعنی 6100 فٹ بلندی پر واقع ہے۔ ہم جونہی گرم چشمہ گراؤنڈ میں اترے تو سامنے کئی خوبصورت مناظر دکھائی دینے لگے۔

موسم بہار عروج پر تھا اس لیے مناظر دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ مولانا حفیظ الرحمان نے مدرسہ تبلیغ الاسلام کی طرف قافلے کا رخ موڑ دیا اور ہم

سیدھے مدرسے کی مسجد جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں طلبہ قرآن کریم اور درس نظامی کے اسباق میں مصروف ہیں۔ قاضی صاحب اور دیگر احباب نے دو رکعت نماز نفل ادا کی اور مدرسے کے مہمان خانے جا پہنچے۔ مجھے ایسے مقامات پر تجسس ہوتا ہے اس لیے مدرسے کا چکر کاٹنے لگا۔ مولانا جلال الدین اور اس کی دینی خدمات کا تذکرہ تو کافی دنوں سے سن رہا تھا مگر اب خود دیکھ بھی رہا تھا کہ اتنے دور مضافات میں اتنا بڑا
ادارہ۔مدرسہ تبلیغ الاسلام میں درجہ حفظ کی سات کلاسیں ہیں جبکہ درس نظامی کے درجہ ثانیہ تک کے درجات ہیں۔ عصری تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ مولانا جلال الدین بنیادی طور پر اسکول ماسٹر ہے مگر ان کی دینی خدمات کا حلقہ بڑا وسیع ہے اس لیے انہیں مولانا سے پکارا جاتا ہے۔انہوں نے گرم چشمہ اور چترال کے دیگر جگہوں میں اب تک 27 مساجد تعمیر کروائے ہیں۔اور کئی مساجد ان کی نگرانی میں تعمیر ہو رہی ہیں۔ ہزاروں لوگ ان سے متاثر ہو کر دعوت و تبلیغ کے کام سے جڑ چکے ہیں اور سینکڑوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ ہر آدمی سے ان کی تعریف سنی۔واقعی وہ ولی اللہ ہیں۔ اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔

چترال کا جو گرم چشمہ ہے اس میں سیاح اور مختلف امراض میں مبتلا لوگوں کی ایک کثیر تعداد آتی ہے۔ گرم پانی سے نہانے کے لیے تالاب بھی ہیں اور واش روم بھی بنائے جا چکے ہیں مگر ان میں ٹھیک ٹھاک رقم چارج کی جاتی ہے۔

انتظامات درست نہیں ہیں۔ جس جگہ سے پانی نکلتا ہے وہاں بہت ساری خواتین کو کپڑے دھوتے دیکھا۔ پائپ لائنوں کے ذریعے گرم پانی مختلف جگہوں میں لے جایا گیا ہے۔ مدرسہ تبلیغ الاسلام چونکہ گرم چشمہ کے پہلو میں ہے اس لیے پانی کی ایک بڑی مقدار مدرسے میں لایا گیا ہے۔ مدرسے میں گرم پانی سے نہانے کا بہترین انتظام ہے۔ مہمانوں کو یہ سہولت فری میں دی جا رہی ہے۔ پانچ تالاب ہیں اور کئی غسل خانے۔ گرم چشمے کا پانی بہت گرم ہے۔ اس میں دوسرا ٹھنڈا پانی نہ ملایا جائے تو نہانا ممکن نہیں۔ مدرسہ تبلیغ الاسلام میں ایک گرم کمرہ خصوصی طور پر بنایا گیا ہے۔ اس کمرے کے فرش کے نیچے چشمہ کا گرم پانی پہنچایا گیا ہے۔ آپ کمرے کے پکی فرش پر پاؤں رکھیں تو ٹھیک ٹھاک گرمائش ہونے لگے گی کیونکہ فرش کے نیچے گرم پانی ہے۔ مولانا حق نواز، قاضی صاحب، مولانا منیر اور برادرم احسن عمر نے مدرسے کے گرم تالابوں میں نہا کر اس گرم کمرے میں آرام کیا۔ جہاں انہیں لحاف اور بستر دیا گیا تاکہ وہ اس میں لیٹے رہیں۔ بتایا گیا کہ گرم چشمے کے پانی میں نہانے کے بعد لحاف یا کمبل اوڑھ کر کافی دیر تک لیٹے رہنا ہے۔ بصورت دیگر نہانا مفید نہیں۔ مدرسہ میں ایک اور کاریگری کی گئی ہے کہ کچھ کمروں کی دیواروں میں G,i(Galvanized Iron) پائپوں کی وائرنگ کی گئی ہے اور ان کے ذریعے گرم پانی گزارا گیا ہے۔ جس کی تپش سے سردیوں میں پورا کمرہ گرم

ہو جاتا ہے۔

عین گرم چشمہ اور مدرسہ تبلیغ الاسلام سے پورا گرم چشمے کا علاقہ نظر آتا ہے۔ یہاں اکثریت اسماعیلی برادری کی ہے۔ دونوں فریقین میں لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے ہیں۔ مختلف سماجی اور معاشرتی معاملات میں بہترین کوآرڈینیشن موجود ہے۔ آپ جب بھی گرم چشمہ جائے تو عین اس جگہ جہاں سے گرم پانی نکلتا ہے میں کھڑے ہو کر نظارہ کریں تو آپ کو نیلامائل شفاف پانی، دور تک سرسبز و شاداب فصلوں کی ہریالی، حسین رنگوں کے امتزاج والے پہاڑ، پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف اور ان کے اوٹ میں گھومنے والے بادل نظر آئیں گے۔ اور چونکہ گرم چشمہ تھوڑی اونچائی پر ہے۔ وہاں سے کچی مٹی، گارے اور پکی اینٹوں کی سادہ عمارتیں بھی نظر آئیں گی اور رنگ اور رنگین مزاج انسانوں کی بنائی ہوئی رنگ آفریں، جدت پسند، نقش و نگار اور مزین و آرائش شدہ بڑی بڑی عمارتیں بھی نظر نواز ہونگیں۔ انسان اپنی حقیقت بھول جاتا ہے ورنہ تو بڑی بڑی فلک بوس عمارتیں بنانا اور ان پر فخر کرنا مغضوب قوموں کا شعار ہے۔ قوم عاد وثمود کی یہی روش رہی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ اور ان کے صحابہؓ کا ہرگز یہ طریقہ نہیں رہا ہے۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ "کن فی الدنیا کانک غریب اَو عابِرُ سبیلٍ" یعنی دنیا میں ایسا رہو جیسے کوئی پردیسی یا راہ چلتا مسافر"۔

گرم چشمے میں سیاحوں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس نظر آئی، ان کا آزادانہ گھومنا پھرنا عجیب سا لگا۔ مختلف مصنوعی رنگ روغنوں سے اپنی فطرتی شکلوں کا رنگ و روپ بگاڑا گیا تھا۔ کملز شدہ مہندی سے بازو، سینہ، کمر، اور جسم کے دیگر اعضاء پر رنگ سازی اور نقس نگاری کا ظالمانہ شوق، ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گویا یہ انسانی جسم خدا کا بنایا ہوا نہیں کسی مجسمہ ساز کا بنایا ہوا مجسمہ ہے جس نے موئے قلم کو گھماتے ہوئے جیسا چاہا رنگ و روپ بنا لیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جس چیز جو فطری رنگ اور شکل بنائی ہے وہی اس کے ساتھ جچتی ہے اور سوٹ بھی کرتی ہے۔ یہ خود ساختہ رنگینیاں اور لیپا پوتیاں اس جاں و جسم کے لیے کی جاتی ہیں جس نے بالآخر مٹی میں دفن ہونا ہے اور حشرات الارض کا خوراک بننا ہے۔

ہم عصر تک گرم چشمہ کے متصل مدرسہ تبلیغ الاسلام میں رہے۔ گرم چشمہ سے واپسی کا سفر بھی خوب رہا۔ رات حاجی سرفراز کے دولت کدے میں ٹھہرے۔ انہوں نے مہمانوں کے اعزاز میں بہترین چترالی روایتی کھانے تیار کروائے۔ حاجی سرفراز سوات کے رہنے والے ہیں تاہم چترال میں ان کے تین پٹرول پمپ ہیں۔ گلگت میں بھی تیل کا کاروبار کیا ہے۔ انہوں نے قافلہ کے تمام ممبران کو ایک ایک اصلی دیر والی چاقو بھی بطور ہدیہ عطا کیا۔ بھائی نور محمد کی فیملی میں فوتگی

ہوئی تھی باوجود اس کے وہ رات کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ حاجی صاحب کے ہاں بہت سارے احباب ملنے آئے۔ ہمارے قاضی نثار احمد صاحب کے ہم نام ایک معروف عالم دین مولانا قاضی نا نثار احمد کے نام سے چترال میں بھی ہیں۔ وہ چترال کے جماعت تبلیغ کے امیر ہے۔ جامعہ رشیدیہ ساہیوال سے ۱۹۷۲ء کے فاضل ہیں۔ ان کے والد ماجد قاضی غلام احمد صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ امیر جماعت چترال مولانا قاضی نثار احمد صاحب اپنے رفقاء عجب خان صاحب، حاجی عبدالرشید صاحب اور دیگر کو لیئے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ تمام ساتھی چترال جماعت تبلیغ کے شوریٰ کے ممبران ہیں۔ ان کیساتھ بڑی خوشگوار ملاقات ہوئی۔ دینی و تبلیغی امور پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ رات گئے تک تمام میزبان ہم سے رخصت ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں قاضی ہم نام ہیں، دونوں کے اباجان دارالعلوم دیوبند کے تربیت یافتہ ہیں اور دونوں اپنے اپنے علاقے میں نہایت ہی مؤثر حلقہ احباب رکھتے ہیں۔

سویرے نماز فجر کے بعد گلگت روانہ ہوئے۔ قاضی صاحب کے ہم درس مولانا نصیرالدین نقشبندی نے سفری ناشتہ لانا تھا جس کا انتظار اس لیے نہیں کیا کہ راستہ لمبا تھا۔ چترال شہر سے چار گھنٹے کی مسافت پر مستوج پٹرول پمپ میں حاجی سرفراز صاحب نے ناشتے کا انتظام کیا تھا۔ وہاں رک کر ناشتہ کیا۔ مستوج سے ایک لنک روڈ تاجکستان جالگتا ہے جبکہ دوسرا روڈ بذریعہ شندور گلگت

لنک کرتا ہے۔ہم نے چترال کے سفر میں کئی قسم کے رنگ اور رنگینیاں دیکھی ۔انسانوں کی رنگینیاں، پہاڑوں کی رنگینیاں، چرند پرند کی رنگینیاں، لباس کی رنگینیاں، حیوانات کی رنگینیان، درختوں کی رنگینیاں، غرض فطرت خداوندی کی ہزار ہا رنگینیاں اور نقوش باصرہ نواز ہوئیں۔پھر مختلف مسالک و مذاہب کی رنگینیاں، بالخصوص کیلاشیوں کی رنگین ثقافت، زرق برق لباس اور بہت کچھ دیکھا جو کبھی سنا نہیں تھا۔اللہ تعالی نے یہ تمام خوبصورتیاں، رنگینیاں انسان کی فائدے کے لیے بنائی ہے اور مسخر بھی کی ہے مگر ناداں انسان ان سے فوائد سمیٹنے کے بجائے ان کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ان جھلملاتے رنگوں کو دیکھ کر دل میں سوچنے لگا کہ ایسی صورت حال میں انسان کو چاہیے کہ صرف اللہ کے رنگ میں رنگ جائے ، اس کے رنگ کے حصول کے لیے اپنی صلاحتیں،اپنی طاقت، مال وجان، دل و دماغ غرض ہر چیز کھپا دے۔ یہی میرے اللہ کا بھی فرمان ہے۔ ’’صبغۃ اللہ، و من احسنُ من اللہ صبغۃ و نحن لہ عٰبدون‘‘ یعنی اللہ کا رنگ بھلا کسی اور کا رنگ اللہ کے رنگ سے بہتر ہو سکتا ہے؟ اور ہم اسی کے ہی عبادت گزار ہیں‘‘۔ اللہ اللہ کرکے سفرنامہ ’’گلگت سے کیلاش تک‘‘ تمام ہوا، اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

زندگی

زندگی کیا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جو لانیحل ہے۔ ہر ایک نے اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔اسلام نے زندگی کے فلسفے کو کس انداز میں پیش کیا ہے اس پر اس لیے بات زیادہ نہیں کرونگا، کیونکہ ہم مجموعی طور پر اسلام بیزار ہو چکے ہیں۔اور بالخصوص اہل ادب تو اسلام بیزاری کو سندِ اعزاز سمجھتے ہیں۔تاہم حفیظ شاکر کی کتاب پڑھنے کے بعد ان پر اسلام بیزاری کا بینر فٹ نہیں کیا جاسکتا۔زندگی کیا ہے؟اسے کون سمجھے اور کیوں سمجھے، اور اسے بھلا کوئی کب سمجھا ہے تو میں اور آپ سمجھیں گے۔ ہاں زندگی کا الٹ موت ہے اور پھر موت کیا ہے؟ بدیہی حقیقت یہ ہے کہ موت تو برحق ہے۔ سوال یہ ہے کہ برحق کیا ہوتا ہے؟۔برحق تو وہ ہے جسے ٹالا نہ جاسکے۔قرآن کا فیصلہ مگر یہ ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔سادہ الفاظ میں ہر زندگی کو موت کے کنویں میں جا گرنا ہے۔

عبدالحفیظ شاکر کی کتاب زندگی موصول ہوئی۔یہ مختصر سی کتاب صرف اور صرف زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ایک ہی موضوع پر اتنی شاعری کرنا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں۔یہ کتاب ان کی کتابِ زندگی نہیں بلکہ موضوعِ زندگی پر ان کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ وہ ارشاد کرتے ہیں کہ

زندگی کی ابتداء بھی ہے عجیب
اور اس کی انتہاء بھی ہے عجیب
زندگی مٹی ہے مٹی زندگی
اس تخیل کا خدا بھی ہے عجیب

میں نے کتاب زندگی کو ہاتھ میں لے کر زندگی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ عجیب آدمی ہوں کتاب نہیں پڑھ رہا بلکہ زندگی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کیونکہ میری زندگی بھی عجیب زندگی ہے۔ مجھے لگا کہ زندگی منسوب ہے۔ کس کے نام ؟ ارے وہ نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں۔ بلکہ زندگی منسوب ہے سانسوں کے چلنے سے،زندگی منسوب ہے دلوں کے دھڑکنے سے، زندگی منسوب ہے آہوں کے مچلنے اور خوابوں کے سنورنے سے بلکہ سنور کر بگڑنے سے۔زندگی منسوب ہے خیالات کے ابھرنے سے، زندگی منسوب ہے دل کے دربدر ہونے سے۔اور سچی بات یہ ہے کہ زندگی منسوب ہے محبوب کے ملنے سے۔ وہ زندگی بھی کیا زندگی جو محبوب کے بنا گزرے۔پَر محبوب کونسا ؟وہ جس کو خود زوال ہے ؟۔ محبوب کا نام زندگی ہے اور وہ کیسی زندگی جو اپنی زندگی کسی اور سے مانگے ؟بہر صورت سادہ الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ حرکت کا نام زندگی ہے اور جو جو تھم جائے۔وہ زندگی نہیں۔

آج کوشش کرونگا کہ حفیظ شاکر صاحب کی نئی نویلی کتاب ”زندگی“ پر کچھ

کلمات لکھوں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ تو شاعری کی کتاب ہے اور میں رہا شاعری سے کامل کورا۔ تو کیا ہوا؟۔ پطرس بخاری اور اس کی میل بغیر پڑھے بلکہ بغیر درمیانی ورقے پھاڑے کتابوں پر تبصرے کر سکتے ہیں تو میں '' زندگی ''کے اشعار، پڑھ کر بغیر سمجھے تبصرہ کیوں نہیں کر سکتا۔ عبدالحفیظ شاکر کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کافی مشکل ہے کہ وہ شاعر زیادہ ہے یا نثر نگار بلکہ وہ ادیب زیادہ ہے یا فنکار۔ جو انہیں ادیب مانتے ہیں وہ فنکار تسلیم نہیں کرتے اور جو فنکار تسلیم کرتے ہیں وہ ادیب کب تسلیم کرتے ہیں۔ وہ جو بھی ہے وقت فیصلہ کرے گا تاہم اتنا ضرور عرض کرونگا کہ وہ استاد ضرور ہیں وہ بھی سرکار کی پکی ملازمت کا۔ کیونکہ تین لاکھ والے استاد بھی تو بہت زیادہ ہیں آج کل۔ تو اب سنتے ہیں استاد عبدالحفیظ شاکر کے کچھ اشعار، لیکن یہ اشعار نثر میں ہونگے یعنی استاد حفیظ شاکر کے اشعار کو نثری قالب میں ڈھال دیا جائے گا۔

وہ کہتا ہے کہ '' خود اپنے اندر ڈھونڈ لو گئے تو آپ کو زندگی ملے گی، جب زندگی ملے گی تو اللہ کی بندگی بھی عطاء ہوگی'' واقعتاً سچ کہا ہے۔

وہ اقدار کے مٹنے پر بھی سیخ پا ہیں۔ فرماتے ہیں '' زندگی کی ساری قدریں مٹ گئی، برہنہ بازار میں ہے زندگی''۔ یار اس برہنگی سے تو واقعی موت اچھی۔

وہ کہتے ہیں کہ " کہیں کچرے میں زندگی لت پت ہے تو کہیں زندگی کسی کوٹھے کی زینت بنی ہوئی ہے۔ کہیں چمن زاغوں کے تصرف میں ہے تو کہیں مغربی تہذیب مشرق کا کفن بن گیا ہے۔ زندگی کو لوٹانا ممکن ہے اور اس کے لیے شرط ایمان ہے۔ جب یہ نہیں تو پھر زندگی میں بے حسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں تو زندگی اپنی وقعت اور وقار کھو دیتے ہے"۔

استاد حفیظ شاکر کے نزدیک " زندگی نمرود کے قہر میں غلطاں ہے تو ابراہیم کے لیے آگ کو گلستان کر دیتی ہے زندگی، حسن یوسفؑ زندگی کا ترجمان ٹھہرتا ہے تو لحنِ داؤدی بھی "زندگی کی پہنائیوں میں ہوتا ہے۔

یارا سنو۔ کیا غضب کا فرماتے ہیں " خاکِ پائے مصطفیٰ ہے زندگی، جراتِ شیر خدا ہے زندگی"۔ سچ یہ ہے کہ مصطفیٰ ﷺ کی جوتیوں کی خاک جب ہماری آنکھوں کہ سرمہ نہ بنے تو پھر ایسے زندگی سے موت اچھی ہے۔ کیونکہ ایسی زندگی سے پرواز میں کوتاہی آ جاتی ہے۔

نونہالوں کے حوالے سے زندگی کو یوں بیان کرتے ہیں " ننھے منے بچوں کی لڑائی بھی زندگی ہے، چھوٹوں کی بڑائی بھی زندگی ہے، کتنے دلکش زندگی کے روپ ہیں، سرخ انچل میں کڑائی زندگی ہے"۔

عشق مصطفیٰ ﷺ کو زندگی میں یوں بیان کرتے ہیں" عشق احمد میں گزارو زندگی، دوستوں مل کر سنوارو زندگی، بحر میں سیرت کے ہو کر غوطہ زن، دہر میں اپنی نکھارو زندگی" یعنی جو بھی سیرت محمدی ﷺ سے کے دریائے لولوء و مرجان میں غوطہ زن ہو کر نقوش زندگی پائے گا اسی کی زندگی سنورے گی۔

عبدالحفیظ شاکر شاعر ہیں۔ اور شاعر اپنی شاعرانہ خُو سے کب باز آتا ہے۔ شاعری میں مہہ جبینوں اور نازنینوں کے نخروں کو مرکزی جگہ حاصل ہے۔ اس حوالے سے بھی انھوں نے خوب کہا" فتنہ گر ہے مہہ جبینوں کی نظر، توبہ توبہ نازنینوں کی نظر، راکھ کرتی ہے جلا کر زندگی، گُل بدن، گُل رخ حسینوں کی نظر"۔ بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ مہہ جبینوں نے بڑے بڑے انقلاب برپا کیے ہیں۔

عشق خلفائے راشدین اور ان کا آپس کا تعلق یوں بیان کرتے ہیں" داستانِ زندگی تحریر کر، "اذ ہما فی الغار" کی تفسیر کر، چار یاروں کی نرالی شان ہے، زندگی اپنا قلم شمشیر کر"۔

غیراللہ سے کنارہ کشی کو کس ظالمانہ اسلوب میں بیان کیا ہے" اہل دل کا ہے

یہ قول معتبر، ''زیر'' ہو جا زندگی !مت بن زبر۔ ''پیش'' ہونا ہے تجھے اک دن ضرور، ماسوااللہ سے بچا قلب و نظر''۔ظاہر ہے فلاح وہی پائے گا جو قول و فعل میں خدا کے سوا کسی کو سجدہ ریز نہ ہو۔اور تمام انبیاء کا بھی یہی متفقہ تبلیغی لائحہ عمل تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

مزدور کی ترجمانی یوں کرتے ہیں''یہ قلم مزدور کا ہے ترجماں، جن کے نیچے خاک سر پر آسماں'' ۔

پھر غربت کو کس پیرائے میں لیا ہے'' تنگ دستی میں تڑپتی زندگی، بھوک سے پیہم سسکتی زندگی،دن بدن ہاتھوں سے مٹی کی طرح،دھیرے دھیرے ہے سرکتی زندگی''۔

خدا کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ''کاد الفقر ان یکون کفراً'' ۔ فقر اور تنگ دستی سے تو انسان سسکتے سسکتے کفر کو قبول کرلیتا ہے۔

قارئین !زندگی کیا ہے سوائے ایک طویل مسافت کے۔۔ایک ایسی مسافت جس کی منزل تو متعین نہیں ، اگر منزل متعین ہے بھی تو راہیں جدا جدا۔ میری زندگی کیا ہے کسی کو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔پھر کن راہوں پر چل کر زندگی کو سمجھا جاتا ہے۔خود کی پہچان کیا ہوتی ہے۔ بہر صورت بہت سارے سوالات اٹھتے ہیں زندگی کے متعلق۔

''استاد حفیظ شاکر کی زیر مطالعہ کتاب ''زندگی

پڑھنے سے شاید کئی سارے انجانے سوالات کے جوابات مل جائے۔کیا یہ سچ نہیں کہ نئی راہیں، نئے منظر، نئے نقوش، نئی زندگی اور نئی باتیں آپ کی منتظر ہیں۔ہر موڑ میں نئی راہ ہے اور پھر سے ایک نئی راہ سے ملنے والے تمام پھولوں اور کانٹوں کو چن کر آپ نے اپنا دامن بھرنا ہے۔۔ اور آگے بڑھتے جانا ہے۔بڑھتے جانا ہے۔ اسی کو تو زندگی کہا جا سکتا ہے۔

زندگی'' کو غور سے پڑھا۔زندگی میں زندگی کی رمق مل گئی۔ شاعری کے رموز و'' اوقاف سے زیادہ آگاہی نہیں تاہم ''زندگی'' کے قطعات و نظموں کو ترنم سے پڑھنے کی کوشش کی تو کامیابی ہوئی۔ کہیں اٹکن کا سامنا کرنا نہ پڑا۔ اسے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ''زندگی'' میں کی جانے والی شاعری، شاعری کے ناپ تول میں پورا اترتی ہے۔آپ بھی زندگی'' کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو زندگی نئے زاویوں میں ملے گی۔ ایک نئی زندگی آپ کو اپنا ہاتھ تھما رہی ہوگی۔ کبھی آپ کی آنکھیں نم ہو نگیں اور کبھی قدم بوجھل اور دل پر سوز۔ زندگی کو پڑھتے پڑھتے جب میری نظر کئی گلدستوں پر پڑی تو ہونٹوں اور آنکھوں میں ایک مسکراہٹ جگمگا اٹھی۔ دل سے فورا ایک آواز آئی۔ تم بھی کہیں زندہ ہو۔

دل کی بات پر دماغ سرشار ہوگیا اور سرشاری کے ساتھ بیدار بھی، اور فورا

تمام وجود کو ایک خوشی کا پیغام ملا۔ ایسا پیغام جس کو میں محسوس تو کر سکتا ہوں پر بیان نہیں کر سکتا۔

زندگی'' دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ زندگی پر لکھی گئی تحریروں سے آراستہ ہے'' ۔ جمشید دکھی، شیر باز علی برچہ، فدا علی ایثار، احمد سلیم سلیمی، اعجاز الحق اعجاز اور عبداللطیف نے زندگی پر خامہ فرسائی کی ہے اور دوسری حصہ شاکر صاحب کی شاعری پر ۔۔ حلقہ ارباب ذوق گلگت اور گلگت کے مختلف بک اسٹالوں پر یہ کتاب دستیاب ہے۔ ٹائٹل پر کمال محنت ہوئی ہے تاہم اندرونی سیٹنگ مزین نہیں۔

"محرم الحرام کے دو شہید "فاروقؓ و حسینؓ

محرم الحرام کے مقدس مہینے میں دو واقعات ایسے پیش آئے کہ تاریخ انسانیت آج تک ان کو بُھلا نہ پائی۔ یکم محرم الحرام ۲۶ سن ہجری کو خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروقؓ کو شہادت کی خلعت فاخرہ ملی جبکہ عاشور یعنی دس محرم الحرام کو جگر گوشہ بتول امام عالی مقام جناب حضرت حسینؓ کو شہادت کا اعلیٰ مقام نصیب ہوا۔ دونوں کی قسمت پر ناز اور فخر ہی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس آج ان دونوں عظیم شخصیات کو تقسیم کرکے متنازعہ بنا دیا گیا ہے۔ ان کا مقام بہت اونچا تھا مگر افسوس انہیں مختلف خانوں میں بانٹ کر انہیں چھوٹا دکھائی دینے کی کوششیں ایک عرصے سے جاری ہیں۔ عمرؓ اور حسینؓ کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا کیا جاسکتا ہے کہ جو طبقہ عمرؓ کو اپنا مانتا ہے وہ جہالت اور کم علمی و پروپیگنڈے کی بنیاد پر حسینؓ کو اپنا نہیں سمجھتا یا کم از کم کسی اور کا سمجھتا ہے۔ اور جو طبقہ حسینؓ کو اپنا سمجھتا ہے وہ ضد، حسد، کینہ، جہالت، کج فہمی اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر عمرؓ کو کسی اور کا سمجھتا ہے، کم از کم اپنا تو نہیں سمجھتا۔ بدیہی حقیقت یہ ہے کہ عمرؓ و حسینؓ اسلام کے ہیں۔ آج ان دونوں عظیم المرتبت انسانوں کے حوالے سے چند الفاظ اس لیے قرطاس کے سپرد کررہا ہوں کہ یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔ یہی میرا ایمان ہے اور یہی میرا

وجدان و اعتقاد بھی ہے۔اہل بیت اطہارؓ اور اصحاب رسولؐ پر درود و سلام بھیجے بغیر تو میری نماز بھی کامل نہیں تو پھر یہ میرے کیسے نہیں ہو سکتے۔

حضرت عمر فاروقؓ قانون کی بالادستی اور تنفیذ کے حوالے سے بہت ہی معروف و مشہور تھے۔ان کا ذہن وسیع اور نگاہ دورس تھی۔حضرت عمرؓ وہ اولین حاکم تھے جس نے امت کو حکمرانوں کے حقوق بتانے کے ساتھ ساتھ رعایا کے حقوق بھی واضح بیان کیے تھے۔انہوں نے ارشاد کیا تھا کہ "جس کسی پر بھی کوئی گورنر یا امیر ظلم و زیادتی کرے وہ مجھے براہ راست اس کی اطلاع کرے۔میں اس سے بدلہ دلواؤں گا"۔حضرت عمرؓ نے انصاف کے قیام کو یقینی بنانے کے لیے عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ کر دیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ قانون نافذ کرنے والے اور نزاعات کا فیصلہ کرنے کی اختیار کسی ایک فرد یا ادارے کے پاس ہو تو پھر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔اسلام کسی حاکم کو حدود سے تجاوز کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

خود احتسابی کا عمل شاید سب سے مشکل ہے۔خود احتسابی ایک عظیم صفت اور اخلاقی خوبی ہے اور یہ بدرجہ اتم حضرت عمرؓ میں پائی جاتی تھی۔وہ فرمایا کرتے تھے" محاسبے کے وقت سے پہلے اپنا محاسبہ کر لو۔اعمال کا ترازو لگنے سے پہلے اپنے اعمال کا وزن کر لو"۔وہ ایک کامیاب حکمران تھے۔قحط سالی میں

ان کا طرز عمل مثالی ہوا کرتا تھا۔ جب رعایا کو کسی بات کا حکم دیتے تو خود اس پر پہلے ہی کاربند ہو جاتے تاکہ رعایا کو بہترین نمونہ پیش کریں۔ حضرت عمرؓ اپنے گھر والوں اور اہل عیال کو قانون و روایات کی پابندی واحترام کرنے کی تاکید اور حکم دوسروں سے زیادہ کیا کرتے تھے تاکہ اس کا اثر عامۃ الناس پر خود بخود ہو جائے اور اچھے اور مفید نتائج برآمد ہو جائے۔ زہد و سادگی اور قناعت حضرت عمرؓ کی زندگی کی خاص باتیں تھیں، مسلمانوں کے بیت المال کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرتے تھے۔ سچائی اور انسانیت و مومنین کی بھلائی حضرت عمرؓ کے نزدیک سب کاموں سے اہم اور مقدم تھی۔ اس حوالے سے کبھی سستی اور کسالت اور مداہنت نہیں برتا کرتے، حالات کیسے بھی ہوں ان چیزوں کا بڑا خیال کرتے۔

حکمرانی کے جملہ اوصاف حمیدہ اور شعبہ ہائے زندگی کے ہر میدان میں کامیابی و کامرانی اور نصرت خداوندی اگر کسی ایک حاکم میں دیکھنا مقصود ہو تو انسان کی نظر بلا جھجک امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی طرف ہی اٹھتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی یہ صفت روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے اور اس کا انکار ممکن نہیں۔ حضرت عمرؓ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم تھا کہ آپ خلافت اسلامیہ کی تمام ذمہ داریوں اور نزاکتوں سے بخوبی آگاہ تھے اور اس کا حق ادا کرنے میں باریک بین اور حد درجہ محتاط تھے۔ آج دنیا یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ

امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے حقِ حکمرانی ادا کیا۔ یہ چند الفاظ سیرتِ عمرؓ کے مطالعہ سے ذہن نشین ہوئے تھے جو آپ کے ساتھ شیئر کیے۔ اب امام عالی مقام حضرت حسینؓ، شہید کربلا کی صفات جلیلہ سنتے ہیں۔

اہل بیت اطہار کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیراً"۔ یعنی اللہ یہی چاہتا ہے کہ اے رسول کے اہل بیت، تم سے ہر قسم کے گناہ کا مَیل دور کردے اور تمہیں کامل واکمل طہارت سے نواز کر بالکل پاک وصاف کردے"۔ اس آیت کریمہ میں اللہ کی یہ منشا محکم طور پر واضح ہوئی ہے کہ وہ اپنے حبیب ﷺ کے اہل وعیال یعنی اہل بیت اطہار کو طاہر ومطہر کردے کہ ان کی حیات مبارکہ میں کوئی میل کچیل نہ رہے اور وہ امت کے لیے نمونہ و اسوہ بنے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حوالے سے مختصراً عرض ہے۔ ان کی سیرت وصورت کے مطالعہ سے جو حاصل ہوا وہ آپ سے شیئر کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ ان کا حق ہے اور میرا فرض۔ ان کا نام حسین رضی اللہ عنہ بن علی المرتضی رضی اللہ عنہ، کنیت ابو عبداللہ، لقب سید شباب اہل الجن اور ریحان النبی، والدہ کا نام سیدہ فاطمہ خاتون جنت رضی اللہ عنہا تھا۔ حضرت حسینؓ کی ولادت بھی بہت ہی باسعادت تھی۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا تھا جو کہ ظاہراً ناگوار سا تھا مگر

آنحضرتؐ نے اس کی تعبیر ولادت حسینؓ سے کی۔ ماشاء اللہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو نہایت مبارک خواب ہے۔ یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا لڑکا پیدا ہوگا یہی لڑکا حضرت حسینؓ تھا، کچھ دنوں کے بعد اس خواب کی تعبیر ملی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت حسینؓ کی ولادت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عقیقہ کرنے اور بچہ کے بالوں کے ہموزن چاندی خیرات کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے آپ کا نام حرب رکھا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بدل کر حسین رضی اللہ عنہ رکھا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بچپن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے ساتھ پیار و محبت کے بیشمار واقعات ملتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تقریبا روزانہ حسنؓ و حسینؓ کو دیکھنے کے لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے اور دونوں کو بلا کر پیار کرتے اور کھلاتے۔ یہ دونوں معصوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد مانوس اور شوخ تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی شوخی پر تنبیہ نہیں فرمائی بلکہ ان کی شوخیاں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے دوش مبارک پر سوار کرکے برآمد ہوتے تھے اور ان کی ادنی سے ادنی تکلیف پر بے قرار ہوجاتے تھے۔ حضرات حسنین کریمین کبھی نماز کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر چڑھ کر بیٹھ جاتے۔ غرض کہ طرح طرح کی شوخیاں کرتے، آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نہایت پیار اور محبت سے ان طفلانہ شوخیوں کو برداشت کرتے اور کبھی تادیبا بھی نہ جھڑکتے بلکہ ہنس دیا کرتے تھے۔یہی تو تعلیمات نبوی ﷺ تھیں۔ابھی امام حسین رضی اللہ عنہ صرف سات سال کے تھے کہ ہادی دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا سای شفقت سر سے اٹھ گیا۔اس لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اتنا فیض حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا جتنا انکے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی احادیث کی تعداد کل آٹھ ہے،۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ جن بزرگوں سے آپ نے احادیث روایت کی ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ،حضرت فاطم الزہرا رضی اللہ عنہا،حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ،حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وغیرہ۔جنہوں نے حضرت حسینؓ سے روایتیں کی ہیں ان کی تعداد لمبی ہے تاہم مشہور یہ ہیں۔حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ،صاحبزادہ علی رضی اللہ عنہ،صاحبزادہ زید رضی اللہ عنہ،صاحب زادی سکینہ و فاطمہ رضی اللہ عنہما،پوتے ابو جعفر وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بہت پیار و محبت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " الحسن والحسین سیدا شباب اہل الجنۃ "یعنی حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

ایک مرتبہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " ان الحسن والحسین ہما

ریحانی من الدنیا" یعنی بے شک حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دونوں میرے دنیا میں پھول ہیں۔امام عالی مقام تو سب کے لاڑلے تھے۔ان کی ذات اقدس سے صحابہ کرامؓ بھی بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں آپ تقریباً آٹھ نو برس کے تھے۔ آپ سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ ادب و محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کو اپنے کندھوں پر بٹھاتے تھے۔امیرالمومنین حضرت عمر فارق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دور میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے پانچ ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِخلافت میں آپ پورے جوان ہو چکے تھے۔ چنانچہ سب سے اول اسی دور میں میدان جہاد فی سبیل اللہ میں قدم رکھا۔جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت برپا ہوئی اور باغیوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت پر مامور کیا کہ باغی اندر گھسنے نہ پائیں۔ انہوں نے نہایت بہادری سے باغیوں کو گھر گھسنے سے روکا تاہم باغی کوٹھے پر چڑھ اندر پہنچ گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر ڈالا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہادت کی خبر ہوئی تو انہوں نے دونوں بھائیوں سے سخت باز پرس کی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت باسعادت کے بعد ان کی نصیحت کے مطابق حضرت حسینؓ نے علوم اسلامیہ میں کمال حاصل کیا اور علوم حدیث اور تفسیر کے ماہر بن گئے۔ اور فقہ و فتویٰ میں چونکہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو موروثی دولت سے وافر حصہ ملا تھا چنانچہ آپ کے ہمعصر آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اور کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو ان کی طرف رجوع کرتے۔

حضرت حسینؓ کے مقولے اور اقوال حکمت بہت مشہور اور عام فہم ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ سچائی عزت ہے، جھوٹ عجز ہے، رازداری امانت ہے، امداد دوستی ہے، عمل تجربہ ہے، حسن خلق عبادت ہے، خاموشی زینت ہے، بخل فقر ہے، سخاوت دولتمندی ہے، نرمی عقلمندی ہے۔ اگر ان اقوال کے دل سے پڑھا جائے اور سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو کامیاب زندگی گارنٹڈ ہے۔

حضرت حسینؓ کی ذات اقدس فضائل اخلاق کا مجموعہ تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ ”کان الحسین رضی اللہ عنہ کثیر الصلو والصوم والحج والصدق افعال الخیر جمیعا“۔ یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ بڑے نمازی، روزہ دار، بہت حج کرنے والے بڑے صدقہ دینے والے اور تمام اعمال حسنہ کو کثرت سے کرنے والے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ کی صفات بے شمار ہے تاہم کاغذ کے ان اوراق میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب کو سمیٹا جائے۔مالی اعتبار سے آپ کو خدا نے جیسی فارغ البالی عطا فرمائی تھی اسی مقدار میں آپ راہ خدا میں خرچ کیا کرتے۔آپؓ حد درجہ خاکسار اور متواضع تھے۔ ادنی سے ادنی شخص سے بھی بے تکلفی سے ملنا آپ کی عادت مبارک تھی۔حضرت حسینؓ کی حق پرستی کے لیے ایک ہی مثال کافی ہے کہ راہِ حق میں اپنا سارا کنبہ لٹایا مگر ظالموں کے سامنے سر نہ جھکایا۔آپ کا حلیہ مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھا۔آپ اتنے حسین تھے کہ آپ کے رخساروں سے نورانیت چمکتی تھی۔
آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق پہلے ہی ارشاد کیا تھا۔حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کا فرمان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ میرا بیٹا حسین رضی اللہ تعالی عنہ میرے بعد زمین طف (جس کو اب کربلا کہتے ہیں) میں قتل کیا جائے گا اور جبرئیل علیہ السلام میرے پاس اس زمین کی یہ مٹی لائے ہیں اور انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ یہی مٹی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مدفن ہے۔بالآخر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ دس محرم الحرام ٦١ سن ھجری کو آٹھاون سال کی عمر میں مقام کربلا میں شہید کیے گئے۔اللہ تعالی آپ کی مرقد مبارک پر ہزار ہار حمتیں اور

کروڑوں برکتیں نازل فرمائے۔ اور ہم جیسوں کو آپ کے شہادت کے مقاصد جلیلہ سے مستفید ہونے اور اپنے لیے راہِ عمل بنانے کی توفیق عطاء فرمائے۔

میری دھرتی کی قسمت

اس سے میری شناسائی کافی پرانی تھی، کشمیری نژاد اس پاکستانی دوست کو میرے خیالات سے شدید اختلاف تھامگرہمارے یہ نظریاتی اختلافات کبھی ہماری دوستی میں آڑے نہیں آئے۔ ایک کرنٹ آفیئر ورکشاپ میں ، میں مدعو تھا۔ مجھے ''گلگت بلتستان اور کشمیر کی آئینی پوزیشن '' کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ میں نے حمد و ثناء کے بعد مختصر وقت ہیں حاضرین کو گلگت بلتستان اور کشمیر کی اصل آئینی و جغرافیائی پوزیشن سے آگاہ کیاکہ دور ماضی میں گلگت ایجنسی اور ریاست کشمیر کا کیا تعلق رہاہے۔ قیام پاکستان کے بعد اب تک کیا صورت حال رہی ہے، اقوام متحدہ ہیں پاکستان قضیہ کشمیر کو کن بنیادوں پر لے گیاہے اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ قضیہ کشمیر کے حوالے سے چار اہم ادوار گزرے ہیں۔ ایک دور 1947 سے 1971 تک کا ہے۔ اس دور میں پاکستان بہت مضبوط پوزیشن میں تھا۔ کیونکہ اقوام متحدہ کی 1948اور 1949 کی قراردادوں کی بنیاد پر ہم اخلاقی اور قانونی طور پر اچھی پوزیشن میں تھے۔ یہ ایک مستحکم دستاویز تھی۔ اس وقت تک مسئلہ کشمیر بین الاقوامی مسئلہ تھا۔ اس کے بعد شملہ معاہدہ ہوا تو اس ہیں ہماری پوزیشن کمزور تھی ۔ ہم نے اس معاہدہ میں کشمیر کے حوالے سے جاندار موٴقف نہیں اپنا سکے۔ اس

معاہدہ یوں ہم نے تمام تنازعات کی بات کی اور مسئلہ کشمیر کو ضمن میں شامل کیا اس کا بااستقلال اس معاہدہ میں ذکر نہیں تھا تو ہندوستان کو موقع ملا تو اس نے اپنے آئین میں تبدیلی کرکے کشمیر کو اپنا جغرافیائی حصہ قرار دیا۔ایک دور 1972 سے 1985 تک کا ہے اس دور میں ہماری حالت بھیگی بلّی کی سی تھی۔ 1885 کے بعد کشمیری مجاہدین نے خود میدان میں نکل کر مسئلہ کشمیر کو زندہ کیا۔ 1985 سے 2001 تک کی مجاہدین کی قربانیوں نے مسئلہ کشمیر میں روح پھونک دی تھی تاہم ہم نے یہ کہہ کر اس سے روح نکال دی کہ کشمیر یوں ہماری طرف سے دراندازی ہورہی ہے۔چوتھا دور 2001 سے تاحال تک کا ہے اس دور میں تو ہمارا آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ہم نے اپنا سب کچھ جنگ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھا دیا۔اب ہم قضیہ کشمیر کو لیکر جہاں کہیں بات کرتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا انٹرنل کیس ہے خود باہمی مذاکرات کے ذریعے حل کرو یوں ہم بین الاقوامی تعاون سے محروم ہوگے۔ہمیں مسئلہ کشمیر کو سمجھنے کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں کا ٹیکسٹ اور شملہ معاہدہ کا متن بغور پڑھنا ہوگا۔ یہ واضح رہے کہ گلگت بلتستان کشمیر کا آئینی اور جغرافیائی حصہ ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس حوالے سے ہمارے لوگ ہمیشہ حقائق سے صرف نظر کرکے من گھڑت اساطیر کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ آج کا نوجوان تاریخی حقائق سے بے بہرہ نہیں۔

میرے یہ دوست بھی سامعین کی اگلی نشستوں پر انگشت بداندں بیٹھے تھے جب میں نے بات ختم کی تو یہ اپنی نشست پر کھڑے ہوئے اور کہا کہ حقانی صاحب معاہدہ کراچی کیا ہے ؟اس کی وضاحت کیجیے۔اصولی طور پر میرا ٹائم پورا ہو چکا تھا مگر سامعین کے اصرار وپر مجھے دوبارہ پورا وقت دیا گیا۔میں نے عرض کیا کہ ''جناب والا ''معاہدہ کراچی'' میری دھرتی کی محرومیوں کا شاخسانہ ہے۔میری آزادی کا گلا گھونٹ ہے۔ میری ترقی میں حائل دیوار چین ہے۔ میری سوچ، فکر، تخیل اور تصور پر قدغن ہے۔یہ ایک غیر قانونی ،غیر آئینی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی معاہدہ ہے جس کو مہذب دنیا تو کیا تیسری دنیا کا کوئی فرد بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔جعلسازی، فراڈ، دھوکہ، مکر، فریب،فرعونیت، دجالیت، شیطانیت اور خیانت کا عظیم شاہکار ہے۔بس دوستو! یوں سمجھو کہ '' معاہدہ کراچی'' اقوام متحدہ، عالمی عدالت انصاف، عالمی برادری، ٹرانس پیرنسی انٹر نیشنل تمام انسانی حقوق کی آرگنائیزیشنز، جنیوا کنونشن، عالمی امن کے ٹھکیداروں، مہذب دنیا، کے علمبرداروں ،نام نہاد عالمی لیڈروں، حقائق سے بے بہرہ قلم کاروں،اندھے دانشوروں،غلط ریکارڈ پیش کرنے والے سرکاری فرشتوں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ اور بین الاقوامی اصول و ضوابط اور قوانین کی خلاف ورزی کی ایک بدترین اور غلیظ ترین مثال ہے۔''

میں نے مجمع پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ تمام مجمع حیران و پریشان میرا منہ

تک رہا تھا۔ خاموشی طاری تھی۔ ہر ایک انگلی منہ میں دابے ورطہ حیرت یں مبتلا تھا۔ میرا یہ دوست دوبارہ کھڑا ہوا اور کہنے لگا جناب والا بات واضح نہیں ہوئی ہے۔ یہ معاہدہ کب، کہاں اور کس کے درمیان ہوا ہے؟ اور اس میں کیا خاص بات ہے؟ میں گویا ہوا کہ ''میرے دوستو!!! یہ معاہدہ 28 اپریل 1949 کو کراچی میں ہوا ہے جس یں گورنمنٹ آف پاکستان کے ایک وزیر مشتاق احمد گورمانی، آزاد کشمیر کے پہلے صدر سردار ابراہیم اور قائد کشمیر چوھدری غلام عباس شریک تھے۔ جس خطہ کے بارے معاہدہ ہو رہا تھا اس کا کوئی فرد اور نمائندہ نہیں تھا بلکہ ان کے علم میں بھی نہیں تھا کہ ہماری قسمت کے فیصلے کون، کہاں اور کیسے کر رہا ہے۔ اس نام نہاد معاہدہ کے تحت گلگت بلتستان اور اس کے تمام ملحقہ علاقہ جات کو ایک پولیٹیکل ایجنٹ کے ماتحت کر دیے گئے۔ اور کمال بات یہ ہے کہ وہ آدمی بھی اس علاقے کا باسی نہیں تھا۔ اس پہلے پولیٹیکل ایجنٹ کا نام سردار عالم تھا۔ دوستو! اس معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ

''All Affairs of Gilgit Ladakh under Control of Political Agent''

آپ نے اس بات کا خوب اندازہ لگایا ہوگا کہ ہمارے محسن، ہمارے ہمدرد، غم گسار اور خیر خواں ہمارے بارے کتنے متفکر تھے کہ گلگت بلتستان سے لاکھوں میل دور کراچی میں بند کمروں کے اندر ہماری غیر موجودگی میں ہماری قسمت کا کیا خوب فیصلہ کیا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے کیا کہیے!''

میرے ایک دوست مفتی امان اللہ کی شادی تھی ۔شادی میں شرکت کی خصوصی دعوت دی گئی تھی تو ہم تین ساتھی کراچی سے ٹنڈوالہ یار روانہ ہوئے۔ ٹنڈوالہ یار اندرون سندھ کا مشہور شہر ہے، وہاں کے لوگ بہت ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ٹنڈوالہ یار میں معروف مدرسہ دارالعلوم اشرف آباد ہے جو قیام پاکستان کے قبل کا قائم شدہ ہے۔پاکستان کی دینی تحریکات میں اس مدرسے کا بڑا حصہ ہے۔ اسی شہر کے وسط میں ہندوں کا مشہور راما پیر کا مندر ہے جہاں ہندوں کاسالانہ میلہ لگتا ہے جس میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یہاں ہندوں کی بڑی تعداد رہتی ہے جو آزادی سے اپنی پوجاپاٹ میں مصروف ہے ۔ جنوبی ایشاء میں ہندوں کا سب سے دوسرا بڑا سالانہ مذہبی میلہ یہی لگتا ہے۔اندرون اور بیرون ملک سے لاکھوں لوگ کشاں کشاں یہاں کھنچے چلے آتے ہیں ۔شادی کے رسومات جاری تھے ہم لوگ کھانے کی ٹیبل میں بیٹھ گئے۔ مجھے صحافی ہونے کے ناتے کچھ خاص مہمانوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ کراچی سے استاد محترم مولانا نورالبشر صاحب بھی تشریف لائے تھے ،۔ انکے ساتھ سعودی عرب سے آئے ہوئے کچھ مہمان بھی تھے، استاد محترم نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ '' ان کا تعلق شمالی علاقہ جات سے ہے ان کے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ ہے ۔حکومت اور بھی سہولیات دے رہی ہے مگر یہ لوگ شاکی ہیں اور اپنے آپ کو پاکستانی بھی نہیں سمجھتے ہیں باقی تفصیل یہ خود بتائیں گے ''

تمام حاضرین میری طرف متوجہ ہوئے، کچھ فوج کے ریٹائرڈ آفیسرز بھی تھے۔ میں نے عرض کیا کہ '' درست بات یہ ہے کہ ہم پاکستان اور پاکستانیوں سے شاکی نہیں بلکہ گزشتہ 60 سال سے پاکستان ہم سے شاکی ہے، ہمیں ارباب پاکستان نے ایک منٹ کیلئے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہم پر ہر قسم کا ظلم روا رکھا گیا ہے۔ مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا ہے اور سوائے چھچھوری ہڈیوں کے کچھ نہیں دیا ہے۔ اگر ساٹھ سال بعد یں پاکستان کو اس کا چہرہ اس کا آئینہ میں دکھاتا ہوں تو تسلیم کرنے کے بجائے وہ سیخ پا کیوں ہوتا ہے۔ یہاں تک شناختی کارڈ کا تعلق ہے تو اس کی کوئی وقعت نہیں'' یں جیب سے کارڈ نکال کر ٹیبل پر پٹخ دیا۔ تمام لوگ انگشت بدنداں تھے، ایک صاحب مجھے ٹکٹکی باندہ کر دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ '' بیٹا آپ نے کافی سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں اس لیئے ہم آپ کے خیالات کا احترام کرتے ہیں تاہم آپکی بات واضح نہیں ہو رہی ہے۔ ذرا تفصیل سے وضاحت کیجئے'' تب میں نے تفصیل سے انکو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے عرض کیا کہ '' جناب پھر ذرا دل تھام کر چند حقائق سن لیں۔ جناب والا ! یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گلگت بلتستان کا خطہ قدرتی وسائل، قسم ہا قسم معدنیات، جنگلات، گلیشیئر، صاف شفاف آبشاروں، آبی ذخائر، خشک میوہ، سلاجیت، جنت نظیر حسین و جمیل وادیوں اور بلند و بالا پہاڑوں کا دیس ہے۔ دفاعی حوالے سے حساس، جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہم

اور سیاحتی حوالے سے نہایت خوبصورت، دلچسپ، دلربا اور جاذب النظر ہے۔

27469 مربع میل پر محیط یہ علاقہ 1947ء تک ڈوگرہ راج کے زیر تسلط تھا۔ پاکستان کی آزادی کے بعد یکم نومبر 1948ء کو گلگت بلتستان کے غیور مسلمانوں نے اپنی مدد آپ جہاد کرکے یہاں سے ڈوگرہ راج کو چلتا کر دیا اور غیر مشروط طور پر پاکستان کے ساتھ اسکا الحاق کردیا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ گلگت بلتستان کے لوگ باسیان پاکستان سے زیادہ پاکستان سے مودّت و محبت کرتے ہیں۔ اگر اس جذبے و محبت میں صداقت نہ ہوتی تو کبھی بھی اس طرح الحاق نہ کرتے، مگر اے کاش............ !

بدلے اور صلے میں مملکت خداداد کے نا عاقبت اندیش حکمرانوں نے اہل علاقہ کو اپنا سمجھ کر گلے سے لگانے کے بجائے '' معاہدہ کراچی '' کے ذریعے دیوار سے لگایا اور انہیں (F.C.R) ایف سی آر جیسا کالا قانون تحفے میں دیا گیا جو طویل عرصے میں بڑی جدوجہد کے بعد ختم کر دیا گیا۔

اس خطہ زمین نے پاکستان کے زیر کنٹرول ہونے کی بنیاد پر پاکستانی کہلانا چاہا تو اقوام متحدہ (U.N.O) نے ڈنڈی مار دی، جغرافیائی لحاظ سے کشمیر بننا چاہا تو شاہان وقت کی مرضی شامل نہ ہوئی اور اُنکے مذموم مقاصد مانع ٹھہرے، پانچواں صوبہ کر اپنا الگ تشخص قائم کرنا چاہا تو کچھ اپنوں کی کارستانیاں اور کچھ غیروں کی ریشہ دوانیاں رکاوٹ بنیں۔ اس عالم وجود میں اپنی الگ ریاست بنا کر جینے کا سوچا تو سوچنے والے '' غدار '' ٹھہرے۔ گو اس دھرتی بے آماں کے ساتھ مختلف ادوار میں ہر قسم کا ظلم و جبر جاری رہا اور سیاسی و

آئینی اور بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ بھٹو دور میں ایک نام نہاد '' قانون ساز کونسل'' وجود میں آئی جس کا کردار فقط زبانی خرچ تک محدود تھا جبکہ تمام انتظامی اختیارات اور امور چیف ایگزیکٹیو کے پاس ہوتے جو وفاق سے ہوتا۔ مشرف دور میں اس انتظامی ڈھانچے میں کچھ تبدیلی کرکے '' قانون ساز اسمبلی '' کا نام دیا گیااور زرداری حکومت نے '' سیلف گورننس اینڈ امپاورمنٹ آرڈیننس 2009 '' کے نام سے ایک انتظامی پیکیج متعارف کروایا اگرچہ اس میں کافی حد تک اہل علاقہ کو اختیارات سونپ دیے گئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انتظامی پیکیج کا عدالتی و آئینی تحفظ نہیں ہے نہ گلگت بلتستان کی اسمبلی و کونسل کے پاس مکمل اختیارات کا سرچشمہ ہے اور نہ اپنی مرضی سے سیاسی و انتظامی فیصلے کر سکتے ہیں۔ اس خطے کی تقدیر کے فیصلے اور نفاذ قوانین کی تکمیل اب بھی صاحبان بست وکشاد اور ارباب اسلام آباد کے ہاتھوں میں ہے ۔ وہی سپید و سیاہ کے مالک ہیں اور انہی کی منشاء و مرضی کے مطابق تمام سیاسی وآئینی اور انتظامی امور طے پاتے ہیں۔ وارے ! کیا انصاف۔۔۔۔۔۔۔؟ وارے ! کیا اپنائیت۔۔۔۔؟

اس وادی جنّت نظیر کی سرحدیں بیک وقت چین، بھارت، افغانستان، تاجکستان، چترال اور کشمیر سے ملتی ہیں ۔ اس میں سات اضلاع اور سولہ تحصیلیں ہیں اور چھوٹے بڑے ، کم و بیش 1000 گائوں آباد ہیں۔ دنیا کی اہم ترین چوٹیاں کے ٹو

نانگاپربت، کوہ ہمالیہ، کوہ قراقرم، کوہ ہندوکش، پامیر اور شنگھریلا، دیوسائی، فیری میڈو، راما جھیل، گیٹی داس، ہنزہ جیسی خوبصورت جگہیں اس خطے کے حصہ میں آئی ہیں۔ دفاعی حوالے سے لداخ سیکٹر، کارگل، سیاچن اور گلتری باڈرز شامل ہیں جو ملک کے حساس ترین باڈرز شمار ہوتے ہیں اور ان باڈروں پر گلگت بلتستان کے عظیم مجاہدین کی قربانیاں سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور پتھر پر لکیر ہے مگر کوئی نگاہ بصیرت عقل سلیم اور اپنے پہلو میں نرم دل رکھنے والا تو ہو.........! اس سب کے باوجود، ''بھی ہم سے کہا جارہا ہے کہ وفادار نہیں، تو سن لو! جگر تھام کر کہ تم بھی دلدار نہیں قارئین جب میں یہ تمام تقریر دلخراش جھاڑ کر خاموش ہوا تو ان سب کی زبانیں گنگ اور مہر بلب تھے۔ جو لوگ ابتدائی کلمات سن کر پیچ وتاب کھا رہے تھے وہ میرے غم گسار بن گئے تھے۔ میں نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ عرض کیا کہ ''جناب والا یہاں تک قومی شناختی کارڈ کی بات ہے تو اس کارڈ میں بڑی رازیں مضمر ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک سبز ہلالی کارڈ اپکے پاس ہے اور ایک میرے پاس، اپ اپنا کارڈ نکال کر دیجیے۔ میں بھی رکھتا ہوں پھر میں بتاتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے۔ اپ اس کارڈ سے پاکستان کا صدر وزیر اعظم اور اٹارنی جنرل بن سکتے ہیں مگر میں نہیں بن سکتا، اپ اس شناختی کارڈ سے، پاکستان کے چیف جسٹس بن سکتے ہیں مگر بدقسمتی یہ ہے کہ میں اس کارڈ سے سپریم کورٹ آف پاکستان سے ا

نصاف کی بھیک بھی نہیں مانگ سکتا۔ایوان بالا اور ایوان زریں کا رکن بھی نہیں بن سکتا۔ عجیب تفاوت ہے نا ہمارے کارڈوں میں ؟''وہ سب لم ٹیج میری باتیں سن رہے تھے بالآخر انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ اگر یہ سچ ہے تو واقعتاً ناانصافی ہے۔ اور یہ ناانصافی معاہدہ کراچی کی مرہون منّت ہے ہمیں بارہا اس معاہدہ کے بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔ اس کی کوکھ سے کتنے شگوفے پھوٹ چکے ہیں کبھی پاک چین سرحدی معاہدہ ہوتا ہے کبھی شملہ معاہدہ ہوتا ہے اور کبھی اعلان لاہور ہوتا ہے تو کبھی کارگل میں گُل کھلائے جاتے ہیں مگر دیوی کیلئے عقیدت کا بھینٹ ہم ہی بنتے ہیں اور قربانی کے بکرے کی سعادت بھی ہم جیسے خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ واہ ''دیوی کا بھینٹ'' ''۔۔۔۔۔۔واہ''قربانی کا بکرا

یہاں ایک بات یاد رہے کہ معاہدہ کراچی آڑ میں آج جو لوگ غیروں کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور ڈالروں کے بل دھرتی ماں کو بیچتے ہیں وہ قابل مذمت نہیں قابل اصلاح بھی ہیں۔ اور وہ لوگ تو قابل نفرت اور گرفت ہیں جو واشنگٹن میں بیٹھ کر یاجاکر دھرتی ماں کا سودا کر رہے ہیں۔ کیا گلگت بلتستان اور پاکستان کے ارباب اقتدار، اور صاحبان بست کشاد کے پاس ایسے بد نما کرداروں سے نمٹنے کے لیے وقت نہیں ہے؟ شاہد۔۔۔۔۔ نہیں ؟

نوٹ: یہ تحریر 2008 کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ حقانی

دیامر بھاشا ڈیم ۔۔۔ایک تحقیقاتی و تجریاتی فیچر

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گلگت بلتستان کا خطہ قدررتی وسائل، قسم ہاقسم معدنیات،جنگلات، گلیشئیر، صاف شفاف آبشاروں، آبی ذخائر، خشک میوہ، سلاجیت، جنت نظیر حسین و جمیل وادیوں اور بلند و بالا پہاڑوں کا دیس ہے۔ دفاعی حوالے سے حساس، جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہم اور سیاحتی حوالے سے نہایت خوبصورت،دلچسپ، دلربا اور جاذب النظر ہے۔ 27469 مربع میل پر محیط یہ علاقہ 1947 ءتک ڈوگرہ راج کے زیر تسلط تھا۔پاکستان کی آزادی کے بعدیکم نومبر 1947ء کو گلگت بلتستان کے غیور مسلمانوں نے اپنی مدد آپ جہاد کرکے یہاں سے ڈوگرہ راج کو چلتا کر دیااور غیر مشروط طور پر پاکستان کے ساتھ اسکا الحاق کردیا۔یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ گلگت بلتستان کے لوگ باسیان پاکستان سے زیادہ پاکستان سے موؤت و محبت کرتے ہیں۔اگر اس جذبے ومحبت میں صداقت نہ ہوتی توکبھی بھی اس طرح الحاق نہ کرتے۔ مگر اے کاش........... ! بدلے اور صلے میں مملکت خداداد کے نا عاقبت اندیش حکمرانوں نے اہل علاقہ کو اپنا سمجھ کر گلے سے لگانے کے بجائے '' معاہدہ کراچی '' کے ذریعے دیوار سے لگایا اور انہیں ایف سی آر (F.C.R) جیسا کالا قانون تحفے میں دیا گیا جو طویل عرصے میں بڑی جدوجہد کے بعد ختم کردیاگیا۔

اس خطہ زمین نے پاکستان کے زیر کنٹرول ہونے کی بنیاد پر پاکستانی کہلانا چاہا تو اقوام متحدہ (U.N.O) نے ڈنڈی مار دی، جغرافیائی لحاظ سے کشمیر بننا چاہا تو شاہان وقت کی مرضی شامل نہ ہوئی اور اُنکے مذموم مقاصد مانع ٹھہرے، پانچواں صوبہ کر اپنا الگ تشخص قائم کرنا چاہا تو کچھ اپنوں کی کارستانیاں اور کچھ غیروں کی ریشہ دوانیاں رکاوٹ بنیں۔ گو اس دھرتی بے آماں کے ساتھ مختلف ادوار میں ہر قسم کا ظلم و جبر جاری رہا اور سیاسی و آئینی اور بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ بھٹو دور میں ایک نام نہاد '' قانون ساز کونسل'' وجود میں آئی جس کا کردار فقط زبانی جمع خرچ تک محدود تھا جبکہ تمام انتظامی اختیارات اور امور چیف ایگزیکٹیو کے پاس ہوتے جو وفاق سے ہوتا۔ مشرف دور میں اس انتظامی ڈھانچے میں کچھ تبدیلی کر کے '' قانون ساز اسمبلی '' کا نام دیا گیا اور زرداری حکومت نے '' سیلف گورننس اینڈ امپاورمنٹ آرڈیننس 2009 کے نام سے ایک انتظامی پیکیج متعارف کروایا اگرچہ اس میں کافی حد تک اہل علاقہ کو '' اختیارات سونپ دیے گئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انتظامی پیکیج کا عدالتی و آئینی تحفظ نہیں ہے نہ گلگت بلتستان کی اسمبلی و کونسل کے پاس مکمل اختیارات کا سرچشمہ ہے اور نہ وہ اپنی مرضی سے سیاسی و انتظامی فیصلے کر سکتے ہیں۔ اس خطے کی تقدیر کے فیصلے اور نفاذ قوانین کی تکمیل اب بھی صاحبان بست وکشاد اور ارباب اسلام آباد کے ہاتھوں میں ہے ۔ وہی سپید و سیاہ کے مالک ہیں اور انہی کی منشاء و مرضی کے مطابق

تمام سیاسی وآئینی اورانتظامی امور طے پاتے ہیں۔

اس وادی جنّت نظیر کی سرحدیں بیک وقت چین، بھارت، افغانستان، تاجکستان، چترال اور کشمیر سے ملتی ہیں۔ اس میں سات اضلاع اور سولہ تحصیلیں ہیں اور چھوٹے بڑے کم وبیش 1000 گائوں آباد ہیں۔ دنیا کی اہم ترین چوٹیاں کے ٹو، نانگاپربت، کوہ ہمالیہ، کوہ قراقرم، کوہ ہندوکش، پامیر اور شنگھریلا، دیوسائی، فیری میڈو، راما جھیل، گیٹی داس، ہنزہ جیسی خوبصورت جگہیں اس خطے کے حصہ میں آئی ہیں۔ دفاعی حوالے سے لدّاخ سیکٹر، کارگل، سیاچن اور گلتری باڈرز شامل ہیں جو ملک کے حساس ترین باڈرز شمار ہوتے ہیں اور ان باڈروں پر گلگت بلتستان کے عظیم مجاہدین کی قربانیاں سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور پتھر پر لکیر ہے مگر کوئی نگاہ بصیرت، عقل سلیم اور اپنے پہلو میں نرم دل رکھنے والا تو ہو........!

ہاں! یہ بھی یاد رہے کہ اس خطے پر عالم کفر کی للچائی ہوئی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ عالمی دہشت گرد، مسلمانوں کا اجتماعی قاتل، فرعون وقت امریکہ یہاں اپنا '' دفاعی اڈہ'' بنانا چاہتا ہے اس لیئے کہ یہاں سے چین، روس اور افغانستان اور دیگر ممالک پر دراندازی سہل ہو جاتی ہے۔ گلگت بلتسان کا علاقہ ہر لحاظ سے خصوصیت کا حامل ہے۔ یہاں دو ڈیم بنائے جارہے ہیں ایک ڈیم سدپارہ

کے نام سے کلی طور پر گلگت بلتستان کے ضلع اسکردو میں بن رہا ہے دوسرا ڈیم '' دیامر بھاشا ڈیم '' کے نام سے ضلع دیامر میں بن رہا ہے تو آیئے آئندہ سطور میں ہم اس ڈیم کے حوالے سے ایک تحقیقی اور تجزیاتی رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

☆دیامر بھاشا ڈیم کا تعارف و پس منظر:

دیامر بھاشا ڈیم کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیاگیا ہے وہ ضلع دیامر کا ہیڈ کوارٹر چلاس سے تقریبا40 کلومیٹر کے فاصلے پر '' تھور گاؤں،، میں واقع ہے۔ دریا سندھ کے بائیں طرف داریل وتانگیر جو کہ سب ڈویژن چلاس کا علاقہ ہے اور دائیں طرف شاہراہ قراقرم بھاشا نالہ تک چلاس سب ڈویژن کا علاقہ ہے جبکہ ڈوڈیشال داریل کے بالمقابل بھاشا پولیس چوکی کوہستان ایریا دکھائی دیتی ہے حالانکہ قدیمی ریکارڈ کے مطابق بھاشا نالہ تک کا علاقہ چلاس کے عملداری میں آتا ہے۔

پاکستان کے شمال میں دریا سندھ پر بنایا جانے والا یہ ڈیم چلاس ٹاؤن بہاؤ کا رخ ۴۰ کلو میٹر صوبہ خیبر پختون خواں اور گلگت بلتستان کی سرحد پر تعمیر کیا جائے گا۔اس ذخیرے کا 98 فیصد حصہ گلگت بلتستان میں واقع ہوگا جبکہ پاور ہاؤس صوبہ خیبر پختون خواں میں واقع ہونگے۔ 12.6 بلین امریکی ڈالر کی لاگت سے

تیار ہونے والا یہ ہائیڈروپاور منصوبہ 4500 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس ڈیم کی لمبائی 35 سو فٹ،چورائی 2ہزار فٹ،اونچائی 660فٹ اور سطح سمندر سے اس کی بلندی 35 سو فٹ ہو گی اور 6.4 ملین ایکٹر فٹ پانی ذخیرہ کیا جاسکے گا۔ڈیم کی دیوار کی اونچائی 270 میٹر ہوگی، دریائے سندھ کے پانی کے سال بھر کا بہاؤ کا 15 فیصد اس میں ذخیرہ ہوگا۔دنیا میں سب سے زیادہ بلندی پر بنائے جانے والے اس ڈیم کی عمر 100 سال ہوگی اور اس میں ریت جمع نہ ہوگی اور اس ڈیم کی تعمیر 2016 تک مکمل کر لی جائیگی (تلخیص از روزنامہ جنگ 28 اپریل 2006)

ڈیم کے منصوبے کے ڈیزائن کے مطابق اس ہائیڈروپاور منصوبے میں دو موڑ یا سرنگیں بنائے (Cofferdams) اور منصوبے کے مقام پر پانی کے بہاؤ کا رخ دو حائطہ بند جائیگے۔ منصوبے میں دو پاور ہاؤس ہونگے جسمیں 375 میگاواٹ صلاحیت کے 12 یونٹ ہونگے اور دو پاور ہاؤس سے سالانہ اوسطاً 18000 Gwh کی پیداوار کا تخمینہ لگایا گیا ہے اور یہ سارا ذخیرہ بالعموم گلگت بلتستان بالخصوص ضلع دیامر میں واقع ہوگا (تلخیص از دیامر بھاشا ڈیم۔فیلڈ وزٹ رپورٹ اکتوبر 2008)

☆ دیامر بھاشا ڈیم کی ضرورت واہمیت:

دیامر بھاشا ڈیم اپنی نوعیت کا ایک مثالی ڈیم ہوگا۔اس ڈیم کی اہمیت و فوائد کا اندازہ ڈیم کی افتتاحی تقریب میں صدر مشرف کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔انہوں نے کہا کہ '' پانی اور توانائی ہمارے لیئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، تیس سال سے ملک میں کوئی ڈیم نہ بننے کے باعث پانی کی ایک بڑی مقدار سمندر میں چلی جاتی ہے جبکہ وسیع ارضی بنجر پڑی ہے۔ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کیلیئے پانی کی ضرورت بڑھ رہی ہے'' بعد میں انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے ڈیم کی عدم تعمیر کو خودکشی قرار دیا۔

موجودہ حکومت کے وفاقی وزیر پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف نے ڈیامر بھاشا ڈیم کی اہمیت و ضرورت پر زور دیتے ہوئے قومی اسمبلی میں وقفہ سوالات کے جوابات دیتے ہوئے کہا کہ '' دیامر بھاشا ڈیم قومی منصوبہ ہے جولائی میں تعمیر شروع ہو جائیگی۔کالا باغ ڈیم نہیں بننا چاہیے اور موجودہ حکومت کالا باغ ڈیم پر لڑائی کے بجائے قومی منصوبے پر آگے بڑھے۔بھاشا ڈیم کی تعمیر سے تربیلا ڈیم کی زندگی تیس سال اور بڑھے گی،انرجی کانفرنس کے نتائج شروع ہوگئے ہیں۔ہائیڈرو پاور پیداوار میں کمی کی وجہ سے آلودگی کے باعث (تربیلا کی صلاحیت 30 فیصد کم ہو گئی ہے'' (تلخیص از ڈیلی صدائے گلگت 4 مئی 2010

دیامر بھاشا ڈیم ترقی کی راہ پر اہم پیش رفت ہے ملک میں وقفے کے بعد 12.6

بلین امریکی لاگت سے تعمیر ہونے والے اس کثیر المقاصد ڈیم کی تعمیر خوش آئند ہے۔
ڈیامر بھاشا ڈیم سے نہ صرف گلگت بلتستان میں تعمیر و خوشحالی آئیگی بلکہ اس کا فائدہ سندھ تک پہنچ جائیگا اور 6.4 ملین ایکڑ فٹ پانی دیامر سے ٹھٹھ تک مختلف علاقوں کو سیراب کرتے ہوئے سمندر میں گرے گا۔ واپڈا کے مطابق یہ منصوبہ نہ صرف پانی سے بجلی پیدا کرے گا بلکہ اس سے آبپاشی کے کثیر فوائد بھی حاصل ہونگے۔ کم بہاؤ کے دنوں میں ذخیرہ شدہ پانی زرعی استعمال کیلئے روزگار کے مواقع ہونگے اور منصوبے سے سیلاب کی روک تھام اور دریائے سندھ میں گاد جمع ہونے کیلئے عمل پر کنٹرول کیا جائے سکے گا۔
مختصراً ڈیم کی تعمیر کو ڈیم کی فزیبلٹی رپورٹ سے لیکراب تک ارباب اقتدار، وزراء اعظم، چاروں وزرائے اعلی، گورنر اور تمام سیاسی و مذہبی لیڈران لازمی قرار دے رہے ہیں اس سے اسکی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ دیامر بھاشا ڈیم کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کی تعمیر سے ملک زرعی و صنعتی ترقی پر گامزن ہوگا کیونکہ پانی زندگی بھی ہے اور دولت بھی، اسی دولت سے زمین ہری ہو جاتی ہے، صنعتوں کیلئے توانائی ملتی ہے ۔ غربت کے عفریت کم ہو جاتے ہیں اور بیروزگاری کے سائے دور ہو جاتے ہیں تب ہی تو ملک کے صدور، وزراء اعظماء ،اور انکی کابینہیں کالا باغ ڈیم کی تعمیر کو (سیاسی دباؤ ہیں آکر) ملتوی کرکے دیامر بھاشا ڈیم کے تعمیراتی پلان پر زور و شور سے کام کی تکمیل چاہتے ہیں اور

تمام سیاسی ومذہبی اور حکومتی واپوزیشنی رہنماء وزعماء اتفاق رائے کے دعوے کر رہے ہیں مگر افسوس انکی کج روی پر کہ گلگت بلتستان کے لوگوں کو روز اول سے مایوس کرتے آرہے ہیں اور اب تلک باسیان ارض شمال کو مکمل اتفاق رائے میں شامل نہ کرکے اور مسلسل انکو نظر انداز کرکے اپنی ہٹ دھرمی ، بغض وعناد اور خواہشات نفسانی کا بین ثبوت دے رہے ہیں۔اہلیان گلگت بلتسا ن نہ ڈیم کے پہلے مخالف تھے نہ اب ہیں وہ تو صرف اپنے نقصانات کا ازالہ اور جائز مطالبات کا رونا رو رہے ہیں۔

☆دیامر بھاشا ڈیم کے نقصانات:

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ نہایت شاندار اور قابل تعریف ہے مگر شو مئی قسمت ڈیم کا نام متنازعہ بنا دیا گیا۔ یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ ڈیم کی تعمیر سے تمام تر علاقہ گلگت بلتسان کا تیسرا بڑا اور سب سے پسماندہ ضلع دیامر کے ہیڈ کوارٹر چلاس کا 80 فیصد زیر آب آیگا اور سب ڈویژن چلاس اور داریل وتانگیر کی آبادی متاثر ہوگی جسمیں کھنبری گاؤں، بصری نالہ، گینے گاؤں ، تھور نالہ ، ہوڈر گاؤں، تھلپنٹ، گیس بالا، گیس پائن، بونر داس، ڈرنگ داس، جلی پور گاؤں، گونر فارم، شاہین کوٹ، سونیوال ،اور گوہر آباد اور رائیکوٹ تک کے نشیبی علاقوں کی تمام آبادیاں شامل ہیں۔اس کے علاوہ زرعی قابل کاشت اراضی اور بنجر ارضیات بھی متاثر ہونگی اور شتیال

تارا ئیکوٹ تقریباً 80 سے 150 کلو میٹر تک شاہراہ قراقرم بھی غرقابی کا شکار ہو گی جو کہ تمام تر '' ضلع دیامر '' کے حدود سے گزرتی ہے۔

ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق 200 مربع کلو میٹر کا یہ ذخیرہ شاہراہ قراقرم کے 100 کلو میٹر پر مشتمل حصہ کو بہالے گا اور 28000 نفوس پر مشتمل گاؤں ختم ہو جائینگے اور تقریباً 50 ہزار پرانی چٹانوں پر موجود کھدائیوں کو تباہ کر دے گا (دیامر بھاشا ڈیم، فیلڈ وزٹ رپورٹ اکتوبر 2008)

واپڈا کے مطابق 27 گاؤں ڈیم کے ذخیرے میں بہہ جائیگے۔ یہ تمام گاؤں یا تو دریا سندھ کے کناروں پر واقع ہیں یا اس کے شاخوں پر۔ علاقے کے طبعی اور جغرافیائی خصوصیات کی مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات فوری سمجھ میں آجاتی ہے کہ ڈیم کے مجوزہ مقام کے ارد گرد زمین بہت قیمتی ہے۔ انسانی آبادی اور زرعی سرگرمیوں کیلئے ترچھے پہاڑوں میں زیادہ ہموار جگہ موجود نہیں، یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مقامی لوگوں کے مطابق سے بھی زیادہ گاؤں اور بستیاں متاثر ہونگیں۔ 3115 گھر تباہ ہونگے اور 311500 زیادہ ایکڑ زمین ذخیرہ میں زیر آب آئیگی۔

معروف کالم نویس جناب عبد الجبار ناصر صاحب دلکش اور دلنشیں پیرائے میں اس

ڈیم کے نقصانات کا نقشہ کھینچتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

آبی ذخائر کے حوالے سے گلگت بلتستان کو اعتماد میں لیا جائے کیونکہ اس وقت جو '' تین بڑے ڈیم زیر غور ہیں (کالا باغ، دیامر بھاشا اور اسکردو) ان میں سے دو ڈیم ریاست جموں و کشمیر کا متنازعہ حصہ گلگت بلتستان میں واقع ہیں۔ اسکردو ڈیم کلی طور پر گلگت بلتستان میں بنے گا جبکہ دیامر بھاشا ڈیم کی تعمیر سے گلگت بلتستان کا تیسرا بڑا ضلع دیامر ہیڈ کوارٹر سمیت اسی فیصد رقبے کی آزادی متاثر ہوگی۔ سچ تو یہ ہے یہ دونوں علاقے صفحہ ہستی سے مٹ جائیگے۔ دونوں کا مجموعی طور پر 70 فیصد سے زائد اور پانچ لاکھ سے زائد آبادی متاثر ہوگی اس کے باوجود دیامر بھاشاڈیم کی رائلٹی اور دیگر مراعات کا مطالبہ صوبہ سرحد کرے تو یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ ''

☆ دیامر بھاشا ڈیم کی تعمیر سے ثقافتی ورثے کی بربادی:

دیامر بھاشا ڈیم کی تعمیر سے وہاں کے قدیمی ثقافتی ورثے کو سخت خطرات لاحق ہیں۔ مجوزہ مقام پر چٹانوں پر کندہ بدھا کی تصاویر ہیں اور وادی سندھ کے اوپری حصوں میں بہت ساری قدیم کندہ چٹانیں ہیں جن کی عالمگیر اہمیت واضح ہے۔ ایک تحقیقاتی ٹیم نے آبی ذخائر کیلئے مجوزہ زمین پر کندہ چٹانوں کا تفصیلی دورہ کیا اور Heidel Berg یونیورسٹی کے پروفیسر Harald Hauptmann

اور واپڈا کے حکام سے آبی ذخائر کے متعلق تفصیلی گفت و شنید کی۔ ایک اور ریسرچ ٹیم نے 2008 میں مقامی لوگوں سے کندہ چٹانوں کے متعلق انٹرویو کیے۔ کندہ چٹانوں اور بالائی سندھ میں چٹانوں پر لکھائی کا مرکز چلاس ضلع دیامر میں ہے جو کہ وسطی اور جنوبی ایشیاء کی ثقافتی تاریخ کے مطالعہ کیلئے ایک نایاب ذریعہ ہے اور جس کے بہت سے قدیم راستے قدیم سلک روٹ کے ورثے کو ظاہر کرتے ہیں۔

Harald Hauptmann جرمنی میں اکیڈمی برائے سائنس اور بشریات کے پروفیسر کی ہدایت کے تحت اس مواد کی تیاری اور طبع کیا جارہا ہے۔ صرف دیامر بھاشا ڈیم کے مجوزہ علاقے میں 88 آثار قدیمہ کے مقامات میں جن میں 68 کندھ چٹانوں کے کمپلکس ہیں۔ کل 5,157 پتھر اور چٹانوں پر 36.187 کندھ چیزیں ہیں جن میں مختلف زبانوں کے 3610 تحریریں ہیں جو کہ اس علاقے سے متعلق مطلوبہ ہیں۔

مختلف سائز کے پتھروں اور چٹانوں پر عبارتیں دریا کے کنارے اور پوری وادی میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس چٹانوں پر تاریخ کے ابتدائی ادوار سے لیکر اسلام کی آمد تک تصاویر کندھ ہیں بالخصوص وہاں بدھا آرٹ کثرت سے موجود ہیں جو کہ بین الاقوامی دنیا کی توجہ کا مرکز ہے۔ 1989 سے Heidel Berg یونیورسٹی کے اس مشن نے ماہرین آثار قدیمہ اور جغرافیائی مطالعہ کرنے والے ماہرین کو چلاس میں لایا اور ان کندھ عبارتوں اور تصاویر کو ماپا، تفصیلی جائزہ لیا ،

تصاویریں لیں اور انکی درجہ بندی کی۔ مذکورہ اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈیم کی تعمیر سے ثقافتی ورثے کو کتنا نقصان پہنچتا ہے اور کتنے تحقیق و ریسرچ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

: ☆سونیوال کوٹ اور وادی کھنبری کی کہانی

ہرے بھرے لمبے درختوں کے درمیان ایک خوبصورت گاؤں سونیوال دریائے سندھ اور تھور نالہ کے جنکشن میں واقع ہے۔ یہ گاؤں 100 گھرانوں پر مشتمل ہے۔گاؤں میں بڑے۔بڑے پھلدار درخت ہیں اور آبشاروں اور ندی نالوں کا شفاف پانی دریائے سندھ میں شامل ہو کر اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ یہ مقامی لوگ سونے کی تلاش، مویشی پالنے اور کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔اور انکی زرعی زمیں کا 300 تا 350 کنال حصہ زیر آب آیئگا۔ یہی انکا ذریعہ معاش ہے اور یہ لوگ پہاڑوں میں نہیں رہنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور وادی کھنبری جو ڈیم کے بالکل قریب میں واقع ہے۔ڈیم کی دیوار وادی سے صرف دو کلو میٹر پر ہوگی وادی کے تمام چھ گاؤں جو سوکم ،چنگک چار ، ناروت، نیا، بالاوث اور نرار آبی ذخیرے میں بہہ جائیں گے۔ یہ آبادیاں تقریباً 100 برس قدیم ہیں اور سونا تلاش کرتی ہیں۔ ان لوگوں کو جنگلات پر کوئی اختیارات حاصل نہیں ہے وہ کالنگ ادا کرکے جنگلاتی وسائل کو استعمال

کرنے کیلئے محدود اختیارات حاصل کرتے ہیں۔ وادی مچھلیوں اور دوسرے آبی حیات سے مالا مال ہے۔ زمین زرخیز ہے لوگ آناج، سبزیاں اور پھلدار درخت لگاتے ہیں۔ سونیوال کوٹ اور کھنبری کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈیم کی تعمیر سے پاکستان اور گلگت بلتستان خوشحال اور ترقی کرتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہمیں صرف ایک مناسب معاوضہ چاہیے تاکہ ہم سب اکھٹے آباد ہوجائیں۔ ہم علیحدہ علیحدہ ہونا نہیں چاہتے ہیں،انہیں شدید خدشہ ہے اور یہ لوگ سوچتے ہیں کہ: حکومت کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اگر ہم نیست و نابود بھی ہوجائیں۔ حکومت ہمیں مناسب آدائیگی نہیں کریگی،تربیلہ کے لوگ ابھی تک منتظر ہیں ۔وہ لوگ ہر لحاظ سے طاقتور تھے اور ہم نحیف و کمزور ہیں۔ شومئی قسمت اس پر مستزاد یہ کہ گلگت بلتستان کی حکومت، اہلیان دیامر اور ایکشن کمیٹی دیامر بھاشا ڈیم بھی ان دونوں وادیوں کیلئے کوئی پلان نہیں رکھتی اور انکی غرقابی اور بربادی میں کسی کو کوئی فکر نہیں۔

:☆دیامر بھاشا ڈیم اور گلگت بلتستان کا مؤقف

مذکورہ بالا تمام باتوں کے بعد اب گلگت بلتستان بالخصوص کے ضلع دیامر کی عوام کے چند تحفظات و مطالبات کا ذکر کیئے جاتے ہیں۔ دیامر کے حوالے سے

مختلف اوقات میں احتجاج اور مذاکرات ہوتے رہے۔ حاجی گندل شاہ اور عنایت اللہ شمالی کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ فروری 2010 کو چلاس کے عوام اپنے مطالبات منوانے کیلئے ایک پرامن احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے اسی اثناء پولیس نے ان پر فائر کھول دی جس سے تین افراد شہید ہوئے اور کئی زخمی ہوگئے تب احتجاجی عمل سخت ہوا،ایک ایکشن کمیٹی بنی جسکے چیئر مین محترم عطاء اللہ صاحب ہیں۔ڈیم ایکشن کمیٹی اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسکی تفصیل عطاء اللہ صاحب سے موصول ہوئی جو حسب ذیل ہے۔

مورخہ 25 فروری 2010 کو ایک اجلاس دیامر بھاشا ڈیم کمیٹی کے ممبران اور حکومت پاکستان کے وفاقی وزیر برائے امور کشمیر و گلگت بلتستان میاں منظور وٹو کی ذیلی کمیٹی زیر صدارت جناب مہدی شاہ وزیر اعلی گلگت بلتستان منعقد ہوا۔وزیر اعلی نے شروع میں تمام شرکاء بالخصوص کمیٹی دیامر بھاشا ڈیم کو خوش آمدید کہا اور سیکرٹری امور کشمیر و گلگت بلتستان باقاعدہ اجلاس کی کاروائی شروع کی اور یقین دلایا کہ تمام مذاکرات اور بحث مذاکراتی کمیٹی اور انتظامیہ کے مابین معاہدے 12-08-2009 کی روشنی میں طے پائینگے۔اس اجلاس میں متفقہ طور پر جو امور طے ہوئے وہ درج ذیل ہیں۔

ا۔رہائشی پلاٹ متاثرین کیلئے 5 کے بجائے ایک کنال کا ہونا چاہیے۔

۲۔زرعی پلاٹ جس کا زیادہ سے زیادہ 6 کنال ہے۔اس میں سے متاثرین اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کم بھی خرید سکتے ہیں۔

۳۔n Special Quelifica کے علاوہ جتنی بھاشا ڈیم میں سیکمز آ جائینگی ان میں روزگار کیلئے متاثرین کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جائیگا۔اور تمام روزگار کے عمومی مواقع پر متاثرین کو ترجیح دی جائیگی۔امیدوار کی عدم دستیابی کی صورت ییں گلگت بلتستان کے دیگر علاقوں کے امیدواروں کو فوقیت دی جائے گی۔

۴۔ہربن داس کے مقدمے کو کورٹ سے پندرہ روز کے اندر واپس لیا جائیگا جو زمین واپڈا کو پہلے معاہدے کے تحت بغیر معاوضے کے تحت دی گئی تھی اب واپڈا باقاعدہ معاوضہ ادا کریگا اور اس طرح باقی ماندہ زمین حکومت کو معاوضے کے ساتھ دی جائیگی۔

۵۔دیامر بھاشا ڈیم کی رئلٹی کا100% حق صرف گلگت بلتستان کا ہے۔اور ساتھ بونڈری کے تنازعے کو فوری طور پر ختم کرنے کیلئے
سپریم کورٹ آف پاکستان کے غیر جانبدار جج کی سربراہی میں کمیشن تشکیل دی جائیگی۔

۶۔دیامر بھاشا ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی سے متاثرین ڈیم کو 50%رعایتی ریٹ پر بجلی مہیا کی جائے۔

۷۔Chilas Development Authority کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۸۔ جن چراگاہوں کی اراضی جو ڈیم میں زیر آب آرہی ہے میں 50% حکومت کو بغیر معاوضے کے مالکان نے چھوڑا تھا،اب حکومت مالکان کو یہ زمین واپس کرتے ہوئے فی کنال ریٹ 1,50,000 مقرر کردیا ہے۔

۹۔ایک مصالحتی کمیٹی زیر سربراہی ڈی سی دیامر تشکیل دی جائیگی جسمیں واپڈااور متاثرین کا ایک ایک نمائندہ بھی شامل ہوگا۔اس کمیٹی کے درج ذیل فرائض ہونگے۔

Land ا۔اگر داس کی سروے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اس کی درستگی اور اگر دوران کوئی تعمیر عارضی طور پر ضروری تو اس کی اجازت دینا۔ Aoquisition

۲۔یہ اصول بھی طے ہوگیا کہ صرف معاوضے دینے کی صورت میں زمین واپڈا کے حوالے کی جائیگی اور مزید یہ کہ اگر معاوضے میں تاخیر ہو تو اس میں مناسب ہرجانہ بھی شامل کیا جائیگا۔

۳۔ تھک داس کے سلسلے میں 9 12-08-200 کے فیصلے پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ ہرپن داس کے مقدموں کی واپسی تھور اور دیگر زمین جو فوری طور پر واپڈا کے چاہنے کے ساتھ منسلک کیا جائیگا۔ہرپن داس وغیرہ میں جو سرکاری پروجیکٹس تعمیر ہو اس کا معاوضہ حکومت گلگت بلتستان ادا کرے گیا اور واپڈا کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

کے مطابق ہوگی۔Land Aoquisitaion ۴۔

اس کے علاوہ کمرشل، زرعی، بنجر اور دیگر اراضی کے فی کنال ریٹ بھی طے ہوئے۔اب حکومت کو چاہیے کہ ان متفقہ اور منظور شدہ مطالبات کو فراخدلی سے قبول کرے۔

:☆دیامر بھاشا ڈیم اور گلگت بلتستان کا مستقبل

دیامر بھاشا ڈیم کی تعمیر کے حوالے سے گلگت بلتستان کے مستقبل کے بارے کچھ کہنا یا لکھنا قبل از وقت ہوگا تاہم فکر و تخیل کی حد تک چند ایک پہلوؤں پر تجزیہ کی گنجائش ہے۔ مثلاً ترقیاتی مستقبل (Development Future) تعلیمی مستقبل (Educational Future) صنعتی مستقبل (Industrail Future) اور بے روزگاری کے بارے میں تفصیل سے لکھا جاسکتا ہے۔مذکورہ بالا موضوعات پر مستقل قلم اٹھانے کی ضرورت ہے تاہم مضمون کی طوالت سے گریزاں کرتے ہوئے مختصر و اجمالاً چند کلمات سپرد کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ ڈیم سے ترقیاتی کاموں مثلاً سڑکوں کی تعمیر و تصحیح،پرانی سرکاری عمارتوں کی بوسیدگی کا خاتمہ اور نئے سرکاری عمارتوں کو وجود میں لایا جاسکتا ہے اور جو دیہات اب تک روڈ اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں وہاں روڈ اور بجلی کا سستا انتظام کیا جاسکتا ہے۔اور تعلیمی حوالے سے دور دراز دیہاتوں میں نئے اسکولوں کا قیام اور پرانے اسکولوں کی تزئین و آرائش

اور تمام ہائی اسکولوں کو انٹر کالجز اور انٹر کالجز کو ڈگری کالجز میں ترقی دیکر غریب عوام کو سستی تعلیم مہیا کی جاسکتی ہے۔ اور تشنگان علوم کو کراچی ،لاہور،اسلام آباد، پشاور اور دیگر شہروں میں در بدر ہونے سے بچایا جاسکتا ہے بالخصوص قراقرم انٹر نیشنل یونیورسٹی کو منظور شدہ شیڈول و چارٹر کے مطابق ڈھال کر یعنی تمام ضلعوں میں یونیورسٹی کے کیمپس قائم کرکے گلگت بلتستان کے طالبان علوم وتشنگان فنون کو سب سے بڑی ڈپریشن سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ اس طرح علماء کیلئے دینی مدارس قائم کرنے کے حالات سازگار ہونگے تو علماء کرام وفاق المدارس کے ماتحت دینی مدارس قائم کرکے گلگت بلتستان کے مسلمانوں کی صحیح طریقے سے خدمت کرسکیں گے اور ان میں دین اسلام کا مثبت جذبہ پیدا کرکے اور بنیادی دینی اصول و عقائد سے آگاہ کرکے انکی درست رہنمائی کر سکتے ہیں۔اور انہی تعلیمی اداروں سے علماء کرام، صلحاء عظام، خطباء دین، مبلغین، مفسرین، محدثین، وکلائ، انجینیرز، ڈاکٹرز، معیشت دان، سیاستدان، ادیب، صحافی اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کیلئے ممتاز رجال کار پیدا ہونگے جس سے گلگت بلتستان میں ایک منفرد اور مثالی معاشرہ قائم ہوگا جسکا عالم انسانیت متمنی اور متلاشی ہے

اسی طرح صنعتی اعتبار سے بجلی وافر مقدار میں سستی مہیا ہوگی تو سینکڑوں صنعتیں، کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہونگی اس طرح ان صنعتوں اور دیگر سرکاری

وپرائیویٹ اداروں جو نئے معرض وجود میں آئینگے میں ہزاروں اسامیاں آئینگی جس سے گلگت بلتستان کے عوام بالخصوص نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بیروزگاری کے دلدل سے چھٹکارا پاسکے گااوران کیلیئے ترقی، پھلنے پھولنے ، روشن مستقبل، کامیابی کے شاندار مواقع ملیں گے اوران میں ستاروں پر کمند ڈالنے،اقبال کا شاہین اور نانوتوی کے جانشیں بننے کی صلاحیتیں پیدا ہونگیں۔تاجر حضرات اپنی تجارت یں وسعت لاکر کاشغر، کشمیر،چترال اور دیگر علاقوں تک پھیل سکیں گے۔ یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب حکومت پاکستان گلگت بلتستان بالخصوص '' ضلع دیامر'' کے جائز بنیادی مطالبات کو فراخدلی سے منظور کرے اورانکے ساتھ دوغلی پالیسی اختیار نہ کرے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

نوٹ: یہ فیچر، 2010 کو ناوانٹر نیشنل کراچی میں شائع ہوا ہے جبکہ فروری 2011 کو سنڈے میگزین میں تصویری البم کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ حقانی

پروفیسر سلیم، مولانا شہاب اور بزم عدم تشدد

گلگت بلتستان کونسل کے انتخابات اختتام پذیر ہوئے اور کئی نامی گرامی حضرات بڑی تگ و دو کے بعد بھی کونسل میں شامل ہونے سے رہ گئے اور جن لوگوں کو کونسل میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا وہ سب قابل مبارک ہیں۔ جو حضرات کسی وجہ سے شامل ہونے سے رہ گئے وہ دل چھوٹا نہ کریں، اللہ دوبارہ موقع عنایت کریں گے اور منتخب حضرات پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ 28 ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے لوگوں کی امیدیں اور توقعات اب ان سے وابستہ ہیں۔ اب آنے والے دن ہی بتلائیں گے کہ منتخب حضرات کس طرح ان لاکھوں لوگوں کی امیدوں اور توقعات پر پورا اترتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کونسل میں گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے تمام ممبران پڑھے لکھے اور منجھے ہوئے لوگ ہیں مگر ان میں دو شخصیات ایسی ہیں جو اپنی معروف و مشہور ہیں ایک مولانا عطاء اللہ شہاب ہیں جو گلگت بلتستان کے ایک معروف قلم کار ، مصنف اور زیرک سیاستدان ہیں۔ علماء حق کا سب سے بڑا تعلیمی بورڈ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے گلگت بلتستان کے مسئول ہیں اور وفاق المدارس کے رکن عاملہ و شوری بھی ہیں۔ اور گلگت بلتستان میں جمعیت علمائے اسلام کے روح رواں اور گلگت بلتستان نیشنل الائنس کے سنئیر

نائب صدر بھی ہیں۔ بلاکے ذہین اور بے باک خطیب بھی ہیں ان کی شخصیت کسی تعرف کی محتاج نہیں۔ ان کا ایک وسیع حلقہ ارادت واحباب ہے۔

دوسری شخصیت پروفیسر غلام حسین سلیم صاحب ہیں جن کا تعلق بلتستان سے ہے۔ پروفیسر صاحب وسیع المطالعہ آدمی ہے وہ کٹر مذھبی آدمی ہونے کے ساتھ دیگر مسالک اور فرقوں کے لئے بھی انتہائی نرم گو ہیں بلتستان کے تمام لوگ ان کے قدردان ہیں۔

2005 میں آغا ضیاء الدین کے مفاجاتی حادثے کے بعد پورے گلگت بلتستان میں حالات انتہائی کشیدہ ہو گئے تھے۔ درجنوں لوگ موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ لاکھوں کے املاک بھسم ہوئے تھے۔ ہر جگہ انتقام، انتقام اور انتقام کی صدائیں عام تھیں۔ امن، رواداری، محبت واخوت کی بات کرنا بے غیرتی سے متبادل تھا۔ حکومت بھی حالات کنٹرول کرنے سے نالاں تھی۔ کئی سیاسی اور مذھبی زعماء اڈیالہ کا نذر ہو چکے تھے۔ اسکردو میں اہل تشیع برادری اکثریت اور اہلسنت اقلیت میں ہے تو اس مفاجاتی حادثے کے بعد لازمی امر تھا کہ وہ مشتعل ہو جائیں۔ چنانچہ اسکردو میں اہلسنت کا مرکز جلا کر راکھ کر دیا گیا جس میں سینکڑوں احادیث کی کتب اور قرآنی مصاحف شہید ہوئے۔

اس عظیم سانحے کے بعد پروفیسر غلام حسین سلیم صاحب اہلسنت علماء کرام کے پاس تشریف لائے اور گلوگیر آواز میں کہا کہ "یہ بلتستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا جب یہاں دینی کتب اور قرآنی مصاحف کو نذر آتش کر دیا گیا" اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اس واقعے کے عینی شاہدین نے راقم الحروف کو بتایا ہے۔

پروفیسر صاحب کتاب دوست انسان ہیں۔ مولانا ابراہیم خلیل نے درالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کی معروف کتاب یزید اور واقعہ کربلا ان کو تھما دی تو انہوں نے اسکا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور بہت متاثر ہوئے اور دل سے ان کے عقائد و نظریات کے معترف ہونے کا اظہار بھی کیا۔ پروفیسر صاحب کی علمیت، ذھانت، معاملہ فہمی اور درد دلی کو دیکھ کر ہی ہمارے وزیر اعلیٰ مہدی صاحب نے ان کو اپنا استاد بنایا ہے اور تمام اہم امور میں ان سے مشاورت کرتے ہیں۔

اس سب جمع تفریق کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کے بے جا تعریف کی جائے بلکہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ان دو شخصیات کی خدمت میں ایک طالب علمانہ گزارش کرنی ہے۔

شہاب صاحب اور سلیم صاحب سے دستہ بستہ عرض ہے کہ اب آپ کی نگرانی میں گلگت بلتستان سطح پر ایک ایسی "بزم عدم تشدد" کی داغ بیل ڈالی جائے جس میں گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے چند فرض شناس، سب کے لئے قابل قبول اور اپنے پہلو میں انسانیت کے لئے درد دل رکھنے والے حضرات شامل ہوں اور انہیں یہ مشن سونپا جائے کہ وہ گلگت بلتستان میں محبتوں، مودتوں اور امن و آتشی کی آبیاری کریں اور نفرتوں، عداوتوں، شقاوتوں، ظلم و تشدد، ضد، بغض، کینہ، عداوت، رہزنیت، سربریت، جبریت، فسطائیت، دنگا وفساد، قتل وغارت اور دجالیت و شیطانیت کی بیخ کنی کریں۔ اپنی خداداد صلاحیتوں سے پورے خطے کا ماحول نسیم بہار کی طرح معطر بنائیں اس کی خوشبو ہر سو پھیلے۔ اور خود یہ دونوں شخصیات "بزم عدم تشدد" کی سرپرستی کریں اور ان اصحاب "بزم عدم تشدد" کے ارکان کو مکمل فری ہینڈ دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے لئے ضابطہ اخلاق تیار کریں۔ اور اپنے قافلے میں باہمی مشاورت سے رفقاء چن لیں اور مولانا شہاب صاحب اور پروفیسر سلیم صاحب ان کی ہر طرح کا تعاون کریں اور اپنے تعلقات، اتھارٹی اور صلاحیتوں سے اس بزم کو جلا بخشے۔

ہم اپنی دانست کے مطابق چند مناسب لوگوں کی نشاندھی کرتے ہیں جن کے لئے گلگت بلتستان کے تمام مسالک کے لوگوں کے دلوں میں احترام و منزلت ہے۔ اور کسی حد تک اہل علم، باشعور اور پڑھا لکھا طبقہ ان سے مطمئن بھی ہے۔ اور ان

کی خدمات کا معترف بھی ہماری مراد ان شخصیات سے درج ذیل ہیں۔

۱) عنایت اللہ شمالی صاحب جو ایک ادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ایک محبت کرنے والے انسان بھی ہیں۔ گلگت بلتستان کے ہر فرد، علاقے اور مسلک کے لئے قابل قبول ہی نہیں قابل قدر و عزت بھی ہیں۔

۲) محترم اسلم سحر صاحب جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کوئی بھی باشعور آدمی ان کی علاقائی و ادبی خدمات سے بے خبر نہیں۔

۳) پروفیسر عثمان علی صاحب جو درجنوں تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں اور گلگت بلتستان کے سرسید بھی کہلاتے ہیں اور معروف افسروں، استادوں، لکھاریوں، مصنفوں کے استاد بھی ہیں۔

۴) عبدالکریم کریمی جو ایک معروف کالمسٹ، شاعر، ادیب اور تین کتابوں کے رائٹر ہیں اور بڑا وسیع حلقہ ارادت رکھتے ہیں اور نوجوانوں میں بے حد مقبول ہیں۔

۵) محترم غلام حسین المعروف "حسنو" جو بہترین مصنف ہیں اور خپلو کے رہائشی ہیں۔ نوربخشیہ صوفیہ کے معروف "بُوا" یعنی مذہبی رہنما ہیں اسکردو سے خپلو جاتے ہوئے میری ان سے تفصیلی گفت و شنید ہوئی ہے عجیب معلوماتی اور محبتی شخص ہیں۔

مذکورہ تمام حضرات میں تین باتیں مشترک ہیں: (۱) تمام حضرات علمی و ادبی ہیں۔ مصنف اور اصحاب کتب بھی ہیں۔

۲) تمام مذاہب و مسالک کے لوگ ان کو دل سے قبول کرتے ہیں۔ (۳) اپنا ایک وسیع حلقہ احباب و ارادت رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات اپنے پہلو میں انسانیت کے لئے ڈھرکتا دل رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ بھی بہت ساری لوگ ہیں جو اس مشن کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اتفاق سے ان سب کا تعلق مختلف اضلاع اور مسالک سے ہے۔ اب شہاب صاحب اور سلیم صاحب پر منحصر ہے کہ وہ ان باشعور، سنجیدہ، باوقار، باعلم وادب اور اپنے پہلو میں انسانیت کے لئے نرم دل اور تمام مسالک کے لئے نرم گوشہ رکھنے والے احباب سے کیسے کام لیتے ہیں۔

مجھے خدا کی ذات پر یقین کامل ہے کہ یہ دونوں حضرات اگر سنجیدگی اور خلوص سے اس پہلو پر غور کریں اور زبانی جمع خرچ کے بجائے کوئی عملی اقدام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ہاں سے مذھبی منافرت، باہمی عدم تعاون، عدم اعتماد، ھٹ دھرمی، دنگا فساد، قتل وغارت، کشیدگی، عصبیت، زبان پرستی، علاقہ پرستی اور مذہب وعلاقہ کے نام پر چنگاریاں ملیامیٹ نہ ہوں اور پورے خطے میں بین الاضلاعی اور بین المذھبی روابط قائم نہ ہوں۔ خدا کرے ہماری یہ معصوم سی امید بھر آئے اور شجر تناور کا شکل اختیار کرے۔ اور ہمارا پیارا

علاقہ وادی جنت نظیر، پریوں کا مسکن، پہاڑوں کا سنگم ، بہتے شفاف آبشاروں کی دھرتی لہلہاتے پھولوں کا گلستان، گرم و سرد موسموں اور دودھ جیسی برف سے ڈھکی ہوئی ، خوبصورت چوٹیوں ، قدرتی جنگلات کا مستقر، معدنیات اور ارضی خرائن کا مدفن ، سلاجیت اور خشک میوہ جات کا ماویٰ اور دیومالائی روایات و تہذیب اور تابناک ماضی رکھنے والا گلگت بلتستان محبتوں کا آماجگاہ پریم و سنگت کا دبستان اور امن و آتشی کا گہوارہ بن جائے۔

میں یہاں اپنے ان کرم فرمائوں کی خدمت عالیہ میں ایک انگریزی کہاوت گوش گزار کرونگا جسمیں ہمارے لئے بہت کچھ پوشیدہ ہے۔خواب دیکھنا، محبت کرنا، امیدیں وابستہ رکھنا، دوستی کے لئے باہیں پھیلانا اور خیالات ، احساسات ، جذبات شئیر کرنا کب بُرا ہے اور کب مہذب و سنجیدہ لوگوں نے اس کو ترک کیا ہے۔اور کب دنیا اس کے بغیر سکھ کا سانس لے سکی ہے اور انسانوں کا بسیرا بن چکی ہے۔ملاحظہ کیجئے۔

"Sweet things are easy to buy, but sweet people are dificult to find. Life ends when you stop dreaming. hope ends when you stop bleieving. love ends when you stop caring. friendship ends when you stop sharing.

So share this with whom ever you consider a friend, brother,

Lover and wisher.

To love without condition and to talk without intention, to give without reason and to care withoiut expectation is the heart of a true friends. (Haqqani is Farst)

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے شام غم مگر شام ہی تو ہے۔

"صحافی نشانے پر"

آج کل ہمارے وزیر اعلیٰ کے کچھ فرمودات پر ہمارے حرف شناس اور قلم دوست ،دوستوں کو شکایت ہے کہ ہمارے وزیر اعلی کن باتوں میں مصروف ہیں ۔ مثلاً ہمارے دوستوں کو شکایت ہے کہ ہمارے مہدی شاہ صاحب نے شعیب اور ثانیہ کو ہنی مون منانے کے لئے گلگت بلتستان آنے کی دعوت دی ہے ۔ اس میں برا منانے کی کونسی بات ہے ۔ اس کے جتنے فوائد ہیں اس کا اندازہ ہمارے ان نکتہ رساں دوستوں کو بالکل نہیں ہے۔ کچھ فوائد ملاخط فرمائے۔ شعیب کا تعلق پاکستان اور ثانیہ کا تعلق ہندوستان سے ہے ۔ اگر یہ دونوں ہنی مون منانے کے لیئے وہاں آئیں گے تو انڈیا والے ہمارے لیئے نرم گوشہ اختیار کریں گے پھر لالک جان کی طرح داد شجاعت دیکر نشان حیدر حاصل کرنا کسی فوجی سپاہی کی خواہش نہیں ہو گی لو جی ! ہمارے ہزاروں فوجی ثانیہ بھابی کی وجہ سے بچ گئے ۔ پاکستان نے گزشتہ ساٹھ سال سے ہمیں شمالی علاقہ جات کہا جو سرے سے کوئی نام نہیں اور ہمارے اوپر وہ کالے قوانین نافذ کئے جو اکیسوں صدی میں دنیا کے کسی خطے پر نہیں تھے تو یوں ہم سیالکوٹی منڈے کو وہاں بلا کر اپنی نیک نیتی اور بے زر غلامی کا عملی ثبوت تو دیں ۔ اس پریمی جوڑے کی آمد سے ہمارے لڑکیوں میں بھی غیرت آ جائیگی اور وہ بھی کسی سے لائن ملا کر گلگت بلتستان

کا نام پورے عالم میں مشہور کریں گی اور بین الاقوامی اداروں میں ہماری لڑکیوں کی رپورٹنگ ہو گی۔ اور ہمارے نوجوان بھی ہمت سے کام لے کر کسی غیر ملکی کو گلگت بلتستان لے آئیں گے تو پھر تو کیا کہنا۔ اور بھی بہت سارے فوائد ہیں۔

ہمارے وزیر اعلی صاحب سخی دل آدمی ہیں وہ اپنی ذاتی خرچے پر ان دونوں کو وہاں کی سیر کروانا چاہتے ہیں۔ اب تو ان کو ایسے صحافی اور لکھاری بھی میسر آ گئے ہیں جو ان کی اس جرأت رندی کو قابل فخر سمجھتے ہیں۔ میں اپنے ان قلمی دوستوں سے دستہ بستہ عرض کرونگا کہ وہ وزیر اعلی کو یہ مشورہ بھی ضرور دیں کہ وہ وینا ملک اور محمد آصف کو بھی گلگت بلتستان میں الگ الگ دعوت تفریح دیں۔ کیونکہ پوری پاکستانی میڈیا ان کی خبر بنائے گا جس میں ضمناً گلگت بلتستان کا ذکر بھی آ جائیگا۔ اور عالم اسلام کے ہیرو اسامہ بن لادن کے بیٹے اور ان کی برطانوی نژاد بیوی کو گلگت بلتستان کا دورہ کی دعوت دیں اس لیے کہ وہ قدامت پسند نہیں جدت پسند مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں اور گلگت بلتستان کے لوگوں پر شک کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ قدامت پسند ہیں تو ہم پر یہ شک بھی ختم ہو گا کیونکہ وہ اپنے باپ کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے آج کل یورپ کے نائٹ کلبوں میں اپنی اہلیہ سمیت رنگ ریلیوں میں مصروف ہے۔ یوں ورلڈ لیول میں گلگت بلتستان کا نام روشن ہو گا اور عالمی جرائد و

اخبارات میں گلگت بلتستان کے حوالے سے نیوز رپورٹیں ، فیچرز، ارٹیکلز ، تصاویر ،پبلش ہوں گی اور گلگت بلتستان کے لوگوں کو یہ سرٹیفکٹ ملے گا کہ یہ لوگ جنگ دہشت گردی میں یورپ کے ساتھ ہیں اور عسکریت پسندوں کے مخالف ہیں ۔ یوں ہماری سیاحت کو فروغ ملے گا اور ہمارے وارے نیارے ہونگے۔

اس کے علاوہ سوات کا جعلی ویڈیو جاری کرنے والی این جی اوز اور ان کی خواتین کو بھی گلگت بلتستان دعوت دی جائے ، وفاقی وزیر جناب زہری کو بھی دعوت دی جائے کیونکہ انہوں نے بلوچستان میں 2 لڑکیوں کو زندہ درگور کیا اور ببانگ دہل میڈیا پر آکر کہاکہ یہ ہماری روایات ہیں اور یوں گلگت بلتستان کی خبریں پوری پاکستانی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر گردش کرنے لگیں گی۔

رہی بات رشید ارشد اور عبدالکریمی کی تو یہ کون ہوتے ہیں جو ہمارے ترقیاتی منصوبوں‌اور جدت پسندی کے سامنے روڑے اٹکائے ۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ہاں صحافی ، ادیب ، شاعر، سائنس دان ، فوجی ، ڈاکٹر، وکلاء انجینئر، علماء کرام اور صوفیائے عظام کب قومی ہیرو ہوتے ہیں اور نہ ان کو مطلعاتی، صحافتی، ادبی، اصلاحی، سماجی اور پیشہ وارانہ دوروں کی دعوت دی جاتی ہے ۔ قومی ہیرو بننے کے لئے تو لازمی ہے کہ موصوف کے اسکینڈلز بنے ، عالمی میڈیا پر اس کا نام آئے ۔ وہ عشق لڑائیں خیر اب تو بد قسمتی سے ہمارے قومی ہیرو وہ ٹھہرے

جو ارکان پارلیمنٹ اور معتدل سیاسی پارٹیوں پر تیز و تند حملے کرے اور خود ہمارے منتخب وزیر اعلی کو ایوان سے آئوٹ ہونے کی دھمکی دے اور مستقل چھٹی کرانے کا سندیسہ قوم کو سنائے۔

بہر صورت کریمی اور رشید ارشد اپنا قبلہ درست کریں اور ہمارے ارباب اقتدار کو ہر گز یہ مشورہ نہ دیں کہ وہ عطاء آباد جھیل، تعلیم و صحت کی گرتی ہوئی صورت حال، معاشی انفرا سٹرکچر کی تباہ حالی، امن و امان کی دگرگوں صورت حال، دیامر بھاشہ ڈیم کی رائیلٹی، اہل دیامر کے جائز مطالبات، اور کابینہ اور گلگت بلتسان کونسل کے دوران ہونے والی ہیرا پھیری، بیروزگاری، بین الاضلاعی روابط کا فقدان، اخباری صنعت کے مسائل اور پی آئی ڈی کی عدم آدائیگی، ادب و صحافت سے منسلک حضرات سے غیر مناسب رویہ اور صحافتی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کے بجائے آئینہ کو توڑنے کی ذہنی روش اور کابینہ کے ارکان کا اسلام آباد میں سیر و تفریح کا نوٹس لیں اور نہ اس بات کا ذکر کریں کہ وہ گلگت بلتستان سے نامور اور ایمان دار اعلی بیورکریٹ کا تبادلہ کرا کران کی جگہ نااہل لوگوں کو ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔

قابل مبارک ہیں میرے وہ دوست جنھوں نے بروقت ان لوگوں کی کلاس لی جنھوں نے ہمارے مخدوم وزیر اعلی کو نشانہ بنایا تھامگر ان سے اتنی سی گزارش ضرور ہے

کہ قلم کی حرمت اور تقدس کو پامال نہ کریں اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار نہ بنیں اور ہاں اپنے صحافی اور قلم دوستوں کی مدح سرائی اور ہمت افزائی کے بارے کچھ نہیں کہنا چاہتے تو ان کے بارے ہرزہ سرائی سے بھی اجتناب کریں اور مہرہ بلب رہے تو مناسب ہو گا۔ اور شے کی حقیقت کو پہنچان کر اہل نظر بننے کی کوشش کریں تو یہ آپ کے لئے اعزاز کی بات ہو گی

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا

”میرا گاؤں“ گوہر آباد

گوہر آباد کا نام سنتے ہیں آپ کے دل و دماغ میں ایک خوبصورت وادی کا تصور ابھرتا ہے ، گوہر آباد کو مقامی زبان میں ”گور“ کہا جاتا ہے مگر اس کا درست نام گوہر آباد ہے۔تاریخ کی کتابوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گوہر آباد بارہ سو سال سے اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔

گوہر آباد وہ گاوں ہے جو گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ پسماندہ ہے۔ مگر اپنے قدرتی حسن اور خوبصورتی اور بالخصوص تعلیم وتدریس کے حوالے سے انتہائی معروف و مشہور ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تناسب آبادی کے اعتبار سے گوہر آباد کے لوگ پورے گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔اس گاوں کا رقبہ اراضی بہت طویل ہے۔ گیس پائن، گیس بالا، رائیکوٹ، تھلیچی پر مشتمل ہے۔ اگر آپ راولپنڈی سے سفر کرتے ہیں تو کے کے ایچ میں ۵۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر وادیِ گوہر آباد آپ کو خوش آمدید کرے گی۔ اگر آپ گلگت شہر سے سفر کرتے ہیں تو نوے کلومیٹر کی مسافت کے بعد گوہر آباد کا مرکزی باب آپ کی باصرہ نواز ہوگا۔

پورے گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ جنگلات گوہر آباد میں پائے جاتے ہیں جسمیں کائل، فر، چیڑھ، دیار، بنئی، کاؤ اور قسم ہائے قسم درخت وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ٹمبر مافیا کو مکمل آزادی ملنے کے باوجود گوہر آباد کے جنگلات اب تک محفوظ ہیں۔ محکمہ جنگلات کو چاہیے کہ ان کو محفوظ بنانے کی فوری احتیاطی تدابیر کریں۔ جنگلی حیات کے حوالے سے بھی گوہر آباد کافی معروف ہے۔ جہاں لومڑی، گیدڑ، برفانی اور میدانی ریچھ، مارخور، ہرن، بٹیر، شاہین، باز، اور ہر قسم کی چہچہاتے پرندے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

گوہر آباد کی زمین زرخیز اور درخت پھلدار ہیں۔ گندم، مکئی، آلو، پیاس، بھنڈی، گوبھی، جُو اور لوبیا کی کاشت بڑی مقدار میں کی جاتی ہے۔ گوہر آباد کا سونچل (ایک سبزی کا نام) بہت لذیذ ہے۔ گلگت بلتستان کی دیگر شہروں میں ایکسپوٹ کیا جاتا ہے۔ پھلوں میں آخروٹ، انگور، شہتوت، انار کثرت سے ہوتے ہیں۔ جلغوزے کے درخت پورے گلگت بلتستان میں سب زیادہ یہی پائے جاتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق سب سے لذیذ جلغوزے بھی گوہر آباد کے ہی ہوتے ہیں۔ جلغوزے کا کاروبار لوگوں کی معیشت کا بہترین وسیلہ ہے۔ گوہر آباد کے لوگ مال مویشاں کثرت سے پالتے ہیں۔ مارتل، کھلیمئی، سگھر، بھری، چھلو، ہومل، سلومن بھوری، مطیرا، دساہ، چانگھا، دروگاہ، ملپٹ گوہر آباد کی مشہور چراگاہیں ہیں جہاں لاکھوں مال مویشاں چرتے ہیں۔ موسم گرما میں ہزاروں لوگ اپنی مال مویشاں لے

کر ان چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ چراگاہیں ایک وسیع و عریض علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تمام چراگاہوں تک کا سفر پیادہ ہے۔ یہ تمام چراگاہیں اتنی خوبصورت، صحت افزا اور دلفریب جگہیں ہیں کہ اگر سیاحوں کا رخ ان کی طرف موڑ دیا جائے تو ہزاروں خوبصورت مناظر کیمرے کی آنکھ سے محفوظ ہو کر دنیا کے سامنے آ سکتے ہیں۔

گوہر آباد میں آبشاروں، چشموں اور گلیشیرز کا شفاف پانی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے مگر نہری نظام نہ ہونے کی وجہ سے وسیع اراضی بنجر پڑی ہوئی ہے اور فصلیں قلت آب کا شکار ہیں۔

کے کے ایچ روڈ ڈرنگ سے وسط گوہر آباد تک چودہ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ بذریعہ جیپ، ہائیس، اور رٹوڈی سے سفر کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہائی اسکول ہے۔ جبکہ کئی مڈل اور پرائمری اسکولز ہیں۔ پچیس بیڈ پر مشتمل ایک ہسپتال تعمیرات کے آخری مراحل میں ہے۔ گوہر آباد میں ایس کام کی موبائل فون سروس بھی موجود ہے اور زونگ بھی چلتا ہے۔

گوہر آباد کے لوگوں کی علم دوستی کا ثبوت اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیڈٹ کالج کے لیے مفت میں ایک ہزار کنال زمین مرحمت کی۔ اب گوہر آباد میں

.براب کے کے ایچ پر کیڈٹ کالج کا تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ گوہرآباد کے لوگ انتہائی مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت اپنے فرائض میں خیال کرتے ہیں۔جب بھی کوئی سیاح گوہرآباد کا رخ کرتا ہے تو گوہرآباد والوں کی مہمان نوازی دیکھ کر ورطہ حیرت میں رہ جاتا ہے۔ گوہراباد میں شین یشکن، ڈوم کمن، سید وغیرہ قومیں پائی جاتیں ہیں مگر یکجہتی اور بھائی چارگی کی فضاء قائم ہے۔ لسنئے، گوچیۓ ڈوبۓ اور کھرتالے پوشیلے کے نام سے تین بڑی ہیٹی (گروپس) ہیں۔ اور ان کے اندر تقسیمات ہیں۔

گلگت گوہرآباد کے جنگلات کی عجیب روگ کہانی ہے۔ چند وڈیروں کی کارستانیوں کی وجہ سے اب تک غریبوں کا پانچ ارب سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے مزید اربوں کے نقصانات کا قوی امکان ہے۔ دو دہائیوں سے یہ جنگلات اٹکے ہوئے ہیں۔ گلگت بلتستان میں سب سے گھنے اور قیمتی لکڑی کے درخت گوہرآباد کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگلات مقامی لوگوں کی ملکیت ہے۔

گوہرآباد میں پرانے طرز کے قلعے بھی ہیں۔ ان کو مقامی زبان میں ''شکارے'' کہا جاتا ہے۔ یہ تین منزلہ ہیں۔ ان قلعوں کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال زیادہ ہوا ہے، لکڑی کی عمارت کھڑی کر کے درمیان میں چھوٹے چھوٹے پتھر لگا دیے گے ہیں۔ یہ قلعے صرف دو جگہوں میں ہیں جو گوہرآباد کی سب سے پرانی

آبادیاں ہیں۔ یعنی لسنوٹ کوٹ اور ڈبوٹ کوٹ میں۔

گوہرآباد میں ایک عجوبہ بھی ہے جو ''ہیپرنگ'' کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بارے بہت سی اساطیر اور من گھڑت کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کھو ہے۔ جنات اور پریوں کا مسکن ہے۔ گوہرآباد کے کئی نالوں کا پانی یہی سے ہوکر دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔

گورنمنٹ اگر ''ہیپرنگ'' کو سیر گاہ بنائے اور مناسب انتظامات کریں تو ہیپرنگ بین الاقوامی توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں جس سے گلگت بلتستان کی معیشت مضبوط اور کھربوں کی آمدن موصول ہوسکتی ہے۔ جب بھی گوہرآباد کا نام لیا جاتا ہے تو حاضرین محفل ''ہیپرنگ'' کا نام بھڑ بھڑاتے ہیں۔۔ گوہرآباد مارتل انتہائی بلندی پر ایک وسیع میدانی علاقہ ہے۔ جہاں لاکھوں ٹن گھاس کاٹ کر خشک کی جاتی ہے اور مویشوں کے کام آتی ہے۔ گوہرآباد جنگل کے دامن میں واقع یہ علاقہ بے حد خوبصورت ہے۔ شریں پانیوں کا مسکن مارتل انتہائی زرخیز ہے۔ جہاں کے آلو اور سبزیاں انتہائی لذیذ اور صحت افزا ہیں۔ ماہرین لذت و صحت افزا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ شفاف پانی کے ساتھ گوبر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یوریا اور نائٹریٹ کی کھاد وغیرہ سے پرہز کیا جاتا ہے۔ آسانی سے روڈ لے جایا جاسکتا ہے۔ اگر مارتل پولو فیسٹول کا انعقاد کیا گیا تو دنیا بہت ساری جگہیں بھول جائے گی۔

شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد یہاں دو پل بنائے گئے۔ ایک گوہرآباد پل اور دوسرا گیس پل کے نام سے معنون ہیں۔ ان دونوں پلوں کے ذریعے گوہرآباد کا وزٹ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کا رہن و سہن اور تہذیب و تمدن بھی دیگر علاقوں سے مختلف ہے۔ کافی سال پہلے یہاں سارے گوہرآباد والوں کی سال میں ایک دفعہ اجتماعی شادیاں ہوتی تھیں اور سب کا ولیمہ بھی ایک ساتھ ہوتا تھا تاہم اب یہ سلسلہ ختم ہوچکا ہے مگر اب بھی پندرہ بیس شادیاں اکھٹی ہوتیں ہیں مگر دعوت ولیمہ سب کی اپنی اپنی ہوتی ہے۔

یہاں نمبرداری اور جرگہ داری سسٹم آج بھی موجود ہیں۔ گھاس کاٹنا، اخروٹ اور انگور جلغوزے توڑنا وغیرہ میں اتفاق ہوتا ہے، نمبردار جس دن اجازت دیں اس دن کاٹا، جاتا، خلاف ورزی کی صورت میں بھاری جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ یہی صورت حال چراگاہوں میں جانور لے جانا، واپس پر لے آنا، بنئی کے درخت کا کاٹنا وغیرہ کے لیے بھی تسلسل سے جاری ہے۔

نوٹ: یہ تحریر، قومی نشریاتی رابطے کا پروگرام ''میرا گاؤں'' کے نام سے ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے یکم نومبر کو آن آئیر نشر ہوا ہے۔

''کرفیو اور پابندی''

کرفیو کا لفظ پڑھتے ہی قاری یہ سمجھ بیٹھے گا کہ اب کرفیو کے مخالفت میں دلائل اور اس کے نقصانات بیان کیے جائیں گے۔ مگر ہمارا ارادہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ غور سے اگر یہ کالم پڑھا جایئگا تو اس میں کرفیو کے فضائل و برکات اور ثمرات نظر آئیں گے۔ گزشتہ کافی عرصے سے پاک آرمی کے جانباز گلگت شہر میں کرفیو لگا کر امن و آمان کو برقرار بلکہ امن کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ ہم قوم ہی ایسی ہے کہ بلکہ سوری ایسی قوم تیار کی گئی ہے کہ ہم کرفیو پسند ہیں۔ تین اپریل کے بم دھماکے کے بعد جو حالات پیدا ہوئے، اگر خدانخواستہ آرمی بروقت اپنا رول نہ دکھاتی تو پتہ نہیں اب تک کا منظر کیا ہوتا، کیونکہ ہماری زیرک اور متین و فہیم سیاسی قیادت ''لاڑکانہ یاترا'' کے لئے پابہ رکاب تھی اور جو اس مقدس میلے میں شرکت کے لئے نہیں جارہے تھے وہ اسلام سے لبا لب بھرا شہر ''اسلام آباد'' میں اسلام کی نعمتوں اور سہولتوں سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ رہے بیورکریسی کے اعلیٰ دماغ آفیسر تو وہ ''گھوڑیاں بیچ'' کر گہری نیند سو رہے تھے اور نیچلا طبقہ نہتوں پر گولیاں برسانے میں مصروف تھا۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ فوج نہ آتی تو کون آتا؟ اور کرفیو نہ لگتا ہو کیا لگتا؟

جب کرفیو میں نرمی کا سلسلہ شروع ہوا تو سیاسی بونے بھی نظر آنے لگے، ماشاء اللہ۔ جب فوج نے کرفیو لگایا تو گلگت کے شہریوں نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا یعنی کرفیو کے تمام لوازمات بھروئے کار لائے، مثلاََ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نہ جانا، اسکولوں میں پڑھائی نہ کرنا، دوکانیں نہ کھولنا، سال بھر جن لوگوں کو چھٹیاں نہیں ملی تھی اپنے بوس کی چمچہ گیری نہ کرنے کی وجہ سے ،انہیں بغیر کسی کے احسان کے کافی دن چھٹیاں ملنے پر چھٹیاں منانا، کرفیو قوانین کے زد میں آنے والوں کا روڈ میں ناک رگڑنا، تندور سے روٹی نان لا کر کھانے کے بجائے فوجی جوتیاں کھانا، پاک آرمی کے جوانوں کو دیکھ کر بھاگنا اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھ کر صلواتیں سنانا اور بہت کچھ۔۔۔۔۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کرفیو کے لگنے اور پھر نرمی کے بعد زندگی میں ایک ہل چل شروع ہونے لگی تھی مگر سیاسی قیادت نے رنگ میں بھنگ ڈالنا شروع کیا۔ گلگت اور اسکے مضافات میں لفظ کرفیو نے جتنی جلدی مقبولیت حاصل کی تھی اب ایک اور لفظ اس کی جگہ لینے لگا ہے، وہ ہے لفظ پابندی۔ مثلاََ موبائیل سروس کی بحالی پر پابندی، نماز جمع پر پابندی، (کیونکہ دونوں مرکزی مساجد پر تالے لگے ہوئے ہیں)، ہماری زیرک سیاسی قیادت نے حالات کی بگاڑ کے وجوہات معلوم کرنے کے لئے اسمبلی اجلاس بلایا اور گرما گرم بحث اور طویل مشاورت کے بعد انہیں وہ تمام محرکات و وجوہات معلوم ہوئے جن کی وجہ سے حالات اس نہج پر

پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے اس کا حل چند پابندیاں عائد کرنے میں نکال ہی لیا۔ مثلاً تنظیم اہل سنت والجماعت اور انجمن امامیہ پر پابندی، ان کی اخباری بیانات پر پابندی، دونوں مساجد میں مذہبی علماء پر پابندی اور بہت کچھ پر۔ میں چونکہ حکومت کا خیر خواہ ہوں اور ان کی ان تمام پابندیوں کے حق میں ہوں اس لئے چند اور پابندیاں تجویز کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ ارباب اقتدار میری تجویز کردہ پابندیوں پر نہ صرف غور کریں گے بلکہ فوراً عمل درآمد کے احکامات جاری بھی کریں گے۔ مثلاً یہ کہ گلگت بلتستان کی تمام مذہبی تنظیموں پر پابندی، تمام مذہبی اجتماعات پر پابندی، تمام مساجد اور مکاتب پر پابندی، تمام علماء و شیوخ پر پابندی، رمضان المبارک اور ایام عاشورہ پر پابندی، نماز عیدین و جمعہ پر پابندی، داڑھی رکھنے پر پابندی، تسبیح اور مسواک پر پابندی، اسکول کالج اور یونیورسٹی میں دینیات کی کتب پر پابندی، اسلامی و مذہبی لٹریچر پر پابندی، اسلامی لباس پر پابندی، شیخ و ملا کے لمبے لمبے کرتے اور عماموں پر پابندی، صوم و صلوۃ پر پابندی، آذان پر پابندی۔ اگر مختصر کہا جائے تو قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی پر ہی پابندی لگادی جائے تو بہتر ہے۔ میں چیلنج سے کہہ سکتا ہوں کہ حکومت ان تمام پر پابندی لگا کر دیکھے کہ گلگت میں امن قائم ہوتا ہے کہ نہیں۔ لاریب کہ امن اسلام کے آفاقی قوانین و تعلیمات اور امن معاہدوں پر عمل پیرا ہونے سے تھوڑا قاتم ہوتا ہے۔ امن تو انہیں پابندیوں کی مرہون منت اور فوری نفاذ سے ہی

قائم ہو سکتا ہے۔ انتہائی غور سے دیکھا جائے تو جن جن ممالک میں ان قسم کی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں وہ ترقی کے منازل طے کرکے کہاں پہنچے ہیں۔ ان کی ترقی کی ایک مثال لے لیجیے۔ وہ لنچ اور پیشاب بھی کھڑے کھڑے چند لمحوں میں کرکے اپنے آپ کو قومی خدمت کے لئے فارغ کر لیتے ہیں۔ اور ان کی زندگیاں ان قسم کے سطحی چیزوں میں مصروف نہیں ہیں جو ہمارے ہاں رائج ہیں۔ مثلاً سب کچھ کو چھوڑ کر نماز کے لئے مسجد جاؤ، بوڑھے والدین کی خدمت کا بہانہ کرکے دفتر سے رفو چکر ہو جاؤ۔ مذہبی رسومات و عبادات کی بجاآوری کا نام دیکر کئی کئی دن چھٹیاں کرو اور اپنے آپ کو مخصوص خول کے اندر مقید کرو اور عبادات و اعمال کا نام دیکر گھنٹوں گھنٹوں خلوت کدوں میں رہو۔

یہاں ایک نکتہ ذہن میں رہے کہ ہم مجموعی طور پر ایک ایسی قوم ہے کہ ہم ان پابندیوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتے ہیں، لہٰذا ارباب اقتدار اور بیوروکریسی کے روشن دماغوں سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے کہ وہ پاک آرمی سے ریکوسٹ کریں کہ وہ ان تمام چیزوں پر فوری طور پر کرفیو لگا دیں۔ کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ عوام کرفیو قوانین پر اچھی طرح عمل پیرا ہوتی ہے۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے جب سے گلگت میں کرفیو لگا ہے کوئی فائرنگ نہیں ہوئی اور نہ کسی انسانی جان کا ضیاع ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ کرفیو سے فائدہ اُٹھانے میں حرج ہی کیا ہے۔ میں یہ تمام تجویزیں مکمل نیک نیتی سے دے رہا ہوں، کسی کو اجازت

نہیں کہ وہ میری نیت میں فتور ڈھونڈیں۔زندگی رہی اور سرکاری فرشتوں سے محفوظ رہا تواگلی دفعہ وہ تمام چیزوں کو تفصیل سے بیان کرونگا جن کی آزادی ہونی چاہیے، کیونکہ انسان بنیادی طور پر آزاد پیدا ہوا ہے لہٰذا اس کو آزادی ملنی چاہیے اور آزادی کو کچلنے والوں پر سخت قسم کی پابندیاں عائد ہونی چاہیے، بالخصوص وہ پابندیاں جو اوپر ہم نے تجویز کی ہیں۔

نوٹ: یہ تحریر 2012ء کے کرفیوزدہ ایام میں لوکل تمام اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ حقانی

گلگت، مذہبی ہم آہنگی پر ورکشاپ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

انٹرنیشنل اسلامک سینٹر لاہور بین المذاہب و بین المسالک اتحاد و یکجہتی کے حوالے سے ایک معروف ادارہ ہے۔اس کو تمام مکاتب فکر کے جید علماء کا اعتماد حاصل ہے۔ برادرم حافظ نعمان حامد اس کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر ہیں، انتہائی نرم دل اور معاملہ فہم شخص ہیں۔ انہوں نے گلگت بلتستان میں ایک انتہائی اہم ورکشاپ منعقد کرنے کے لیے راقم الحروف سے رابطہ کیا۔ورکشاپ کا عنوان تھا"Intra/Inter-faith Dialogue and Conflict Resolution Skills"۔ یہ محرم الحرام سے قبل کی بات ہے۔میں نے ان سے عرض کیا کہ گلگت بلتستان میں محرم الحرام کو حالات کشیدہ ہوتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے پروگرام کو بعدِ محرم ترتیب دیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم کوئی خاص مذہبی پروگرام یا کسی ایک مسلک کے لوگوں کا پروگرام نہیں کرنا چاہتے، بلکہ تمام مکاتب فکر کے جید علماء پر مشتمل ایک ورکشاپ کے انعقاد کا خیال ہے، ہمارا پروگرام کوئی جلسہ نہیں بلکہ ایک مشترکہ ورکشاپ ہوگا جس میں مسلم کے ساتھ غیر مسلم بھی شریک ہونگے۔اور ہم تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار لوگوں کے ساتھ غیر مسلموں بالخصوص عیسائیوں کو بھی دعوت دے کر اکٹھا کرکے ،ساتھ ڈائیلاگ کروانا چاہتے ہیں اور ہمارے ایک

مہمان غیر مسلم بھی ہونگے۔ مجھے ان کی طرف سے یہ تفصیلی وضاحت سن کر بڑی خوشی ہوئی تاہم پھر بھی میں نے اصرار کرکے محرم الحرام کے بجائے صفر کے آغاز میں ورکشاپ کے انعقاد کا کہا، جو انھوں نے مان لیا۔یوں 26 اور 27 نومبر کو پروگرام منعقد کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا گیا اور انھوں نے دعوت نامے اور پروگرام شیڈول ای میل کیا اور یہاں گلگت سے ڈیزائن کرواکر پرنٹ نکلوایا۔ اب میری ذمہ داری یہ تھی کہ تمام مکاتب فکر کے لوگوں سے رابطہ کروں اور ورکشاپ کے پہلے روز کے لیے مہمانوں کا انتخاب بھی کروں اور انہیں دعوت بھی دوں۔ حافظ نعمان کا یہ بھی اصرار تھا کہ اگر وزراء اور ارکان اسمبلی پروگرام میں شامل ہوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اللہ کے فضل سے بہت ہی قلیل وقت میں ان کی تمام ڈیمانڈز کو پورا کیا اور محترم وزیر بیگ، اسپیکر گلگت بلتستان اسمبلی، محترم سید سرورشاہ صاحب، ممبر گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی و امیر جمیعت علمائے اسلام گلگت بلتستان، اسماعیلی ریجنل کونسل کے صدر کرنل عبیداللہ بیگ صاحب، محقق و دانشور جناب شیر باز علی برچہ صاحب اور جناب شیخ مرزا علی صاحب جیسے مشہور شخصیات سے رابطہ کرکے انہیں ورکشاپ کی نوعیت و افادیت بتلا دی تو تمام بزرگوں نے کمال محبت سے اپنی آمد و شرکت کو یقینی بنانے کی یقین دھانی کرادی۔ پھر ورکشاپ کے شرکاء میں سے بھی ایسے جید اور دانشور ور قسم کے احباب کو مدعو کیا کہ وہ مکمل دو دن پورے دے سکیں اور پروگرام کے اثرات و افادیت کو بعدازیں عام سوسائٹی میں فروغ بھی دیں۔ ان میں الواعظین بھی تھے

شیوخ بھی اور علماء و مفتیان کرام بھی، صحافی بھی تھے پروفیسرز بھی، ادیب بھی تھے، شعراء بھی، اور نوجوان طلبہ بھی۔یوں پچاس کے قریب احباب نے شرکت کی۔

ورکشاپ کے منتظمین دو دن پہلے ہی گلگت پہنچ چکے تھے۔برادرم حافظ نعمان اور مولانا یاسین ظفر صاحب (ناظم اعلی وفاق المدارس السّلفیہ پاکستان، پرنسپل جامعہ سلفیہ فیصل آباد) نے گلگت آمد کی اطلاع کی، انہوں نے ورکشاپ کی تیاریوں کا جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ گلگت اور مضافات کا چکر لگایا۔ حضرت قاضی صاحب نے ان کے گھومنے پھرنے کے لیے ٹرانسپورٹ اور ساتھیوں کا انتظام کیا۔انہوں نے گلگت دیکھا اور گلگت کے قدرتی حسن سے بہت متاثر ہوئے اور اس کا اظہار بار بار کرتے رہے۔

ورکشاپ اپنے مقررہ وقت پر شروع ہوا۔ شرکاء وقت پر سرینہ ہوٹل پہنچ گئے۔ ابتدائی تعارف ہوا، پروگرام کے اغراض و مقاصد اور آپس میں اعتماد کی بحالی کے حوالے سے مختصر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد ٹی بریک ہوا۔ دن گیارہ بجے سے دو بجے تک مولانا یاسین ظفر اور حافظ نعمان نے مختصر خطاب کیا اور اس کے بعد گلگت بلتستان کے معزز مہمانوں نے مذاہب میں ہم آہنگی اور رواداری اور کامیاب معاشرتی زندگی کے اصولوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔برادرم زینت شاہ (PDCN) نے بھی اسماعیلی مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے مہمانوں کو

ویلکم کہا اور مذہبی ہم آہنگی کے حوالے سے مثالوں سے بھرپور مزین گفتگو کی۔ شیعہ علماء کونسل کے رہنماء شیخ مرزا حسین نے اپنی گفتگو میں کہا کہ قیام امن کے لیے ہم سب کو مل کر کام کرنا ہوگا، ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ حالات کن اسباب و علل کی وجہ سے بگڑتے ہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسباب و علل میں پڑے بغیر امن و امان اور مذہبی رواداری کے لیے میدان عمل میں نکلنا ہوگا۔ ان کے بعد جمعیت علمائے اسلام گلگت بلتستان کے امیر و ممبر لیجسلیٹیو اسمبلی گلگت بلتستان مولانا سرور شاہ نے تفصیلی خطاب کیا۔ انہوں نے قرآن کریم کی آیت '' اخرجت للناس '' کا مفہوم تمام تر تفصیلات کے ساتھ بیان کیا اور کہا کہ قرآن نے بھی لفظ ''الناس '' یعنی انسانیت پر زور دیا ہے۔ قرآن کا آفاقی مضمون انسانیت کی بھلائی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جب تک اسباب و علل کو جانچا نہیں جائے گا اور ان بنیادی خرابیوں کو دور نہیں کیا جاتا تب تک رواداری اور امن و امان کی بحالی ناممکن ہے۔ جب ایک ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے تو سب سے پہلے مریض کے خون، پیشاب وغیرہ کا مختلف لیبارٹریوں میں کئی ٹیسٹ کرواتا ہے۔ تب مرض تشخیص ہوتی ہے تو دوا دیتا ہے۔ ہمیں بھی ان تمام اسباب کو تلاش کرنا ہوگا جن کی وجہ سے قتل و غارت اور ظلم و ستم کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اس محفل کے چیف گیسٹ جناب وزیر بیگ صاحب اسپیکر گلگت بلتستان اسمبلی تھے۔ انہوں نے بھی بہت ہی خوبصورت باتیں کی۔ تمام شرکاء اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور راقم الحروف کا نام لے کر کئی

بار شکریہ ادا کیا۔ اس ورکشاپ کی افادیت کو سراہا اور منتظمین سے گزارش کی کہ آئندہ بھی ایسے ورکشاپ کا انعقاد کیا جائے تاکہ مذہبی ہم آہنگی کو بہتر طریقے سے فروغ دیا جاسکے۔ مسائل کو تعلیم و تعلم اور ڈائیلاگ کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا۔ ورکشاپ کے منتظمین نے اسلام آباد سے کنیڈین ڈپٹی ہائی کمشنر جناب مسٹر برناڈ مکفیل کو بھی مدعو کیا تھا۔ مسٹر برناڈ ورکشاپ کے شروع سے آخر تک دلجمعی کے ساتھ شریک رہے۔ انہوں نے انگلش میں معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، ترجمانی کے فرائض جناب سید عبدالحمید نے انجام دیے جو اسلام آباد سفارت خانے سے خصوصی طور پر آئے تھے۔ عبدالحمید صاحب بہت ملنسار اور نفیس انسان ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے ہیں۔ مسٹر برنارڈ نے کنیڈا کی مختصر تاریخ بیان کی اور خصوصی طور پر کہا کہ امن و امان اور مذہبی ہم آہنگی کے حوالے سے کنیڈا پوری دنیا میں ٹاپ ٹین ممالک میں شامل ہے۔ ایک واقعہ بھی سنایا کہ ایک دفعہ کنیڈا کی کسی مسجد کی دیوار پر کسی نے کوئی نازیبا نعرہ لکھ دیا۔ کنیڈین شہریوں نے جب دیکھا تو خود سیڑھیاں اور دیگر رنگ و روغن کا بندوبست کرکے ان نعروں کو مٹایا اور مسلمانوں سے کہا کہ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے ہم کنیڈا کے شہری اس پر معذرت کرتے ہیں۔ اور ایسی قبیح حرکت کرنے والے کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ مسٹر برنارڈ نے گلگت کے مناظر کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ دنیا میں بہت کم خطے ایسے ہیں جو اتنی فطری خوبصورتی سے مالامال ہیں۔

نوے منٹ پر مشتمل یہ سیشن ختم ہوا۔ کھانے اور نماز کے بعد آخری مختصر سیشن شروع ہوا۔اس میں تمام شرکاء کو ایک مختصر ٹاپک دیا گیا کہ '' فرقہ وارانہ فسادات کے اسباب و علل کیا ہیں۔ شرکاء کے چار گروپ بنائے گئے اور انہیں باہمی مذاکرہ سے اسباب و علل تحریری بیان کرنے کو کہا گیا۔ہر گروپ کا ایک لیڈر بنایا گیا۔ مختصر وقت میں شرکاء نے فرقہ وارانہ فسادات کی بہترین وجوہات پیش کی۔ ان کا خلاصہ یوں ہے۔انصاف کی عدم فراہمی، جاہلانہ رسومات اور ان پر سختی سے عمل کرنا، قانون کی عملداری میں سست روی،حب جاہ وحب مال، عصبیت، عدم برداشت، اسلامی تعلیمات کی روح سے دوری، سماجی، سیاسی اور مذہبی اداروں کی مجرموں کی پشت پناہی، مقدس شخصیات کی توہین ، گالیوں پر مشتمل فحش مذہبی لٹریچر، دوسرے کے مذہب، مسلک اور کلچر میں مداخلت کی کوشش،افہام و تفہیم کی کمی، جنریشن گیپ ،اخلاقی تربیت کی کمی،اور تعصب، نفرت، حسد، ضد، کینہ ، بغض، عداوت اور مذہب کی غلط تشریح ، لوڈ اسپیکر کا ناجائز استعمال وغیرہ عناصر واسباب و علل قرار پائے۔ ملٹی میڈیا کے ذریعے مختلف تحریروں، اقوال ، نقشوں اور گرافس کے ذریعے مثالیں دے کر عنوان کی افادیت، واہمیت اور مذہبی کشیدگی سے ہونی والی نقصانات ، معاشرے پر اثرانداز ہونے والے مثبت اور منفی اثرات کو سمجھایا گیا۔

ورکشاپ کا دوسرا دن بھی بہت ہی خوشگوار رہا۔ ابتداء میں ہی'' بین المذاہب وبین المسالک مکالمہ اور حل تنازعات'' "Intra/Inter-faith Dialogue and Conflict Resolution Skills"

کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اس بحث میں تمام شرکاء نے دل کھول کر حصہ لیا۔ مجادلہ، مناظرہ مباہلہ اور مکالمہ پر دلائل و براہین پر مشتمل گفت وشنید ہوئی۔ ہر شریک نے آزادنہ، طور پر ڈائیلاگ میں حصہ لیا۔ اور اس کے بعد ٹی بریک ہوا۔ اگلا سیشن بھی کمال کا تھا۔ جس میں اقوام متحدہ کا منظور کردہ انسانی حقوق کا عالمی چارٹر، پر برادرم نعمان نے ایک لمبی پریزنٹیشن دی اور پھر ہر ہر شق کو انگلش اور اردو ترجمے کے ساتھ پڑھ کر سنایا۔ ملٹی میڈیا کی سہولت موجود تھی جس کی وجہ سے شرکاء باسانی خود بھی پڑھ رہے تھے۔ اس چارٹر کا اسلامی اصولوں کے مطابق جائزہ بھی لیا گیا۔ شرکاء کی بڑی تعداد نے اس چارٹر کے بعض شقوں کو غیر اسلامی قرار دیا۔ اور دل کھول کر جو کہنا تھا کہہ لیا۔ یہ بتانا بھول ہی گیا کہ اس ورکشاپ کے اصولوں میں سے یہ بھی طے تھا کہ اپنی بات بلا کسی ہچکچاہٹ اور شرماہٹ کے بلاکم وکاست عرض کی جائے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ چھپایا جائے یا دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی انداز جارحانہ نہیں تھا اور نہ ہی مباہلانہ و مناظرانہ بلکہ مکالمانہ تھا جس کو تمام شرکاء نے سراہا۔

اسی سیشن میں خطبہ حجۃ الوداع کا عربی متن اور اردو ترجمہ بھی دیکھنے کو ملا۔ ایک ایک شق پڑھ کر سنایا اور اسکرین پر دکھایا گیا۔ اور کائنات کے نبی جناب محمد کے سنہرے الفاظ دل کو موم اور دماغ کو متاثر کر رہے تھے۔ اور میرے ساتھ بیٹھا کنیڈین ڈپٹی ہائی کمشنر بھی بہت ہی محظوظ ہو رہا تھا خطبہ حجۃ الوداع کے مفاہیم سن کر۔ سچ یہ ہے کہ یہ خطبہ انسانی حقوق کا ایک آفاقی چارٹر ہے۔ کاش ہم مسلمان اس کو ہی سمجھتے اور عمل کرتے۔ اور ایک بات پر تمام شرکائِ ورکشاپ نے صاد کیا کہ 1948ء میں مرتب کیے جانے والے انسانی حقوق کے چارٹر سے بدرجہ بہتر وہ خطبہ ہے جو آنحضرت نے چودہ سول سال پہلے دیا تھا۔ واقفان حال نے یہ بھی کہا کہ یہ چارٹر تو اس خطبہ کی کاپی نظر آتی ہے۔ بس لفظ اسلام اور محمد کو ہٹا کر اپنی مرضی کی چند ترامیم کرکے اسے انسانی حقوق کا چارٹر قرار دیا گیا ہے۔ اس تفصیلی سیشن کی تمام گفتگو یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ بہت ساری غلط فہمیاں ان دونوں چارٹروں کے مطالعہ و جائزہ اور تقابل کے بعد ختم ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ٹی بریک ہوا۔ جس میں پہلے روز کی طرح ایک ایکٹیوٹی دی گئی۔

آج کا عنوان تھا کہ ''فرقہ وارانہ فسادات کی معاشرے پر اثرات اور خاتمے کے لیے تجاویز''۔ پہلے دن اسباب وعلل پر غور و خوض کیا گیا تھا اور آج اثرات کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ اور تجاویز دی جا رہی تھی۔ ہر گروپ ہوٹل کی کرسیوں میں

سر جوڑے بیٹھا تھا اور چاہ نوشی کے ساتھ اپنی دانست کے مطابق اپنے لیڈر کو اثرات و تجاویز لکھو رہا تھا۔ ان سب کی نگرانی اور لکھا ہوا اسٹیج پر پڑھ کر سنانے کے لیے تیار کرنے اور بلانے کی ذمہ داری ناچیز کی تھی۔ آج بھی بہت اچھی باتیں ہوئی کہ کس طرح فرقہ وارانہ فسادات سے معاشرتی زندگی تباہ و برباد ہوتی ہے اور خاتمہ کے لیے خوب تجاویز بھی سامنے آئیں۔ تجاویز کا خلاصہ یہ ہے۔ اپنی مذہبی و مسلکی عبادات و اعتقادات دوسروں پر زبردستی نہ ٹھونکی جائیں۔ دوسروں کا عقیدہ اس کے مذہبی رہنماؤں سے جانیں، اور اپنا عقیدہ خود بیان کریں۔ دوسروں کی مقدس شخصیات کا احترام کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ باہمی مشترکات پر زور دیا جائے۔ عدل وانصاف اور عقائد کا احترام یقینی بنایا جائے۔ روزگار کے مواقع ہر ایک کے لیے یکساں میسر ہوں۔ کرپشن نہ ہو، دینی تعلیمات کی تشریح و توضیح مزاج کے مطابق نہ ہو، ہو بہو دینی تعلیمات نسل نو تک منتقل کیے جائیں۔ کسی کی عزت نفس مجروح نہ کیا جائے۔ مذہبی رسوم اور عبادات، طور طریقے اور اعمال معبد خانوں تک محدود کیے جائیں۔ دوسروں کے گھر میں جھانکنے کی روش سے گریز کیا جائے۔

مثبت اثرات کا خلاصہ یہ ہے۔ معاشرے میں امن وامان اور آشتی عام ہوگی۔ ہر انسان آزادی کے ساتھ اپنے عبادات انجام دے گا۔ اور تصادم پیدا نہ ہوگا۔ غلط فہمیاں دور ہونگیں، افہام و تفہیم کی فضاء قائم ہوگی۔ بہت سے معاملات مل

بیٹھ کر حل کرنے کا موقع ملے گا۔ کسی کے جذبات مجروح نہیں ہونگے، معاشرے کی ترقی میں ہر ایک کا حصہ ہوگا۔ ظلم ختم ہوگا۔ میرٹ بحال ہوگا۔ تعلیم عام ہوگی، جہالت کا خاتمہ ہوگا۔ ورکشاپ کے آخر میں ایک اعلامیہ ''امن برائے انسانیت'' پڑھ کر سنایا گیا اور تمام شرکاء نے مکمل تائید کی۔ اس کا متن یہ ہے۔

ہم تمام، جو اس اعلامیہ کے دستخط کنندگان ہیں، انسانیت، معاشروں اور اقوام کو امن o اور بھائی چارے کا پیغام دیتے ہیں اور تمام لوگوں کو آپس میں محبت، اخوت، عظمت، تحریم و تکریم اور باہم عدل وانصاف کی دعوت دیتے ہیں۔

اگرچہ ہم مختلف مذاہب، عقائد، ثقافت اور معاشروں میں اختلافات پاتے ہیں، تاہم، o ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ تمام لوگوں کو بے شمار حقوق اور اقدار حاصل ہیں جنہیں تمام مذاہب اور عقائد میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں، تاکہ وہ انسانیت o کے ناطے امن اور باہمی ہم آہنگی کے ساتھ مل کر رہ سکیں۔

ہم دہشت گردی کو کھلم کھلا طور پر مسترد کرتے ہیں ((مذمت کرتے ہیں)، کیونکہ ہر o مذہب کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ معصوم لوگوں کے تقدس کا احترام کیا جائے۔

ہم واضح طور پر اسلام کے نام پر کی جانے والی ہر قسم کی دہشت گردی کے خلاف ہیں، o نہ صرف یہ بلکہ ہم اسلام اور دیگر تمام مذاہب کے نام پر کی جانے

والی دہشت گردی کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں، بلکہ کھلم کھلا طور پر مذمت کرتے ہیں۔

جہاں تک پر تشدد کارروائیوں کا تعلق ہے، تمام ممالک کی حکومتوں کو ان کا ازالہ کرنا o چاہیے۔ ہم آج اکٹھے اس لیے کھڑے ہیں کہ تمام مسائل کا پر امن حل تعلیم اور مذاکرات کے ذریعے ممکن بنائیں۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ انسانی حقوق، بنیادی آزادیوں، مرد اور عورت کے درمیان o عدل و مساوات، صلح، عفو در گزر، کشادہ دلی اور یکجہتی جیسی اعلی انسانی قدروں کو فروغ دیا جائے۔

ہم مشترکہ طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ تمام انسان برابر ہیں اور سب کے ساتھ o یکساں عزت و احترام، حلیمی، برد باری، انصاف اور یکجہتی کے ساتھ پیش آیا جائے، کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں سوائے تقوی کے۔

ہم تمام مغربی حکومتوں اور مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ معاشرتی وحدت کو فروغ o دیں، کیونکہ وحدت اور پر امن بقائے باہمی کے حصول کا یہی ایک راستہ ہے۔

ہم دنیا کی تمام حکومتوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ نفرت، تشدد، مذہبی عدم رواداری o اور قومیت پرستی کے خلاف اپنی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کریں۔

،ہم دنیا کی جملہ حکومتوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ غربت و افلاس کے انسداد o

جہالت کے خلاف جنگ، ہتھیاروں کی دوڑ اور قدرتی ماحول کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی جدوجہد تیز تر کریں۔

بہر صورت دو دن پر مشتمل اس ورکشاپ پر ہر مکتبہ فکر کے ذمہ دار لوگوں نے شرکت کی اور اپنے خیالات، احساسات، جذبات بلا کم وکاست بلا خوف وخطر بیان کیے۔ اختتام پروگرام میں کینیڈا کے ڈپٹی کمشنر مسٹر برناڈ نے تمام شرکاء کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور سید عبدالحمید نے ترجمانی کے فرائض ادا کیے۔ راقم الحروف نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور منتظمین و مہمانوں کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور انہیں دعوت دی کہ آئندہ بھی ایسے پروگراموں کا انعقاد یقینی بنایا جائے تاکہ ہمیں مثبت فوائد حاصل ہوں اور مل بیٹھ کر اپنے مسائل سلجھانے کا موقع ملے۔

ہفت روزہ جی بی پوسٹ، خدشات و تجاویز

ہفت روزہ جی بی پوسٹ (ویکلی گلگت بلتستان پوسٹ) کا پہلا شمارہ دیکھتے ہی ذہن کے نہاں خانوں میں کچھ خدشات اور چند تجاویز گھومنے لگیں۔ نشر و اشاعت کے حوالے سے۔برادرم منیر جوہر کے ساتھ اس حوالے سے کافی مشاورت بھی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم جی بی پوسٹ کے حوالے سے باقاعدہ کوئی تفصیلی گفت و شنید اور نشست نہیں ہوئی۔ گلگت بلتستان کی صحافت سے کسی نہ کسی طریقے سے نتھی رہتا ہوں اس لیے اس کے نشیب وفراز کے متعلق کچھ انفارمیشن بھی رکھتا ہوں۔ کئی اخباری مالکان سے صحافتی دعا و سلام ہے اس لیے بڑی حد تک ان کے کاروباری مسائل سے آگاہ بھی ہوں۔ اس میں دورائے نہیں کا اخبار ایک جاندار قسم کی صنعت کا روپ دھار چکا ہے۔اخباری مالکان کی سوچ نشری و صحافتی،ابلاغی اور اپنے وظائف سے زیادہ کمرشل ہوچکی ہے۔ کمرشل پر مبنی اس سوچ کے مالکان اپنے معاصرانہ اخبارات و رسائل کو شدید نقصان اور بھاری گزند پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بلکہ ارباب اختیار سے ملکر ان کا راستہ روکنے کی ہمہ جہت کوششوں میں مبتلا رہتے ہیں۔سازشوں کے تار عنکبوت بنتے رہتے ہیں۔ڈمی اخبارات کا نام دے کر بہت سے حقداروں کا حق روکے رکھنے میں اپنے ''کاروبار''کا بھلا وترقی دیکھتے ہیں یعنی اپنے راستے سے کانٹے صاف

کرتے ہیں۔اس غیر مناسب رویے سے کئی اچھے خاصے اخبارات سخت کرائسس کا شکار ہیں اوراشاعت ملتوی ہوچکی ہے۔کاش کوئی حقیقت نگاران تلخیوں سے پردے اٹھائے۔یہاں ایک اور سوچ سختی سے رواج پکڑ رہی ہے کہ اخبارات میں کام کرنے والا عملہ (ایڈیٹر سے سٹی رپوٹرتک) کا شدیداستحصال کیا جاتا ہے۔معاشی استحصال کی ایسی مثالیں بہت کم اداروں میں ملتی ہیں۔گلگت کی صحافت میں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ غیر تربیت یافتہ، جعلی ڈگری ہولڈرز، کم علم اور پرانے پاپیوں نے تربیت یافتہ، ڈگری ہولڈرز اور باخبر نوجوان صحافیوں کا راستہ روکا ہوا ہے جس سے ان کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچنے کے ساتھ ان کی ترقی کے راستے بھی مسدود ہوتے ہیں۔نوجوان قلم کاروں اور صحافیوں کی حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی کا یہ نامناسب رویہ یقیناًمثالی معاشرے کی راہ میں ایک عظیم رکاوٹ ہے اور اخبارات کے نکھار میں بھی ۔یہی حال ادب (نثر و نظم) کے علمبرداروں کا بھی ہے۔وہ تو کسی مبتدی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

جی بی پوسٹ کا چیف ایڈیٹر کہنہ مشق صحافی ہے۔ کئی بڑے اداروں میں صحافتی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ماتحت عملہ کے جذبات سے بھی واقف ہے۔کالم نگاروں کی سوچ سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ خود صحافت کے استاد بھی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ گلگت بلتستان میں ایک دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے والے مکروہ چہروں سے بھی واقف ہیں۔بلکہ کئی ایک کے چہروں میں لگے دبیزپردوں کے

اندر سے جھانک بھی چکے ہیں۔اور ان کے نہاں خانوں میں پنپنے والی استحصالی سوچ سے بھی واقف ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ان تمام مکروہات سے اجتناب کریں گے۔اور اشاعتی اداروں اور ہم عصر اخبارات کے راستے میں کانٹے بچھانے والے کالے بھجنگوں اور سیس ناگوں سے دامن بچاتے ہوئے اپنے پروفیشنل امور انجام دیں گے۔ انشاء اللہ بطور ماحضر چند باتیں ہمارے دل و ماغ میں آئی تو مناسب جانا کے قرطاس ابیض میں اتار دیں، شاید کسی کے کام آ جاوے۔ یہاں تک خدشات کی بات ہے تو اشارۃً وکنایۃً بلکہ استعارۃً ہم نے ماقبل میں ذکر کر دیا ہے۔ میرے سامنے بہت سی مثالیں ہیں کہ کچھ اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور کچھ غیروں کی کارستانیوں سے، اور کافی ساری اخباری مالکان کی اپنی خرمستیوں سے ان کے اخبارات مختلف بحرانوں کا شکار ہوئیں اور بالآخر مکمل بند ہوئی یا اشاعت میں طویل تاخیر ہوئی اور ان کا امیج بری طرح متاثر ہوا۔یہی خدشات جی پوسٹ کے ساتھ بھی لاحق ہو سکتی ہیں بلکہ مگرمچھ کی طرح منہ کھولے انتظار کر رہی ہیں لہٰذا تمام ذمہ دار عملے کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے کہیں نو مولو گی میں بھی اُکھیڑ نہ دیے جاوے یا خود بچھڑ جاوے۔

ہمارا ایک عدد مشورہ فری میں حاضر ہے۔ مشورہ دینے میں کونسا میں حرج ہے۔اور

نہ ہی اس میں کوئی بڑا بجٹ انوال ہے۔ویسے بھی مشورہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس پر عمل نہ کیا جاوے۔بلکہ دیوانے کی بڑ کو مشورہ کے بجائے تجویز ہی خیال کیا جائے کیونکہ مشورہ کا مطلب باہمی تجویز ہے جبکہ یہ ہماری انفرادی تجویز ہے۔ جی بی پوسٹ کے چیف ایڈیٹر اور ایڈیٹر اور ذمہ دار عملے سے گزارش ہے کہ وہ گلگت بلتستان کے جید کالم نگاروں پر مبنی ایک ٹیم تشکیل دیں۔یہ ذہن میں رہے کہ کالم نگار صاحب اُسلوب ادبی و صحافتی سوچ کا مالک'' حیوان'' ہو۔صرف ''حیوان ''ہونا کافی نہیں بلکہ معاشرتی وسیاسی حیوان ہو۔یعنی حیوان ناطق۔ طرز کہن پہ اَڑتا نہ ہو اور آئین نو سے ڈرتا نہ ہو۔چار پانچ افراد پر مشتمل کالم نگاروں یہ کی ٹیم اخبار کو زندہ جاوید رکھنے میں مرکزی کردار ادا کر سکتی ہے۔دبستان صحافت میں کئی ایسے اخبارات تھے جو چند ایک جری اور صاحب اسلوب لکھاری، انشاء پرداز اور خوش نواشاعروں کی وجہ سے ہی زندہ وتابندہ تھے۔معارف اعظم گڑھ، ہفت روزہ البلاغ والہلال ، ہمدرد ، ہفت روزہ چٹان کالوگ شدت سے صرف اس لیے انتظار کرتے تھے کہ معارف میں سید سلیمان ندوی کے علمی مضامین، البلاغ و الہلال میں ابوالکلام آزادکے ادبی شہ پارے، ہمدرد میں ظفر علی خان کی ادبی و شعری چٹکیاں اور چٹان میں بے باک صحافی، صاحب طرز ادیب شورش کاشمیری کی معجزانہ تحریریں ہی انبوہ عام کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھیں۔اور اجتماعی طور پر ان اخبارات و رسائل کو پڑھا جاتا تھا۔کوثر نیازی کا شہاب، نقوش اور ادب لطیف اسی زمرے کے جرائد ہیں۔ موجودہ دور میں

ہفت روزہ ضرب مومن، ماہنامہ ترجمان القرآن اور ماہنامہ الشریعہ بھی مخصوص لکھاریوں اور اصحاب علم کی وجہ سے مرکزِ نگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ہفت روزہ ضرب مومن میں چند جید کالم نگار اور ایک دو تحقیقاتی و تجزیاتی رپوٹیں ہی مقبول عام بننے کا سبب ہیں ورنہ معلومات کے تیز ترین دور میں ہفتہ پرانی خبریں کون پڑھے گا۔ آج تو انگلی دبانے کی دیر ہے کہ پوری دنیا سامنے آجاتی ہے ایسے میں ہفت روزہ اخبارات کو اپنا وقار، معیار اور مارکیٹ ویلیو بنانے اور اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے کچھ نئی راہیں اور انوکھے طریقے اپنانے ہی پڑھتے ہیں۔

ہفت روزہ جی بی پوسٹ کو بھی اخباری صنعت ،اصحاب علم اور عوامی حلقوں میں زندہ رہنے کے لیے فی الحال کالم نگاروں کی ایک مضبوط ٹیم بنانے کی ضرورت ہے۔ اور ساتھ ہی ہر شمارے کے لیے ایک دو جاندار قسم کی نیوز رپورٹس تیار کرنی ہونگی تاکہ عوام و خاص اخبار پڑھنے پر مجبور ہوجائیں۔ ورنہ روزنامہ اخبارات اور انٹرنیٹ کی موجودگی میں ہفتہ باسی خبروں کو کوئی دور سے بھی نہیں دیکھے گا۔ یہاں تک کالم نگاروں کی بات ہے تو جی بی پوسٹ کی ٹیم اگر سنجیدگی سے یہ کام کرنے کی کوشش کریں تو انہیں اچھی ٹیم میسر آسکتی ہے۔ یہ خوب جانتا ہوں کہ جی بی پوسٹ والے فی الحال قلم قبیلہ کو کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں لیکن محبت و شرافت پر مبنی درخواست قلم کاروں کے دل پسیجنے

کے لیے کافی ہے۔ اگر ہو سکے تو منتھلی ایک لنچ پروگرام میں اپنی ٹیم کے قلم کاروں کو جمع کیا جاسکتا ہے اوران کا بھرپور شکریہ ادا کرکے انہیں مزید جذبے سے لکھنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔آج وہی فاتح عالم ہے جو دلوں کو فتح کرے۔کاپی پیسٹ کالم، خبریں اور تحریریں آپ کے اخبار کو تباہ تو کرسکتی ہی زندہ نہیں رکھ سکتی۔آپ مل بیٹھ کر طے کرلیں اور ہر کالم نگار کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کریں، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے اور وہ آپ کے ڈیمانڈ کے مطابق گلگت بلتستان کے سلگتے مسائل، معاشرے کے رِستے ناسور، ڈوبتی ناؤ، امید کی کرن، پامالیِ حقوق نسواں، ناگفتہ بہ حالات و واقعات اور ان جیسے بے شمار موضوعات کے ذریعے اصلاح معاشرہ، معلومات کی فراہمی اور اخبار کی زندگی کا بیڑہ اٹھائیں گے۔رہی بات تحقیقی نیوز رپوٹس کا تو اس کے لیے آپ خود ہی کوئی لائحہ عمل طے کرسکتے ہیں، باہر سے آدمی ہائر (hire) کریں گے تو وہ مہنگا پڑ سکتا ہے۔اپنے تلامذہ کو یہ اسائنمنٹ دیا جاسکتا ہے۔ رہا اداریہ : تو اداریہ کسی بھی جریدے کا چہرہ ہوتا ہے۔ جس کا چہرہ بے نور ہو اس کی تمام خوبیاں ماند پڑتی ہیں ویسا آج کل عالمی مقابلہ حسن کے لیے چہرے کے علاوہ کچھ اور لوازمات بھی ضروری سمجھے جاتے ہیں جیسے امن کے نوبل انعام کے لیے امن کے علاوہ کچھ اور بھی ضروری ہے۔ خیر اداریہ اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ ایوانوں میں ڈسکس ہونے لگے۔ کیا ایسا ہوگا؟۔''جان چھڑاؤ'' ادریوں سے قاری بھی جان ہی چھڑاتا ہے۔

میرے نزدیک صحافت ایک مقدس پیشہ ہے۔ صحیفے آسمانوں سے اترتے ہیں تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا مقدس پیشہ ہے۔اس مقدس پیشے کی لاج رکھنا صحافت سے منسلک ہر آدمی کا فرض ہے۔ مگر یہاں تو اس کو جنس بازار بنایا جاچکا ہے۔ گلگت بلتستان کی صحافت کی جب بھی تاریخ لکھی جاوے گی تو جی بی پوسٹ کے مدیران کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ میری گزارش ہے کہ آپ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اخبار پر آنچ نہ آنے دیں۔جو کہنا ہے ڈنکے کے چوٹ پر کہا جاوے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل آپ کا موٹو ہونا چاہیے۔جھکنا آپ کی سرشت میں ہی نہ ہو، حق پر ڈٹنا آپ کا منشور ہو۔ مالی مشکلات آپ کا راستہ نہ روکتی ہو۔اصحاب اقتدار اور ان کے چیلوں کے مظالم آپ کے ارادوں کو نہ بدلنے پاوے اور ڈالر کی جھونک ضمیر کو نہ خریدنے پاوے۔آپ کو ایک مرد بیمار کے بجائے ایک مرد جری و بے باک کا کردار ادا کرنا ہوگا یعنی ''یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک''۔

میرا ایک مسئلہ ہے۔ میں نے قنوطیت سے بھاگنے بلکہ دور بھاگنے کا حلف اٹھا رکھا ہے۔ غربت میں نام کمانے کے گُر سے واقفیت حاصل کی ہے۔ میرا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا کے اکثر عظیم ترین لوگ غریب جھونپڑیوں اور جھگیوں سے اُٹھے ہیں۔خدا کو سجدہ کرنے والے اور خانہ خدا کو آباد کرنے والے بھی غریب

ہی ہیں۔امید سے دنیا قائم ہے۔ تمنائیں ہر کسی کا حق ہے۔ کم سے کم امیدوں اور تمناؤں پر تو اقوام متحدہ پابندیاں عائد نہیں کر سکتی۔ سو میں بھی یہ امید اور تمنا کرتا ہوں کہ جی بی پوسٹ پھلے پھولے اور برگ وبار نکالے۔ کیا میں اپنے دوست منیر جوہر، محمد سلیم خان اور متعلقہ احباب کو یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ وہ شورش کاشمیری کے ان اشعار کو اپنا منشور اور پالیسی بنائے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے سینکڑوں مسائل ہیں لیکن پھر بھی۔ بہر صورت شورش کاشمیری نے آزادی صحافت پر ایک نظم کہی ہے اس کے چند بند آپ کی نظر کرتا ہوں ۔ شاید کہ تیرے دل میں اتر جاوے میری بات:

تم قلم روک رہے ہو پر تمہیں یاد رہے
ہم وہاں ہیں کہ سفینوں سے لہو ٹپکے گا
دعوتِ فکر کا رکنا ممکن نہیں صاحب
شہریاروں کی جبینوں سے لہو ٹپکے گا
ہم قلم کار کسی خوف سے دبنے والے نہیں
ہم یہاں پرورشِ دار ورَسن کرتے ہیں
پابہ زنجیر چلے جاتے ہیں مقتل کی طرح
اپنے ہی خون سے مینائے سفر بھرتے ہیں

واشنگٹن میں گلگت بلتستان کے خلاف سازشیں

دل کرتا ہے کہ جو دل و دماغ میں ہے سب کچھ انڈیل دوں مگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ! دکھڑا کہاں سے شروع کروں؟ کس کس کا ماتم کروں ؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری دھرتی کے پیر و جوان باہم دست گریباں ہیں، چار سو مایوسی ، بے چینی، افرا تفری،
اضطراب، بد دیانتی، کسمپرسی ، بدحالی و بیماری ، میرٹ کی پامالی اور کرپشن کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ جس کے ہاتھ میں خنجر اور کلاشن کوف ہو وہی اپنی بات منوائے اور وہی سپید و سیاہ کا مالک ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کلاشنکوف اور اسمبلیوں کو اڑانے کیلئے بم کہاں سے آتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں بتایا جاتا ہے نہتے اور غریب عوام کو؟ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ امپورٹڈ ہیں یا ایکسپوٹڈ؟ اہل اقتدار لوگوں کی خواہشوں اور امنگوں سے بے پروا ہو کر صرف اپنا مستقبل محفوظ کرنے میں مصروف کیوں نظر آتے ہیں؟
قارئین ! مانا کہ مذہب ازم کے اثرات و واقعات کے نتائج کارامد ثابت نہیں ہوئے مگر سیکٹر ازم، علاقہ ازم، زبان ازم اور قبائل ازم کا کیا علاج کیا جائے؟ تسلیم ہے جی کہ ! مسجد و منبر کے داعیان کی وجہ سے حالات مخدوش ہو رہے ہیں مگر یہاں تو اسمبلی میں بیٹھ کر قانون سازی کی گتھیاں سلجھانے والے بیخ

پا ہیں اور مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں اور وہ دھمکیاں دے رہے ہیں جو القاعدہ والے بھی امریکہ کو نہیں دیتے۔ افسوس اس بات کا نہیں کہ گلگت بلتستان اسمبلی مچھلی بازار بنی ہوئی ہے مگر دکھ اس بات کا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے، انصاف دینے والی کرسیاں، حالات کی رپورٹنگ کرنے والی ایجنسیاں اور حکمراں طبقہ کیوں خاموش ہیں؟ ان کے لب ہلتے کیوں نہیں ہیں؟ اصل حقائق سامنے کیوں نہیں لائے جاتے ہیں؟ سب کو جان کے لالے کیوں پڑتے ہیں؟ کھوکھلے نعرے لگانے والے تلخ حقائق کا ادراک کیوں نہیں کرتے ہیں؟ جن کو ادراک ہے ان سے استفادہ کیوں نہیں کیا جارہا ہے؟ گراونڈ ریالٹیز کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ باشعور اور سمجھدار سیاسی لیڈرشپ کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ مشاورت کا عمل کیوں کھٹالی میں پڑا ہوا ہے؟ مانا کہ گلگت بلتستان کا میڈیا اتنا Up-date نہیں مگر اتنا بے بہرہ بھی تو نہیں، توپھر کیوں اصل حقائق منصہ شہود پر نہیں لائے جاتے ہیں؟ منظر دھندلایا ہوا ہے۔ انتقام اور نفرت کی سیاست جوبن پر ہے تمام علاقائی کنٹرول چند سرپسند عناصر کے ہاتھ میں ہے جو دل چاہیے وہی کر گزرتے ہیں۔ مختلف گروپوں کو تیر وتفنگ کی ٹریننگ دینے کیلئے فنڈ کہاں سے آتا ہے؟ مرکزی اور مہنگی زمینیں خرید کر اجارہ داری کیوں قائم کی جارہی ہیں؟ ہر سرکاری و غیر سرکاری ادارے کو کیوں یرغمال بنایا ہوا ہے؟ اس پر مستزاد تیر و تفنگ اور توپ و ٹینک، سب و شتم اور لعن و طن۔۔۔۔۔ عجب طرفہ تماشہ ہے کہ معصوم بچے کے لہو کی بھی لاج نہ رکھ کر، خون آشام

سیاست کرکے اقتدار کی راہداریوں میں براجمان بڑے سرکار کیوں کردار ادا کرنے سے قاصر ہے؟ اور جن اداروں کا نام لیکر ان کی کارکردگی کا ذکر کرنا تختہ دار کو گلے لگانے کے مترادف ہے وہ کیوں تماشائی بنے بیٹھے ہیں؟ کیا اس خونی کھیل کا وہ خود حصہ تو نہیں؟ ہر ایک ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا کے بزعم خویش کیوں مسیحا بنا بیٹھا ہے، کیا وہ اپنے مخصوص خول سے نکل کر انسانیت کی بنیادوں پر نہیں سوچ سکتا؟ امن اور یکجہتی کے نام پر ووٹ لینے والے کیوں ببانگ دہل امن کو تاراج کر رہے ہیں؟ اور یکجہتی کی دھجیاں اڑا رہے ہیں؟ نا طقہ سر بیگریباں ہے کیا کہیں۔

یہ بات درست ہے کہ اختلافِ رائے جمہوری معاشروں کی تعمیر و ترقی کیلئے نئے نئے راہ دکھلاتا ہے اس لئے تو اختلافِ رائے کو خیر کا باعث قرار دیا گیا۔ اختلاف وہ جو اصولوں پر مبنی ہو، مخالفت برائے مخالفت نہ ہو۔ بد قسمتی سے گلگت بلتستان میں اس سوچ کے حامل شاید یہی دو چار لوگ ہوں۔ وہاں تو سیاست میں زیادہ تر ذاتی مفادات کا عنصر حاوی ہے۔ جس کی وجہ سے امن وامان اور جمہوری اقدار وہ برگ بار نہیں لا سکی جو باسیان گلگت بلتستان کے لئے ناگزیر ہے۔ گلگت بلتستان کے تمام سیاستدان بڑی اصولی اور اچھی باتیں کرتے پھر رہے ہیں اور مذہبی لیڈر بھی قوم کے غمگسار دکھائی دیتے ہیں۔ امن اور تعمیر و ترقی کے راگ الاپتے نہ تھکتے ہیں مگر ان کا عمل بالعموم مختلف ہوتا ہے۔

سیاسی و

مذہبی لیڈروں اور اسٹیبلشمنٹ کے کالے بھجنگوں کے قول و فعل میں تضاد کی وجہ سے پوری قومی زندگی متاثر ہے۔ لوگوں میں بے چینی اور اضطراب غالب ہے۔

اس میں دورائے نہیں کہ مفاہمت کی پالیسی اور مل جلکر علاقائی معاملات کو سلجھانا اصولی طور پر قابلِ تعریف مدبرانہ عمل ہے۔ مگر یہ کام ذاتیات اور مسلکی و گروہی مفادات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اس کیلئے حکومت ، اپوزیشن اور تمام مذہبی و علاقائی لیڈروں کا فرض بنتا ہے کہ وہ قانون کی پاسداری کا سختی سے پابندی کریں۔ اگر تمام پارٹیاں،اور ان کے لیڈر نیک نیتی سے خوفِ خدا اور خوفِ قانون اور علاقائی واسلامی روایات کی پابندی کریں تو کسی کو کسی سے سڑکوں اور گلیوں میں لڑنے یا اسمبلیوں کے ایوانوں کو تماشاگاہ بنانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خوفِ خدا اور خوفِ قانون زندگی کا جزلاینفک اور منشور کا لازمی حصہ ہو۔ تب دیکھیں، امن کی آشا کیسے پابہ رکاب نہیں ہوتی ہے۔

روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد کی ایک خبر گزشتہ کئی دنوں سے میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔ جس کی طرف توجہ سینئر صحافی عبداللہ صاحب نے کرائی،اور ہمارے بزرگ حاجی سمیع اللہ صاحب سابق چئرمین زکواۃ و عشر پاکستان کی دلی خواہش ہے کہ جلد از جلد ان سازشوں کو طشت ازبام کیا جائے۔ خبر کی تفصیل کچھ

یوں ہے کہ '' گلگت بلتستان کو الگ کرنے کی سازش، واشنگٹن میں علیحدگی پسندوں کا خصوصی اجلاس، اجلاس میں پیپلز پارٹی کی سابق رکن ملکہ بلتستانی نے بھی شرکت کی۔ واشنگٹن میں امتیاز حسین گلگتی نامی شخص متحرک ہے۔ جس نے 4 فروری کو جان ہاپکنز یونیورسٹی واشنگٹن میں ایک فورم کا انعقاد کیا جس کا موضوع گلگت بلتستان میں چین کا بڑھتا ہوا اثرورسوخ تھا۔ بھارتی کشمیری ممتاز خان ایگزیکٹیوڈائریکٹر، انٹرنیشنل ڈائکٹر فار پیس اینڈ ڈیموکریسی نے پاکستانی قوم اور فوج کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور جنوری میں ہونی والی ایک خفیہ میٹنگ میں پاکستان سے آئی ہوئی پیپلز پارٹی کی سابقہ سرگرم رکن ملکہ بلتستانی سرفہرست ہے جنھوں نے اجلاس سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے گلگت بلتستان کی علیحدگی کا نعرہ لگایا، وہ اپنے گورنر نہ بنائے جانے پر سخت مایوس ہیں۔ نیویارک میں مقیم چند پاکستانی لوگ اپنے اپنے مفادات کے باعث پاکستان دشمنی کے راستے پر چل پڑے ہیں (4 مارچ 2011)۔

قارئین آپ نے اندازہ لگایا کہ دھرتی بے اماں کے بارے کہاں کہاں سازشیں ہورہی ہیں۔ ملکہ بلتستانی سے انتہائی ادب واحترام کے ساتھ عرض ہے کہ کیا وہ اپنی جوانی کے حسین ایام اور دورِ شباب کو بھول گئی ہیں جس کی ساری توانائیاں پیپلز پارٹی کیلئے وقف ہوا کرتیں تھیں۔ اور پیپلز پارٹی وفاق کی علامت ہوا کرتی ہے آج بھی۔ کیا ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے ساتھ

بیتے دنوں کی حسین یادیں اسطرح فراموش کی جانی چاہیے ؟ لیاقت انٹر نیشنل لائبیریری کراچی کے آڈیٹوریم ہال میں ایک پروگرام میں محترمہ ملکہ بلتستانی بطور چیف گیسٹ مدعو تھیں۔ مجھے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کیلئے آخر میں ملکہ سے پہلے بلایا گیا تھا۔25 منٹ کے لگ بھگ تقریر میں، میں نے گلگت بلتستان کی تمام صورتحال سامعین کے سامنے رکھی تھی ۔ میں نے جنگِ آزادی گلگت بلتستان کے تاریخی ہیروز بالخصوص قاضی عبدالرزاق مرحوم اور انکے تلامذہ اور صوبیدار بابر خان کی لازوال خدمات کو تفصیل سے دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا تھا اور میرے بعد محترمہ نے 4 دفعہ نام لیکر میری تائید کی تھی اور کہا تھا کہ '' جنگِ آزادی کا منظر محترم حقانی نے جس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے وہ اسی کا ہی خاصہ ہے۔ بہت ساری باتیں جو اب تک مجھے معلوم نہیں تھیں آج حقانی کے ذریعے معلوم ہوئی ۔ میں ان کے خیالات سے مکمل اتفاق کرتی ہوں'' یہ باتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ مگر آج محترمہ کے حوالے سے مختلف اخباری خبریں اور ٹی وی ٹاک شوز دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ محترمہ کن کن کاموں میں لگی ہوئی ہے اور کیا گل کھلانے جارہی ہے۔ کیا ہی بات ہوگی کہ ملکہ بلتستانی اور اس کے متعلقین ان تمام خبروں کی تردید کرکے خود کو حقیقی معنوں میں ''بلتی'' ہونے کا ثبوت دیں۔ اگرچہ بلتستان کے لوگ ان کو بلتی ہی تسلیم نہیں کرتے ہیں ۔ کیونکہ ملکہ بلتستانی کا اصل نام حسینہ بانو ہے اور وہ شملہ میں پیدا ہوئی ہے۔ کم سنی میں قیام

پاکستان کے بعد کراچی آئی اور بھارتی صوبہ بہار کے ایک مہاجر سمیع جعفری سے شادی کی اور تاحال کراچی میں مقیم ہے۔ ہماری ملکہ بلتستانی سے اتنی گزارش ہے کہ نیویارک اور واشنگٹن میں چند ڈالروں کے عوض دھرتی ماں گلگت بلتستان کو بیچنے اور پاک افواج کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے بے ضمیروں سے برات کا اعلان کریں اور خود کو حقیقی معنوں میں بلتی کہلوائے۔ ورنہ آنے والے دنوں میں ملکہ بلتستانی گلگت بلتستان میں ایک ناپسندیدہ نام ہوگا جو یقینا اس کے لئے نیک شگون نہیں۔ محترمہ کو گورنر نہ بنایا جانے پر اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ عالم اسلام کا اجتماعی دشمن، نہتے مسلمانوں کا قاتل، بین الاقوامی لٹیرا، وقت کا فرعون، دجالی ریاست کا علمبردار امریکہ کے دل واشنگٹن میں جاکر علیحدگی کا مطالبہ کریں۔ کیا اپنے بھائی سے کسی بات پر اختلاف ہو تو چور، ڈاکو اور دشمن سے مدد لی جا سکتی ہے؟ کیا یہ اخلاقا، قانونا اور شرعا جائز ہے؟ یقینا نہیں۔۔۔ گورنری اور وزارت علیا تو" شاہوں" کو ملتی ہے جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہوتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو گلگت بلتستان کے دونوں شاہوں (کرم شاہ اور مہدی شاہ) کو دیکھ لیجے۔ آپ تو ایک متوسط خاندان کی خاتون ہو، آپ کو ایسے خواب زیبا نہیں دیتے۔ بہر صورت اس موضوع پر لکھنے کیلئے دل و دماغ جتنی جگہ ہے اتنی کاغذ کے ان اوارق میں کہاں ہے اور نہ سردست اسکی ضرورت ہے۔ فی الحال اسی پر اکتفاء کیا جائے۔

نوٹ: یہ تحریر 2011ء کو اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ حقانی

گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسوسی ایشن، اسلام آباد

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں نے ایک ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا۔ جب میں نے اخباروں میں یہ خبر دیکھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس میں دو رائے نہیں کہ گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوان ملک کے ہر علاقے میں اپنی صلاحتیوں کے جھنڈے گاڑھے ہوئے ہیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اتحاد نہیں ہے' ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں جس کی وجہ سے ان کو کئی مسائل کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم گلگت بلتستان یونین آف جرنلسٹ کراچی کے پلیٹ فارم سے کام کرتے تھے تو ہمیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں نے اس یونین کا قیام عمل میں لایا تھا۔ اس کے ابتدائی ارکان میں ڈیلی اسلام کے چیف رپورٹر' سنیئر صحافی و کالم نگار محترم عبدالجبار ناصر صاحب، روزنامہ بانگ سحر کے چیف ایڈیٹر جناب ڈی جے مٹھل صاحب اور برادرم شہاب الدین غوری صاحب' وائس آف گلگت بلتستان کے چیف ایگزیٹیو جناب ایس ایس ناصری اور دیگر شامل تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اس یونین کو زندہ رکھا۔ ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء کو اس یونین میں بطور سینئر نائب صدر کی حیثیت سے راقم الحروف کو بھی کام

کرنے کا موقع ملا۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور کتنی سخت گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب بھی یہ یونین فعال ہے۔اب بھی اس یونین میں میرے کئی جونیئر دوست سرگرم ہیں۔ فیض اللہ فراق، ثمر عباس قذافی، اسلم انقلابی، فیروز خان، عباس وفا، ایس ایس ناصری، ریاض الدین، جان عالم اور اسلم شاہ ہنزائی وغیرہ اس یونین کے اہم حصہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع عثمانی، قاسم شگری، ریاض علی یاسینی، صادق حسین صادق ، رحمت کریم ، تعلیم شاہ، علی غلام اب بھی کام کر رہے ہیں۔

ملک کے دوسرے حصوں کی طرح اسلام آباد میں بھی گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے صحافی، بہترین صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ گلگت بلتستان کے اکثر اخبارات اسلام آباد/راولپنڈی کے طباعتی مراکز سے پرنٹ ہوتے ہیں اور ان کے ہیڈ آفس بھی عملاً اسلام آباد/راولپنڈی میں واقع ہیں۔ اور ایک محتاط اندازے کے مطابق گلگت بلتستان کے صحافیوں کی اکثریتی تعداد بھی وہاں پر مقیم ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا فورم ہو جہاں گلگت بلتستان کے اہل قلم اور صحافی حضرات جمع ہوں اور آپس کے اشتراک وتعاون سے صحافتی امور کو انجام دیں۔ اس حوالے سے گزشتہ کافی عرصے سے مشاورت جاری تھی۔ جب میں اسلام آباد میں تھا تو اس حوالے سے صحافی دوستوں سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اب جب

گلگت بلتستان کے صحافیوں کی ایسو سی ایشن کے قیام کا علم ہوا تو دل خوشی کے بلیوں اچھل پڑا۔بڑی خوش کن بات یہ ہے کہ اس میں باخبر صحافی شامل ہیں۔ گلگت بلتستان کے صحافیوں کی ایک بڑی ٹیم جمع ہوئی ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ اسلام آباد/راولپنڈی میں گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کو قدر کی نگاہ سا نہیں دیکھا جاتا تھا' وجہ صاف ظاہر تھی کہ ان میں اتحاد و یکجہتی نہیں تھی۔ بکھرے پڑے تھے۔ ان کی آواز اسلام آباد اور اس کے گرد نواح میں دب کر رہ جاتی تھی۔ ثمر عباس قذافی اور برادرم عالم نور حیدر (سینئر نائب صدر ایسو سی ایشن) کے ساتھ کئی دفعہ اسلام آباد پریس کلب میں اس حوالے سے بات چیت رہی' وہاں کے صحافیوں کا رویہ بھی دیکھا ان کا رویہ مجموعی طور پر کوئی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ تاہم اب ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔' گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسو سی ایشن کے پلیٹ فارم سے گلگت بلتستان کے صحافی اب جہاں کہیں بھی جائیں گے تو ان کو ان کا جائز مقام مل جائے گا۔ ایسو سی ایشن کے قیام میں برادرم رشید ارشد (ایڈیٹر روزنامہ ہمالیہ ووائش چیئرمین ایسو سی ایشن) کا مرکزی کردار ہے۔ میں ایسو سی ایشن کے تمام عہداروں جناب اکبر حسین اکبر' رشید ارشد' کریم مدد' عالم نور حیدر'شبیر حسین' شفقت حسین' زوہیب اختر' علی شیر' منظور حسین اور گورننگ باڈی کے تمام ممبران کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام تحسین پیش کرتا ہوں اور ان سے امید کرتا ہوں کہ وہ صحافتی اقدار کو کبھی بھی پامال نہیں ہونے دیں گے اور صحافت میں شرط اول غیر جانبداری ہے'

انشاء اللہ وہ غیر جانبداری سے اپنے فرائض کو انجام دیں گے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھونگا کہ گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسو سی ایشن کو اپنے لیے ایک الگ ضابطہ اخلاق اپنے علاقائی ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دینا چاہیے۔ کیونکہ ہمارا علاقہ ہر لحاظ سے مختلف حیثیت کا حامل ہے۔ راقم الحروف نے ۲۰۰۹ء کو گلگت بلتستان یونین آف جرنلسٹ کراچی کے لئے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا تھا اس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس ' مدیران اخبار اور دیگر صحافتی انجمنوں سے اپنی ساکھ کو برقرار رکھتے ہوئے مثبت (CPNA) کی تنظیم تعلقات استوار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ گلگت بلتستان کی حکومت سے بھی گزارش کرونگا کہ اس نوخیز صحافتی ایسو سی ایشن کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرے' یاد رہنا چاہیے کہ انہی صحافیوں کی وجہ سے بہت سے عام لوگ معروف و مشہور ہوئے ہیں ورنہ ان کو ان کے محلے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا، اب وہ بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں ' لہٰذا اچھے دنوں میں اپنے دوستوں کو ضرور یاد کیا جانا چاہیے۔ میں جب کراچی میں تھا تو گلگت میں مقیم صحافیوں اور اہل قلم سے مستقل رابطے میں تھا' ایک دلی خواہش تھی کہ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے علاقے میں جاکر صحافتی و ادبی برادری کے ساتھ مل کر کوئی خدمت انجام دوں گا تاہم یہاں آکر مجھے اس حوالے سے کافی مایوسی ہوئی' بے مروتی و بے التفاتی پر مبنی انداز کو دیکھ کر دلبرداشتہ ہوا اور دل نے کہا کہ ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں' کیونکہ کچھا

تیرا امکان ہے تو خیال کر'' تاہم گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسو سی ایشن کو چاہیے کہ گلگت بلتستان میں مقیم تمام صحافتی و ادبی انجمنوں سے مضبوط بنیادوں پر تعلقات استوار کرے اور کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے نوجوان صحافیوں سے بھی روابط میں رہے اور ان کے ساتھ اپنے مسائل شیئر کرے اور ان کی بھرپور رہنمائی کرے۔ مجھے امید ہے کہ اس حوالے سے گلگت بلتستان جرنلسٹ ایسو سی ایشن اسلام آباد اہم کردار ادا کرے گی' اور لیڈری اور رہبری کا تاج اپنے سر لے گی۔ کیونکہ اس یونین میں میرے دوست رشید ارشید' جناب اکبر حسین اکبر (ریجنل انچارج پی ٹی وی) جناب کریم مدد (سینئر رپورٹر اے ٹی ٹی) اور برادرم عالم نور حیدر جیسے پڑھے لکھے لوگ شامل ہیں جو صحافتی رموز و اوقاف کو اچھے طرح جانتے ہیں۔

میں اپنے ان دوستوں سے گزارش کرونگا کہ وہ صحافت کی اعلی اقدار کا ہر حال میں پاس رکھے' صحافت ایک مقدس پیشہ ہے' اور اس پیشے کا لاج رکھنا بھی صحافیوں کی ذمہ داری ہے۔ مرحوم الطاف حسین حالی نے مسدس حالی میں بے ضمیر قلم کاروں اور صحافیوں کے لیے ایک نظم رقم کی ہے۔ تو صحافی برادری سے گزارش کرونگا کہ وہ حالی کے بیان کردہ مذموم نکات سے بچتے ہوئے اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ ملاحظہ ہو۔

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی

جگر جس سے شق ہو، وہ تحریر کرنی
گنہ گار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تذلیل کرنی
یہ ہے صحافیوں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت، ایک جھلک

جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت بلتستان کا اولین دینی ادارہ ہے۔ گلگت بلتستان پاکستان کے انتہائی شمال میں ایک بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں طائفہ منصورہ کے ساتھ طوائف ضال کی کثرت ہے۔ گلگت بلتستان کا پاکستان کے ساتھ مواصلاتی تعلق بہت کمزور ہے جس کے وجہ سے پاکستان کی بڑی شہروں سے اس علاقے کا رشتہ تقریباً کٹا ہوا ہے۔ اس دورافتادہ علاقے میں جامعہ نصرۃ الاسلام کے نام سے ایک ادارہ گزشتہ ساٹھ سالوں سے دینی و ملی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جامعہ نصرۃ الاسلام بھی پاکستان بھر کے دینی اداروں کی طرح، دینی درس گاہوں کے اس مقدس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو خطہ برصغیر میں اللہ کے کچھ برگزیدہ بندوں نے انگریزی استعمار کے ظلم و ستم اور تاریک رات میں دین کی شمعیں روشن رکھنے کے لئے قائم کیا تھا۔ اس سلسلۃ الذہب کا اولین ادارہ ''دارالعلوم دیوبند ہندوستان'' ہے جس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحم اللہ علیہما اور ان کے رفقائِ کار ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی آزادی کے لیے بدیسی استعمار کے خلاف جہاد میں بنفس نفیس حصہ لیا تھا۔ جامعہ نصرۃ الاسلام بھی دارالعلوم دیوبند، مظاہرالعلوم سہارنپور، جامعہ امینیہ دہلی، دارالعلوم ندوۃ العلمائ، مدرسہ

رحیمہ، الجامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن، جامعہ دارالعلوم کراچی، جامعہ فاروقیہ کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی طرح ایک خالص دینی و علمی ادارہ ہے جو اکابر علمائے کرام کی منہج و فکر کو لے کر چل رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مزاج و ہم مسلک و مشرب مدارس کا ایک ہی موٹو ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ کا لایا ہوا دین اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ مل جائے۔اس کے لیے یہ دینی مدارس قائم ہوئے اور جامعہ نصرۃ الاسلام بھی انہی میں ایک ہے۔ اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحم اللہ علیہ کا لگایا ہوا چمن ہمیشہ باغ و بہاراں اور سرسبز و شاداب رہے۔دارالعلوم دیوبند سے علم و فضل، علمی تبحر، اتباعِ سنت اور زہد و تقوی کے جو آفتاب و ماہتاب نمودار ہوئے ان کے پاکیزہ کردار سے صحابہ وتابعین کی حسین یادیں تازہ ہو جائیں۔

جامعہ نصرۃ الاسلام کا قیام حضرت مولانا قاضی عبدالرزاق رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء نے انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ 1953 میں شہر گلگت کے ایک صحراء ''کنوداس'' میں رکھا۔ ابتداءً انجمن نصرۃ الاسلام کے نام سے کام شروع کیا گیا۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گلگت بلتستان میں تین بڑے فرقے، اسماعیلی، اہل تشیع اور اہل سنت والجماعت بستے ہیں، اٹھائیس ہزاروں مربع میل پر پھیلے

اس علاقے میں ایک اور فرقہ نور بخشی کے نام سے بھی موجود ہے۔ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اہل تشیع حضرات نے پاکستان، ایران اور دیگر خلیجی ممالک میں اپنے ہم مسلک لوگوں، این جی اوز، رفاہی اداروں اور حکومتوں سے روابط پیدا کیے۔ جو انہیں تعلیمی، سیاسی، مذہبی، اور دیگر امور میں سپورٹ کر رہے ہیں۔ اسماعیلیوں کی بھی گلگت بلتستان میں خاطر خواہ تعداد ہے۔ ان کا مذہبی پیشوا شاہ کریم آغا خان پیرس میں مقیم ہے۔ شاہ کریم آغا خان نے گلگت بلتستان کے اسماعیلیوں کی ہر قسم کی معاونت عرصہ دراز سے جاری رکھی ہوئی ہے۔ اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے بنوائے ہیں۔ جگہ جگہ سکول اور کالجز کا اہتمام کیا ہے۔ بہترین صحت کے ادارے بنوائے ہیں۔ رفاہی، ثقافتی اور دیگر طریقوں سے زندگی کے ہر شعبے میں انہیں سپورٹ کی جاتی ہے۔ اور گلگت بلتستان کو اسماعیلی ریاست بنانے کی تیاریاں مکمل کی گئی ہیں۔ بہت کم عرصے میں دور فاطمی کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اور چوتھا طبقہ نور بخشی ہے۔ ان کی حالت بھی کوئی سازگار نہیں۔ انہی حالات میں فاضلین دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاضی عبدالرزاق رحمہ اللہ کی سرپرستی میں جمع ہوئے اور چار سو کنال سے زائد رقبہ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قاضی عبدالرزاق کے رفقاء کار میں مولانا گل شیر خان، مولانا نذیر اللہ خان، مولانا حبیب اللہ دامت فیوضہم، مولانا لقمان حکیم حفظہ اللہ اور دیگر علماء تھے۔ تمام تر مالی بے بضاعتی اور بے مایہ گی کے باوجود اس تین سو کنال اراضی پر ابتدائی طور پر دو بلاک پر

مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کی گئی۔ اہل سنت عوام کے لیے ایک بڑا عیدگاہ بھی تعمیر کروایا گیا جو آج تک مرکزی عیدہ گاہ کے طور پر استعمال میں ہے۔ اسی اراضی میں ایک اجتماعی قبرستان بھی بنایا گیا جہاں اہل سنت عوام اپنے مرحومین کو دفناتے ہیں۔ دس کنال اراضی تبلیغی جماعت کو گلگت بلتستان کا مرکز بنانے کو دیا گیا جہاں آج ایک بڑی مسجد اور عمارت تعمیر کے مراحل سے گزر کر تیار ہے۔ اب بھی جامعہ کے پاس جامعہ کی حدود سے لے کر پہاڑی کے آخری سرے تک ہزاروں کنال سے زیادہ کی زمین موجود ہے۔ جس پیں وسائل نہ ہونے کی وجہ سے تعمیراتی کام آہستہ آہستہ جاری ہے۔ اس اولین پرانی دو بلاکوں پر مشتمل عمارت پیں گلگت بلتستان کے دور دراز دیہاتوں سے گلگت آکر عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے ہاسٹل کا انتظام کیا گیا۔ یہ غریب طلبہ دن کو سکول وکالج جاتے اور باقی سارا وقت جامعہ کے ہاسٹل میں رہ کر تعلیم و تربیت سے اراستہ ہوجاتے۔ قاضی عبدالرزاق رحمہ اللہ کے ہونہار شاگرد مولانا حبیب اللہ حفظہ اللہ (فاضل دارالعلوم دیوبند) اس ہاسٹل کے اولین ناظم مقرر ہوئے۔ یہ سلسلہ 1984ء تک چلتا رہا۔

جامعہ نصرۃ الاسلام میں درس نظامی کا آغاز

1984ء کو قاضی عبدالرزاق نے اپنے رفقاء ایک ایمرجنسی میں میٹنگ بلوائی اور ایک طویل مشاورت کے بعد توکل علی اللہ کرکے اس پرانی عمارت میں ایک

استاد اور کچھ طلبہ کے ساتھ باقاعدہ درس نظامی کا آغاز کیا گیا اور مولانا نذیر اللہ خان کو مہتمم اول مقرر کیا اور مولانا گل شیر خان نائب مہتمم اور مولانا لقمان حکیم کو ناظم تعلیمات مقرر کیا۔

جامعہ نصرۃ الاسلام، صدیقی ٹرسٹ کے تعاون خصوصی اور مخیّر حضرات کی صدقات، فطرات سے باقی ماندہ زمین پر کچھ اساتذہ کے مکانات اور جامعہ نصرۃ الاسلام کے طلبہ ونگ کے لیے ایک ہاسٹل 32 کمروں پر تعمیر کیا گیا جو کچی تعمیرات پر مشتمل ہیں۔ شکراللہ سعیہ وجزاہ فی الدارین خیر الجزائ۔ اللہ تعالی ان کو دارین کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

جامعہ نصرۃ الاسلام گلگت، گلگت بلتستان کا سب سے بڑا اور قدیم دینی ادارہ ہے۔ یہی وہ مدرسہ ہے جس نے گلگت بلتستان کے غریب طلبہ کو اپنے دامن میں جگہ دی اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کی۔ الحمد اللہ پورے گلگت بلتستان کے عوام نے اس جامعہ سے استفادہ کیا اور اس جامعہ میں تعلیم وتربیت پانے والے سینکڑوں علمائ، فضلا، محدث، مفسر، فقیہ وادیب، قاضی و مفتی، حفاظ وقراء، زہاد واتقیائ، امام و مؤذن، سرفروش مجاہدین اور مبلغین اسلام تیار ہو کر پورے علاقے میں ہر لمحہ دین کی حفاظت واشاعت میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں، یہ مرکزِ علم و حکمت اور فکر و دانش، اس الحادی و مادی علاقے میں ایک روشن

مینار ہے جس کی شعاعیں پورے گلگت بلتستان م میں پھیل رہی ہیں۔ اور یہاں کے تربیت
یافتہ پاکستان کے مختلف علاقوں اور عرب ممالک میں دینی خدمات انجام دے رہے
ہیں۔ مہتمم اول مولانا نذیراللہ خان کے انتقال کے بعد ان دونوں جامعات کا تمام تر نظم
و نسق اور اہتمام قاضی عبدالرزاق کے فرزند ارجمند قاضی نثار احمد حفظہ اللہ ورعاہ
سنبھالے ہوئے ہیں۔اور ہم جیسے کم علم و کوتاہ عمل بھی دامے درمے قدمے سخنے اس
جامعہ کی آبیاری میں اپنا حصہ بقدر جثہ شامل کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا
ہے کہ یہ جامعہ پھلے پھولے اور چہار سو یہاں سے دین، دنیا اور محبت و مودت کے چشمے
پھوٹے اور نور کی شمعیں روشن ہوں۔

شیخ القرآن مولانا شہزادہ خان کا سانحہ ارتحال

بلاشبہ ضلع دیامر ایک عظیم استاد، ماہر قرآن، تحریکی زندگیوں کا روح رواں، مصلح، محقق اور مفسر و مبلغ عالم دین سے محروم ہوا۔ شیخ القرآن مولانا شہزادہ خان کا سانحہ ارتحال نہ صرف دیامر کے لیے المیہ ہے بلکہ گلگت بلتستان، ملک بھر اور افغانستان میں موجود شیخ کے ہزاروں تلامذہ اور تربیت یافتہ لوگوں کے لیے المیہ عظیم ہے۔ شہزادہ خان صاحب نے زندگی بھر پیغام خدا کو عام کیا۔ ان کی پوری زندگی تحریک سے تعبیر تھی۔ زندگی کے عمومی و خصوصی مقاصد سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ ان کی زندگی کے بے شمار گوشے تھے۔ ہر گوشے میں تفصیل ہے۔ گزشتہ سال مولانا مرحوم سے گلگت میں ایک طویل انٹرویو کیا۔ اس کی روشنی میں چند بے ربط باتیں آپ سے شیئر کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ وہ ایک بہترین استاد تھے۔ اپنے شباب کی باون بہاریں اپنی ہی قائم کردہ دارالعلوم تعلیم القرآن تانگیر میں کلام اللہ کا درس دیا۔ ایک دنیا نے تفسیر القرآن میں مولانا سے فیض حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن کریم کے ساتھ خصوصی شغف عطاء فرمایا تھا۔ وہ قرآن کی حواشی بھی لکھ رہے تھے شاید مکمل کی ہو۔ ''مواہب الرحمان فی اصول القرآن'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس میں اصول قرآن ذکر کیے ہیں جو انہوں نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد طاہر

صاحب پنج پیری سے برسوں پہلے زمانہ طالب علمی میں پڑھے تھے۔ سادہ الفاظ میں سلیس و روانی کے ساتھ مطالب بیان کیے ہیں۔ایک اور کتاب ''سورہ فاتحہ کی تفسیر'' کے نام سے مرتب کی ہے۔ دراصل یہ کتاب '' دُرالمعانی فی سبع المثانی'' کا اردو ترجمہ ہے۔دوران انٹرویو حضرت نے وعدہ فرمایا تھا کہ تانگیر پہنچتے ہیں دونوں کتابیں ارسال کریں گے جو انہوں نے مجھے ارسال کی۔دونوں کتابیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ مولانا بحیثیت معلم ، ایک کامل استاد تھے۔ گلگت بلتستان کے تمام جید علماء کسی نہ کسی واسطے ان کے شاگرد تھے۔انہوں نے عمر عزیز کی چھہتر بہاریں دیکھی، ان کا اکثر حصہ تعلیم و تعلم، درس وتدریس، وعظ و نصیحت اور اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے آواز بلند کرنے میں گزاری۔ان جیسا مرد درویش اور مجاہد ضلع دیامر نے نہ پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ آئندہ امکان ہے۔ شیخ القرآن کے سانحہ ارتحال سے کچھ عرصہ پہلے دیامر کے ایک اور جید عالم دین مولانا مترجان بھی راہ حق کے راہی ہوئے۔ان دونوں کی سادہ زندگی ہم جیسے کوتاہ علم و عمل کے لئے مشعل راہ ہے۔

شیخ القرآن کے نماز جنازہ میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔تانگیر رم جیسے دیہات میں اتنے لوگوں کا جمع ہونا بعید عن عقل تھا۔ہر ایک کے زبان پر یہ جملہ تھا کہ تانگیر کی وادی نے اس سے پہلے اتنا بڑا مجمع کبھی نہیں دیکھا۔لوگ پیدل اور گاڑیوں میں کچھا کھچ جنازہ گاہ کی طرف آرہے تھے۔ہر آنکھ سے

آنسو رواں تھے۔ ہمارے قاضی نثار احمد صاحب نے اپنے تمام سفری پروگرام ملتوی کرکے ایک بڑے قافلے کے ساتھ تانگیر پہنچے تھے۔جنازہ کے مجمع سے آخری خطاب کرنے کے، لیے کھڑے ہوئے تو بے اختیار رونے لگے۔ان کے آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ہوا مگر ضبط کیا۔ سچ یہ ہے کہ دیامر میں قاضی نثار احمد کا مولانا شہزادہ خان اور مولانا متر جان رحمہما اللہ جیسے کوئی معاون ومددگار نہیں ہے۔شاید ان دونوں شخصیات کے انتقال سے سب سے زیادہ متاثر قاضی نثار احمد ہونگے۔

مولانا کے جنازہ میں ایک عالم نے کھڑے ہوکر روتے ہوئے کہا کہ ہم سب یتیم ہوگئے۔ دو ہی عالم تھے جو مراجع کل تھے مگر دونوں کے یکے دیگرے انتقال سے علمی خزانے بند ہوئے۔ ستاروں میں شمس و قمر کے مانند تھے۔ ان کے اچانک اٹھنے سے وادی تانگیر سوگوار ہوئی، تحریکی زندگی کے سینکڑوں ابواب از خود مغلق ہوگئے۔پھر کیا تھا ہزاروں لوگ زار و قطار رونے لگے۔ نماز جنازہ معمر عالم دین مولانا گل شہزادہ نے پڑھائی۔ میں عین امام کے پیچھے کھڑا تھا۔ یہ بزرگ عالم دین رونے لگا۔ جنازہ کے مجمع سے کئی نامی گرامی علماء کرام نے خطاب کیا۔ جن میں مولانا قاضی عنایت اللہ، چیئرمین دیامر گرینڈ جرگہ، مولانا عبدالقیوم، مولانا عبدالغیاث توحیدی، مولانا ایاز ، مولانا عبدالمحیط، مولانا امان اللہ، مولانا وصیل خان، مولانا عبدالحلیم تھے۔ ہر

ایک نے مولانا مرحوم کے گن گائے اور اپنے دلی جذبات بلاکم وکاست بیان کیے۔ ایک نکتہ سب کا یکساں تھا کہ '' مولانا مرحوم سب کے سرپرست، راہ نما اور معاون و مددگار تھے ''۔ شاید دیامر میں واحد عالم دین تھے جس کی ایک آواز پر تمام علماء اور عوام یک زبان کھڑے ہو جاتے اور بڑی سی بڑی مشکل سہنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ برسوں پہلے مولانا شہزادہ خان اور مولانا مترجان نے چلاس شہر میں '' تحکیم القرآن '' کے عنوان سے جلسہ عام سے خطاب کیا تو اس وقت کے ایس پی امیر حمزہ نے دونوں کو گرفتار کیا اور وہ ظلم کیا کہ دیامر کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ دونوں عالموں کی داڑھیاں نوچی اور حد درجہ تشدد کیا۔ عوام نے پولیس سے تصادم کرکے دونوں علماء کو باعزت رہائی دلائی۔ وہ زندگی بھر ظلم سہتے رہے مگر صدائے حق بلند کرنے میں کبھی کمزوری نہیں دکھائی۔ یہ ان کا ہی طرۂ امتیاز تھا۔ ہر ایک کے حصے میں یہ سعادتیں نہیں آتیں۔

مولانا شہزادہ خان نے چھہتر سال پہلے وادی تانگیر میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد کا نام شاہ سلطان تھا جو 1800ء کے آواخر میں کولی کوہستان سے تانگیر رِم میں آکر آباد ہوئے تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم تانگیر و کوہستان کے مختلف دینی مدارس میں حاصل کی۔ مولوی عبدالمتین، مولانا جمع دین، مولانا مستہ خان، مولوی عبدالقادر سے ابتدائی صرف و نحو اور فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اکوڑہ خٹک میں مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے مولانا فہم گل اور عبدالخالق سے

ہدایہ اول، اصول الشاشی، نورالانوار اور منطق و فلسفہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مردان کے مدرسہ خیرالمدارس میں علم المعانی کی معروف کتب، تلخیص، مختصرالمعانی اور مطول وغیرہ مولانا عبدالرحمان سے پڑھی۔ موقوف علیہ (درجہ سابعہ) جامعہ اشرفیہ لاہور سے پڑھا جہاں کبار علماء کرام سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مولانا رسول خان سے ہدایہ آخر، تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی پڑھی۔ مولانا عبدالرحمان سے ہدایہ رابع، مفتی جمیل صاحب سے مشکوۃ آخر اور مولانا ادریس کاندھلوی صاحب سے مشکوۃ اول پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

1965ء میں مولانا شہزادہ خان صاحب نے دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمان مینوری صاحب فاضل دیوبند سے بخاری شریف کا درس حاصل کیا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند میں استاد رہ چکے تھے۔ مولانا عبدالشکور صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند سے مسلم شریف پڑھا۔ جامعہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب سے دروس قرآن کا سبق لیا اور پنج پیر کے معروف شیخ القرآن مولانا طاہر پنج پیری صاحب نوراللہ مرقدہ سے بارہ سال دورہ تفسیر کیا۔ اور دیگر کبار علماء کرام سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا شہزادہ خان نے قرآن کریم، حدیث شریف

اور فقہ اسلامی و فنون کی درس وتدریس اور تحریکی زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔
تانگیر میں واقع اپنے مدرسے میں مسلسل باون سال قرآن کریم کا درس اور دورہ تفسیر کروایا جہاں ہزاروں تشنگان علوم قرآن نے فیض حاصل کیا۔ مولانا مرحوم کی پسندیدہ عربی تفاسیر میں تفسیر روح المعانی، تفسیر قرطبیؒ، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، تفسیر مداری تھی جو اکثر ان کے مطالعے میں رہتی اور اپنے تفسیری لیکچر اور مواعظ میں ان کے حوالے اور عبارتیں نقل کرتے۔ اردو تفاسیر میں جواہر القرآن، بیان القرآن اور معارف القرآن (شفیع عثمانی) کے مداح تھے۔ باقی تفاسیر بھی مطالعے میں رکھتے۔ اپنی تحریر کردہ کتابیں '' مواہب الرحمان فی اصول القرآن'' اور '' سورۃ الفاتحہ کی تفسیر یعنی اردو ترجمہ درالمعانی فی سبع المثانی'' کی ترتیب و تحقیق میں اپنے استاد محترم مولانا طاہر پنج پیری کے دروس القرآن اور ان کے بیان کردہ اصول القرآن کے علاوہ تفسیر اتقان، البرہان فی علوم القرآن اور قاموس القرآن سے استفادہ کیا۔ ضلع دیامر اور کوہستان کے اکثر نوجوان علماء کرام مولانا کے تلامذہ میں شامل ہیں۔
مولانا کی تحریکی وجہادی زندگی ایک زندہ وتابندہ باب ہے۔ امارت اسلامی افغانستان کی جہاد میں مولانا کا بنیادی کردار ہے۔ کشمیر کی آزادی کے لیے مولانا نے سینکڑوں مجاہد تیار کیے اور پاک فوج کے شانہ بشانہ آزادی کشمیر

کے لیے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ ان کے خاندانوں کی اعانت کی۔ بیسوی دفعہ خود جنگی محاذوں میں گئے اور دشمن کے خلاف جہاد کیا۔ گلگت بلتستان کے حرکت المجاہدین اور حرکت الجہاد اسلامی کے امیر رہے۔ کشمیر کی آزادی کے لیئے تانگیر میں معسکر بنایا اور یہ معسکر بارہ سال چلایا۔ بارہ سال تک کشمیر کی آزادی کے لیے پاک فوج کے شانہ بشانہ مجاہدین بھیجے جن میں بہتوں کو شہادت ملی۔ تحریک آزادی کشمیر اور امارت اسلامی افغانستان کے لیے مولانا شہزادہ خان کی خدمات کو ہمیشہ کے لیے یاد رکھا جائے گا۔

گلگت بلتستان میں امن و امان کے لیے بھی مولانا نے مثبت اور مثالی کردار ادا کیا۔ امن کے حوالے سے ان کا جرگہ سسٹم بھی کامیاب رہتا۔ بلاشبہ وہ ضلع دیامر کے علماء و عمائدین جرگہ کے لیے سرپرست اور باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے انتقال پر ملال سے جو خلا پیدا ہوا شاید کوئی پُر کرسکے۔

میرے استفسار پر مولانا شہزادہ خان نے نوجوانوں سے دو ہی نصیحتیں فرمائی۔ ایک قرآن کی تعلیم و تفہیم کا لازمی اہتمام کریں۔ اور اس کے سیکھنے اور عمل کرنے میں وقت لگائیں کیونکہ نبی کا فرمان ہے '' خیر کم من تعلم القرآن و علمہ ''۔ دوسری بات کہ عقائد و اعمال اور اخلاق کی اصلاح کریں۔ اور ان عقائد و اعمال اور اخلاق کو اپنائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔

بہر صورت مولانا مرحوم وہاں چلے گئے جہاں ہم سب نے جانا ہے۔ مولانا نے دو شادیاں کی تھی ان کے بطن سے دس بیٹے اور نو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک بیٹا مولانا عبیدالرحمان عالم دین ہیں جو دارالعلوم پنج پیر سے فارغ التحصیل ہیں۔ مولانا کا تانگیر شہر میں دارالعلوم تعلیم القرآن کے نام سے ادارہ ہے۔ اللہ اس ادارے کو مزید پھلنے پھولنے کی توفیق دے۔اور ان کے مشن کو آگے بڑھائے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

''اتحاد تنظیمات مدارس اور دہشت گردی''

ملک کی موجودہ صورت حال ، اکیسویں آئینی ترمیم اور نام نہاد جنگ دہشت گردی کے حوالے سے علماء کرام کا کیا کردار ہے۔ پاکستان یں تمام مسالک و مکاتب کے مدارس و جامعات کا سب سے بڑا وفاقی اتحاد'' اتحاد تنظیمات مدارس ''کے ذمہ داران کہاں کھڑے ہیں ، کے حوالے عامۃ الناس اور جدید طبقہ بالخصوص میڈیا برادری اور معترضین مدارس و جامعات کی درست رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔اتحاد تنظیمات مدارس یں وفاق المدارس العربیہ پاکستان (دیوبند) ،وفاق المدارس الشیعہ (اہل تشیع)، تنظیم المدارس پاکستان (بریلوی)، وفاق المدارس السّلفیہ (اہل حدیث) ، رابطۃ المدارس الاسلامیہ (جماعت اسلامی) شامل ہیں۔ یہ پانچوں وفاقی بورڈز کے ساتھ ملک بھر میں پچیس ہزار کے قریب مدارس و جامعات ملحق ہیں۔یہ تمام وفاقی بورڈ غیر سیاسی اور غیر منافع بخش بنیادوں پر قائم ہیں۔ان کے منشور کے مطابق تمام مسالک کے بورڈز صرف اور صرف تعلیم وتربیت اور تحقیق وتدقیق کے فروغ دے رہے ہیں۔ان میں سب سے بڑا اور ملک گیر وفاقی بورڈ'' وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' ہے۔اس کے موجود صدر شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب ہیں جو اتحاد تنظیمات المدارس کے بانی اور اولین صدر بھی ہیں۔وفاق المدارس العربیہ کے تحت ملک بھر میں اٹھارہ ہزار چھ سو ستتر(18677) مدارس وجامعات کام کر

رہے ہیں۔ان مدارس ہیں ایک لاکھ آٹھ ہزار چونسٹھ (108064) اساتذہ کرام خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ جبکہ تیئیس لاکھ چار ہزار پانچ سو بارہ (2304512) طلبہ /طالبات زیر تعلیم ہیں۔وفاق المدارس العربیہ سے اب تک فارغ التحصیل ہونے والے علما کی تعداد ایک لاکھ انیس ہزار آٹھ سو بانوے (119892)، عالمات کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار اٹھائیس (150028) اور حفاظ کی تعداد نو لاکھ پچیس ہزار ایک سو بانوے (925192) ہے۔وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے قیام 1959 سے جون 2014 تک وفاق کے ساتھ ملحق مدارس کی تعداد 15139 ہے۔ ملحقہ مدارس کی شاخوں کی تعداد 3538 ہے۔ اس طرح وفاق المدارس العربیہ کے تحت کام کرنے والے اداروں کی کل تعداد 18677 ہے۔وفاق المدارس العربیہ کے ملحقہ مدارس میں اساتذہ اور دیگر عملہ کی کل تعداد 108064 ہے۔ مرکزی دارالحکومت اسلام آباد میں 1755 بلوچستان میں 9008 پنجاب میں 38697، خیبر پختونخواہ میں 28100، سندھ میں ، گلگت بلتستان میں 516 اور آزاد کشمیر میں 1745 ہے۔ دیوبند مکتبہ فکر کے 28243 تبلیغی جماعت کے مدارس و جامعات کا نیٹ ورک اس کے علاوہ ہے۔ وہ کسی بھی وفاق کے ساتھ اپنے مدارس کا الحاق نہیں کرتے۔یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے ذمہ دار اور ملحقہ مدارس ہمیشہ اپنوں کی بے رعنائیاں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کا شکار رہے ہیں۔ہمیشہ ان کو ہی معطون سمجھا جاتا ہے۔آج بھی سب سے مشکل وقت انہیں مدارس و علماء پر آپڑا ہے۔

وفاق المدارس العربیہ اور دیگر چاروں وفاقوں کے حوالے سے اہم معلومات وقتاً فوقتاً اپنے قارئین کے ساتھ شیئر کرتا رہوں گا۔تاہم آج کی محفل میں ''اتحاد تنظیمات مدارس'' یعنی دینی مدارس و جامعات کے پانچویں نمائندہ تنظیموں کے ذمہ داروں نے اصحاب حل و عقد اور صاحبان بست وکشاد سے دہشت گردی کے خاتمے کے حوالے سے قومی ایکشن پلان پر اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے ایک سربراہی اجلاس میں شرکت کی۔جس کی صدارت وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان کر رہے تھے اور ان کے ساتھ وفاقی وزیر مذہبی امور سردار محمد یوسف ، وزیر مملکت برائے مذہبی امور پیر امین الحسنات شاہ، وزیر اعظم کے معاونینِ خصوصی خواجہ ظہیر احمد اور بیرسٹر ظفر اللہ خان مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندگان ، سرکاری اداروں کے سربراہان وغیرہ شامل، تھے۔اس اہم اجلاس میں شرکاء اجلاس نے رسول پاک کے گستاخانہ خاکے چھاپنے والے مغربی جرائد کی پرزور مذمت کی اور اس بات پر زور دیا کہ تمام انبیاء کرام اور تمام مذاہب کے شعائر کے احترام کو یقینی بنانے کے لئے عالمی سطح پر قانون سازی کی جائے۔ اجلاس کے شرکاء نے گستاخانہ طرز عمل پر پوپ فرانس کے موقف کو سراہا اور قوم کے نام پیغام دیا کہ شر انگیزی کے خلاف احتجاج کو پُر امن رکھا جائے اور قومی املاک کو ہرگز نقصان نہ پہنچایا جائے ۔اس غیر معمولی اجلاس میں شرکاء اجلاس نے مدارس و جامعات اور جنگ دہشت گردی کے حوالے سے ایک مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کیے ۔مشترکہ اعلامیہ کے نکات درج ذیل ہیں۔یقیناً ان نکات پر عملدرآمد سے بہت فائدہ

ہو گا۔ ملاحظہ ہو۔

۔ تمام شرکاء اجلاس نے متفقہ طور پر سانحہ پشاور کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی اور 1 اس بات کا عزم کیا کہ تمام سیاسی جماعتیں اور مذہبی اکابرین دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے شانہ بشانہ جدو جہد کریں گے۔

علماء نے یک زبان ہو کر قرار دیا کہ خود کش حملے حرام ہیں اور واشگاف الفاظ میں 2 اعلان کیا کہ ریاست پاکستان کے خلاف مسلح جدوجہد حرام ہے۔اس ضمن میں فتاویٰ پہلے ہی جاری کئے جا چکے ہیں۔

۔ اتفاقِ رائے قرار پایا کہ کسی بھی قسم کی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث پایا3 جانے والے فرد یا ادارے پر ملکی قانون کے مطابق بلاامتیاز کارروائی کی جائے گی ۔

مدرسوں کی رجسٹریشن کو آسان اور یقینی بنانے کے لئے متعلقہ وفاقی و صوبائی 4- محکموں/اداروں اور اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو اتفاق رائے سے ایک جامع رجسٹریشن فارم تیار کرے گی تاکہ تمام کوائف ایک ہی وقت میں حاصل ہو سکیں۔

دینی مدارس قانون کے تحت اپنے حسابات کی آڈٹ رپورٹ پیش کرنے کے پابند 5- ہیں ۔ علماء کرام نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ مدرسوں کو بیرونی امداد صرف حکومت کے ذریعے آئے گی اور حکومت اس ضمن میں طریقہ کار وضع کرے گی۔

علماء کرام نے اس بات پر وزر دیا کہ مدارس بارے قانون سازی اتحاد 6-

تنظیمات مدارس کی مشاورت سے کی جائے گی۔

7- اجلاس نے قرار دیا کہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے صرف طاقت کا استعمال ہی نہیں بلکہ فکری نظریاتی سطح پر بھی ذہن سازی کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں تمام طبقات فکر بشمول علماء کرام کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

8- مدارس کے نصاب اور اس سے متعلقہ معاملات کو طے کرنے کے لئے وزارت تعلیم وزارت مذہبی امور، صوبائی حکومتوں اور اتحاد تنظیمات مدارس کے نمائندوں پر، مشتمل کمیٹی قائم کی جائے گی جو سفارشات مرتب کرے گی۔

9- دینی مدارس کی قیادت نے واضح کیا کہ دینی مدارس میں اصلاحات کا عمل جاری ہے۔ دین و مذہب اور ملک و ملّت کی بہتری کے لئے دینی مدارس میں وقت کے ساتھ ساتھ بہتری لائی جاتی ہے اور آئندہ بھی لائی جاتی رہے گی اسی طرح مروجہ تعلیمی نظام میں بھی اصلاح لائی جائے گی۔

10- اس موقع پر یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ مدارس کے قائدین نے '' تعلیم امن اور اسلام '' کے نام سے مشترکہ طور پر جو کتاب تیار کی ہے اسے دینی مدارس بھی نصاب کا باقاعدہ حصہ بنانے کی کوشش کریں گے اور عصری ادارے بھی اس کتاب کو شامل نصاب کرنے پر غور کریں۔

11- دینی مدارس کی قیادت نے سیاسی جماعتوں، سفارتکاروں اور زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو دعوت دی کہ وہ دینی مدارس کے دورے کرکے مدارس کے نظام و نصاب کا از خود مشاہدہ کریں۔

12- علماء نے مطالبہ کیا کہ دینی اور مذہبی کتب پر اشاعت کے بعد پابندی عائد کرنے کے بجائے ان کی اشاعت سے قبل جائزہ لے کر مسودہ کی منظوری دی جائے اور اس کے بعد ان کی اشاعت عمل میں لائی جائے ۔اور موجودہ کتب کا بھی اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے ۔

13- اس بات پر بھی اتفاق رائے پایا گیا کہ علماء کرام اپنے خطبات میں اسلام کے پیغام امن کو واضح کریں گے اور اس اتفاق رائے سے قوم کو آگاہ کریں گے۔

14- طے پایا کہ حکومت ، سیاسی قیادت اور علماء کرام کے درمیان مستقل رابطے کے لئے اداراتی نظام وضع کیا جائے گا تاکہ دہشت گردی کے خلاف مشترکہ جدو جہد جاری رکھی جاسکے۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن وحدیث ، تعلیمات اہل بیت عظام واصحاب کرام کے بغیر کسی اسلامی ریاست و سوسائٹی کی بقااور معاشرے کے قیام کا تصور عبث ہے۔نہ یہ تصور کیا جاسکتا ہے۔یہ سچ ہے کہ علوم الٰہی و نبوی ہی پر کسی اسلامی معاشرہ کی بنیاد اور داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے۔ قرآن و حدیث علوم الٰہی وعلوم نبوی کا منبع و ماخذ ہیں اور دینی مدارس و جامعات اسلامی کے مقاصد و اہداف اس کے علاوہ کیا ہو سکتے ہیں۔ کہ علوم الٰہی و نبوی، فقہ اسلامی اور تعلیمات اہل بیت عظام و صحابہ کرام کے ماہرین ، محققین اور اعلیٰ بصیرت و بصارت رکھنے والے مطلوب افراد تیار کیے جائیں۔یہی مطلوب افراد

ورجال اسلامی معاشری کی تشکیل میں قرآن و حدیث کی روشنی میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔اور عامۃ الناس میں اسلام کی بنیادی اور ضروری تعلیم عام کرنے اور اسلامی تہذیب و تمدن کی ابدی صداقت کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں اور ایک طویل عرصے سے دے رہے ہیں۔برصغیر پاک و ہند میں دینی روایات اور اسلامی اقدار کے تحفظ و سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے علما حق نے جو مجاہدانہ و سرفروشانہ کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخِ اسلامی کی ناقابل فراموش ابواب ہیں۔یہی سرفروشانہ روایات قیام پاکستان کے بعد بھی جاری ہیں۔مدارس و جامعات کے ذمہ داروں اور علماء وفضلاء نے روز اول سے ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کا بلامعاوضہ تحفظ کیا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں مدارس اسلامیہ کو ارباب حل و عقد نے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے تنگ کیا ہے۔مدارس اسلامیہ پر تنقید برائے تنقید کا شیوہ روز اول سے ہے۔ تنقید برائے اصلاح کا دینی مدارس و علماء نے ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے تاہم بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے کی جانے والی تنقید کو علماء کرام نے اتحاد و اتفاق سے ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

مزدور علماء کا قتل

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے استاد مولانا افتخار کی شہادت کی خبر سن کر اور فیس بک میں خون میں لت پت میت دیکھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ ذہنی اسکرین کے سامنے وہ تمام مزدور علماء کی تصاویر گھومنے لگی جن کو وقتا فوقتا شہید کیا جاتا رہا۔ کتنے قابل اور ملک وملت کے لیے مفید لوگوں کو خون کے آنسو رلایا گیا۔ ان کی لاشیں بے یار و مددگار تڑپتی رہی، خون جمتا رہا۔ آہ مفتی نظام الدین شامزئی، باباعنایت اللہ، مولانا حمیدالرحمان، مولانا سعید جلال پوری، مفتی عبدالمجید دینپوری، مولانا اسلم شیخ پوری، قاری فدا گلگتی اور ان جیسے علم و عمل کے ہزاروں نمونوں کو کراچی اور اس مملکت خداداد پاکستان کے سڑکوں پر بے دردی سے مارا گیا۔ مبارک ہو ! اے وہ جنھیں ان مزدور علماء کی قتل پر بھاری رقم مل گئی ہے ۔آج تمہاری روحیں آسودہ ہیں، تمہارا دل خوش ہے اور تمہاری مرادیں پوری ہونے کو ہیں اور تمہارے آقا بھی تمہیں تھپکیاں دے رہے ہیں۔ بس تم خوش رہو۔ لیکن یاد رکھو، بہت جلد خدا آپ کی پکڑ کرے گا اور تمہیں عذاب الیم دیا جائے گا۔

پورے پاکستان میں مدارس کے اساتذہ واحد مخلوق ہے کہ آج تک انھوں نے گورنمنٹ

سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔اپنی ہر دعا میں پاکستان اور عالم اسلامی کی سلامتی مانگتے رہے۔نہ ہی ان مزدور اساتذہ کی کوئی ایسو سی ایشن ہے نہ انجمن اور نہ ہی کسی رفاہی ادارے نہ آج تک ان کی بے چارگی کے لیے کوئی مہم چلائی یا کوئی فنڈ قائم کیا ہے اور نہ ہی کوئی ٹریڈ یونین کا ان پر رحم آیا۔ حالانکہ مدارس کے مہتممین اور طلبہ کی بھی درجنوں اتحاد اور انجمنیں ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے حقوق کا نعرہ مستانہ بلند کرتی رہتی ہیں۔مدارس کے یہ مظلوم اساتذہ نے آج تک کوئی احتجاج کیا نہ ہی کوئی روڈ بلاک کیا اور نہ ہی کبھی توڑ پھوڑ کی نہ نعرے بازی کی۔یہ وہ مظلوم مخلوق ہے جن کی نوکری کی کوئی پروٹکشن نہیں۔انہوں نے آج تک اپنے حقوق کے لئے کوئی اتحاد کا سوچا نہ آئندہ ممکن ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث، فقہ اسلامی، منطق و فلسفہ اور دیگر علوم وفنون کی موٹی موٹی آٹھ نو کتابوں کا روزانہ درس دیتے ہیں اور چھ سات ہزار روپے پر قناعت کرکے زندگی کا سلسلہ کسمپرسی اور فقر کے ساتھ جاری و ساری رکھتے ہیں۔اور شاکی بھی نہیں رہتے بلکہ صبر و شکر کرتے ہیں۔زیادہ تنگ دستی ہو تو کسی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں یا پارٹ ٹائم معمولی نوکری کرتے ہیں۔کتابوں کی جلدیں بنالیتے ہیں، کسی مکتبہ میں کتابیں فروخت کرتے ہیں، کمپوزنگ کرتے ہیں، کہیں ٹیوشن پڑھاتے ہیں، اخبار کی ڈیسک پر خبر بناتے ہیں، ان مدرسین کی اکثریت ایسی ہے جو پیٹ پالنے کی خاطر دو تین جگہوں پر کام کرتے ہیں۔ غرض یہ روکھی سوکھی کھا کر درس تدریس اور تعلیم و تعلم کا

رشتہ زندہ رکھے ہوئے ہیں اور ناکردہ گناہوں کے عوض یوں بے دردی سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی مقدس شاہروں پر قتل ہوتے رہتے ہیں جس سے میرا رشتہ میرے اکابر اور اجداد سے جڑا ہوا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ان مزدور علماء کی خلوتوں اور جلوتوں سے ہی مدارس شاد و آباد ہیں۔ اگر ان مزدور علماء کا وجود نہ رہا تو میرا رشتہ ماضی سے ٹوٹ جائے گا، علمی روایات کا جنازہ نکل جائے گا، اس لیے کہ مذہبی و سیاسی جلسوں میں بھڑکیں مارنے والوں اور بڑی بڑی گاڑیوں میں سفر کرنے والوں سے تدریس و تحقیق ا ور علم و عمل کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ تاہم عوام، حکومت اور ریاست نے مدارس کے ان مظلوم اساتذہ کو ہر حال میں نظر انداز کیا ہوا ہے۔ افسوناک امر یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کی زکوات و صدقات بھی ان مزدور علماء کو نہیں بلکہ کسی اور صاحب'' کے ہاتھ لگتی ہیں اور وہ برابر ان کا استحصال کرتا رہتا ہے۔ مساجد کے آئمہ'' کی حالت بھی کم و بیش مدارس کے اساتذہ جیسی ہے۔ مزدور علماء سے میری مراد صرف مدارس کے اساتذہ''اور'' مساجد کے آئمہ'' ہیں۔ مذہبی تنظیموں کے رہنماء اور'' وفاق المدارس کے مہتممین نہیں ہیں۔ اور نہ ہی دینی مدارس کے طلبہ تنظیموں کا ان مزدور علماء سے کوئی تعلق ہے۔ وفاق المدارس، مذہبی سیاسی جماعتوں اور طلبہ تنظیموں کے منشور و دستور میں ان مزدور علماء کے لیے ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ یہ دنیا کی وہ واحد مخلوق ہیں جن کے قتل پر کوئی آنسو نہیں بہاتا، کوئی ٹی وی چینل پر ان کی موت کی خبر بریکنگ نیوز نہیں بنتی، ۔نہ ہی

کوئی انوسٹ گیشن نیوز ڈاکومنٹری بنتی ہے۔ کسی ٹاک شوز میں کوئی ان کی دفاع پر ایک لفظ نہیں بولتا اور نہ ہی کوئی ان کی موت پر کوئی پروگرام کرتا ہے۔ سینکڑوں چینل میں سے کسی نے بھی ان کو کوریج نہیں دی۔ کسی اخبار کی سپر لیڈ نہیں لگتی۔اخبار کا ادارتی بورڈ ان مزدور علماء پر اداریہ تحریر نہیں کرتا نہ ہی اخباری کالم نگار ان کی مظلومانہ موت پر کوئی کالم قرطاس کرتا ہے اور نہ ہی ہزاروں میگزینز میں ان پر کوئی فیچر، انوسٹ گیشن یا نیوز رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ کمرشل میڈیا ایسا کر بھی نہیں سکتی۔ مدارس اسلامیہ اور مساجد کے یہ مزدور علماء کے قتل پر کوئی فوج، نیم فوجی اور پولیس فورس حرکت میں آتی ہے نہ ہی ان کے دکھ میں کوئی ترجمان پریس ریلز جاری کرتا ہے۔نہ ہی کوئی کرفیو لگتا ہے، نہ کہیں ایمرجنسی نافذ کی جاتی ہے۔ اور نہ ہی درجنوں خفیہ ہاتھ مٹھی کھولتے ہیں۔نہ ہی سوگ میں قومی پرچم سرنگوں ہوتا ہے۔نہ ہی سوگ کا اعلان۔ کوئی عدالت ان کے قتل پر سوموٹو ایکشن نہیں لیتی ، اور نہ ہی کیس دائر کرنے پر ان کے نامزد قاتلوں کو سزا دیتی ہے۔ کوئی مذہبی و لسانی وفلاحی تنظیم یا سیاسی پارٹی ان کی موت پر احتجاجی ریلیاں نکالتی ہیں نہ ہی احتجاج۔نہ کسی اسمبلی ، پارٹی یا ادارے میں ان کے قتل پر مذمتی قرارداد پاس کی جاتی ہے۔نہ ہی کوئی صدر، کوئی وزیراعظم، گورنر اور وزیر اعلیٰ تعزیت کے دو جملے کہتا ہے۔ کوئی سوشل ویلفیئر کا ادارہ ان کے لواحقین کے لیے کوئی گرانٹ کا اعلان کرتا ہے نہ ہی حکومت کا خزانہ ان مزدور علماء کے لیے کچھ

رقم مختص کرتا ہے۔نہ تاجروں کی تجوریاں ان کے لیے کھلتی ہیں۔نہ۔بڑے۔بڑے مالدار پیروں کے مریدان باصفا کی امدادی فہرست میں ان مزدور علماء کا نام شامل ہوتا ہے۔ اوروں سے کیا گلہ ان مزدور علماء کے اپنے متعلقین، مسجد کمیٹی اور مدرسہ بھی ان کے لیے کچھ نہیں کرتی بلکہ پسماندگان کو سیدھا سا جواب دے کر بے دخل کیا جاتا ہے۔انسانی حقوق کاڈھونڈوراپیٹنے والے مفکرین و دانشور خاموش ہیں اور ان کی انجمنیں ان مزدور علماء کے حق میں دو بول نہیں بولتی۔شاید یہ مزدور علماء ان کی انسانی حقوق والی دانش اور فہرست میں شامل ہی نہیں۔کوئی اقوام متحدہ حرکت میں نہیں آتی اور نہ ہی کسی بیرون ملک انکے حق میں کوئی آواز بلند کرتا ہے اور نہ یاد میں کوئی شمعیں جلاتا ہے۔بخدا، مدارس کے یہ مزدور علماء دنیا کی مظلوم ترین اور الگ ترین مخلوق ہے۔

حیرت ہے نہ ان مزدور علماء کے قتل کی کوئی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور نہ ہی کبھی ان کے قاتل پکڑے جاتے ہیں۔دہشت گردوں اور طالبان کے ظلم وستم کاڈھونڈورپیٹنے والے ان مزدور علماء کی دردناک موت پر لب سی لیتے ہیں اور اپنے اپنے بلوں میں چلے جاتے ہیں۔سوشل میڈیا پر بھی ان کے حق میں دو بول بولنے والا کوئی نہیں، سوائے چند طلبہ وفضلاء کے۔ڈاکٹر، پروفیسر،ادیب،پولیس، فوجی، صحافی سیاستدان،مذہبی وپارٹی لیڈر، سماجی ورکر،تاجراور دیگر لوگوں کو قتل کرنے والے،، خود کش دھماکہ کرنے والے، اور

اسکول کے بچوں کو مارنے والے پکڑے جاتے ہیں اور ان کو کسی حد تک کیفر دار تک پہنچایا بھی جاتا ہے اور ان کے لواحقین کی ہر طرح خاطر مدارت بھی کی جاتی ہے۔ان کے بچوں کو سرکار نوکری آفر کرتی ہے مگر اس دنیا میں واحد انسان مدرسہ کے مزدور استاد، مفتی اور مسجد کا امام ہیں جن کے قاتل کبھی نہیں پکڑے جاتے اور نہ ہی آج تک پکڑنے کی کوشش کی گئی۔ مجھ آج تک سمجھ نہیں آسکا کہ ان بے ضرور مزدور علماء کی جان کیوں لی جاتی ہے؟اپنے بچوں اور والدین کا علاج نہ کروا سکنے والے آخر کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مظلوم لوگوں کی یوں شہادتوں کے عوض ہم سب کا احتساب نہ کرے۔اس ملک کی بنیادوں پر اسلام پیوست ہے مگر آج ا سلام اور اسلام پسند سب سے زیادہ مظلوم یہاں ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ پاکستان میں اسلام مظلوم ہوگا اور ہندوستان میں مسلمان، اگر آج ابوالکلام زندہ ہوتے تو میں ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ مولانا، پاکستان میں اسلام کے ساتھ کھرے مسلمان بھی مظلوم ترین لوگوں کی فہرست میں شامل ہیں۔یاد رہے مظلوم کی آہ اور اللہ رب العزت کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔مجھے ڈر لگتا ہے کہ معاشرے کی اس مجموعی بے حسی پر خدا دردناک پکڑ نہ کرے۔یا اللہ ان مزدور علماء ، جو میری صداقتوں اور عظیم الشان روایتوں کے امین ہیں کی تو خود ہی حفاظت فرما۔بے شک تو بڑی حفاظت کرنے والا ہے۔ میں اپنی تحریر اور الفاظ پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نوحہ سے کم نہیں لگتے اور بے حس معاشرے کے چہرے پر زور دار

تھپڑ۔ میں نوحہ خواں نہیں بننا چاہتا مگر میرا ضمیر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتا ہے کہ مظلوموں کے حق میں آواز بلند کرو، بے شک اللہ مظلومین و صابرین کے ساتھ ہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

نگران کابینہ، الیکشن کمیشن اور سیاسی جماعتیں

آج کی محفل میں گلگت بلتستان کی نگران کابینہ، الیکشن کمیشن اور سیاسی و مذہبی اور قوم پرست جماعتوں سے چند گزارشات پیش کرنی ہیں۔چونکہ گلگت بلتستان میں الیکشن قریب آرہے ہیں۔لازمی بات ہے کہ نگران کابینہ اورالیکشن کمیشن نے شفاف الیکشن کا اہتمام کرنا ہے اور تمام جماعتوں نے انتخابات میں اپنے جثہ کے مطابق حصہ لینا ہے۔انہیں مختلف حلقوں میں اپنے نمائندے الیکشن کے لیے کھڑے کرنے ہیں۔ اس حوالے سے چند گزارشات عرض ہیں۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے اس حوالے سے الیکشن کے قریب گزارشات عرض کی جائیں گی۔ ہم مملکت خداداد پاکستان کے بے آئین شہری ہیں۔ اس لیے اس حوالے سے بھی آئین پاکستان سے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے۔مجھے آئین پاکستان پڑھاتے پڑھاتے چار سال ہوچکے ہیں۔ آئین کی آرٹیکل نمبر63,62 کی اہم ذیلی دفعات ہماری یوں رہنمائی کرتی ہیں۔یعنی کون لوگ ہیں جو پاکستان میں الیکشن لڑ سکتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ کون لوگ ہیں جو گلگت بلتستان میں الیکشن لڑ سکتے ہیں تو لامحالہ ہمیں کہناپڑے گا کہ تمام امیدواروں کے لیے ان شرائط کا خصوصی طورپر پایاجانا ضروری قرار دیا جائے۔ جوآئین میں موجود ہیں۔ اور یہ کام الیکشن کمیشن، نگران کابینہ اورسیاسی و مذہبی جماعتیں مل کرہی انجام دے سکتی ہیں ۔

آئین پاکستان کی آرٹیکل نمبر63,62 میں ضروری

: تبدیلی کے ساتھ عرض ہے کہ

ا۔ گلگت بلتستان کا شہری ہونا۔

۲۔ اس کا کردار اچھا ہو' وہ عام طور پر اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی شہرت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ اسلام کا مناسب حد تک علم رکھتا ہو اور اسلامی فرائض کی بجاآوری کرتا ہو اور کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتا ہو۔

۴۔ دیانتدار' نیک' سمجھ دار اور امین ہو۔ فضول خرچ اور عیاش نہ ہو۔

۵۔ کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں سزا نہ پائی ہو اور نہ ہی جھوٹی گواہی کا مرتکب پایا گیا ہو۔

۶۔ پاکستان و گلگت بلتستان بننے کے بعد ملک و علاقے کی یکجہتی کے خلاف کام نہ کیا ہو اور نہ ہی نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہو۔ اور نہ ہی اقوام متحدہ میں زیر بحث گلگت بلتستان کی آئینی و جغرافیائی موقف جو کہ ریاست پاکستان نے اپنایا ہے کی مخالف کی ہو۔

آئین پاکستان نے قومی اسمبلی کا ممبر بننے کے لیے کچھ باتیں لازمی قرار دی ہیں ان کے ہونے سے وہ ممبر اسمبلی نہیں بن سکتا تو لامحالہ ہمیں بھی وہ چیزیں گلگت بلتستان میں لازمی قرار دینے ہونگیں جن کے ہونے سے کوئی بھی آدمی گلگت بلتستان اسمبلی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اس امر کو بھی نگران

کابینہ، الیکشن کمیشن اور سیاسی جماعتوں کو یقینی بنانے کے لیے ایک صفحے پر جمع ہونا ہوگا۔یعنی ان تمام شرائط کے پائے جانے سے کوئی بھی آدمی گلگت بلتستان اسمبلی کا ممبر نہیں بن سکتا ہے۔

۱۔ گلگت بلتستان کا شہری نہ ہو، یا کسی ملک کی شہریت حاصل کر چکا ہو۔

۲۔ وہ کسی ایسی آراء کا پرچار کر رہا ہو یا ایسی حرکات کا مرتکب ہو جن سے پاکستان و گلگت بلتستان کے نظریے' اقتدارِ اعلیٰ' سالمیت یا سیکیورٹی پر زد پڑتی ہو یا جس سے امن عامہ قائم کرنے یا اخلاقیات کی نفی ہو یا جس سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوتی ہو یا افواج پاکستان بدنام ہوتی ہوں یا طنز و تحقیر کا نشانہ بنتی ہوں۔

کے سبب حکومت کی نوکری سے برخاست ہوا ہو۔ (Misconduct) ۳۔ غلط رویے

البتہ اگر اس دوران پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہو تو اس پابندی کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۴۔ رائج الوقت قوانین کے تحت کرپشن کا مجرم پایا گیا ہو یا کوئی غیر قانونی حرکت کا مرتکب ہوا ہو۔

☆..لیگل فریم ورک آرڈر مجریہ 2002ء میں اراکین شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب ہونے کے لیے کچھ شرائط کا اضافہ کیا گیا تھا۔ تو ان شرائط کا اطلاق گلگت بلتستان میں لازمی طور پر کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ شق نمبر 63 (q) کے مطابق ایسا شخص گلگت بلتستان اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل نہیں جس نے خود، یا بیوی یا اپنے کسی زیر کفالت کے نام پر کسی بینک' مالی ادارے، یا

کوآپریٹو سوسائٹی/باڈی سے بیس لاکھ یا زیادہ قرضہ لیا ہو جو واجب الادا تاریخ سے ایک سال تک کے عرصے میں ادا نہ کیا ہو یا پھر اس نے یہ قرضہ معاف کروایا لیا ہو، ان دونوں صورتوں میں اسے نااہل تصور کیا جائے گا۔

اب سب سے اہم کام جو سیاسی و مذہبی اور قوم پرست جماعتوں کو کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ ہر جماعت مذکورہ بالا صفات پر مشتمل ایک کور کمیٹی بنائے اور اس کور کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپ دی جائے کہ وہ کس کو پارٹی ٹکٹ سے الیکشن لڑنے کی اجازت دیتی ہے اور کس کو نہیں دیتی ہے۔اس کور کمیٹی کے تمام ارکان خود صوم و صلوۃ کے پابند ہوں، امین ہوں یعنی آئین کی آرٹیکل نمبر 63,62 پہلے ان پر خود صادق و صادر آتی ہو، تاکہ ایسے ارکان جب مختلف حلقوں سے نمائندے چن لیں گے تو ان کی طرف سے عطاء کردہ ٹکٹ لوگوں کو الیکشن کمیشن اور نگران کابینہ مسترد نہیں کرے گی، لا محالہ پھر گلگت بلتستان میں اچھے اور نیک لوگ ممبران اسمبلی بنیں گے تو گلگت بلتستان ترقی کے منازل طے کرتا چلا جائے گا۔ یاد رہے کہ اب کی بار بھی پارٹی ٹکٹوں کی تقسیم، اقرباء پروری، رشوت اور دیگر مفادات کی خاطر ہوئی تو آئندہ پانچ سالوں میں گلگت بلتستان کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔جب چور، ڈاکو، لٹیرے اور پرانے پاپی ممبران اسمبلی بنیں گے، وزیر اور وزیر اعلی بنیں گے تو وہ بیوروکریسی کو کرپشن سے روکنے کے بجائے ان کو مزید کرپشن کرنے پر مجبور کریں گے۔ اس امر سے کون واقف نہیں کہ گلگت

بلتستان کی بیوروکریسی میں بہت سارے نیک اور اچھے لوگ ہیں جو نظام کو درست کرنا چاہتے ہیں مگر یہ لٹیرے قسم کے لوگ ان آفیسران کو کام کرنے نہیں دیتے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں تاکہ مشاغل سے فرصت ملنے پر آئندہ الیکشن کے حوالے سے تفصیلی امور زیر بحث لاسکوں، تاکہ الیکشن کی افادیت واہمیت کا عوام الناس کو شعور حاصل ہو۔آج کی محفل میں اس پر گزارہ کیا جائے۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

گلگت پھر جل رہا ہے

گلگت کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے معروف شاعر قتیل شفائی کا درد بھرا یہ پیغام یاد آجاتا ہے۔ قتیل شفائی نے برسوں پہلے شہر آشوب کے حوالے سے فرمایا تھا، آج گلگت پھر شہرآشوب بننے جارہاہے۔ قتیل کیا خوب فرماتے ہیں۔

رشتۂ دیوار و در، تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
مت گرا،اس کو یہ گھر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
تیرے میرے دم سے ہی قائم ہیں اس کی رونقیں
میرے بھائی یہ نگر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگِ میل پر
اس میں نقصانِ سفر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
شاخ شاخ اس کی ہمیشہ بازوئے شفقت بنی
سایا سایا یہ شجر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
کھا گئی کل ناگہاں جن کو فسادوں کی صلیب
ان میں اِک نورِ نظر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
اپنی حالت پر نہیں تنہا کوئی بھی سوگوار
دامنِ دل تربہ تر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

کچھ تو ہم اپنے ضمیروں سے بھی کرلیں مشورہ
گرچہ رہبر معتبر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
غم تو یہ ہے گر گئی دستارِ عزت بھی قتیل
ورنہ اِن کاندھوں پہ سر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

مبارک ہو ! اے وہ جنہیں اس علاقے کا امن کبھی نہیں بھاتا، معلوم نہیں ان خونخواروں کی نظریں اس جنت نظیر علاقے پر کیوں لگیں ہیں۔آج تمہاری روحیں آسودہ ہیں، تمہارا دل خوش ہے اور تمہاری مرادیں پوری ہونے کو ہیں اور تمہارے آقا بھی تمہیں تھپکیاں دے رہے ہیں۔ بس تم خوش رہو۔ کوئی بات نہیں کہ گلگت میں آگ لگے، دھواں اُٹھے، عورتیں بیوہ ہوجائیں، بچے یتیم ہو جائیں اور سہاگ لُٹیں، جوانیاں ضائع ہوجائیں، اہل علاقہ آپس میں دست و گریباں ہوجائیں، خون کے تالاب بنیں۔ بازاروں میں کساد بازاری ہو، معیشت دم توڑ لیں، سیاحت کا جنازہ نکل جائے، مساجد و مدارس بے آباد ہوں۔ بس تم اور تمہارے آقا خوش ہوں، باقی خیر ہے۔

ہم اسلام کے داعی ہیں اور الحمدللہ اسلام نے کبھی اس قتل و غارت اور خونخواری کا درس نہیں دیا۔ ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ کیا ہماری اندرونی خلفشار اور ناچاکیاں ناقابل تلافی نقصان کا باعث نہیں بنی ہیں ؟۔

کیا یہ سچ نہیں کہ فرقہ واریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔؟ اختلاف رائے کا ہونا الگ مسئلہ ہے، اختلاف میں حسن بھی ہے۔ دین اسلام افہام و تفہیم کا درس دیتا ہے ایک دوسرے کو ملیا میٹ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی ایک دوسروں کی پریشانیوں اور غموں اور مصیبتوں میں خوش ہونے کا درس دیتا ہے اور نہ ہی شادیانے بجانے کو اسلام لائق تحسین گردانتا ہے۔ مگر یہاں تو ہمارا حال یہ ہے کہ ایک طبقہ اور اس کے ارباب پر مصیبت آجائے تو دوسرا طبقہ خوشی کے شادیانے بجاتا نہ تھکتا ہے۔ یہ بہت افسوس ناک رویہ ہے۔ اسلام امن و سلامتی اور احترامِ انسانیت کا سب سے بڑا داعی ہے۔ انتہا پسندی، عدم برداشت اور بدامنی اسلام کی روح کے یکسر منافی ہیں۔ مگر ہمارے اعمال و افعال اسلام کے آفاقی پیغام کے سراسر مخالف جارہے ہیں۔ ہمارا دین اسلام ہے اور ہمیں اس پر بے حد فخر ہے۔ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری مکمل راہنمائی کرتا ہے اور برائی اور ظلم کو مٹانے کا درس بھی دیتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں بنی نوع انسان کا ہر فرد چاہیے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، بلا تفریقِ مذہب وملت احترام کا مستحق ہے۔ اس عظیم دین کا حسن دیکھئے کہ اسلام سلامتی اور ایمان امن سے عبارت ہے۔ سلامتی اور امن دنیا کے ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ ضرورت فقط اور فقط اسلام پوری کرتا ہے۔ اور پوری انسانیت کے ہادیِ اعظم پیغمبر آخرالزماں کو اللہ تعالی نے تمام جہانوں کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ نبی رحمت کی حیاتِ طیبہ، صبر و برداشت، عفو و درگزر اور

رواداری اور محبت و مودت سے عبارت ہے جبکہ مذہبی انتہا پسندی آپ کی تعلیمات کے قطعاً منافی ہے۔ میں نے جب بھی تعلیمات خداوندی پر غور کیا تو انہیں نتائج پر پہنچا۔

قرآن کریم واحد آفاقی کتاب ہے اس نے دین ومذہب کا جو تصور عطا کیا ہے وہ اعتدال پر مبنی ہے، قرآن مجید نے انتہا پسندی کے مقابلے میں اعتدال پسندی کو مستحسن عمل اور دین کی روح قرار دیا اور امت مسلمہ کو ابلاغ اور تبلیغ دین کے حوالے سے بھی اعتدال اور غیر جانب داری کا اصول عطا کیا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ آج مسلم امہ میں اس کا شدید فقدان ہے۔ کم از کم گلگت میں تو اس کا قحط ہی ہے۔

میرے پیارے گلگت بلتستان میں ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق نفرت کی لکیریں کھینچ دی ہیں، یہاں ایک بے سود جنگ جاری ہے۔ سیاست دانوں کو اپنی سیٹ کنفرمیشن کی فکر ہے جبکہ نگران کابینہ کو مبارک بادیاں وصول کرنے سے فراغت نہیں اور مذہبی رہنماؤں کے بیانات، تقریروں، احتجاجی مظاہروں، ہڑتالوں اور مطالبوں میں شدت آچکی ہے۔ جن سے علاقہ مزید مفلوج ہوتا جارہا ہے۔ کوہستان تا بلتستان مختلف مسالک اور علاقوں میں محاذ ارائی کا سلسلہ چل نکلا ہے جس کے باعث علاقائی نظم و نسق ابتری کا شکار ہے۔ پولیس فریق کا کام کررہی ہے۔ انتظامیہ اور بیورکریٹس خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ شہریوں کی زندگی اجیرن بن چکی ہے جبکہ اہم سیاسی لیڈران اسلام آباد

ہیں ہارس ٹریڈنگ اور

بند کمرہ ملاقاتوں میں مصروف ہیں۔

پیارے گلگت بلتستان میں تضادات و اختلافات کی سیاست و معاشرت نے پورے معاشرے کو لپیٹ میں لے لیا ہے اور غریب قوم کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہر آدمی حالات سے شاکی ہے۔یوں لگتا ہے کہ پھر سے کوئی بڑی افتاد پڑنے والی ہے۔ یا اللہ ہمیں بھی بچا اور اس پیارے گلگت بلتستان کو بھی بچا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاک فوج اور وفاقی حکومت کو حالات اپنے کنٹرول میں لینا چاہیے۔ بدمعاشوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے، یہ نہ ہو کہ مجرم تو بھاگ نکلے اور اس کا جرم غریب کو بھگتنا پڑے۔ گلگت بلتستان ایک اہم جغرافیائی علاقہ ہے۔ حکومت پاکستان اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ایک متنازعہ خطہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حساس اور مقتدر اداروں کو اس علاقے پر سخت نظر رکھنی چاہیے۔تاکہ کوئی ملک دشمن خونی کھیل نہ کھیلے۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ عوامی نمائندوں پر سے عوام کا اعتماد آٹھ چکا ہے اور ان کی عوام دوستی کا سارا بھرم کھل گیا ہے۔ لوگ منافقت اور مفادات کی سیاست سے تنگ آ چکے ہیں ۔ انہیں شدید احساس ہو چکا ہے کہ گلگت بلتستان کی بقا سیاسی راست بازی، سیاسی شائستگی اور مذہبی لیڈروں کی وسعت ظرفی اور کشادہ دلی میں مضمر ہے مگر سیاسی و مذہبی رہنما ان اوصاف حمیدہ سے عاری نظر آتے

ہیں۔ دل و دماغ میں انگاروں کی مانند سوالات اُمڈ رہے ہیں ۔ مگر کسی سوال کا کوئی مثبت جواب نہیں مل رہا ہے۔ دو سال سے کافی پرامن ماحول بنتا جارہا تھا مگر پورے علاقے میں یک طرفہ کاروائیوں کی وجہ سے حالات مزید گھمبیر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ عدل وانصاف کا ترازو اور سزا و جزا کا نظام سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے، بصورت دیگر حالات مزید خراب ہوجائیں گے جس سے صرف اور صرف غریب کا نقصان ہوگا۔ ہر ایک اپنی راگ آلاپ رہا ہے۔ مشترکات کی بات کرنا جرم بن گیا ہے۔ میں گلگت بلتستان کے نوجوانوں سے مخاطب ہوں کہ آپ غور و فکر کریں اور ایک ایسا عمرانی معاہدہ پر دستخط کردیں کہ ان روز روز کی چپقلشوں سے پوری قوم کی جان چھوٹ جائیں، ہاں ہمیں یہ حقیقت بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ان عمرانی معاہدوں پر عمل درآمد کے لیے تمام طبقات سے نوجوان اور تعلیم یافتہ احباب کو کمر کس کے میدان عشق و وفا میں اترنا ہوگا، ورنہ ہم نے امن معاہدہ 2005ء اور ضابطہ اخلاق 2012 کا حشر دیکھا ہے۔ میں نے تین سال پہلے لکھا تھا کہ '' کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان خونیں معاملات و واقعات کا اعلیٰ ترین سطح پر غور کیا جائے اور اپنی حدوں سے تجاوز کرنے والوں کا کڑا محاسبہ کیا جائے اور دن دہاڑے لوگوں کو مارنا اور اسلحہ کی نمائش کرنے والے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے جیسی مکروہ روایات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا

جائے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ گلگت بلتستان کو مقتل بنانے والوں کو بے نقاب کیا جائے اور عوام کو بتلایا جائے کہ اس دھرتی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والا اصل طبقہ کون ہے۔ حکومت، عوام، عدلیہ وانتظامیہ اور فوج کو مل کر ان پُر تشدد واقعات کے حوالے سے بے لاگ تحقیق کا اہتمام کرنا چاہیے اور جو بھی ملوث ہو اس کا محاسبہ ہونا چاہیے اور آئندہ اس سے حدود میں رکھنے کے لئے سخت اقدامات کرنے چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ اب تو آگ اور خونی کھیل کا ابتداء ہے انتہا کیا ہوگی۔ فاعتبروا یااولی الابصار،'' ۔

آؤ ہم سب مل کر اللہ کے حضور دیا کرتے ہیں: یا اللہ ہمیں امن وسکون سے رہنے کی توفیق عطاء فرما، اے ارحم الراحمین: ہمارے اس جنت نظیر علاقے کو امن واشتی گا گہوارہ بنا۔ یہاں سے شر وفساد کو ہمیشہ کے لیے ختم فرما۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

امن مگر سب کی ضرورت ہے

معاشرتی امن اور سماجی انصاف میرا پسندیدہ موضوع ہے اور ہمیشہ سے اس پر لکھتا آیا ہوں، میرے قارئین کہتے ہیں کہ آپ کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی ہے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ، مجھے بس اپنے حصے کا چراغ جلانا ہے۔ آپ میری صدا کو دیوانے کی بَڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بے شک میں ظلمتِ شب میں چمکتے ستاروں کا طالب ہوں جو ممکن نہیں۔ تاہم مایوس نہیں۔ میرے دامن میں اسلام جیسا دین ہے جس کا اولین درس یہ ہے کہ حقیقی اسلام صرف اور صرف کتاب وسنت ، عقیدہ صحیحہ اور راسخ ایمان سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی دین ہمیں سمجھاتا ''وعتصِموا بحبلِ للہِ جمِیعا ولا تفرقوا''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اسلام میں گروہ بندی، لسانی وعلاقائی جھگڑوں اور کسی امتیازی بنیاد پر افتراق وانتشار کی کوئی گنجائش نہیں ،اللہ کے ہاں قربت وعزت و شرف کا معیار صرف ایک ہے اور وہ ہے'' ان اکرمکم عنداللہ اتقکم ''یعنی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ اسلام امن عالم اور انسانیت کا سب سے بڑا داعی ہے اور مابین مسلمین کو بھی سختی سے امن کی تلقین کرتا ہے۔

کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیں اسلام اور امتِ مسلمہ پر مختلف محاذوں سے ہونے والے حملوں سے پوری طرح باخبر رہنا ہوگا اور اس کا درست ادراک بھی کرنا ہوگا۔ اور مسلمانوں کو باہم متحد ویکجان رکھنے اور افتراق وانقسام ، نفرت و شرانگیزی اور چپقلشوں سے بچانے کے لئے ہر ممکنہ اقدام بروے کار لانا ہوں گے ، قرآنِ کریم ہمیں اسی کا واضح حکم دیتا ہے۔ ''ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم ''یعنی آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

ہمارے لئے انتہائی ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی ترقی کے لئے سرگرم ہو جائیں ۔ کوئی بھی قوم امن واستحکام کے بغیر اقتصادی ترقی نہیں کر سکتی۔ ہماری قوت وعظمت ہماری وحدت میں مضمر ہے اور تمام تر سعادتیں اور برکتیں ہمارے استحکام میں پنہاں ہیں اور استحکام صرف درست و راسخ عقیدہ ، ایمان اور اس اسلامی معاشرے سے محبت و مودت ہی سے حاصل ہوسکتاہے۔ اس کے برعکس جب بدامنی ، فرقہ واریت تشدد ، اور مقابلہ بازی کی فضا ہو تو قوموں اور ملکوں کے لئے تعمیری، اقتصادی، تعلیمی ، اور بہتری کا کوئی کام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک پر لازم ہو چکا ہے کہ ہمیں محبت اور امن وآشتی کا داعی اور معاشرے کا کارآمد پرزہ بننے کی ضرورت ہے۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مذہبِ اسلام نے فرد کو فکرو نظر کی پوری آزادی عطا کی۔ اس نے انسان کو جبری غلامی، معاشی استحصال، سیاسی جبر اور مذہبی اکراہ کی بندشوں سے پوری طرح آزاد کیا۔ جدید دور کا مفکر روسو نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر آج وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر تاریخ کا دروازہ کھٹکھٹانے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب نے اپنے گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص کو تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا حالانکہ ان کی ماں نے انھیں آزاد جنا تھا؟ مگر ہمارا رویہ اور سلوک اس سے مختلف ہے۔ ہم نے ایک دوسروں کو ہر قسم کا غلام بنا کر رکھنے کو کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

اسلام کے آفاقی تعلیمات سے انسانی ضمیر انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو کر اور خدا سے براہِ راست رابطہ قائم کرکے، ہر قسم کے اندیشوں، خطرات، وسوسوں اور گمراہیوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ یہ امتیاز و شرف صرف اور صرف مذہبِ اسلام کو حاصل ہے۔ جان و مال اور شرف و کرامت کو لاحق خطرے انسان کی خودداری اور اس کی عزتِ نفس کو مجروح کر دیتے ہیں اور یوں رفتہ رفتہ اس کی انسانیت کو بھی چھین لیتے ہیں۔ اسلام ہر قیمت پر عزتِ نفس اور خودداری کی حفاظت کرنے کی تلقین کرتا ہے اور انسانوں کے عزوشرف کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ

انسان کے ذہن نشین کرتا ہے کہ زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مگر عمیق جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے شرف انسانیت عطاء کرنے کا پروانہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے مگر ہم نے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہا کر ثابت کر دیا ہے کہ زندگی خدا کے بجائے ہمارے ہاتھ میں ہے۔

تاریخ چیخ چیخ کر گواہی دے رہی ہے کہ دین اسلام کی اِن آفاقی تعلیمات اور اقدار کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ نمودار ہوا جس کا ہر فرد آزادیِ ضمیر کا نمونہ تھا۔ کیا حاکم، کیا رعایا، سب خوددار، عزتِ نفس سے مالا مال، اظہارِ حق میں جری و بے باک تھے۔ انھیں کوئی طمع یا خوف بزدل نہیں بنا سکتا تھا۔ وقت کا چیف جسٹس امام ابو یوسف نے اپنی معروف کتاب ''کتاب الخراج'' میں حضرت عمر کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ حضرت عمر نے اپنے گورنروں کو فرمان بھیجا کہ وہ حج کے موقع پر مکہ میں ان سے آ کر ملیں۔ جب سب جمع ہو گئے تو حضرت فاروق اعظم خطاب فرمایا: لوگو ! میں ان عُمال (گورنروں) کو اس لیے مقرر کرتا ہوں کہ راست روی کے ساتھ تمھاری سرپرستی اور حفاظت کریں۔ میں نے انھیں اس لیے ہر گز مقرر نہیں کیا ہے کہ تمھاری جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کریں۔ لہٰذا اگر تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف ظلم و جبر کی شکایت ہو تو کھڑا ہو جائے''۔ مگر آج ہمارا گورنری نظام اپنے تمام اعمال سے اس کی نفی کر رہا ہے۔

بہر صورت یہ سچ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ قرآن مذہبی جبر کی قوت سے نفی کرتا ہے،
قرآن کسی شخص پر اپنے عقیدے کو مسلط نہیں کرتا۔ وہ افہام و تفہیم اور تعلیم و تلقین کا
قائل ہے اور جبر واِکراہ، تشدد اور دھونس دھاندلی کو اعلانیہ مسترد کر دیتا ہے۔ کیا یہ سچ
نہیں ہے کہ قرآن اپنی صداقت اور حقانیت پر پوری طرح مطمئن ہونے کے باوجود وہ
واشگاف اعلان کرتا ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ قرآن کی وسیع
المشربی کا کوئی مذہب ہم پلہ نہیں۔ عقیدہ و مذہب کی آزادی، دوسرے مذاہب،
تہذیبوں اور روایات کے لیے وسیع المشربی او رواداری اسلام کی ایک اہم ترین قدر
ہے جس پر قرآن کریم نے مختلف انداز میں ارشاد کیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہے کہ
ہم نے تم انسانوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی''
ہے۔ اگر تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا، لیکن اس نے یہ اس لیے
کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے''۔
عین اسی طرح اسلام اپنے حلقہ بگوشوں کو ایمانداری، سچائی، بلند اخلاقی، عالی ظرفی،
اصول پسندی، ایفاے عہد، قانون کی پابندی، صفائی و پاکیزگی ،انسانی ہمدردی، معاشرتی
امن، سماجی انصاف اور راست بازی جیسی اعلی خوبیوں کا حکم دیتا ہے۔ کسی انسانی
سوسائٹی میں اسلام کے آنے کا مطلب برکتوں اور

رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسلام کی تربیت انسانوں کو اپنے معاشرے کے لیے انتہائی مفید رکن بنا دیتی ہے۔ وہ امن، انصاف، پیار اور محبت کے علمبردار اور سفیر بن کر جیتے ہیں۔ اور اپنے اپنے حلقوں میں خوشیوں، سکون واطمینان اور فرحت و سلامتی کی علامت بن کر دنیا کے لیے رول ماڈل بن جاتے ہیں۔ اس لیے آج چار سو پھیلی ہوئی خود غرضی اور بے حسی ہو یا دیگر طرح کی سینکڑوں برائیاں، ان سب کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام کی اعلی، پاکیزہ اور روشن تعلیمات پہلے خود اپنائے پھر انھیں نرمی و حکمت کے ساتھ
دوسروں تک پہنچایئے اور اپنے بچوں، فیملی اور احباب کے درمیان اسلام کی برکتوں اور خوبیوں کا چمکتا نمونہ بن کر زندگی گزاریئے۔ مسلمان ہونے کا آج ہم سب پر سب سے بڑا ایہی فرض بھی ہے اور قرض بھی۔

بے شک قرآن نے '' واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ'' سے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ تمام تر قوت کے ساتھ اہل باطل اور کفار کا مقابلہ کرو، یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ ظلم و ستم کا بازار گرم رکھتے ہیں مگر پر امن کفار کے لیے قرآن کا یہ واضح فرمان ہے کہ'' اور اے نبی! اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جا اور اللہ پر بھروسا کرو۔ یقیناوہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے''۔ مفہوم یہ ہے کہ قرآن اور اسلام برابری اور توازن کی بنیاد پر جینے کی بات کرتے

ہیں، کمزوری اور بزدلی سے نہیں۔

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا درس دیا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کے خلاف پر تشدد

کارروائیاں اور طاقت کا استعمال اِس بنا پر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے اور کفروشرک پر اس کا اعتقاد ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں اس پر علمائے کرام، مفتیانِ عظام، محدثین اور فقہاء و مجتہدین کا اتفاق رہا ہے۔ کہ کسی شخص کو طاقت کے استعمال سے دینِ اسلام میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ قرآن کا حکم تو یہ ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ عداوت نہیں رکھتا اور ان پر ظلم کرنے والوں میں وہ شامل نہیں ہے اس کے ساتھ اچھا برتا کیا جائے، اور عام انسانی حقوق کی ادائیگی کے معاملے میں مسلمان اور غیر مسلم میں فرق نہ کیا جائے۔

اسلام محبتوں اور رواداریوں کی بستیاں بچھاتا چلا جاتا ہے۔اسلام انسان کے ضمیر میں، خاندانی ومعاشرتی نظام میں، ملکی قوانین میں، انٹر نیشنل ریلیشن میں، غرض ہر جگہ زندگی کے ہر شعبے میں امن و سلامتی اور محبت واخوت کے پھول کھلاتا جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہمی معاملات کی استواری اور ان کے درمیان الفت اور بھائی چارے کے فروغ کی

مثال دیتے ہوئے ارشاد کیا ہے۔''تم دیکھوگے کہ مسلمانوں کے درمیان محبت، ایک دوسرے پر رحم اور شفقت کی مثال ایک جسم کی مانند ہے۔جب اس کے کسی حصے کو تکلیف ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''رسول اللہ کریم نے یہ ارشاد کیا ہے کہ'' اے مسلمانو!ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو۔اے اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن کر رہو''۔یہی احکامات دیگر مذاہب والوں کے ساتھ اپنانے کے لیے بھی ہیں، آپ نے فرمایا''ساری مخلوق اللہ تعالی کا خاندان ہے۔ تمام لوگوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے خاندان کے ساتھ حسن سلوک کرے''۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مولانا نذیراللہ خان نمبر پر خصوصی وضاحت

الحمدللہ ! مولانا نذیراللہ خان مرحوم (فاضل دارالعلوم دیوبند) (1930ء تا اکتوبر 2010ئ) کی شخصیت 'خدمات 'افکار و نظریات پر مبنی' تفصیلی روئیداد پر مشتمل خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ چونکہ گلگت بلتستان میں اس طرح کے خصوصی شماروں کا کبھی بھی اہتمام نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کے لیے ذہنی طور پر کوئی تیار ہوتا ہے۔ بنا برایں یہ کام کافی کٹھن تھا مگر اللہ رب العزت کے فضل و کرم ، جامعہ نصرۃ الاسلام اور رئیس الجامعہ اور اہل قلم کی معاونت اور اپنا ذاتی ذوق و لگن سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس خصوصی شمارے میں آپ کو گلگت بلتستان کے تمام نامور لوگوں کی تحریریں، مضامین اور کالم پڑھنے کو ملیں گے۔ یہ میرا خدا جانتا ہے کہ ان تمام اصحاب قلم سے حضرت مولانا مرحوم پر چند صفحات ، بیان نے کس مشکل سے لکھوایا ہے۔ ہر ایک کی کتنی منتیں کرنی پڑی۔ بہتوں کو خطوط لکھے۔ بار ہا ٹیلی فونک رابطہ کیا گیا مگر کوئی مثبت جواب ندارد ۔ مجھے حیرت ان لوگوں پر ہوئی جو عمر بھر مولانا کے خوشہ چیں رہے اور مولانا کے وسیع دستر خوان سے شکم پروری کرتے رہے مگر ان کی وفات کے بعد ان پر کچھ لکھنے کو کہا گیا تو وہ طرح دے جاتے۔ شکایات کرتے۔ ٹال مٹول کرتے۔ بلکہ الٹا ہمیں موردِ الزام ٹھہراتے۔ بہر صورت بہت سارے ایسے ہیں جن سے میں لکھوانے میں

کامیاب نہیں ہوا اور کافی سارے اہل علم و قلم نے لکھا، بہت خوب لکھا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ مولانا کے کچھ قرابت داروں کے پیغامات شامل کرنے کی بے حد خواہش تھی، بار بار کے رابطے کے باوجود بھی انہوں نے ایک لفظ بھی لکھ کے نہیں دیا۔ میں یہاں یہ بات عرض نہ کروں تو ناشکری ہوگی کہ '' اس خصوصی شمارے کے تیار کرنے میں رئیس الجامعہ حضرت قاضی صاحب نے میری اچھی حوصلہ افزائی کی، ہمت بندھائی، کام کو سراہا، شمارے نے پہلے آنا تھا مگر کام کے کثرت کی وجہ سے دیر ہوئی، اس کا بوجھ بھی حضرت نے اپنے کاندھوں پر لیا اور کہا کہ '' میری وجہ سے تاخیر ہوئی ہے ''۔ انہوں نے شمارے کے حوالے سے میری تمام گزارشات کو نہ صرف ملحوظ خاطر رکھا بلکہ بہت ساری جگہوں میں میری باتوں کو ترجیح دی۔ کچھ تحریریں ایسی تھی جو ناقابل اشاعت تھی ان کو قابل اشاعت بنایا گیا، کچھ تحریروں میں اشارات وکنایات کے ذریعے جامعہ اور رئیس الجامعہ کی طرف انگلیاں اٹھائی گئی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر درگذر کردیا کہ انہیں بھی اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا حق ہے، ہمارے رسالے میں شائع ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ یقیناً یہ ان کا بڑا پن ہے۔ ورنا تو مجھے یہ بھی دیکھنے کو ملا ہے کہ فلاں کا نام ہمارے رسالے میں نہیں آنا چاہیے، یہاں تو اپنوں کے ناموں سے بھی نفرت کی جاتی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ذہن میں رہے کہ مولانا مرحوم پر لکھی گئی تمام تحریریں من وعن شائع کی گئی ہیں۔ ایک دو تحریروں میں گرائمر یا کسی ترکیب کی درستگی اور بعض جملوں کو حذف کیا گیا ہے۔ یہ کام صرف نوآموز

لکھاریوں کی تحریروں میں کیا گیا ہے ورنہ جید اہل قلم کی تحریروں میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی نہیں کی گئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ سہ ماہی نصرۃ الاسلام کی ترتیب و تزئین، پروف ریڈنگ، ایڈیٹنگ، اہل علم و قلم سے مضامین لکھوانا، سرکولیشن اور رسالے کے دفتری انتظام وانصرام، غرض سب کچھ خود مجھے کرنا پڑتا ہے، اس لیے کچھ خامیاں ہونگیں بلکہ یقینا ہیں تو آپ درگذر فرمائیں اور دعاؤں کے ساتھ نیک مشوروں سے بھی نوازیں تاکہ ہم بہتر سے بہترین کی جانب گامزن ہوجائیں۔ بہر صورت اس شمارے ہیں مولانا مرحوم کی شخصیت پر اصحاب علم و قلم ' صاحبان فکر و دانش اور ارباب سیاست وقیادت کی جاندار تحریریں پڑھ کر آپ محظوظ ہونگے۔ اور اگر موقع ملے تو اپنے مستجاب الدعوات دعاؤں میں ضرور یار رکھیے گا۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ اپنا بہت خیال رکھو۔

گلگت: منہاج الدین پر قاتلانہ حملہ، شدید غم وغصہ

11فروری2012ء بروز ہفتہ جے یو آئی گلگت بلتستان کے سیکریٹری اطلاعات جناب منہاج الدین پر گلگت سٹی میں خومر چوک کے قریب رویل ہوٹل کے قریب دن دہاڑے نامعلوم دہشت گردوں نے قاتلانہ حملہ کیا اور ان پر اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ منہاج الدین پر قاتلانہ حملہ کرنے والے موٹر بائیک پر سوار تھے۔ خومر چوک پہ ایک چیکنگ پوسٹ ہے جہاں پولیس، فوج اور رینجرز والوں کی بڑی تعداد ہمیشہ چوکس رہتی ہے اور خفیہ اداروں کے کئی اہلکار بھی موجود ہوتے ہیں، ایسی حساس اور اہم جگہ سے دن دھاڑے ایک بے گناہ شہری پر گولیاں برسا کر دہشت گردوں کا فرار ہونا خالی از علت نہیں۔ انتہائی باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ ایک منظم کوشش اور پلان شدہ منصوبے کی تکمیل ہے جو انسان دشمن عناصر کا وطیرہ عام ہے۔ گزشتہ ایک سال کے شہداء اور زخمیوں کی تعداد اور ان پر حملہ آور عناصر جو سرراہ پھرتے ہیں کا شاقبانہ جائزہ لیا جائے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائیگا۔ یہاں تو سچ بات لکھنا اور کہنا ہی قصوار سمجھا اور گردانا جاتا ہے۔ منہاج الدین پر اس ظالمانہ انداز حملہ سے حکومت اور دیگر مقتدر طبقات اور ان کے گماشتے، عوام بالخصوص اہلسنت آبادی کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہم جس کو بھی چاہیے موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ منہاج الدین ایک پرامن شہری کے

طور سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں اور قیام آمن کے لیے ان کی کوششیں ہمیشہ اچھی رہی ہیں۔اس بات کا اعتراف اپنے تو اپنے غیر بھی کرتے ہیں۔ منہاج الدین ایک سیاسی ورکر ہیں اور جس پارٹی سے وہ تعلق رکھتے ہیں وہ بھی حکومت کی اتحادی ہے۔ اگر حکومت اپنے اتحادیوں کو بھی یوں نوازیں تو پھر اوروں کے ساتھ ان کا ظالمانہ رویہ کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ بہر صورت ادارہ'' سہ ماہی نصرۃ الاسلام'' کا تمام عملہ بالخصوص چیف ایڈیٹر قاضی نثار احمد، ایڈیٹر ابن شہزاد حقانی اور دیگر تمام معاونین نے اس ظالمانہ و قاتلانہ حملے کی شدید مذمت کی ہے اور حکومت وقت سے شدید احتجاج کرتے ہیں کہ حملہ آور دہشت گردوں کو فی الفور گرفتار کریں اور ان کے پس پردہ عناصر کو بے نقاب کرکے قرار واقعی سزا دے۔سہ ماہی نصرۃ الاسلام کے مدیر اعلی اور جامعہ نصرۃ االاسلام کے رئیس نے کہا کہ منہاج الدین کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ ایک غیور سنی نوجوان اور ایک باکردار سیاسی ورکر ہے۔انھوں نے مطالبہ کیا کہ اہلسنت کے تمام شہداکے قاتلوں کو گرفتار نہ کیا گیا تو اہلسنت بھی اپنے دفاع میں سخت اقدام کرنے میں مجبور ہو جائی گی۔ہم حکومت سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ اہلسنت شہداء کو بھی پورا معاوضہ دیا جانا چاہیے اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ پوری گلگت بلتستان کے سنی عوام سے ظلم کے مترادف ہوگا۔حکومت وقت کو چاہیے کہ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کریں۔

چیف سیکرٹری اور فورس کمانڈر، خدا کے لیے موت سے بچاؤ

آج جناب چیف سیکرٹری صاحب اور اور جناب فورس کمانڈر صاحب سے ایک درمندانہ فریاد کرنے جارہا ہوں۔ میرے قارئین کو یاد ہے کہ گوہرآباد کے دونوں پلوں کے حوالے سے میری کئی تحریریں اخبارات کی زینت بنی ہے مگر کسی کے کانوں جوں تک نہیں رینگی۔ 2010ء کے سیلاب سے گوہرآباد گیس کی پُل مکمل دریا برد ہوئی تھی اور سنٹر گوہرآباد کی پل کو جزوی نقصان پہنچا تھا۔ گیس میں پل کے بجائے گراڑی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور اسی گراڑی کو اس سال بعد دیامر کے چیف انجینئر اور دیگر کی ملی بھگت سے اٹھا کر کوئی خراب گراڑی لگادی گئی تھی جس کی وجہ سے آٹھ لوگ دریا برد ہوئے تھے۔ آج تک ان کی لاشیں نہیں ملی اور نہ ہی حکومت کی طرف سے ان کے پسماندگان کی کوئی مدد کی گئی جو بہت ہی شرمناک ہے۔

اب مسئلہ سنٹر گوہرآباد کے پل کا ہے۔ اس پل کی طبعی عمر پوری ہوچکی ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ تاریں بھی سڑ گئی ہیں۔ لکڑی بھی سڑ کر خراب ہوچکی ہیں۔ میڈیا میں بار بار اس کی خرابیِ حالت کی نیوز شائع ہوئی ہیں تاہم کسی نے کسی قسم کا نوٹس نہیں لیا۔ اس پل سے روزانہ تیس گاڑیاں گزرتی ہیں۔ لوڈ ایک طرف اتارا جاتا ہے۔ بخدا پل کی کیفیت انتہائی حد تک خطرناک اور ڈراونی ہوچکی ہے۔

کسی بھی وقت بڑے حادثے کا خطرہ ہے۔ گوہر آباد کا عوامی ممبر پانچ سال تک وزیر تعمیرات رہا مگر غلطی سے بھی اس پل کی طرف نہیں دیکھا۔کچھ دن پہلے عوام نے دو دو سو روپے جمع کرکے پل کی مرمت کی کوشش کی مگر اس ادنی سی کوشش سے کیا ہو سکتا ہے۔

بہر صورت میں اپنی تحریر کو طول دینے کے بجائے گوہر آباد کے غریب عوام کی متفقہ آواز جناب چیف سیکرٹری صاحب اور جناب فورس کمانڈر صاحب تک پہنچاتا ہوں کہ خدا کے لیے کسی بڑے حادثے کے ذریعے کئی لوگوں کی جانیں ضائع ہونے سے پہلے پہلے اس پل کی حالت زار کو بہتر بنانے کے احکامات جاری کریں۔پل کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی ہے۔ ہر آدمی کی زبان پر یہی ایک لفظ ہے کہ حکومت کسی بڑے حادثے کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ میری آواز نہیں بلکہ ہزاروں لوگوں کی آواز ہے۔ گلگت شہر سے 90 کلومیٹر کے فاصلے پر شاہراہ قراقرم کے دہانے پر، یہ پل موجود ہے۔ اگر چیف سیکرٹری صاحب اور فورس کمانڈر صاحب ایک نظر دیکھ ہی لیں تو بہت مہربانی ہوگی۔ اگر نہیں تو اپنے باخبر ذرائع سے ہی تصدیق کرلیں۔ خدا کے لیے انسانی جانیں بچانے کے لیے کچھ کیجیے۔ میں وزیر اعلی اور وزیر تعمیرات سے اس لیے گزارش نہیں کرتا کہ گزشتہ پانچ سالوں میں بار بار کی فریادیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں ہیں۔اگر آپ دونوں نے یہ چھوٹا سا کار خیر کرلیا تو بخدا گوہر آباد کے عوام آپ کو نماز تہجد میں دعا دیں گے۔ جناب

چیف سیکرٹری صاحب اور فورس کمانڈر صاحب! کیا میری آواز آپ تک پہنچ سکے گی؟ اور کیا آپ میری گزارش پر گوہرآباد کی خستہ حال پُل کو ایک نظر دیکھ سکیں گے؟۔ کیا اس کی درستگی و مرمت کے احکامات جاری کریں گے؟۔ واللہ مجھ سمیت تمام گوہرآبادیوں پر آپ دونوں کا احسان عظیم ہوگا۔ ہم شدت سے منتظر ہیں۔اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

نگرں نیاٹ "کے لوگ بھی ہمدردی کے مستحق ہیں"

ضلع دیامر گلگت بلتستان کا سب سے پسماندہ ضلع ہے۔یہ بات اٹل ہے کہ ضلع دیامر ہر اعتبار سے مکمل تنزلی کا شکار ہے۔ تعلیم، صحت، میڈیا کی رسائی اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اس بے اماں ضلع کے لوگ آج بھی پتھر کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔اس بات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ باسیان دیامر کو پتھر کے زمانے میں دھکیلا جائے اور اس وادی بے نظیر کی بلند و بالا چوٹیوں کا تورابورا بنایا جائے۔

رقبہ کے اعتبار سے ضلع دیامر گلگت بلتستان کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ شاہراہ قراقرم کی ایک طویل پٹی ضلع دیامر کے زمین کو چیرتی ہوئی پاکستان اور چین کی سنگت کا سبب بنی ہوئی ہے۔ قدرتی جنگلات کا حظہِ وافر موجود ہے۔ دیامر کے لوگ محنت کش اور مشقت طلب ہیں ۔ان کی جرأت و بہادری اور مہمان نوازی کے چرچے پورے گلگت بلتستان میں ہیں۔ ضلع دیامر میں خدا تعالیٰ کی دی ہوئی تمام نعمتیں موجود ہیں لیکن اے کاش ! اگر ضلع دیامر میں نہیں ہے تو گڈ گورننس نہیں ہے۔ بہترین تعلیمی مراکز اور صحت عامہ و رفاہ عامہ کے ادارے نہیں ہیں ۔حکومتی ادارے بس نام کی حد تک محدود ہیں ۔کوئی قدرتی آفت آئے، آندھی اور زلزلے سے بستیوں کی بستیاں اجڑ جائے، کہیں آگ لگ جائے تو اس تمام

صورت حال سے نمٹنے کے لئے کوئی صورت اور سد باب نہیں ہے۔ اس سے بڑی بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ ان زلزلہ زدگان اور آفت زدہ لوگوں کی آہیں بھی بہت کم میڈیا کی زینت بنتی ہیں۔ اگر کوئی ادارہ ذمہ داری کا احساس کرتا ہوا کوئی خبر لگوانا یا لگانا چاہیے بھی تو ایک کالمی یا دو کالمی سے بڑی خبر نہیں بنتی۔ ضلع دیامر کے کسی بھی گاؤں میں کوئی بھی مسئلہ پیدا ہوا ہو، اس پر کوئی واہ ویلا کرنے والا نہیں۔ ضلع دیامر کا میڈیا پاور زیرو ہے بہت ہی کم لوگ ضلع دیامر کے مسائل کو ڈسکس کرتے ہیں۔

ارباب اختیار تو چپ سادہ لئے بیٹھے ہیں آیئے ہم آپ کو ضلع دیامر کے ایک ایسا گاؤں کا تذکرہ سناتے ہیں جس میں لاکھوں کا نقصان ہوا مگر اصحاب بست وکشاد بھی خاموش اور میڈیا کے دعویدار بھی۔

نگرں نیاٹ کا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے لوگ خطہ غربت سے بہت نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ کئی دہائیوں سے پورے گاؤں کے لوگ زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہیں۔ اس پر مستزادیہ کہ اس گاؤں پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔ کبھی طوفان و آندھی کی شکل میں تو کبھی زلزلہ کی شکل میں۔ 19 اپریل کو رات 8 بجے اس ناچار گاؤں میں ایک شدید قسم کو سیلاب آیا اور لاکھوں کی املاک خس وخاشاک کی طرح بہالے گیا۔ سیلاب سے ہونے والے نقصانات

کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہیں۔ 50 کے قریب مال مویشاں سیلاب کا ندر ہوئیں ۔ تین گھر مکمل ڈوب گئے اور پانی بہالے گیا باقی پورے گاؤں کے مکانات کو جزوی نقصان پہنچا۔ لاکھوں کی لکڑیاں نذر آب ہوئیں جس میں کڑی ، پٹاوا اور دیگر تیار کردہ تعمیراتی لکڑیاں تھیں ۔ ان غریبوں کی معیشت کا دار و مدار صرف اور صرف یہی لکڑیاں تھیں۔ کھیتوں میں اس وقت مٹر کی فصل اپنی جوبن پر تھی مگر مکمل طریقے سے پورے گاؤں والوں کا فصل تباہ و برباد ہوا ۔ ان لوگوں نے گندم مکئی سے مٹر کو ترجیح دیکر مٹر اگایا تھا کیونکہ مٹر کی ایک بوری 500 سے 700 کا فروخت ہوتی ہے۔ محنت کشوں کی تمام محنت خاک میں مل گئی ۔

اس کے علاوہ بھی متعدد بار یہ گاؤں میں قدرتی آفات کا شکار ہوا ہے۔ حکومتی ارکان نے ایک دو دفعہ برائے نام سروے بھی کیا ہے مگر ان غریبوں کو کچھ نہیں ملا ۔ کیونکہ یہ لوگ حد درجہ غریب ہیں ۔ عوامی نمائندوں اور سرکاری ہری کاروں تک ان کی رسائی نہیں ہے۔ اس گاؤں میں ایک بہت بڑا مسئلہ ایک پل کا ہے جو صرف ایک لاکھ کی قلیل لاگت سے بنوایا جا سکتا ہے مگر کوئی ہو جو عقل سلیم رکھیں ۔ آبشاروں کے پانی سے ایک بڑا نالہ بہتا ہے جسے عبور کرنے میں بہت زیادہ مشکل ہے لہذا اس گاؤں کے لوگ تین کلومیٹر کا سفر طے کرکے دوسرے گاؤں چلے جاتے ہیں اگر یہ پل بن جائے تو صرف 2 منٹ میں دوسرے گاؤں پہنچا جا سکتا ہے ۔

بہر صورت ہم ارباب اقتدار بالخصوص ضلع دیامر کے ڈپٹی کمشنر صاحب اور اس کے علاقے کے منتخب ممبر جناب بشیر احمد صاحب سے گزارش کرتے ہیں کہ خدارا ! ان غریبوں پر رحم کریں ان کے نقصانات کا اچھے انداز میں ادائیگی کریں۔ یاد رہے ان غریبوں کا سرکار اور پرائیوٹ سیکٹر میں کوئی نہیں مگر وہ خدا جو سب کا خالق و مالک ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ کون اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ان کے دکھوں کا مداوا کرتا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔ میری میڈیا کے نمائندوں سے بھی گزارش ہے کہ ایسے واقعات کی اچھی طرح رپورٹنگ کریں اور ان کے مسائل اور محرمیوں کو ارباب اختیار تک پہنچایا جائے۔ بلاشبہ نگرں نیاٹ کے لوگ بھی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ بھی انسان ہیں ان کے ساتھ انسانیت والا رویہ اپنایا جائے اور ان کے دکھوں کا بانٹا جائے۔

نوٹ: یہ کالم 2010ء کو مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ حقانی

کراچی یونیورسٹی میں B.N.S.O کی ویلکم پارٹی اور میری گزارشات

کراچی یونیورسٹی کا شمار ملک کی مایہ ناز یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔اس کا وسیع تعلیمی نیٹ ورک ہے۔28ہزار طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں اور گلگت بلتستان کے بھی ہزاروں اسٹوڈنٹ زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں یونیورسٹی کے آڈیٹوریم ہال میں B.N.S.O کی طرف سے نئے طلبہ کے اعزاز میں " ویلکم پارٹی" اور فارغ التحصیل طلبہ کو" الوداعی پارٹی "کا اہتمام کیا گیا تھا۔B.N.S.O سندھ زون کے صدر محترم اسلم انقلابی کا اصرار تھا کہ میں اس تقریب میں شرکت کروں اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کروں۔ گزشتہ کئی سالوں سے کراچی میں جہاں کہیں بھی B.N.S.O کے دونوں دھڑوں کا کوئی بھی پروگرام ہوتا ہے تو وہ احقر کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ کئی بار ان کے پروگرام میں اظہار مافی الضمیر کا موقع بھی ملا۔اب کی بار بھی اسلم انقلابی صاحب کا کہنا تھا کہ کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے صحافیوں میں ہم نے اسپیچ کے لئے آپ کو چنا ہے۔لہٰذا آپ ہر حال میں اپنی شرکت لازمی بنائیں۔ بہر صورت گلگت بلتستان یونین آف جرنلسٹ کراچی کے سنئیر نائب صدر ہونے کے ناطے میں نے شرکت کی ٹھان لی اور اپنے دیگر دوستوں کو مطلع بھی کیا۔یوں

ہم وقت مقررہ پر اپنی نشست گاہوں پر پہنچ گئے۔ ذہنی طور پر تعلیم و تربیت، جدید نظام تعلیم، قدیم نظام تعلیم اور عصری و دینی طرق ہائے تعلیم اور ان کے درمیان واقع گیپ کے بارے میں تیار ہو کر گیا تھا مگر مجھ سے پہلے چند مقررین نے موضوع سے ہٹ کر چند ایسی بے ہودہ باتیں شروع کی جو کم از کم مجھ جیسے انسان کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ان دوستوں نے انتہائی ڈھٹائی سے اسلام اور مذہب کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور قوم پرستوں کے پلیٹ فارم سے سوشلسٹ نظریات کی پرچار کیا۔ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار مذہب اور نظریہ اسلام ٹھرایا اور مذہب کو ناکام قرار دیا۔

مجھے آخر میں میر محفل محترم جناب سید حیدر شاہ رضوی سے پہلے اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ میں نے خطبہ مسنونہ کے بعد فیض احمد فیض کے معروف اشعار "ہم پرورش لوح قلم کرتے رہیں گے، جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے" سے اپنی بات کا آغاز کیا اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے چند رسمی باتیں کرنے کے بعد ان اصحاب کی خدمت میں چند بے باکانہ گزارشات عرض کردیں۔ مختصر میرا کہنا تھا کہ B.N.S.O اور"B.N.F پورے گلگت بلتستان کے حقوق کی بات کرتی ہے۔ وہاں مختلف مسالک و مذاہب اور زبان وہ تہذیب اور کلچر کے لوگ بستے ہیں۔ آپ کے منشور کے مطابق پورے گلگت بلتستان کے لوگ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں تو پورے لوگوں کی بات کی جائے۔ اپنی تاریخ کے حوالے سے بات کی جائے۔ کیا آپ کو

معلوم ہے کہ گوہر آمان، صوبیدار بابر خان، قاضی عبدالرزاق، کرنل حسن، حمید خان اور قدم خان کون تھے۔ کسی سے نفرت و برأت کے بجائے اپنے جائز حقوق اور آئینی تشخص کی بات کریں۔ بات کو موڑ کر اور تاریخ کو جھٹلا کر اپنی پسند کے نتائج اخذ کرنا اعتدال پسندی کے خلاف ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم منافقت کی پالیسی اپنائیں اور منہ میں رام رام اور بغل میں چھری کا ثبوت دیں اور قوم پرستوں کے پلیٹ فارم سے اپنے ہی مذہب و مسالک کے لوگوں پر کڑی تنقید کریں۔ قومی عناصر ترکیبیہ کو بیان کرنے کے بجائے سوشلسٹ نظریات کی تبلیغ کرنا کونسا قرین انصاف ہے۔ ہم جسے مذہب پسند لوگ بھی آپ کے ہاں آتے ہیں اور آپ سے دست محبت بڑھاتے ہیں تو آپ بجائے قریب کرنے، گلے سے لگانے کے کیوں ہمیں دور کرتے ہو۔ ہمارا صرف یہ کہ ایک حلقہ نہیں کہ ہمیں صرف مسٹروں سے واسطہ پڑتا ہے اور آپ کے ہاں آتے ہیں بلکہ ایک طبقہ ملّا والا بھی ہے۔ آپ کے پروگرام سے اُٹھ کر اپنے حلقہ میں چلے جاتے ہیں تو ہم پر کڑی تنقید ہوتی ہے اور خوب پھبتیاں کسی جاتیں ہیں۔ تاہم پھر بھی ہم ملّا اور مسٹر کے درمیان تفریق، خلیج اور تعصب کو ختم کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں اور یہاں تک مذہب کی ناکامی کی بات ہے تو پوری دنیا پر عیاں ہے کہ مذہب کبھی ناکام نہیں ہوا ہے۔ ہاں لینن اور مارکس کے نظریات نے 1979 کو دم توڑ دیا ہے۔ دھیمے انداز میں چینی سوشلسٹوں نے بھی روسی سوشلزم اور کمیونزم سے برأت کا اظہار کیا ہے۔ بہر صورت ہمیں آپس میں خلیج کو بڑھانے کے بجائے اتحاد کی رسی

کو مظبوطی سے تھامنا چاہیے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گلگت بلتستان کے دونوں قوم پرست دھڑے اپنے اپنے انداز میں حقوق اور آئینی حیثیت کی بات کرتے ہیں۔ مجھے ان دونوں دھڑوں کے احباب و ذمہ داروں سے نیاز مندی ہے۔ اکثر ان کے ساتھ پروگرام میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔ 2006 سے اب تک ان کے ساتھ کئی تفصیلی نشستیں رہی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ان کے پاس علاقائی حوالے سے وسیع معلومات ہیں۔ میری جب بھی کسی قوم پرست رہنما سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کو کرید کرید کر علاقے کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ محترم نواز خان ناجی، نفیس بگورو، الیاس صاحب، عابد شاہ، عبدالرازق، محترم جناب حیدر شاہ رضوی، بابا جان، بھائی عزیزالرحمان، فیض اللہ فراق اور اسلم انقلابی اور ڈی جے مٹھل کے ساتھ جتنی بھی نشستیں رہی ہیں بے مثال تھیں۔ ان کے ساتھ علاقائی کلچر، تہذیب و تمدن، آئینی حیثیت، جغرافیائی حیثیت اور کام کے طریق کار کے حوالے سے گرما گرم بحثیں ہوتیں رہتیں ہیں۔

نواز خان ناجی صاحب کو تو گلگت بلتستان کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

2007 کو لیاقت میموریل لائبریری کے آڈیٹوریم ہال میں ان کو

تفصیل سے سننے کا موقع ملا اور مختصر سی ملاقات ہوئی۔ حیرت ہوئی کہ گوہر آباد کے ایک ایک بستی سے واقف ہیں۔ ہماری برادری کے اندرونی مسائل و تنازعات تک سے آگاہی رکھتے ہیں ایسے لوگ قوم پرست کہلانے کے بھرپور مستحق ہیں۔ کھرمنگ سے تعلق رکھنے والے سید حیدر شاہ رضوی صاحب کے جذبات اور معلومات بھی قابل رشک ہیں۔ قوم پرستوں میں میں نے یہ واحد آدمی دیکھا ہے جو مذہبی تعصّبات سے یکسر خالی ہے اور ہر مذہب و مسلک کے لوگوں کو برابر کا احترام دیتے ہیں۔ سوشلسٹ نظریات کے ناقد ہیں ۔ قوم پرستی بھی اسلام کے حدود میں رہ کر کرنے کے خواہ ہیں۔ حیدر رضوی صاحب نے پروگرام میں پر مغز، معلوماتی اور جذباتی تقریر کی اور دوران تقریر کئی دفعہ میرے خیالات کی تائید کی اور شکریہ بھی ادا کیا۔ پروگرام کے بعد وار فتگی سے بغل گیر ہوئے۔ ہمارے قوم پرست اور وفاق پرست دوستوں کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے۔ یہ ہر گز نیک شگون نہیں بالخصوص حالیہ انتخابات کے بعد تو دوری اور عدم اعتماد کی بھرپور فضا قائم ہوئی ہے۔ میں گلگت بلتستان کے قوم پرست اور وفاق پرست دوستوں اور رہنمائوں سے گزارش کرونگا کہ وہ علاقے کے حوالے سے کوئی بھی تحریک، قدم اُٹھائے اور نعرہ لگانے اور بیان دینے اور عملی اقدام کرنے سے پہلے علاقے کی آئینی و جغرافیائی حقیقت کو سامنے ضرور رکھیں۔

مختصر الفاظ میں عرض ہے کہ گلگت بلتستان کے علاقے بھارت یا پاکستان کے نہیں بلکہ متنازعہ ریاست جموں کشمیر کا آئینی اور جغرافیائی حصہ ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک ناقابل تردید تاریخی اور جغرافیائی حقیقت ہے۔ تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔ پاکستان کے ہر آئین نے اس واشگاف حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے تو تینوں آئینوں میں کہیں پر بھی اس علاقے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ موجودہ پیکج یعنی گلگت بلتستان گورننس آرڈ بھی ایک ایگزیکٹو صدارتی حکم نامہ ہے۔ اسکی کوئی آئینی حیثیت اور عدالتی تحفظ نہیں ہے۔

اقوام متحدہ میں بھی پاکستان کا کشمیر کیس ایسے حقائق پر مبنی ہے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کی عدالت عظمی نے بھی اس تاریخی حقیقت کا بانگ دھل تسلیم کیا ہے۔ 20اپریل 1949 والا معاہدہ کراچی بھی اس کی عکاسی کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی قرار دادیں جنہیں پاکستان نے تسلیم کیا ہے انہی حقائق پر منحصر ہیں۔ یہاں تک کہ 1963کا پاک چین سرحدی معاہدہ بھی اسی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ گزشتہ 6دہائیوں سے پاکستان کا اصولی موقف بھی ظاہراً یہی رہا ہے۔ کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا تعین کرنے کا حق صرف وہاں کے عوام کو حاصل ہے۔ اگرچہ سابق ڈکٹیٹر نے کچھ واہیات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں بھی اسی موقف پر مبنی ہیں ۔ اسی جاندار موقف کی وجہ سے تو سلامتی کونسل میں پاکستان کو ابتدائً حمایت حاصل رہی ہے اور یہی

حقیقت پاکستان کو بھارت پر آئینی اور اخلاقی برتری دلاتی رہی ہے۔
یہ بھی روزِروشن کی طرح عیاں ہے کہ گلگت بلتستان کی آئینی و جغرافیائی حیثیت سے قوم پرست اور وفاق پرست دونوں تذبذب کا شکار ہیں ۔ دونوں حد درجہ غلو اور تجاوز سے کام لیتے ہیں۔ کوئی بھی واضح اور متعین پوزیشن اختیار کرنے سے نالاں ہیں اور اپنی اپنی راگ الاپنے میں مصروف ہیں ۔ہر دو نظریہ و سوچ رکھنے والے احباب کو مل جل کر کام کرنا چاہیئے ۔ مرکز پرستوں کو چاہیئے کہ قوم پرستوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے ۔ انکے جائز تحفظات کو خوش دلی سے سن لیں اور ازالہ کریں ۔ اور قوم کے ان بہترین نوجوانوں کو خس وخاشاک کی طرح اڑ جانے سے بچائیں اور ان کو ان کا جائز مقام دیں ۔ پھر دیکھیں کہ یہ بھپرے نوجوان کیسے آپ کے صفوں کے سپاہی بنتے ہیں ۔ ورنہ یہ کسی بھی وقت طوفان کی طرح تمہارے کھیت وکھلیان کو بہالیں گے ۔ میری ان بے ربط باتوں پر جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل و دماغ اور سنجیدگی سے غور کریں ۔
بہر صورت ہم تو فیض احمد فیض کے مقلد ہیں ۔

هم پروش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھائیں گے
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارہ
دم ہے تو مداوا الم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ تم کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

نوٹ: یہ کالم بھی 2009 کو مقامی اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ حقانی

گلگت بلتستان میں خدماتِ قرآن

قرآن کریم اللہ تعالی کی آخری کتاب ہے۔ اللہ تعالی نے اس مقدس اور عظیم کتاب کو ایک مقدس اور عظیم فرشتے کے ذریعے ایک مقدس و عظیم شہر میں ایک مقدس اور عظیم نبی کے سینہ انور پر اُتارا، اس کتاب مبارک کی عظمت کی گواہی، تقدیس کی شہادت، اگر کوئی فلسفی، اسکالر یا دانشور دے دیتا تو اس میں قیل و قال اور تنقید کی گنجائش ہوتی مگر اس کے لاریب ہونے کی گواہی خود کائنات کے رب نے دی ہے۔ اللہ جل وعلا نے قرآن کریم کے ابتداء ہی میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ '' ذلک الکتاب لاریب فیہ، ھدی للمتقین '' اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو، اللہ تعالی نے اس کتاب مقدس کی سچائی و صفائی پر مہر ثبت کرنے کے بعد اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا انحصار بندوں پر نہیں چھوڑا ہے جیسا سابقہ کتب سماوی کی حفاظت کی ذمہ داری اسی امت پر چھوڑ دی تھی بلکہ رب العزت نے اس آخری کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی۔ اللہ تعالی نے شفاف اور واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ '' انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون '' ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں چنانچہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قرآن مجید حرکات و سکنات کی کسی ادنی سی

ردو بدل اور تبدیلی کے بغیر اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور روز قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیگا۔ قرآن کریم میں کجی ڈھونڈنے کی کوشش دور رسالت ہی سے ہوئی تھی جب مشرکین اور دوسرے کفار نے قرآن کریم کو پرانے لوگوں کے قصے، شاعرانہ کلام اور خود ساختہ کوشش قرار دیا تو اللہ تعالی نے چیلنج کیا کہ تم میں بڑے بڑے فصیح وبلیغ شاعر موجود ہیں۔ تمہارے کام کے بڑے چرچے ہیں لہذا قرآن جیسی کوئی کتاب لا کر دکھاؤ! اللہ نے فرمایا کہ '' فاتوا بمثل ھذا القرآن '' اور اللہ تعالی نے اجازت دی کہ اس کی تخلیق میں اپنے تمام معبودوں سے بھی مدد لے سکتے ہو۔ جب وہ قرآن جیسی کتاب لانے سے قاصر رہے تو ان کو یہ چیلنج کیا گیا ''فاتوا بعشر سور مثلہ ''کی سورتوں کی طرح دس سورتیں لا کر دکھاو، پھر یہ بھی نہ ہوسکا تو اللہ نے فرمایا'' فاتوا بسورۃ مثلہ '' قرآن کریم کی ایک سورت جیسی کوئی سورت لے کر آؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ کوثر کو لکھوا کر خانہ کعبہ کے دیوار پر چسپاں کرکے اعلان کر دیا کہ سورۃ کوثر جیسی سورت بھی لا کر دکھاؤ۔ مگر کہاں کلام اللہ اور کہاں بندوں کی رسائی! اسی طرح قرآن پاک میں کجی، کمی اور اعوجاج کی کوششیں آج تک جاری ہیں مگر جس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدائے ذوالجلال نے لے لی ہو اس میں تحریف وتنقیص اور کمی وبیشی کی ناپاک کوشش وسعی کرکے کون کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

آج کوئی بد بخت کاغذی اوراق میں صحت قرآن اور اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کیلئے قرآن کی تفسیر و ترجمہ میں تحریف و تغیر کرکے اپنے مذموم مقاصد کا پرچار اور تکمیل کی کوشش تو ضرور کرتا ہے مگر کون بتائے! ایسے خبث باطن رکھنے والے افراد، ادارے اور مغرب نواز شخصیات کو کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی حفاظت کس احسن انداز میں فرما رہے ہیں، آج ہم اگر اعداد و شمار کرنے بیٹھ جائیں کہ پوری دنیا میں حفاظ قرآن اور مفسرین قرآن کی تعداد کیا ہو گی؟ تو شاید صدیاں لگ جائیں۔ اگر ہم صرف اور صرف وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا گذشتہ 40 سالہ ریکارڈ دیکھ لیں تو حفاظ اور کتاب اللہ کے پڑھنے پڑھانے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز نظر آ ئیگی۔ اس سے قطع نظر، آج ہم اکیسوی صدی کے ایک بے آئین علاقے کے سب سے پسماندہ علاقے گلگت بلتستان کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں جہاں کی معاشی و سیاسی اور عصری تعلیم کی زبوں حالی کا کف افسوس ملنے کے علاوہ کوئی اور مداوا نہیں مگر قرآن مجید کی خدمت گذشتہ ۴۰ سال سے جس وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے اس کا گمان کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا۔ ضلع دیامر میں حفظ قرآن اور ترجمہ و تفسیر کا جو اہتمام سہولیات اور بنیادی ضروریات کی عدم موجودگی میں ہو رہا ہے آج کے عیش پرست اور سہولیات کے خوگر انسان کے بس کی بات نہیں۔ قاری اشرف مدظلہ نے 33 سال سے گوہر آباد میں

بلامعاوضہ انجام دیا ہے۔100 حفاظ سے زائد کی تعداد ایسی ہے کہ جس نے پورا قرآن قاری صاحب سے حفظ کیا ہے ۔یہ حفاظ گلگت بلتستان اور ملک کے دیگر شہروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔داریل وتانگیر اور تھک نیاٹ کے علماء کرام بھی قرآن کی بہترین خدمت کررہے ہیں ۔ حفظ و ناظرہ کے علاوہ تفسیر وترجمہ پڑھانے کاجو انتظام کیا ہے وہ قابل رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

داریل میں گذشتہ ۳۰ سال سے کئی نامور علماء کرام تفسیری دورے کروارہے ہیں جن یں مولانا عبدالحلیم صاحب اور مولانا عبدالوکیل صاحب قابل ذکر ہیں اور استاد شیخ مولانا عبدالکریم، مولاناسید محمد، مولانا محمد طاہر بھی قرآنی خدمت میں ہمہ تن، مصروف ہے۔اس طرح پورے گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ تفسیرِ قرآن کریم پڑھانے کا اہتمام تانگیر میں ہوتا ہے۔ کئی جید علماء کرام حلقہ ہائے درس پورا سال جاری رکھتے ہیں اور سالانہ تعطیلات میں مختلف مقامات میں تفسیری دورے کروائے جاتے ہیں۔ امیر المجاہدین ،استادالعلماء مولانا شہزادہ خان رحمہ اللہ نے (مصنف مواہب الرحمان فی القرآن و درالمعانی فی سبع المثانی ،) مسلسل باون سال تانگیر اپنی مدرسے میں درس قرآن و دورہ تفسیرالقرآن کروایا۔ مرحوم قرآن کی تفسیری حواشی بھی لکھ رہے تھے۔شاید مکمل کی ہو۔ مولانا متر جان مرحوم نے زندگی بھر درس قرآن دیا۔ مولاناعبداللہ، شیخ الادب مولانا بختیار، مولانا عبدالقادر، مولانا عبدالقیوم، مولاناغلام ،الدین شاہ

مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالشکور صاحب دیامری (مصنف اصطلاحات القرآن) کے تفسیری دورے معروف و مشہور ہیں۔ سینکڑوں طلبہ ان کے تفسیری دورں میں شرکت کرتے ہیں۔ قاری حیدر صاحب بھی حفظ قرآن کی تعلیم دے رہے

ہیں۔ مولانا عبدالوکیل تھک، مولانا عبدالوہاب تھور داس، مولانا مطیع الرحمان نیاث اور چلاس شہر میں، مولانا امان اللہ ہوڈر چلاس، مولانا سیف الرحمان، مولانا صبور، مولانا میور، مولانا محیط اور شیخ الحدیث مولانا عبدالقدوس صاحب مدظلہ وغیرہ قرآن کریم کے ترجمہ و تفاسیر میں بڑی تگ و دو کر رہے ہیں۔ مونا عبدالقدوس کے درس قرآن میں تو بڑے بڑے جید علماء کرام بھی شامل ہونا سعادت سمجھتے ہیں۔ اور بھی کئی حفظ کے مکاتیب پورے انہماک سے خدمت قرآن میں مصروف ہیں۔ گونر فارم کا مدرسہ انوارالصحابہ بھی دینی اور سماجی خدمات میں کوشاں ہے۔ ضلع دیامر میں درجنوں دینی ادارے درس نظامی اور حفظ قرآن کی تعلیم دے رہے ہیں۔ جہاں طلبہ و طالبات قرآنی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

اگر آپ ضلع دیامر سے باہر نکل کر پورے گلگت بلتستان کا ایک طائرانہ جائزہ لیں تو آپ کو کئی معیاری دینی درسگاہیں نظر آئیں گی۔ جگلوٹ میں دیامر کے ایک عظیم سپوت مولانا معاذ صاحب نے شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب زیدہ مجدہ کی زیر سرپرستی ایک عظیم دارالعلوم '' دارالعلوم تعلیم القرآن '' کے نام سے

قائم کرکے کے درس نظامی کی تعلیم شروع کیا ہے۔ ان کے ہاں سالانہ دورہ تفسیر القرآن کا خوب اہتمام ہوتا ہے۔ دار لعلوم جگلوٹ اور ترتیل القرآن تو کئی سالوں سے بہترین قرآنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مدرسہ عائشہ صدیقہ للبنات جگلوٹ میں مولانا سید محمد صاحب کی نگرانی میں درس نظامی کی مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں سے کئی عالمات و حافظات فاضل ہوئیں ہیں۔ جامعہ نصرۃ الاسلام ایک عظیم الشان اور نسبتاً قدیم اوراولین دینی ادارہ ہے جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کے ایک نامور فاضل، شیخ العرب والعجم حضرت مدنی کے تلمیذ رشید مولانا قاضی عبدالرّزاق نے رکھی ہے۔ یہاں ۳ دہائیوں سے دینی وقرآنی تعلیم دی جارہی ہے۔ امیر اہلسنت والجماعت و خطیب جامع مسجد گلگت قاضی نثار احمد صاحب نے کئی سال دورہ تفسیر پڑھایا۔ قاضی صاحب بتارہے تھے کہ بہت سارے لوگوں نے استفادہ کیا،اور میں خود بھی عربی اور اردو کے تمام تفاسیر کا بالاستیعاب مطالعہ کرتاتاکہ بہترین طریقے سے درس کا اہتمام ہوسکے۔ جامعہ نصرۃ الاسلام میں جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا خلیل الرحمان داریلی، مولانا بشیر اور مولانا عبدالستار کا بھی درس قرآن ہوتا ہے۔ حفظ قرآن کی بہترین تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی قاری ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ نصرۃ الاسلام کی ذیلی شاخ ،جامعہ عائشہ صدیقہ لبنات الاسلام میں پانچ سو طالبات حفظ قرآن اور قرآنی علوم سے مستفید ہورہی ہیں۔مدرسہ ابوہریرہ مناور اور مدرسہ قاسم العلوم پڑی میں بھی حفظ قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی اور مدارس

بھی ہیں جہاں قرآن پاک پڑھایا جاتا ہے۔ جامعہ الطاف الرحمان کشروٹ میں بھی تعلیم القرآن کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ بسین گلگت میں بھی حفظ قرآن کی کلاسیں ہیں۔

ضلع غذر کے کیپٹل ایریا گاہکوچ میں دارالعلوم کراچی کے فاضل مفتی شیر زمان صاحب نے ایک عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیوں کو حفظ قرآن اور درس نظامی کا سلیبس بہت ہی معیاری انداز میں پڑھایا جاتا ہے۔ مفتی صاحب اور ان کی ٹیم انہماکی سے علوم قرآن و حدیث کی ترویج و تنشیر میں مصروف ہے۔ مدرسہ حدیقۃ الاسلام چٹوڑ کھنڈ اور دارالعلوم یاسین و گوپس میں بھی تعلیم القرآن کا سلسلہ کئی سالوں سے جاری ہے۔ مرکز اہلسنت سٹلائیٹ ٹاون اسکردو کے علماء کرام بہترین حکمت عملی سے کئی مدارس، مکاتب اور مساجد کا انصرام سنبھالے ہوئے ہیں وہ قابل داد بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ بلتستان کے مولانا حق نواز صاحب، مولانا ابراہیم خلیل، مولانا عبد اللہ، مفتی شریف اللہ، مفتی سرور، مولانا، مولانا یاسین، مولانا رحمت اللہ، حبیب اللہ راشدی، عطاء اللہ راشدی اور معروف شاعر مولانا احسان اللہ محسن اور دیگر علماء کی مساعی جمیلہ قابل مبارک ہے۔ ڈغونی کی مدرسہ سلطان المدارس، براہ کی جامعہ صدیقہ للبنین والبنات، دارالعلوم غواڑی اور المرکز الاسلامی اسکردو شہر وغیرہ کے اصحاب خدمتِ قرآن میں مصروف ہیں۔ ان وحشت کدوں اور ظلمت کدوں میں حق کے دیے

جلانا دل گردے کا کام ہے۔ ضلع استور میں بھی کئی قرآنی مکاتب ہیں۔ قاری عبدالحکیم استوری، قاری گلزار، مولانا اکرام الحق اور دارالعلوم استور نے علاقے میں قرآن کی بڑی خدمت کی ہے۔

جمیعت تعلیم القرآن ٹرسٹ کی خدمات بہت زیادہ ہیں اور ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ہر محلّہ اور مسجد میں ان کے مکاتیب ہوتے ہیں۔ بلاشبہ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے زیر اہتمام ہزاروں حفاظ اور ہزاروں لوگوں نے ناظرہ قرآن پڑھا۔ علماء و قراء اور قاریات و فاضلات کے لئے تعلیم القرآن ٹرسٹ والے سالانہ تجویدی کورس کا انعقاد کرتے ہیں جس میں سینکڑوں علماء وحفاظ تربیتِ قرآن پاتے ہیں۔ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے لیے مولانا نذیراللہ مرحوم سے لے کر موجودہ مولانا عبدالحلیم اور قاری فیض الحق اچھی کارکردگی سے خدمت قرآن انجام دے رہے ہیں۔ گلگت بلتستان میں اقرء روضۃ الاطفال کی سنگ بنیاد جید اکابر علماء نے رکھی ہے۔ اقراء کی بنیاد میں شیخ الاسلام یوسف لدھیانوی کے ساتھ قاضی نثاراحمد کا کردار کلیدی ہے۔ اقراء نے گلگت بلتستان میں پانچ ہزار حافظ قرآن پیدا کیے۔ اقراء کا سلسلہ تعلیم القرآن روز بروز بڑھتا جارہاہے۔ پورے گلگت بلتستان میں اقراء روضۃ الاطفال کی قرآنی کلاسیں ہیں جہاں ہزاروں طلبہ و طالبات حفظ قرآن سے مستفید ہورہی ہیں۔ حفظ قرآن کے بہترین نتائج مل رہے ہیں۔ اقراء دینی اسکولی خدمات اس کے علاوہ ہیں۔

یقین جانیں ! میں ان اکابر علماء کرام کی کوششوں کو دیکھتا تو دل خوشی کے بلیوں اچھلتا ہے اور مجھے گلگت بلتستان کا ایک شاندار اور روشن مستقبل نظر آتا ہے اور مجھے مغرب کی باد سموم سے متاثر تمام افراد، ادارے اور ان کے مکروہ عزائم تار عنکبوت دکھائی دیتے ہیں جو قرآن کی عظمت اور حقانیت کو مٹانے کے درپے ہوتے ہیں۔ میری ان تمام منتظمین مدارس واداروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے پروگراموں کو منجمد نہ ہونے دیں بلکہ مزید ترقی کی راہیں ہموار کریں۔ اصحاب ثروت سے اپیل ہے کہ ان کے ممد و معاون رہے۔ وکلاء برادری سے درخواست ہے کہ ان کے قانونی حقوق کی جنگ لڑیں۔ صحافی برادری سے خواستگار ہوں کہ ان کی خدمات کو اجاگر کرکے منظر عام پر لے آئیں۔ علماء کرام اور مدرسین عظام سے دستہ بستہ عرض ہے کہ خدمت قرآن اور خدمت دین مکمل خلوص سے کریں۔ یہ مختصر معلومات مکتبہ اہل سنت والجماعت کے حوالے سی تھی۔

گلگت بلتستان کے دوسرے مسالک کے علماء و مشائخ اپنی اپنی ترتیب سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ زندگی رہی تو ان کی تفصیلات سے بھی قارئین کو آگاہ کرونگا۔اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

ووٹ، ووٹر، امیدوار اور موجودہ جمہوریت

فی زمانہ الیکشن جمہوری نظام میں ہوتے ہیں۔ جمہوریت کو ایک ایجنڈے کے تحت ''عالمی سلوگن'' بنادیا گیا ہے اور پوری انسانیت کو باور کروایا گیا ہے کہ ان کی کامیابی وکامرانی اور ان کے تمام بنیادی حقوق کا حصول جمہوری نظام میں پنہاں ہیں۔ یہی کچھ عالم عربی اور مسلم دنیا کے عوام و خواص کے دل ودماغ میں نقش پتھر کی طرح راسخ کیا گیا ہے۔ چونکہ ہم ایک مسلم ریاست کے باسی ہیں اور پھر اسی ریاست کے ایک ایسے خطے کے شہری ہیں جو آج کے جدید دور میں اپنی آئینی و شہری حیثیت سے ناآشنا ہے بلکہ محروم ہے۔ اسی خطہ بے آئین میں بہت جلد الیکشن ہونے والے ہیں۔ اس لیے ضروری سمجھا کہ عامۃ الناس کو بالعموم اور خاصۃ الناس کو بالخصوص الیکشن، ووٹ، ووٹر، کینڈیڈیٹ کی شرعی حیثیت، فی زمانہ اس کی افادیت واہمیت اور جمہوری نظام کی کارستانیوں کے ساتھ اس کے دلکش سلوگن سے بھی آگاہ کروں۔

اولاً یہ جاننا از حد ضروری ہے کہ ووٹ کہا کس چیز کا جاتا ہے یعنی ووٹ کی تعریف کیا ہے۔ آج کے جمہوری نظام کے قیام ہیں ووٹ اہم ترین حصہ ہے، بذریعہ ووٹ کسی بھی ملک کے شہری اپنے حلقے سے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو پارلیمنٹ یا قانون ساز اسمبلیوں میں جا کر عوامی مفاد میں قانون سازی کرتے

ہیں۔ چونکہ موجودہ ووٹ یا الیکشن کی تعریف قرآن و حدیث سے تو ملنی ناممکن ہے لہٰذا ووٹ کی تعریف سمجھنے کے لیے ہمیں انگریزی کا ہی سہارا لینا ہوگا۔ چونکہ ہم پاکستان پھر گلگت بلتستان کے ہیں اور یہاں جمہوری پارلیمانی نظام ہے۔ایک جمہوری و پارلیمانی نظام میں ووٹ کی حیثیت واہمیت اور ووٹروں کے کردار کے تعین کیلئے وہی ریفرنس یا مراجع قابل قبول ہو سکتے ہیں جو اس نظام کو ترتیب دینے اور چلانے والوں کے ہاں معروف ہیں۔انٹرنیٹ میں ایک انسائیکلوپیڈیا میں ووٹ کو یوں بیان کیا ہے۔

A vote is a formal expression of an individual's choice in voting, for or against some motion (for example, a proposed resolution), for or against some ballot question, for a certain candidate, a selection of candidates, or a political party.

ایک انگلش ڈکشنری میں یوں لکھا دیکھا۔

to express your choice or opinion, especially by officially writing a mark on a paper or by raising your hand or speaking in a meeting:

اکسفرڈ انگلش ڈکشنری سے رجوع کیا تو وہاں ووٹ کی ڈیفینیشن کچھ یوں ملی۔

A formal indication of a choice between two or more candidates or courses of action, expressed typically through a ballot or a show of hands.

بعض مسلم مفکرین اور علماء نے قیاس کے ذریعے موجودہ ووٹ کی شرعی حیثیت بیان کی ہے۔انہوں نے ووٹ کو گواہی یعنی شہادت، وکالت، امانت، مشورہ اور سفارش وغیرہ سے تعبیر کیا ہے مگر تحقیق و تجسس کے بعد ووٹ کی موجودہ حالت دیکھ کران تمام تعبیرات کو دل ماننے سے انکاری ہے۔ ہم ایک اسلامی مملکت میں رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اسلامی جمہوریت کا بھی تجربہ کیا جاتا رہاہے۔اگر چہ بار بار یہ تجربے ناکام ثابت ہوچکے ہیں۔بنیادی طور پر جمہوریت نظام اسلامی سے متصادم نظام ہے۔ اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ موجودہ جمہوری نظام خالصتاً مغربی وفکر و نظر کا پروردہ ہے۔ کارپوریٹ جمہوریت میں مسلمانوں کے لیے کوئی بھلائی نہیں ، یہ جاگیرداروں، ملٹی نیشنل کمپنیوں، اور سرمایہ داروں کا ایک الجھا ہوا کھیل ہے۔ باوجودیکہ ، نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں جمہوری سسٹم میں رہنا ہے اور اسی میں بہتری اور خیر کو ڈھونڈنا ہے یعنی جلبِ منفعت کے بجائے دفعِ مضرت کے طور پر اس سسٹم کو قبول کرنا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوری حکومتوں کی بنیاد عوام کے ذریعہ منتخب ہونے والی حکومت پر ہوتی ہے اور پاکستان کا آئین بھی اس طرز عمل کی سفارش کرتا ہے۔ لامحالہ ہمیں اس نظام کی خرابیوں کو ساتھ قبول کرنا ہے۔اور ووٹ یا الیکشن در حقیقت جمہوری ممالک کے لیے بہت ہی خاص موقع ہوتا ہے۔چوں کہ انتخابات کے عمل کا سارادار ومدار ووٹ پر ہوتا ہے اس لیے یہ جانا لازم ٹھہرتا ہے کہ ووٹ

کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مختلف مفکرین نے اس کو کس حد تک لازم قرار دیا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ انہوں نے دفعِ مضرت کے لیے موجودہ الیکشن کے نظام کو قبول بلکہ لازم قرار دیا ہے۔اس حوالے سے میں اپنے الفاظ یا رائے کی بجائے ایک جید عالم دین کی تحریر کو نقل کر رہا ہوں۔ مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی صاحب ہندوستان کے نامور عالم دین ہیں۔ وہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (مارچ 2013) انڈیا کے اپنے ایک تحقیقی مضمون ''جمہوری نظام میں الیکشن اور اسلامی نقطہ نظر'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ

'' ووٹ کی شرعی حیثیت : ووٹ (vote) انگریزی زبان کا لفظ ہے۔اس کا عربی متبادل انتخاب اور تصویت ہے۔ جب کہ اس کا اردو متبادل ہے نمائندہ چننا، حق رائے دہی کا استعمال کرنا ہے۔ جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ اسمبلی، کونسل ،بلدیہ یا اس جیسے اداروں کے لیے عوام کے ذریعہ نمائندہ چننے کا عمل ووٹ پر منحصر ہوتا ہے؛چوں یہ کہ اصطلاح مستحدث اور نئی ہے۔حکومت سازی کے لیے انجام دیا جانے والا یہ عمل چوں کہ عہد سلف میں موجود نہیں تھا،اس لیے اس کا استعمال قرآن وحدیث میں نہیں ہوا ہے، لیکن معنوی اور اصولی طور پر اس کے لیے ذخیرۂ شریعت میں ہدایتیں موجود ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے ووٹ کی متعدد حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔

ا) شہادت : شہادت کا مفہوم ہے عینی مشاہدہ یا بصیرت کی بنیاد پر کسی چیز کے)

برحق ہونے کی گواہی دینا۔ قول صادِر عن عِلم حصل بمشاہدِ بصر و بصیر
راغب، جرجانی) ایک لحاظ سے ووٹ کی حیثیت عرفی شہادت اور گواہی کی ہے، اس لیے)
کہ ووٹر ووٹنگ یا حق رائے دہی کے استعمال کے وقت یہ سمجھتا ہے کہ فلاں امیدوار اس
عہدہ کے لائق ہے، جس کے لیے اس نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے یا پارٹی کی طرف سے
اسے امیدوار نامزد کیا گیا ہے۔ اور وہ پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو
انجام دے سکتا ہے، وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ امیدوار اس مقصد کے لیے
موزوں اور قوی وامین ہے۔ چاہے وہ دوسرے کاموں کے لیے موزوں نہ ہو۔
۲) سفارش: ووٹ کی ایک حیثیت سفارش کی بھی ہے۔ گویا کہ ووٹر کسی متعین)
امیدوار کے سلسلہ میں مجاز اتھارٹی سے یہ سفارش کرتا ہے کہ وہ ممبر پارلیمنٹ یا ممبر
اسمبلی بننے کے لائق اور اہل ہے اور وہ اس عہدہ کی اور منصب کی ذمہ داریوں کو بہتر
طور پر انجام دے سکتا ہے؛ لہٰذا میں اس کے انتخاب کی سفارش کرتا ہوں۔ شفارش کے
بارے میں قرآن کریم کا حکم یہ ہے'' من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منھا و من
یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا وکان اللہ علی کل شئ مقیتا '' (النسا: ۸۵) یعنی جو شخص
اچھی بات کی سفارش کرے گا اس کے لیے اس کے اجر میں سے ایک حصہ ہوگا اور جو
بری بات کی سفارش کرے گا اس کے لیے بھی اس کے گناہ کا کچھ بوجھ ہوگا اور اللہ ہر چیز
پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

لہذا رائے دہندگان اگر اچھے امیدوار کا انتخاب کریں گے تو یہ عمل ان کے لیے باعثِ اجر ہوگا اور اگر غلط امیدوار کا انتخاب کریں گے تو باعثِ مواخذہ ہوگا۔

۳) وکالت: وکالت کا مفہوم ہے کسی مخصوص کام کے لیے کسی انسان کو اپنا نمائندہ) اور نائب چننا۔ ووٹ کی ایک حیثیت وکالت کی بھی ہے۔ گویا ووٹ دینے والا حق رائے دہی کا استعمال کرکے در حقیقت اس حلقہ کے کسی امیدوار کو سیاسی امور، کارِ حکومت کی انجام دہی۔ یا پارلیمنٹ کی تشکیل اور وزیر کے انتخاب کے لیے اپنا وکیل اور نمائندہ منتخب کرتا ہے، اس اعتبار سے اگر ووٹر نے سیاسی امور کی انجام دہی کے لیے کسی نا اہل امیدوار کو کامیاب بنا دیا اور جیتنے کے بعد اس شخص نے قوم وملت کے حقوق کو پامال کیا اور ظلم وزیادتی کو راہ دی، تو ووٹر بھی اپنے رول کی حدتک اس کے گناہ میں شریک ہوں گے۔ اور اگر اچھے کام کیے، تو اس کی نیکیوں میں شریک ہوں گے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ووٹ کے اندر چاروں مفہوم ہونے کے باوجود اس پر شہادت کا مفہوم غالب ہے، ہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی ہے''۔

اس حقیقت سے کوئی عاری نہیں کہ موجودہ دور میں جمہوری وغیر جمہوری ممالک میں ،اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپلز کمیٹیوں، سیاسی جماعتوں اور سماجی انجمنوں

فشاری گروپس اور دیگر پروفیشنل اتحادوں کے انتخابات میں جمہوریت کے نام پر جو ناروا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ان انتخابات میں عالمی اور علاقائی جاگیردار اور سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بل بوتے تمام طاغوتی وسائل استعمال کرکے جو نتائج حاصل کرتے ہیں ان کی ہولناکیاں کہاں مخفی ہیں۔ باوجود اس کے ہمیں اس انتخابی عمل کو کسی کی ہار جیت کا کھیل سمجھ کر تماشہ بین نہیں بننا چاہیے بلکہ ہمیں احساس کرنا چاہیے کہ یہ سلسلہ ہماری دنیاوی نفع و نقصان کی حد تک نہیں رہتا بلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت و معصیت اور گناہ و ثواب بھی ہے، اس میں جزا و سزا کا عمل بھی ہے۔اگر یہاں سستی وکاہلی کی گئی تو اس کے بد اثرات آخرت میں ہمارے گلے کا ہار، عذابِ دوزخ کی شکل میں بن سکتی ہے۔

انتخابات میں کنڈیڈیٹ یعنی امیدوار کی حیثیت بھی انتہائی اہم ہوتی ہے۔پاکستان کے آئین میں اسمبلی ممبر کے لیے ارٹیکل 62, 63 میں جو شرائط رکھی گئی ہیں وہ تو انتہائی سخت ہیں۔ اگر عمیق جائزہ لیا جائے تو ان شرائط پر تو دو چار ہی پورے اتر سکتے ہیں۔آئین پاکستان کی روح سے، جو بھی آدمی کنڈیڈیٹ بننے کا اعلان کرتا ہے گویا وہ دو چیزوں کا دعویٰ کرتا ہے کہ ایک تو وہ ممبر بننے کے صلاحیت رکھتا ہے، مطلوبہ تمام اہلتیں اس میں موجود ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ امین و صادق بھی ہے اور قوم وملت کا درد بھی رکھتا ہے۔اور

آئین کا تقاضا بھی یہی ہے۔ تاہم کنڈیڈیٹ کو خود سے دعوے کرنے کی بجائے اس کے حلقے کے سمجھ دار اور باشعور لوگوں کو چاہیے کہ کسی باشرع، صوم وصلوۃ کے پابند امین اور سمجھ دار آدمی کو اپنا کنڈیڈیٹ منتخب کریں تاکہ وہ کل ممبر بن قومی، ملکی، ملی اور اپنے حلقے کے عوام کی مفادات کا حفاظت کر سکیں۔ اگر عوام نے بے پرواہی کا مظاہرہ کرکے کسی صالح آدمی کو کنڈیڈیٹ منتخب کرنے کی بجائے کسی ڈاکو، کرپٹ اور نااہل آدمی کو منتخب کیا اور اس نے لوٹ مار اور ظلم وستم کا بازار گرم کیا تو اس کے ساتھ تمام عوام بھی عذاب الیم کا مستحق بن جائے گی۔ دنیا میں بھی وہ ظالم ان کو ستائے گا اور ملک وملت کو نقصان پہنچائے گا اور قیامت میں بھی اللہ عوام کو غلط آدمی منتخب کرنے پر سزا دے گا۔ غلط آدمی کے انتخاب کا مطلب یہ ہوگا کہ عوام اپنی گواہی، وکالت اور سفارش درست جگہ کے بجائے غلط جگہ استعمال کر رہے تو عنداللہ ان کا مواخذہ ہوگا۔ ممبر اسمبلی کے لیے پر تولنے والوں کو بھی خیال رہنا چاہیے کہ جب وہ ممبر بن جائیں گے تو جتنی مخلوق خدا کا تعلق و واسطہ اس سے ہوگا تمام کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے سر پر آئے گا، حالانکہ ممبر بننے سے پہلے اس پر صرف اور صرف اپنے عیال اور فیملی کی ذمہ داریاں تھی اب پورے حلقے اور ملت کی ذمہ داریاں ان کی گردن پر آچکی ہونگیں۔ ممبری کو بچوں کا کھیل یا مفادات کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

گلگت بلتستان میں ایک اہم خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ یہاں ووٹ دینے والے قوم، خاندان، علاقہ اور قبیلہ کو دیکھتے ہیں یا پھر مذہبی بنیادوں پر ووٹ کاسٹ کیا جاتا ہے۔حالانکہ ووٹ کاسٹ کرنے والے کو چاہیے کہ وہ بغیر کسی طمع و لالچ اوور خوف و خطر کے ایک ایسے کنڈیڈیٹ کو ووٹ کاسٹ کریں کہ وہ امین ہو، ملک وملت کا خیر خواہ ہوں اور اپنے حلقے کے ساتھ بھی وفادار ہو، ووٹر کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ووٹ کے ذریعے شہادت، وکالت اور سفارش کا فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے۔کیا کسی کرپٹ، چور، ڈاکو، ننگ ملت وملک اور علاقہ و قوم کی سچائی کی شہادت ،اپنے ووٹ سے دے سکتا ہے؟کیا وہ ایسے بدنام زمانہ آدمی کی وکالت یا سفارش کرسکتا ہے؟اگر کرتا ہے تو دنیا وآخرت میں ذلیل و رسوا ہوگا۔جس طرح ووٹ کے ذریعے کسی غلط آدمی کے انتخاب پر اللہ کی پھٹکار ہوگی اسی طرح کسی صالح اور اہل آدمی کے انتخاب پر اللہ کی رحمت اور ثواب بھی ملے گا۔علماء کرام نے ووٹ کے فروخت کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔آج کل ووٹ خریدنے کا رواج عام پکڑ چکا ہے۔مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع عثمانی صاحب مرحوم ووٹ کے حوالے سے اپنی معروف کتاب جواہر الفقہ جلد نمبر پانچ میں لکھتے ہیں کہ ''انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہارجیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے

ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم و عمل اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے، جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعہ جو نمائندگی سے کسی اسمبلی میں پہنچے گا، وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا، ان کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی، آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے''۔

اس میں کوئی شک ہے نہ کوئی اختلاف کہ جمہوریت خلافت یا امامت کے متضاد ایک تصور حکمرانی یا طرز حکومت ہے۔یہ بات عیاں ہے کہ اہلِ نجران کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب گرامی میں وضاحت سے فرمایا تھا کہ ''فانی ادعوکم الی عِبادِ اللہِ مِن عِبادِ العِبادِ وادعوکم الی وِلایۃِ اللہِ مِن وِلایۃِ العِبادِ کہ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں بندوں کی عبادت چھوڑ کر ایک اللہ کی بندگی کی اور بندوں کی حکمرانی سے نکل کر ایک اللہ کی حکمرانی یں آنے کی ۔اور حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فارس کے بادشاہ کے دربار میں اپنے مقصدِ اصلی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ واخراج العِبادِ مِن عِبادِ العِبادِ الی عِبادِ اللہِ الواحِدِ القہارِ کہ میری آمد کا مقصد بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک غلبہ والے اللہ کی بندگی میں داخل کرنا ہے۔ یہی خلافت یا امامت کا منشاء ہے۔تاہم جمہوریتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ انسانوں کو

انسانوں کے غلام بنا کر رکھتا ہے۔ نام جمہوریت کا ہوتا مگر کبھی شخصی حکومت ہوتی ہے، تو کبھی خاندانی حکومت۔ کہیں پر استبدادی نظام چل رہا ہے، تو کبھی عوامی نظام۔ عالمی جمہوریتوں کے زیادہ تر مراحل میں ایسی حکومتوں کا غلبہ رہا جن کے جمہوری حکام زمامِ اقتدار سنبھالتے ہی خدائی کا دعویدار بن بیٹھے اور محکوم عوام کو اپنا غلام بنا کر ان سے اپنی بندگی کروانے لگے۔ پہلے زمانوں میں بندگی کے اصول کچھ اور ہوا کرتے تھے اور اب اس کے اصول بدل گئے ہیں۔ انہی جمہوری حکام نے پوری دنیا میں ظلم و ستم کا بازار گرم رکھا ہوا ہے۔ برطانیہ جو جمہوریت کی ماں کہلاتا ہے ایک طویل عرصہ نوآبادیات بنانے پر لگا ہوا تھا اور آج یہی کچھ امریکہ کر رہا ہے اور ساتھ ہی جمہوریت کا علمبردار بنا ہوا ہے اور پوری دنیا میں جمہوری نظام کے لیے مال بھی خرچ کر رہا ہے، فکر بھی کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ جمہوری نظام لانے کے لیے ملکوں ملکوں کو تہہ تیغ کرتا جاتا ہے اور ہم بھی اس کی لَے میں لَے ملائے جمہوریت کے لت پت گندے نظام میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ جس کا بہترین مظہر ووٹ، ووٹر، کینڈیڈیٹ اور الیکشن ہے۔

اسلام نظامِ خلافت کو پسند کرتا ہے، جس میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ خلیفہ یا مسلمانوں کا حاکم خدا تعالیٰ کے عادلانہ نظام کو نافذ کرنے میں اس کا نائب ہوتا ہے یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام عملی طور پر

نافذ کرتا ہے۔خلافت کا حکم بھی قرآن ہی سے ملتا ہے۔ مسلمانوں نے حکومتِ الہیہ اور خلافتِ راشدہ علی منہاج النبوۃ کا ایسا بے نظیر نظام دنیا کے ایک کثیر خطے پر نافذ کیا کہ اس سے بہتر اور عادلانہ و منصفانہ نظام چشم فلک نے آج تک روئے زمین پر کہیں نہیں دیکھا اور نہ آئندہ ممکن ہے۔حکومت الہیہ کے حکمران عدل وانصاف، پاک بازی، صفائی قلب اور روشن ضمیری اور خداترسی ورعایا پروری میں یکتا و بے مثال تھے۔

خلافت راشدہ علی منہاج النبوۃ کے بجائے جمہوریت کے نفاذ کا مطالبہ یقیناان لوگوں کی دلی چاہتے ہے جو دنیا سے نظامِ اسلام کو کلیۃ ختم کرنا چاہتے ہیں۔اس بات میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ یہ دنیا اسلامی نظام خلافت سے ایک طویل عرصہ مستفید ہوتی رہی ہے۔تاہم بدقسمتی سے مسلمانوں کی آپس کی ناچاکیوں و بداعمالیوں اور اغیار کی سازشوں کی وجہ سے نظامِ خلافت کا بالکلیۃخاتمہ ہوچکا ہے۔اور اس کے مقابلے میں ایک نظام کو زور و شور کے ساتھ پوری مسلم دنیا میں متعارف کروایا گیا جس کو عرف عام میں ڈیموکریسی''یعنی جمہوریت کہا جاتا ہے۔جمہوریت کی چند ایک خوبیاں بھی ہیں مگر اس'' کی خرابیاں خوبیوں پر بھاری ہیں۔علامہ اقبال مرحوم نے جمہوریت کے حوالے سے کہا ہے کہ

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک اور جگہ میں انہوں نے ارشاد کیا ہے کہ

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ

جو نقشِ کہن آئے نظر اس کو مٹا دو

جمہوریت میں حاکمیت اللہ کے بجائے کسی فرد یا ادارے کے پاس ہوتی ہے۔ تمام فیصلے اکثریت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ تاہم یہ اکثریت دلیل و برہان کی نہیں تعداد کی اکثریت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر دس پی ایچ ڈی عالم وفاضل ایک رائے یا فرد کو ووٹ دیں اور گیارہ جاہل، گنوار، اور چور ڈاکو دوسرے فرد کو ووٹ دیں تو ڈاکو ہی جیت جاتا ہے اور اسی کو اکثریت کے خوبصورت عنوان سے معنون کیا جاتا ہے۔ کوئی انصاف سے بتائے کہ کیا دس عالم و فاضل اور پی ایچ ڈی اسکالر کی رائے اور گیارہ چوروں کی رائے ایک جیسی ہو سکتی ہے۔؟ اور یہاں تو یہی گیارہ چوروں کی رائے معتبر ٹھہرتی ہے۔ باوجود اس کے انتہائی تیزی کے ساتھ پوری دنیا میں جمہوریت کو رواج دیا جاچکا ہے۔ اور مسلمانوں کو بھی لاچار اس میں اپنی لیے بہتری کا سامان ڈھونڈنا ہے۔

ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان کے آئین نے یہاں کے ہر شہری کو ووٹ دینے اور امیدوار بننے اور دیگر انتخابی عمل میں شرکت کا بھرپور حق دیا ہے۔ اب اس حوالے سے جائزہ لینا ہے کہ بحیثیت ایک شہری اس انتخابی عمل میں شرکت کی شرع

میں کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ ووٹ، ووٹر کے حوالے سے ماقبل میں بحث ہو چکی ہے۔اس کی روشنی میں یہ سمجھ آ جاتا ہے کہ انتخابی عمل میں شرکت کرنا کبھی تو محض جائز ہو جاتا ہے اور کبھی یہ عمل مستحب اور کبھی کبھار واجب تک ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں حکومت الیکشن کی بنیاد پر بنتی ہے۔جس پارٹی کو الیکشن میں کامیابی ہوتی ہے وہی پارٹی حکومت بناتی ہے۔اور یہ کامیابی کبھی کبھار ایک ووٹ کی اکثریت کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار ایک ووٹ کی کمی کی وجہ سے بھی حکومتیں گر جاتی ہے۔یہی حکومتیں قانون سازی کرتی ہیں۔ ملکی نظام چلانے کے لیے پالیسیاں بناتی ہیں۔بین الاقوامی معاملات بھی یہیں حکومتیں اور پارلیمنٹ سلجھاتی ہیں۔اگر تمام دیندار لوگ ووٹ کے عمل سے بائیکاٹ کریں تو بے دین اور اسلام دشمن لوگ اسمبلیوں میں جا کر قرآن و حدیث اور تعلیماتِ اسلامی کے خلاف قانون سازی کریں گے اور لامحالہ یہ نہ مسلم مملکت کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی عام و خاص مسلمانوں کے لیے۔ایسی صورت حال میں جمہوری طریقے سے لڑے جانے والے الیکشن میں ووٹ ڈالنے کے عمل کو محض مباح نہیں، بلکہ واجب اور فرض کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ مکرر عرض ہے کہ اس سارے عمل میں حصہ لینا صرف اور صرف دفع مضرت کے لیے ہے۔ ورنہ تو جمہوری نظام کے ذریعے اسلام لانا محال ہے۔ کم از کم اب تک کے تجربات کا تو یہی خلاصہ ہے۔ ہمارے ہاں انتخاب سے پہلے زور و شور سے کمپئین چلائی جاتی ہے۔ ہر پارٹی ایک

لمبا منشور رکھتی ہے اور مختلف حلقوں سے امیدوار الیکشن کے لیے کھڑے کیے جاتے ہیں اور یہ امیدوار بھی پارٹی ٹکٹ کے لیے کروڑوں رشوت دیتے ہیں اس حوالے بھی ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ انتخاب میں بطور امیدوار خود کو پیش کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہوجاتا ہے، یہ کہ کوئی دوسرا شخص الیکشن میں امیدوار بننے کے لیے دستیاب نہیں ہو۔ یا دستیاب تو ہو مگروہ اس کام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو۔یا بہت سارے افراد کنڈیڈیٹ بننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن وہ تمام افراداس عہدہ کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اس صورت حال میں کسی کو یہ یقین ہو کہ وہ ان تمام افراد میں بہتر ہے اور الیکشن کے بعد عوامی خواہشات پر پورا اتر سکتا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا بھی کر سکتا ہے، تائید حق اور انکار باطل کی بھی ہمت ہے۔ اور ساتھ ساتھ جمہوری نظام میں رہتے ہوئے اپنے ایمان اور عقیدے کو بھی محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور ممبری کا حصول حب مال اور دنیا کمانا نہ ہو۔اور اس ممبری سے نیت یہ ہو کہ عوام کی بلا تفریق خدمت کریں اور ان کے حقوق کی پاسبانی کریں۔ اور سماجی انصاف قائم کرسکیں۔ ایسی صورت میں کسی ایسے فرد کے لیے بطور کنڈیڈیٹ اپنے آپ کو پیش کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بہت ہی مستحسن بھی ہے۔اس حوالے سے ہم حضرت یوسف علیہ السلام کی پیشکش سے بھی استدلال کر سکتے ہیں۔انہوں نے خشک سالی اور اس کے بعد کی صورت حال سے یعنی کہ لوگوں کو بھوک وافلاس سے بچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھی قران کریم میں ہے کہ یوسف نے فرمایا'' قال اجعلنِی علی

خزائنِ الارضِ اِنّی حفیظ علیم) کہ مجھے ملکی خزانوں پر مامور کر دیجیے میں نگہبان ہوں اور خوب واقف کار بھی ۔

البتہ جو لوگ یا کنڈیڈیٹ ان صفات عالیہ سے عاری ہوں، ان کے لیے عہدہ طلبی اور الیکشن میں امیدوار بننا جائز نہیں ہے ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پر مکمل یقین تھا کہ وہ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ.براں ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے تو ایک کافر حاکم کے لیے اپنی خدمات شرائط کے ساتھ پیش کی تھی یہاں تو حاکم مسلمان ہے۔ ہمارے بعض اسلامی مفکرین نے اس موجودہ جمہوری نظام میں شرکت کو ناجائز لکھا ہے مگر جمہور علما اور فقہا نے جواز کے قول کو ہی اختیار فرمایا ہے ۔ جس کی وجہ سے علماء کرام کا ایک.بڑا طبقہ اس جمہوری الیکشن میں حصہ لیتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں کئی ایک اہم فیصلے اسمبلیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوئے ہیں جس کی مثال فی زمانہ دنیا میں کہیں پر بھی نہیں ملتی۔

ایک اعتراض عام طور پر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جمہوری نظام لادینی نظام ہے اور لادینی نظام میں شرکت دین کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ یہ حقیقت تو بدیہی ہے کہ جمہوری نظام لادینی نظام ہے لیکن اس میں شرکت سے دین کو نقصان پہنچنا ضروری نہیں۔ تاہم میں یہ عرض کرتا ہوں کہ لادینی نظام میں اس لیے حصہ

لینا کہ اس سے مسلمانوں کو نفع مل رہا ہو، قطعاً ناجائز یا حرام نہیں ہوتا۔اور اگر کسی غیر مسلم امیدوار کے مقابلے میں مسلم ایماندار اور مضبوط امیدوار ہو تو مسلمانوں کے عمومی مصالح کے لیے اس کو ووٹ دینا اور اس کی حمایت کرنا نہ صرف جائز ہوتا ہے بلکہ لازم بھی ہو جاتا ہے۔اور بالکلیہ الیکشن سے بائیکاٹ کرنا ہر لحاظ سے مفید نہیں۔اگر کوئی متعصب اور اسلام بیزار آدمی ممبر بنا تو لازمی بات ہے کہ وہ اسلام اور عوام دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا اور یہ یقینا عوام کے لیے نقصان عظیم سے کم نہیں۔ علمائے امت نے مسلمانوں کے لیے جلب منعفت اور فع مضرت مقاصد دین میں گردانا ہے۔ایک دیندار اور صالح و غیور امیدوار کے کامیاب ہونے میں دفع مضرت بھی ہے اور جلبِ منفعت بھی۔

یہاں یہ ذہن میں رہے کہ جو پارٹی اپنے منشور کے اعتبار سے یا اپنے قول و عمل کے اعتبار سے اسلام دشمنی کا اظہار کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے عام مصالح کے لیے رکاوٹ بن رہی ہے ایسی پارٹی میں شرکت کرنا یا پھر ایسی پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دینا جائز نہیں ہوتا۔

اور نہ ہی ایسی پارٹی کا امیدوار بنا جائز ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ ''یا یہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم ولیاء

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بنا! آیت مذکورہ میں اسلام'' کے دشمنوں اور دشمن قوتوں کے ساتھ دوستی قائم کرنے کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، لہٰذا وہ سیاسی پارٹیاں جو اسلام اور مسلم دشمنی کو اپنا شعار بنائے ہوئی ہیں، منظم فسادات بھڑکا کر مسلمانوں کی جان مال اور عزت وآبرو سے کھیلتی ہیں، ان کے مقدس مقامات کو نقصان پہنچاتی ہیں یا نقصان پہنچانے میں مدو معاون بنتی ہیں اور اس پر خوش بھی ہوتی ہیں ایسی سیاسی و مذہبی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت احکام الٰہی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہاں تک سیکولر پارٹیوں کی بات ہے تو ان میں مشروط شرائط کے ساتھ سیاسی وابستگی کی گنجائش ہے یعنی کہ ان سے مسلمانوں کے عمومی و خصوصی مصالح کو نقصان نہ پہنچے۔

خواتین اسلام کے حوالے سے قرآن و حدیث میں واضح احکامات موجود ہیں۔ بہت سارے معاملات میں مرد اور عورت کی ممتاز حیثیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عورتوں کے لیے حکم ہے ''تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح بناو سنگار کرکے مت نکلا کرو''۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو کسی عورت کو اپنا سربراہ بنالے۔ ان احکام کے بعد عورت کو سربراہ مملکت بنا جائز نہیں ہوتا۔ تاہم اگر خواتین کے لیے مکمل پردے کے انتظام کے ساتھ الگ نشستوں کا اہتمام ہو، ان کی

تمام ایوانی کاروائیاں الگ سے کی جا رہی ہوں تو ان کے لیے شاید ممبر اسمبلی بننا جائز ہو اور اگر یہ خواتین اپنی ممبری اور دیگر سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں احکام شرع کی پابندی نہ کر سکیں تو لامحالہ ان کو سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں شرکت مناسب نہیں ہوگی بلکہ ناجائز ہو جائے گی۔

موجودہ پارلیمنٹ کے حوالے سے یہ عرض کرنا ضروری ہے۔ پارلیمنٹ کی حیثیت مجلس شوریٰ کی سی بن گئی ہے۔ مشاورت کے حوالے سے اللہ کا فرمان ہے کہ ''وامرہم شوریٰ بینہم'' اور ''وشاورہم فی الامر''۔ تاہم یہ مشاورت اور قانون سازی ان امور ہوگی جن میں نصوص اور اجماع امت نہ ہو۔ چونکہ اسلام میں کچھ احکام منصوص من اللہ ہوتے ہیں اور کافی سارے احکام کے بارے میں اجماع امت ہو چکا ہے ہے۔ ان امور میں نہ مشاورت کی گنجائش ہے نہ ہی کسی قسم کی قانون سازی کی۔ مثلاً سود و شراب حرام ہے، حاکمیت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور اسی طرح حدود اللہ میں کسی تغیر مشاورت اور قانون سازی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ تاہم اسلام نے مشاورت کی شکل، کو کسی خاص صورت میں بیان نہیں کی۔ ہر زمانے کی ضروریات و تغیریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مشاورت کے لیے کوئی سا فورم بنایا جا سکتا ہے۔ مگر اس فورم میں اہل الرائے کا ہونا ضروری ہے۔ پارلیمنٹ کو مجلس شوریٰ کا ادارہ کہا جا سکتا ہے، اور اسی پارلیمنٹ میں اسلام کی روشنی میں نئی قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ مگر قانون سازی کے نام پر حدود اللہ اور منصوص

احکام کیساتھ چھیڑنے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اس کی اجازت تو رسول اللہ اور خلفائے راشدین کو بھی نہیں تھی۔

یہ راز بھی اب راز نہیں رہی کہ جمہوریت چاہیے جس شکل میں بھی ہو، کا ایک اصول ہے کہ ہر حال میں حکومت حاصل کی جائے، اس کے سوا جمہوریت کی چکی دو قدم چل ہی نہیں سکتی۔ انتخابی مہم کے دوران تمام سیاسی پارٹیاں اور کنڈیڈیٹ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور ہر جائز و ناجائز طریقے کو روا رکھتے ہیں۔ پروپیگنڈہ کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ اپنے حلقے کے لوگوں سے بے شمار جھوٹے وعدے کیے جاتے ہیں۔ دھندھالی کو باقاعدہ رواج دیا گیا ہے۔ ووٹوں کی خریداری معمول کا حصہ بنا ہے۔ عوام تو عوام یہاں تو سینٹ کے لیے ممبر وں کے ممبر خریدے جاتے ہیں جو کو ہمارے عرف میں ہارس ٹریڈنگ کہلاتا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ حصول اقتدار کے لیے اس سب کی اسلام سے اجازت مل سکتی ہے؟ اسلام اس چیز کی کبھی بھی حمایت نہیں کرتا کہ حصول اقتدار کے لیے اپنی ہی تعریف میں قلابازیاں کھایا جایا۔ بڑے بڑے بینر لگوایا جائے، اور اخبارات اور ٹی وی چینلز پر انتخابی مہم یا کمپیئن کے نام پر کروڑوں کا خرچہ کیا جائے۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خود سے حکمرانی طلب کرنا یا عہدے مانگنا بہت بڑی عیب کی بات ہے بالخصوص اس صورت میں جب انسان نااہل ہو۔ آپ نے فرمایا ہمارے نزدیک تو وہ شخص بہت بڑا خائن

ہے جو از خود حکومت طلب کرے۔ کنزالاعمال میں ایک حدیث ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کو مخاطب فرماکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' اے عبدالرحمٰن بن سمرہ! منصب کا سوال مت کرو اس لیے کہ اگر طلب پر تم کو یہ دیا جائے تو تم کو اسی کے حوالے کردیا جائے گا اور بلا طلب ملے تو نصرتِ الٰہی شامل حال ہوگی'' آج کامل پانچ برس کے بعد پھر سے گلگت بلتستان میں انتخاب کا اہم ترین مرحلہ آچکا ہے۔ انتخابی مہم باقاعدہ شروع ہوچکی ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں جن لوگوں نے گلگت بلتستان کو بدآمنی، کرپشن، بدحالی، بے انصافی، اور مذہبی تشدد پسندی جیسے مسائل میں دھکیلا ہے آج پھر سے انہوں نے اپنے آپ کو اصول پسند، سچے اور قوم کے لیے ضروری گردانتے کی کمپیئن شروع کیا ہے۔ ایسے میں عوام کو بہت ہی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔

جن لوگوں نے قوم اور علاقے کو قعرمذلت میں دھکیلا ہے آج پھر سے وہی لوگ عوام الناس کو یہ خوبصورت خواب دکھلا رہے ہیں کہ ہم جمہوریت کے علمبردار ہیں۔ آپ کے ہی ووٹ سے ہم منتخب ہوکر اسمبلی میں جائیں گے۔ تم ہی اصل طاقت کا سرچشمہ ہو، عوام کو اصل اقتدار کا مالک ٹھہرانے کے بعد یہی لوگ پھر سے اسمبلیوں میں پہنچ کر عوام الناس کو بھول جائیں گے اور عوام جمہوریت کے ثمرات سے مستفید ہونے کا خواب دیکھتی رہی گی۔ یہی جمہوریت کی اصل صورت ہے مگر پھر بھی ہم جمہوریت کے علمبردار بنے پھر رہے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ پوری

دنیا میں جمہوری نظام سیاسی پارٹیوں کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتا۔ یہ سیاسی پارٹیاں ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ یہ پارٹیاں اپنے آپ کو نظریاتی، مذہبی، دینی اور نہ جانے کیا کیا القابات سے نوازتی رہتی ہیں۔ ان کے منشور اٹھا کر دیکھو تو انسان حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر بخدا یہ لوگ نہ نظریاتی ہیں نہ کوئی اور صفت ان میں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام پارٹیاں اپنی پارٹی قائد کا جتھے ہیں جو مخصوص مقاصد کے لیے قربان ہوتے رہتے ہیں۔ کیا عوام الناس نے کبھی سوچا ہے یا سوال کیا ہے کہ یہ سیاسی پارٹیاں انتخابی مہم کے انعقاد کے لیے اتنا سرمایہ کہاں سے لاتی ہیں۔ ان کے کنونش، دھرنوں، ہڑتالوں اور جلوسوں اور اشتہار بازیوں کے لیے اتنا کثیر سرمایہ کون عطا کرتا ہے۔ یہی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہوتی ہیں جو ان کے تمام انتخابی اخراجات.برداشت کرتیں ہیں تاکہ ان کے لوگ اسمبلی پہنچ کر ان کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ یہی کمپنیاں پوری پارٹی خرید لیتی ہیں اور پھر پارٹی کو فنڈنگ کرتی ہیں اور پارٹی حلقوں اور امیدواروں کو یہ رقم بطور انتخابی مہم چلانے کے لیے دے دیتی ہیں۔ غور سے جائزہ لیا جائے تو پوری دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

جو لوگ جمہوریت کو پرموٹ کرتے ہیں اصل میں وہی لوگ جمہورت کے اصل نمائندے ہیں۔ یہی کارپوریٹ کلچر کے افراد ہی دنیا میں بھوک وافلاس اور غربت و بے روزگاری کے اصل ذمہ دار ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ اپنی مصنوعات کے ذریعے

غریب اور مفلوک الحال انسانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور ان کی جائیداد
یں منٹ منٹ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی جاگیر دار پوری کی پوری سیاسی پارٹیاں خرید
لیتے ہیں یعنی الیکشن کمپئین کا پورا خرچہ برداشت کرلیتے ہیں تاکہ ان کے منظور نظر
لوگ اسمبلیوں میں آکر ان کے کاروبار اور مصنوعات کو وسعت دینے کی پالیساں اور
قانون سازی کریں ۔ یہی کارپوریٹ جمہوریت کے اصل مالکان غریبوں کی لوٹی ہوئی
دولت کا کچھ حصہ غریبوں میں بانٹ کر میڈیا پر اشتہار دے دیتے ہیں اور انسانی دنیا کے
سخی ترین افراد کہلاتے ہیں۔ مگر بدبختی یہی ہے کہ اس صورت حال کا ادارک نہ عوام کو
ہوتا ہے نہ خواص کو۔کیا یہ سچ نہیں ہے کہ دنیا کے کچھ امیر انسانوں نے اپنے مفادات
کے حصول کے لیے جمہوری نظام کو دنیا پر مسلط کیا ہے یعنی کہ پارٹی فنڈگ کے ذریعے
پارٹی کی پارٹی اور افراد کے افراد کو خریدا ہوا ہے۔یہی لوگ جمہوری اداروں یعنی
اسمبلیوں سے معاشی قوانین پاس کرواتے ہیں۔دنیا بھر کے کارپوریٹ سرمایہ داروں نے
اپنی مصنوعات کے ذریعے عوام کی لائف اسٹائل تک کو تبدیل کر رکھا ہے۔انہیں ایسی
ایسی چیزوں کا عادی بنایا جاتا ہے کہ عوام ان کو زندگی کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔
کیا ہمیں معلوم نہیں ہے کہ پورا مغرب اور ان کے تھینک ٹینک چاہتے ہیں کہ مسلمانوں
میں جمہوریت کا رواج ڈالا جائے اور قابل قبول بنانے کے لیے

اسلامی جمہوریت '' کا خوبصورت نام تراشا جاتا ہے۔ مغرب اور اس کے پالیسی ساز ''
سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو جمہوریت کے خوشنما نعرے میں ہی غرق رکھا جائے۔ اگر یہ
لوگ جمہوریت کے بجائے خلافت اپنانے لگے تو یہی خلافت مغربی زوال کا ابتداء
ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ پوری مسلم امہ کو خلافت یاد ہی نہیں رہی اور مغرب خلافت کے
تصور کو کبھی بھول ہیں نہیں سکتا کیونکہ اسلامی خلافت مغرب کے لیے ابدی موت کا پیغام
ہے۔ اس لیے دنیا میں جہاں کہی بھی خلافت کی آواز یا اسلامی نظام کی لہر شروع ہوتی
ہے تو مغرب اس کو تاراج کرنے کے لیے ناٹو کی شکل میں اکٹھا ہوتا ہے اور غریب اور
مفلوک الحال ممالک میں چڑھ دوڑتا ہے تاکہ وہاں جمہوریت قائم کرسکے۔ مغرت نے
تمام مسلمانوں کو خلافت سے بد ظن کرکے جمہوریت کا درس دیا ہوا ہے تاکہ مسلمان اللہ
کی حاکمیت و حکمرانی کو بھلا کر اپنی یعنی عوام کی حکمرانی میں جت جائیں۔ تب ہی تو مغرب
مسلم دنیا میں جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ لیے پھرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت
سے صبح روشن کی امید کرنا ایک سراب ہے اور اس سراب میں گزشتہ ستر سال سے
پوری پاکستانی قوم دھوکہ کھا رہی ہے۔ جمہوریت پر اسلام کا لیبل لگانا اور اس کو اسلامی
بنانے کی کوشش کرنا ایک کار عبث سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایک غیر اسلامی سسٹم پر اسلامی
لیبل چسپاں کرنے سے ہرگز اسلامی سسٹم نہیں بن سکتا۔

اسی پوری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے جو شروع میں عرض بھی کیا تھا کہ اسی پارلیمانی جمہوری نظام کے اندر اپنے لیے گنجائش نکالنی ہے۔ اس کے بائیکاٹ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ عوام الناس کو چاہیے کہ اپنے اپنے حلقوں سے ایماندار اور صالح الفکر افراد بطور نمائندہ اسمبلی کے لیے منتخب کریں۔ اسمبلی میں جانے کا مقصد تائید حق ہونا چاہیے اور انکار باطل بھی۔ اگر اس نظام کو مغربی یا غیر اسلامی کہہ کر کنارہ کشی اختیار کی جائے تو لامحالہ سیکولر اور اسلام بیزار لوگ خوش ہونگے ان کے وارے نیارے ہونگے۔ لہٰذا ووٹنگ کے ذریعے ان کا راستہ روکنا چاہیے۔ ایماندار اور مصلح قوم افراد کو اسمبلیوں میں پہنچنا چاہیے اور لادین اور امت بیزار لوگوں کے لیے سدِ سکندری بننا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ عوام دشمن اور ملک وملت دشمن لوگوں کے لیے میدان خالی چھوڑا
جائے۔ الیکشن کمیشن کا ادارہ شفاف الیکشن کروانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے اور آئین کے مطابق نگران حکومت کا بھی یہی اہم فریضہ ہے کہ وہ الیکشن کمیشن کے ساتھ مل کر شفاف الیکشن کو یقینی بنائے۔ اب عوام، الیکشن کمیشن، نگران حکومت اور بیوروکریسی پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ شفاف الیکشن کے لیے ہر ممکن اقدام کریں اور آئین کی آرٹیکل باسٹھ تریسٹھ کے عملی نفاذ کو یقینی بنائے تاکہ کوئی ملک وملت اور عوام دشمن انسان اسمبلی پہنچ کر ملک وملت اور عوام کے ساتھ کھلواڑ نہ کرسکے۔ ہم ایک اضطراری دور میں جی رہے ہیں۔ اس لیے جمہوری نظام کو قبول کرتے ہوئے الیکشن میں حصہ لینا چاہیے لیکن اصل

منزل خلافت اور امارت کو نہ بھولنا چاہیے۔اس کے لیے مناسب اور اسلامی طریقے کے ذریعے کوشش کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ کیا ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اسلامی زندگی کے تمام پہلوؤں کو معاشرے اور ریاست میں نافذ کیے بغیر کہیں سے بھی خیر کی توقع کرنا فضول ہے۔ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ایک پولیٹیکل سائنس کا اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ ایک دینی طالب علم بھی ہوں۔ دونوں کا مطالعہ اور زمینی مشاہدوں سے یہی کچھ سمجھ آیا، جو بلاکم وکاست آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ وماعلینا الاالبلاغ۔

اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

نواز شریف کا دورہ گلگت اور عوامی توقعات

محترم نواز شریف اسلامی جمہوری پاکستان کے وزیر اعظم ہیں۔ انہوں نے چودہ اپریل کو گلگت بلتستان کا ہنگامی دورہ کیا۔ حیرت ہوئی کہ اٹھائیس ہزار مربع میل پر پھیلے اس علاقے کو نواز شریف صاحب اٹھائیس گھنٹے بھی نہ دے سکے۔ مبصرین کے مطابق گلگت بلتستان کی آبادی کم وبیش بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ نواز شریف صاحب تو اس بیس لاکھ کی آباد کو بیس گھنٹے بھی نہ دے سکے۔یا اسفا علی ذالک۔شاید ان کی ترجیحات میں گلگت بلتستان کا خوبصورت مستقبل شامل ہی نہ ہو۔پی ایم صاحب کی آمد سے پہلے ن لیگ گلگت بلتستان کے تمام لیڈران وکارکنان بڑے بڑے بلند و بانگ دعوے کیا کرتے تھے ۔اب بھیگی بلی بن کر وضاحتیں دیتے پھر رہے ہیں۔ اگر عمیق جائزہ لیا جائے تو وزیر اعظم صاحب نے مکمل طور پر گلگت بلتستان کی عوام اور ن لیگ کی قیادت کو ٹوپیاں پہنائی ہے۔ اس کے جواب میں لیگی قیادت ٹوپی پہنانے لگی تو شریف صاحب نے انکار کردیا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف لیگی قیادت کی توہین نہیں بلکہ اٹھائیس ہزار مربع میل میں پھیلے ان تمام انسانوں کی توہین ہے جن کی روایتی ٹوپی ان کے وزیر اعظم نے دو منٹ سر پر رکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ گلگت بلتستان کی روایت میں ''ٹوپی بدلی '' ہوجائے تو اس ٹوپی کی خاطر جان تک کا ندرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہماری روایت میں ٹوپی کا تبادلہ

دوستی و محبت کی آخری دلیل سمجھا جاتا ہے۔ یہاں دوستی و محبت ہی نہیں تو آخری دلیل کا سوال ہی فضول ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا نواز شریف صاحب سندھ، پنجاب، بلوچستان اور خیبر پختون خوا کی روایات و روایتی چغوں، ٹوپیوں، شالوں اور پگڑیوں کا یوں مزاق بناتے ہیں؟آخر یہ درگت ہماری ہی کیوں؟۔

نواز شریف صاحب کے اعلانات میں ایک بھی نیا نہیں۔ دیامر بھاشا ڈیم کا تو باقاعدہ آغاز سابق صدر مشرف نے کیا تھا اور ن لیگ کی حکومت سے پہلے بہت سارا فنڈ بھی ریلیز ہوا تھا۔ کے آئی کا بلتستان کیمپس گزشتہ کئی سالوں سے کام کر رہا ہے۔ ہنزہ نگر اور کھرمنگ اور شگر کو الگ الگ ضلع بنانے کا کافی کام گزشتہ حکومت کر چکی تھی۔ اعلانات کے دوران ایک حیران کن بات سامنے آئی کہ محترم وزیر اعظم صاحب نے کہا کہ '' میرے دوست راجہ غضنفر نے کہا ہے اس لیے میں ہنزہ کو الگ ضلع بنا رہا ہوں''۔ کمال کر دیا آپ نے تو پرائمنسٹر صاحب۔ آپ کو عوام کی فکر ہی نہیں ایک آدمی کو خوش کرنے کے لیے ضلع بنا دیا۔ اگر آپ یہ کہتے تو کتنا اچھا ہوتا کہ '' ہنزہ نگر کے عوام کی دیرینہ چاہت پر الگ الگ ضلع کا اعلان کرتا ہوں''۔ بہر صورت شیر کی مرضی ہے انڈہ دے یا بچہ ۔ ہم کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔

نواز شریف صاحب نے تین اضلاع کو مکمل نظر انداز کیا۔ ضلع دیامر، استور اور

غذر کے عوام کی تمام تر توقعات دریا برد ہو چکی ہیں۔ رد عمل کے طور پر ضلع استور کی پوری لیگی قیادت اور آفس بیریئرز نے اجتماعی استعفیٰ دیا۔ کیا اس سے واضح نہیں ہوتا کہ نواز شریف کا دورہ گلگت مکمل طور پر ناکام اور مایوس کن تھا؟ ان کی آمد سے پہلے ن لیگ کے لیے ایک ماحول بنا تھا، قیادت کے ساتھ کارکنان بھی بھنگڑے ڈال رہے تھے۔اور ''شیر'' کے گن گا رہے تھے۔ اب سب کے چہروں پر پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ اخبارات میں وضاحتیں دیے پھرتے ہیں۔ عوامی خیالات، اخباری بیانات اور ن لیگ قیادت کی دفاعی وضاحتوں سے تجزیہ یہ بنتا ہے کہ پی ایم کے حالیہ دورے سے ن لیگ کو سخت دھچکا لگا ہے۔پی پی حکومت کے اعلان کردہ اعلان کو مکرر دہرا کر نواز شریف نے کوئی نیا اعلان یا احسان نہیں کیا۔ میری لیگی قیادت سے گزارش ہے کہ واقعی آپ گلگت بلتستان کے ساتھ مخلص ہیں تو فوری طور پر یہ اقدامات کریں تاکہ آپ کا بگڑا ہوا امیج بحال ہوسکے۔ ورنہ آپ کے لیے حالات سازگار نہیں آنے والے الیکشن میں۔ مجھے لگتا ہے عوام آپ سے خوب بدلہ لے گی۔

ن لیگ حکومت کو چاہیے کہ داریل تانگیر کو الگ ضلع بنائے، یاسین اور گوپس کو الگ ضلع بنائے، تھک نیاٹ اور گوہر آباد کو الگ سب ڈویژن بنانے اور حلقہ نمبر 1 گلگت کو الگ سب ڈویژن بنانے کا نوٹیفکیشن جاری کریں۔ گلگت شہر کی تمام ضروریات بالخصوص بجلی، پانی اور سیوریج سسٹم کو فوری درست کرنے کا

بندوبست فرمادے۔ ضلع استور کی تمام جائز مطالبات منظور کیے جائیں۔ اگر بلتستان یونیورسٹی سے بابت اعلان ایک الگ یونیورسٹی کا قیام ہے تو خوش آئند ہے اگر قراقرم یونیورسٹی کا کیمپس مراد ہے تو یہ بلتیوں کو ٹوپی پہنانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیا بلتی ایسی ٹوپی پہننے کے لیے تیار ہیں؟ اگر واقعی بلتستان یونیورسٹی بنانا ہے تو پھر عوامی توقعات کے مطابق ''بلتستان وومن یونیورسٹی'' کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اور یہ ایک آزاد اور مکمل یونیورسٹی ہو۔ بلتستان کے لوگ مخلوط تعلیم کے عادی بھی نہیں اور نہ ہی پسند کرتے ہیں۔ وومن یونیورسٹی ان کی آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور ساتھ ساتھ اکنامکس کوریڈور میں گلگت بلتستان کی حیثیت کو باقاعدہ واضح کرکے گلگت بلتستان کو بھی دیگر صوبوں کے برابر مراعات دی جائے۔ عوام و خواص اور سرزمین بے آئین گلگت بلتستان کو ''ٹشو پیپر'' بنانے کا کلچر اب مزید نہیں چل سکتا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

خواتین کا ووٹ اور داریل جرگہ

میرے لیے یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ ضلع دیامر بالعموم اور داریل بالخصوص میڈیائی طبقے اور حقوق نسواں کے علمبرداروں کے نشانے پر رہتا ہے۔ گزشتہ دس سال کا طائرانہ جائزہ اس بات پر واضح ثبوت ہے کہ جب بھی ضلع دیامر میں خواتین کے حوالے سے علاقائی کلچر و ثقافت کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی اجتماعی یا انفرادی بات کی جاتی ہے تو یہ طبقہ ان کے غم میں ہلکان ہو جاتا ہے۔ پھر خواتین کے نام پر این جی اوز بنا کر لاکھوں کروڑوں ہڑپ کرنے والے بھی پوسٹر چسپاں کرتے اور احتجاجی شمعیں جلانے اور پھر اخباری بیانات جاری کرتے نہیں تھکتے ہیں۔

گزشتہ دنوں گلگت بلتستان ایل اے 17 دیامر حلقہ نمبر 3 داریل میں علماء کرام اور عمائدین داریل نے علاقے میں ووٹ کے عمل کو پر آمن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک طویل مشاورتی اجلاس کیا۔ چونکہ جون 2015ء گلگت بلتستان اسمبلی کے الیکشن ہونے ہیں۔ گزشتہ الیکشن میں اسی حلقے میں سخت حالات خراب ہوئے اور تین قیمتی جانوں کا نقصان ہوا۔ الیکشن کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہوئے اور اسی حلقے میں ایک ماہ بعد دوبارہ الیکشن ہوئے۔ گزشتہ

الیکشن میں افراتفری اور کشیدگی حالت کی وجہ سے خواتین کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اب کی بار داریل کے علماء کرام اور عمائدین اور الیکشن میں حصہ لینے والے امیداروں نے ایک مشاورتی سلسلہ شروع کیا۔اس جرگے نے اس بات پر اطمینان کیا کہ اب کی بار دنگا فساد کی بجائے پرامن طریقے سے الیکشن کا قیام لازمی بنایا جائے گا۔ جرگے کے کچھ ممبران نے علاقائی کلچر اور رسم ورواج اور دینی جذبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ رائے بھی رکھی کہ خواتین کو ووٹ کے عمل سے اجتناب برتنا چاہیے۔ اس رائے کی تمام ممبران، علماء کرام اور امیدواروں نے فوری طور پر توثیق کی۔ اس جرگے میں چالیس جید علماء کرام، کئی عمائدین اور انتخابی امیدواروں مسلم لیگ ن کے حاجی حیدر خان، پیپلزپارٹی کے دافر خان، جے یو آئی ایف کے حاجی رحمت خالق، پی ٹی آئی کے ڈاکٹر زمان اور آزاد امیدوار شمس الرحمان نے شرکت کی اور متفقہ طور پر اس رائے کا احترام کیا گیا کہ خواتین اگر ووٹ کے عمل میں شرکت نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ تاکہ ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہوجائے اور خدانخواستہ حالات خراب ہونے کی صورت خواتین محفوظ بھی رہ سکیں۔ لیکن افسوس اس وقت ہوا جب میڈیا اس پو خوبصورت مشاورتی عمل کو کوریج دینے کی بجائے صرف خواتین کی ووٹ والی خبر کو لے اڑا، اور ایسا پروپیگنڈہ شروع کیا کہ الامان والحفیظ۔ پورے جی بی کی میڈیا اور پاکستان سمیت بی بی سی جیسے عالمی ادارے نے اس معمولی خبر کو وہ کوریج دی کہ انسان انگشت بدنداں رہ گیا۔ ورنہ داریل پر سخت مشکلات آئیں

زلزلے آئے اور سیلاب سے لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہوا مگر انسانی حقوق کے علمبردار اور باخبر میڈیا ان سے مکمل بے خبر ہی رہا۔

خواتین کے الیکشن میں حصہ لینے کے حوالے سے میں نے اپنی ایک تحریر میں عرض کیا تھا کہ ''خواتین اسلام کے حوالے سے قرآن و حدیث میں واضح احکامات موجود ہیں۔ بہت سارے معاملات میں مرد اور عورت کی ممتاز حیثیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالی کا عورتوں کے لیے حکم ہے ''تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح بناو سنگار کرکے مت نکلا کرو''۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ اہل فارس نے کسری کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنالیاہے، تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی کام یاب نہیں ہوسکتی جو کسی عورت کو اپنا سربراہ بنالے۔ ان احکام کے بعد عورت کو سربراہ مملکت بننا جائز نہیں ہوتا۔ تاہم اگر خواتین کے لیے مکمل پردے کے انتظام کے ساتھ الگ نشستوں کا اہتمام ہو، ان کی تمام ایوانی کاروائیاں الگ سے کی جارہی ہوں تو ان کے لیے شاید ممبر اسمبلی بننا جائز ہو اور اگر یہ خواتین اپنی ممبری اور دیگر سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں احکام شرع کی پابندی نہ کرسکیں تو لامحالہ ان کو سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں شرکت مناسب نہیں ہوگی بلکہ ناجائز ہوجائے گی۔''

داریل کے علماء اور جرگے نے بزور قوت خواتین کو ووٹنگ سے ہرگز نہیں روکا ہے

بلکہ اپنی روایات کے مطابق ایک فیصلہ کیا ہے کہ مناسب یہی ہے کہ خواتین ووٹ کاسٹ نہ کریں۔ انہوں نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ خواتین کا ووٹ میں حصہ لینا ناجائز ہے یا خلاف اسلام ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ زمینی حقائق کو پس پشت ڈال کر ہر ''ایرا غیر'' اپنا من چاہا تجزیہ، تبصرہ اور اخباری بیان جاری کر رہا ہے۔ حقائق حال جانے بغیر ہر کوئی بولے جا رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ داریل کے اس حلقے میں خواتین کے لیے الگ پولنگ کی سہولت موجود بھی ہے یا نہیں۔ مردوں کے ساتھ مخلوط سسٹم میں رہ کر ووٹ دینا ہوتا ہے جو قبائلی رسم و رواج کے عین مخالف ہے۔ اور اقوام متحدہ کا عالمی منشور ہر قوم و نسل اور قبیلہ کے لوگوں کو اپنی چاہت و مرضی اور رسم و رواج کے مطابق زندگی گزارنے اور فیصلے کرنے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ ایسے فیصلوں کا احترام و تحفظ بھی کرتا ہے۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ کوئی سروے کروائی جائے تو داریل و تانگیر کی نوے فیصد خواتین ووٹ کے عمل میں حصہ لینا ہی پسند نہیں کرتی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ایک مخلوط پولنگ میں غیر محرم مردوں کے سامنے ایک عزت دار اور غیرت مند خاتون کا ووٹ کاسٹ کرنا کتنا مشکل ہے۔ کیا اس طرح کے عمل کو قبائلی روایات اجازت دیتی ہیں۔ ایسے نازک مزاج لوگوں کے لیے مخلوط پولنگ اسٹیشنوں میں ووٹ کی کاسٹنگ کی نہ اسلام اجازت دیتا ہے اور نہ ان کے قبائلی طور طریقے۔ مگر ہمارے ہماوشما'' دانشور اپنی راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔ بخدا اگر پورے حلقے میں خواتین'' کے لیے علیحدہ پولنگ کا نظام ہو۔ جہاں ریٹرننگ آفیسر اور

دیگر سپورٹنگ عملہ خواتین کا ہو تو، داریل کے علمائ، عمائدین اور امیدوار کبھی بھی یہ فیصلہ نہ کرتے۔ انہوں نے تو دفع مضرت کے لیے یہ مشکل فیصلہ کیا ہے ورنہ کوئی امیدوار نہیں چاہیے گا کہ خواتین ووٹ میں حصہ نہ لیں۔ بلکہ وہ اس کی کمپیئین کریں گے۔ مگر زمینی حقائق اس کے مخالف ہیں۔ سب نے عافیت یہی جانا کہ انکو پولنگ کے عمل سے دور رکھا جائے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اہل دیامر بالعموم اور داریل وتانگیر والے بالخصوص اپنی قبائلی روایات پر سختی سے کاربند ہیں۔ انہیں ایسے ہنگاموں یں میں اپنی عزت گنوا کر کسی کو ووٹ کاسٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ داریل تانگیر میں جرگہ سسٹم بہت مضبوط ہے۔ وہاں کے علماء و عمائدین جو بھی فیصلے کرتے ہیں وہ علاقائی رواج و اسلامی افکار کو مدنظر رکھتے ہوئے علاقہ و قوم کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کرتے ہیں اور لوگ بلاچوں وچراں ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہاں کی نفسیات کیا ہیں۔ کون سا عمل علاقے کے لیے مفید اور کونسا مضر ہے۔ تُف ہو یسے لوگوں پر جو داریل کی خواتین کے ووٹ کے خلاف اپنی سیاسی دکان چمکاتے ہیں اور اپنے بیرونی آقاؤں کو تصویری رپورٹیں فراہم کرتے ہیں کہ ہم نے جمہوریت اور خواتین کے حقوق کے لیے یہ خدمات انجام دی ہیں۔ میں مکمل وثوق سے کہتا ہوں کہ ایسے خبث باطن رکھنے والے لوگ خواتین کو ووٹنگ سے روکنے کے عمل کو اپنی مفادات کے لیے استعمال کرتے

ہیں۔ ورنہ تو انسانی حقوق کے علمبرداروں کے لیے کام اور بھی ڈھیروں پڑے ہیں جو کرنے کے ہیں مگر انہیں وہ سب کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کیا یہ سراسر زیادتی نہیں کہ کسی علاقے کے لوگوں کو اپنی روایات اور قبائلی کلچر کے مطابق فیصلے کرنے اور زندگی گزارنے سے روکا جائے۔

سعودی عرب میں بھی خواتین کو ووٹ کاسٹ کرنے پر پابندی تھی تاہم یہ پابندی سال پہلے ختم کی گئی۔ سعودیہ کی شوری کونسل کے اراکین نے خواتین کو ووٹ ڈالنے کی حق دینے کی سفارش کی تو شاہ عبداللہ نے شوریٰ کے فیصلے پر عمل کیا۔ اور خواتین ووٹ کے ساتھ بلدیاتی انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لینے کی بھی اجازت دی۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ وہاں امن و امان اور خواتین کے لیے الگ نظام کو یقینی بنایا گیا تھا۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ خواتین کو ووٹ ڈالنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ داریل جرگے نے خواتین کو بزور طاقت ووٹ سے روکا تو نہیں البتہ اتفاق رائے سے ایک فیصلہ کیا گیا ہے۔ جس کی کوئی قانونی حیثیت تو ہے ہی نہیں البتہ اخلاق حیثیت ضرور ہے۔ اگر علماء و عمائدین کے فیصلوں سے کوئی انحراف کرتا ہے تو لوگ اس کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کر سکتے ہیں ان کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتے۔ مگر اس سادھے سے فیصلے کو ہمارے دانشور اور میڈیائی طبقے اس شد و مد کے ساتھ اٹھا رہے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ بس آج کل میں داریل میں ساری خواتین کو زندہ جلا دیا جائے

گا۔این جی اوز کے عالمی منشور میں یہ بات کلیر ہے کہ کسی بھی علاقے کے کلچر کو ملحوظ خاطر رکھ کر سماجی و بہودی فلاح کے لیے کام انجام دیے جائیں مگر کوئی سماجی فلاح کے نام پر دیامر کی خواتین سے یہ سوال کریں کہ '' تم کونسے صابن سے نہاتی ہو؟'' تو کیا اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے؟۔ قطعاً نہیں۔ مگر یہ فہمائش تو عقل والوں کے لیے ہے۔ جن کے عقلوں پر پردہ ہو اور مسلسل ڈالر کی کشش ہو ان کو رتی برابر اثر نہیں ہونا۔

گزشتہ دنوں پی ڈی سی این میں ایک نشست میں ڈاکٹر مولاداد شفا صاحب نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ دیامر کے اساتذہ کے ورکشاپ کے بعد داریل سے تعلق رکھنے والا ایک استاد ورکشاپ کے آخر میں مجھ سے خصوصی ملنے آیا اور کہا کہ '' سر! میری گزارش ہے کہ اگلی دفعہ میری وائف کو بھی ورکشاپ میں مدعو کریں۔ یہاں دیگر ضلعوں کی خواتین ورکشاپ میں حصہ لیتی ہیں تو ہماری خواتین کے لیے بھی گنجائش ہونی چاہیے ''ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا کہ '' ابھی نہیں، اس لیے کہ فی الحال آپ کا کلچر اور روایات اس بات کی اجازت نہیں دیتی ، اور جب یہاں صرف اور صرف خواتین کا ورکشاپ ہوگا تو ہم دیامر کی خواتین اساتذہ کو ضرور موقع دیں گے تاکہ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ تعلیمی تربیت پاسکیں''۔ یہ ہوتی ہے عقل مندی اور علاقائی روایات کا احترام۔ ہمیں ایسا ماحول پیدا کرنے کے لیے عملی طور پر کام کرنا ہوگا نہ کہ اخبارات میں مسلسل بیانات اور اداریے لکھے

جائیں۔ اس سے ماحول مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

''پروفیسر کمال الہامی کی'' الہامیاں

پروفیسر حشمت علی کمال الہامی صاحب سے میرا تعلق صرف اتنا سا ہے کہ وہ میرے مستقل قاری ہیں اور کبھی کبھار میری کسی تحریر پر فون کرکے تبصرہ بھی فرمایا کرتے ہیں۔ میں بھی اکثر فون پر خریت دریافت کرتا ہوں تاہم میں ان کے نام اور کام سے کافی پہلے سے واقف ہوں۔اور ہم دونوں محکمہ ایجوکیشن گلگت بلتستان کا حصہ ہیں۔وہ ڈگری کالج بلتستان میں اور میں ڈگری کالج گلگت میں تدریسی خدمات سے منسلک ہوں۔ میری عمر سے زیادہ ان کا تجربہ ہے۔ ان کا کلام الہامی ہوتا ہے یعنی پروفیسر حشمت کمال الہامی کا کلام۔پروفیسر کمال الہامی کی خوبصورت ومزین کتاب '' رباعیاتِ کمال الہامی'' اور ہاتھ کالکھا ہوا مختصر اصلی مسودہ موصول ہوا ہے۔ میں ان کی شاعری میں کھو گیا ہوں۔الہام اور تنقید پر مختصر بات کرتے ہوئے پروفیسر کمال کے الہامی کلام پر طائرانہ نظر دوڑاؤنگا۔ اگرچہ یہ کام پختہ اہل قلم کا ہے۔

الہام کیا ہے؟۔ یہ سوال مجھے برسوں سے تنگ کررہا ہے۔کیا شاعروں کی اصطلاح میں ''آمد'' کا جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے وہ الہام ہے؟ بہر صورت یہ طے یہ ہے کہ دین اسلام میں الہام کی حقیقت موجود ہے مگر وحی متلو اور غیر متلو

دونوں سے بہت کم درجے کی۔جب بغیر کسی شعوری کوشش کے کسی کو غیب سے رہنمائی ملے تو اس کو کشف والہام کہتے ہیں۔ کشف والہام غیر نبی کو ہوتا ہے۔ میرا وجدان اور مطالعہ مجھے یہ سمجھا رہا ہے کہ الہام یا کشف، یہ ایک مذہبی واردات یا مذہبی تجربہ کی بنیاد پر حاصل ہونے والا علم ہے۔ مگر یہ وحی متلو اور غیر متلو کے علم کی طرح نہ نا قابل اعتماد علم ہے اور نہ ہی الہام اور کشف کی بنیاد پر حتمی اور قطعی فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔اور نہ اجتہاد کی طرح الہام کے متعین قوانین و ضوابط ہوتے ہیں۔ الہام کے قابل غور اور قابل قبول ہونے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ وہ وحی متلو اور غیر متلو یعنی قرآن و حدیث کے مطابق ہو۔واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الہام، کشف، وجدان، آمد وغیرہ کی اصطلاحات صوفیاء اور شعراء میں بہت ہی زیر بحث رہتی ہیں اور انہیں میں ہی ان کا غلغلہ رہتا ہے۔جب کسی شاعر سے کلام سنانے کا کہو تو فورا کہہ دیتا ہے کہ ابھی آمد نہیں ہو رہی ۔تاہم یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نبی اور غیر نبی کے الہام میں ایک بنیادی فرق یہ پایا جاتا ہے کہ نبی پر جب بھی وحی و الہام ہوتا وہ سو فیصد درست ہوتا ہے۔ نبی کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بات براہِ راست اللہ تعالی کی طرف سے یا فرشتے کی طرف سے اس تک منتقل کی جا رہی ہے۔ جبکہ دیگر لوگوں کا معاملہ الگ ہے چاہیے کتنا بڑا صوفی ،ولی اور شاعر کیوں نہ ہو۔ ان کا احساس یا تو وجدانی نوعیت

کا ہوتا ہے یا ایک خواب کی صورت میں بات دل و دماغ میں ڈال دی جاتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ الہام محترم ضرور ہے لیکن اس میں یقین کا عنصر نہیں ہوتا اور نہ شرعی طور پر متعبر کہلایا جاسکتا ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ایک ذاتی راہ نمائی جیسے ہوگی۔ اساتذہ ادب سے سنا ہے کہ تنقید کا مطلب انفارمیشن میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ علم میں اضافہ کرنا ہے۔ علم اور معلومات میں کیا فرق ہے؟۔ اس بحث کو پھر کبھی ڈسکس کرتے ہیں۔ تاہم تنقید نقد سے ماخوذ ہے جو عربی زبان کا لفظ ہے۔ تنقید کی اردو معنی کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کے ہیں۔ اصطلاح ادب میں کسی نثر نگار یا شاعر کے ادبی فن پارے کے حُسن و قُبح کا احاطہ کرتے ہوئے اس کا مقام بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس فن پارے کی خوبیوں و خامیوں کو جانچتے ہوئے یہ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے کہ صاحبِ فن پارے نے اپنے موضوع کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا ہے۔ یعنی قواعد و ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کسی فن پارے (تخلیق) پر بے لاگ تبصرہ و تجزیہ کا نام تنقید کہلاتا ہے۔ شاید تنقید میں نظریات و اعتقادات پر بات کم کی جاتی ہے۔ اور نہ ہی غلط اور صحیح اور حق اور باطل کے فتویے صادر کیے جاتے ہیں۔ اہل فرنگ تنقید کو Criticism کہتے ہیں۔ اگر یہ تنقید کسی شاعر کی شاعری پر کی جائے تو یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اس شاعری کو کیوں پڑھا جاتا ہے؟۔ اور اس شاعری کی شعری حُسن و

فتح پر بھی بات کی جاتی ہے۔ قارئین ! خود اندازہ لگائے کہ تنقید والا مشکل کام میرے جیسے طالب علموں کے بس کی بات کہاں، اور وہ بھی اگر'' کلام الہامی'' ہو۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ''الہامی کلام'' کو پرکھنے اور جانچنے کا کام جید اہل علم اور مستند ادیب ہی کریں گے۔

تاہم اس لمبی چوڑی بحث کے بعد میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ پروفیسر حشمت کمال کا کلام الہامی ہوتا ہے۔ ان کی رباعیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ غیر معمولی کلام ہے۔ ظاہر ہے پھر ان کا کلام'' الہامی'' ہی ہوا۔ ان کے کلام ہیں آمد اور وَجد کلیُرتو ہوتا ہے۔ الہامی صاحب کا بعض الہامی کلام کو تو بہت ہی شہرت نصیب ہوئی ہے۔ ان کا یہ شعر تو معروف عام و خاص ہے۔

پہاڑی سلسلے چاروں طرف اور بیچ میں ہم
مثالِ گوہرِ نایاب ہم پتھر میں رہتے ہیں

میں آج بھی اپنی اس رائے پر قائم ہوں جس کا کبھی اظہار کیا تھا کہ '' مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اٹھائیس ہزار مربع میل پر پھیلا پورا گلگت بلتستان ادبی و علمی حوالے سے مکمل بانجھ ہے۔ اگر دو چار لوگ ادب بالخصوص خالص ادب لکھتے ہیں تو اس کا اطلاق پورے علاقے پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عربی اور انگریزی ادب تخلیق کرنے والے تو شاید دو چار بھی نہیں، البتہ اردو ادب

لکھنے والے چند احباب ہیں بھی تو ان کی پذیرائی نہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ پورا معاشرہ بے ادب ہو چکا ہے۔'' تو پروفیسر کمال الہامی صاحب کا شمار بھی ان دو چار خالص ادب لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری کا ایک عنصر مذہبی شاعری بھی ہے جو اپنی ہی مسلکی ترجمانی میں نمایاں نظر آتی ہے۔اس کا فائدہ بھی بہت ہوتا ہے تاہم نقصان یہ ہوتا ہے کہ ان کے چاہنے والوں کو ٹھیسیں پہنچتی ہیں۔ قارئین کرام !اب کلامِ الہامی کے چند ادبی فن پارے اپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ بالخصوص غیر مطبوع مسودہ سے چند غزلیہ اشعار جو مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔

اپنی ایک غزل میں گلگت بلتستان کے تمام پہاڑوں کی نمائندگی کرتے ہوئے علاقے کی حفاظت کی بات کرتے ہیں۔

ہم کھڑے سَرحدِ ایماں پہ ہیں ''کے ٹو'' کی طرح
دستِ کفار سے سیاچن کو بچانے کے لیے
لیکے یخ بستہ ہوا، برف کا موسم آیا
نانگا پربت کے کھُلے سر کو چھپانے کے لیے
راکا پوشی کھڑا ہے،برف کا سہرا باندھے
ریشمی راہ سے، محبوب کو لانے کے لیے

ایک غزل میں حیات انسانی کو انتہائی سلاست سے یوں بیان کرتے ہیں۔

دنیائے حادثات کا کیا اعتبار ہے
انسان کی حیات کا کیا اعتبار ہے
دریائے حادثات میں ڈوبے ہیں سارے لوگ
کشتی کی اب نجات کا کیا اعتبار ہے

ایک دوسری غزل میں ادب کے بارے میں کمال ادب سے عرض کرتے ہیں۔

ہر بے ادب سے ربط ہمارا نہیں رہا
اہل ادب کے سامنے تُو سر جھکا لیا
آب جُو جاتا ہے ہر جانب اُچھلتا کودتا
پُرسکوں دریا کے پانی میں ہے گہرائی بہت
فکرِ شاعر رک نہیں سکتی، کہ ہے آب رواں
جمتی ہے ٹھہرے ہوئے پانی پہ تو کائی بہت
جاہلوں کے ہاتھ میں بکتا نہیں جس کا قلم
اُس میں ہوتا ہے کمالِ لطفِ گویائی بہت

جناب الہامی صاحب نے اپنی ایک نظم '' شہر نامہ '' کے عنوان سے لکھی ہے۔ بہت ہی دلکش منظر کشی کی ہے۔ اس کے چند ایک اشعار آپ کے ذوقِ لطیف کے لیے پیش خدمت ہیں۔

شہر نامہ '' کے ایک شعر میں محتسب کے احتساب کا بھانڈا یوں پھوڑتے ہیں۔ ''

محتسب کیسے کرے گا مُجرموں کا احتساب
اس کے اپنے جرم سے پردہ ہٹا ہے شہر میں .

گلگت بلتستان کے ناسازگار حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے ''شہر نامے'' میں ارشاد کرتے ہیں۔ کمال الہامی کا ایک ایک بند پڑھتے جائیں اور اپنے شہر پر آشوب کا حقیقی تجزیے پر سر دُھنتے جائیں۔

دَفعتاً اک شور بے معنٰی اٹھا ہے شہر میں خوف وہشت؛ وہم کا محشر بپا ہے شہر میں
کرچکا ہے کُوچ کب سے، الفتوں کا قافلہ نفرتوں کا روپ آ کر بَسا ہے شہر میں
ڈس رہا ہے دوستوں کو چُن کو انجانے میں وہ اژدھا اک خودفریبی کا پَلا ہے شہر میں
زلزلے میں گر گئے سارے مریدوں کے محل جھونپڑا مرشد کا، تنہا رہ گیا ہے شہر میں
گرچکا ہے قلعہ تنظیم واَمن واتحاد جس کا ملبہ ہر طرف بکھرا ہوا ہے شہر میں
جڑ گئے ہیں دنیوی رشتوں میں، سارے اہل دین دین کا مضبوط رشتہ ٹوٹا ہے شہر میں
قدروقیمت علم ودانش کی، کہاں اس دور میں جہل و ناسمجھی کا ہی رتبہ بڑا ہے شہر میں

قارئین کرام ! آیئے اب کمال الہامی صاحب کی رعبایات پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔الہامی صاحب کی شخصیت کی طرح ان کی کتاب بھی مزین و مرتب ہے۔ انتہائی خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ اعلیٰ پیپر میں شائع ہونے والی اس کتاب میں رباعیات الہامی کا الہام ہوتا جارہا ہے۔ جہاں سے اٹھا کر پڑھو، پڑھنے کو ہی دل چاہتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں کئی نامور قلم کاروں نے توضیحی و توصیفی تقاریظ و تبصرے لکھے ہیں۔ کتاب یوں کمال الہامی صاحب نے عنوان باندھا ہے اور اسی عنوان پر رباعی کہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ عنوان کا حق ادا کیا ہے۔اور ان عنوانات کو حروف تہجی کے طور پر مرتَب کیا ہے۔ ٹوٹل 534 رباعیات ہیں۔ ہر ایک کا موضوع الگ ہے۔ ہر رباعی قطعے یوں الگ لطف ہے۔ ان کے چند عنوانات اور ان کی رباعی شاعری سے آپ کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔

اگرچہ کمال الہامی کی شخصیت اور رباعیاتِ الہامی کی فنی و شاعری حیثیت، قلیل کے بجائے کثیر کے متقاضی ہیں مگر قلتِ وقت و صفحہ کی وجہ سے اختصار کرنے پر مجبور ہیں۔

'' عنوان باندھا ہے۔ '' اللہ جَمیل، ویحب الجمال

ہر حُسن کا خالق، وہ خدا، خود ہے حسیں
جتنے بھی حَسیں ہیں، وہ خدا کے ہیں قرِیں
محبوب ہیں اللہ کو، یہ حسن وجمال
دنیا بنی انگشتری، اور حُسن، نگیں

ایک رباعی کا نام ہے '' یونیورسٹی''۔ یونیورسٹی یعنی جامعہ پر کمال قطعہ ہے۔یہ لازمی نہیں کہ پاکستانی دینی و عصری جامعات کمال صاحب کی بیان کردہ یونیورسٹی سے منطبق کھائیں۔یونیورسٹی ایک عالمی لفظ ہے۔

جاری ہے یہاں، چشمۂ تحقیقِ علوم
دیکھو تو! یہاں، اہلِ علم کا ہے ہجوم
یہ جامعہ ہے۔اس کا ہر اک شعبہ ہے چرخ
اور جس میں چمکتے نظر آتے ہیں نجوم

کمال الہامی صاحب کا ایک اور قطعہ جو '' حُسنِ محبوب '' پر عرض کیا ہے رقم کرتا ہوں۔لازمی نہیں کہ محبوب سے مراد وہی محبوب ہو جو نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہوتا ہے۔یا افسانوی اور الف لیلوی کہانیوں میں ہوتا ہے بلکہ یہ محبوب کوئی بوڑھا یا بوڑھی بھی ہو سکتی ہے۔اور پھر ذریت میں سب سے بڑھ کر محبوب تو محبوبِ خدا ہے۔خدا اور محبوبِ خدا دونوں کا حسن وجمال چار سو بکھرا ہوا ہے۔یہی کمال بیان کرتے ہیں۔

اک جلوۂ تابندہ ہے، حسنِ محبوب

اک اُلفتِ پائندہ ہے ہے، حسنِ محبوب
عاشق کی نظر سے، یہ نہیں چھپ سکتا
ہر سمت، پراگندہ ہے۔ حُسنِ محبوب

قارئین ! تنگیِ داماں کی وجہ سے اختصار کرنے پر مجبور ہوں ورنہ بہت ساری رباعیات آپ کے گوش گزار کرتا۔ پروفیسر کمال الہامی صاحب کی شاعری میں حسن وجمال بھی ہے اور دنیا وآخرت کی درد بھی۔ تہذیب و تمدن کی بیان بھی ہے اور جذبات و اعتقادات کا ذکر بھی۔ اتنے سارے عنوانات قائم کرکے زندگی کے ہر شعبے پر کمال حکمت سے ارشادات کیے ہیں۔ عربی، اردو اور فارسی کے الفاظ کا استعمال بر محل ہے۔ گرائمر کے رموز واوقاف کی مدد سے قاری کو پڑھنے کے لیے سہولت پیدا کی گئی ہے۔ جو لوگ بیت بازی کے شوقین ہوتے ہیں ان کے لیے بھی رباعیات الہامی میں بہت سارا سامان رکھا ہوا ہے۔ کمال صاحب کے ادب پارے (شاعری) فن پاروں کے اصول و ضوابط پر کتنے پورے اترتے ہیں اس کا فیصلہ کہنہ مشق شعراء ہی کریں گے۔ ہم نے تو ان کی شاعری سے مزے لینا تھا لے لیا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

نوٹ: یہ مقالہ بلتستان کا معروف ادبی مجلّہ '' موج ادب '' کے پروفیسر کمال الہامی نمبر کے لیے خصوصی لکھا گیا ہے۔ وہاں بھی دیگر اہل ادب کی تحاریر کے ساتھ شائع ہوگا۔ 8-5-2015

صدائے گلگت کی صدا

صدائے گلگت سے میری قلمی وابستگی بہت پرانی ہے۔اس وابستگی کی وجہ سے اخبار کے نشیب وفراز سے بھی آگاہی ہے۔میں ہمیشہ اس صدا کی گونج کے لیے اللہ کے حضور ملتجی رہامگرافسوس کہ یہ صدا ہمیشہ سے دبائی جاتی رہی۔اس صدا کو دبانے میں اپنوں کی بے رعنائیوں کے ساتھ غیروں کی ریشہ دوانیاں بھی شامل رہی۔یہ ایک طویل قصہِ غم ہے کبھی پھر سہی۔تاہم اب روزنامہ صدائے گلگت کو نئے سرے سے منظر عام لایا جارہا ہے۔اللہ کرے اب کی بار یہ صداء ''صداء بصحرا'' نہ ہو۔صدائے گلگت کو اب کی بار دوبارہ ''میک آپ '' کرکے اس کے قارئین کی نذر کی جارہی ہے تو تجدید شدہ اولین شمارے کے لیے یہ چند الفاظ لکھنے لگا ہوں۔

میرے احباب جانتے ہیں کہ میں نے صحافت کو بطور پیشہ نہیں اپنایا،اور نہ ہی صحافت کو کمانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ صحافت میرا ذوق ہے۔اور میں اپنی ذوق کی تکمیل کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا ہوں۔اسی ذوق کی خاطر مجھے صحافت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا پڑا۔ میں نوجوانوں صحافیوں اور اپنے شاگردوں سے بھی ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ صحافت کی خارزار جھاڑیوں میں قدم رکھو تو کمانے کے لیے

نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے لیے قدم رکھو۔اپنی مختصر زندگی میں صحافت کے ذریعے بہت سی خدمات اس معاشرے کی بہتری کے لیے انجام دی ہیں۔ اللہ مزید توفیق دے۔ میرے نزدیک صحافت ایک مقدس پیشہ ہے۔ صحیفے آسمانوں سے اترتے ہیں تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا مقدس پیشہ ہے۔اس مقدس پیشے کی لاج رکھنا صحافت سے منسلک ہر آدمی کا فرض ہے۔ مگر یہاں تو اس کو جنس بازار بنایا جاچکا ہے۔ گلگت بلتستان کی صحافت کی جب بھی تاریخ لکھی جاوے گی تو صدائے گلگت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ صدائے گلگت ، اب کی بار اس کے اصل اور حق دار مالک.برادرم عبداللطیف کی ملکیت میں آچکی ہے۔ انہوں نے ایک تجربہ کار ٹیم کا انتخاب کیا ہے۔اس کی ٹیم کے نئے چہرے دیکھ کر دل باغ باغ ہوا۔برادرم عبداللطیف اور اس کی عامل ٹیم سے میری گزارش ہے کہ آپ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اخبار پر آنچ نہ آنے دیں۔ جو کہنا ہے ڈنکے کے چوٹ پر کہا جاوے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل آپ کا موٹو ہونا چاہیے۔ جھکنا آپ کی سرشت میں ہی نہ ہو، حق پر ڈٹنا آپ کا منشور ہو۔ مالی مشکلات آپ کا راستہ نہ روکتی ہو۔ اصحاب اقتدار اور ان کے چیلوں کے مظالم آپ کے ارادوں کو نہ بدلنے پاوے اور ڈالر کی جھونک ضمیر کو نہ خریدنے پاوے۔ آپ کو ایک مرد بیمار کے بجائے ایک مرد جری و بے باک صحافی کا کردار ادا کرنا ہوگا یعنی ''یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزدان چاک''۔

میرا ایک مسئلہ ہے۔ میں نے قنوطیت سے بھاگنے بلکہ دور بھاگنے کا حلف اٹھا رکھا ہے۔ غربت میں نام کمانے کے گُر سے واقفیت حاصل کی ہے۔ میرا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا کے اکثر عظیم ترین لوگ غریب جھونپڑیوں اور جھگیوں سے اُٹھے ہیں۔خدا کو سجدہ کرنے والے اور خانہ خدا کو آباد کرنے والے بھی غریب ہی ہیں۔امید سے دنیا قائم ہے۔ تمنائیں ہر کسی کا حق ہے۔ کم سے کم امیدوں اور تمناؤں پر تو اقوام متحدہ پابندیاں عائد نہیں کر سکتی۔ سو میں بھی یہ امید اور تمنا کرتا ہوں کہ صدائے گلگت اپنی تمام تر جھولانیوں اور رعنائیوں سے پھلے پھولے اور انسانی خدمت میں ہر ایک سے دو قدم آگے رہے۔ صحافت کوئی مزاق نہیں اور نہ ہی اس کو مزاق سمجھا جا سکتا ہے۔ صدائے گلگت کی ٹیم کو مبارک بادی کے ساتھ ایک مشورہ بھی دونگا کہ انیسوی صدی کے نامور صحافی و ادیب جناب شورش کاشمیری کے ان اشعار کو اپنا منشور اور پالیسی بنائے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے سینکڑوں مسائل ہیں لیکن پھر بھی۔ بہر صورت شورش کاشمیری نے آزادی صحافت پر ایک نظم کہی ہے اس کے چند بند آپ کی نظر کرتا ہوں ۔ شاید کہ تیرے دل میں اتر جاوے میری بات:

تم قلم روک رہے ہو پر تمہیں یاد رہے
ہم وہاں ہیں کہ سفینوں سے لہو ٹپکے گا
دعوتِ فکر کا رکنا ممکن نہیں صاحب
شہریاروں کی جبینوں سے لہو ٹپکے گا

ہم قلم کار کسی خوف سے دبنے والے نہیں
ہم یہاں پرورشِ دار ورَسن کرتے ہیں
پابہ زنجیر چلے جاتے ہیں مقتل کی طرح
اپنے ہی خون سے مینائے سفر بھرتے ہیں

میں اپنے ان دوستوں اور عامل صحافیوں سے گزارش کرونگا کہ وہ صحافت کی اعلی اقدار کا ہر حال میں پاس رکھیں' اس کی لاج رکھنا سب سے پہلے آپ کی ذمہ داری ہے۔۔ مرحوم الطاف حسین حالی نے مسدس حالی میں بے ضمیر قلم کاروں اور صحافیوں کے لیے ایک نظم رقم کی ہے۔حالی کے بیان کردہ مذموم نکات سے بچتے ہوئے اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دیں۔مجھے امید ہے کہ آپ ایسا ہی کریں گے۔ ملاحظہ ہو۔

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہو' وہ تحریر کرنی
گنہ گار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تذلیل کرنی
یہ ہے صحافیوں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

تجدید شدہ اولین شمارے کے لیے یہ چند الفاظ بطور ہدیہ تبریک قلم کیے ہیں۔ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ نیکو کاروں کی مدد کرے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

اختلاف کے ساتھ اتحاد

معاشرتی امن اور سماجی انصاف میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اور ملک عزیز میں سب سے زیادہ اسی کا فقدان ہے۔ آج کی محفل میں ایک بار پھر مختصراً اس موضوع کو چھیڑتے ہیں کہ کیا اختلاف کے ساتھ اتحاد ممکن ہے؟۔ میرا سادہ سا جواب ہے کہ بالکل اختلاف بلکہ سخت اختلاف و تنوع کے ساتھ بھی اتحاد ممکن ہے۔ مجھے علمی اور سماجی و سیاسی شخصیات کے ساتھ ہمیشہ ڈائیلاگ کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو سیکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہر ایک کا یہی رونا ہوتا ہے کہ امت کا شیرازہ اختلاف و لڑائی کی وجہ سے بکھرا ہوا ہے۔ اور یہ بات کسی حدتک درست بھی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آج کے موجودہ معاشرے میں شیعہ سنی، بریلوی دیوبندی، وہابی، حیاتی مماتی، مقلد (حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی) غیر مقلد، خارجی غیر خارجی، صوفیہ امامیہ، اسماعیلی آغاخانی، خوجے، بوہری، غامدی، مودودی، غرض سینکڑوں فرقے ہیں پھر ہر فرقے کے اندر جتھے کے جتھے ہیں اور ہر، جتھہ دوسرے کو بدعتی اور لادین و بے دین کہتا نہ تھکتا ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ صرف احناف کے اندر کئی گروہ ہیں جو ایک دوسروں پر لعن و طعن اور خارج از اسلام قرار دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اہل سنت کا گروہ احناف میں بریلوی و دیوبندی، حیاتی و مماتی اور تبلیغی و جہادی ایک دوسروں کے لیے کتنا احترام اور برداشت رکھتے ہیں یہ سب

جانتے ہیں۔آج مملکت خداداد پاکستان میں سینکڑوں فرقے وجود میں آچکے ہیں بقول عبدالخالق تاج کے ،صرف گلگت کشروٹ میں تہتر فرقے ہیں۔تاہم اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ہمیں اسلام کے صدر اول کا مختصر جائزہ لینا ہوگا۔ عین ترقی اسلام میں مسلمانوں کے کئی گروہ یا فرقے وجود میں آئے تھے۔ان میں خارجی، جہمیہ، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، شیعہ، اہل ہوا،اور اہل بدعت وغیرہ بہت ہی مشہور تھے۔پھر اہل سنت کے اشعری، ماتریدی، حنبلی، محدثین اور دیگر کی علمی بوقلمونیاں اور معاصرانہ چشمک تاریخ کے صفحات پر عیاں ہیں اور ایک دوسروں کو گمراہ اور زندیق کہنا تو معمول کی بات تھی۔ان کے حوالے دینے بیٹھ جاؤں تو صفحات کے صفحات بھر جائیں گے۔

ان تمام فرقوں کے علمی مناظروں و معرکوں کی کہانیوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔تاہم اس دور میں وہ تمام اصحاب علم وفرق سمجھتے تھے کہ عقائد کے باب میں اتنے سخت اختلاف کے باوجود بھی مشترک اغراض و مقاصد اور معاشرتی ضروریات ا ور سماجی انصاف کے لیے اتحاد ممکن ہے۔اور اگر سچ پوچھا جائے تو اسی اتحاد ویکجہتی کی دعوت قرآن کریم نے دی ہے۔ اللہ تعالی سورہ لقمان میں ارشاد فرماتے ہیں کہ '' واِن جاھداک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم، فلاتطعھما، وصاحبھما فی الدنیا معروفا''۔یعنی اگر وہ دونوں (لڑکے کے والدین) یہ کوشش کریں کہ تو ہمارا شریک اس چیز کو بنائے، جس کا تجھ کو علم نہیں تو

ان کا کہنا نہ مان، لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آ۔قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین بیٹے کو شرک پر اکسار ہے ہیں مگر اللہ بیٹے کو شرک سے روک رہے ہیں مگر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور معاشرتی رواداری کا حکم فرماتا ہے۔اس آیت کریمہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اختلاف اور اتفاق کی راہیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔یہ سوفیصد ممکن ہے کہ عقائد کے باب میں اختلاف ہو مگر دوسرے معاملات بالخصوص معاشرتی یکجہتی و رواداری میں اتفاق و اتحاد ممکن ہے۔

اختلاف کیساتھ اتحاد ممکن ہے۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ اور اس دعویٰ کے سینکڑوں دلائل موجود ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ علامہ زمخشری غالی معتزلی تھے۔ انہوں نے تفسیر کشاف لکھی اس میں اپنے عقائد کو کہیں واضحاً اور کہیں اشارتاً بیان کیا لیکن علماء امت نے ہمیشہ تفسیر کشاف سے استفادہ کیا اور اپنے دروس و نصاب میں اس کو شامل رکھا۔یہی حال علامہ تفتازانی کی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عقلی اور ادبی، عقلی سائنسی علوم میں جو لوگ امام مانے جاتے تھے ان کا احترام ہر دور میں کیا جاتا رہا، اگرچہ ان کے عقائد میں بعدالمشرقین تھا۔ مختلف مکاتب فکر کی کتابیں پڑھائی جاتی رہی۔ اور فرقہ مخالف کے مصنف کا نام احترام و اکرام سے لیا جانا ایک معمول کی روایت تھی اور آج بھی کہیں کہیں یہ بات موجود ہے۔

میرا مدعا صرف اتنا ہے کہ دوسروں کو چھیڑا نہ جائے اور اپنا عقیدہ چھوڑا نہ جائیں۔ قرآن کریم کی زبان میں اسے ''لکم دینکم ولی دین'' کہا جاتا ہے۔اس میں دورائے نہیں کہ انتشار وافتراق کے بے شمار علل واسباب ہیں۔ ہم ان میں سختی پیدا کرنے کے بجائے ان اسباب کو ختم کرنا چاہیے تو یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اسلام نے انسانیت کا درس سب سے زیادہ دیا۔کیا ہم انسانیت کے نام پر بھی سکون سے نہیں رہ سکتے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے'' یا ایھا الانسان ماغرک بربک الکریم'' ۔ اے انسان تجھے کس نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔تجھے کس نے تیرے پرودگار سے دور کیا ہے۔ہمارے معاشرے میں جوانٹیلیکچول ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان تمام اسباب و علل کا کلیۃً خاتمہ کریں جو انتشار وافتراق اور لڑائی جھگڑے کا سبب بن رہے ہیں۔ اگر ان کو ملیامیٹ کیا جانا ممکن نہیں تو پھر ایسا ماحول ضرور پیدا کیا جانا چاہیے کہ ان اسباب و علل کی پرچار اور تبلیغ پر پابندی ہو۔ اور یہ پابندی لوگ حکومت کی بجائے لوگ اخلاقی طور پر قبول کریں۔ اس کے لیے اسکالرز اور تعلیم یافتہ احباب کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ موجود دور میں میڈیا ایک باوقار ذریعہ ہے۔ اگر میڈیا کے کارپرداز چاہیے تو وسیع پیمانے پر یہ خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ شاید میڈیا مالکان کی ترجیحات میں یہ بات نہ ہو۔ سانحہ لال مسجد ہو، سانحہ پشاور ہو یا پھر سانحہ کراچی یا دیگر سانحات۔ یہ کسی گروپ یا کمیونٹی کے سانحے

نہیں یہ تمام سانحات پاکستان کے ہیں۔ ایسے سانحات سے ہمیشہ ملک و ملت بدنام ہو جاتے ہیں۔ اب وقت آیا ہے کہ پاکستانیوں کو گروپ بندیوں کی بجائے پاکستانی ہو کر سوچنا ہوگا۔ آج بھی اگر ''تیرا میرا'' کا چکر رہا تو پھر مشکل ہے زندگی کو معاشرتی رواداری سے گزارنا۔ خدا کے لیے انسانیت اور پاکستانیت کے نام پر تو متحد ہو جائیں۔

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

دیامر میں سیاسی تعصب، المناک ہے

بلاشبہ ضلع دیامر پاکستان کے 135 ضلعوں میں سب سے پسماندہ ضلع ہے۔اس ضلع کی پسماندگی کے عِلل میں دیگر عوامل کے ساتھ یہاں کی سیاسی لیڈر شپ کا حد درجہ تعصب پر مبنی رویہ ہے۔گلگت بلتستان کے کسی بھی ضلع سے زیادہ عصبیت ضلع دیامر میں پائی جاتی ہے بلکہ پالی جاتی ہے۔ ضلع دیامر وہ واحد ضلع ہے جہاں سو فیصد اہل سنت دیوبندی مکتبہ فکر کے لوگ بستے ہیں۔مگر انتہائی المناک بات یہ ہے کہ یہاں کے حفاظ و علمائ، یہاں کے تبلیغی و مجاہد، یہاں کے سیاسی لیڈر، سماجی ورکر، سرکاری ملازم،مزدور، جدید تعلیم یافتہ حضرات، اور عوام یہاں تک کہ خواتین بھی غالی درجے کی تعصب میں مبتلا ہیں۔اس عصبیت نے ضلع دیامر کے تمام طبقوں کا امیج بری طرح برباد کر رکھا ہے۔ یہاں کی برادیوں کے تعصب سے گلگت بلتستان کے دوسرے اضلاع کے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ جب برادریوں کے تعصب کی بات آتی ہے تو دیامر کے لوگ مذہب و مسلک اور اسلام تک کو پاؤں تلے روندھتے ہیں۔اور وہاں جا گرتے ہیں جہاں صرف اور صرف گندا کیچڑ ہوتا ہے۔اسی برادری تعصب (شین یشکن) کی وجہ سے کئی کئی خاندانیں صفحہء ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ کئی دشمنیاں برادری تعصب کی وجہ سے سالوں چلتی رہی ہیں ۔جس میں سینکڑوں قیمتی جانیں ضائع ہوئی۔لوگ اپنی عزت

اور حیاء تک کی قربانی دیتے ہیں مگر برادری تعصب کو ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔دیامر کی برادریوں نے جو علماء پیدا کیے ہیں بد قسمتی سے ان میں بھی یہ بیماری بوجوہ تمام موجود ہے۔اگر سچ کہوں تو کئی جید علماء تعصب و عصبیت کے سرغنہ ہیں۔افسوس اس بات پر ہے کہ یہ حضرات تو امام اور رہنماء تھے مگر انہوں نے تقویٰ و پرہیز گاری کی بجائے تعصب بالخصوص شین یشکن کی تعصب سے اپنا وقار کھودیا اور اوج ثریا سے قعرمذلت میں گرتے جارہے ہیں۔یا اسفا علی ذالک

کیا اسلام میں تعصب کی گنجائش ہے؟آیئے اس سوال پر مختصر بحث کرتے ہیں کہ تعصب کرنے والوں کے لیے خدارسول کے کتنے سخت احکامات موجود ہیں۔اور جائزہ لیتے ہیں ان لوگوں کا جو سرتاپا تعصب اور نفرت سے بھرے پڑے ہیں۔تعصب ایک لعنت ہے۔اسی تعصب کی وجہ سے نہ معلوم کتنے حضرات کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔تقویٰ وتورع کا بھرم سربازار پھوٹتا ہے۔کتنی مقدس شخصیات نے اس حمام میں اپنے آپ کا ننگا کردیا۔کتنے مقبول لیڈروں کی فلک بوس سیاست کو تعصب نے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔جمہوریت کے بڑے بڑے علمبردار جھوٹ کے پتلے نظر آرہے ہیں۔تعصب کے لغوی معنی عصبیت دکھلانا اور دھڑے بندی کرنا کے ہوتے ہیں۔تعصب کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی قوم کا ظلم میں ساتھ دینا یعنی ظلم میں قوم کی مدد کرنااور حق ظاہر ہونے کے باوجود قبول نہ کرنے کو تعصب کہا جاتا ہے۔تعصب کی

کئی شاخیں ہیں۔ قبیلہ پرستی و ذات برادری (شین یشکن، ڈوم کمین) کی عصبیت، حسب ونسب کی عصبیت، لسانی و وطنی عصبیت اور علاقہ و قوم کی عصبیت، مالداری و غریبی کی عصبیت۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے ان تمام عصبیتوں کو سختی سے منع کیا ہے۔مذکورہ تمام تعصبوں سے خطرناک حسب و نسب اور ذات و قبیلہ پرستی کی عصبیت ہے جو ضلع دیامر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ خود کو عظیم اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کا سلسلہ عام ہے۔اور حسب ونسب اور ذات وقبیلہ پرستی اتنی عام ہے کہ لوگ بزعم خود اونچا سمجھتے ہیں اور دوسروں کو انسانیت کا درجہ دینے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔اور خود کو اقتدار کا لازمی حقدار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالٰی کا ارشاد واضح ہے کہ ''یایہا الناس اِنا خلقنٰکم مِن ذکر وانثی و جعلنٰکم شعوبا و قبائل لِتعارفوااِن اکرمکم عِند اللہِ اتقاکم، اِن اللہ علِیم خبِیر'' یعنی اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت آدم وحوا) سے بنایا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا (محض اس لئے کیا)) تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ تعالٰی کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو بلاشبہ اللہ تعالٰی خوب جاننے والا اور پوری خبر رکھنے والا ہے۔قرآن کریم کی اس آیت نے تعصب کے تمام پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیا ہے۔ اسی طرح احادیث نبوی میں بھی ہر قسم کے تعصب سے ممانعت کی گئی ہے۔امام

قرطبی نے اپنی معروف تفسیر الجامع الاحکام میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ کہ حضور اکرم صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا بن فلانہ کہنے والا کون ہے ؟ثابت نے عرض کیا میں یا رسول اللہ، حضور صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سب کے چہروں کو دیکھو۔ ثابت نے موجود تمام صحابہ کے چہروں کو دیکھا۔ حضور صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثابت کیا دیکھا عرض کیا کوئی سفید ہے کوئی سرخ ہے کوئی سیاہ ہے۔ حضور صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو تم ان سے نہیں بڑھ سکتے مگر تقوی کی وجہ سے یعنی تمہارا تقوی اور پرہیزگاری ان سے بڑھ کر ہے تو تمہارا مقام عند اللہ اونچا ہوگا یہ دنیوی اونچ نیچ کی وقعت عند اللہ نہیں ہے۔ تفسیر قرطبی میں ایک اور حدیث بھی تعصب کے حوالے سے نقل کی ہے کہ ''عن ابی نضر قال حدثنی او حدثنا من شہد خطب رسولِ اللہِ بمنیٰ فی وسطِ ایامِ التشریقِ وہو علی بعیر فقال یا یہا الناس اَلا اِن ربکم واحد واِن ابا کم واحِد۔اَلا لا فضل لِعربی علی عجمی ولا عجمِی علی عربی ولا لسود علی احمر ولا لِاحمر علی اسود اِلا بِالتقوی۔اَلاہل بلغت قالوا نعم قال لیبلغِ الشاہِد الغایب'' یعنی ابو نضر کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جو مقام منی میں ایامِ تشریف کے درمیان میں حضور صل اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں حاضر تھا درانحالیکہ آپ اونٹ پر سوار تھے آپ صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! خبردار! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ (آدم) ایک ہے۔ خبردار کسی عربی آدمی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور

نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر نہ کسی کالے وسیاہ آدمی کو کسی سرخ پر اور نہ کسی سرخ کو کسی سیاہ آدمی پر کوئی فضیلت ہے۔ہاں تقوی فضیلت کا مدار ہے پھر آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا میں نے پیغام الہی امت تک پہنچادیا؟ صحابہ نے جواب دیا جی ہاں آپ نے پہنچادیا۔آپ صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعصب کرنے والوں کو امت محمدیہ سے خارج قرار دیا ہے۔آپ کا ارشاد ہے ترجمہ حدیث یعنی جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ نبی اکرم صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عصبیت کا داعی ہو اور عصبیت کی خاطر قتال وجنگ وجدل کر رہا ہو اور جو تعصب کی خاطر قتال کرتا ہوا مرجائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔اس طرح کے کئی احکام ہیں جو عصبیت کی بیخ کنی کرتے ہیں۔

عصبیت سے کئی امراض اور پیدا ہوتے ہیں۔حقوق العباد سے انسان چشم پوشی کرتا ہے۔حسد، ضد، کینہ بغض اور عداوت متعصب کے رگ رگ میں پیدا ہوتی ہے۔تعصب سے ظلم و تعدی، الزام و بہتان اور افتراپردازی کے ہزاروں دروازے کھلتے ہیں۔ایک دوسروں کو حقیر، ذلیل، کم تر سمجھنے کا رواج عام ہو جاتا ہے۔قتل و غارت اور ظلم و ستم اور انسانیت کشی اپنے عروج پر پہنچتی ہے۔اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ تعصب ایک سخت ناسور ہے جس سے انسان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہو کر رسوائی وذلت اس کے مقدر بن جاتی ہے۔تعصب سے آپس میں

لڑنے جھگڑنے کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔تعصب بالخصوص نسلی وحسبی اور ذات و قبیلے کی تعصب و تفاخر بدبختی کے سوا کچھ نہیں۔اسی تعصب میں پھنس کر انسانیت سسک رہی ہے۔تاہم اسلام میں تعصب سے نکلنے کے لیے بہترین راستہ موجود ہے۔اسلام نے تعصب کی فصیلوں کو ڈھا کر انسانوں کو منظم نظامِ حیات بخشا ہے۔حیوانیت و درندگی اور تعصب و عصبیت سے نکل کر صالح معاشرے میں عزت سے جینے کا حق دیا ہے۔مگر بدقسمتی سے ہم سرتاپر تعصب اور عصبیت کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

میں یہاں صرف ضلع دیامر میں پائی جانے والے سیاسی تعصب کا ذکر کروں گرونگا۔اصل میں یہ ذات و قبیلے کی تعصب ہے جو سیاسی تعصب میں تبدیل ہو گئی ہے۔اور ثابت کرونگا کہ سیاسی تعصب (یعنی شین یشکن کی سیاست) میں ضلع دیامر کہاں تک ملوث ہے۔اور اس تعصب کو بامِ عروج تک کس نے پہنچایا ہے۔میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ حقائق کے آئینے میں دکھایا جائے کہ واقعی دیامر میں تعصب ہے کہ نہیں۔

ہم مختصراً ضلع دیامر کے سیاسی ممبروں کا جائزہ لیتے ہیں کہ 70 19 سے لے کر اب تک ضلع دیامر سے کتنے ممبر، خواتین ممبرٹ اور ٹیکنو کریٹ منتخب ہوئے اور ان میں کتنے شین تھے اور کتنے یشکن تھے۔اس تعداد سے ہم اچھی طرح اندازہ

کر سکیں گے کہ ضلع دیامر میں سیاسی تعصب کس درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کی آبیاری کہاں کہاں سے کی جاتی ہے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو گلگت بلتستان کی مشاورتی کونسل کے اولین انتخابات ہوئے۔ مشاورتی کونسل کا چیئرمین ریذیڈنٹ گلگت بلتستان مقرر ہوا۔ اس کونسل میں ضلع دیامر (بشمول استور) سے چار ممبر منتخب ہوئے۔ استور سے امیر حمزہ اور محمد خورشید خان جبکہ چلاس سے عبدالرؤف اور داریل تانگیر ملک محمد مسکین منتخب ہوئے۔ دوسرے انتخابات ناردرن ایریاز کونسل کے ماتحت ۶ نومبر ۱۹۷۵ء کو منتخب ہوئے۔ مشاورتی کونسل کا نام تبدیل کرکے ناردرن ایریاز کونسل رکھا گیا۔ اس کے چیئرمین وزیر امور کشمیر شمالی علاقہ جات مقرر ہوا۔ اس کونسل میں دیامر سے چار ممبر منتخب ہوئے۔ استور سے قاری عبدالحکیم اور عبدالحمید خاور جبکہ چلاس سے عبدالرؤف اور داریل تانگیر سے ملک محمد مسکین منتخب ہوئے۔ ناردرن ایریاز کونسل کے تیسرے انتخابات ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو امنعقد ہوئے۔ اس میں بھی دیامر سے چار ممبر منتخب ہوئے۔ استور سے افلاطون اور قاری عبدالحکیم جبکہ چلاس سے حنیف اللہ اور داریل تانگیر سے حاجی امیر جان منتخب ہوئے۔ ناردرن ایریاز کونسل کے چوتھے انتخابات ۱۲۶ کتوبر ۱۹۸۳ء کو منعقد ہوئے۔ اس میں بھی دیامر سے چار ممبر منتخب ہوئے۔ استور سے محبوب علی اور حاجی جان محمد جبکہ چلاس سے حاجی عبدالقدوس اور حاجی امیر جان منتخب ہوئے۔ ناردن ایریاز کونسل کے

پانچویں انتخاب ۱۱ نومبر ۱۹۸۷ء کو منعقد ہوئے۔ اس میں دیامر استور سے محمد نصیر اور صاحب خان جبکہ چلاس سے جانباز خان اور داریل تانگیر سے جان عالم منتخب ہوئے۔ ناردرن ایریاز کونسل کے چھٹے انتخابات نومبر ۱۹۹۱ء منعقد ہوئے۔ اس میں دیامر استور سے محبوب علی اور شاید علی جبکہ چلاس سے عبدالقدوس اور داریل تانگیر مہرداد منتخب ہوئے۔ کونسل کے ساتویں انتخابات اکتوبر ۱۹۹۴ء کو منعقد ہوئے۔ اس میں ضلع دیامر استور سے نصراللہ اور عبدالحمید جبکہ چلاس سے شاہ بیگ اور جانباز، داریل سے حیدر خان اور تانگیر سے امیر جان منتخب ہوئے۔ اور خواتین کی نشست سے شائستہ شمیم حمزہ منتخب ہوئی۔ اس میں تمام سات ممبران شین برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب کونسل کا نام ناردرن ایریاز کونسل کی بجائے ناردرن ایریاز لیجسلیٹو کونسل رکھا گیا۔ لیجسلیٹو کونسل کے آٹھویں انتخابات ۱۹۹۹ء منعقد ہوئے۔ اس میں بھی دیامر کے سات ممبر منتخب ہوئے۔ دیامر استور سے صاحب خان اور محبوب علی خان جبکہ دیامر چلاس سے حاجی شاہ بیگ اور جانباز جبکہ داریل سے رحمت خالق اور تانگیر سے امیر جان منتحب ہوئے۔ اور محترمہ شائستہ شمیم خواتین کی نشست سے منتخب ہوئی۔ کونسل کے نویں انتخابات جماعتی بنیادوں پر ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۴ منعقد ہوئے۔ اس ہیں آٹھ ممبر منتخب ہوئے۔ دیامر استور سے عبدالحمید، مظفر ریلے جبکہ چلاس سے فداء اللہ اور عبدالقدوس اور داریل سے حیدر خان اور تانگیر سے ملک مسکین منتخب ہوئے۔ ٹیکنوکریٹ کی سیٹ سے جان عالم اور خواتین کی نشست سے محترمہ گل میرا دلپذیر

منتخب ہوئی۔

حکومت پاکستان نے ۱۵ دسمبر ۲۰۰۷ء کو گلگت بلتستان کے لیے چند اہم انتظامی اصلاحات کی منظوری دی۔ قانون ساز کونسل کو قانون ساز اسمبلی قرار دیا۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۹ء پیپلز پارٹی حکومت نے صدارتی پیکج کے ذریعے کسی حد تک داخلی خود مختاری دی، یوں قانون ساز اسمبلی کے دسویں انتخابات ۱۲ نومبر ۲۰۰۹ کو منعقد ہوئے۔ اب استور الگ ضلع بن چکا تھا۔ اس دفعہ دیامر سے سات ممبر منتخب ہوئے۔ چلاس سے بشیر احمد اور جانباز اور داریل سے رحمت خالق اور تانگیر سے گلبر خان اور ٹیکنوکریٹ سے مولانا سرور شاہ خواتین کی نشست سے گُل میرا صاحبہ منتخب ہوئی جبکہ گلگت بلتستان کونسل کے لیے دیامر سے سید افضل منتخب ہوئے۔اور مشیر اعزازی کے طور پر طیفور شاہ کو سیاسی امور دیامر کا مشیر لیا گیا۔دیامر کے ممبروں میں بشیر احمد اور حاجی گلبر کو وزارتیں جبکہ سید افضل کو گلگت بلتستان کونسل کے چیئرمین (وزیراعظم) کا مشیر لیا گیا۔ان سات ممبروں میں صرف رحمت خالق ممبر اسمبلی ہیں باقی چھ ممبر اور ایک اعزازی مشیر شین برادری سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ دونوں وزارتیں اور مشیر برائے گلگت بلتستان کونسل بھی شین برادری کے قبضے میں رہیں۔

(اب تک دس الیکشن ہوئے ہیں ۔ ان تمام الیکشن یں موجودہ دیامر سے اکتیس (۳۱

ممبر اسمبلی اور ایک اعزازی مشیر منتخب ہوئے ہیں۔ اس میں صرف ملک مسکین اور رحمت خالق یشکن باقی سارے ممبر شین برادری سے منتخب ہوئے ہیں۔ کسی تیسری برادری کو موقع ہی نہیں دیا گیا۔ بلکہ انہیں الیکشن لڑنے تک کی اجازت نہیں ملتی۔ اب تک جتنی وزارتیں، مشیریاں، ٹیکنوکریٹس اور خواتین ممبر منتخب ہوئیں ہیں وہ بھی تمام کی تمام ہماری شین برادری سے تعلق رکھتی ہیں۔ سوائے ایک دفعہ ملک مسکین اسپیکر بنے ہیں۔ انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ اب تک تمام سیاسی پارٹیوں نے دیامر یں صرف اور صرف شین برادری کے امیدواروں کو پارٹی ٹکٹ دیا سوائے ایک دفعہ رحمت خالق کے۔ دس بار کے الیکشن میں موجودہ دیامر سے چار دفعہ ملک مسکین اور دو دفعہ رحمت خالق کو ممبر بننے کا موقع ملا، باقی کسی کو نہیں۔ اب تک کے اعداد و شمار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ دیامر میں سیاسی تعصب کی کیا انتہا ہے۔ ہمیں اللہ اس تعصب سے بچائے۔

اب گلگت بلتستان اسمبلی کے گیارہویں الیکشن آٹھ جون 2015ء کو ہو رہے ہیں۔ اس میں بھی تعصب، قبیلہ و ذات پرستی اور حسد کی انتہا ہو رہی ہے۔ نسلی و قبیلہ جاتی تعصب میں بڑے بڑے علماء اور قائدین بری طرح ملوث ہیں۔ دن رات بیٹھ کر سازشیں کر رہے۔ امیدوار کے کردار اور اہلیت و صلاحیت کی بجائے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ یہ کس برادری کا ہے۔ اپنے حلقے کے علاوہ دوسرے حلقے کے مخالف برادری کے امیدوار کو ہرانے کے لیے مل بیٹھ کر سرگوشیاں کی جاتیں ہیں اور عہد لیے

جاتے ہیں کہ فلاں فلاں کو کسی صورت اسمبلی نہ پہنچنے دیا جائے۔ سخت سے سخت سیاسی فریق اتحادیں قائم کررہے ہیں تاکہ مخالف برادری کا امیدوار جیت نہ جائے۔ قبیلہ جاتی برادری کے لیے پارٹی اور رشتہ داریوں کو بھی دور دھکیلا جارہا ہے۔ نقد رقم اور چھوٹی موٹی نوکریاں دلوا کر ووٹ خریدنے کا عمل بھی تسلسل سے جاری ہے۔ قارئین ! یہ رویہ کیا ظاہر کرتا ہے؟۔

علماء کرام سے ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہوں کہ خدا اور رسول کے احکامات مانتے ہوئے اس گندے کیچڑ سے اپنے آپ کو باہر نکالو۔ عوام الناس اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے سے اپیل کرتا ہوں کہ خدارا! برادری کے تعصب سے نکل کر اس امیدوار کو ووٹ کاسٹ کر کے جیت یقینی بنائیں جو آپ کے حلقے اور ملک وملت کے اجتماعی مفادات ومقاصد کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ بہت ساری ے تلخ حقائق کو پھر کبھی بیان کرتے ہیں۔ جو ناسور کی طرح دیامر کو برباد کررہے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

گلگت سے کالا پانی تک

آغازِ سفر

یہ میری ایک افیشل میٹنگ تھی۔ احباب کے ساتھ محوِ گفتگو تھا کہ سیل فون رنگ رنگ بجنے لگا۔ کال ریسو کی تو ایک کڑک دار آواز میں یہ مژدہ سنایا گیا کہ آج تین بجے (24-08-15) استور کا سفر ہے۔ احبابِ سفر میں آپ بھی شامل ہیں۔ تین دن کا سفر ہے۔ کالا پانی تک جانا ہے۔ مسجد کی افتتاح ہے۔ آپ اپنا سیاحتی ذوق بھی پورا کیجیے اور اس کارِ خیر میں حصہ بھی لیجیے''۔ کالا پانی کا نام سن کر میں شش پنج میں مبتلا ہوا کہ کیا پاکستان میں بھی کالا پانی ہے۔ میں نے اپنے گھر میں فوری اطلاع کی کہ اسباب سفر تیار رکھے جائیں۔ استور راما کا ایک سفر پہلے بھی ہوچکا تھا تاہم اب کی بار سفر کافی لمبا تھا اس لیے لازمی سفری اسباب تیار کرکے چار بجے گلگت سے استور روانہ ہوئے۔ یقیناً سفر مشقت کا باعث ہوتا ہے اس لیے میں سفری دعائیں ضرور پڑھتا ہوں۔ ہر مسافر اور سیاح کو ارادہِ سفر کے وقت یہ دعا ضرور پڑھنی چاہیے۔ یہ دعا ترمذی شریف میں ہے۔ ''زودک اللہ التقویٰ و غفر ذنبک ویسر لک الخیر حیثُ ماکنتَ''۔ اور سفر سے پہلے دو رکعت نماز سفر بھی پڑھنی چاہیے۔ یہ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت و مروی ہے۔ اور بھی بہت ساری دعائیں ہیں جن کا سفر میں اہتمام کیا جاتا ہے۔

ضلع استور کا طائرانہ جائزہ

استور گلگت بلتستان کا ایک نیا ضلع ہے۔ یعنی 2004ء میں ضلع دیامر سے الگ کرکے ضلع بنادیا گیا ہے۔ استور میں سینکڑوں وادیاں اور نالے ہیں، بہتے آبشار ہیں۔ جن میں مشہور وادیاں پریشنگ، گوری کوٹ، گدئی، میر ملک، روپل اور کالا پانی شامل ہیں۔اور کئی ایک درے بھی ہیں جن میں برزل، شونٹر، چھچھور کھنڈاور چاچوک عالم وغیرہ سیاحوں کے لیے دلچسپی کے باعث ہیں۔۔استور ضلع کا نام ہے اور ''استور'' ضلع کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ ہمارے مضیف جناب وزیر اقبال بتارہے تھے کہ ہیڈ کوارٹر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کوریکوٹ اور استور عیدگاہ۔ ہیڈ کوارٹر استور سطح سمندر سے 2400میٹر بلند ہے۔استور کا رقبہ (مربع کلومیٹر) 8657 ہے۔گلگت اسمبلی میں ضلع استور کی دو نشتیں ہیں۔رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے یہ دو نشتیں ناکافی ہیں۔ کم از کم تین تو ہونی چاہیے۔ کسی زمانے میں استور چین، افغانستان اور کشمیر و ہندوستان کے لیے ایک اہم سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔اور استور میں گھومنے پھرنے سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔استور بونجی سے گریز تک پھیلا ہوا ایک وسیع علاقہ ہے۔ تھلیچی کے کے ایچ سے استور روڈ شروع ہوتا ہے۔دریا سندھ کراس کرنے کے لیے ایک آر سی سی برج بنائی گئی ہے۔رام گھاٹ پل بونجی کے ساتھ معلق ہے۔ وہاں سے باقاعدہ استور کی وادیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ہزاروں آبشاروں،ندی

نالوں اور گلیشئرز سے بہتا پانی دریائے استور کی شکل میں پہاڑوں کے بیچوں بیچ بہہ رہا ہے اور دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔رام گھاٹ پل کراس کرتے ہی رائٹ سائٹ پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے ساتھ لپٹی سڑک ایک سیاہ لکیر جیسی نظر آ رہی ہے۔روڈ کی حالت انتہائی خستہ ہے۔ٹریفک چلتی رہتی ہے۔گاڑیوں سے بھی ان گھاٹیوں کا نظارہ قابل دید ہے۔ کہیں پہاڑ سے آتا پانی آبشاروں کی صورت میں سڑک کے آس پاس گرتا ہے اور ان آبشاروں کی پھوہاریں گاڑیوں اور مسافروں پر پڑتی ہیں تو عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ زندگی میں ایک نئی لہر سی دوڑتی ہے اور سفر کی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں۔ان آبادیوں میں مکانات، ایک ادھ دوکان اور پھلدار درختوں کے جھنڈ، جن پر سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے شگوفے، آلو کے کھیت اور مکئی و گندم کے سبزے انتہائی جاذبِ نظر لگتے ہیں۔

احبابِ سفر اور کثرت ازدواج

ہمارے احبابِ سفر میں گلگت سے قاضی نثاراحمد صاحب، مولانامنیر، برادرم حماد اور دیگر محافظین و پولیس عملہ شامل تھا۔جگلوٹ سے ہمارے ساتھ مفتی شفیع صاحب خطیب قطر دوحہ) بھی مع فیملی رفیق سفر تھے۔جگلوٹ ان کے دولت کدے پر چائے) نوش کی۔ اور فوری پابہ رکاب ہوئے ۔ نماز مغرب تھلیچی کی مسجد میں ادا کی جہاں ہماری ملاقات تھلیچی کی معروف عملیاتی شخصیت ''موران'' سے ہوئی۔ جو

میرے دور کے دادا بھی لگتے ہیں۔ عملیات میں انہیں ید طولی حاصل ہے۔ چلتی گاڑی رکوادیتے ہیں۔ نماز مغرب کے بعد ہماری گاڑیوں نے فراٹے بھرنے شروع کیے۔ سیدھا استور ہرچو جاکر رک گئیں۔ استور ہرچو میں مفتی شفیع صاحب نے ایک مسجد اور مدرسہ بنوائی ہے۔ مدرسہ کے طلبہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے تاہم ہمیں جلدی سے آگے نکلنا پڑا۔ تھلیچی سے مجھے مفتی شفیع صاحب کی معیت میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ بڑے ملنسار اور باذوق آدمی ہیں۔ 1992ء کو دارالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہیں۔ دورہ حدیث کے پوزیشن ہولڈر ہیں۔ آج کل قطر دوحہ میں خطابت اور پاکستان ایمبیسی اسکول میں بطور لیکچرار اصلاحی و تعلیمی فرائض انجام دے رہے ہیں اور گلگت بلتستان میں کئی دینی مکاتب کے معاون خاص ہیں۔ مفتی صاحب نے تین شادیاں کی ہیں جن سے دس اولاد ہیں۔ ہم نے بھی اپنی دیرینہ چاہت یعنی دوسری شادی کے حوالے سے ان سے گفتگو کی اور ضروری ٹپس لیے۔ شادیوں کے حوالے سے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں مثنیٰ (دو)، ثلث (تین) اور ربع (چار) کے الفاظ نازل فرمائے ہیں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ '' فانکحوا ماطاب لکم مِن النِساءِ مثنیٰ وثلاث ورباع، فاِن خفتم الا تعدِلوا فواحِدۃ ''ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار (مگر یہ اجازت بشرطِ عدل ہے)، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (زائد بیویوں میں) عدل نہیں کرسکو گے تو صرف ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔ اللہ تعالی نے ہمیں امت وسط '' قرار دیا ہے۔ امتِ وسط کا

لفظ اس قدر وسیع معنویت رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہ۔ ہمیں تو پوری انسانیت میں عدل قائم کرنے کا حکم ہے۔ شیخ القرآن مولانا طاہر صاحب فرماتے ہیں کہ بدبخت ہوگا وہ انسان جو اپنی دو بیویوں کے درمیان عدل قائم نہ کرسکتا ہو''۔ تو میں کہتا ہوں کہ وہ خاک انسانیت میں عدل قائم کرے گا۔

سیاحتی و دفاعی حوالے سے استور کی اہمیت

تقریباً رات دس بجے ہم گوریکوٹ میں وزیر اقبال کے دولت سرے میں پہنچ گئے۔ ہمارے کالا پانی تک کے مضیف وزیر اقبال ہیں۔ یہاں استور کے سابق ممبر اسمبلی قاری عبدالحکیم صاحب، برادرم انجینئر نقشبر صاحب داریلی اور دیگر احباب شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ مہمانوں کو ایک خوبصورت مزین و مرصع گھر میں بٹھا دیا گیا۔ فرشی نشست ہے۔ کھانے کا دور چلا، کئی قسم کے دیسی و بدیسی کھانے پیش کیے گئے۔ جی بھر کر کھایا۔ قہوہ کا اپنا مزہ تھا، علاقائی حالات زیر بحث آ گئے۔ وزیر اقبال کے پاس گلگت بلتستان اور استور کے حوالے سے کثیر معلومات ہیں۔ وہ انتہائی جذباتی ہو کر اپنے مہمانوں سے پوشیدہ جذبات شیئر کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ استور سیاحتی اور دفاعی حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ استور کا روڈ وسیع اور کشادہ ہونے کے ساتھ ہر وقت کلیر

ہونا چاہیے۔ میں سوچ رہا تھا کہ دفاعی حوالے سے بلتستان سے زیادہ اہم اور سیاحتی حوالے سے ناران کاغان اور ہنزہ وغذر سے زیادہ دلچسپ اور جاذب النظر استور کو یوں نظر انداز کرنا کسی طور نیک شگون نہیں۔حکومت کے ساتھ استور کی عوام اور ممبران بھی برابر کے قصور وار ہیں کیونکہ یہ لوگ اجتماعی مفادات کی بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے استور کے تمام ادارے زبوں حالی کا شکار ہے۔ مجھے استوریوں کی یہ عادت ایک سیکنڈ نہیں بھاتی۔اگر یہ لوگ بھی بلتیوں کی طرح ایک قوم ہو کر سوچتے تو آج استور دنیا کے چند اہم سیاحتی مقامات کا روپ دھارتا۔

وزیر اقبال کا افسانوی گھر اور دھڑم خیل قبیلہ

وزیر اقبال استور گوریکوٹ کے ہیں مگر ان کے پاس موجودہ نیشنلٹی سوئزر لینڈ کی ہے۔ انہوں نے شادی بھی سوئزر لینڈ سے کی ہے۔ان کے دو بچے اور ایک بچی ہے۔ سوئس بینک کے ملازم ہیں۔ انتہائی ملنسار انسان ہے۔ان کی خصلتیں سوئس ہیں۔ مغرب کے کسی ملک میں عشرت کی زندگی گزارنے والے پہلے پاکستانی دیکھا جو پاکستان اور گلگت بلتستان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ان کا گھر، صحن، مویشی خانہ، چھوٹا سا چڑیا گھر اور دیگر مصروفیات دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ان کے باغیچے میں ہری ہری باریک کونپلیں اور رنگ برنگ پھول، سبزیاں اور نایاب درخت اس بات کا عندیہ دے رہے ہیں کہ صاحب باذوق ہیں۔ میٹھے سیب پک

کر تیار ہیں۔ ہم نے جی بھر کر کھائے۔ وزیر اقبال کو ہر قسم کے نایاب جنگلی و پالتو جانور پالنے کا بے حد شوق ہے۔ کئی قسم کے جانور اور پرندے ان کے گھر کا زینت بنے ہوئے ہیں۔ان کے لیے انتظامات بھی کمال کے کیے گئے ہیں۔وزیر اقبال دھڑم خیل قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ استور میں ہمیشہ حکومت اور نمبر داری دھڑم خیلوں کے پاس رہی ہے۔برٹش انڈیاکے دور میں دھڑم خیل قبیلے کو استور کی وزرات سونپی گئی تھے۔ وزیر روزی خان ہری سنگھ اور غلاب سنگھ کے استور میں وزیر تھے۔ یہ دونوں کشمیر کے مہاراجے تھے۔ آزادی کے بعد بھی استور کے اکثر ممبران گلگت اسمبلی بھی دھڑم خیل قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گلگت بلتستاان کی پہلی گورنر محترمہ شمع خالد مرحومہ بھی دھڑم خیل تھی۔ دھڑم خیلوں کا تعلق افغان قبیلوں سے بہت قریبی ہے۔بتایا جاتا ہے کہ یہ پٹھان قبیلوں کی ایک شاخ ہے۔

گوریکوٹ اور مضافات کا دوبینی نظارہ

وزیر اقبال کی بالا کونی سے استور گریکوٹ اور دیگر مضافاتی وادیوں کا منظر انتہائی صاف اور خوبصورت دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے ان کی جرمن میڈ دوربین (German made Telescope) سے پورے علاقے کی سیر کی۔ دور دور تک کا نظارہ کیا۔ کہیں بہتے پانی نظر آتے، کہیں برف کے بڑے بڑے تودے دکھائی دیتے۔فلک بوس چوٹیاں اور ان چوٹیوں کو ڈھانپتا ہوا برف ، برفانی تودوں کی

منظر سے کم نہیں۔ پھرتا حد (Romantic) کشش، گلیشئرز کا رعب کسی رومینٹک نگاہ پہاڑوں، وادیوں اور چٹانوں پر اُگ آنے والے پھول، نیلے نیلے، اودے اودے، پیلے پیلے بیل بوٹے گویا مکمل بہار کا سماں پیش کر رہے ہیں۔دوربین سے تمام وادیوں اور گھاٹیوں کا نظارہ کیا۔پہاڑی ٹیلوں اور سبزوں پر مارخور، برفانی چیتے، برفانی لومڑی اور گیڈر وغیرہ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔مجھے ایسا لگا کہ برفیلے پہاڑوں اور کھائیوں میں یہ جنگلی جانور بسیرا جمائے ہوئے سیاحوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں اور اس بات کی گواہی بھی کہ اللہ رب العزت اتنے سخت موسم اور حالات میں بھی اپنی مخلوقات کو زندہ وسلامت رکھتا ہے۔فبای آلاء ربکما تکذبان۔

گوریکوٹ مسجد کا قضیہ اور قاضی کی سوچ

شیڈول کے مطابق ۲۵ اگست کو ہمیں سیدھا کالا پانی جانا ہے۔تاہم قاضی صاحب کی گوریکوٹ آمد کی خبر پھیل چکی ہے۔ملاقاتیوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔کچھ لوگوں کے اہم مسائل ہیں جو قاضی صاحب کے ساتھ شیئر کر رہے ہیں۔استور گوریکوٹ کی جامع مسجد کا قضیہ بھی قاضی صاحب اور جج خورشید صاحب کے پاس ہے۔مسجد کے وفد سے گفتگو کرتے ہوئے قاضی نثاراحمد نے کہا کہ '' مجھے علاقے کا امن اور رواداری ہر اعتبار سے عزیز ہے۔میری کوشش ہے ہوگی کہ اہل سنت کے دونوں دھڑوں میں ایک اچھا فیصلہ کروں اور ایک ایسا امام و خطیب کا

تقرر کروں جو دونوں فریقین کے لیے قابل قبول ہوگا۔ اس کی پہلی اور آخری ترجیح امن وسکون اور محبت واخوت کا فروغ ہوگا اور علاقے میں دعوت دین واشاعت توحید کا پرچار ہوگا۔ اور اس حوالے سے جج صاحب بھی مخلص ہیں۔ وہ بھی بھائی چارگی اور امن کے خواں ہیں''۔

استور میں آرمی کی تعدی اور عوامی تویش

مجھے کدوکاوش اور جستجو کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔اس لیے موقع پاتے ہی وزیر اقبال کو کریدنا شروع کیا۔ وہ پہلے پاکستانی پھر استوری ہیں مگر کچھ اداروں کی ستم کاریوں پر سخت نالاں بھی ہیں۔ سویلین حکومت کی بے توجہی پر کڑھتے ہیں۔ وہ استور کو سوئزر لینڈ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ان کے پاس پلان بھی ہے مگر رفیقان کار نہیں۔انہیں سخت قلق ہے کہ چلم میں بارڈر بناکر بند کردیا گیا ہے۔چیک پوسٹ سے آگے سویلین کو جانے کی اجازت نہیں ،چیک پوسٹ سے آگے ہٹس (Huts) بنائے گئے ہیں جہاں آرمی آفیسرز اپنی فیملی سمیت سیر کو جاتے ہیں۔ چلم میں چیک پوسٹ لگاکر عوام کو تنگ کرنا ٹھیک ہی نہیں بنتا۔ان کا کہنا ہے کہ '' رٹو اور دیگر وادیوں میں ہزاروں کنال عوامی اراضی پر قبضہ جمانا دانشمندی نہیں ہے۔ کیا اسطرح دلوں کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ منی مرگ میں ،برگیڈ مس (Brigade mess) دیکھ کرانسان کانپ جاتا ہے کہ کس طرح پاکستان کے ساتھ زیادتیاں کی جارہی ہیں''۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ یہ

باتیں سفر کی شیرینیوں میں کھٹاس پیدا کر رہی ہیں۔ خیر ہم نے تو آگے جانا تھا اور قدرت کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونا تھا۔ سو چل دیے۔

راستے کی ایسی مفرح ساعتیں

دس بجے گوریکوٹ سے کالا پانی کے لیے روانہ ہوئے۔ گوریکوٹ سے قافلہ بڑھتا گیا۔ مجھے برادرم نقشبر کے ساتھ شریک سفر ہونا پڑا۔ مفتی ایوب (چیئرمین زکواۃ و عشر ضلع استور) بھی ہمارے رفیق سفر ہوئے۔ قاضی صاحب، قاری عبدالحکیم اور مولانا منیر ایک ساتھ بیٹھ گئے جبکہ وزیر اقبال اپنے لاؤ و لشکر سمیت اپنی ٹیوٹا میں پابہ رکاب ہوئے اور مفتی شفیع اپنی فیملی کے ساتھ محو خرام تھے۔ گاڑیوں کا قافلہ چل پڑا۔ راستہ کالا پانی کا ہو، گاڑی لینڈ کروزر ہو اور رفیقانِ سفر میں انجینئر نقشبر جیسے باذوق، ملنسار، آزاد طبع، علاقائی روایات، ثقافت، تاریخ اور ویلی ویلی سے آگاہ اور فرد فرد سے واقف انسان ہو اور اس پر مستزاد مفتی ایوب جیسا معتدل مزاج شخص کی معیت ہو، ڈولتی گاڑی میں حمدیہ کلام، نعت، ملی نغمے اور دیسی ترانے مسلسل چل رہے ہوں تو سوز و گداز کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور '' سوختہ دل'' فریفتگی و آشفتہ سری کی وادی سے نکل کر مسرت و آسودگی اور لذت و فرحت کے باغِ رضوان میں چہل قدمی کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی مفرح ساعتیں کبھی کبھی نصیب ہوا کرتی ہیں۔ ''ریختہ دل'' آشفتہ نوائی سے باز آ جاتا ہے۔ ایسے لمحات میں اگر مسمریزم (Mesmerism) کا

کوئی ماہر ساتھ ہو تو درونِ خانہ دل کے تمام پوشیدہ رازوں کو معلوم کرکے خوب محظوظ ہوسکتا ہے۔پھر قافلے میں قاضی نثاراحمد جیسا متقی اور بے باک لیڈر، قاری عبدالحکیم جیسا مدبر، مولانا منیر جیسا خوش مزاج، مفتی شفیع جیسا'' ماہرِ ازدواج وازواج'' اور برادرم وزیر اقبال جیسا مہمان نواز اور مہذب انسان ہوں تودل کے نہاں خانوں میں سَروش غیب سے پیغام آتا ہے کہ تم سُورگ سے نکل کر بہشت میں گھوم رہے ہو۔تو پھر مجھے یاد آتا ہے کہ '' اے کمبخت انسان ! تو اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

تحصیل شونٹر کے مناظر اور سڑک کے کُلی

استور کی دو تحصیلیں ہیں۔ایک تحصیل استور اور دوسری تحصیل کا نام شونٹر ہے۔ شونٹر پل کراس کرتے ہیں دو راستے ہیں ایک شونٹر سے ہوتے ہوئے بائیں جانب چلم اور دوسائی سے ہوتے ہوئے اسکردو جانکلتا ہے جبکہ دوسرا روڈ رٹو کی طرف جاتا ہے۔ ہمارا سفر بھی رٹو روڈ سے ہوتے ہوئے کالاپانی تک تھا۔ شونٹر سے متصل ایک گاؤں بولشربر'' نامی ہے۔ ساتھیوں کا کہنا ہے کہ پورے استور میں اس گاؤں میں بہنے'' والے نالے کا پانی شفاف ہے۔ ٹراؤٹ مچھلیاں ہیں۔ میں نے خود مشاہدہ کیا تو نالے کا پانی بہت شفاف اور دودھ جیسی رنگت کا ہے۔ بہتے نالے کے ساتھ فشریز کی فارم بھی دکھائی دے رہی تھی۔اس کے بعد پریجوٹ نام کا ایک خوبصورت گاؤں نظرنواز ہوتا ہے۔ رٹو جاتے ہوئے راستے میں چورت کا نالہ

آتا ہے۔ چورت نانگا پربت کے دامن میں واقع ہے۔ چورت نالے سے بہنے والا پانی بہت ہی گدلا ہے۔ جبکہ رٹو سے آنے والا پانی بہت شفاف ہے۔ دونوں کا ملاپ بہت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔ جیسے حور کے ساتھ لنگور کے امتزاج سے جو کیفیت رونما ہوتی ہے۔ رٹو جاتے ہوئے رام پور گاؤں آتا ہے جس کو لنک روڈ جاتا ہے۔ اور شوگام گاؤں تو اپنی رعنائی اور خوبصورت سے دل بھا لینے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ اور ہماری گاڑیاں سرپٹ دوڑ رہی ہیں جبکہ پیار بھرے مناظر باصرہ نواز ہو رہے ہیں۔ شوگام گاؤں میں برلب روڈ اسکول کے طلبہ والی بال کھیلنے میں مصروف ہیں جبکہ دائیں بائیں مکئی اور آلو کی فصلیں پک کر کسانوں کو کاٹنے کی دعوت عام دے رہی ہیں۔ شوگام کافی بڑا گاؤں ہے، دو حصوں پر مشتمل ہے شوگام بالا اور شوگام پائین۔ کیا دیکھتا ہوں کہ انجینئر نقشبر گاڑی روک کر کسی کو سختی سے کہہ رہے ہیں کہ واٹر ٹینک چلا کر لوگوں کو پانی دے دو ورنہ کل سے آپ کی ڈیوٹی روڈ کلی کی لگادونگا۔ اور دوسری جانب سے ''جی سر کی آواز گونجتی ہے۔ میرے استفسار پر بتایا کہ شونٹر سے لے کر کالا پانی کے آخر تک'' اور واٹر سپلائی کی ذمہ داری میری ہے۔ اور پھر (Maintenance) روڈ کی مینٹیننس پورے سفر میں روڈ کلیوں کو کھڑے کھڑے جھڑکتے رہے مگر ان کی جھڑکیوں کا کوئی برا ہی نہیں مناتا۔ وہ ہر بستی میں گاڑی روکتے۔ لوگ ان سے ملتے۔ اور اگلے دنوں کے ہدایات لے کر چل نکلتے۔ عجب آفیسر ہیں۔ ہر مستقل اور ڈیلی ویجیز پر کام کرنے والے کُلی کے نام اور گاؤں سے واقف ہیں اور کام چوروں کی

بری خصلتوں سے بھی آگاہ ہیں۔ محنت کشوں کو شاباش دیتے ہیں جبکہ نوسربازوں کو ڈپٹتے ہیں اور سخت سرزنش کرتے ہیں۔ شوگام کے ساتھ ناصر آباد ہے جس کا بالائی منظر بہت ہی پیارا ہے۔ سنا ہے کہ یہ علاقہ بدعات اور خرافات آماجگاہ ہے۔

رٹو آرمی پبلک اور سنوں اسکول اور کیڈیٹ کالج ڈرنگ

میرے سامنے استور کا مشہور گاؤں رٹو ہے۔ رٹو سے دائیں جانب میر ملک وادی کی طرف سڑک جاتی ہے جبکہ بائیں جانب کالا پانی کا راستہ ہے۔ میر ملک اور کالا پانی کے نالوں کے پانی کے ملاپ سے ایک چھوٹا سا دریا بن جاتا ہے۔ یہ دو دریائی نالوں کے پانی کا ایک حسین سنگم ہے جو معشوقانہ ادا پیش کر رہا ہے۔ رٹو یں آرمی پبلک سکول ہے اور فوجی آفیسروں کے لیے ٹریننگ کا ایک اسکول بھی ہے اسکا نام (Army altitude school Rattu) ہے۔استوری لوگ اسے آرمی سنوں اسکول سے یاد کرتے ہیں۔ رٹو میں آرمی نے چار ہزار کنال زمین بغیر معاوضہ (Compensation) کے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ جس سے لوگ سخت خفا ہیں اور نجی محفلوں میں خفگی کے ساتھ تذکرے کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ خیال باربار آتا ہے کہ آرمی جس جگہ میں بسیرا کرتی ہے وہاں بہت ساری سکیمیں لے آتی ہے جس سے لازمی طور پر مقامی لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔ کئی ادارے بنتے ہیں اور روڈ پانی اور بجلی کے مسائل ہنگامی بنیادوں پر حل ہوتے ہیں اور پورا ایریا

کمرشل بن جاتا ہے۔آرمی کی موجودگی پر اگر مثبت نتائج پر نظر رکھی جائے تو اہلیان رٹو کو آرمی کی اس مقبوضگی پر نالاں ہونے کے بجائے شاداں ہونا چاہیے۔بیشک کچھ سائڈ ایفکٹس ضرور ہیں فوائد بہر صورت کثیر ہوتے ہیں۔آپ دیامر کی مثال لیجیے ! دیامر میں کیڈٹ کالج بننی تھی اور 2012ء کو مکمل ہونی تھی تاہم چلاس کے چند وڈیروں کی انا پرستی کی وجہ سے نہ بن سکی۔چلاس سٹی میں کالج کے لیے زمین نہ ملی، حکومت نے تھک داس میں بنانے کے لیے تمام انتظامات مکمل کرلیے مگر اہلیان تھک و نیاٹ نے مکمل عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے کالج بننے نہیں دیا۔ افتتاحی اسٹیج گردایا۔ اسی دوران مجسٹریٹ تنویر احمد کی کاؤشوں سے گوہرآباد کے علماء و عمائدین نے کیڈیٹ کالج کی تعمیر کے لیے ڈرنگ داس میں ہزار کنال زمین فری آف کاسٹ دینے کی آفر کی۔ تب ڈرنگ داس میں کالج بنانے کا م شروع ہو۔اس کے فوائد اور معاشی، تعلیمی و سماجی اثرات و فوائد پر الگ تحریر کی ضرورت ہے تاہم میں گوہرآباد کے علماء و عمائدین سے اتنا ضرور کہونگا کہ جس جگہ میں کیڈیٹ کالج کو ہزار کنال فری زمین دی ہے وہاں قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی کے دیامر کیمپس کے لیے بھی فوری زمین دینے کی آفر کریں، اور ایک مناسب جگہ دینی دارالعلوم بنانے کے لیے بھی وقف کرلیں اور ساتھ ہی افواج پاکستان کی ڈیمانڈ کے مطابق تین چار سو کنال انہیں بھی عطا کیجیے۔افواج پاکستان سے طے کرلیں کہ وہ اس ایریا کو وی آئی پی کینٹ ایریا بنائیں گے۔ ہر حال میں آرمی پبلک اسکول اور سی ایم

ایچ ہسپتال بنوائیں گے۔اور سول نوکریوں میں گوہرآباد کا مخصوص کوٹہ ہو۔آرمی موجود ہوگی تو امن کا ہونا یقینی ہے۔ان کی موجودگی میں ہر ایرے گیرا ماحول خراب نہیں کر سکتا۔اگر ایسا ہوا تو یہ ایریا گلگت جوٹیال سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے۔اور اہلیان دیامر و گوہرآباد کی معاشی صورت حال یکسر بدل سکتی ہے۔مگر دکھ اس بات کا ہے کہ خدا کی زمین کو اپنی زمین سمجھنے والے لٹیروں نے ڈرنگ کیڈیٹ کالج کے کام رکوانے کی ٹھان لی ہے اور عدالتوں میں جا گھسے ہیں۔میں اتنا ضرور کہونگا کہ خدا کی ''زمین مخلوقات خدا پر تنگ کرنے والوں کے لیے اللہ کا فرمان ہے۔'' ان عذابی لشدید

گھاس کٹائی، عورت اور گدھا اور این جی اوز

رٹو میں لوگ گھاس سنبھالنے میں مصروف ہیں۔ٹریکٹرز، گدھوں اور انسان سوکھی گھاس کھیتوں اور سبزہ زاروں سے محفوظ مقامات کو منتقل کر رہے ہیں۔گھاس کٹائی کا موسم ہے۔ سوکھی گھاس کے حوالے سے استور خود کفیل ہے۔سب سے زیادہ گھاس استور میں کاٹی اور جمع کی جاتی ہے۔آٹھ ماہ تک جانوروں کو یہی سوکھی گھاس کھلائی جاتی ہے۔عورتیں ایک مخصوص انداز میں گھاس کاٹتی ہیں۔کم از کم نواردوں کے لیے ان کی ''گھاس کٹائی'' کا یہ عمل خوش گوار حیرت کا سبب بنتا ہے۔میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ استور میں عورت اور گدھا سب سے مظلوم ہے۔کیوں کہ ان دونوں سے سخت مشقت لی جاتی ہے۔اگر میں اسے جبری مشقت کہوں تو

بے جا نہ ہوگا۔ تاہم انسانی حقوق کے علمبردار، حقوق نسواں کا ڈھونڈورا پیٹنے والے این جی اوز اور حیوانات کے حقوق کا نام دے کر فنڈ بٹورنے والے انسان نما درندوں کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ہے۔ اور انجینئر نقشبر اور مفتی ایوب اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اِس دوغلے پن پر کڑھتے بھی ہیں۔

کالا پانی تک کے گاؤں اور پگڈنڈی پلیں

شونی گئی کی آر سی پل کراس کرنے کے بعد گاڑیاں روک لی گئی۔ احباب نے وضو بنالیے اور ہم نے بھی دریائے کالا پانی میں اتر کر وضو بنانے کی ایکٹنگ کی اور اپنا تصویری شوق پورا کیا۔ یہاں سے کالا پانی کے چھوٹے۔بڑے گاؤں شروع ہوتے ہیں۔ سڑک پہاڑوں سے ہوتے ہوئے چھوٹی چھوٹی وادیوں میں اتر رہی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف آبادیاں ہیں اور ان آبادیوں میں پھلدار درخت اور کھیت ہیں۔ کھیتوں میں گندم مکئی اور آلو اُگ آیئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے پودے اور بیل بوٹے کھیتوں کی خاکی رنگت کو مائل بہ سبز کر رہے ہیں۔ درختوں کی ٹہنیاں گھمرے سبز پتوں اور لذیذ پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ہر طرف ہریالی کا سماں بندھا ہوا ہے۔ شونی گئی سے کالا پانی کے آخر تک دریا کے دونوں کناروں میں مختصر آبادیاں ہیں جن میں فقیر کوٹ، درلہ، کھمئی، شنکر گڑھ، سکمال، چیچڑی، گشاٹ، اسپہ، اشاٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گشاٹ آخری آبادی ہے جہاں لوگ سال کے بارہ

مہینے رہتے ہیں۔ اس سے آگے کالا پانی کے آخر تک صرف موسم گرما میں لوگ بیل بکریوں لے جاتے ہیں۔ دریا کے دو طرف آبادیوں کو ملانے کے لیے لکڑی کے تختوں اور آہنی رسیوں سے پل بنائے گئے ہیں۔ ان پلوں پر گاڑی چڑھتی ہیں تو وہ بوجھ برداشت نہ کرکے جھول رہی ہوتی ہیں۔ اور روڈ سائٹ پر جو پل ہیں ان میں کچھ آر سی سی ہیں اور اکثر بڑی بڑی لکڑیوں کو جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ گاڑیاں ان پر چڑھتی ہیں تو خوف کے مارے پورا بدن کانپ جاتا ہے۔

شنکر گڑھ یہاں کی مسجد اور لہلہاتے کھیت

ہمارے قافلے کے احباب ایک وسیع گاؤں میں اتر گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مڈل اسکول کا بورڈ دکھائی دے رہا ہے۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ مسجد کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ ''مسجد خدیجہ، شنکر گڑھ استور، زیر نگرانی جامعہ اسلامیہ نصرۃ الاسلام گلگت، بتعاون صدیقی ٹرسٹ کراچی''۔ میرے دماغ کی اسکرین پر ایک مظلوم عالم دین مولانا نذیر اللہ خان کی تصویر گھومنے لگی۔ کیا غضب کے انسان تھے کہ گلگت بلتستان کی دور دراز غریب علاقوں میں مسجدیں بنوائی ہے۔ ہنزہ علی آباد کی مسجد قباء بھی دیکھ کر مولانا یاد آئے تھے اور آج پھر سی ان کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ میں لٹرین کرنے دور کھیتوں میں نکل گیا۔ شنکر گڑھ کی آبادی بہت پیاری لگی۔ مد مقابل پار دریا ایک باریک درہ نما پہاڑی ہے جس کے قدرتی حسن اور سبزے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ دیر تک

میں اس سبزے کے حسن میں کھوگیا۔ بخدا ایسی حسین جگہوں میں مجھے حسین چہرے یاد آجاتے ہیں۔ جن کی یادیں دل و دماغ سے وابستہ ہیں اور محو نہیں ہوتی۔ شنکر گڑھ کی پوری وادی گندم اور آلو کے کھیتوں سے لہلہا رہی ہے۔ ہر طرف سبزہ اور جنگلی پھول ہیں۔ دھوپ کی تمازت سے فصل پکنے کے آخری مراحل میں ہے۔ اور کہیں کہیں عورتیں گھاس کاٹ رہی ہیں اور لڑکے لڑکیاں پیٹھ پر لادے محفوظ مقامات تک گھاس لے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ پس منظر میں دیو ہیکل پہاڑ اپنے سروں پر برف کی سفید چادریں اوڑھے اپنی ہیبت دکھا رہے ہیں۔ یہ نسبتاً ایک بڑی وادی ہے۔ خوبصورت لباسوں میں ملبوس مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھ جیسے چند سیاح بھی گھوم رہے ہیں۔ بہتے پانی سے وضو بنالیا۔ مسجد کے دروازے پر پہنچ چکا تھا کہ قاضی صاحب نے فرمایا۔ '' میاں حقانی، یہ دیکھو، یہ مسجد ہماری جامعہ کے زیر نگرانی ہے، مولانا نذیر اللہ صاحب کے کمالات کا منہ بولتا ثبوت ہے''۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت دیکھ چکا ہوں اور مسجد اور اس کے بورڈ کی تصویر بھی محفوظ کرلی ہے۔ دو رکعت نماز پڑھ لی اور تب دیکھا تو احباب میرے انتظار میں ہیں۔بتایا گیا کہ قاری عبدالحکیم کا آبائی گاؤں ہے۔ ان کے بھتیجے کے گھر چائے کی ضیافت ہے۔یقیناً اتنی تھکاوٹ اور ٹھنڈک میں چائے کی چاہ مزید بڑھ جاتی ہے۔ سو چائے کے ساتھ سموسے، چپس اور روسٹ سے پیٹ کی پوجا کی اور چل دیے۔

درلئی جھیل اوراور محبت کے پھول

درلہ گاؤں میں 2008ء کے سیلاب میں ایک جھیل بنی ہے۔ جس کا نام ''درلئی جھیل'' پڑگیا ہے۔ اس کی لمبائی چار کلومیٹر تک ہے۔ ٹروٹ مچھلیوں کی آماجگاہ بن چکی ہے۔ پانی کی رنگت نیلا بہ مائل سبز ہے۔ اس جھیل کے آس پاس گومتی گاؤں، اسپہ گاؤں اور دیگر چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی تمام تر کسمپرسی اور خوبصورتی کے ساتھ حکومت اور سیاحوں کو ندا دے رہے ہیں مگر کوئی ہے سننے والا... میری خواہش پر نقشبر نے جھیل کنارے گاڑی روک لی۔ جھیل کی نیلاہٹ کا روپ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ نظریں جھیل کے پانی پر گاڑھ لی اور دیر تک سوچتا رہا۔ جھیل کے شفاف پانیوں کی تہہ میں کوئی دکھائی دینے لگا۔ ایک مہک، ایسی مہک جو مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال رہی ہے۔ انگشت بدنداں کھڑا ہوں۔ یہ محبت ہے۔ اور محبت کے پھول نظر آنے لگے مگر ان کی رنگت زرد ہے اور میری پہنچ سے باہر۔ خوف محسوس ہونے لگا، میں اپنی آرزوؤں کی بلندیوں اور خواہشوں کی جھیلوں میں سرگرداں ہوں اور کوئی دور سے مجھ پر ہنس رہا ہے اور میری بے بسی پر طنز بھی کررہا ہے۔

آزادی سے پہلے کی سڑک

چیچڑی گاؤں سے آگے قمری تک وہی روڈ ہے جو قیام پاکستان سے پہلے بنایا گیا تھا۔ اب تک اس میں کوئی بہتری دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ روڈ کی حالت ناگفتہ بہ

ہے۔ انجینئر نقشبر اپنی حد تک لوکل کُلی بھرتی کرکے روڈ مینٹنین رکھنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں مگر یہ ناکافی ہے۔ ایک زبردست سکیم کی ضرورت ہے۔ تاکہ سیاحوں کی جنت کالا پانی دنیا کے لیے متعارف ہو جائے۔یہی روٹ تو ہے جس سے لوگ کشمیر جاملتے تھے۔ایاٹ سے کالا پانی تک تو پہاڑ اور ان کی چوٹیاں بھی سبزے اور برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ تا حد نگاہ سبزہ ہی سبزہ ہے۔

بنگلہ ریسٹ ہاؤس اور گجروں کا قبرستان

کالا پانی کے راستے میں ''بنگلہ ریسٹ ہاؤس'' بھی ہے۔ یہ ریسٹ ہاؤس پی ڈبلیو ڈی کے زیر انتظام تھا تاہم مقامی لوگوں نے گرادیا۔ گرانے کی بظاہر کوئی علت معلوم نہ ہو سکی۔ اب ریسٹ ہاؤس کا ملبہ ہی دکھائی دے رہا ہے۔ ریسٹ ہاؤس کے ساتھ گجروں کا قبرستان ہے۔ گجر برادری کے لوگ موسم گرما میں اپنے مرحومین کہ یہی دفناتے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو کئی تازہ قبریں بھی نظر آنے لگی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ دریا بہتا ہے۔ سڑک انہی نشیب و فراز سے ہوتی پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا سینہ چیرتی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ کہیں بلندی سے سڑک اترائی کی طرف جا رہی ہے۔اور کہیں اترائی سے بلندی کی طرف۔ سبز وادیوں پر لیٹی سڑک کسی مہیب اژدھے کی طرح بل کھاتی گزرتی جارہی ہے۔اور ہم ڈولتے ہوئے منزل کی طرف رواں ہیں۔ ہمارے قافلے کی گاڑیاں ہم سے بہت آگے جاچکی ہیں۔ جبکہ ہم ہر ہریالی اور سبزے میں ''پکچر نگ'' کرتے جارہے ہیں اور برادرم

نقشبر اپنے کُلیوں کو احکامات جاری کرتے ہیں۔ لا محالہ ہم لیٹ ہی ہو نگے۔ان سبزوں میں ہزاروں آبشاریں ہیں۔آبشاروں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کے سینے پر مونگ دلتی یہ سڑک محنت کشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کیونہ یہاں تک جدید مشنری کا پہنچنا محال ہے۔بہر صورت اللہ اللہ کرکے کالا پانی کے دامن میں واقع وزیر اقبال ہٹ (hut) پہنچ گئے۔

کالاپانی کے دامن کا جادوائی منظر

یہ دیکھو ! میرے سامنے کالا پانی کی چراگاہیں ایستادہ ہیں۔تاحد نگاہ سبزہ ہی سبزہ ہے۔عصر کے وقت وزیراقبال ہٹس کے پاس پہنچ گئے۔ سامان سفر اتار لیے۔ گوریکوٹ استور سے وزیراقبال ہٹس تک 78 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ایک کپ چائے نوش کی۔ وضوء بنانے سبزہ نما میدان میں نکلے۔ قارئین میں آپ کو وہی لے جانا چاہتا ہوں جہاں میں کھڑا ہوں۔

اٹھ کھڑا ہو۔

ہواؤں کے دوش وہی چلتے ہیں۔

آپ کشادہ سبزہ نما میدان میں ایک ٹیلے پر سکون سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اگر آپ کے چہار جانب ایک کھلا سرسبز میدان ہو، میدان میں نالیوں کی صورت

میں بہتا ٹھنڈا دودھیا پانی ہو، پانی کے کناروں پر میدان میں جا بجا اسٹریلوی نسل کی بھیڑیں، پنجابی بکریاں، دیسی گھوڑے، ہزاروی کچھر، استوری خوش گاؤ اور یاک، دیسی گائیں چر رہی ہوں۔

میدان کے عقب میں پہاڑیوں کے ڈھلوانوں پر ٹکے چھوٹے چھوٹے '' شیلی'' صنوبر کے درخت مزید خوبصورتی اور (Brich) کے جنگل ہوں۔اور برج پتر (Junipers) رنگینی کا سبب بن رہے ہوں۔

آبشاریں اور گلیشئرز دو قدم پر ہوں۔

بالکل سامنے نظر دوڑاؤ تو قاتل پہاڑ نانگا پربت کی چوٹی کا حسین نظارہ ہو۔

آگے دیکھو تو قمری کے پہاڑوں کی چوٹیاں ہوں اور نیلے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتے گزر رہے ہوں۔

دھوپ ایسے کھلتی ہو جیسے گلاب کے شگوفے، چاندنی کا غبار خیموں میں گھستا ہو، سفید رنگت کے میلے کچیلے بچے ترچھی نگاہوں سے آپ کو دیکھ رہے ہوں۔

بکروالوں کی دوشیزائیں چادر کے اوٹ سے آپ کی چال ڈھال کا جائزہ لیتے ہوئے آپ کی تفریح طبع کا سامان بن رہی ہوں۔

چار سو قسم کے پھولوں والی وادی کا ہر پھول الگ رنگت، خوشبو اور جسامت سے آپ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

پھولوں اور جڑی بوٹیوں سے ٹکراتا پانی آپ کے نظام ہضم کو فعال بناتا ہے تو

یقین جانیں!

آپ کالاپانی کے دامن میں میں کھڑے ہیں اور بہشت جیسے ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جڑی بوٹیوں اور پھولوں کی اقسام

جو نشیب پہلے گلیشیرز نظر آتے تھے اب نالوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور یہی نالے دریاوں کا طفلی وجود ہے۔ اے ناداں انسان! پھر اپنے رب کے وجود کا کب تک انکار کرتا رہے گا۔'' ماغرک بربک الکریم'' تجھے تیرے رب سے کس نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ دیکھو!برف پوش پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں نظر آتی ہیں اور پانی رواں دکھائی دیتا ہے۔درخت، پودے نظر نہیں آتے مگر گھاس ،گل بوٹے، ہزاروں قسم کے پھولوں اور جڑی بوٹیوں نے اور سبزے نے جنگل کو منگل بنا رکھا ہے۔استور کے ان سبزوں اور چراگاہوں سے 240 قسم کی جڑی بوٹیوں کو ڈسکور کیا گیا ہے۔ اور تین سو سے زائد قسم کے پھول پائے جاتے ہیں۔ یہ تحقیق (Mountain and market biodiversity and business in Northern Pakistan) کی طرف سے حالیہ دنوں میں سامنے آ گئی ہے۔مزید کو منکشف کرنے پر کام جاری ہے۔

نایاب جڑی بوٹیوں کی زندگی خطرے میں

پنجاب، کشمیر اور ہزارہ ڈویژن سے سینکڑوں ''بکروال'' اپنی مال مویشاں اور

بال بچے لے کر کالا پانی کے سبزہ زار چراگاہوں میں ڈھیرے جمائے نظر آ رہے ہیں۔ ان کے ٹینٹ ہر نالہ اور سبزہ میں دکھائے دے رہے ہیں۔ محکمہ جنگلات ان سے کچھ ٹیکس بھی وصول کرتا ہے تاہم استوریوں کی طرف سے بکروالوں کی آمد و رفت پر کسی قسم کی قدغن نہیں۔ شاید یہ آمد و رفت کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔آج کل یہ بکروال اور گجر لوگ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ محکمہ ماحولیات و جنگلی حیات کے ایک آفیسر کا کہنا ہے کہ استور کی ان خوبصورت وادیوں میں کئی ہزار قسم کی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ IUCN (the International Union for Conservation of Nature) نے ایک رپورٹ جاری کی ہے کہ استور کے ان مقامات میں دس جڑی بوٹیاں ایسی ہیں کہ جن کا وجود معدوم ہونے کو ہے۔ ان کی کٹائی پر پابندی عائد ہے تاہم بکروال اور دیگر لوگ ان کی غیر قانونی کٹائی کرکے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو سستے داموں فروخت کرتے ہیں۔ مہدی شاہ حکومت نے پنجاب کے ایک بزنس مین میاں عادل محمود کو پانچ سال کے لیے ان نایاب اور دیگر جڑی بوٹیوں کو نکال کر لیجانے کی اجازت دی تھی تاہم لوکل کمیونٹی کی مداخلت سے چیف کورٹ نے اس اجازت نامے کو منسوخ کردیا۔ ترمادہ کے نام سے ایک جڑی بوٹی استور کے ان سبزہ زار علاقوں میں پائی جاتی ہے اور کچھ اہم جڑی بوٹیاں بھی ہیں جن کا وجود دنیا کے دیگر علاقوں میں معدوم ہوچکا ہے۔جی بی گورنمنٹ سے میری گزارش ہوگی کہ اس حوالے سے قانون سازی کرکے جڑی بوٹیوں کو محفوظ بنائے اور ان کے خرید و فروخت کو لیگالائز

کرے۔ اور استور کو سیاحوں کی جنت بنالے۔

مسجد و مہمان خانے کی افتتاح ،تلاوت اور مختصر بیان

چائے نوشی اور نماز عصر کی آدائیگی کے بعد میزبان نے کہا کہ اب مسجد اور مہمان خانے کی جگہ دیکھی جائے تاکہ سنگ بنیاد رکھا جاسکے۔ ہم سب کی اپنی اپنی رائے تھی۔ تاہم قاضی صاحب کے ساتھ میزبان وزیر اقبال کی رائے پر سب نے صاد کیا۔

قاضی صاحب نے کہا کہ مسجد اور مہمان خانہ برلب روڈ ہوں۔

پھر وزیراقبال نے روڈ کے ساتھ وہ جگہ دکھائی جہاں سے گرم چشمہ نکلتا ہے اور ساتھ ہی نالے کا شفاف پانی اپنی آب وتاب کے ساتھ بہتا ہے۔ جگہ مناسب ہے۔ گرم چشمہ، برابر میں بہتا نالے کا پانی، روڈ کا اتصال۔

شاید اس سے مناسب جگہ اس پورے ایریا میں کوئی نہیں۔

حضرت قاضی صاحب نے مفتی شفیع صاحب سے کہا

تلاوت قرآن سے آغاز کیجیے''۔ ''

مفتی صاحب نے انتہائی سریلی اور تجویدی لہجے میں ''انمایعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر واقام الصلواۃ وآتی الزکوۃ ولم یخش الااللہ'' کی تلاوت کی۔

اتنی بلندیوں پر اس درد کے ساتھ تلاوت یقیناً فردوسی منظر ہے۔ قاضی صاحب نے کدال سے مسجد کی افتتاح کی۔ تمام مہمانوں نے کدال چلائی۔ میں بھی اپنے ناکارہ وجود کے ساتھ اس کار عظیم کا حصہ بنا۔ شاید یہی مغفرت کا سبب بنے۔ پھر حضرت قاضی صاحب نے ''سنگ بنیاد'' کا بنیاد پتھر رکھ دیا اور متصلاً آیات و حدیث کی روشنی میں متلو آیات مبارکہ کی مختصر مگر دل نشیں تشریح کی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے کہا ''پوری دنیا کی مسجدیں اللہ کے گھر ہیں۔ اور تمام مساجد کعبۃ اللہ کی بیٹیاں یعنی بیت اللہ کی شاخیں ہیں۔ اس لئے مسجد کی تعمیر بہت بڑا کار ثواب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو اللہ کے لئے مسجد بناتا ہے اللہ اس کے لئے جنت میں ایک بہترین گھر بناتا ہے اور مساجد کی تعمیر مسلمان کے ایمان کی علامت ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں فرمایا انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر۔ مسجدوں کو تو وہی لوگ تعمیر کرتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور آخرت کے دن پر۔ بحر حال مسجدوں کی تعمیر اسلام میں محمود چیز ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ مسلمان اور مسجد کا گہرا تعلق ہے۔ مومن کا وجود ہی بغیر مسجد کے مشکل ہے۔ جہاں ایمان والے ہونگے وہاں مسجد ضرور ہوگی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، المومن فی المسجد کالسمک فی الماء یعنی مومن مسجد میں ایسا ہے جیسے مچھلی پانی میں ۔ مچھلی کی زندگی ہی پانی کے بغیر مشکل ہے۔ اگر کوئی مسلمان مسجد کے بغیر جی رہا ہے تو اس کی یہ زندگی اسلامی اور ایمانی زندگی

نہیں ہے بلکہ یہ زندگی حیوانی ہے۔ اس لحاظ سے مساجد کی تعمیر مسلمانوں کے لئے بہت منشا نبوت کے decoration ضروری ہے مگر تعمیر میں مبالغہ اور اس کی تزئین یعنی خلاف ہے۔ تاہم ضروری تزئین و آرائش اور لازمی سہولیات سے مزین کرنا حضرت عثمان غنی کی سنت ہے۔ مسجدیں تو اللہ سے تعلق کو بڑھانے کے لئے ہیں۔ اور پھر مسجد '' کے ساتھ مسافر کھانا بنانا زیادہ افضل اور مناسب بات ہے۔

گل بوٹوں کی وادی میں رقت آمیز دعا

پھر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ایک پر سوز دعا کروائی۔ تمام احباب نے خدا سے مانگنے کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ میں نے بھی اجتماعی دعا یں ہاتھ اٹھائے۔ اور ساتھ ہی آنکھیں بھی آسمان کی طرف اٹھائی۔ کیا دیکھتا ہوں

بادلوں نے چوٹیوں کو گھیرا ڈالا ہوا ہے۔

قدرت چار سو بکھری پڑی ہے۔

پانی کے کنارے آسمان سے بارش کی پہلی بوند پڑی۔

دل نے گواہی دی کہ یہی تو دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ہے۔

جب آپ کا دل و دماغ، جسم کا ایک ایک عضو یہ محسوس بلکہ یقین کر رہا ہے کہ قدرت آپ کے ساتھ ہے تو پھر دعائیں قبول ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

دیر تک اللہ سے راز و نیاز کی باتیں کرتا رہا۔ تب آمین یارب العالمین کی

صدا گونج اٹھی۔
آنکھیں تر ہیں اور دل مسرور۔
آذان مغرب کی صدائیں پوری وادی ہیں گردش کرنے لگی۔
مسجد کی افتتاح شدہ جگہ پر پہلی باجماعت نماز ادا کی گئی۔
اللہ ایسی نمازوں کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔
علی الصبح کے لطف اندوز مناظر
کالا پانی کے دامن ہیں اللہ اللہ کرکے رات گزری، نماز فجر کے بعد تمام احباب سیر کو نکلے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ '' اس خوشگوار موسم میں جو '' واکنگ '' کے لیے نہیں نکلے گا وہ بدقسمت ہوگا '' باجوداس کے میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا پھر کافی دیر تک سوتا رہا۔تاہم جلد جاگا، سویرے کے موسم سے لطف اندوز ہوا۔ صبح کا منظر بہت ہی پیارا ہے۔
میں باہر نکلا۔
وزیر اقبال ہٹ کے سامنے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔
ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے اور ٹھنڈ کافی زیادہ ہے۔
سویٹر اور گرم ٹوپی پہلے ہی پہن رکھی مگر کسی اور اوڑھنی کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی۔

احباب کالا پانی کے دامن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خواتین و حضرات کا ٹہلنا، اٹکھیلیاں کرنا، سرگوشیاں کرنا، ہاتھ ہلانا، قہقہے لگانا اور پھر دھیرے دھیرے گھوم پھر کر ہٹس کی طرف آنا یقیناً ایک جادوائی منظر ہے۔

چار سو نظریں دوڑائیں تو دھوپ کی تمازت سے۔برف کے تودے اور گلیشئرز پگل پگل کر چھوٹے چھوٹے پانی کے دھاروں کی شکل میں دریا میں مل رہے ہیں اور اپنی ہستی کو مٹا کر ابدیت حاصل کر رہے ہیں۔یہی معاملہ عشق کے ساتھ بھی ہے۔ عشق '' میں'' کو ختم کرکے خواہش وصال میں اپنے وجود سے بھی لاپروا ہو جاتا ہے اور جب خواہش وصل پوری ہوتی ہے تو عاشق کی اپنی ہستی فنا ہو جاتی ہے مگر وہ دوام پا جاتا ہے اور دنیا کے لیے استعارہ بن جاتا ہے۔

ہمارے قافلے کے دو ساتھ بھائی اسلام اور ''ٹارزن''کالاپانی کے دامن سے نظر آنے والی چوٹی کے ٹاپ کی طرف نکلے ہیں اور مجھے ان کی واپسی کا شدت سے انتظار ہے۔جب وہ پہنچے تو پوچھنا شروع کیا۔ وہ کہنے لگے ان چوٹیوں کے اُس پر کئی بکروال ٹینٹ لگا کرفروکش ہیں ۔ یہاں سے بھی بڑے سبزے اور چراگاہیں تا حد نگاہ دکھائی دیتی ہیں اور ندی نالوں اور بہتے پانیوں۔بے شک '' فیہما عینان تجریان''۔

وزیر اقبال کے شاہکار ہٹس

بنائیں۔ایک مال مویشی کے لیے جس میں تین سو(Huts) وزیراقبال نے تین ہٹس کا بندوبست (Heating) بھیڑ بکریاں رکھنے کی گنجائش ہے۔ سخت موسم میں ہیٹنگ ہے۔ دو چھوٹے ہٹس ہیں جن میں ایک مختصر فیملی ارام سے رہ سکتی۔ ایک ہٹ بالکل تمام سہولیات کے ساتھ تیار ہے جس میں ہم نے رات گزاری، اس ہٹ میں کور کمانڈر اور دیگر اعلیٰ سرکاری و فوجی آفیسران اپنی فیملی کے ساتھ رات گزار چکے ہیں۔ میرے کہنے پر وزیراقبال نے اپنی گھڑی سے موسمیاتی معلومات لینے شروع کی۔انھوں نے بتایا کہ کالاپانی کا یہ پھیلا دامن سطح سمندر سے 3500 میٹر بلند ہے جو کہ 1200 فٹ بنتا ہے۔ موسم خوشگوار ہونے کی صورت میں نمی 662 جبکہ 18 سینٹی گریڈ ہے۔

کالاپانی کے منابع آب پر

رات یہ طے ہوا تھا کہ کالاپانی کے راستے سے بارڈ کراس کرکے قمری جائیں گے اور منی مرگ سے ہوتے ہوئے دیوسائی، چلم، دومیل اور دیگر وادیوں کی سیر کریں گے۔ تمام ساتھی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔۔برادرم نقشبر کے حوصلے اور میرے اصرار پر قاضی صاحب نے فیصلہ صادر کردیا کہ ہر حال میں آگے جائیں گے۔ وزیر اقبال ہٹ سے ٹاپ چوٹی تک 6 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ہم نے چل دیے۔ٹاپ پر پہنچے پہنچتے رہ گئے۔ راستہ کافی دشوار ہے۔کچھ گاڑیاں آگے نکل نہیں سکتی ہیں روڈ پر.بڑے.بڑے پتھر گرے ہیں۔ تاہم ہم وہاں پہنچے جہاں ٹاپ ہے۔ پانیوں

کا منبع ہے۔ برفانی تودے پگلتے دیکھا، اور ان تودوں پر بیل بکریاں اور خوش گاؤ خرامے خرامے ٹہلتے دیکھا۔ سیکورٹی احباب نے نشانہ بازی کی۔ ہم نے بھی شوق پورا کیا۔ اور چل دیے۔

واپسی پر راما میں

واپسی پر پھر وہی خوبصورت مناظر ہمارے سامنے ہیں۔ سیدھا راما پہنچے۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام برادرم انجینئر نقشبر نے راما ریسٹ ہاؤس میں کیا تھا۔ نماز ظہر راما چشمے میں پڑھا، راما کا میدان سطح سمندر سے تقریبا 3175 میٹر بلند ہے اور راما جھیل 3500 میٹر بلند ہے۔ رام جھیل ٹروٹ مچھلیوں کا مسکن ہے۔ راما چشمے والے میدان دیر تک گھومتے رہے۔ پھر پی ڈبلیو ڈی کے راما ریسٹ ہاؤس میں کھانا تناول کیا۔ اور چائے نوشی کی اور سیدھا ہرچو پہنچے۔ استور جامع مسجد کے دروازے سے ہمارے مضیفین نے ہمیں رخصت کی اور ہم نے انہیں الوداع کہا۔ میں خیالوں کی دنیا میں ڈوب گیا۔ ڈوبتا چلا گیا۔ وہاں گیا جہاں سے واپسی ناممکن ہے تاہم ایک جھٹکے سے خیالی دنیا سے حقیقی دنیا میں پہنچ گیااور ہرچو میں اتر کر مسجدیں نماز عصر ادا کی۔ متصل مدرسہ میں مقامی معتبرین کے ایک مختصر اجتماع سے قاضی صاحب نے گفتگو کی۔ وہاں سے سیدھا گلگت چل دیے۔ استور کے کالاپانی کے اس مختصر سفر کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ

ہے اپنی وضع میں یہ نرالی جہان سے
اتری زمیں پہ جس کی شبیہ آسماں سے

مولانا سمیع الحق، ایک عہد ساز شخصیت

مولانا سمیع الحق سے میری صرف دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔پہلی بار اس وقت جب مولانا پارلیمانی وفد کے ساتھ جرمنی سے بیلجیئم جاتے ہوئے آئرپورٹ میں گرفتار کیے گئے تھے۔ میں ان دونوں دارالعلوم حقانیہ کے شیخ الحدیث مولانا مغفوراللہ (باباجی صاحب) کے بیٹے.برادرم منصوراللہ کے ساتھ جامعہ فاروقیہ سے ششماہی تعطیلات گزارنے کے لیے دارالعلوم اکوڑہ خٹک آیا تھا اور باباجی کے چھوٹے سے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم باباجی کے ساتھ ان کے کمرے بھی بیٹھے تھے کہ اچانک مولانا سمیع الحق صاحب کا وُرود ہوا۔ چارپائی پر بیٹھ گئے اور باباجی سے باتیں شروع کی۔ بیلجیئم میں ہونے والی گرفتاری کا ماجرا پشتو زبان میں سنا رہے تھے تو میں نے مداخلت کی کہ حضرت! اگر اردو میں بات کریں تو مہربانی ہوگی۔ مولانا سمیع الحق صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے تو میں نے کہا کہ میرا نام امیر جان حقانی ہے۔ کہنے لگے کہ کیا آپ جامعہ حقانیہ کے فاضل ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ پوچھا تو کیا آپ ہماری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جواب نفی میں پاکر مولانا صاحب نے پوچھا پھر آپ حقانی کیسے ہیں۔ تو میں نے عرض کیا کہ حضرت لاشعوری سے حقانی ہوں اور اب آپ کی محبت بھی غالب آچکی ہے۔ جس پر کمرہ قہقہوں کی گونج سے زرد زعفران بن گیا۔

مولانا سمیع الحق کی ذات گرامی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، جہادی، صحافتی اور دینی حلقوں کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ بات سب پر عیاں ہے کہ پاک وہند کی بنجر زمین کی سرسبزی وشادابی میں مولانا سمیع الحق کا حصہ سب پر بھاری ہے۔ مملکت عزیز کی دینی و قومی روایات کے تحفظ، بدعات و خرافات میں توحید و سنت کی شمعیں روشن کرنے، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، مجاہد، عالم، محدث و مفسر، مناظر و متکلم، قاری و حافظ اور فقیہ و مفتی اور ادبی و صحافتی شہسواروں کی فوج تیار کرنے میں مولانا کی شخصیت اور ان کا ادارہ ستاروں میں چاند کی مانند ہے۔ انشاء و نثر نگاری اور تصنیف وتالیف اور تحقیق میں مولانا کا نام سرفہرست ہے۔ اپنے دور کے ایک نامور خطیب ہیں، مولانا نثر میں ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد ومالک ہیں، الفاظ اور تراکیب کے حسن اور اندازِ بیان سے عبارت میں ایک مخصوص رنگ جھلکتا ہے، واقفانِ حال سمجھتے ہیں کہ آپ کی تحریر میں ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ مولانا سمیع الحق اردو زبان کے ممتاز اور صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ سحرالبیان مقرر و خطیب بھی ہیں۔ مولانا موقع محل کے مناسب ایسا انداز گفتگو کرتے ہیں کہ ہر مقام پر جدت وندرت اور شائستگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب مولانا نے قلم اٹھایا تو علمی دنیا کے شہنشاہ ادب بن گئے۔ ان کی کتابیں گواہ ہیں کہ وہ

صاحب تخلیق اور بے مثال انشاپرداز کی شکل میں نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اسلامی ادبی دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مؤرخ نے ان کے ساتھ درست انصاف نہیں کیا۔آج ہماری اجتماعی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم مولانا کی ان اعلیٰ کارکردگیوں کو منظرعام پر لائیں جو سیاسی و علاقائی عصبیت کے پردے میں چھپ کر رہ گئی ہیں۔ نسلِ نو کو ان جیسے جلیل القدر علماء سے صحیح آشنا کروانے کی ضرورت ہے۔

مولانا عبدالقیوم حقانی نے مولانا سمیع الحق حقانی کی سوانح عمری ضبطِ تحریر میں لائی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے جو آج (15-05-15) ہی مجھے موصول ہوئی۔ انتہائی خوبصورت ٹائٹل اور کاغذ میں چھپی اس کتاب میں مولانا سمیع الحق کی ذات کے ہزاروں پَرتو نظر آتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے یہ تاثرات زائل ہوجاتا ہے کہ مولانا سمیع الحق کوئی پاکستانی نامور لیڈر ہے اور ایک بڑے مذہبی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بلکہ مولانا ایک عالمی رہنماء کے طور پر ابھرتے ہیں۔ مولانا عبدالقیوم حقانی نے انتہائی عرق ریزی سے ''مولانا سمیع الحق، حیات و خدمات'' کو مرتب کیا ہے۔ گو کہ اس کتاب میں مولانا کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں مگر اہم حصوں کا احاطہ ضرور ہے۔

مولانا نے انٹرنیشنل پریس کو جتنے انٹریو دیے ہیں ان کے متعلق بھی معلومات ہیں۔ انٹرنیشنل پریس کو جو انٹرویو دیے ہیں ان کو ''صلیبی دہشت گردی اور عالم

اسلام'' کے نام سے الگ کتاب چھپی ہے۔پڑھنے کی چیز ہے۔ عالمی حالات و خیالات اور موجودہ کروسیڈ سے مکمل آگاہی حاصل ہوجاتی ہے۔ مولانا سمیع الحق کی ایک کتاب مکاتیبِ مشاہیر'' ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ مولانا'' سمیع الحق ایک عالمی لیڈر ہے۔ اردو، فارسی، عربی، انگلش، فرانسیسی اور جرمنی، غرض کسی بھی زبان میں اتنی تعداد میں بل علم، دانشور واسکالر،اولیاء و صوفیائ، محققین ومحدثین، سیاست دان و حکمران، صحافی وادیب بلکہ مختلف الجہت بااثر لوگوں خطوط جمع کیے گئے ہوں ممکن نہیں۔ میں نے کئی دن انٹرنیٹ پر سرچ کیے مگر ناکامی ہوئی اور نہ ہی خطوط کی ایسی دستاویز کا کہیں اشارہ ملا۔اس کتاب میں شیخ الاسلام تقی عثمانی صاحب کے غالباً بیاسی خطوط ہیں۔

تحریک ختم نبوت کی کامیابی میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ان کی کتاب ''قادیانیت، ملت اسلامیہ کا موقف'' اور دوسری کتاب ''قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ'' اس پر دال ہے۔ مولانا کی ایک کتاب انگلش میں ہے۔ یہ بھی انٹرنیشل پریس کو دیے گئے انٹرویوز پر مشتمل خلاصہ ہے۔برطانوی صحافی ایون ریڈلی (مریم) نے اس پر تبصرہ لکھا ہے۔ جہاد افغان میں ان کی خدمات ایک مکمل روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے شریعت بل کی ایک طویل داستان ہے۔ان کی کتاب ''شریعت بل کا معرکہ'' لائق صد تحسین ہے۔ مولانا کی زندگی کا سب سے حیران کن

باب ''قومی اسمبلی میں شریعت بل، نفاذ شریعت کی سیاسی و پارلیمانی جدوجہد اور افغان جہاد اور افغان لیڈروں سے تعلق کا ہے۔ مولانا کے اسمبلی کے مشترکہ فورم سے جتنے بھی خطاب ہوئے ہیں پڑھنے اور سننے کے قابل ہیں۔ سینٹ کے چیئرمین جناب صدر اسحٰق خان صاحب کے سامنے ایوان بالا (سینٹ) میں شریعت بل کا مقدمہ کے عنوان سے کی گئی تقریر بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ سینٹ سیکرٹریٹ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اسمبلیوں میں تحفظ اہل بیت و تحفظ صحابہ پر مولانا کی تقاریر ریفرنس کا کام دیتی ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے لیڈروں، ریاستی سربراہوں، علمی و ادبی زعماؤں اور نامور شخصیات نے مولانا کو تفصیلی خطوط لکھے ہیں۔ ایران کا صدر ہو یا سعودی عرب کا بادشاہ، افغانستان کے حکمران و مجاہد رہنماء ہوں یا عراق و فلسطین کے زعمائ، نئی دنیا کے کرتا دھرتاؤں سے لے کر تیسری دنیا تک کے بااثر لوگ و حکمران طبقے کے ساتھ مولانا کسی نہ کسی صورت میں رابطے میں نظر آتے ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ اور مولانا واحد انسان ہیں جن سے پاکستان کے کسی بھی ادارے اور لیڈر سے زیادہ مغربی دنیا نے انٹرویو قلمبند کیے۔ جدید دنیا کے ہر معتبر میڈیا فورم نے ان سے طویل طویل انٹرویو بار بار کیے۔ گزشتہ دنوں ایک فیس بک دوست کی نشاندہی پر مولانا کی پچاس سال پہلے لکھی

کتاب '''اسلام اور عصر حاضر'' کا بالاستعیاب مطالعہ کیا۔اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا کی تحریر میں رعنائی بھی ہے اور تازگی بھی۔بیان میں سچائی اور شگفتگی کے ساتھ عصری تاثرات، خیالات ، نظریات و افکار کا مکمل احاطہ بھی ہے اور سماجی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور ان کی دین اسلام سے رہنمائی اور ترجمانی سے مولانا ایک مکمل صاحب طرز فنکار نظر آتے ہیں۔کیا میں اپنے قارئین کی خدمت میں یہ عرض کر سکتا ہوں مولانا کی کتابوں میں سیاسی شعور کی پختگی، مذہبی و سیاسی نظریوں اور رویوں میں استحکام بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ مولانا کے انداز نگارش نے انہیں بلند پایہ صحافیوں، قلم کاروں اور انشاپردازوں میں لاکھڑا کردیا ہے۔ان کی کتاب '' اسلامی معاشرہ کے لازمی خدوخال'' بہت پیاری کتاب ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں سوشل لائف کو بیان کیا ہے۔

غالباً مولانا عدنان کاکاخیل کی کسی تحریر میں پڑھا تھا کہ پختون علماء میں سب سے اچھی اردو مولانا سمیع الحق صاحب لکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد میں یہ کہونگا کہ ادب و انشاء کی دنیا ہیں پختون علماء نہیں بلکہ پورے پاکستان کے علماء و ادباء میں مولانا کا مقام بہت عظیم ہے۔اور خصوصاً اردو زبان کی بقائ، دلکشی و جاذبیت، شیرینی و چاشنی اور سحرانگیزی میں مولانا سمیع الحق نے اردو کو ایک نئی جہت عطاء کی ہے۔اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کا

برمحل اور خوبصورت استعمال کوئی مولانا سے سیکھے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا کے اس مقام کو علمی وادبی حلقوں میں سامنے لایا جائے تاکہ ان کے بیش بہا لعل و گوہر سے نوجوان نسل مستفید ہوجائیں۔

اپنی اس مختصر تحریر میں مولانا سمیع الحق کی شخصیت کے تمام پہلواجاگر نہیں کرسکتا۔ بس اتنا ضرور کہونگا کہ برصغیر کے جید علماء میں یورپ کی آنکھوں کا سب سے بڑا کانٹا مولانا سمیع الحق ہے۔یورپ کا پورا میڈیا اس بات پر اتفاق کرتا ہے کہ مولانا سمیع الحق فادر آف طالبان ہے۔ بلکہ فادر آف طالبان (افغان طالبان) کا لقب بھی مولانا کو یورپی میڈیا نے ہی دیا ہے۔امیر المومنین ملا عمر سمیت کئی وزراء نے مولانا سمیع الحق سے تعلیم حاصل کی ہے اور ان کی جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے سندفراغت حاصل کی ہے۔یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ جب بھی افغان مجاہدن میں اختلافات ہوئے تو مولانا سمیع الحق نے ان اختلافات کو ختم کروایا ہے۔ ملا عمر اور اسامہ کے درمیان بھی کئی بار مولانا سمیع الحق نے رفع دفع کروایا۔ ملی یکجہتی کونسل، ایم ایم اے، متحدہ دینی محاذ، دفاع افغانستان کونسل، دفاع پاکستان کونسل کے بھی اصل بانی و خالق مولانا سمیع الحق ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اوروں نے کڈنیپ کیا۔ تحریک ختم نبوت، 1973ء کے آئین کی تیاری، شریعت بل کی منظوری یہ پاکستان کی کسی بھی مذہبی جماعت کے لیڈر یا عالم دین سے سب سے زیادہ کوشش اور کردار

مولانا سمیع الحق کا ہے۔ تحریری و تحریکی جدوجہد اوردینی وملی اغراض کے لیے مولانا سمیع الحق ۱۹۵۰ء سے تاحال مسلسل کوشاں ہیں۔نصف صدی تک جمیعت علماء اسلام کے مرکزی رہنماء رہے۔ان کی تحریکی زندگی بلاشبہ قابل تقلید ہے۔ مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبداللہ درخواستی اور شیخ القرآن غلام اللہ خان جیسے جلیل القدر علماء کے ساتھ طویل عرصہ تحریکی وسیاسی جدوجہد کی۔اب جمیعت علماء اسلام (س) کے تاحیات امیر ہے۔

میں اکیلے بیٹھ کرجب سوچتا ہوں تو مولانا سمیع الحق کی زندگی داستانِ عزیمت لگتی ہے۔پون صدی پر مشتمل یہ داستان عزیمت ایک عہد کی مکمل تاریخ ہے۔ ایک ایسی داستان ہے جس میں لاکھوں اسباق پوشیدہ ہیں۔علم وقلم کی ہو یا درس وتدریس کی، تحقیق وادب کی ہو یا تاریخ وتاریخ سازی کی، اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو یا قومی وملی خدمات کی، قادیانیت کی تردید کی ہو یا فرق باطلہ کے تعاقب کا، اُمت مسلمہ کی زبوں حالی کا درد کی ہو یا صلیبی دہشت گردی کی تعاقب کا، نفاذ شریعت کے قیام وجدوجہد کی بیتی پارلیمنٹ میں ہو یا میدان جنگ و محاذ میں، افغان جہاد کی ہو یا امارت اسلامی افغانستان کی، تحریک دفاع اسلام وافغانستان کی ہو یا دفاع پاکستان کونسل کی،دینی مدارس و جامعات کے تحفظ کی ہو یا اسلامی کلچر وتہذیب کی دفاع کا، غرض ہر میدان میں یہ مرد مجاہد صف اول میں نظرآتے ہیں۔اور اپنے نقوش چھوڑتے ہیں۔ میرے نزدیک مولانا

کی علمی شخصیت کا حوالہ و مرتبہ بہت بلند وارفع ہے۔بلکہ تمام خدمات پر فائق واونچا ہے۔ وہ بیک وقت پندرہ سو علماء کو درس دے رہے ہیں۔دارالعلوم حقانیہ میں انسانی تاریخ کا سب سے بڑے فاضل مجموعے کو سال بھر درس (لیکچر) دیا جاتا ہے۔ یعنی سال بھر ایک کلاس ''دورہ حدیث شریف'' میں پندرہ سو طلبہ کو درس دیا جاتا ہے اور اس درس کا روح رواں مولانا سمیع الحق دامت فیوضہم ہے۔اللہ اپنے حفظ وآمان میں رکھے۔

اُف ! یہ چلاس ہے

چلاس شہر ضلع دیامر کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ضلع دیامر کی تین تحصلیں ہیں۔ چلاس سب سے بڑی تحصیل ہے۔ چلاس کے مضافات میں ہوڈر، تھور، تھک نیاٹ، گونرفارم، گوہرآباد، کھنر اور دیگر چھوٹے چھوٹے گاؤں اور وادیاں آباد ہیں۔ یہاں جنگلات اور بنجر زمینوں کی بہتات ہے جو یہاں کے لوگوں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ فیری میڈو، نانگا پربت اور بابوسر جیسی معروف سیاحتی مقامات بھی تحصیل چلاس میں ہے جہاں ملکی و غیر ملکی سیاحوں کا تانتا بندھتا ہے۔

یہ 1993ء کی بات ہے جب میں گورنمنٹ پرائمری اسکول سٹیلائیٹ ٹاؤن چلاس میں دوسری کلاس کا طالب علم تھا۔ بچپن کے ایام تھے۔ گلی کوچوں اور چوک چوراہوں میں گھومنے پھرنے کا اپنا ذوق ہوا کرتا تھا۔ پھر 1998ء میں چلاس ہائی اسکول میں کلاس اٹھاویں پڑھا کرتا تھا۔ وہاں سے تعلیم کے لئے کراچی سدھار گیا۔ پھر ٹھیک سترہ سال بعد چلاس شہر کا جائزہ لینے کا موقع مل رہا ہے۔ قارئین میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر پہلی محفل میں اس کی گنجائش نہیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی تفصیلات سے آگاہ کرونگا۔ بہت سارے تلخ حقائق کا جائزہ لینا ہے۔ ان کو دبانے اور چھپانے کی بجائے منظر عام پر لانا مفید ہے۔ شاید مجھ سے میرے

چلاسی بھائی خفا ہوں لیکن میرا ضمیر کہتا ہے کہ ہمیں ان مسائل کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہیے اور مثبت حل کے لیے اقدامات کرنے ہونگے۔ سر دست چند باتیں عرض کیے دیتا ہوں۔

یہ سچ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان سترہ سالوں میں چلاس جیسے معروف شہر میں کچھ بھی نیا دِکھائی نہیں دیتا۔ وہی پرانے دفاتر اور ان کی ناگفتہ بے حالت، چلاس کا ٹاؤن ایریا بہت مختصر سا ہے مگر اس مختصر ایریا کی حالت کا جائزہ لیتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ روڈ کی جو حالت ہے اس پر تو کلام کی گنجائش ہی نہیں۔ ہر جگہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ بڑے بڑے کھڈے آپ کا سامنا کریں گے۔ عوام کا جم غفیر روڈ پر کھڑا ہونا اپنا دائمی حق سمجھتے ہیں۔ درمیان سڑک پر گاڑی روک کر گپ شپ لگانا اور گزرتی گاڑیوں کا راستہ روکنا کسی طور معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ پورے ملک میں واحد چلاس بازار ہے جہاں لوگ بے مقصد گھوم پھر رہے ہیں۔ گھروں کے بجائے ہوٹلوں اور چائے خانوں کو آباد کرنا لوگوں کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ سرکاری دفاتر کا جائزہ لیا جائے تو وہاں کے کرتے دھرتاؤں کی حالت دیکھ کر کف افسوس ہی ملا جا سکتا ہے۔ چلاس وہ برمودہ تکون ٹرائی اینگل) ہے جہاں ہر ایماندار آفیسر غائب ہوتا ہے۔ اس کی غیبوبت میں عوام کے) ساتھ خواص کا بھی عملی کردار ہوتا ہے۔ پولیس گردی معمول کی بات ہے۔ عوام تو عوام سرکاری دفتروں میں گھس کر بے قصور لوگوں کو مار مار کر

لہولہان کرنا ان کے لیے تفریح طبع کا باعث ہے۔ڈی ایس پی لیول کے لوگ آن ڈیوٹی ملازمین کو مار مار کر کچومر بنادیتے ہیں اوران سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں۔پولیس کی نااہلی کا اس سے بڑا کیا ثبوت چاہیے کہ ایک معصوم بچے کو اغوا کیا گیا اور وحشانہ قتل کردیا گیا اور اس کے تین ہفتے بعد جنات کے خلاف ایف آئی آر درج کرلی گئی۔پوری دنیا جانتی ہے کہ پولیس کی نااہلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے دیامر کی سرزمین پر کیسے کیسے دردناک اور اندوہناک واقعات پیش آئے۔

انتہائی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ پورے چلاس بازار میں کوئی اصلی چیز نہیں ملتی۔ جعلی اشیاء نے لوگوں کی زندگی تباہی کے دھانے کھڑی کر دی ہے۔ڈھونڈنے سے بھی اوریجنل دوا نہیں ملتی۔ہر دوسرے آدمی کے زبان پر یہ بات عام ہے کہ چلاس شہر میں اصلی اور اوریجنل دوا نہیں ملتی۔مقام افسوس یہ ہے کہ اس جعلسازی پر نوٹس لینے کی لیے کوئی ادارہ تیار ہی نہیں۔اگر کوئی اعلیٰ آفیسر انکوائری کروالیتا ہے تو ڈرگ مافیا اتنی مضبوط ہے کہ لیبارٹریوں سے ''سب ٹھیک ہے'' کا رزلٹ تیار کرواتی ہے اور وہ آفیسر بے بس ہوجاتا ہے۔چلاس کی تعلیمی صورت حال پر اس لیے بات نہیں کرونگا، کیونکہ اس کے لیے مستقل الگ کالم کی ضرورت ہے۔ اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ اکلوتا معروف پبلک اسکول بھی کوئی معیاری تعلیمی ادارہ نہیں۔ باقی اسکولوں و کالج کی حالت کا آپ خود

اندازہ لگالیجیے۔کیا یہ کسی المیے سے کم ہے کہ کیڈیٹ کالج کو ٹاؤن ایریا چلاس میں نہیں بننے دیا گیا۔ تعلیم دشمنی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت چاہیے۔کوئی قابل ذکر دینی تعلیمی ادارہ بھی نہیں۔ وہی پرانی روش، وہی پرانا انداز۔یعنی آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اَڑنا۔تاہم زیرو پوائنٹ چلاس کے قریب ڈسر تھک میں چند جید علماء کرام نے جامعہ فیض العلوم کے نام سے ایک منظم دارالعلوم کی داغ بیل ڈالی ہے اور جدید انداز میں خدماتِ دین انجام دے رہے ہیں۔

ایک چیز میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ 1993ء میں شاید پورے چلاس میں دو چار بینکوں کی برانچیں تھی آج شہر چلاس میں ہر بینک کی برانچ اپنی آن و شان کے ساتھ موجود ہے۔اس کو ترقی کا عمل قطعاً نہیں کہا جاسکتا بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ دیامر بھاشا ڈیم کا بے تحاشا پیسہ ضلع دیامر کے عوام کو موصول ہوا، تو پرائیوٹ بینکوں کے مالکان نے ہنگامی بنیادوں پر بینک برانچیں کھولیں تاکہ عوام کا پیسہ انہیں کے برانچوں میں رکھا جاسکے۔اور وہ سود کی مد میں زیادہ سے زیادہ کمالیں۔ڈیم کی رقم نے لوگوں کو حواس باختہ کردیا ہے تاہم یہ حقیقت آنکھوں سے اوجھل نہ رہے کہ اس حواس باختگی کی عمر انتہائی کم ہے۔

ڈیم اور جنگلات کی مد میں وصول ہونے والی رقم سے کوئی تعلیمی ادارہ اور

رفاہی ادارہ بنانے کی بجائے مہنگی ترین گاڑیاں خرید کر مہنگے ترین ہوٹلوں میں عیاشیاں کرنا افتخار سمجھا جاتا ہے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جاتا ہے۔ دیامر بھاشا ڈیم کی سردست جو ادائیگیاں ہوئی ہیں اس میں عوام کے ساتھ بے تحاشا ظلم ہوا ہے۔ 2007ء کا ریٹ دیا گیا ہے۔ کمرشل ایریا جہاں فی کنال نوے لاکھ سے مہنگا ہوگیا ہے وہاں ڈیم کی متاثرہ زمین میں فی کنال 19 لاکھ کی ادائیگیاں ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ عوام میں نااتفاقی اور آپس کی چپقلشوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ سرکار بھی اپنا ہاتھ ضرور دکھاتی ہے مگر اس ظلم میں خود عوام اور مختلف قبائل کا ہاتھ ہے۔ اور ترقیاتی سکیموں میں بے ضابطگیوں اور گھپلوں کی کہانیاں...؟

اُف! اس ساری صورت حال پر ممبران اسمبلی اور وزراء بھی خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی تو حصہ دار ہیں نا۔

چلاس میں کئی ہفتے بیت گئے مگر کوئی ثقافتی و تہذیبی تقریب دیکھنے کو نہیں ملی۔ سنا ہے کہ کچھ ادبی و ثقافتی تنظیمیں کام کر رہی ہیں مگر دیکھنے سے بھی ان کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ صحافتی و ابلاغی حالت بھی کوئی قابل بیان نہیں، یہ الگ بات ہے کہ چند صحافی اپنی بساط سے زیادہ ایکٹیو نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی عظمت ہے۔ صفائی کا نظام انتہائی ناقص ہے۔ ایک ذمہ دار آفیسر نے بلدیہ

چلاس کے ذریعے پورے ٹاؤن ایریا میں کوڑے دان لگوائے تھے۔ ان میں کچرا ڈالنے کے بجائے توڑ کر اپنی گائے بکریوں کے لیے کھرلیاں بنائی گئی۔ پھر بھی ہم کہتے نہ تھکتے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ شاید یہ ہمارا دشمن انگریز کے لیے نصف ایمان ہو۔

آ! عندلیب مل کر کریں آہ وزاریں ۔
تو پکار ہائے گُل، میں چلاوں ہائے دل

بہر صورت بہت سارے ایسے ایشوز ہیں جن پر تفصیل سے لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ معاشرت کی تباہی پر، ثقافت کی لاچارگی پر، ادب و صحافت کی بے لطفی پر، طرز زندگی کی بے ہودگی پر، قانون کی علمبرداری پر، بنتے بگڑتے رویوں پر، تعلیم وتربیت کی زبوں حالی پر، اشیاء صحت و خورد نوش کی جعلسازی پر، امانت و دیانت کی بے مائیگی پر، دینی وعلاقائی اقدار سے بے گانگی پر، حقوق انسان کی پامالی پر، تمدنی زندگی میں بے پروائی پر، احساس و ذمہ داری میں بدلحاظی پر، ظلم وستم کی بڑھوتگی پر، عدل وانصاف کی لاچارگی پر، روایات و مہمان نوازی کی تنزلی پر، اپنوں کی ریشہ دوانیوں پر اور غیروں کی بے رعنائیوں پر اوران جیسے سینکڑوں موضوعات ہیں جن کو مفصل بیان کرنا مقتضائے وقت ہے۔ ہر فرد کو احساس ہے کہ ہم تباہی کے دھانے پر کھڑے ہیں مگر وہ بھی سوسائٹی کی لَے میں لَے ملائے زندگی کا پہیہ چل رہا ہے اور درون خانہ کڑھ رہا ہے۔

ایک انتہائی ذمہ دار شخص تکرار کے ساتھ دھراتا ہے کہ ''چلاس میں باجماعت نماز پڑھو اور سنت کے مطابق داڑھی رکھو اور اس کے بعد جو چاہیے کرلو، یہاں کے لوگ آپ کے فین بن جائیں گے اور اگر کہیں مسائل کھڑے ہوں تو مولویوں کا سہارا لو''۔یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔اس حوالے سے ایک زبردست سماجی و معاشرتی اور اخلاقی و روحانی انقلاب کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ لاء اینڈ آرڈر کو بھی بھرپور طاقت کے ساتھ بروئے کار لایا جانا چاہیے۔چلاس کے اہل علم و قلم سے گزارش ہے کہ معاشرے کے ان رِستے ہوئے ناسوروں کو بلاکم وکاست منظر عام پر لائیں۔علماء کرام و دانشوران عظام اپنی تقریر و تحریر اور وعظ و نصیحت میں قران و حدیث کی روشنی میں ان رویوں کی سخت مذمت کریں اور ساتھ ہی انتظامیہ قانون کی علمبرداری کو ہر حال میں یقینی بنائے۔بہر حال ان رویوں کی بیخ کنی ضروری ہے ورنہ آنے والی نسلوں کو برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

ماں

یہ سچ کہنے میں مجھے قطعاً عجیب نہیں لگ رہا ہے کہ ''بے لوث محبت'' صرف ماں کا خاصہ ہے۔ ورنہ تو اللہ بھی اپنی مخلوقات سے بے لوث محبت نہیں کرتے۔ اگر وہ بے لوث محبت کرتے تو کافروں کے لے عذاب الیم اور نافرمانوں کے لیے سخت وعیدیں کیوں نازل فرماتے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ محبت کی کئی اقسام ہیں۔ مال و دولت سے محبت، اپنے آپ سے محبت، حسن و جمال سے محبت، بیوی سے محبت اور بیوی کی محبت۔ علماء کرام برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ اللہ سے محبت اور اللہ کی محبت بھی۔ غرض ہر قسم کی محبت میں کوئی نہ کوئی غرض ولالچ ضرور شامل ہے۔ واللہ العظیم ! اگر کوئی بے لوث، ہر قسم کے اغراض سے پاک، تمام آلائشوں سے صاف، تمام کثافتوں سے طاہر محبت ہے تو وہ صرف اور صرف ماں کی محبت ہے۔ ماں کی عظمت کے حوالے سے قرآن میں '' وبالوالدین احسانا '' ہزاروں بار پڑھا۔ ''ولاتقل لہما اُف و قل لہما قولا کریما ''یعنی والدین کے ساتھ اچھا برتاو کرو، اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بوڑھاپے کی منزل پر پہنچ جائیں تو انہیں "اُف" تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو، بلکہ ان سے مہربانی سے بات کرو۔ ''الجنتہ تحت اقدام امہاتکم ''کی توضیحات کو سینکڑوں بار پڑھا اور اتنی ہی بار سننے والوں کو سنایا۔ عظمتِ ماں پر مسلم و غیر مسلم مفکرین و دانشوروں کی تحقیقات و

تدقیقات اور اُدباء و فلسفیوں کی نثر نگاریاں اور علمی موشگافیاں بار بار پڑھنے اور سلجھانے کو ملی۔ ماں کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ اللہ کریم جب انسان سے محبت کا دعوی کرتا ہے تو اس کے لیے محبت کی مثال ماں کو بناتا ہے اور کہتا ہے کہ میں انسان کے ساتھ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ یعنی بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اللہ کے اس فرمان میں شک و شبہ کی نہ گنجائش ہے نہ کوئی مسلمان اس کی جسارت کر سکتا ہے۔

ہزاروں نیک صفات و خصوصیات اور مجاہدات و ریاضات کی خوشبوں سے ماں کا خمیر تیار ہوتا ہے اور جب ماں زمین پر قدم رکھتی ہے تو اسی زمین کے تلے اولاد کو جنت مل جاتی ہے۔ یہ قطعاً قید نہیں کہ وہ ماں نیک اور پارسا ہو۔ بلکہ صرف ایک ہی شرط ہے کہ وہ ماں ہو۔ بے شک وہ زانیہ و شرابیہ ہو۔ بے شک وکافرہ و مرتدہ ہو مگر ماں ہو ماں ہو۔ اگر وہ اپنے ناپاک قدم کہیں رکھ دے تو زمین کا وہ ٹکڑا اولاد کے لیے باغ بہشت بن جاتا ہے۔

بے شک... ماں کی عظمت آسمان کی عظمت و رفعت سے بڑھ کر ہے۔
بے شک... ماں کی روشنی میں ممتا کی کلیاں مسکراتی ہیں۔
بے شک...ماں کے میلے پاؤں تلے جنت کے پھول اُگتے ہیں۔
بے شک...ماں کی چاندنی میں تپش و تمازت نہیں۔
بے شک...ماں ایک ایسا تابندہ تارہ ہے جو ظلمات میں روشنی کا کام دیتا ہے۔

بے شک...ماں کی روشنی واجالا کے سامنے زہرہ، مریخ اور شاقب کی روشنی پھیکی پڑ جاتی ہے۔

بے شک...ماں کی نظر کرم اَبرِ رحمت کے خوشگوار جھونکوں سے لاکھوں درجہ خوشیوں کا باعث ہے۔

بے شک...ماں کا دل سمندر سے زیادہ گہرا اور ہمالیہ وکے ٹو سے زیادہ اونچا ہے۔

بے شک...ماں کی خوشبو سے پوری دھرتی معطر ہو جاتی ہے۔

لاریب کہ... ماں عطیہ خداوندی ہے۔ شاید سب سے بڑا عطیہ۔

بے شک... مگراس سب کچھ کے باوجود مجھے ماں کی عظمت اور وقار درست طور پر سمجھ ہی نہیں آیا۔

میری والدہ گزشتہ تین سال سے سخت علیل ہیں۔ انہیں Parkinsonism ہے۔ یہ فالج کی طرح ایک مرض ہے جو انسان کو بستر کا بنا کر رکھ دیتی ہے۔اس مرض نے میری والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ میں نے حتی المقدور علاج معالجہ کروایا ہے مگر مرض بڑھتا جاتا ہے۔ آفاقہ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ دیسی وطبیبی اور ڈاکٹری علاج میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ والدہ کی اطمینان کے لیے تعویذ گنڈوں کا بھی خوب سہارا لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی استطاعت کے مطابق والدہ محترمہ کی خدمت بھی خوب کرتا ہوں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے

کہ میرے احباب و رشتہ دار مجھے اکساتے رہتے ہیں کہ آپ نے والدہ کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے اور میں بھی اسی گھمنڈ میں رہا مگر یہ سب کچھ اس وقت کافور ہوا جب میرے دو معصوم بچوں نے میری وائف کا جینا حرام کر دیا۔اللہ تعالیٰ نے ایک سال میں بالترتیب دو بیٹوں سے نوازا۔بڑا بیٹا چھوٹے سے ایک سال چار دن کا بڑا ہے۔ دونوں ماں کا دودھ پیتے ہیں اور رات بھر کبھی ایک ساتھ اور کبھی باری باری سے جاگتے ہیں۔ روتے ہیں بلکہ اودھم مچاتے ہیں۔اس پر مستزاد بیماری کی حالت میں جاگتے ہیں کھانستے ہیں اور چلاتے ہیں۔ میں اپنی وائف کا کچھ بھی مدد نہیں کرتا۔ مجھے صرف نیند میں ڈسٹربینس ہو جاتی ہے جس پر سخت غصہ آ جاتا ہے مگر میری بیوی ان دونوں کو سنبھالتی ہے۔دودھ کی شکل میں خون جگر پلاتی ہے۔ایک کو گود میں لیتی ہے دوسرے کو پیٹھ پر اٹھا کر چادر سے باندھ دیتی ہے۔ لوری سناتی ہے۔ ان کے کانوں میں ''اللہ ہو'' کا ورد کرتی ہے۔دونوں کو ساتھ دودھ پلاتی ہے۔ کمال ہے کبھی ان کے لیے کوئی نازیبا لفظ کہا ہو۔دسیوں دفعہ میں نیند سے بیدار ہوا اور بڑے والے ''ایک سالہ'' لڑکے کو تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو انھوں نے سختی سے روکا اور ہاتھ کھینچا اور کہا کہ میرے ساتھ روز کا یہی معاملہ اور آپ ایک دن یہاں آتے ہیں اور ان معصوموں پر چلاتے ہیں۔ تمھیں کیا تکلیف ہے اگر نیند خراب ہو رہی ہے تو جا کر الگ کمرے میں سو جاؤ۔یقین جانیں۔جب یہ صورت حال دیکھتا ہوں تو مجھے حدیث کے وہ الفاظ جن میں تین دفعہ مسلسل ماں کے ساتھ احسان عظیم کرنے کا حکم وارد

ہوا ہے صحیح معنوں میں سمجھ آنے لگتے ہیں۔سچ ہے کہ انسان دلیل سے زیادہ مشاہدہ و تجربہ سے سیکھتا ہے اور مانتا ہے۔جب رات کے دو بجے میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے تو مجھے بے ساختہ اپنی ماں یاد آجاتی ہے۔اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔اپنی چیخیں یاد آجاتی ہیں۔پیشاب کے لوتھڑے بھی یاد آجاتے ہیں۔اپنی ماں کی وہ تمام تکالیف بھی یاد آجاتی ہیں جو اس نے ہم گیارہ بہن بھائیوں کے لیے اٹھائی ہے جن میں تین پیدائش کے چند دن بعد اللہ کے پیارے ہوئے ہیں اور فرمان نبی ﷺ کے مطابق جنت میری ماں کے لیے لازم بن گئی ہے۔اور میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ میں نے اپنی ماں کی خدمت کا حق ادا کیا ہے۔ٹھیک اسی وقت میں اٹھ کھڑا ہو جاتا ہوں، متصل کمرے میں سوئی ہوئی اپنی والدہ کو جگاتا ہوں،بیمار ماں کی خبر گیری کرتا ہوں۔ان کا سر ہاتھ میں لے کر دیر تک ان سے مختلف سوالات پوچھتا رہتا ہوں اور ان کے ہاتھ بے اختیار چومتا رہتا ہوں۔ وہ مسکرا کر صرف اتنا کہہ دیتی ہے کہ باقی سب تو ٹھیک تھا مگر آپ کو سنبھالنے کے لیے صرف ایک ہی چادر ہوا کرتی تھی جو میرے صوبیدار ماموں جان نے عنایت کیا تھا۔ میرے بول و براز سے چادر کا ایک حصہ گیلا ہوجاتا تو دوسری حصے میں مجھے لپیٹتی ۔اور میری ماں کو یہ عمل سخت تکلیف میں بتلا کردیتا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کے لیے صرف اور صرف ایک ہی چارد میسر ہے۔انہیں آج بھی اپنی تکالیف کا احساس نہیں جو انھوں نے میرے لیے اٹھائی ہے۔ میرے اصرار پر صرف اتنا کہہ دیتی ہے کہ ہر ماں اپنے بچوں سے محبت اور ان کے لیے تکالیف جھیلتی

ہے۔ اس میں میرا کیا کمال ہے۔ یہ تو فطرت خداوندی ہے۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اپنی ماں کی محبت کے کئی دلفریب واقعات لکھ دیتا۔

میرے آقا ﷺ نے سو فیصد درست فرمایا کہ انسانی خدمت اجر عظیم کا مستحق ہے۔ اور قرآن پاک جگہ جگہ اس کا ارشاد بھی کرتا ہے۔ تو میں عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کیا بچوں کو پیدا کرنا اور ان کی تربیت کرنا انسانی خدمت نہیں؟۔ کیا معصوم بچہ انسان نہیں؟ ہاں یہ سچ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ کسی غریب کی مدد کرنا، کسی مریض کی بیمار پرسی کرنا، کسی پیاسے کو پانی پلانا، کسی بھوکے کو روٹی کھلانا، کسی یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنا، کسی طالب علم کی تعلیم میں معاونت کرنا اور ان جیسی دیگر انسانی خدمات کوئی مشکل نہیں۔ بخدا! اگر مشکل ہے تو کئی سیر کا بچہ نو ماہ تک پیٹ میں لیے پھرنا مشکل ہے۔ زندگی اور موت کے انتہائی اتصالی حالت میں پہنچ کر بچے کو جنم دینا، اُف! وضع حمل کی چیخیں اور آہیں... اور پھر آج کل اپریشن کے ذریعے پیٹ چاک کروا کر بچہ نکلوانا، دو سال تک دودھ کی شکل میں خون جگر پلانا، سخت جھاڑوں میں اور رات کے آخری پہر میں جاگ کر بیمار بچے کو لوریاں دینا اور پھر تاحیات اپنے نافرمان سے نافرمان بچوں سے بے لوث محبت کرنا اور ان کی کامیابی وکامرانی کے لیے خدا کا دروازہ کھٹکھٹانا سب سے زیادہ مشکل اور اصعب کام ہے۔ اور یہی تو انسانی خدمت و مخلوق خدا سے محبت کا لازوال

شاہکار ہے۔ جس کی کوئی تمثیل نہیں۔زیادہ نہیں صرف ایک بچے کو پالنا پوسنا عظیم قربانی و ایثار کا متقاضی ہے۔ جی کرتا ہے کہ ماں جیسی مجسم محبت ہستی پر لاکھوں جنتیں قربان کروں کیونکہ اس کے پاؤں کے دھول تلے جنت ہے تو اس کے ہاتھوں کی شفقت، دل کی محبت اور زبان کی لوریوں تلے کیا سے کیا ہو سکتا ہے۔ جس کا بیان میرے جیسے کوتاہ علم و عمل کے لیے ممکن ہی نہیں۔

میں نے یہ بات سینکڑوں دفعہ کہی ہے کہ میں سخت سے سخت مشکل اور تکلیف سے نہیں ڈرتا۔ اس لیے کہ میری ماں زندہ ہے اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ میری حفاظت اور کامیابی کے لیے ہمہ دم اٹھتے رہتے ہیں۔ میری ماں جس کے ماتھے میں نور، جس کے آنکھوں میں ٹھنڈک، جس کے دل میں محبت، جس کی زبان میں مٹھاس، جس کے لرزہ براندام ہاتھوں میں شفقت، جس کی باتوں میں مودت، جس کی آغوش میں دھرتی کا سب سے بڑا سکون و طمانیت اور سب سے بڑھ کر اس کے میلے کچیلے پاؤں تلے میرے لئے جنت الفردوس ہے۔ اسی ماں کی خدمت گزاری کا موقع مجھ جیسے کوتاہ کو حاصل ہے تو پھر ڈرنے ورنے کی کوئی بات نہیں۔ خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد میرے لیے بقول خدا سب سے بڑھ کر جس ہستی کی عظمت و احترام کا حکم ہے وہ میری ''ماں'' ہے۔

بقول تابش کے کہ

گردشیں لوٹ جاتی ہیں میری بلائیں لے کر
گھر سے جب نکلتا ہوں میں ماں کی دعائیں لے کر

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
اک ماں ہی ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

یہ سچ کہنے میں مجھے قطعاً عجیب نہیں لگ رہا ہے کہ ''بے لوث محبت'' صرف ماں کا خاصہ ہے۔ ورنہ تو اللہ بھی اپنی مخلوقات سے بے لوث محبت نہیں کرتے۔ اگر وہ بے لوث محبت کرتے تو کافروں کے لئے عذاب الیم اور نافرمانوں کے لیے سخت وعیدیں کیوں نازل فرماتے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ محبت کی کئی اقسام ہیں۔ مال و دولت سے محبت، اپنے آپ سے محبت، حسن و جمال سے محبت، بیوی سے محبت اور بیوی کی محبت۔ علماء کرام برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ اللہ سے محبت اور اللہ کی محبت بھی۔ غرض ہر قسم کی محبت میں کوئی نہ کوئی غرض ولالچ ضرور شامل ہے۔ واللہ العظیم ! اگر کوئی بے لوث، ہر قسم کے اغراض سے پاک، تمام آلائشوں سے صاف، تمام کثافتوں سے طاہر محبت ہے تو وہ صرف اور صرف ماں کی محبت ہے۔ ماں کی عظمت کے حوالے سے قرآن میں '' وبالوالدین احسانا''ہزاروں بار پڑھا۔ ''ولاتقل لہما اُف وقل لہما قولا کریما ''یعنی والدین کے ساتھ اچھا برتاو کرو، اگران میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بوڑھاپے کی منزل پر پہنچ جائیں تو انہیں "اُف" تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو، بلکہ ان سے مہربانی سے بات کرو۔ ''الجنتہ تحت اقدام امہاتکم ''کی توضیحات کو سینکڑوں بار پڑھا اور اتنی ہی بار سننے والوں کو سنایا۔ عظمتِ ماں پر مسلم و غیر مسلم مفکرین و دانشوروں کی تحقیقات و

تدقیقات اور اُدباء و فلسفیوں کی نثر نگاریاں اور علمی موشگافیاں بار بار پڑھنے اور سلجھانے کو ملی۔ ماں کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ اللہ کریم جب انسان سے محبت کا دعوی کرتا ہے تو اس کے لیے محبت کی مثال ماں کو بناتا ہے اور کہتا ہے کہ میں انسان کے ساتھ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ یعنی بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اللہ کے اس فرمان میں شک و شبہ کی نہ گنجائش ہے نہ کوئی مسلمان اس کی جسارت کر سکتا ہے۔

ہزاروں نیک صفات سینکڑوں مجاہدات اور سخت ریاضات کی خوشبوؤں سے ماں کا خمیر تیار ہوتا ہے اور جب ماں زمین پر قدم رکھتی ہے تو اسی زمین کے تلے اولاد کو جنت مل جاتی ہے۔ یہ قطعاً قید نہیں کہ وہ ماں نیک اور پارسا ہو۔ بلکہ صرف ایک ہی شرط ہے کہ وہ ماں ہو۔ بے شک وہ زانیہ و شرابیہ ہو۔ بے شک وہ کافرہ و مرتدہ ہو مگر ماں ہو ماں ہو۔ اگر وہ اپنے ناپاک قدم کہیں رکھ دے تو زمین کا وہ ٹکڑا اولاد کے لیے باغِ بہشت بن جاتا ہے۔

بے شک... ماں کی عظمت آسمان کی عظمت و رفعت سے بڑھ کر ہے۔

بے شک... ماں کی روشنی و اجالا کے سامنے زہرہ، مریخ اور شاقب کی روشنی پھیکی پڑ جاتی ہے۔

بے شک... ماں کا دل سمندر سے زیادہ گہرا اور ہمالیہ و کے ٹو سے زیادہ اونچا ہے۔

بے شک... ماں کی دھوپ میں تپش و تمازت نہیں۔

بے شک... ماں کی روشنی میں ممتا کی کلیاں مسکراتی ہیں۔

بے شک... ماں کے میلے پاؤں تلے جنت کے پھول اُگتے ہیں۔

بے شک... ماں ایک ایسا تابندہ تارہ ہے جو ظلمات میں روشنی کا کام دیتا ہے۔

بے شک... ماں کی نظر کرم اَبرِ رحمت کے خوشگوار جھونکوں سے لاکھوں درجہ فرحتوں کا باعث ہے۔

بے شک... ماں کی خوشبو سے پوری دھرتی معطر ہوجاتی ہے۔

لاریب کہ... ماں عطیہ خداوندی ہے۔ شاید سب سے بڑا عطیہ۔

بے شک... مگر اس سب کچھ کے باوجود مجھے ماں کی عظمت اور وقار درست طور پر سمجھ ہی نہیں آیا۔

ہے۔ یہ فالج Parkinsonism میری والدہ گزشتہ تین سال سے سخت علیل ہیں۔ انہیں کی طرح ایک مرض ہے جو انسان کو بستر کا بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس مرض نے میری والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ میں نے حتی المقدور علاج معالجہ کروایا ہے مگر مرض بڑھتا جاتا ہے۔ آفاقہ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ دیسی و طبیبی اور ڈاکٹری علاج میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ والدہ کی اطمینان کے لیے تعویذ گنڈوں کا بھی خوب سہارا لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی استطاعت کے مطابق والدہ محترمہ کی خدمت بھی خوب کرتا ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے

کہ میرے احباب و رشتہ دار مجھے اکساتے رہتے ہیں کہ آپ نے والدہ کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے اور میں بھی اسی گھمنڈ میں رہا مگر یہ سب کچھ اس وقت کافور ہوا جب میرے دو معصوم بچوں نے میری وائف کا جینا حرام کر دیا۔اللہ تعالٰی نے ایک سال میں بالترتیب دو بیٹوں سے نوازا۔بڑا بیٹا چھوٹے سے ایک سال چار دن کا بڑا ہے۔ دونوں ماں کا دودھ پیتے ہیں اور رات بھر کبھی ایک ساتھ اور کبھی باری باری سے جاگتے ہیں۔ روتے ہیں بلکہ اودھم مچاتے ہیں۔اس پر مستزاد بیماری کی حالت میں جاگتے ہیں کھانستے ہیں اور چلاتے ہیں۔ میں اپنی وائف کا کچھ بھی مدد نہیں کرتا۔ مجھے صرف نیند میں ڈسٹربینس ہو جاتی ہے جس پر سخت غصہ آجاتا ہے مگر میری بیوی ان دونوں کو سنبھالتی ہے۔دودھ کی شکل میں خون جگر پلاتی ہے۔ایک کو گود میں لیتی ہے دوسرے کو پیٹھ پر اٹھا کر چادر سے باندھ دیتی ہے۔ لوری سناتی ہے۔ ان کے کانوں میں " اللہ ہو" کا ورد کرتی ہے۔دونوں کو ساتھ دودھ پلاتی ہے۔ مجال ہے کبھی ان کے لیے کوئی نازیبا لفظ کہا ہو۔دسیوں دفعہ میں نیند سے بیدار ہوا اور بڑے والے "ایک سالہ " لڑکے کو تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو انھوں نے سختی سے روکا اور ہاتھ کھینچا اور کہا کہ میرے ساتھ روز کا یہی معاملہ اور آپ ایک دن یہاں آتے ہیں اور ان معصوموں پر چلاتے ہیں۔ تمھیں کیا تکلیف ہے اگر نیند خراب ہو رہی ہے تو جا کر الگ کمرے میں سو جاؤ۔یقین جانیں۔جب یہ صورت حال دیکھتا ہوں تو مجھے حدیث کے وہ الفاظ جن میں تین دفعہ مسلسل ماں کے ساتھ احسان عظیم کرنے کا حکم وارد

ہوا ہے صحیح معنوں میں سمجھ آنے لگتے ہیں۔ سچ ہے کہ انسان دلیل سے زیادہ مشاہدہ و تجربہ سے سیکھتا ہے اور مانتا ہے۔ جب رات کے دو بجے میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے تو مجھے بے ساختہ اپنی ماں یاد آ جاتی ہے۔ اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ اپنی چیخیں یاد آ جاتی ہیں۔ پیشاب کے پوتھڑے بھی یاد آ جاتے ہیں۔ اپنی ماں کی وہ تمام تکالیف بھی یاد آ جاتی ہیں جو اس نے ہم گیارہ بہن بھائیوں کے لیے اٹھائی ہے جن میں تین پیدائش کے چند دن بعد اللہ کے پیارے ہوئے ہیں اور فرمان نبی ﷺ کے مطابق جنت میری ماں کے لیے لازم بن گئی ہے۔ اور میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ میں نے اپنی ماں کی خدمت کا حق ادا کیا ہے۔ ٹھیک اسی وقت میں اٹھ کھڑا ہو جاتا ہوں، متصل کمرے میں سوئی ہوئی اپنی والدہ کو جگاتا ہوں، بیمار ماں کی خبر گیری کرتا ہوں۔ ان کا سر ہاتھ میں لے کر دیر تک ان سے مختلف سوالات پوچھتا رہتا ہوں اور ان کے ہاتھ بے اختیار چومتا رہتا ہوں۔ وہ مسکرا کر صرف اتنا کہہ دیتی ہے کہ باقی سب تو ٹھیک تھا مگر آپ کو سنبھالنے کے لیے صرف ایک ہی چادر ہوا کرتی تھی جو میرے صوبیدار ماموں جان نے عنایت کیا تھا۔ میرے بول و براز سے چادر کا ایک حصہ گیلا ہو جاتا تو دوسری حصے میں مجھے لپیٹتی ۔ اور میری ماں کو یہ عمل سخت تکلیف میں بتلا کر دیتا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کے لیے صرف اور صرف ایک ہی چارد میسر ہے۔ انہیں آج بھی اپنی تکالیف کا احساس نہیں جو انہوں نے میرے لیے اٹھائی ہے۔ میرے اصرار پر صرف اتنا کہہ دیتی ہے کہ ہر ماں اپنے بچوں سے محبت اور ان کے لیے تکالیف جھیلتی

ہے۔ اس میں میرا کیا کمال ہے۔ یہ تو فطرت خداوندی ہے۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اپنی ماں کی محبت کے کئی دلفریب واقعات لکھ دیتا۔

میرے آقا ﷺ نے سو فیصد درست فرمایا کہ انسانی خدمت اجر عظیم کا مستحق ہے۔ اور قرآن پاک جگہ جگہ اس کا ارشاد بھی کرتا ہے۔ تو میں عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کیا بچوں کو پیدا کرنا اور ان کی تربیت کرنا انسانی خدمت نہیں ؟۔ کیا معصوم بچہ انسان نہیں ؟ ہاں یہ سچ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ کسی غریب کی مدد کرنا، کسی مریض کی بیمار پرسی کرنا، کسی پیاسے کو پانی پلانا، کسی بھوکے کو روٹی کھلانا، کسی یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنا، کسی طالب علم کی تعلیم میں معاونت کرنا اور ان جیسی دیگر انسانی خدمات کوئی مشکل نہیں۔ بخدا ! اگر مشکل ہے تو کئی سیر کا بچہ نو ماہ تک پیٹ میں لیے پھرنا مشکل ہے۔ زندگی اور موت کے انتہائی اتصالی حالت میں پہنچ کر بچے کو جنم دینا، اُف ! وضع حمل کی چیخیں اور آہیں...اور پھر آج کل اپریشن کے ذریعے پیٹ چاک کروا کر بچہ نکلوانا، دو سال تک دودھ کی شکل میں خون جگر پلانا، سخت جھاڑوں میں اور رات کے آخری پہر میں جاگ کر بیمار بچے کو لوریاں دینا اور پھر تا حیات اپنے نافرمان سے نافرمان بچوں سے بے لوث محبت کرنا اور ان کی کامیابی وکامرانی کے لیے خدا کا دروازہ کھٹکھٹانا سب سے زیادہ مشکل اور اصعب کام ہے۔ اور یہی تو انسانی خدمت و مخلوق خدا سے محبت کا لازوال

شاہکار ہے۔ جس کی کوئی تمثیل نہیں۔ زیادہ نہیں صرف ایک بچے کو پالنا پوسنا عظیم قربانی و ایثار کا متقاضی ہے۔ جی کرتا ہے کہ ماں جیسی مجسم محبت ہستی پر لاکھوں جنتیں قربان کروں کیونکہ اس کے پاؤں کے دھول تلے جنت ہے تو اس کے ہاتھوں کی شفقت، دل کی محبت اور زبان کی لوریوں تلے کیا سے کیا ہو سکتا ہے۔ جس کا بیان میرے جیسے کوتاہ علم و عمل کے لیے ممکن ہی نہیں۔

میں نے یہ بات سینکڑوں دفعہ کہی ہے کہ میں سخت سے سخت مشکل اور تکلیف سے نہیں ڈرتا۔ اس لیے کہ میری ماں زندہ ہے اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ میری حفاظت اور کامیابی کے لیے ہمہ دم اٹھتے رہتے ہیں۔ میری ماں جس کے ماتھے میں نور، جس کے آنکھوں میں ٹھنڈک، جس کے دل میں محبت، جس کی زبان میں مٹھاس، جس کے لرزہ براندام ہاتھوں میں شفقت، جس کی باتوں میں مودت، جس کی آغوش میں دھرتی کا سب سے بڑا سکون و طمانیت اور سب سے بڑھ کر اس کے میلے کچیلے پاؤں تلے میرے لئے جنت الفردوس ہے۔ اسی ماں کی خدمت گزاری کا موقع مجھ جیسے کوتاہ کو حاصل ہے تو پھر ڈرنے ورنے کی کوئی بات نہیں۔ خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد میرے لیے بقول خدا سب سے بڑھ کر جس ہستی کی عظمت و احترام کا حکم ہے وہ میری "ماں" ہے۔

بقول تابش کے کہ

گردشیں لوٹ جاتی ہیں میری بلائیں لے کر
گھر سے جب نکلتا ہوں میں ماں کی دعائیں لے کر

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
اک ماں ہی ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوئے

ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور مزید لکھا جائے گا۔ان کی شخصیت کے سینکڑوں پہلوؤں ہیں مگر سب سے اہم اور بڑا پہلو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ ''حب الوطنی ان کے ایمان کا حصہ تھا۔ پاکستان کے خلاف ہر اندرونی اور بیرونی سازش کا انھوں نے ساری زندگی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ عالم اسلام کے حوالے سے وہ امریکہ کی یاری اور یلغاری ، دونوں ادوار کے دوران اہل حق اور اہل اسلام کے ساتھ کھڑے رہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے شیدائی رہے اور مشکل کے اس دور میں جہاد فی سبیل اللہ کی حقانیت اور دعوت کی بہت مظبوط دلیل کے طور پر متعارف ہوئے''۔اسلام اور وطن کی آزادی کے لیے لڑنے والے مجاہدین اسلام کے راہ نما کے طور پر پوری آب وتاب کے ساتھ وہ برسوں زندہ و تابندہ رہے۔ جہاد کشمیر اور افغانستان کے صف اول کے سرپرستوں میں آپ سرفہرست رہے ہیں۔ڈاکٹر صاحب سچے معنوں میں ایک مجاہد تھے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک کامل استاد تھے۔ڈاکٹر صاحب قیام پاکستان سے سترہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔اور تحریک پاکستان میں شامل رہے تھے۔وہ ایک سچے پاکستانی ہونے کے ساتھ ایک کامل صوفی اور کامیاب شیخ الحدیث اور نامور محقق تھے۔ محنت ڈاکٹر

صاحب کا شعار تھا۔ جس محنت سے انہوں نے مدینہ یونیورسٹی سے حسن بصریؒ کے تفسیری روایات میں پی ایچ ڈی کرکے عالم عربی و اسلامی میں نام کمایا تھا اسی محنت سے تعلیم وتدریس اور تبلیغ وجہاد میں بغیر میڈیائی تشہیر کے علمی و عملی دنیا میں اپنا لوہا منوایا اور عنداللہ و عندالناس مقبول و معروف ہوئے۔ ان کی محنت اور اخلاص دنیا اور آخرت دونوں میں کام آ گئی۔ اور ان کی علمی کتابیں بہت دیر تک اہل علم کو مستفیض کرتی رہیں گی۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

19 مئی 2011ء کو ڈاکٹر صاحب نے گلگت کا دو روزہ دورہ کیا۔ ان کا یہ دورہ بھی، 18 خالصتاً دینی و مذہبی تھا۔ دنیاوی کوئی اغراض و مقاصد شامل ہی نہیں تھے۔ جامعہ نصرۃ الاسلام کے رئیس قاضی نثار احمد نے انہیں جامعہ میں تقریبِ ختم بخاری میں بخاری شریف کا آخری حدیث کا درس دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس دعوتِ خیر کو بلاچوں وچراں قبول کیا اور اس ضعیف العمری میں گلگت تشریف لائے۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ گلگت میں ان کا ایک شاندار استقبال ہوا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب استقبال کے قطعاً متمنی نہیں تھے۔ ان کی گلگت آمد اور جامع مسجد گلگت میں نماز جمع اور جامعہ نصرۃ الاسلام میں تقریب کے لیے جو اشتہارات اور بینرز تیار کیے گئے تھے وہ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب کی خصوصی ڈیمانڈ پر یہ تمام بینرز اور

پینافلکس میں نے لکھ کر ڈیزائن بھی کروائے تھے۔ مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب کی گلگت آمد کا سن کر پورے گلگت بلتستان سے جید علماء کا ایک جم غفیر جامعہ نصرۃ الاسلام میں جمع ہوا تھا۔ گلگت بلتستان کے علماء کی ایک بڑی تعداد ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ضلع دیامر کے سب سے ذہین اور معمر عالم دین مولانا شیخ الحدیث عبدالقدوس صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ آج سے چالیس سال پہلے ڈاکٹر صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ نصرۃ الاسلام کے مرکزی لان میں ایک اجتماع عام سے تفصیلی خطاب کیا۔ ہزاروں لوگ ان کا خطاب انتہائی انہماکی سے سن رہے تھے۔ میں نے ریڈیو پاکستان کے تین پروڈیوسر دوستوں سے بات کی تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کا پورا خطاب ریڈیو پاکستان سے براہ راست نشر کریں اور ڈاکٹر صاحب سے میں نے ریڈیو پاکستان گلگت کے لیے الگ انٹرویو بھی کرنا تھا۔ پروڈیوسر دوستوں نے اپنے ریجنل ڈائریکٹر سے بات کی تو اس نے اجازت دی اور انہیں جائے اجتماع جاکر تقریر ریکارڈ کرنے کی اجازت دی۔ اسی دوران ڈائیریکٹر نے اپنے ایک دوست کو ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے فون کیا تو اس نے ڈاکٹر صاحب کی تقریر ریڈیو سے نشر نہ کرنے کی تاکید کی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے عملے کو راستے سے واپس بلایا۔ بعد میں اس نام نہاد دیندار آدمی کی اس بونڈی حرکت کا مجھے علم ہوا تو بے حد دکھ ہوا۔

مجھ ناچیز کو ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحبؒ سے دو دفعہ ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ 2006ء کو پہلی بار برادرم محمود الحسن کی معیت میں نوشہرہ میں ان کے گھر جا کر زیارت کی جب ان کے دل کا اپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی۔ دیر تک ان کی نصیحتیں سنتا رہا۔ دوسری دفعہ جب ڈاکٹر صاحب گلگت تشریف لائے تو ان کے پاؤں دبانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ قاضی نثار احمد صاحب بنفس نفیس ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے لیے کھڑے تھے۔ ان کی ہی درخواست پر ڈاکٹر صاحب پہلی دفعہ گلگت تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے عربی زبان میں جامعہ نصرۃ الاسلام کے لیے ایک تصدیقی سرٹیفیکیٹ بھی لکھا اور جامعہ کے نظم و ضبط اور دینی و رفاہی کوششوں کی بھرپور تحسین کی۔ لیٹر پیڈ پر مرقوم شدہ یہ سرٹیفیکیٹ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ان کی عربی دانی پر رشک ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کا عربی میں تحریر کردہ پی ایچ ڈی کا مقالہ علمی دنیا میں اپنا لوہا منوا چکا ہے۔ 30 اکتوبر 2015ء بروز جمعہ کو ان کا انتقال ہوا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن کی موت عذاب قبر سے بھی حفاظت ہے اور سوال قبر سے بھی۔ یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ جمعۃ المبارک کو جہنم میں آگ نہیں بھڑکائی جاتی۔ یہ سعادت بھی ڈاکٹر صاحب کو نصیب ہوئی، زہے قسمت۔ میں ایم فل (M.Phil) کے ٹیسٹ وانٹرویو کے لیے اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ حضرت کی جنازے میں شرکت کی کوئی ترتیب نکل جائے۔ بروز ہفتہ نماز فجر کے ٹائم قاضی صاحب نے فون کیا کہ میں ڈاکٹر صاحب کی جنازے کے لیے پہلی

فلائٹ سے اسلام آباد آرہا ہوں۔ آپ تیار رہیں ساتھ چلیں گے۔ یوں ہم بروقت نماز جنازہ میں شامل ہوئے۔ ان کی نماز جنازہ میں کم از کم دس لاکھ لوگوں نے شرکت کی۔ شاید پاکستان کی سرزمین نے اس سے پہلے اتنا بڑا جنازہ نہ دیکھا ہوا۔ جہانگیرہ سے لے کر پشاور تک جی ٹی روڈ پانچ گھنٹے مسلسل بند رہا۔ نماز جنازے کے بعد ایک دیوار پر چڑھ کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو حیرت کی انتہاء ہوئی کہ چاروں طرف تا حد نگاہ انسانوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا۔ شاید جنازہ گاہ چاروں طرف سے پانچ میل سے زیادہ اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ مولانا سمیع الحق کے بقول جنرل ضیاء الحقؒ کے جنازے سے ڈاکٹر صاحب کا جنازہ بڑا تھا۔ مفتی سیف الدین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے اصرار پر قاضی صاحب نے دارالعلوم حقانیہ کے سربراہ مولانا سمیع الحق اور دیگر اساتذہ سے ان کی آفس میں ملاقات کی اور تعزیت کی۔ ہر ایک مولانا سمیع الحق سے تعزیت کیے جارہا تھا ہم نے بھی تعزیت کی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو مولانا سمیع الحق صاحب بے حد خوش ہوئے اور ان کی شخصیت پر لکھے ہوئے مضمون کی تعریف کی اور کہا کہ ”آپ نے جامع و مانع لکھا ہے۔ اللہ جزائے خیر دے“۔ اپنی کتاب مشاہیر کے خطوط کے دو والیم تحفے میں عنایت کیے اور بقیہ حصے دینے کا وعدہ کیا۔ اور اپنی نئی کتاب مشاہیر کے خطبات کی مکمل سیٹ قاضی صاحب کو بطور تحفہ عنایت کیا اور تمام مہمانوں کو پر تکلف کھانا بھی کھلایا۔ افغانستان سے ہزاروں علماء اور مجاہدین نے ڈاکٹر صاحب کی جنازے میں شرکت کی تھی۔ کئی نامی گرامی

مجاہدین مولانا سمیع الحق صاحب کی دفتر میں نظر آئے۔ مولانا جلال الدین حقانی کے برادر صغیر بھی ڈاکٹر صاحب کی جنازے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے اور مولانا سمیع الحق کے متصل فروکش تھے۔

بہر صورت میں نے اپنی تحریر کو طول نہیں دینا۔ یہ ریکارڈ پر ہے کہ جب ڈاکٹر صاحبؒ گلگت آئے تھے تو گلگت بلتستان کے اخبارات نے ڈاکٹر صاحب کے خطبہ کو شہ سرخیوں میں شائع کیا تھا۔ گلگت کے اہل سنت عوام نے ان کے راہ میں محبت و عقیدت کے پھول نچھاور کیے تھے۔ آج بھی ان کے علمی خطبوں کے زمزمے محسوس کیے جارہے ہیں۔ اپنے عہد کے ایک عظیم انسان وہاں چلے گئے جہاں ہم سب نے جانا ہے۔ 2015ء کا سال افغان مجاہدین کے لیے انتہائی مشکل سال ثابت ہوا ہے۔ ملا عمرؒ، جلال الدین حقانیؒ اور جنرل حمید گل کے بعد افغان مجاہدین کے لیے ڈاکٹر صاحب کی وفات حسرت آیات سب سے تکلیف دہ بات ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک بے لوث سرپرست سے محروم ہوئے۔ اللہ ان کو علیین میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کی طفیل ہم سب کی مغفرت کرے۔ بے شک ڈاکٹر صاحبؒ کے پاس دنیاوی کروفر نہیں تھا مگر ان کا ایمان مضبوط تھا۔ اور ان کا روحانی فیض پورے عالم اسلام کو پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تلامذہ کی تعداد لاکھوں میں ہے جو ان کے فیض کو چہار دانگ عالم پھیلانے میں مصروف ہیں۔ رب مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مغوی انجینئرز..... داریل تانگیر آپریشن.... عوام کا موقف

دیامر کی بدقسمتی یہ ہے کہ چند دہشت گردوں کی وجہ سے گلگت بلتستان کا سب سے بڑا ضلع مسلسل بدنام ہوتا جارہا ہے۔ اس میں کچھ اپنوں کی بے رعنائیاں ہیں تو کچھ غیروں کی ریشہ دوانیاں شامل ہیں۔ خمیازہ دیامر کی عوام نے بھگتنا ہوتا ہے جو کسی صورت مستحسن نہیں۔ ایک طویل عرصے سے باقاعدہ پلان کے تحت دیامر کے حدود میں دہشت گردانہ کاروائیاں کروائی جارہی ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان ظالمانہ کاروائیوں کے پس پردہ کون سی قوت کارفرما ہے۔ کبھی سرراہ مسافروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ کبھی کسی فوجی اور پولیس آفیسر کو قتل کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی تھانے میں حملہ کروایا جاتا ہے۔ کبھی رینجرز کے نوجوانوں پر اٹیک کیا جاتا ہے۔ اور کبھی سیاحوں کو بے دردی سے مارا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک افسوسناک واقعہ گزشتہ دنوں سپیشل کمیونیکیشن آرگنائزیشن کے دو انجینئرز کے اغوا کی شکل میں رونما ہوا۔ اطلاعات کے مطابق چند روز پہلے دن دیہاڑے داریل سوتھے داس میں نصب ایس کام ٹاور میں آنے والی فنی خرابی ٹھیک کرنے کے لیے گئے ہوئے ایس سی او (SCOM) کے دو انجینئروں محمد امجد اور عیسٰی بیگ کو 10 سے زائد نامعلوم مسلح دہشت گردوں نے اغوا کیا۔ اور داریل کے پہاڑیوں میں روپوش ہوگئے ہیں ۔ جبکہ ٹاور پر چوکیداری کے فرائض سرانجام دینے والے عبدالحفیظ کو رسیوں سے باندھ

دیا گیا۔اغوا کئے گئے دونوں انجینئرز کا تعلق گلگت بلتستان سے ہے، جن میں ٹیکنیشن عیسیٰ بیگ گلگت سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ محمد امجد کا تعلق بونجی استور سے ہے۔

گزشتہ کئی دنوں سے اس موضوع پر لکھنا چاہ رہا ہوں مگر لکھنے کی جسارت نہیں کرپا رہا۔ تین دن قبل گلگت بلتستان کے ہائی پروفائل لوگ تانگیر میں جمع ہوئے۔ ضلع دیامر کے تمام ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو باقاعدہ شرکتِ یقینی کا لیٹر ایشو کیا گیا۔ چیف سیکرٹری، آئی جی پی، رینجرز اور جی بی اسکاؤٹ کے کمانڈرز اور فورس کمانڈر گلگت بلتستان کے ساتھ وزیراعلیٰ گلگت بلتستان بنفس نفیس تانگیر پہنچے۔ عوام، عمائدین جرگہ، دیامر کے سیاستدان اور علماء کرام نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ دیامر کی عوام انتہائی خوش تھی کہ ان کے تمام بڑے ایک جگہ جمع ہیں۔ لیکن دیامر کی مظلوم عوام نے اپنے بڑوں کا خدائی لہجہ دیکھا تو سخت مایوس ہوئے۔ فورس کمانڈر اور وزیراعلیٰ کے خیالات سن کر عوام ششدر گئی۔ جن سے محبتیں اور تحفظ جان و مال اور عزت و آبرو کی امیدیں تھی انھوں نے آئی ڈی پیز بنانے کی دھمکی دی۔ سوات اور وزیرستان کے حوالے دیے۔ مولوی فضل اللہ اور اس کے متعلقین کی طرح نیست و نابود کرنے گل افشانیاں کی۔ یقیناً دیامر بالخصوص داریل تانگیر کے عوام نے اس کرخت لب و لہجے کو پسند نہیں کیا۔ ہمیں بھی ان کے بیانات، اخبارات میں پڑھ کر عجیب احساس ہوا.... اور

ملک مسکین کے کھرے اور سچے الفاظ پر خوشگوار حیرت بھی ہوئی، کیونکہ سب کو آئینہ دکھایا۔ ملک مسکین نے واضح طور پر کہا کہ جہاد کے چمپیئن بننے والے آج دوغلا کردار ادا کر رہے ہیں۔ سرکار اور دہشت گردوں کے ساتھ .برابر کی ڈیلنگ کر رہے ہیں جو کسی صورت دیامر اور بالخصوص داریل تانگیر کے عوامی مفاد میں نہیں۔اور انتظامیہ بھی انہی کے ٹاؤٹ بنی ہوئی ہے۔

اس مخدوش صورت حال کا تفصیلی جائزہ مجھے خود داریل جاکر لینے کا موقع ملا۔ محترم مولانا عبدالحلیم و برادرم عبدالخبیر صاحب کی والدہ ماجدہ کی نماز جنازے میں شرکت کے لیے داریل جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں دو دن عوام وخواص اور علما و عمائدین اور ذمہ دار شخصیات سے مغوی انجینئرز، چند دہشت گردوں کی ظالمانہ کاروائیاں اور فورس کمانڈر و وزیر اعلیٰ کی پورے داریل تانگیر کے لاکھوں عوام کو آئی ڈی پیز بنانے ، نیست ونابود کرنے اور نسلوں تک ملیا میٹ کرنے کے حوالے سے تفصیلی گفت وشنید ہوئی۔یقیناہر ایک کی زبان پر یہی ایک جملہ تھا کہ پانچ دہشت گردوں کی وجہ سے دو ویلیز میں اپریشن کرنا قرین انصاف نہیں۔ ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ حکومت خود ان دہشت گردوں کی پشت پناہ ہے۔یہ دہشت گرد حکومت کے وظیفہ خوار ہیں۔ حکومت اور مقتدر طبقات مخلص ہوتے تو آج وہ چند لوگ پھانسی پر لٹکے ہوتے۔حکومت کے اعلامیہ کے مطابق پورے دیامر میں 14 لوگ مفرور دہشت گرد ہیں۔ ان 14 مفروروں کی وجہ سے پورے دیامر

والوں کو بدنام کرنا نہ میڈیا کو زیب دیتا ہے نہ ہی حکومت کو کہ وہ بے گناہ اور بے قصور لوگوں کو تنگ کرے۔ پورے دیامر کی عوام حساس اداروں، مقتدر طبقات اور انتظامیہ سے گزارش کرتی ہے کہ اسلامی تعلیمات، آئین پاکستان اور قانون کے مطابق ان 14 مفروروں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچائے۔ خدارا! خدائی لہجے میں بات نہ کریں۔ غیر آئینی اور غیر قانونی اقدامات اٹھا کر 14 کی بجائے ایک لاکھ چودہ افراد کو دہشت گرد نہ بنائیں۔ دیامر کے لوگ پاکستانی ہیں۔ محب وطن ہیں۔ ہمیشہ سے ملک وملت کی سربلندی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ کشمیر کی آزادی کے لئے فوج کے شانہ بشانہ لڑے ہیں۔ ہمیشہ فوج کو بڑا بھائی تصور کیا ہے۔ اپنی مشکل کی آخری لاٹھی فوج کو ہی سمجھا ہے۔ یقیناً وہ افواج پاکستان سے پر اُمید ہیں۔

حکومت اور حساس اداروں کو بہرحال اپنی رٹ قائم رکھنا چاہیے۔ دیامر کوئی علاقہ غیر نہیں کہ وہاں کے عوام حکومتی راہ میں مزاحمت ہوں۔ عوام نے ہر دور میں حکومت کی راہ میں دل بچھا دیے ہیں۔ انتظامیہ کا یہ رویہ کہ غریب عوام کو ہفتوں کی الٹی میٹم دینا کسی صورت جائز نہیں۔ آئین پاکستان، اسلامی تعلیمات اور خود پاکستانی قانون اور انٹر نیشنل لاز بالخصوص انسانی حقوق کے عالمی چارٹر میں یہ بات طے کہ ہے مجرم کے جرم کی سزا کسی بے قصور انسان کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہاں تک اس کے باپ اور بیٹے کو بھی نہیں دیا جاسکتا۔ حکومت

کو چاہیے کہ ان تمام مفروروں کو پکڑے۔ نیشنل ایکشن پلان کے مطابق ان کو سزائیں دیں۔کیا دیامر کی عوام نے انہیں ایسا کرنے سے روکا ہے؟ یہ کہاں کا قانون ہے کہ غریب لوگ جو تمام تر حربی و تیکنیکی آلات سے خالی ہیں ان کو یہ کہنا کہ ہفتے کے اندر مجرم ہمارے حوالے کرو۔ میاں! مجرم کو پکڑنا اور قانون کے مطابق کیفر کردار تک پہنچانا حکومت کا کام ہے نہ کہ عوام کا۔ عوام کا تو مشترکہ مؤقف ہے کہ ان کو پکڑ کر پھانسی لگادو۔اپنی کمزوریاں چھپانے کے لیے عوام کو ہراساں کرنا آئین پاکستان اور انسانی حقوق کے خلاف ورزی ہے۔اور کم از کم سرکار کو آئین کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے ۔ غیر آئینی اقدامات سے گریز کرنا چاہیے۔یہاں ایک انتہائی اہم گزارش دیامر اور داریل تانگیر کے جرگے سے کرنی ہے۔ان کو یہ بات سمجھ آنی چاہیے کہ وہ مذاکرات کے نام پر داریل تانگیر میں آپریشن کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ایسے سینکڑوں مذاکرات اور معاہدوں کا انجام سوات، وزیرستان اور وانا میں دیکھا گیا ہے جس کا لازمی انجام عوام کی بربادی کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔علماء و عمائدین کو دوٹوک مؤقف اختیار کرتے ہوئے انتظامیہ اور حساس اداروں کو بتانا چاہیے کہ اپنی رٹ بحال کرو اور دہشت گردوں کو پکڑ کر نیشنل ایکشن پلان کے مطابق کاروائی کرو۔ یاد رہے بصورت دیگر داریل تانگیر کے لاکھوں آئی ڈی پیز اور بے قصور عوام کی بددعائیں انتظامیہ کے ساتھ علماء و عمائدین کو بھی ملیں گی جو ان کی دونوں جہانوں کو برباد کرنے کے سبب ہونگی۔ عجیب بات یہ ہے کہ حساس اداروں

کے ٹیکنکل ماہرین آخری وقت تک اغواکاروں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور دیامر پولیس کو کاروائی کرنے کے احکامات صادر کرتے رہے، کیا جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ادارے اغواکاروں کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے؟۔ بالآخر اغواکاروں نے اپنی موبائل سم نکال لیے اور ٹیکنکل ماہرین کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے۔ بہر صورت داریل تانگیر کی عوام کا اجتماعی مؤقف، جو بلاکم وکاست آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

اساتذہ کرام سے ملاقات کی سبیل

میری زندگی کے سات بہترین سال جامعہ فاروقیہ کراچی میں گزرے ہیں۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اب تک کی تیس سالہ زندگی کے بہترین دن گلشن سلیمی میں گزرے ایام ہیں۔ یہ درجہ خامسہ کی بات ہے کہ ہمارے شعبہ معہد اللغۃ العربیہ (عربی ڈیپارٹمنٹ) میں ایک طالب علم وارد ہوئے۔ شعبہ عربی میں تمام تر تعلیم وتدریس اور لکھت پڑھت عربی زبان میں ہوتی ہے لیکن یہ نوارد، اردو کا زیادہ ذوق رکھتا تھا۔ اور یہی خبط مجھے بھی تھا اس لیے جلد ہی ہماری دوستی ہوئی اور ہم نے اردو ادب کے حوالے سے طویل گفتگوئیں کی۔ جامعہ کے شعبہ دیواری مجلات کی صحافت میں، میں پہلے سے ایڈیٹو تھا۔ ایک مجلّہ ''ماہنامہ طلوع سحر'' میری ادارت میں نکلتا تھا۔ اور دوسرا مجلّہ ''ماہنامہ تعمیر ملت'' برادرم ابراہیم عابدی کی مشاورت و ادارت میں نکلتا رہا۔ یہ سلسلہ کئی سال چلا۔ ہمارے بعد دوسرے طلبہ نے ان مجلات کی ادارت سنبھالا۔ دینی مدارس میں دورہ حدیث کا سال انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کلاس فیلوز کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی ہے۔ بڑے اساتذہ کے ساتھ تعلق بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے برادرم ابراہیم عابدی سے ایک آئیڈیا شیئر کیا۔ آئیڈیا یہ تھا کہ اساتذہ کے حالات زندگی اور ان کی لیکچرز پر مبنی ایک مختصر کتاب ترتیب دی جائے اور دورہ حدیث کے

ساتھیوں کے ایڈریسز اور رابطہ نمبرز بھی کتاب کا حصہ بنایا جائے۔ پھر کیا تھا عابدی صاحب نے اس نہج پر کام کیا اور بہت قلیل عرصے میں ایک بہترین کتاب مرتب کی اور دورہ حدیث کے سال کے اختتام سے پہلے پہلے کتاب چھپ کر تقسیم ہوئی اور اپنے لیے خوب جگہ بنالی۔ اب کی بار دوبارہ کتاب کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ بہت ساری چیزوں میں اضافہ کیا۔ بالخصوص استاد محترم حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم شیخ الحدیث وبانی جامعہ فاروقیہ و صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان) کے حوالے) سے بہت سی خوبصورت معلومات اور حضرت کے ارشادات کتاب کا حصہ بنایا۔ عابد نے مجھے حکم دیا کہ ''کتاب کو پڑھ کر کوئی تبصرہ کریں''۔ کتاب کی نیو اٹھان دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ میرے جیسے ہزاروں میل دور رہنے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب واحد سبیل ہے جس کے ذریعے اپنے کبار اساتذہ سے ملاقات ممکن ہے۔ کتاب کی مطالعہ نے طالب علمی کے حسین ایام یاد دلائے۔ اپنے اساتذہ کرام کے پرنور چہرے دل و دماغ کی سکرین پر نمودار ہوئے۔ اساتذہ کے حالات، ان کی علمی ظرائف اور چٹکیاں اب بھی ہنسنے پر مجبور کررہی ہیں۔ دورہ حدیث کے سال کے اساتذہ کرام کی نصائح کا بڑا حصہ بھی کتاب میں شامل کیا گیا جو بہت مناسب ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا تو عابدی صاحب نے مجھ طالب علم سے کتاب کے لیے ایک تقریظ لکھوائی

قرار دیا تھا۔میں آج بھی (Legend) تھی۔میں نے انہیں دورہ حدیث کا ادبی لیجنڈ
اپنی اس رائے کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں اپنے دورہ حدیث شریف کے ساتھیوں کا
ادبی جھومر کہتا ہوں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ پانچ سو سے زائد صاحبان درس میں واحد
عابدی ہے جو قلم کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔تاہم کچھ دوستوں نے دو چار
کتابیں جمع کرکے پانچویں کتاب تیار کرلی ہے لیکن ایسی کتابوں کی عمر اور ادبی وقعت زیرو
فیصد ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ عابدی صاحب کہ یہ نئی کتاب بھی خوب پڑھی جائے
گی۔ان کا تحریری اسلوب خوب ہے۔ تحریر میں شائستگی اور سنجیدگی بھری ہوتی
ہے۔میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کا طرز تحریر نہ خشک ہے کہ بندہ اکتاجائے اور نہ اتنا
فحش ہے کہ سنجیدہ لوگ پرے پھینک دیں۔خشک صوفیانہ اسلوب اور فحش ادیبانہ انداز
سے انہوں نے اپنے آپ کو بچا رکھا ہے جو شاید آج کی سب سے بڑی ضرورت بھی
ہے۔عابدی کی کاوش کو اساتذہ کرام تحسین بھی نظر سے دیکھیں گے اور دعائیں دیں
گے۔

میں اپنے تمام دوستوں سے اور جامعہ فاروقیہ کے طلبہ وفضلاء اور کتاب دوست
انسانوں سے گزارش کرتا ہوں کہ ایک دفعہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔میں آپ کو
یقین دلاتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کو بہت کچھ دے گی۔ثابت قدم رہنے کا اسلام میں
بڑی اہمیت ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے آپ میں ثابت قدم رہنے کے جراثیم پیدا
ہونگے، برابر متحرک اور سرگرم رہنے کا جذبہ بیدار ہوگا، انتظار کی

گھڑیاں کتنی لمبی ہوں مگر آپ ہیں جہد مسلسل اور ہمت نہ ہارنے کا عزم برابر بڑھتا رہے گا اور آپ اپنے لیلائے مقصود سے ہمکنار ہو کر رہیں گے۔آپ میں قربانی کا جذبہ بھی بیدار ہو گا۔اپنے لیلائے مقصود کے لیے جان، مال، وقت اور زندگی غرض اپنی کُل کائنات صَرف کرنے کا شوق پیدا ہو گا۔مغربی افکار و تہذیب کے مسحور کن بلکہ تباہ کن نعروں کی زد میں آنے والے نوجوان نسل کی اصلاح کا سبب بھی بن جائے گا جو اکابرین کی پگڑیاں اچھالنے میں پیش پیش ہے۔آپ کو اپنے اساتذہ سے ملوائے گی۔طالب علمی کے حسین ایام کو یاد دلائی گی۔اور آپ کو احساس بھی دلائی گی کہ کیا واقعی آپ نے اپنی عملی زندگی میں کچھ کیا ہے کہ نہیں۔مجھے مکمل امید ہے کہ اس کتاب کو اہل فکر و نظر اور صاحبان بست و کشاد میں خصوصی پذیرائی نصیب ہو گی۔یہ کتاب کبار اساتذہ کی گلہائے رنگارنگ زندگی کے مضامین کا ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جو روح و قلب اور دل و دماغ کو برسوں معطر کرتا رہے گا۔

ایک ترقی پذیر قوم کے لیے بے تحاشا عزم ویقین اور ابے پناہ جوش وجذبے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔قرآن کریم نے کسالت پسند اور بے جان قوم میں زندگی کی امنگ، یقین و عزم کا ولولہ پیدا کرنے کا باربار حکم دیا ہے۔اور اس نے ناامیدی کو گمراہی اور یاس کو کفر کہا ہے۔تو اس کتاب میں اساتذہ کرام بالخصوص رئیس المحدثین شیخ سلیم اللہ خان دامت فیوضہم کی نصائح اور

الوالعزم کہانیاں،اور پُر کیف اور پُر کھٹن زندگی کا مطالعہ ہماری زندگی بدلنے میں مفید ثابت ہو نگی اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انڈیا کا ایک مہاجر پاکستان میں کیسے سب سے بڑا شیخ اور مرجع خلائق بنا اور کن کن گھاٹیوں سے گزر کر لیلائے مقصود سے ہمکنار ہوا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

بہر صورت ہزاروں میل دور گلگت بلتستان کے ایک دورہ افتادہ گاؤں کے باسی امیر جان حقانی) کی.برادرم عابدی کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ انہیں کی) توسط سے آج اساتذہ کے ساتھ تفصیلی ملاقات ہو رہی ہے۔ یا اللہ میرے اساتذہ کرام، جامعہ فاروقیہ اور.برادرم عابدی کو اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازے۔ امین یارب العالمین

بتاریخ: تین دسمبر دو ہزار پندرہ

پروفیسروں کا المیہ

آج میں ایک ایسا خط شائع کرنے جارہا ہوں جو میرے خلاف ہے، میری پوری کمیونٹی کے خلاف ہے۔اپنے خلاف کوئی تحریر شائع کرنا بہت مشکل ہے بلکہ آج کے دور میں ناممکنات میں شامل ہے تاہم میں یہ رسک لینے جارہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے احباب خوش دلی سے ان فرمودات کا سامنا کریں گے اور اگر واقعتاً ان باتوں میں صداقت ہے تو اپنی اصلاح فرمائیں گے۔انشاء اللہ

السلام علیکم ! امید ہے آپ خیرت سے ہونگے۔ محترم حقانی صاحب ! میں آپ کا'' پرانا قاری ہوں، آپ کی تحریریں اخبارات اور سوشل میڈیا میں پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ سماجی، سیاسی اور تعلیمی مسائل پر آپ کی رائے کا احترام معتبر حلقوں میں کیا جاتا ہے۔آپ چھوٹے چھوٹے عوامی مسائل کو بھی اجاگر کرتے ہیں مگر پانچ سالہ طویل عرصہ گزارنے ، اور سب کچھ جاننے کے باوجود بھی اپنی برادری کے متعلق ایک حرفِ شکایت نہ لکھنا حیرت سے خالی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج آپ سے مخاطب ہوجاؤں اور آپ سے آپ کی شکایت کروں، آپ کی برادری کی شکایت کروں،آپ تمام پروفیسروں اور لیکچراروں کو آئینہ دکھاؤں، تاہم مجھے یہ یقین ہے کہ آپ میرے اس ، تحریر کردہ خط کو اپنے کالم میں شائع نہیں کریں گے

وجہ صاف ظاہر ہے کہ آپ اپنے خلاف اور اپنی چہیتی برادری کے خلاف اپنے کالم میں جگہ دے ہی نہیں سکتے۔یہ آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ اپنا احتساب سب سے مشکل ہے اور اپنے متعلق حقائق عامۃ الناس تک پہنچانا کوئی نہیں چاہتا اور نہ ہی کوئی ان حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔آپ میرے تلخ حقائق کو اپنے کالم میں جگہ دیں یانہ دیں میں آپ کو لکھ کر اپنا فرض ضرور ادا کرونگا۔اور جلد گلگت بلتستان کے ٹیچروں کی کارستانیوں اور لاپرواہیوں پر مشتمل تفصیلات بھی آپ کو تفصیل سے لکھ کرارسال کرونگا۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ گلگت بلتستان کے تمام پروفیسرز اور لیکچرار اپنے فرائض منصبی سے انصاف نہیں کرتے۔اکثر کالجز میں پانچ ماہ سے کم درس وتدریس کا سلسلہ چلتا ہے اور اس قلیل وقت میں بھی یہ حضرات حاضر نہیں ہوتے ہیں یایکسوئی اور ایمانداری سے تیاری کرکے نہیں پڑھاتے ہیں۔جتنی کوشش ایگزام لینے اور اسمنٹ کرنے کے لیے کرتے ہیں اس کا عشرہ عشیر بھی پڑھانے کے لیئے نہیں کرتے۔بہت سارے پروفیسرز اور لیکچرار کالجز جانے کے بجائے پیپرزچیک کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں اور درجنوں کی تعداد میں یہ حضرات دوران تدریس اوٹ اسٹیشن ایگزام ڈیوٹیاں لگواتے ہیں اور کلاسیں ضائع کرکے امتحان لینے کے لیے دور دور علاقوں میں چلے جاتے ہیں اگرانہیں یہ کہا جائے کہ ان علاقوں کے کالجز میں پڑھانے کے چلے جاؤ توان کی جان نکلتی ہے اور

ہزاروں بہانے بناتے ہیں اور ہر قسم کا سیاسی و مذہبی سورس لگاتے ہیں کہ ان کا فورا تبادلہ ہوجائے۔کیا یہ سچ نہیں ہے؟۔پروفیسروں اور لیکچراروں کی اسمنٹ اور ایگزام ڈیوٹی کے لیے کوششوں کو دیکھتا ہوں تو ہنسی آجاتی ہے کہ یہ لوگ ایک ایگزام ڈیوٹی کے لیے برادری کے دوسرے پروفیسرز اور لیکچرارز کے بارے میں کیا کیا سازشیں بنتے ہیں اور من گھڑت کہانیاں بناتے ہیں اور ہر قسم کے کارڈ کھیلتے ہیں جن میں مذہبی،علاقائی، لسانی اور تعصب کارڈ سرفہرست ہیں۔پرنسپل شپ کے لیے لڑنا تو معمول کی بات ہے اور پسندیدہ اسٹیشنوں میں ٹرانفسری اور پرنسپل بننے کے لیے پروفیسر برادری کونسا حربہ ہے جو استعمال نہیں کرتی؟اور ہاں اسمنٹ میں ہیڈ بننے کے لیے ایک دوسروں پر ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں اور گالیاں بھی دیتے ہیں اور کالجوں میں پڑھانے کے بجائے دفتروں میں کلرک بننے کا رجحان سینئر پروفیسروں اور لیکچراروں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہر ممکن تگ و دو بھی کرتے ہیں۔

حقانی صاحب! ایمانداری سے بتایں کہ کیا آپ کی برادری کے لوگ اپنے پیشے کے ساتھ انصاف کرتے ہیں؟یقینا جواب نفی میں ہے۔ طلبہ کو مطمئن کرنا اور ان کے اشکالات و اعتراضات کا مسکت اور درست جواب دینا گلگت بلتستان کے کالجز میں رواج ہی نہیں، وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے لیے پروفیسروں کو مطالعہ کرنا ہوتا ہے جو وہ قطعاً نہیں کرتے؟۔ مجھے دوچار کے علاوہ کوئی پروفیسر ملا ہی

نہیں کہ جو کتاب دوست ہو، اپنے پاس کتابیں جمع کرتا ہو، اچھی گاڑی اور اچھے کپڑے پہننے میں ایک دوسروں سے سبقت ضرور لے جائیں گے مگر اچھی کتاب خریدنے یا پھر کسی لائیبریری سے ایشو کرواکر پڑھنے کی جسارت کوئی نہیں کرتا۔ تین سو افراد پر مشتمل اس پوری برادری میں کتنے لوگ ہیں جنھوں نے تحقیق و تفتیش کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے؟ کتنے ہیں جو ایم فل اور پی ایچ ڈی کرتے ہیں؟ کتنے ہیں جو تحقیقی مقالے لکھتے ہیں اور علمی و ادبی مجلسوں میں پیش کرتے ہیں؟ ایک بھی نہیں نا؟ اور ہاں کتنے لوگ ہیں جو سماجی و معاشرتی مصلح بن کر قوم کی رہنمائی کرتے ہیں؟ اور تو اور آج کے جدید دور میں آپ کی برادری کے اکثر لوگ انٹرنیٹ سے بھی واقف نہیں، اخبار تک نہیں پڑھتے چہ جائیں کہ اخبار میں کوئی فیچر، کالم یا مضمون لکھیں، آپ کی دو درجن سے زائد کالجوں سے ایک بھی میگزین نہیں نکلتا حالانکہ طلبہ سے میگزین کی مد میں لاکھوں فیس وصول کی جاتی ہے۔ مجھے انصاف سے بتاؤ کہ آپ کی پوری برادری نے کتنی ادبی، علمی اور قلمی کانفرنسیں کروائی ہے اور محفلیں منعقد کی ہیں؟ ایک بھی نہیں۔ کسی ادبی، علمی اور سماجی مجلس میں پروفیسروں کا کنٹری بیوشن زیرو فیصد ہے۔ ریڈیو پاکستان، ایف ایم چینل اور ٹی وی میں کتنے پروگرامز کرتے ہیں؟۔ یہ سچ بھی غور سے سن لو کہ دنیا میں لوگ تحقیق، تالیف، اور علمی مقالے لکھ کر پروفیسر بن جاتے ہیں مگر گلگت بلتستان میں آپ کی برادری کے لوگ گریڈ ۱۸ اور ۱۹ حاصل کرکے پروفیسر بن جاتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھتے

ہیں۔کچھ لوگ شاعری کرتے ہیں اور کچھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ ان کی شاعری اور تحریریں سرقہ شدہ ہوتی ہیں۔دوسروں کے الفاظ، تراکیب اور ادبی جملے اور خیالات چرا کر شاعری کرنا، تحریریں لکھنا اور کتابیں تالیف کرنا یقینا علمی وادبی دنیا میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔معاشرہ پروفیسروں سے کچھ امیدیں رکھتا ہے مگر آج تک ان کی امیدیں بھر نہیں آتی۔کتنی کتابیں ہیں جن کا ترجمہ گلگت بلتستان کے پروفیسروں نے کی ہیں حالانکہ میں درجن سے زائد لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے بہترین کتابوں کے ترجمے کیے ہیں جو پروفیسر نہیں۔آپ لوگ اپنی نجی محفلوں میں ہر ایک کو لتاڑتے رہتے ہو مگر آپ سے ایک بھی ادبی اور علمی و صحافتی اور تحقیقی کام نہیں ہوتا۔کیا آج تک تعلیم میں بہتری، معاشرے میں انصاف، سماجی ہم آہنگی، اور اداروں کی ترقی اور علاقے کی بھلائی کے لیے آپ کی برادری نے کوئی رہنمائی کی ہے؟ کوئی پلا ن تیار کرکے حکومت کو دیا ہے کہ وہ اس کو نافذ کرے؟۔ہاں یہ تو دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ نے اپنی پروموشن، ٹائم سکیل کی منظوری اور دیگر مالی مفادات کے حصول کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی ہر کوشش کی ہے اور کالجوں میں ہڑتالیں کروائی ہے اور طلبہ کا وقت ضائع کیا ہے۔آپ حضرات کی ایک ایسوسی ایشن بھی ہے جو ابھی تک رجسٹرڈ ہی نہیں۔ایسوسی ایشن کی ماضی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کا واحد مشن یہ ہے کہ فلاں کی ٹرانسفری فلاں جگہ ہوجائے۔ ٹائم سکیل مل جائے۔ فلاں کی ایگزام ڈیوٹی لگائی

جائے اور فلاں کی نہ لگائی جائے۔ اسمنٹ ریٹ بڑھایا جائے اور سپلیمنٹری میں صرف فلاں فلاں کو بلاؤ۔ اس کے لیے ایک دوسروں کی شکایات کا انبار لگاتے ہیں اور اپنے مقام سے بہت نیچے گر جاتے ہیں۔ صرف اور صرف ذاتی مفاد کے لیے کوئی شین بنتا ہے کوئی یشکن بنتا ہے کوئی بلتی بنتا ہے کوئی گلگتی بنتا ہے اور کوئی مذہبی کارڈ استعمال کرتا ہے کوئی لسانی داؤ کھیلتا ہے اور کوئی دوستی کا واسطہ دیتا ہے؟ آپ لوگ ایسوسی ایشن کے الیکشن کرواتے ہو اور ہارنے والا پینل جیتنے والے پینل کو ہر قسم کے برے القابات سے نوازتا ہے اور اس کی جیت تسلیم ہی نہیں کرتا باوجودیکہ اپنے آپ کو سوشل بھی کہلاتا ہے۔

میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر آپ لوگ اپنے پیشے اور علاقے کے ساتھ مخلص ہوتے تو یہاں سماجی اور تعلیمی انقلاب برپا ہو جاتا۔ آپ سماجی، فلاحی، تعلیمی اور ادبی و تحقیقی مجلسیں منعقد کرتے اور نوجوان نسل کی درست سمت رہنمائی کرتے اور انہیں شعور و آگاہی دیتے۔ حکومت کے لیے شفاف تعلیمی اور معاشرتی پلان تیار کرکے دیتے۔ ادبی و تعلیمی جرائد نکال کر ہزاروں نوجوانوں کو قلم وکتاب دوست بناتے اور جدید دور کی چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے انہیں تیار کرتے مگر آپ کے پاس ان چیزوں کے لیے ٹائم ہی نہیں۔ کوئی لکڑیاں فروخت کرتا ہے۔ کوئی چکی پیتا ہے۔ کوئی لوہا بیچتا ہے کوئی چیری کا کاروبار کرتا ہے۔ کوئی اسٹیشنری کی دکان لگاتا ہے۔ کوئی سیپ بیچتا ہے کوئی کاسمیٹکس کی دکان سجاتا ہے۔ کسی

نے اسمنٹ کو کمانے کا ذریعہ بنایا ہے کسی نے ایگزام ڈیوٹیوں سے ڈالر بنانے کا گُر سیکھا ہے۔ کسی نے قیمتی پتھر خریدنے کا دھندا اپنایا ہوا ہے۔ کسی نے این سی پی گاڑیوں کا کاروبار شروع کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سیخ پا ہونے کے بجائے میرے بیان کردہ تلخ حقائق پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور ایک پروفیسر کا کردار ادا کریں گے۔ یاد رہے کہ اگر آپ کی حالت نہ بدلی تو گلگت بلتستان کے عوام آپ کو بھی ٹیچر ایسوسی ایشن کی طرح ایک پریشر گروپ سمجھیں گے''۔

نوٹ: گلگت بلتستان پروفیسر اینڈ لیکچرار برادری کا کوئی فرد اگر اس کا جواب لکھنا چاہتا ہے تو پلیز لکھ کر مجھے ارسال کریں میں اپنے کالم میں شائع کرونگا اور میں خود بھی پروفیسروں اور لیکچراروں کی حمایت میں لکھونگا اور بہت ساری غلط فہمیوں کو دور کرونگا۔ انشاء اللہ۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

پروفیسروں کے امتیازات

میرے گزشتہ مکتوب نما مضمون'' پروفیسروں کا المیہ ''کے اشاعت کے بعد اہل علم و قلم احباب کی طرف سے چند خطوط موصول ہوئے۔ ان میں چند مکتوبات تو انتہائی تلخی اور سنجیدگی سے لکھے گئے ہیں مگر یہ خیانت ہوگی کہ ان کو من و عن شائع نہ کیا جائے۔ پہلے والا مکتوب بھی بلاکم وکاست احباب اور قارئین کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اب کی بار بھی ان تینوں خطوط کو تلخیوں اور سنجیدگیوں سمیت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ پسند فرمائیں گے اور پروفیسروں اور لیکچراروں کے حوالے سے پائے گئے خدشات وابہامات کو دور کرنے اور ان کی علمی و قلمی وجاہت کو منظر عام پر لائے کے لیے یہ خطوط مفید ثابت ہونگے۔

پروفیسر برادری کا ایک انتہائی انٹیلکچول اور میرے پرانے قاری کا ایک خط موصول ہوا۔ وہ ایک با کردار استاد ہونے کے ساتھ صاحب کتب ہیں۔ کئی ادبی کتابیں منظر عام پر آئیں ہیں اور علمی مجلات میں ان کے مضامین مسلسل شائع ہوتے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ میری تحریروں کو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں اور اصلاح فرماتے ہیں۔ ان کا خط من و عن شائع کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

السلام علیکم ! امید ہے آپ خیریت سے ہونگے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ''
رویوں کا جنگل ہے۔اس میں ہر طرح کے درخت ہوتے ہیں۔ پھل دار بھی،کانٹے دار
بھی۔ مفید بھی ضرر رساں بھی۔ کہیں ببول کے کانٹے چبھتے ہیں، کہیں مخملی گھاس سے
راحت ملتی ہے۔ہم اپنے مزاج کے مطابق انہیں پسند، ناپسند کی سند تو دے سکتے ہیں مگر
فتویٰ کی بھینٹ چڑھا کر دوسروں پر مسلط نہیں کر سکتے۔وجہ....؟ وجہ یہ کہ ضروری
نہیں ایک چیز جو مجھے ناپسند ہے دوسرے بھی ایسا سوچتے ہوں۔ضروری نہیں ایک بات
میں جانتا ہوں تو وہ سچ بھی ہو۔ضروری یہ بھی نہیں کہ کچھ لوگوں میں کوئی خامی ہو تو
وہ سب میں پائی جائے۔آپ کا کالم "پروفیسروں کا المیہ " پڑھنے کے بعد مجھے سمجھ نہیں
آرہی اسے اچھا کہوں یا برا۔ میں کنفیوز ہوں اسے مفید کہوں یا مہلک۔کیوں کہ ایک
سنجیدہ موضوع پر آپ نے نہایت عامیانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔استاد قومی تعمیر اور
معاشرتی ترقی کا بہت ہی اہم کردار ہے۔ہر باشعور انسان ان کی اہمیت اور قدر سے
واقف ہے۔لیکن انسانی رویوں کے جنگل میں کبھی ان میں بھی لوگ بھٹک جاتے
ہیں۔اپنے پیشے سے اپنے فرض سے غافل لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔آپ نے اپنے
مضمون میں جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے یقینا" ان میں سے بہت سی باتیں سچ بھی
ہیں۔اور ان سے بھی بڑا سچ یہ ہے یہ خامیاں سب میں نہیں۔ میں پھر دوہراتا ہوں ان
کی تعداد 20 فیصد سے کم ہے۔ایسے میں عمومی مثالوں کے ذریعے سب پر خامیوں

کا کیچڑ تھوپنا ایک صحافیانہ سنسنی خیزی تو ہو سکتی ہے۔ کسی ذمہ دار قلمکار کی سچ بیانی نہیں۔اور یہ بھی مت بھولیں آپ خود بھی اسی پیشے سے منسلک ہیں ۔اگر آپ نے خود کو آئینہ بنا کے یہ سب لکھا ہے تو یہ گمان نا کریں سب اس میں مبتلا ہیں۔آپ کے کالم کے آغاز میں ہے "گلگت بلتستان کے تمام پروفیسرز اور لیکچررز اپنے فرائض منصبی سے انصاف نہیں کرتے" اس جملے میں لفظ "تمام" کو آپ ثابت نہیں کر سکتے۔ میں بھی آپ کی تحریریں پڑھتا ہوں ۔ میں جانتا ہوں آپ چیزوں کو سمجھتے ہو۔ مگر اکثر اوقات نا سمجھی میں بہت سی ناگفتنی بھی کہہ جاتے ہو۔اپنی رائے کو دوسروں پر فیصلہ بنا کے تھوپتے ہو اور اس پر اڑ بھی جاتے ہو۔ یہ کچھ لوگ برداشت کر سکتے ہیں لیکن میڈیا کے ذریعے اسے سب سے منوانا حماقت ہے اور یہ خبط آپ میں ہے۔ کچھ لوگوں کی غیر نصابی سرگرمیوں کو ایک مجموئی رنگ دے کر سرکاری کالجز کے اساتذہ کی ساکھ اور نیک نامی کی جو دھول اڑائی ہے اس کے کتنے بھیانک سماجی اثرات پڑ سکتے ہیں کیا آپ سمجھ سکتے ہیں؟؟؟ کتنے ہی مخلص، ہمدرد اور بہترین اساتذہ کے کردار کو کیسا آپ نے داغدار کیا ہے؟کیا اس کی تلافی ممکن ہے؟ معاشرے میں لیکچررز اور پروفیسرز کی جو عزت ہے، جو ٹرسٹ ہے آپ کی اس قلمی مہم جوئی سے اس کو کتنا نقصان پہنچا ہے آپ کو سمجھ ہے؟؟؟ امید ہے آپ کو پہلے نہیں تو اب سمجھ آئے گی۔آپ نے جوش میں آکر ڈھول تو پیٹا ہے مگر سب میں اس کو ثابت نہیں کر سکیں گے۔اور یہ آپ جانتے ہیں ڈھول باہر سے جتنا ڈھم ڈھم۔۔۔۔اندر سے اتنا ہی کھوکھلا ....

والسلام آپ کا خیر اندیش''۔

ایک اور خط بھی موصول ہوا۔ یہ خط بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں

حقانی صاحب آپ کے گزشتہ کالم'' پروفیسروں کا المیہ'' میں ایک خط پڑھ کر'' صاحبِ خط اور آپ کی ذہنی ساخت معلوم ہوئی۔اس صاحب نے گلگت بلتستان کی سب سے اچھی برادری اور علم و عمل کا چراغ روشن کرنے والے پروفیسروں پر دانستگی سے کیچڑ اچھالا اور آپ نے اپنے کالم میں شائع کیا۔ میں آپ اور آپ کے صاحبِ خط سے چند سوالات کرتا ہوں۔ کیا آپ لوگ جواب دینا پسند فرمائیں گے۔مجھے بتایا جائے کہ اگر ایگزام ڈیوٹیاں پروفیسر اور لیکچرار نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ جس ایمانداری سے پروفیسروں اور لیکچراروں نے ایگزام ڈیوٹی اور اسمنٹ کی ذمہ داری سنبھالا ہے کیا کوئی اور سنبھال سکتا ہے؟ ایگزام لینا اور پیپر چیک کرنا تو پروفیسروں کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اگر پروفیسر یہ کام نہیں کریں گے تو پولیس ڈیپارٹمنٹ والے کریں گے؟ خدا کا خوف کرو۔ گورنمنٹ نے ایک نظام بنایا ہے اس کے تحت کالجز میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ گلگت بلتستان کی دو درجن سے زائد کالجز کو ان بیچاروں نے سنبھالا ہوا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کونسی کالج ایسی ہے جس میں اسٹاف کی کمی نہیں مگر یہ پروفیسرز اور لیکچرار ڈبل کلاسیں لیکر کالجز کے نظم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کیا حکومت دیگر

شعبوں کے آفیسرز کو جتنی سہولیات دیتی ہے اتنی پروفیسروں اور لیکچراروں کو دیتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیا آج تک کسی پروفیسر نے کرپشن کی ہے؟ کونسا محکمہ ہے جو کرپشن سے پاک ہے مگر آپ ایک پروفیسر کی کرپشن ثابت نہیں کر سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پروفیسرز فرشتے ہوتے ہیں مگر یہ دعویٰ ضرور ہے کہ گلگت بلتستان کے دیگر تمام محکموں کے آفیسروں سے زیادہ نیک نیت، باوصف اور نیک طینت ہیں۔ مشکل حالات میں یہ لوگ اتحاد و یکجہتی سے رہتے ہیں اور اپنے تمام معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیتے ہیں۔ آپ لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہیں کہ بہت سارے پروفیسر پی ایچ ڈی اور ایم فل کیے ہوئے ہیں، اور کچھ کر رہے ہیں۔ کچھ کتابیں لکھتے ہیں کوئی تحقیقی مضامین لکھتا ہے۔ کوئی صاحب دیوان ہے۔ پورے گلگت بلتستان کے تمام سرکاری ملازمین کا ریکاڈ نکال کر دیکھ لیجیے گا کہ کتنے فیصد وہ آفیسر ہیں جنھوں نے انہی پروفیسروں سے تعلیم حاصل کیا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ کتنے ججز، سیکرٹریز، ڈائریکٹرز، ڈاکٹرز، آرمی کمیشنڈ آفیسرز اور دیگر محکموں میں اعلیٰ آفیسرز ہیں جنھوں نے انہی پروفیسروں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے مگر آپ کو یہ حقائق نظر ہی نہیں آتے۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔ آج بھی لوگ سو دفعہ سوچتے ہیں جب کسی پروفیسر اور لیکچرار سے بات کرتے ہیں تو۔ ان کے سامنے بڑے بڑوں کی بولتی بند ہوتی ہے مگر آپ کو یہ زمینی حقائق نظر ہیں نہیں آتے یا آپ نے اندھاپنے کا کالا چشمہ پہنا ہوا ہے''۔

ایک اور خط موصول ہوا۔ ملاحظہ کیجیے۔ ''حقانی صاحب آپ کے مضمون کے بعد کافی سارے پروفیسرز اور لیکچرارز سیخ پا ہیں۔ سیخ پا ہونے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہیں جن پر وہی باتیں سو فیصد صادق آتی ہیں جو آپ نے کالم میں کی ہے۔ انہوں نے اس کالم کے بعد سنجیدگی سے سوچنے کی بجائے آپ کی ذات پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ یہ کم از کم پڑھے لکھے لوگوں کا رویہ نہیں ہوتا۔ بدیہی حقیقت ہے کہ کم ظرف لوگ ہمیشہ ذاتیات پر بات کرتے ہیں۔ ان کے اس طرح اول فول بکنے سے آپ کی شخصیت میں کوئی اثر بھی نہیں پڑتا۔ بہر صورت میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ خط خود آپ کے خلاف بھی تھا۔ اس لیے کہ ایگزام ڈیوٹی اور اسمنٹ آپ بھی کرتے ہیں۔ آپ بھی کوئی کاروبار کرتے ہونگے۔ پیسہ کمانے کا کوئی ذریعہ ہوگا۔ آپ بھی اپنی ٹرانسفری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہونگے۔ آپ بھی اگلے گریڈ کی خواہش رکھتے ہونگے۔ آپ بھی کلاسیں سنجیدگی سے نہیں لیتے ہونگے۔ غرض بیان کردہ چیزیں اگر کسی پروفیسر میں پائی جاتی ہیں تو آپ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن آپ نے ان کو دبانے کے بجائے منظر عام پر لایا۔ ہمارا میڈیا، وزیراعلیٰ اور اس کی کابینہ، ممبران اسمبلی، اعلی سرکاری ملازمین اور یہاں تک مسجد و مُلا و شیخ و امام بارگاہ اور دیگر مقدس لوگوں کے حوالے سے تفصیلی رپورٹیں شائع کرتا ہے تو یہ پروفیسروں کے بارے میں کیوں نہیں کرسکتا ہے۔ آپ لوگ ہر گز مقدس گائے نہیں مگر یہ سمجھنا آپ کی برادری

کے بس کی بات۔ میں آپ کی ہمت کو داد دیتا ہوں، آپ اپنے آپ کو بھی کٹھمرے میں کھڑا کرتے ہو''۔

یاد رہے کہ ''پروفیسروں کا المیہ'' والے کالم سے میری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا مگر بے حد افسوس ہوا جب اپنے سینئرز بالخصوص میرے وہ دوست جو ''منہ میں رام رام اور بغل بیں چھری'' والی پوزیشن اختیار کیے ہوتے ہیں کی کمزور ترین حرکتوں کو دیکھا۔ انہوں نے بہت سارے محترم سینئرز پروفیسروں کو اکسانے کی کوشش کی یہاں تک کہ پروفیسر ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کو بھی میرے خلاف بھڑکایا۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی بھونڈی حرکتوں سے میرا کچھ بگڑنا والا نہیں۔ رہی بات ان احباب کی جنہیں مجھ سے شکایت ہے یا خفگی ہے تو اگر اس مکتوب نما مضمون سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہے تو معافی کا خواستگار ہوں۔ اور ہاں گلگت بلتستان کے انیس ڈیپارٹمنٹ کے ایک سو پچاس آفیسرز کو بیس لاکھ لوگوں کی نمائندہ اسمبلی نے ایک قانون سازی کے ذریعے ریگولر کیا۔ سپریم ایپلیٹ کورٹ نے ان کے حق میں فیصلہ دیا۔ چیف سیکرٹری اور اس کی قائم کردہ سیکرٹریوں کی کمیٹی نے تمام ترجانچ پڑتال کے بعد ان آفیسرز کو ریگولر کیا۔ اسی میں چند ایک لیکچرار بھی ریگولر ہوئے ہیں۔ جن کو انہی پروفیسروں نے ٹیسٹ انٹرویو سے گزار تھا۔ اگر یہ واقعی نااہل ہیں تو اس نااہلی کا سارا کریڈیٹ تمام ڈیپارٹمنٹ کے سینئرز پروفیسرز، چیف سیکرٹری، سپریم ایپلیٹ کورٹ اور گلگت

اسمبلی اور گورنر گلگت بلتستان کو جاتا ہے۔اپنے کیے کا الزام کسی اور کو دینا ہر گز زیبا
نہیں۔اور ہاں یاد رہے ایک اور گروپ بھی ریگولر ہونے جارہا ہے کسی میں ہمت ہے تو
روک لیں۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

بشالینی آف کیلاش اور عورت کا اصل مقام

قارئین میں اپنے اس سفرنامے کو مختصر کرنا چاہتا ہوں مگر یہ طول پکڑ رہا ہے۔ بہر صورت بشالینی کا تذکرہ کیے بغیر میں اس سفر نامے کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ کیلاشی عورت کو اس کی سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ عورت کو مخصوص ایام، ایام ولادت ، معاشرتی زندگی اور دیگر معاملات میں رذیل سمجھا جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان دنوں میں عورت کا مقام اچھوت سے بھی گرا ہوتا ہے۔
باوجودیکہ کئی حوالوں سے اس کو آزادی بھی حاصل ہے۔ مثلاً شوہر کے انتخاب میں وہ مکمل آزاد ہوتی ہے۔ جب بھی کیلاشی لڑکی کا جی چاہیے وہ کسی کے ساتھ بھی جا سکتی ہے۔ اپنے محبوب کے حوالے وہ اپنے سرپرستوں کے ساتھ کھل کر ڈسکس بھی کر سکتی ہے۔ اس کو برا نہیں منایا جاتا۔ آئندہ کی سطور میں عورت کا اصل مقام، عورت اور مرد میں امتیاز، حیض و نفاس میں اسلام کی طرف سے دی گئی رخصتیں اور پھر ایک کیلاشی عورت اس صورت حال میں کن مراحل سے گزرتی ہے اس کا مختصر جائزہ لیں گے۔
عورت اور مرد کی قوتیں اور صلاحیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عورت جسمانی طور پر مرد سے کمزور ہے اور زیادہ محنت و مشقت برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر عورت کے ساتھ کچھ ایسے عوارض بھی لاحق ہیں

جو اسے مسلسل اور سخت محنت سے روکتے ہیں۔ اس کا آغازِ شباب ہی ماہواری سے ہوتا ہے اور جب تک وہ جوانی کو خیر باد کہ کر بڑھاپے کی دہلیز میں داخل نہ ہو جائے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔اس کے علاوہ اسے حمل و رضاعت کے سخت اور جاں گسل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ حیض، نفاس اور استحاضہ اس کے سِوا ہیں۔ یہ چیزیں اس کی صحت ، وقتِ کار اور مزاج پر اثر ڈالتی ہیں ۔ یہ چیزیں جہد مسلسل اور محنت کی راہ میں مانع ہیں۔ عدل و انصاف اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے میں اس کمزور جاں عورت پر اس سے کچھ کم بوجھ ڈالا جائے جتنا بوجھ مرد پر ڈالا جاتا ہے۔

یہ بات بھی اٹل ہے کہ عورت کا مزاج ، اس کے رجحانات و نفسیات بھی اس بات کے متقاضی ہیں کہ ایک عورت کے اندر محبت و مودت ، غم گساری، ہمدردی و دلداری ، قربانی و ایثار ، صبر و تحمل اور خدمت کے جذبات مرد سے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ان کی وجہ سے وہ اپنے ماحول کو مسرت و راحت اور دلجوئی و محبت سے بھر سکتی ہے۔

یہ بات ہرگز عورت کی خیر خواہی میں نہیں جاتی ہے کہ اسے اس فطری دائرہ کار یا فطرت حقیقی سے نکال کر غیر فطری دائرہ کار میں پہنچا دیا جائے۔ اس صورت میں عورت کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر خسارے کی بات ہے۔ عورت جب تک عورت

ہے وہ ماں بننے، حمل و رضاعت کی تکلیفیں برداشت کرنے اور حیض و نفاس اور استحاضہ کی تکلیف دہ کیفیات سے گزرنے پر مجبور ہے۔ ان مشکلات اور پیچیدگیوں میں مرد اس کے ساتھ معاونت نہیں کر سکتا۔ باوجود اس کے مرد کی ذمہ داریاں بھی اس نازک اندام پر ڈالنا غیر فطری اور ظلم و جبر سے کم نہیں۔ ان تمام تکالیف کے بعد ایک عورت سے یہ کہا جائے کہ وہ کما کر گھر سنبھالے۔ یہ اس کے ساتھ سراسر ظلم و ستم ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ عورت کو تمام تقاضوں سے آزاد کر کے صرف بچوں کی تربیت، گھر کا نظام اور امور خانہ داری سنبھالنے کی ذمہ داریاں دی جائے تاکہ وہ ہر قسم کی ٹینشن سے آزاد ہو کر ایک باکمال امت و قوم کی تعمیر کر سکے۔ جب باکمال قوم وجود میں آئیگی تو معاشرتی انقلاب خود آ جائے گا۔ بہر صورت عورت کو جنس بازار اور مختلف محکموں میں دربدری کے ٹھوکرے کھانے سے بچایا جانا چاہیے۔ اس کو اس کا اصل اور حقیقی مقام ملنا چاہیے۔ وہی مقام جو محمد نے ازواج مطہرات کو دیا تھا اور حضرت علی نے فاطمۃ الزھرۃ کا دیا تھا۔

اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان جھوٹے اور غیر ضروری امتیازات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ جدید جاہلی تہذیب کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ سارے انسان ایک جان سے پیدا ہوئے ہیں۔ سب کی اصل ایک ہے۔ اسلام کے آفاقی اصولوں کے مطابق پیدائشی طور پر نہ تو کوئی شریف ہے اور نہ رذیل، نہ کوئی اچھی ذات کا ہے اور نہ بد

ذات کا۔ سب برابر اور مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ صرف اور صرف اہل تقویٰ کو برتری حاصل ہے۔ سورۃ النحل ہیں ارشاد ربانی ہے '' من عمل صالحا من ذکر او انثی فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ ولنجزینہم اجرہم باحسن ماکانو یعملون'' یعنی جو کوئی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے،اور انہیں ضرور ان کا اجر بھی عطا فرمائیں گے، ان اچھے اعمال کے عوض جو وہ انجام دیتے تھے۔

بشالینی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، مگر جو دیکھا وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ بشالینی وہ جگہ ہے جہاں ایام ممنوعہ اور ایام زچگی کے دوران عورتیں قیام کرتی ہیں۔ شہزادہ خان کیلاشی کی بیٹی شاہین گل پشاور یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ '' تمام کیلاشی وادیوں میں بشالینیاں ہوتیں ہیں۔ تاہم بموریت میں سرراہے یہ بشالینی ہے۔ یہ بشالیناں ہماری بہترین درسگاہیں بھی ہیں''۔ میں جب کراکال کا چکر کاٹ رہا تھا تو بشالینی کا پوچھنا ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شرم آگیر لیتی۔ قبرستان اور معبد خانے کے دو چکر کاٹنے کے بعد سڑک پر آیا تو انکل محمد نواز نے کہا کہ وہ دیکھو، وہی مخصوص جگہ ہے۔ میں نے سنا تھا کہ بشالینی ایک بڑا کمرہ ہوتا ہے جس کے نہ روشن دان ہوتے ہیں اور نہ روشنی اور ہوا کے لیے کوئی اور جگہ۔ یہ کمرہ مکمل تاریک ہوتا ہے اور یہاں خواتین کے علاوہ کوئی نہیں جاتا۔ تاہم

بموریت میں جس عمارت کی طرف میری رہنمائی کی گئی تھی وہ تو ایک بہت بڑا ایریا معلوم ہوا۔ اس عمارت کا جائزہ لیا تو اس کا صرف ایک مرکزی دروازہ نظر آیا۔

دروازے سے باہر ایک جنگلہ تھا وہاں پانچ کیلاشی خواتین کھڑی تھیں، دو کے پاس بچے تھے اور دو بالکل دوشیزائیں تھی اور ایک بڑی پیٹ کی خاتون تھی شاید حاملہ ہو۔ میں روڈ میں کھڑے کھڑے ان سے گفتگو کرنے لگا۔ میں نے پوچھا کہ اس وقت بشالینی میں کتنی خواتین ہیں تو ایک خاتون نے کہا کہ بتیس خواتین موجود ہیں۔ اگلا سوال یہ تھا کہ اس راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ ہے تو جواب نفی میں ملا۔ ان کی گفتگو سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس عمارت میں کئی کمرے ہیں اور عمارت کی ظاہری وضع قطع سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ کسی این جی او نے تعمیر کروایا ہے۔ باتوں باتوں میں، میں نے بشالینی کے جنگلے پر ہاتھ لگایا جس پر کھڑی ایک خاتون نے چیخ لگائی اور کہا کہ ہاتھ ہٹاؤ، میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں؟ اس کا جواب میرے توقع کے بالکل مختلف تھا۔ کہا کہ پلید ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ نہیں میں اس جنگلہ پر ہاتھ لگانے سے پلید نہیں ہو جاؤنگا تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا '' اس وقت ہم سب نجس ہیں۔ یہ پوری عمارت نجس ہے۔ ہمیں یہی بتایا جاتا ہے کہ ہم ناپاک اور نجس ہیں۔ اور جہاں ہم رہتیں ہیں وہ جگہ بھی پلید اور نجس ہے''۔ بشالینی میں مقیم عورتوں کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کیلاش حائض عورتوں کو پلید یا نجس سمجھتے ہیں۔ ان کو گھروں میں رکھنا معیوب بلکہ حرام سمجھتے

ہیں۔ ان کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھایا جاتا، نہ ہی ان کے ساتھ ان ایام میں کسی بھی قسم کا اختلاط و امتزاج ہوتا ہے۔

اگر بشالینی میں بچے کی پیدائش ہو جائے تو باہر سے کوئی ایک خاتون اس کی مدد کے لیے جا سکتی ہے وہ بھی مکمل برہنہ ہو کر۔ کیلاش کی نوجوان دوشیزائیں ایام ممنوعہ کے دوران بشالینی میں قیام کرتی ہیں اور وہ متجربہ خواتین کے ساتھ اپنی محبت، اپنے بوائی فرینڈ، جنسی تعلقات اور مستقبل کے حوالے سے کھل کر بات چیت میں حصہ لیتی ہیں اور ازدواجی اور خانگی مسائل پر بھی سیر حاصل گفتگو کرتی ہیں اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ راز داری اور اعتماد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پرانی اور متجربہ خواتین اس بشالینی میں نوجوان دوشیزاؤں اور حسیناؤں کو محبت و نفرت کے سارے گُر سکھاتی ہیں۔ یعنی کیلاش تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے بشالینی ایک تربیت گاہ اور درسگاہ بھی ہے۔

حیض اور نفاس فطری ہیں۔ کسی عورت کو اس سے مفر نہیں۔ ان ایام میں اللہ تعالیٰ نے عورت سے بہت ساری ذمہ داریاں ختم کی ہے اور اس کے کاموں کو سہل اور آسان کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی ہر تخلیق میں حکمت ہوتی ہے اور ہر حکم بھی حکمت سے بھرا ہوتا ہے۔ حیض کے حوالے سے ارشاد رب العزت ہے۔ ویسلونک عنِ المحیضِ قل ہواَذی، فاعتزِلوا النِسا فی المحیضِ ولا تقربوہن حتی یطہرن فاذا تطہرن

فاتوہن مِن حیث امر کم اللہ ان اللہ یحِب التوابِین ویحِب المتطہِرِین۔ "وہ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے یہ ایک گندگی ہے پس حیض کے دنوں میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور وہ جب تک پاک نہ جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔پس جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس اس طریقہ سے جاؤ کہ جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔(سورہ بقرہ)، لیکن کیلاشی ایک حائض عورت کو احترام و اکرام اور اس کے کاموں کو سہل کرنے کے بجائے اس سے ایک اذیت میں ڈالتے ہیں اور اس کو پلید سمجھتے ہیں۔وہ قولا اور عملًا ایام ممنوعہ اور دوران زچگی عورت سے مکمل بائیکاٹ کرتے ہیں۔ایک عورت کے لیے سب سے مشکل لمحات یہی ہوتے ہیں، ان لمحات میں اس سے محبت، حوصلہ اور خدمت کی ضرورت ہوتی ہے مگر کیلاش تہذیب وثقافت عورت کو اس سے محروم رکھتی ہے۔

نوٹ: یہ ارٹیکل بھی سفرنامہ کیلاش کا ایک درمیانی حصہ ہے۔ جو ابھی تک ہماری ویب میں شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔حقانی

قراقرم یونیورسٹی اور جی بی کالجز

قراقرم انٹر نیشنل یونیورسٹی گلگت بلتستان کی اکلوتی یونیورسٹی ہے۔اس یونیورسٹی کو قائم ہوتے ہوئے ابھی بارہ سال ہی گزرے ہیں مگر یہاں کے ناعاقبت اندیشوں نے اس یونیورسٹی کو مسلکی وعلاقائی اڈہ بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے یونیورسٹی میں تحقیقاتی و تجزیاتی اور تعلیم وتدریس کی بجائے لایعنی مشغلے اور ثقافتی گل غپاڑے زیادہ ہونے لگے ہیں۔یہ اس قوم کی بڑی بدقسمتی ہے۔یونیورسٹی کے ابتدائی خاکے میں یہ بات طے تھی کہ مختلف اضلاع میں یونیورسٹی کے کیمپس بنائے جائیں گے ۔ اسی خاکے میں رنگ بھرتے ہوئی بلتستان یونیورسٹی کا کیمپس اوپن کیا گیا اور ہنزہ میں بھی باقاعدہ منظوری ہوگئی۔گزشتہ دنوں محکمہ ایجوکیشن (ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن کالجز) کی طرف سے ڈگری کالج چلاس، انٹر کالج غذر اور انٹر گرلز کالج ہنزہ کو ایک خط بھیجا گیا۔اس خط میں یہ وضاحت تھی کہ قراقرم انٹر نیشنل یونیورسٹی اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے ان تینوں علاقوں میں کے ائی یو کیمپس کے اجراء کا پلان کیا ہے۔لہذا ہائی اتھارٹیز کی طرف سے یہ ڈائریکشن ملی ہیں کہ ان کالجوں میں موجودہ سہولیات یعنی کور ایریا، کلاس رومز، لیبارٹریاں، ایڈمن آفس، ہاسٹل، پلے گراونڈ، لائبریریاں اور ان میں موجودہ کتابیں، ٹائلٹس،فرنیچرز، کمپوٹرز، رجسٹرڈ طلبہ وطالبات کی تعداد اور پڑھائے جانے

والے مضامین کی تمام تفصیلات سے ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن کو آگاہ کیا جائے۔تاکہ یونیورسٹی کے کیمپس کے قیام کو یقینی بنایا جاسکے۔

یہاں یہ وضاحت کرتا جاؤں کہ ضلع ہنزہ اور ضلع غذر میں کئی گورنمنٹ کالجز کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ اور کمیونٹی کالجز کی بھرمار ہے۔ طلبہ وطالبات کی تعلیمی ضروریات کسی حدتک پوری ہورہی ہیں اور یونیورسٹی کے مین کیمپس تک ان کی اپروچ بھی بہت آسان ہے۔ اس سے میرا مدعا یہ ہر گز یہ نہیں کہ وہاں کیمپس کا اجرا نہ کیا جائے بلکہ معلومات کی فراہمی ہے۔آج کے ارٹیکل میں صرف اس بات پر بحث کرنی ہے کہ قراقرم یونیورسٹی کے کیمپس ان علاقوں میں فوری طور پر اسٹیبلش ہونے چاہیے مگر جس طریقہ کار کے مطابق کیمپس کا چلانا کا عزم ظاہر کیا ہے اس سے اتفاق نہیں۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ گلگت بلتستان کے تمام کالجز ایک طویل عرصے سے فراہمی علم و حصول علم کے لیے خدمات انجام دے رہی ہیں۔ یہاں دو درجن سے زائد کالجز ہیں جہاں غریب طلبہ وطالبات کو انتہائی آسانی سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جارہا ہے۔فیسیں مناسب ہیں بلکہ کافی کم ہیں۔ گورنمنٹ کالجز پیور سرکاری ادارے ہیں۔ جہاں کے اکیڈمک اور دیگر اسٹاف کی تنخواہیں اے جی پی آر سے طے شدہ ہیں۔ان کے فنڈ میں مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ کالجوں کی بلڈنگیں اور دیگر

اثاثہ جات گورنمنٹ گلگت بلتستان کی ملکیت ہے۔ تمام کالجز کو ایک طے شدہ پروسیجر کے تحت قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ مگر یونیورسٹیاں ایک بااختیار ادارے کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اور پھر قراقرم یونیورسٹی اپنے تمام معاملات میں آزاد ہے۔ صوبائی حکومت کا اس پر کسی قسم کا کنٹرول بھی نہیں۔ خود مختار اداروں کے لیے بجٹ طے شدہ ہوتا ہے جو وفاق سے ملتا ہے۔ اب اس تمام تر آزادی کے ساتھ اگر قراقرم یونیورسٹی اپنے کیمپس کا اجراء مختلف اضلاع میں کرنا چاہتی ہے تو انہیں خوش دلی سے ویلکم کیا جانا چاہیے اور ان کے لیے حکومتی تعاون کو یقینی بنایا جانا چاہیے مگر یہ بات انتہائی نقصان اور زمینی حقائق کے منافی ہوگی کی ان اضلاع میں پہلے سے کام کرنے والے تعلیمی اداروں پر قبضہ کرکے وہاں یونیورسٹی کیمپس کھولا جائے۔ حکومت پاکستان اتنی غریب نہیں کہ ایک چھوٹا سا کیمپس کے لیے زمین نہیں خرید سکے یا پھر حکومت گلگت بلتستان اتنی بے بس بھی نہیں کہ یونیورسٹی کیمپس کے لیے ان علاقوں میں خالصہ سرکار کا ایک مناسب حصہ یونیورسٹی کو الاٹ کرے۔ اور نہ ہی قراقرم یونیورسٹی اتنی دیوالیہ ہے کہ اپنا کیمپس تعمیر نہ کر سکے۔ اگر یونیورسٹی کے پاس اپنا باقاعدہ کیمپس کھولنے کی گنجائش نہیں تو پھر ایک کمزور اور غیر مفید کیمپس کھول کر کیا کرنا چاہتی ہے؟ کہیں غریب علاقوں کے طلبہ وطالبات سے فیس بٹورنے کا پلان تو نہیں؟ بہر صورت قراقرم یونیورسٹی گلگت بلتستان کے چہرے کا جھومر ہے۔ اس کو کسی اور ادارے کو قبضہ کرکے اپنا

کیمپس شروع کرنے کے بجائے لوکل گورنمنٹ سے زمین الاٹ کرواکر اپنا کیمپس تعمیر کرنا چاہیے تاکہ مستقل بنیادوں پر تعلیمی خدمات انجام دی جاسکیں۔ گلگت بلتستان پروفیسر اینڈ لیکچرر برادری میں اس حوالے سے پہلے سے غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ اس کو مزید مشتعل کرنی کی کوشش سے گریز کرنا چاہیے۔ گزشتہ دنوں سیکرٹری ایجوکیشن گلگت بلتستان کی ایک تفصیلی نیوز رپورٹ اخبارات میں پڑھنے کو ملی۔ سیکرٹری ایجوکیشن نے واضح طور پر کہا ہے کہ قراقرم یونیورسٹی کو اپنے کیمپس کھولنے ہیں تو اپنا ذاتی کیمپس تعمیر کریں، سرکاری کالجز میں قبضہ کرکے کیمپس کھولنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ سیکرٹری صاحب نے پوری علاقے کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ ایک غریب قوم کا ایک پرانا ادارہ ڈسٹرب کرکے ایک مہنگا ادارے کو نوازنے کی پالیسی عوام دشمن تو ہوسکتی ہے عوام دوست نہیں۔

ضلع دیامر میں ترجیحی بنیادوں پر یونیورسٹی کا کیمپس کھلنا تھا مگر جس ذہن نے بھی اب تک کیمپس بننے نہیں دیا یہ اس کی ٹھوس غلطی ہے۔ ضلع دیامر کو جب تک تعلیمی شعور اور یونیورسٹی کلچر کا فروغ نہیں دیا جائے گا تب تک وہاں غیر انسانی اور بدتہذیبی روایتیں راج کرتیں رہیں گی۔ حکومت کو اس حوالے سے سنجیدگی سے غور و خوض کرنا چاہیے۔ ڈگری کالج چلاس گلگت بلتستان کے سب سے بڑے ضلع میں اکلوتا ڈگری کالج ہے۔ پورے ضلع میں ایک بھی گرلز کالج نہیں جس کی

وجہ سے طالبات انتہائی پریشانی کا شکار ہیں۔وہ ہزار دفعہ چاہنے کہ باوجود بھی اپنی تعلیم ریگولر جاری نہیں رکھ سکتی۔ وہاں کے چند اسلامی ٹھیکداروں نے بھی گرلز کالج کا اجرا کرنے میں رکاوٹیں ڈالی ہوئی ہیں مگر بنیادی طور پر سرکار کی نااہلی بلکہ بددیانتی ہے جو اب تک کالج اوپن نہیں کر سکی۔اور اب تک کوئی انٹر بوائز کالج بھی نہیں پورے ضلع میں۔اب یونیورسٹی کے نام پر ڈگری کالج کو بھی قبضہ کرنا کسی طرح مستحسن نہیں۔ ڈگری کالج میں غریب طلبہ انتہائی مختصر فیس پر انٹراور گریجویشن کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ خدارا، اس بنیادی حق سے محروم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔یاد رہے ڈگری کالج چلاس اور پبلک سکول چلاس کے ساتھ گورنمنٹ کے پاس ہزاروں کنال خالی زمین پڑی ہوئی ہے۔ اگر لوکل حکومت اور یونیورسٹی انتظامیہ دیامر کے لیے اتنی مخلص ہے تو اس بہترین خالی اراضی پر یونیورسٹی کا کیمپس تعمیر کریں۔لوکل حکومت زمین کی الاٹمنٹی کے ساتھ ایک بجٹ بھی یونیورسٹی کو دے اور یونیورسٹی بھی ایک مخصوص بجٹ دیامر کیمپس کی تعمیر کے لیے مختص کرے۔ بہت بہترین ایریا میں اچھا کیمپس تعمیر ہوجائے گا۔اگر اس خالصہ سرکاری زمین میں رکاوٹیں ہیں تو میں یونیورسٹی انتظامیہ بالخصو ص وی سی سے گزارش کرونگا کہ وہ قراقرم ہائے وے میں کیڈیٹ کالج کے ساتھ یونیورسٹی کا کیمپس تعمیر کریں۔ میں ذاتی طور پر عمائدین گوہرآباد سے یونیورسٹی کیمپس کے لیے مفت زمین کی فراہمی کے لیے کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم نے ایک ہزار کنال کیڈیٹ کالج کی تعمیر

کے لیے فری میں دیا ہے تو پانچ سو کنال یونیورسٹی کے لیے بھی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے اگر مجھے گوہر آباد کی عوام کے سامنے فریاد بھی کرنا ہوا، تو کرلونگا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ ڈگری کالج چلاس پر قبضہ کرکے کیمپس کھولنے کی کوشش علاقے کی عوام کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ ایک منکوحہ عورت کو مطلقہ بنا کر اس سے نکاح کیا جائے اور نئی شادی رچائی جائے۔ ہائی اتھارٹیز اور یونیورسٹی کو ضلع دیامر میں خوش آمدید مگر جس انداز میں آنا چاہتے ہیں اس میں نہیں۔ آپ دیامر کے لیے کوئی محبت بھرا پیکج لے کر آؤ، مگر جو پہلے سے ہے اس کو چھین کر جعلی لیپا پوتی کرنا یقینا باشعور لوگوں کا کام نہیں ہوتا۔ میرا حکومت سے سوال ہے کہ وہ آرمی کو تھک داس الاٹ کرسکتی ہے تو یونیورسٹی جیسے عظیم تعلیمی ادارے کے لیے زمین الاٹ کیوں نہیں کرسکتی؟ اللہ ہم سب کا حامی ہو ناصر ہو۔

دیامر کے لیے بھیک

آج یہ چند سطریں بادل نخواستہ لکھ رہا ہوں۔مجھے اکثر یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ میں دیامر پرست ہوں۔دیامر میرا گھر ہے اور گلگت بلتستان کا گیٹ وے۔اگر دیامر جل رہا ہے اور میں اس آگ میں کمی کی بات کرتا ہوں تو کیا غلط کرتا ہوں؟ یقیناً نہیں۔گلگت بلتستان کے ہر بہن بھائی سے یہی عرض کرونگا کہ '' دیامر خوشحال گلگت بلتستان خوشحال ''۔دیامر کے چپے چپے میں گھوم پھرنے اور جائزہ لینے کا بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ دیامر کی بربادی میں سب سے زیادہ ہاتھ لوکل گورنمنٹ کا ہے۔اربوں روپیہ کے پروجیکٹ بے یارو مددگار چھوڑ دیے گئے ہیں اور ٹھیکیداران کب کا رقم ہضم کرچکے ہیں۔دیامر اس وقت گلگت بلتستان کا سب سے بڑا ضلع ہے مگر انتہائی خستگی کے عالم میں سسک رہا ہے۔پورے دیامر کو چھوڑیئے۔صرف چلاس سٹی کا جائزہ لے لیا جائے تو بھی دل خون کے آنسو روتا ہے۔چیف انجینئر، ڈی سی، ایس پی، ججز اور دیگر اعلیٰ آفیسران کے دفاتر کے سامنے والی روڈ اور گٹر کے پانی کی نالی بھی درست حالت میں نہیں۔ان کے دفاتر کے سامنے والی روڈ پر گندہ پانی چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔اگر آپ دیامر کے مضافاتی گاؤں کا دورہ کریں گے تو حیرت ہوگی کہ سرکار نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔اگر کوئی صاحب دل پولو گروانڈ چلاس، ہائی اسکول چلاس کا گروانڈ، ایئرپورٹ اور تین

میل پر مشتمل کے کے ایچ سے چلاس بازار تک کے روڈ کا بھی جائزہ لے گا تو وہ کسی صورت اس کو شہر نہیں کہہ سکے گا۔ گندا پانی اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر کے سوا آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ صفائی نام کی کوئی چیز آپ کو انتظامیہ کی طرف سے چلاس کے چھوٹے سے شہر میں نہیں ملے گی۔

دیامر کے لوگوں کو گنوار اور ہٹ دھرم بنانے میں کسی کا کردار ہو نہ ہو سرکار کا ضرور ہے۔ دیامر کا تعلیمی اسٹریکچر تباہی کے آخری دھانے پر کھڑا ہے۔ این جی اوز بھی کاغذات کی حد تک دیامر میں اپنی کارکردگی اپنے ڈونرز کو پیش کرتے ہیں عملًا ان کی کوئی خدمات دیامر میں نہیں۔ ایک بھی ادارہ نہیں جو لوگوں کو شعور و آگاہی دے۔ عامۃ الناس کو جدید دور کے تقاضوں اور ضروریات سے آگاہ کرے۔ ڈیم کی مد میں بے تحاشا رقم اہلیان دیامر کو موصول ہوئی مگر اس کے استعمال کرنے کا انہیں کوئی شعور ہی نہیں۔ کوئی عالم، کوئی اسکالر، کوئی پروفیسر، کوئی آفیسر کوئی سماجی ورکر انہیں گائیڈ لائن دینے کے لیے تیار ہیں نہیں۔ لازمی طور پر لوگ اخلاقی طور پر تنزلی کا شکار ہیں۔ اس بے تحاشا رقم سے دیامر میں ایک بھی فلاحی اور سماجی ادارہ قائم نہیں ہو رہا ہے بلکہ بھائی بھائی کا دشمن بن چکا ہے۔ اکثر رقم کسی کے اکاونٹ یں جمع ہو چکی ہے۔ لوگ اس کے استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ داریل تانگیر والوں کو ایک طے شدہ پلان کے تحت ظالم اور خونخوار ڈکلیئر کروایا گیا ہے۔ وہ ہزار چاہیے بھی تو سالوں تک

اپنا امیج بحال نہیں کر سکتے۔ اتنے ملنسار اور مہمان نواز اور انسانیت دوست لوگوں کو قاتل اور سماج کا بدنما داغ گردانے والوں کو سمجھنا چاہیے کہ وہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہے۔ اور اس پر مستزاد ہمارا میڈیا تیل چھڑ کا رہا ہے۔

میں دیامر کے لیے کچھ نہیں مانگتا۔ جناب فورس کمانڈر، جناب وزیر اعلیٰ، جناب گورنر، جناب چیف سیکرٹری، جناب وزیر تعلیم اور جناب سیکرٹری ایجوکیشن سے صرف تعلیمی انقلاب کی بھیک مانگتا ہوں۔ آپ دیامر میں تعلیمی انقلاب بر پا کیجیے، اس وقت تعلیمی انقلاب کے لیے دیامر سے زیادہ موزوں جگہ پورے ملک میں کہیں نہیں۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اگر آپ نے دیامر کی بگڑتی تعلیمی صورت حال کا کوئی مثبت حل نکال لیا تو دیامر کے لوگ سب سے زیادہ سوالائز، سب سے زیادہ امن پسند اور سب سے زیادہ اس ملک و ملت کی خدمت کرنے والے بن جائیں گے۔ آپ کا ہر عمل، آپ کا ہر اخباری بیان، آپ کا ہر خیال دیامر کو بدنام کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر آپ ان سے محبت اور سوالائز ہونے کی توقع رکھتے ہیں تو کان کھول کر سن لیں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر دیامر کا تمام تعلیمی اسٹریکچر پاک آرمی کو بھی دیا جائے تو بھی کافی بہتری آ سکتی ہے۔ کیڈٹ کالج بھی عرصہ دراز سے سسک رہا ہے۔ آخر کب وہاں باقاعدہ تعلیمی عمل جاری ہوگا؟ بلوچستان اور وزیرستان کے لوگوں کو پاکستان آرمی میں خصوصی کوٹہ دیا جاسکتا ہے تو یہی عمل دیامر میں بھی دہرایا جاسکتا ہے۔ خدا کی قسم دیامر کا

بچہ بچہ پاک آرمی کا صف اول کا مجاہد بن سکتا ہے۔ آپ دست محبت بڑھا کر تو دیکھ لیجیے حضور۔ ملک اور ملت کی حفاظت کے لیے خون کے آخری قطرہ تک گرانا دیامر والے عبادت سمجھتے ہیں۔ آپ ان کے اس عبادت اور نیک جذبے کا خیر مقدم تو کیجیے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ دیامر کی ہر مسجد میں ملک کی سلامتی اور پاک فوج کی کامیابی کے لیے اجتماعی دعائیں ہوتی ہیں؟ پھر بھی شکوہ ہے کہ ہم وفادار نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم وفادار نہیں تو تم بھی دلدار نہیں۔ خدارا! ہم سے محبت کیجیے۔ ہم محبت کے بھوکے ہیں۔ مگر آثار و قرائن یہی بتلا رہے ہیں کہ آپ دست محبت کی بجائے دست نفرت بڑھا رہے ہیں۔ پلیز یہ رویہ ٹھیک نہیں۔ ہم سے بڑھ کر اس ملک و ملت کا کوئی بھی وفادار نہیں ہو سکتا۔ دیامر کے ہر گاؤں کے سپاہیوں نے اس ملک کی خاطر جان دے کر سبز ہلالی جھنڈے کو اپنا کفن بنا کر اللہ کے حضور حاضر ہوئے ہیں۔ اس ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے میرے اپنے گاؤں کے درجنوں جوان خاک و خون میں مل گئے ہیں۔ بہر صورت مسٹر حفیظ الرحمان صاحب۔ صرف گلگت اور اسکردو، گلگت بلتستان نہیں۔ دیامر بھی گلگت بلتستان کا سب سے اہم حصہ ہے۔ آپ کو وزارت علیا تک پہنچانے کا سب سے بڑا سہرا دیامر کو جاتا ہے۔ کیا آپ بھی دیامر والوں کو اپنا حصہ سمجھیں گے؟

دیامر ہیں آپ کا، آپ کی حکومت کا، آپ کے وژن کا، آپ کے ترقیاتی دعوؤں کا اور آپ کے وزیروں کی کارکردگی کا شدت سے انتظار ہے۔ کیا آپ اپنی توجہ کا، ایک فیصد بھی دیامر کی بحالی کے لیے دینا پسند فرمائیں گے؟ ویسے سچی بات یہ

ہے کہ آپ کے دیامر کے وزیر مشیر اپنی عقل کُل کے ذریعے دیامر کی تباہی چاہتے ہیں۔ اگر ان پر انحصار کرنا ہے تو پھر رہنے دیں۔ دیامر کا اللہ ہی حافظ ہے۔ باقی میرے صحافی دوستو۔ جب آپ خبر بنا رہے ہو اور اخبار کی سرخی نکال رہے ہیں تو اتنا خیال رکھو کہ اگر یہی خبر آپ اپنے ضلع کے لیے بناتے تو الفاظ کیسے چنتے؟ آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ خبر ہمیشہ غیر جانبداری سے بنتی ہے؟ خبر میں کون ، کیا، کہاں کیسے اور کب کا خیال رکھا جاتا ہے اس میں ذاتی خواہش کو دخل نہیں ہوتا۔ مگر وائے نادانی۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

جی بی ارضیات: قانون سازی کی ضرورت ہے

گلگت بلتستان کے بے شمار مسائل میں ایک اہم مسئلہ بلکہ سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ ارضیات'' کا ہے۔ارضیات میں سب سے اہم ایشو بنجر زمینیں، جنگلات اور معدنیات'' کا ہے۔ گلگت بلتستان کے تمام اضلاع میں اب تک ارضیات کے حوالے سے سو سال پرانے رسم ورواج اور روایات کو مد نظر رکھ کر معاملات کو چلایا جاتا ہے۔آزادی حیثیت (Settlement) گلگت بلتستان سے پہلے گلگت، استور اور بلتستان کو بندوبستی دی گئی تھی جبکہ دیامر، غذر، ہنزہ ونگر اب تک نمبرداروں، جرگہ داروں، وڈیروں اور طاقتوروں کی اقرباپروریوں اور سرکاری عمال کی خرمستیوں کے رحم وکرم پر جی رہے ہیں۔ گلگت بلتستان کی ارضیات بالخصوص بنجر زمینوں اور حدود کے حوالے سے جائزہ لیا تو حیران کن چیزیں سامنے آئی۔ تمام اضلاع کے مابین حدود کا جھگڑا ہے۔ ایک ضلع بیک وقت دو تین دیگر اضلاع سے حدود کے جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے پھر ہر ضلع کے مابین ڈویژن، تحصیل اور یونین کونسل حتی کہ گاؤں اور نالہ سطح تک حدود کے سخت قسم کے جھگڑے پائے جاتے ہیں۔ انہیں حدود کے جھگڑوں کی وجہ سے اب تک سینکڑوں لوگ مارے جاچکے ہیں اور کئی دیوانی اور فوجداری کیسز رجسٹرڈ ہیں۔ گلگت بلتستان میں بے شمار بنجر زمینیں اس لیے ناقابل استعمال ہیں کہ ان کے حوالے سے کوئی قانونی راستہ موجود نہیں۔ بہت سے علاقوں اور بنجر اراضی

پر طاقتوروں نے قبضہ جمایا ہوا ہے۔ بعض جگہوں میں اضلاع کے مابین جھگڑا چل رہا ہے تو بعض میں حکومت اور عوام کے درمیان بنجر ارضیات پر جھگڑے اور مقدمے چل رہے ہیں۔ بے شمار بنجر ارضیات ایسی ہیں جہاں عوام آپس میں الجھی ہوئی ہے۔ایک دوسروں کے علاقوں میں قبضے، مقدمے اور قتل کی سینکڑوں کیسز چل رہے ہیں۔اس سب کچھ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان ارضیات سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت اس حوالے سے کوئی مثبت قدم اٹھانے کی بجائے ان بنجر ارضیات پر پابندی عائد کرکے خاموش تماشائی بنی بیٹھی ہے۔دیامر ڈیم کی مد میں ملنی والی رقم کا اکثر حصہ ان جھگڑوں ہیں‌ناقابل استعمال ہوکر پابندی کا شکار ہے یعنی یہ پوری رقم حکومتی اکاونٹ میں جمع ہے۔یہی حالت بلتستان، گلگت، ہنزہ نگر اور غذر واستور کے بنجر ارضیات کا ہے۔

بنجر زمینوں اور جنگلات اور معدنیات کے حوالے سے ایک اور ظلم گلگت بلتستان میں سالوں سے روا رکھا جارہاہے۔ نظام اور رواج آج سے سوڈیڑھ سو سال پرانا والا چل رہاہے۔ ایک قوم یا قبیلہ تین سو سال سے ایک علاقے میں آباد ہے مگر اس کو جنگلات کی ریالٹی اور جنگلات سے استفادہ کرنے، بنجر زمینوں کی تقسیم اور اس کی مد میں ملنا والا پیسہ اور معدنیات سے استفادہ کرنے سے محروم رکھا جارہا ہے۔بے شمار مثالیں ایسی ہیں کہ ڈیڑھ سو سال سے آباد لوگوں کو بنجر زمینوں اور جنگلات سے ملنے والے رقم میں اس لیے حصہ نہیں دیا گیا کہ وہ

غیر مالک '' ہیں۔ یہ مالک اور غیر مالک کا ظالمانہ اور کافرانہ تصور کہاں سے آیا اس '' کی کوئی بنیاد نہیں۔ بس طاقت کے نشے میں کچھ لوگ مالک ہیں اور بہت سارے غیر مالک۔ اور مالک لوگ اپنے ایریاز کے تمام بنجر اراضی، تمام جنگلات ، معدنیات اور دیگر نیچرل ریسورسز یعنی قدرتی وسائل کے بلاشرکت غیر مالک بنے ہوئے ہیں۔اور خدا کی زمین پر خدا بن کر بیٹھنے میں فخر بھی کرتے ہیں۔یا اسفا علی ذالک

ایک انٹرنیشنل ریسرچ رپورٹ کے مطابق گلگت بلتستان میں معدنیات کے بے شمار ذخائر موجود ہیں۔دنیا کا دوسرا قیمتی ڈائمنڈ گلگت بلتستان کا ہے۔ہر قسم کے قیمتی پتھر گلگت بلتستان کے ان کالے کالے پہاڑوں میں موجود ہیں۔معدنیات کے حوالے سے گلگت بلتستان پوری دنیا میں امیر ترین علاقہ ہے اور جی بی کا مستقبل بھی ان معدنیات کے درست استعمال سے جڑا ہوا ہے۔لیکن انتہائی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان اور آزادی گلگت بلتستان سے اب تک اس حوالے سے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ گزشتہ چند سالوں میں معدنیات کے حوالے سے گلگت بلتستان کو بہت عروج حاصل ہوا تو اس حوالے سے بھی کسی قسم کے قوانین موجود نہیں تھے۔کچھ جعلی کمپنیوں کو لائسنس دیے گئے۔ اور سستے داموں قیمتی سرمایہ فروخت کیا گیا۔ محسن انڈسٹری اور اس جیسے دیگر کالے بھجنگ اس علاقے کو لوٹنے میں بھرپور کامیاب ہوئے۔معدنیات کے حوالے سے چونکہ قانون نام کی

کوئی چیز موجود نہیں تھی اس لیے محکمہ کے سابق اعلیٰ افسران، سیکٹرز اور ان کے کارندوں نے ان کمپنی مالکان سے بھاری مقدار میں رشوتیں وصول کی اور بعض کے ساتھ اپنے حصے شیئر کیے پھر انہیں من مانی کرنے کی کھلی اجازت دی۔ محتاط اندازے کے مطابق ان چند سالوں میں گلگت بلتستان کو اربوں کا نقصان ہوا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹس اور باوثوق ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق معدنیات کے ڈیپارٹمنٹ کے چند سابق کرپٹ آفیسروں نے جمیز اور منزلر میں کام کرنے والی لوکل کمپنیوں اور کاروباری لوگوں کا جینا حرام کیا۔ لائسنس منسوخ کیے گئے اور انہیں ڈرا دھمکا کر ان کے گوداموں میں چھاپے مارے، ان کے قیمتی املاک کو ضبط کیا۔ اور ملک کے دوسرے حصوں میں اسمگلنگ کرکے کروڑوں کمائے۔ بہت سارے غیر ملکی لوگ بھی اس گورکھ دھندے میں شامل رہے، لیکن افسوسناک امر یہ تھا کہ گلگت بلتستان کے ارباب اقتدار، حساس اداروں کے لوگ اور دیگر تمام لوگ غفلت کی گہری نیند سو گئے۔ اخبارات نے بھی اس معاملے کو زیادہ دیر تک نہیں اچھالا۔ آخری اطلاعات کے مطابق معدنیات کے حوالے سے قوانین تیار کرلیے گئے ہیں اور جی بی کونسل نے اس کی منظوری دینی ہے۔ اس حوالے سے عرض یہ ہے کہ ان بنائے ہوئے قوانین کو جی بی اسمبلی میں بحث کے لیے پیش کیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مخصوص لابی اپنے مفادات کے لیے جی بی کے عوامی مفادات کو پس پشت ڈالے۔ جڑی بوٹیوں کے حوالے سے بھی گلگت بلتستان بالخصوص استور اور بلتستان بہت امیر ہے مگر قیمتی جڑی بوٹیوں کے حوالے سے

بھی قوانین موجود نہیں،اور نہ ہی ان کی اہمیت وافادیت سے کسی کو شعور وآگاہی حاصل ہے اور علاقہ ان جڑی بوٹیوں سے استفادہ کرنے سے محروم ہے۔استور اور بلتستان میں '' بکراوال'' کی شکل میں آنے والے لوگ سالانہ اربوں کی جڑی بوٹیاں مفت میں نکال لے جاتے ہیں اور ان کی پست پر یقینا کوئی طاقتور گروپ موجود ہے مگر ہمارے ادارے آرام کی گولیاں کھا کر گہری نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔ایک اطلاع کے مطابق کچھ قیمتی جڑی بوٹیاں پوری دنیا میں ناپید ہیں صرف استور اور بلتستان کے سبزہ زاروں اور چراگاہوں میں پائی جاتیں ہیں۔

جنگلات کے حوالے سے بھی انتہائی مخدوش صورت حال کا سامنا ہے۔اس حوالے سے بھی باقاعدہ قوانین موجود نہیں۔ ضلع دیامر میں بے انتہاجنگلات ہیں جس میں ہر قسم کی قیمتی لکڑی والے درخت موجود ہیں۔بے دریغ کٹائی کے باوجود بھی یہ جنگلات آج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ تمام جنگلات اور قیمتی درخت چند نمبرداروں، ٹمبر مافیا اور چند کرپٹ محکموں کے چند آفیسروں اور طاقتور وڈیروں کی من مانیوں اور علاقائی غیر انسانی رسم و رواج اور ملکیتی و غیر ملکیتی ظالمانہ قوانین کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ان لوگوں نے اپنی ضرورت اور مفاد کی خاطر اپنی طرف سے کچھ قوانین گھڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یقینا ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ قوانین اسمبلیاں

بناتی ہیں۔ایک تو بے تحاشا کٹائی کی گئی ہے اور پھر جنگلات کی مد میں موصول ہونی والی رقم کو مخصوص افراد میں تقسیم کیا گیا ہے۔ صدیوں سے رہنے والے لوگوں کو '' غیر مالک'' کا لیبل چسپاں کرکے محروم رکھا گیا ہے۔ جن کو مالک تصور کیا گیا ہے ان میں بھی غریب لوگوں کو بہت کم حصہ دیا گیا ہے۔ چند لوگ ان تمام قدرتی وسائل کو اپنی نجی ملکیت بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ان کی ظالمانہ کہانیوں کو سنا جائے تو رونگٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ظلم کا یہ سلسلہ آزادی گلگت بلتستان سے لے کر تادم تحریر اپنی پوری جاہ وجلال کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

دنیا اکیسوی صدی میں جی رہی ہے مگر ہم اپنے دائیں بائیں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا کہ ہم پتھر کے دور میں جی رہی ہے بلکہ پتھر کے دور میں بھی کچھ قوانین ہوا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگل کا قانون چل رہا ہے مگر سچ یہ ہے کہ جنگل میں بھی تو کوئی قانون چل رہا ہوگا مگر گلگت بلتستان میں بنجر ارضیات، معدنیات اور جنگلات اور دیگر قدرتی وسائل کے حوالے سے قانون نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ مفاداتی گروہوں، پریشر گروپس اور طاقتور فیملیز نے اپنے مفادات کے لیے وقتاً فوقتاً '' محکمانہ قوانین'' بنوانے کی کوشش کی ہے مگر یہ علاقہ اور عوام کی مفاد کے بجائے ان مخصوص لوگوں کو فائدہ بہم پہنچاتے ہیں۔ ان حساس معاملات کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے جناب وزیر اعلی گلگت بلتستان کو

ہنگامی بنیادوں پر قانون سازی کے لیے موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔ چونکہ اسمبلی میں ن لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہے، اگر وہ ماہرین سے مشاورت اور معاونت کے بعد گلگت بلتستان کی ارضیاب بالخصوص بنجر زمینیں، خالصہ زمینیں، نظام آب، معدنیات اور جنگلات اور جڑی بوٹیوں کے حوالے سے قانون سازی کرے تو بغیر کسی مشکل کے وہ قوانین اسمبلی سے پاس کروا سکتے ہیں۔ اگر موجودہ اسمبلی ارضیات کے تنازعے، حدود کی لڑائیاں، بنجر ارضیات کی قانونی حیثیت، جنگلات، معدنیات، مالک اور غیر مالک کی لڑائی، حدود کی تعین، اور اس قبیل کے دیگر ظالمانہ رسوم ورواجات کے خاتمہ کے حوالے سے انصاف پر مبنی قوانین بنانے میں کامیاب ہوئی تو یہ اکیسوی صدی میں گلگت بلتستان کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ قوانین کی موجودگی میں معدنیات، جنگلات اور بنجر ارضیات کا درست استعمال ہوگا جسے علاقے کی قسمت بدل جائے گی۔ ہر ذی شعور انسان سمجھتا ہے کہ آج گلگت بلتستان کی سب سے اہم ضرورت انہیں چند چیزوں میں بہتر حکمت عملی اور قانون سازی ہے۔ اگر موجودہ اسمبلی اس حوالے سے کوئی مثبت اقدام کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اگلی حکومت بھی یہی بنائی گی۔ اگر مہدی شاہ سرکار کی طرح چند مخصوص لوگوں کو نوازنا، خود بھی کھاؤ، دوسروں کو بھی کھلاؤ اور من پسند افراد کی اعلیٰ پوسٹوں پر تقرری تک محدود رہی تو یاد رہے کہ ان کا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ اگر ن لیگ ایسے کچھ ایکٹس اسمبلی میں لاتی ہے تو حزب اختلاف کے دو چار لوگ بھی ان کے حمایتی بن جائیں گے۔ اور قوم بھی سمجھیں

گی کہ اسمبلی، ممبروں، وزیروں، گورنروں اور مشیروں کی شاہ خرچیوں کی مد میں قوم کو سالانہ اربوں کا نقصان ہوتا ہے تو پھر مثبت قانون سازی کی شکل میں ان کو فائدہ بھی ہو رہا ہے۔کیا میری اس صدا کو کوئی سن سکتا ہے؟ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

دین و دانش... اور دینی قیادت کی بے بصیرتی

سوشل میڈیا بالخصوص فیس بک ایک اوپن فورم ہے۔ فیس بک کی افادیت اور نقصانات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ مستند کالم نگاروں نے فیس بک کے فوائد و مضرات پر تفصیلی گفتگوئیں کی ہیں۔ سال پہلے میں نے ایک انگلش ارٹیکل '' فیس اوپن یونیورسٹی '' کے عنوان سے لکھا تھا جو احباب میں بہت ہی مقبول ہوا تھا۔ میں گزشتہ پانچ سال سے فیس بک استعمال کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے خیالات دوسروں تو فوراً پہنچانے اور بہت سے اہل علم و فکر اور ادباء و محققین کو جانچنے اور ان سے رابطہ نکالنے اور انہیں پڑھنے اور سمجھنے کا،اور اپنی رائے قائم کرنے کے لیے سب سے بہترین جو فورم ملا ہے وہ فیس بک ہے۔ اس لیے میں نے اوپن یونیورسٹی سے تعبیر کیا ہے۔ گزشتہ دنوں میں نے دینی قیادت کی بے بضاعتی اور بے بصیرتی پر مبنی ایک مختصر پوسٹ لکھی۔ احباب نے بہت ہی پسند کیا۔ جید اسکالرز اور اہل علم و محققین نے اس پر اپنے اپنے تبصرے لکھے اور مستقل تحریریں رقم کی۔ میں اپنی پوسٹ اور اس پر لکھی گئی دو اہم تحریریں اس کالم کا حصہ بنانا چاہتا ہوں تاکہ یہ تلخ حقائق اور وقت کی ضروریات اور ملی تقاضوں کا ادارک کیا جاسکے اور ماضی کی غلطیوں سے سیکھ کر مستقبل کے لیے کوئی پلان تشکیل دیا جاسکے۔ سوشل میڈیا کی افادیت کا اندازہ

ان چند بصیرت افروز کمنٹس سے لگایا جاسکتا ہے۔ میری مختصر پوسٹ ملاحظہ کیجیے گا۔
''مذہبی قیادت۔۔۔۔ سنت و بصیرت سے مکمل عاری''
درمیانی شخص'' کو عزت دینا، اس پر اعتماد و بھروسہ کرنا رسول اللہ کی سب سے ''
بہترین سنت ہے۔ غزوہ خندق کے موقع پر مسلمان انتہائی مشکل حالت میں تھے۔ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ پکے مسلمان تھے لیکن سابقہ تعلق کی وجہ سے قریش اور یہودیوں کے ہاں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔۔۔۔ عین مشکل وقت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں کردار ادا کرسکتا ہوں۔۔ آپ نے ایجنٹ کہہ کر بھگایا نہیں بلکہ ارشاد کیا ''انما انت فینا رجل واحد' اور ان کو استعمال کیا اور درپیش مشکل کا حل نکالا۔اور مسلمانوں کو ظفریابی ہوئی۔ یہ سنت و بصیرت کا اعلیٰ پہلوں ہے۔
ہماری موجودی مذہبی قیادت اور ان کے کارکنان اور چمچہ گیران ان درمیانی اشخاص کی قدر کرنے اور ان سے کام لینے کی بجائے انہیں ایجنٹ، غیروں کا آلہ کار، اپنوں کا دشمن اور نہ جانے کیا کیا القابات رذیلہ سے نواز کر دور بھگا رہے ہیں۔اور تو اور اپنے شاگردوں اور ہم عقیدہ و مسلک لوگوں پر بھی اعتماد و بھروسہ کے بجائے کاسہ لیس کا خطاب دے کر بہت دور کر رہے ہیں۔ ہم نے

ابوالکلام آزاد اور سر سید احمد خان اور عبیداللہ سندھی کے ساتھ یہی کیا۔ابوالکلام آزاد مسلمانوں اور ہندوں کے بیچ درمیانی شخص کا کردار ادا کر سکتے تھے مگر ہم نے اس سے شو پیں'' کا خطاب دیا۔ سر سید احمد خان انگریز اور مسلمان کے درمیان پل بنے مگر ہم'' نے سختی سے مسترد کردیااور عبیداللہ سندھی کو تو مسترد کرنا ثواب ہی سمجھا۔ شیخ الہند کی نصیحتیں اور وصیتیں بھی کام نہیں آئی۔ ہماری وفاق المدارس کی قیادت نے ڈاکٹر طفیل ہاشمی کے ساتھ یہی کیا۔کاش ! ہاشمی صاحب پر تھوڑا سا بھی بھروسہ کیا جاتا۔ ہم نے ہر ایک کو اپنے سے دور رکھا ہوا ہے۔ ابلاغ کے وسیع ترین ذرائع کو اپنا کر اپنے موقف و نظریہ و فکر کی ترویج و تبلیغ کے بجائے ان اداروں میں کام کرنے والے مخلص لوگوں کو بھی ایجنٹ کا لقب دے کر دور بھگایا ہوا ہے۔۔۔ بخدا یہ صرف اور صرف سنت رسول سے لاعلمی اور بصیرت و بصارت کی کمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔۔۔ سینکڑوں نام ہیں جن کو ہماری مذہبی و مدارسی قیادت نے دور کیا ہوا ہے۔ وہ ہمارے لیے بہترین خدمات انجام دے سکتے ہیں مگرایک دفعہ ہی دل سے ان کو خوش آمدید کہا جائے اور ان پر بھروسہ کیا جائے۔۔اے کاش ایسا نہ ہوتا ! احباب کیا کہتے ہیں؟

اس مختصر سی تحریر پر دوستوں نے مجھ سے بہت سے پہلوں ڈسکس کیے اور بہتوں نے اوپن فورم میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔انتہائی علمی شخصیت مولانا لقمان

حکیم صاحب (سینئر جج و مترجم رحماء بینھم عربی) نے کمنٹس کے ساتھ استفسار کیا کہ ڈاکٹر طفیل ہاشمی کی کیا خدمات کیا ہیں؟ میں نے مختصر عرض کیا۔''ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب پاکستان میں اسلامی علوم میں ایم فل کروانے کا بانی ہے۔پاکستان میں بہت سے علماء و شیوخ (تمام مکاتب فکر کے) نے ان کی نگرانی میں علوم اسلامیہ میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب 1966ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے فاضل ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا آغاز کیا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایم فل علوم اسلامیہ متعارف کروایا اور کورس ڈیزائن کیا اور گائیڈ بکس لکھی ۔پنجاب یونیورسٹی میں بھی اس کے اسٹائل کو اپنایا گیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے درس نظامی کا اغاز کیا۔ درجنوں کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔اور اگر وفاق المدارس والے تمام مراحل طے ہونے کے بعد آخر میں یہ کہہ کر پوری سکیم مسترد نہیں کرتے کہ یہ سازش ہے تو آج تمام مدارس وجامعات کے طلبہ کے پاس میٹرک، ایف اے اور بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی باقاعدہ ڈگری ہوتی اور یہ سب کچھ اپنے مدرسے و جامعات میں بیٹھ کرتے۔ یونیورسٹی والے صرف انگریزی اور مطالعہ پاکستان کا ایگزام لے کر (مدرسے میں ہی) ان کو ڈگری دیتی، اور ہر مدرسے کے چند اساتذہ کو تھوڑی بہت تنخواہ بھی اوپن یونیورسٹی سے ملتی اور اسائمنٹ کی چیکنگ کی شکل میں بھی اساتذہ کو کچھ نہ کچھ ملتا''۔

پھر جب بات کھل گئی تو بہت دور تک چلی گئی اور ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب نے تلخ حقائق پر مبنی یہ مفصل تحریر اپنی وال سے شیئر کیا۔ قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں ؟''

آج مدت بعد امیر جان حقانی (راقم الحروف) نے وہ زخم پھر سے ہرے کر دئے جو بتدریج مندمل ہو رہے تھے ۔مجھے نہ معلوم کیسے شروع سے یہ احساس تھا کہ پاکستان.بر صغیر میں اسلام کی بقاکے باعث وجود میں آیا۔انگریزی انتداب کے بعد جس طبقے نے اسے سپین ہونے سے بچایا حقیقتا وہی لوگ اس ملک کے خالق ہیں اور اس کا نظم چلانے کے اولیں مستحق بھی۔ لیکن تاریخی ارتقاکے نتیجے میں ملکی نظم و نسق چلانے کے لئے کچھ مخصوص مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ مدارس کا ایک طبقہ تقسیم ملک کے بعد بھی اس ذہنی کیفیت سے نہیں نکل سکا جو غیر ملکی تسلط کے باعث پیدا ہوئی تھی اور ایک حد تک فطری اور ناگزیر تھی ۔دوسرا طبقہ کنجِ گرفت وترسے خدارا بہانہ ساخت کا پیکر ہو گیا۔ ایسے میں ضرورت تھی کہ دینی طبقات کو ملکی نظام چلانے کی اہلیتوں کے حصول کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

اتفاق سے میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں تھا اور اوپن یونیورسٹی اصلًا

ان لوگوں کے لئے بنائی گئی تھی جو کسی بھی وجہ سے باقاعدہ کالجز یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے تاکہ اس یونیورسٹی کے ذریعے انکے لئے تکمیلی تکنیکی فنی اور دیگر انواع کی تعلیم کا فاصلاتی طریق پر انتظام کیا جائے۔

میں نے سوچا کہ دینی مدارس کے طلبہ اپنی تعلیمی مصروفیات کے باعث رسمی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف ہماری جامعات معمولی درجہ میں تفسیر حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم دے کر ایم اے کی اسناد دیتی ہیں تو کیوں نہیں یہ کیا جائے کہ دینی مدارس کے نصاب کو یونیورسٹی میں درجاتی کریڈٹ دیا جائے مدارس کے اساتذہ کو یونیورسٹی ٹیوٹر مقرر کیا جائے اور دینی مدارس کے بعض متروک مضامین جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ضروری ہیں فاصلاتی طریقہ سے پڑھا دئے جائیں اور یونیورسٹی امتحان لے کر میٹرک سے پی ایچ ڈی تک ڈگری دیا کرے۔۔مدارس کے نظم کو محفوظ رکھنے اور ان کا مالی تعاون کرنے کے لئے یہ بھی سوچا کہ طلبہ کے داخلے مدارس کے توسط سے کئے جائے اور مدارس کے اساتذہ کو یونیورسٹی کا ٹیوٹر لگا کر ان کی آمدنی میں اضافے کی راہ نکالی جائے۔

یونیورسٹی اتھارٹیز اس پروگرام کے خلاف تھیں۔ایسے میں مجھے باہر سے صرف مرحوم ڈاکٹر محمود غازی اور ڈاکٹر ایس ایم زمان کی مکمل حمایت حاصل تھی

۔آخر بہت مشکل سے اتھارٹیز کو رضامند کرنے کے بعد میں نے مختلف وفاقوں اور مدارس سے رابطے کرنا شروع کئے۔مجھے۔بریلوی اہل حدیث اور شیعہ وفاقوں کی طرف سے بھرپور یقین دہانی کرائی گئی۔لیکن دیوبندی وفاق کو اس کی افادیت باور کروانے میں مجھے بہت وقت محنت اور وسائل خرچ کرنا پڑے، ایک سے زائد مرتبہ وفاق کے اجلاسوں میں بھی پروگروام پیش کیا۔کراچی جاکر مولانا سلیم اللہ خان سے بھی ملاقات کی اور باقاعدہ ایک معاہدہ طے ہوا۔اس کے مطابق مجھے 8--9 ماہ کے بعد یہ پروگرام لانچ کر دینا تھا۔لیکن ایک دن اچانک میرے آفس میں وفاق المدارس کے ایک نمائندہ وفد کے ارکان یکے بعد دیگرے آنا شروع ہو گئے۔جب سب تشریف لا چکے تو میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ جو پروگرام ہمارے درمیان طے ہوا اس پر فوراًاور اسی سمسٹر سے عمل درآمد کیا جائے۔میں نے اپنی مشکلات اور یونیورسٹی کا طریق کار سب کچھ عرض کیا لیکن وفد میں موجود استاذ گرامی قدر مولانا نذیر احمد صاحب کی وجہ سے میں نے ہامی بھر لی اور قہر درویش بر جان خویش کے مصداق دن رات کام کرکے پروگرام شروع کر دیا۔جب میرے پاس داخلوں کی تفصیل آئی تو معلوم ہوا کہ دیوبندی وفاق سے کوئی طالب علم داخل نہیں ہوا۔

مرے تھے جن کے لئے۔۔۔۔

حیرت ہوئی۔مولانا محمد زاہد (فیصل آباد والے) سے معلوم کیا تو انہوں نے صرف یہ کہا کہ

'' علماء کرام نے رجوع کرلیا''

بعد میں دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا سلیم اللہ خان نے تمام مدارس کو ایک سرکلر جاری کر دیا تھا کہ طفیل ہاشمی کا پروگرام مدارس کے خلاف حکومت کی سازش ہے اس میں کوئی طالب علم داخل نہ کروایا جائے۔ اگرچہ میرے پاس ثبوت کوئی نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ یونیورسٹی کی جس میٹنگ میں یہ پروگرام منظور کیا گیا اس وقت کے وفاقی سکریٹری ایجوکیشن بھی اس کے ممبر تھے۔ میٹنگ کے بعد انہوں نے تنہاء میں مجھے کہا یہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ مدرسوں کے مولوی اگر ڈگری لے کر سی ایس ایس کرکے بیورو کریسی میں آجائیں گے تو ہمارے بچے کہاں جائیں گے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ کہاں سی ایس ایس؟ بیچارے تعلیمی اداروں میں چلے جائیں تو بھی بسا غنیمت لیکن وہ بہت منجھے ہوئے اور سینئر بیورو کریٹ تھے اور مستقبل کو دور تک دیکھ سکتے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ مولانا سلیم اللہ خان تک سازش تھیوری انہوں نے نہ پہنچائی ہو، اور دیوبندی علماء سازش کے خوف کا بآسانی شکار ہو جاتے ہیں۔ اس حادثے کے نتیجے میں مختلف اہل علم اور اہل اللہ کے تقوی دانش کردار کی بلندی اور بے شمار خوبیوں سے

'' متعارف ہو کر ایک نظریہ نہ بنانا میرے بس میں نہیں تھا

: میرے قلم کار دوست عنایت شمسی صاحب نے اس پوسٹ پر یوں تبصرہ کیا

بالکل حق بجانب ہے آپ کا خیال۔ یہ حضرات گرامی لوگوں کو صرف اور صرف'' مولوی بنانے اور مدارس کی تعداد میں اضافہ کرتے چلے کے بجائے دعوت کا نبوی منہج اختیار کرکے زندگی کے ہر شعبے کو اہمیت دیتے تو آج صورتحال بہت مختلف ہوتی۔ ستر کی دہائی میں محمود شام نے جناب مفتی محمود کا ایک انٹرویو کیا۔ ایک سوال تھا مدارس سے ہر سال بڑی تعداد میں طلبہ نکلتے ہیں، کیا ان کے لئے روزگار کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا؟

: مفتی صاحب جواب میں پوری قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں

نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے، یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ معاشرے میں مدارس کے فضلا" کی کھپت طلب سے کہیں زیادہ ہے۔ مدارس تو معاشرے کی ضرورت اور طلب کو ہی "پورا نہیں کر پا رہے ہیں۔۔۔۔

بلاشبہ ستر کی دہائی میں صورتحال ایسی رہی ہوگی، مگر کیا آج کے حالات نے اس بات کی بصیرت افروزی" پر سنجیدہ سوال نہیں کھڑا کیا ہے؟ روایتی دینی طبقہ صرف ایک شعبے " کی لکیر پیٹنے کے بجائے ہمہ گیر محنت پر کاربند ہوجاتا تو نہ صرف آج مدارس کے طلبہ کو روزگار کے معاملے میں ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑتا اور نہ ہی سرکاری اداروں اور ذرائع ابلاغ کے تئیں کوئی فرسٹریشن پیدا ہوتی۔

پاکستان میں کئی مکاتب فکر کے لوگوں نے انتہائی سنجیدگی اور مہارت سے اپنے مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ آج وہ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مضبوط بنائے ہوئے ہیں۔ اقلیت میں بھی اکثریت کا روپ دھارا ہوا ہے۔ اور آپ کے حصے میں فقط رونا دھونا رہ گیا ہے۔ وہ اپنے تمام مفادات انتہائی عقل مندی سے محفوظ کر کے سکون سے بیٹھے ہیں۔ اور آپ کے مدارس کو اب بھی "تحفظ" کے خطرات کا سامنا ہے اور آپ کے اسلام کو ستر سال بعد بھی آج وقتاً فوقتاً ہنگامی "زندہ باد مہم" کی آکسیجن کی ضرورت رہتی ہے۔

جب آپ کا حال ہی یہ ہو کہ آپ سے محبت رکھنے والے ایک کلین شیو مسلمان کے ہاتھ پورے خطیبانہ طمطراق کے ساتھ انتہائی کراہت سے یہ کہتے ہوئے جھٹک دیے جائیں کہ کیا شکل بنائی ہوئی ہے، یہودیوں کی شکل بنائی ہوئی ہے۔۔۔" (یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے) تو بابا آپ کی قسمت میں صرف اور صرف دجالی میڈیا کا رونا رہ جاتا ہے۔ یقین کریں اس سوچ، اس رویے اور اس کردار کے ساتھ جتنا وقت آپ گزارتے چلے جائیں گے، اتنا ہی بے اثر، بے وقعت اور بے کار ہوتے چلے جائیں گے! شکریہ حقانی میاں، آپ نے اپنے حصے کا فرض نبھانے کی ایک اور اچھی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش جاری رکھئے، آخر پتھر پہ جونک پڑ ہی جائے گی''۔

بہت سارے احباب کے سنجیدہ کمنٹس اس لیے مقتبس نہیں کیے جاسکے کہ جو جگہ دل

میں ہے وہ کاغذ کے ان اوراق میں کہاں؟ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

دشمنیوں میں مصالحت۔۔کار نبوی ﷺ

دشمنیوں میں مصالحت کروانا اور انسانوں کی جانیں بچانا کار نبوت ہے۔ قرآن کریم کے اندر آپس کی تنازعات کو ختم کرنے اور کروانے کا ذکر صریح ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اہل بیت عظام اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری زندگی ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ ان کی زندگیوں کا مطالعہ ہمارے لیے آپس کی تنازعات ختم کرکے شیر وشکر ہونا سبق دیتی ہیں۔ قرآن کریم میں واضح ارشاد ہے کہ " انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم، واتقواللہ لعلکم ترحمون" اس آیت کریمہ کی ذیل میں مفسرین نے تفصیلی گفتگوئیں کی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو معاشرتی، اسلامی اور لسانی و مذہبی بھائیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہو،اور وہ مرنے مارنے پر اترآئیں تو ان کے درمیان صلح کروایا جائے۔ اصلاح کی کوشش بہر حال مسلسل جاری رکھنی چاہیے۔ شرعی حدود کے موافق کے موافق اس معاملے کو طے کردو، صرف لڑائی اور جھگڑا بند کروانے پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ان دونوں گرہوں کے درمیان عدل و انصاف کو برقرار رکھتے ہوئے معاملے کو صاف کیا جائے تاکہ لڑائی جھگڑے کا احتمال ہی باقی نہ رہے اور اس کوشش میں کسی بھی قسم کی کوئی نفسیانی غرض کو دُر آنے نہ دیا جائے،اس اصلاح کی کوششوں کے دروان خدا اور اس کے رسول کے احکامات کو مدنظر رکھتے ہوئے انصاف

کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ تاکہ انسانی، معاشرتی اور اسلامی برادری میں امن و امان برقرار ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور ان پر رحم کرتا ہے۔اگر ہم سیرت رسول ﷺ پر غور کرتے ہیں تو ایسے سینکڑوں واقعات ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششوں سے صدیوں سے لڑنے مرنے والے قبائل شیر وشکر ہوئے ہیں۔آج نبی کا کام ای کے امتیوں نے کرنا ہے ای کار نبوت کو سامنے رکھتے ہوئے خاندانی، لسانی، قبائلی، مذہبی اور سیاسی اور مفاداتی طور پر وجود میں آنے والی دشمنیوں میں مصالحت کروانے کا کام شروع کیا جانا چاہیے۔ گزشتہ دنوں داریل سے تعلق رکھنے والے ایک انتہائی دردمند انسان برادرم ثمر خان ثمر نے ایک دل ہلا دینے والی پوسٹ قارئین کے نذر کی۔ اس کو غور سے پڑھنے کے بعد آنکھیں پرنم ہوئی۔ انہوں نے صرف داریل کے حوالے سے گفتگو کی ہے میرا دل چاہتا ہے کہ اس گفتگو کو پورے جی بی کے حوالے سے مختصراً عرض کروں۔ ثمر خان ثمر لکھتے ہیں۔

''یہ دشمنیاں ''

"بھائی، آپ کیا جانو، میں کس کرب سے گزر رہا ہوں؟ ہم جیسے لوگ روز جیتے ہیں اور روز مرتے ہیں۔ڈر، خوف، اضطراب اور اندیشوں کے سائے تلے زندگی کٹ رہی ہے ۔کبھی کبھی اپنے سائے سے بھی خوف آنے لگتا ھے...شب کی تاریکی میں چوروں کی طرح گھر سے نکلنا اور چوروں کی طرح گھر میں گھس جانا...... میری کل کائنات

بس یہ چاردیواری ہے...... وہ جو ٹاور دیکھ رہے ہو، در حقیقت وہ "ڈربا" ہے اور میں مانند "مرغی" اس میں پڑا رہتا ہوں...... آپ آزاد فضاؤں میں سانس لینے والا شخص اس قیدی کا حال کیا جانو گے؟...... یہ بھی کوئی زندگی ہے.....؟ کب کہاں کس موڑ پر نامعلوم گولی مجھے چاٹ جائے، معلوم نہیں.........."

خاندانی دشمنی کی آگ میں جل رہے اک نوجوان کے الفاظ تھے جو آج سے سات آٹھ سال پہلے مجھ سے کہے تھے.....اور پھر ایسا ہی ہوا کہ نامعلوم گولی اس نوجوان کو چاٹ گئی......

کہتے ہیں نا کہ: لمحوں کی غلطیوں کا خمیازہ انسان صدیوں بھگت لیتا ہے ان دشمنیوں کا سبب جاننے کی کوشش کی جائے تو 90% کا تعلق "لمحاتی غلطی" ہی نکلتا ہے اور پھر یہ غلطی آگے چل کر کیسے خاندان کے خاندان تباہ کر دیتی ہے اس کا علم ہم سب رکھتے ہیں..... کئی سہاگنوں کے سہاگ اجڑتے، ماں کو جواں سال بیٹوں کی میتوں پر ماتم کرتے، باپ اور بھائیوں کو چھلنی لاش پر آنسو بہاتے اور بچوں کو باپ کی لاش پر آہ وزاریاں کرتے دیکھ چکا ہوں......

خون قرض ہوتا ہے اور خون دے کر ہی چکانا پڑتا ہے...... میری وادی میں خاندانی دشمنیوں کا رواج اب کسی حد تک کم ہوا ہے.... لوگ آزاد اور خوشحال

زندگی جینا چاہتے ہیں۔ بچوں کے ہاتھ میں قلم اور کتاب تھمانا چاہتے ہیں........ بہتر سے بہتر مستقبل دینا چاہتے ہیں....... جو خاندان اس آگ میں جل رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ باہر نکلا جائے....... مگر سب سے بڑا سوال یہ کہ انہیں اس دلدل سے کون کیسے نکالے؟؟؟جرگہ...... ہاں جی اک مخلص، غیر جانبدار جرگہ یہ آگ بجھا سکتا ہے۔ لوگوں کو دلدل سے نکال سکتا ہے...اگر ضلع دیامیر کے علمائے کرام، عمائدین اور باشعور لوگ مل بیٹھ کر طے کرلیں تو میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ نصف سال کے اندر اندر پورا ضلع خاندانی دشمنیوں سے پاک ہوجائے گا... حکومت کو ایسے جرگوں کا اہتمام کرکے علاقے سے بدامنی کا خاتمہ کرکے امن کا گہوارہ بنا دینا چاہیے...........کاش کہ اس طوطی کی آواز نقار خانے سے باہر نکل کر کسی کے کان میں جا پڑتی.......اے کاش...!!''

ثمر خان کی آواز ارباب اقتدار، حساس اداروں اور صاحبان دل و دماغ اور باسیان گلگت بلتستان تک پہنچانے کے لیے یہ سطور رقم کررہا ہوں۔ صرف داریل نہیں پورا گلگت بلتستان اس آگ میں جل رہا ہے۔ کتنی مائیں اپنے لاڈلوں کا ماتم کرچکی ہے۔ یہ راز اب راز نہیں کہ ہمارے پیارے گلگت بلتستان میں ہر طرح انہیں خاندانی، علاقائی، مذہبی، سیاسی اور لسانی دشمنیوں نے ''راج'' کر رکھا ہے۔ ہزاروں نامعلوم گولیوں نے ہزاروں انسانوں کو خاک و خون میں تڑپایا ہے۔ دو ہزار پانچ سے لیکر دو ہزار تیرہ تک کتنے لوگ انہی گولیوں کا نشانہ بن

چکے ہیں جن کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ بس اچانک کسی سمت سے کوئی گولی آجاتی ہے اور پھر انسان خون اور مٹی میں تڑپ رہا ہوتا ہے۔

ایک ایسے جرگے کی تشکیل جس کے مقاصد صرف اور صرف انسانوں کی جان بچانا ہوا۔ سیاسی اور مذہبی مفادات کا حصول کی بجائے انسانیت کی قدرو منزلت پہچان کر انسان کو انسان کی گولی سے بچانے کے لیے رضاالٰہی کی خاطر سامنے آنا چاہیے۔اس جرگے کا ون پوائنٹ ایجنڈا ہو کہ خاندانی، لسانی، مذہبی، سیاسی اور علاقائی دشمنیوں کو ختم کرائیں۔ میرے علم میں ایسی درجنوں کوششیں ہیں جن کا بہترین نتیجہ نکلا ہے۔ گزشتہ دنوں ہربن اور تھور کے درمیان ایک بہت بڑا تنازعہ عمائدین اور علماء کی جرگہ نے ختم کرادی اور جرگے سخت ترین دشمنوں کو گلے لگوایا۔ گلگت شہر میں کئی ایسی مصالحتیں ہوچکی ہیں جو خالص مذہبی بنیادوں دشمنیاں چل رہی تھی۔ جن پر کیس دائر کیا گیا تھا وہ مجرم ہی نہیں تھے مگر بے گناہ لوگ جیلوں میں سڑ رہے تھے۔ جرگوں نے مصالحت کرکے انہیں جیلوں سے بھی نکالا اور آزاد زندگی گزارنے کا موقع بھی دیا۔ بلاشبہ اس میں مذہبی قائدین نے بھی مرکزی کردار ادا کیا۔آج بھی اگر کوئی جرگہ صرف اس مقصد کے لیے سامنے آتا ہے تو لوگ جوق درجوق ان کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے تیار ہونگے۔ بخدا ! آج کے اس مصروف ترین دور میں کوئی بھی دشمنیوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ اگر ان دشمنیوں کا خاتمہ ہوا تو سینکڑوں بے گناہ لوگ جیلوں سے

باہر نکل جائیں گے اور ہزاروں گھروں میں چین اور سکھ کی زندگی شروع ہو جائے گی
اور لوگ اپنا کاروبار حیات پر سکون طریقے سے گزارنا شروع کریں گے۔ کوئی ہے جو
اس کار نبوت ﷺ کو آگے بڑھانے کے لیے میدان میں آ جائے؟ اللہ ہم سب کا حامی و
ناصر ہو۔

خواتین کے لیے مساجد

گزشتہ پانچ سال سے مجھے مسلسل سفر درپیش آرہے ہیں۔ بالخصوص سیاحتی و تفریحی اور پبلک مقامات پر زیادہ آنا جانا ہوتا ہے۔ ملک بھر سے ان مقامات پر لوگ اپنی فیملز کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سیاحتی و تفریحی اور پبلک مقامات پر سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں، تاہم جس چیز کی شدت سے کمی محسوس کی جارہی ہے وہ ملک بھر کے شاہراہات، تفریحی مقامات، پبلک پلیسس، شاپنگ سنٹرز اور سرکاری و غیر سرکاری محکموں، بڑے بڑے ہوٹلوں اور پارکس میں خواتین کے لیے طہارت خانے اور نماز کی آدائیگی کے مقامات کی عدم موجودگی ہے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان جیسے دیندار معاشرتی ملک میں بھی خواتین کے ساتھ یہ زیادتی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کہ طہارت اور قضائے حاجت جیسی بنیادی ضرورت اور نماز جیسی اہم عبادت کی ادائیگی کے لیے خواتین کو اتنا کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے اور غفلت برتی جاتی ہے۔ ائندہ سطور میں ہم اس کا جائزہ لیں گے کہ اسلام میں اس کے کیا احکام ہیں اور پھر موجودہ دور میں ان تمام مقامات پر طہارت خانے اور نماز پڑھنے کے لیے جگہیں اور مساجد میں خواتین کے لیے الگ جگہ کا ہونا کتنا ضروری ہوگیا ہے۔

عمومی طور پر گزشتہ کئی صدیوں سے خواتین کو مسجد سے دور رکھا گیا ہے تاہم قدیم مفکرین اور فقہاء نے بھی خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ مخصوص شرائط کے ساتھ خواتین مسجد میں نماز کیلئے جا سکتی ہیں، تاہم ان شرائط میں محرم کا ساتھ ہونا شامل نہیں ہے، چنانچہ بغیر محرم کے مسجد میں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اور مرد حضرات اپنی بیویوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت مانگنے پر منع نہیں کر سکتے، بشرطیکہ خواتین پردہ میں ہوں، اور ان کے جسم سے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئے جسے اجنبی لوگوں کیلئے دیکھنا جائز نہ ہو۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ : "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جب تمہاری بیویاں مسجد میں جانے کی اجازت مانگیں تو انہیں اجازت دے دو"۔ اسی طرح کی کئی روایات ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ خواتین کو عمومی حالات میں بھی مساجد میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے تاہم گھر میں نماز پڑھنا افضل اور بہتر ہے۔ تاہم امتدادِ زمانہ کی وجہ سے جب حالات بدل گئے اور کچھ مشکلات پیش آئی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے مشورہ سے عورتوں کا مردوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھنا بند کر دیا۔انتہائی مخصوص حالات کی وجہ سے یہ پابندی عائد کی گئی تھی۔

یہاں یہ ذہن میں رہے کہ خواتین اگر بے پردہ ہوں اور اس کے جسم کا ایسا حصہ عیاں ہو رہا ہو جو اجنبی نظروں کیلئے حرام ہوں، یا خوشبو لگائی ہوئی ہوں تو ان حالات میں ان کیلئے گھر سے باہر نکلنا بھی منع ہے، مسجد میں جا کر نماز ادا کرنا تو بعد کی بات ہے؛ کیونکہ اس میں فتنے کا خدشہ ہے، اور سورۃ النور میں اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ '' وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ یعنی اور اے نبی ! مومن عورتوں سے فرما دیں کہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کیا کریں۔ مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبان پر ڈالے رکھیں اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر اپنے خاوندوں کے لیے۔ اور اسی طرح بے پردگی اور بے حیائی کے حوالے سے دوسری جگہ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ '' ذَلِكَ أَدْنَى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا

رَحِیمًا'' (الاَحزاب) یعنی اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے فرمادیں کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں، یہ بہت ہی مناسب ہے تاکہ وہ پہچانی جائیں اور انہیں اذیت نہ پہنچائی جائے، اللہ تعالی بہت بخشنے والا اور نہایت مہربانی فرمانے والا ہے۔ان ایات مبارکہ سے بے پردگی اور فحاشی و عریانی کی ممانعت واضح ہے، اس کا سنجیدگی سے خیال کرنا چاہیے خواتین کو۔

فقہاء کرام نے بھی شرائط کے ساتھ خواتین کو مساجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ان شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ'' خواتین خود بھی اور دوسرے لوگ بھی فتنے سے محفوظ رہیں۔خواتین کے حاضر ہونے سے کوئی شرعی قباحت پیدا نہ ہورہی ہو۔ راستے میں اور جامع مساجد میں مردوں کے سامنے مت آئیں۔خوشبو مت لگائیں۔ مکمل پردے میں اور اپنی زینت چھپا کر گھر سے باہر نکلیں۔ مساجد میں خواتین کیلئے الگ سے دروازہ ہو، اور وہیں سے خواتین آئیں جائیں، عورتوں کی صفیں مردوں کے پیچھے

ہوں۔ مردوں کے برعکس خواتین کیلئے آخری صف بہتر ہے۔اگر امام نماز میں بھول چوک جائے تو مرد سبحان اللہ کہے، جبکہ عورت ہاتھ پر ہاتھ مارے۔ مسجد سے خواتین مردوں سے قبل چلی جائیں، اور مرد خواتین کے گھروں تک پہنچ جانے کا انتظار کریں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ جب خواتین نے ان قیود و شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا تو

اجازت بھی باقی نہیں رہے گی، اس بنا پر فقہائے اُمت نے، جو درحقیقت حکمائے اُمت ہیں، عورتوں کی مساجد میں حاضری کو مکروہ قرار دیا ہے، گویا یہ چیز اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہے، مگر کسی سبب کی وجہ سے ممنوع ہو گئی ہے۔اگر حالات و واقعات اور زمانے کی کیفیت اور معاشرت کے طور طریقے بدل جائے تو پھر احکام بھی بدل جاتے ہیں اور تبدیلی اجاتی ہے۔

اگرہم ان تمام دلائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اج کے دور کا جائزہ لیتے ہیں تو پھر ہمارے ہاں تبدیلیاں بہت زیادہ ائی ہیں۔ ان معاشرتی و سماجی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حالات وہ نہیں رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔آج مسلم معاشرے کے طور واطور مکمل بدل گئے ہیں، ایسے میں عزیمت کے بجائے رخصتوں پر بھی عمل ہوگیا تو بہت بڑی بات ہوگی۔اور وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان پیش آمدہ مسائل کے لیے نئے احکام و مسائل مرتب کیے جانے چاہیے۔ہزار سال پرانی باتوں پر اڑے رہنا کوئی مناسب نہیں۔شریعت اسلام میں اتنی تنگی بھی نہیں ہے۔

ہمارے معاشرے میں اب خواتین گھل مل گئی ہیں، عام خواتین کے علاوہ دین دار گھرانوں کی خواتین بھی تفریحی مقامات، شاپنگ سینٹرز، سرکاری و غیر سرکاری دفاتر، سفر، پارکس اور تجارتی مراکز وغیرہ میں روزانہ کی بنیاد پر چلی جاتی

ہیں۔ لوگ فیملز کے ساتھ ملک بھر کا سفر کرتے ہیں، سرکاری و غیر سرکاری ہسپتالوں میں بھی مردوں سے زیادہ خواتین کی تعداد ہوتی ہے۔ پھر ضرورت کی بنا پر لڑکیوں کے مدارس و جامعات بھی بڑی تعداد میں قائم کیے گئے ہیں۔ وفاق المدارس کی حد تک بنین کے مدارس و طلبہ سے بنات کے مدارس وطالبات زیادہ ہیں۔ یونیورسٹیوں میں بھی خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہیں۔

ایسے میں ایک افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ ان تمام مقامات میں خواتین کے لیے الگ طہارت خانے اور مساجد میں کوئی جگہ نہیں بنائی جاتی ہے۔ اگر محلے کی مسجدوں میں خواتین کے لیے الگ طہارت خانے اور مسجد میں جگہ کا اہتمام نہ بھی کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ان تمام مقامات پر بننے والی مساجد میں خواتین کے لیے باقاعدہ الگ جگہ کا ہونا ضروری ہے۔ اور ان کے طہارت خانے بھی مردوں سے الگ ہوں۔ اج کے دور میں یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ عورتوں کو گھروں میں محصور کرکے رکھا جاسکے۔ اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ خواتین لمبے سفر میں نماز ادا نہ کریں، یا دن بھر ان پبلک مقامات پر نماز نہ پڑھیں بلکہ شام کو گھر جاکر ایک ساتھ نماز پڑھیں۔ اور قضائے حاجت نہ کریں۔ میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ نماز جیسی بنیادی عبادت میں خواتین کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا تمام پبلک مقامات، یونیورسٹیز، تجارتی مراکز، تفریحی پوائنٹس اور بالخصوص لمبے راستوں پر بنائی جانے والی مساجد میں

خواتین کے لیے مکمل انتظامات ہونی چاہیے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ حکومت کے ساتھ دیندار معاشرہ بھی اتنی اہم ذمہ داری سے کیوں غفلت برت رہا ہے۔ ہمارے علمائے کرام اور دیگر طبقوں کو بھی اس حوالے سے عامۃ الناس کی درست رہنمائی کرنی چاہیے۔ میں نے اج تک کسی دانشور، کسی کالم نگار، کسی ٹی وی اینکر، کسی عالم دین اور کسی مبلغ کو خواتین کے لیے ان بنیادی ضروریات پر بات کرتے نہیں سنا۔ اور نہ ہی خواتین نے اپنی اس ضرورت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ سڑکوں پر احتجاج کرنے تو نکلتی ہے لیکن ایک انتہائی بنیادی ضرورت کے حوالے سے کوئی اقدامات کے لیے اواز نہیں اٹھاتی۔ ہمیں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اس کے لیے کام کا آغاز کرنا ہوگا۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

دیامر: تباہی کے دھانے پر

بلاشبہ ضلع دیامر سرتاپا کرپشن بداخلاقی، بیحسی اور کسالت پسندی، خود غرضی، لالچ، حرص و حوس، اقربا پروری میں ڈوبا ہوا ہے۔آہ! وہ دیامر جس کی روایات واقدار پر بلاشبہ فخر کیا جاتا تھا آج تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے۔ایک طویل عرصہ یہ سمجھا جاتا رہا کہ دیامر میں ایمان و عقیدہ مضبوط ہے۔ امن و سکون اور اعتماد واطمینان کی بہاریں چار سو ملتی ہیں۔ قناعت و استغنا دیامر کا خاص خاصہ ہوا کرتا تھا۔ لوگ غربت میں بھی خوش ہوا کرتے تھے۔ محبت و الفت اور انسانیت کی قدر بلاشبہ یہاں فراواں تھی۔ اس پر مستزاد فطرت کی سادگی اور اس کا حسن، اللہ اور اس کی مخلوقات سے مخلصانہ تعلق اور پھر جسم و روح کا حسین اتحاد ضلع دیامر کی عظیم روایات میں ہوا کرتیں تھیں۔ایک وقت تھا باسیان دیامر کا اندرونی اتحاد اور ہم آہنگی بہت مضبوط ہوا کرتی تھی۔ اور ان کو تقسیم کرنے والے عناصر بہت ہی مصنوعی تھے۔آپس میں رشتہ اور تعلق کی بنیادیں روپیہ پیسہ اور رنگ و نسل کی بنیاد پر نہ تھیں بلکہ ایمان ، تقوی اور کردار کی بنیاد پر قائم تھی۔

لیکن انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام باتیں ماضی کا قصہ بن گئی ہیں۔ حالات واقعات اور تمدنی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں

ہوتی کہ دیامر میں بے یقینی اور ناامیدی نے بری طرح ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ پورا معاشرہ اضطراب اور انتشار کا شکار ہے۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے اغراض و مقاصد کا تصادم برپا ہے۔ سیاسی جماعتوں بلکہ سیاسی اشخاص کی رقابتیں اور چپقلشیں عروج پر ہیں۔ پھر خاندانی، قوم ذات پات اور طبقات کی کشمکش نے زندگی اجیرن بنا کر رکھ دی ہے۔ بے اعتمادی اور بدگمانی کی تاریک فضائیں پورے دیامر کے فضاوں کو محیط ہیں۔ جائز اور ناجائز حصول دولت اور ترقی و توسیع تجارت ضلع دیامر کے پیر و جوان میں جنونیت کی حد تک سرایت کرگیا ہے۔ میں نے انتہائی غور سے دیکھا ہے کہ دولت و حرص کی ایک نہ بجھنے والی پیاس ضلع دیامر کے جوانوں میں پائی جاتی ہے۔ دولت کی اس ہوس نے قلب و روح کو مار دیا ہے۔ انسانیت زوال کے دروازے پر کھڑی ہے۔ زندگی کی اصل دولت اور انسانیت کی اصلی لطافت کا یہاں سے خاتمہ ہوا جارہا ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق بھی ٹوٹنے کو ہے یا انتہائی کمزور ہوچکا ہے۔ اجتماعی روایات میں رسہ کشی جاری ہے۔ زندگی کے نئے نئے فتنے یہاں سر آٹھا رہے ہیں۔ عجیب و غریب فیشنوں نے انسان کو سخت کش مکش میں ڈالا ہوا ہے۔ آہ! نظریں ان اوصاف حمیدہ اور خصائص عالیہ کے لیے ترستی ہیں جن پر کبھی اہلیان دیامر فخر کیا کرتے تھے۔ آپس کا اتحاد و اتفاق دم توڑ رہا ہے۔ تعلق و احترام کی بنیادیں، روپیہ پیسہ، عہدہ اور گاڑی پر منحصر ہوکر رہ گیئں ہیں۔ علم و عمل، تقوی و للٰہیت اور کردار کی بنیاد پر ضلع دیامر میں کسی کو عزت نہیں ملتی بلکہ سرکار کی جتنی بڑی نوکری ہوگی اتنا ہی

وہی شخص عزت و احترام کا حق دار کہلایا جائے گا۔
دیامر بھاشا ڈیم کی مد میں ضلع دیامر میں اربوں روپیہ آیا لیکن یہ تمام روپیہ دیامر سے باہر صرف ہوئے۔ ان روپیوں سے ضلع دیامر کی تعمیر ترقی اور تعلیم تربیت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں کو کروڑوں میں روپیہ ملا انہوں نے گلگت، اسلام آباد اور دیگر شہروں میں چھوٹے چھوٹے مکان یا پلاٹ مہنگے داموں خرید لیے۔ انہیں غلطی سے بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ دیامر کے کسی علاقہ میں رہائشی سوسائٹی بناتے اور لوگوں کی رہائشی زندگی کا اسلوب بدل کر رکھ دیتے۔ کاش ان اربوں روپیہ سے کوئی ڈھنگ کا تعلیمی ادارہ ہی بنا لیا جاتا۔ جن لوگوں کو ڈیم کی مد میں پیسہ ملا ہے ان کی اخلاقیات اور طرز زندگی بھری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ کل تک جن کے پاس گلگت جانے کا کرایہ نہیں ہوا کرتا تھا آج وہ لینڈ کروزر اور ٹی زیڈ گاڑیوں میں فراٹے بھر رہے ہیں۔ آخر کب تک اپنی اس متاع عزیز کو یوں بے دردی سے لوٹاتے رہیں گے؟ کب تک ان کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا؟
سرکار بھی خاموش تماشائی بن کر اس سارے عمل کو دیکھ رہی ہے۔ دیامر میں اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اور تو اور دیامر کے کیپٹل چلاس شہر میں صفائی اور پانی و سیوریج کی ناقص اور بدترین صورت حال دیکھ کر افسوس کے سوا کسی چیز کی

گنجائش نہیں۔ بازار اور رہائشی کالونیوں میں گندے پانی نے ڈیرے جمایا ہوا ہے۔ لیکن کسی کے کانوں جوں تک نہیں رینگتی۔ آپ کسی کے بھی گھر میں داخل ہونگے تو بہترین سسٹم اور انتظام دیکھنے کو ملے گا لیکن جیسے ہر گھر سے باہر گلی میں قدم رکھتے ہیں تو گندگی کا ڈھیر آپ کا سامنا کریگا۔ جتنی توجہ ذاتی گھر اور ذاتی زندگی کی بہتری کے لیے دی کی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی اجتماعی معاملات کے لیے صرف ہوتی تو بخدا صفائی کا نظام اور سڑکوں کی حالت بہت اچھی ہوتی لیکن، روڈ ٹوٹے، بجلی نہ آئے، گندا پانی پورے شہر میں پھیل جائے، جگہ جگہ بے جا کنسٹریکشن ہو، ہر طاقتور ناجائز قبضہ کرے، بازار میں تمام دوکاندار من مانی قیمتیں وصول کریں،گاڑی والے مرضی سے کرایہ طے کریں، سرکاری عملہ دفاتر میں ہوں یا نہ ہوں، ٹھیکدار کام کرائے یا نہ کرائے،اسکول کالج آباد ہوں یا نہ ہوں، ہسپتال میں کوئی حاضر ہو یا نہ ہو، جعلی ادویات بکے یا اصلی، اشیا خود نوش میں ملاوٹ ہو یا نہ ہو، عدالتوں میں انصاف ہو یا نہ ہو، پولیس گردی، آفسر گردی، غرض کسی کو کسی چیز سے غرض نہیں۔ بس ہر کوئی اپنی اپنی ذاتی زندگی میں تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ اور تمام تر کوششیں اپنی ذات کی حد تک کے لیے کی جاتیں ہیں۔

ضلع دیامر اور اس کے مضافات کو تو چھوڑیں، ہیڈ کوارٹر چلاس کی انتظامی و انصرامی حالت دیکھ کر حیرت ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ باقی تمام سرکاری

ڈیپارٹمنٹس کی کارکردگی کو چھوڑیں، تعلیم اور صحت جیسے اہم اور بنیادی ضروریات والے اداروں کی ایک مختصر سی بات ملاحظہ کیجیے۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال چلاس میں ڈاکٹروں کی سیٹیں ہیں لیکن آٹھ ڈاکٹر چلاس ہسپتال میں ڈیوٹی انجام دیتے ہیں باقی 36 تمام ڈاکٹر چلاس ہسپتال سے تنخواہ لے رہے ہیں لیکن ڈیوٹیاں گلگت اور دیگر من پسند علاقوں میں دے رہے ہیں۔ اسی طرح ڈگری کالج چلاس میں 20 استادوں کی سیٹیں ہیں ان میں 9 چلاس ڈگری کالج میں ہیں باقی گیارہ اپنی پسندیدہ کالجوں میں ہیں لیکن تنخواہ ڈگری کالج چلاس سے لیتے ہیں۔اب گلہ کریں تو کس سے کریں، وزیر صحت بھی دیامر کا ہے اور سیکرٹری ایجوکیشن بھی دیامر کا ہے۔ اپنوں کی نگرانی اور سرپرستی میں یہی حال ہے تو دیگر ڈیپارٹمنٹس کے متعلق آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

کافی دنوں سے یہاں کے لوگوں کے رویے مطالعہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان کے جذبات واحساسات کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں شعور وآگاہی کا کتنا فقدان ہے۔انتہائی مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت، قوم کی جگہ ذات، اور خدمت کی جگہ خودغرضی جیسی لعنتوں نے یہاں کی معاشرت برباد کرکے رکھ دی ہے۔ یہ وہ اسباب و محرکات ہیں جنھوں نے ہر انسان کو متاثر کیا ہوا ہے۔

یہ سچ ہے کہ دیامر کے لوگوں کا لباس، مہنگی گاڑیاں، بینک بیلنس اور سامان حیات دیکھ کر ان کی خوش قسمتی، خوش حالی اور معاشی بہتری کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے چہروں پر چھائی ہوئی مغمومیت، ان کی اداس شکلیں، اور جعلی اور پھیکی مسکراہٹوں سے یہ اندازہ کرنا قطعاً مشکل نہیں کہ ان کے اندر کوئی بے اطمینانی اور کرب ہے جو انہیں سکون و طمانیت سے رہنے نہیں دیتا۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا دنیاوی مال و متاع کی فروانی ہر چیز کا علاج اور مداوا ہے؟۔ باسیان دیامر کی زندگی میں اتنی جلدی یہ تضاد کیوں واقع ہوا ہے۔۔؟ وہ کونسا کرب ہے جس سے یہاں کے نوجوان گزرنا شروع ہوئے ہیں۔۔۔؟ ان کا اصل مرض کیا ہے جو گھن کی طرح ان کو کھایا جارہا ہے۔۔۔؟ انتہائی سادہ الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ قناعت کا فقدان، اپنی شاندار روایات اور تعلیمات اسلامی سے دوری اور ھل من مزید کی لعنت نیانہیں تباہی کے چوراہے پر کھڑا کیا ہوا ہے۔ دولت کی دیوی اور ناجائز حرص نے ہر انسان کو لپیٹا ہوا ہے۔ اس کے حصول کے لیے ہر ممکن اور ناجائز کوشش جاری ہے۔ان کی یہ صورت حال کو ''خوشحال بے چینی'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

بہرصورت، تعلیم وصحت، تہذیب وتمدن، کرپشن، انتظامیہ کی لاپروائی، علما و صلحاء کی خاموشی، رشوت خوری، معاشرتی مسائل، سماجی ناانصافی، فکر و شعور کی کمی، اقربا پروری، قومیت، لامرکزیت، حرص و حوس اور اس جیسے بے شمار

مسائل ہیں جن پر وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں اور آئندہ بھی خامہ فرسائی کی جائے گی۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہے۔

چیلنج قبول کیجیے

ضلع دیامر کے حوالے سے بہت لکھا، سینکڑوں امراض کی نشاندہی کی۔ سنجیدہ احباب نے تشخیص شدہ امراض کی دوا کا تقاضہ کیا۔ اور جذباتی دوستوں نے حسب سابق جذبات سے ہی کام لیا۔ اور مجھے ناہنجار ٹھہرایا۔ آج میں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف ایک دو پہلوں کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اگر کسی صاحب کو اس پر سنجیدگی سے غور کرکے کوئی خدمت کرنے کی توفیق ہوئی تو میں سمجھونگا کہ میری تحریر اپنے ہدف کو پہنچی۔

لاریب کہ دیامر ڈیم اور سی پیک کی وجہ سے ضلع دیامر میں ہر قسم کی تبدیلیاں رونما ہونگی۔ سب کچھ بدل کر رہ جائے گا۔ آج سے قبل ہمارے بزرگوں نے اور اصلاح پسندوں اور علماء کرام نے جس نہج پر بھی کام کیا یقیناً قابل صد تعریف ہے۔ لیکن آج کے دور میں زمانہ بڑا سرگرم ہوا ہے۔ خیالات، ضروریات، تقاضے اور میادین بدل گئے ہیں۔ نئے نئے چیلنجوں نے معاشرے کا سامنا کیا ہوا ہے۔ اور آئندہ مزید چیلنجز کا سامنا ہوگا۔ ہمارے بزرگوں نے جس انداز میں کام کیا ہے اب زمانہ اور حالات اس سے بہت زیادہ کے طالب ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ زمانے کا دامن جتنا سمٹ گیا ہے اتنا پھیل بھی گیا ہے۔ بلاشبہ جن لوگوں کو رہنمائی اور لیڈری کا دعویٰ ہے۔ بالخصوص دینی رہنمائی، زمانہ ان سے جدید سیاسی و

سماجی اور معاشرتی تغیرات اور ایک خاص پیمانے کے مطابق رہنمائی چاہتا ہے۔ رہبری چاہتا ہے۔لاریب آج کا زمانہ کسی لیڈر، عالم، مصلح کو اس وجہ سے سند دے کہ وہ اچھی تحریر و تقریر پر قدرت رکھتا ہے یا کچھ متوسط درجے کی خدمات انجام دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ضلع دیامر میں عام ذہنی انتشار اور ایک مخصوص قسم کی مایوسی پھیل رہی ہے۔جدید نوجوان طبقہ اور حاملین دین میں یہ مایوسی کچھ زیادہ ہی محسوس کی گئی ہے۔ اسی اعتبار سے آج، پہلے سے زیادہ تیاری کی ضرورت ہے۔ کل تک ہمارے علماء و صلحاء اور رہبرانِ قوم نے جس نہج پر کام کیا ہے آج اس کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ ایک نئی سوچ، فکر اور جدید انداز کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔اگر ہم ان چیزوں پر اڑے رہیں گے اور انہی استدلالات اور مناہج پر ہی آگے بڑھنے کی سعی کریں گے تو بلاشبہ ہم مایوسی اور قنوطیت کے سوا قوم کو کچھ بھی نہیں دے سکیں گے۔آج بہت زیادہ وسیع علم و عمل، اور زیادہ محنت و کاوش کی ضرورت ہے۔

یہ ماننے میں کوئی عیب نہیں کہ زمانہ آسانی کے ساتھ کسی کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ سچ ہے کہ زمانہ بہت بڑا ظالم اور بے رحم ہے۔زمانہ کسی بڑی سی بڑی شخصیت اور مقدس جماعت کے ساتھ بھی آسانی سے مروت کرنے کے لیے تیار نہیں۔پرانا اور بوسیدہ طرز و اسلوب اور تسلسل کو قبول کیا جانا بعید ہے۔ جب تک حقیقت پسندی اور نئے انداز و اسلوب سے کام نہ کیا جائے اور زمانے کو

مجبور نہ کیا جائے وہ کبھی بھی آپ کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کبھی بھی آپ کے سامنے نہیں جھکے گا۔ آج کے مغربیت و مادیت سے بھرپور زمانے سے کسی قسم کی سند لینا، کوئی اعزاز کا اعتراف کرانا، اور کوئی خراج عقیدت وصول کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔

لاریب اس کے لیے علمی معیار کو مزید بڑھانا ہوگا، سخت قسم کی جدوجہد کرنی ہوگی۔ قدیم طرز کے دینی و عصری اداروں کے بجائے جدید قسم کے ادارے اور نئے انداز قائم کیے جانے چاہیے۔ بے شک علم نے بہت ترقی کی، نئے نئے شعبے قائم ہوئے ہیں۔ علمی و فکری دنیا نے کروٹ لی ہے۔ ایسے میں محض دلنشیں تقریریں، برجستہ تحریریں، خیالی افکار اور صدیوں پرانی کتابوں کی ر تفکیشن قطعاً کافی نہیں۔ بلکہ قدیم و جدید علوم سے لیس ہونے کے ساتھ بلند کردار، دل سوزی و دردمندی کی بھی اشد ضروت ہے۔ یعنی ایسے رجال کار پیدا کیے جائیں جن میں زمانے کی تمام ضروریات اور تقاضوں کی سمجھ بھی ہو اور ان ضروریات کو اسلام کی روشنی میں بیان بھی کر سکیں اور نہ صرف بیان بلکہ اسلام کی حقانیت اور قوانین اسلام اور افادیت اسلام کا نقش معاشرے کے دلوں میں بٹھا سکیں اور زندگی کی ہر مشکل کے ساتھ اسلام کا پیوند درست طریقے سے لگا بھی سکیں۔ ایسے رجال ہوں کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ اسلام جدید دور کی تمام ضروریات کو نہ صرف پورا کرسکتا ہے بلکہ اسلام کسی بھی خود ساختہ چیز سے بہت اعلی و ارفع ہے۔ زمانہ خواہ کتنی بلندی پر فائز ہوا ہو، حالات نے کتنا نیا رخ لیا ہوا ہو، دنیا خواہ کتنی ترقی کے منازل طے کر چکی ہو لیکن اسلام ان سب

کی رہنمائی کرتا ہے اور جدید ذہن اور مادیت کے دلدادوں کے دل و دماغ میں اٹھنے والے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

میرا ضمیر روز مجھ سے مخاطب ہوتا ہے کہ فکری انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر قسم کی چیلنجز کو قبول کرکے ان کے معیار کے مطابق خود کو بدلنا ہے۔ تیاری کرنی ہے۔ علم و عمل اور فکر و اسلوب اور ذہانت و سنجیدگی کا وہ معیار قائم کرنا ہے جو زبان کے اعتبار سے، جو انداز و اسلوب اور سنجیدگی کے اعتبار سے اور مواد کے اعتبار سے غرض ہر اعتبار سے معاشرے کو، جدید ذہن کو اور مغلوب سماج کو متاثر کرنے والا ہو، اور اس عظیم کوشش کو دیکھ کر زمانہ خود اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے کہ ایک ایسی چیز پیش کی گئی ہے جو وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بے شک زمانہ ہم سے ان سب چیزوں کا طالب ہے جو زمانے کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم نے وہ چیزیں مہیا نہیں کی تو یاد رکھیں۔ ہم بہت پستی میں گر جائیں گے۔

خلاصہ کلام، بدلتے اطور و افکار اور تہذیب و خیالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سینکڑوں رجال تیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے شاندار اور اعلی قسم کے علمی ادارے قائم کیے جانے چاہیے۔ ایسے ادارے جن سے نکلنے والے افراد دین و دنیا دونوں کی شمعیں لے کر معاشرے اور سماج کی رہنمائی کریں۔ سماج کی دنیاوی اور

دینی واخروی اصلاح اور درستگی ان اداروں اور درسگاہوں کے بنیادی مقاصد ووظائف میں شامل ہوں۔خدانخواستہ اگر اس پہلو کو نظرانداز کیا گیا تو دیامر اپنی تمام ترافادیت اور اہمیت کو کھو بیٹھے گا۔اور پھر ہر قسم کی بدبودار چیزیں یہاں داخل ہونگی۔پھر ان کے تعفن اور مضرات سے کوئی روک نہیں سکے گا اور پوری فضا متاثر ہوگی۔

کسی ایک گروپ کو ان تمام مشکلات کا ادراک کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔اس گروپ میں اصلاح احوال کا جذبہ ہونا چاہیے۔ کردار کی بلندگی، قلب کی درمندی، سوز دروں وافر مقدار میں موجود ہو، اور اس کی کاوشوں اور محنتوں سے ہزاروں دل گرما جائے اور ایک درست معاشرتی انقلاب کا آغاز ہوجائے۔ ورنہ تحریروں، تقریروں اور نعروں اور روپیہ پیسہ کی فراوانی سے اور نہ ہی نادر علمی تحقیقات اور قلم کی روانی سے انقلاب آئے ہیں نہ آئیں گے۔ اور نہ ہی جدید ٹیکنالوجی سے کسی معاشرہ اور قوم کی قسمت بدل جاتی ہے نہ بدل گئی ہے۔پرانے خیال کو نئے طرز میں پیش کرنے سے بھی کام نہیں بنے گا۔یا نہ ہی نئے جام میں شرابِ کہن کو زمانہ قبول کرتا ہے۔ بلکہ زمانہ ٹھوکر مار کر آگے نکل جاتا ہے۔اللہ سب کا حامیو ناصر ہو۔

انداز بیاں گرچہ میرا شوخ نہیں ہے۔
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

ریاست ماں ہوتی ہے

اسلام کی اولین ریاست مدینہ منورہ ہے۔ اس ریاست کا قیام خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اس ریاست کے شہری یہود مدینہ، عیسائی، مسلمان (انصار و مہاجر) اور منافقین و مشرکین تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس اولین ریاست میں ایک معاشرتی معاہدہ فرمایا جس کو معاہدہ مدینہ یا میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس میثاق میں مذکورہ تمام شہریوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک معاہدہ '' معاہدہ حدیبیہ '' کے نام سے کیا گیا اس میں برسرپیکار دشمن کے ساتھ مصالحت کے امور طے ہوئے اور یہ معاہدہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی انوکھا ہے۔ اسی طرح کے کئی معاہدات ہوئے جن سے معاشرتی امن وامان اور شہریوں کی مال جان عزت وآبرو کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا۔ یہ سارے امور اسلامی ریاست نے انجام دیے۔ اسی طرح انسانی دنیا میں معاہدوں اور میثاقوں کی بہتات ہے اور بڑی اہمیت بھی ہے۔ ان کے دورس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

گلگت بلتستان میں بھی دو معاہدے ایسے ہوئے جن کو عوامی پذیرائی کے ساتھ سرکاری رہنمائی بھی حاصل ہوئی۔ 2005ء کے کشیدہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے گلگت بلتستان کی اسمبلی نے ایک پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی جس کی سربراہی محترم ملک مسکین صاحب کررہے تھے۔ اس امن معاہدہ کی تیاری میں مکتبۂ اہل سنت

واہل تشیع کے سرکردہ 36 عوامی نمائندے اور علمی شخصیات شامل تھی۔ اس کو ''امن معاہدہ گلگت'' کا نام دیا گیا۔ اس معاہدہ میں بہت خوبصورت طریقے سے عوامی اور علاقائی مفادات کا تحفظ کیا گیا۔ پھر شومئی قسمت 2012ء میں گلگت بلتستان کے حالات کشیدہ ہوئے اور خونی مناظر دیکھنے میں آئے تو گلگت اسمبلی نے ایک ضابطہ اخلاق بنایا۔ اس ضابطہ اخلاق میں بھی دین و دنیا کے تمام اہم معاملات کو تحفظ دیا گیا۔ دینی اقدار اور معاشرتی اصول و ضوابط اور ضروریات دین کی حفاظت کی گئی۔ اس معاہدے کو بھی اہل سنت واہل تشیع کے مرکزی مذہبی قیادت کی تائید حاصل ہوئی۔ گلگت اسمبلی میں بحث سے پہلے اس ضابطے پر دونوں فریقین کی مرکزی قیادت نے دستخط ثبت کیے اور پھر باقاعدہ اسمبلی ممبران نے ووٹنگ کے ذریعے اس کو قانون کا حصہ بنایا اور گزٹ آف پاکستان نے 15 اکتوبر 2012ء کو شائع کیا۔ ان دونوں معاہدوں اور ضوابطہ کی وجہ سے گلگت شہر اور اس کے مضافات میں امن کا قیام یقینی ہوگیا تھا۔ سول انتظامیہ کے ساتھ حساس اداروں نے بھی قیام امن میں مرکزی کردار ادا کیا مگر بدقسمتی سے 2016ء کے اواخر میں پھر سے شہر گلگت اور اس کے مضافات بدآمنی کا شکار ہو رہے ہیں۔ حکومتی رٹ کو چیلنج کیا جانے لگا۔ مساجد وامام بارگاہوں سے نفرت انگیز خطبات دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ ریاستی رٹ کو انتہائی ڈھٹائی سے چیلنج کیا جا رہا ہے۔ ایک دوسروں کے خلاف نفرت آمیز قرار دادیں اور تقاریر کا سلسلہ جاری ہے۔ اپیکس کمیٹی پاکستان اور نیکٹا کے احکامات پامال کیے گئے۔ تعلیمی اداروں

کو متنازعہ بنایا گیا۔ بد قسمتی سے مقدس شخصیات اور اولوالعزم لوگوں کی توہین کی گئی۔ سرکاری عمال اور پارلیمانی کمیٹوں کو رسوا کیا گیا۔ دو طرفہ مذہبی قیادت دھرنوں اور احتجاجوں پر اُتر آئی ہے، اور شومئی قسمت دیکھیں کہ مذہبی قیادت سیاسیوں عزائم رکھنے والوں کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ معروف وفاقی سیاسی پارٹیوں کی بد قسمتی دیکھیں کہ ان کی علاقائی قیادت بھیمذہب کے نام پر تقسیم ہے۔ عوام نہ چاہتے ہوئے بھی ایک کو ایک مذہب کے ساتھ جبکہ دوسری پارٹی کو دوسری مذہب کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ان میں عوام کا قصور کم اور ان سیاسی پارٹیوں کا قصور زیادہ ہے۔

ایک دفعہ پھر یہ خدشہ پیدا ہوگیا ہے کہ گلگت بلتستان میں کسی طے شدہ منصوبے کے تحت بدآمنی کروائی جائے گی۔ جس کے لیے جو جو استعمال ہو سکتا ہے اس کو کرنی کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ سی پیک جو ملک بھر کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے کو متنازعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ایک طبقہ بے جا حمایت کرتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ بے جا مخالفت، دونوں کے پاس حمایت و مخالفت کے کمزور دلائل ہیں۔ سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو یہ دونوں طبقے آپس کی چپقلش کی وجہ سے سی پیک جیسے انٹر نیشنل پراجیکٹ کی مخالفت و حمایت کرتے ہیں جو انتہائی افسوسناک ہے۔

انسان جب اندھا مقلد ہوتا ہے تو اس کو اپنوں کی غلطیاں بھی صحیح لگتی ہیں اور غیروں کی درستگیاں بھی غلطیاں ہی لگتی ہیں۔ گلگت بلتستان میں بھی یہی ماحول پیدا ہوگیا ہے۔اچھائی اور برائی، صحیح اور غلط، حق اور ناحق کا درست تجزیہ کوئی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ہر ایک وہی راگ آلاپتا ہے جو اسکی قیادت کہتی ہے۔ قیادت کی سوچ، فکر اور نقطہ نظر سے ہٹ کی درست سمت رہنمائی کرنے کے لیے نہ کوئی لیڈر سامنے آتا ہے نہ کوئی مفکر۔ بس چھوٹے چھوٹے خانوں میں قوم کو ایک دفعہ پھر سے تقسیم کرنے کا عمل بری طرح جاری ہے۔ کچھ معاملات بالخصوص گندم سبسڈی کے حوالے سے گلگت بلتستان کی قوام ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوچکی تھی لیکن اپنوں کی بے رعنائیوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں نے اس اتحاد و یکجہتی کو تار تار کردیا۔جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔کاش ہم مذہبی یا نام نہاد سیاسی بن کر سوچنے کے بجائے انسان بن کر سوچتے۔ جب تک انسانیت کی سوچ ہمارے دل و دماغ میں سرایت نہیں کرے گی تب تک یہ حالات کبھی درست نہیں ہوسکتے۔بڑی سی بڑی حکومتیں اور سزائیں کچھ بھی نہیں کرسکیں گی۔ گلگت بلتستان بالخصوص شہر گلگت کی موجودہ صورت حال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آئین پاکستان، نیشنلایکشنپلان، فوجداری قوانین، انسداد دہشت گردی کی عدالتیں،امن معاہدہ اور ضابطہ اخلاق، ایپکس کمیٹی کے احکامات اور نیکٹا کے قواعد و ضوابط کسی مخفی کونے میں جاکر آرام فرمارہے ہیں اور انکا صحیح استعمال یہاں نہیں ہوسکتا۔ قانون سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ جرم کرنے والا

مجرم ہے چاہیے جس علاقہ و مذہب سے تعلق رکھے۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ ریاست کی رٹ بحال ہو تو ملکی قوانین کے ذریعے گلگت بلتستان کو جہنم کا گھڑ بنانے والوں کے خلاف سخت سے سخت کاروائی عمل میں لائی جانی چاہیے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان قوانین کی مد میں کوئی بے گناہ انسان قانون کے شکنجے میں نہ آئے۔ اگر قانون کا استعمال مخصوص لوگوں کو ٹارگٹ بنا کر کیا گیا اور اس میں سیاسی و مذہبی چپقلشوں کو مد نظر رکھا گیا تو یہ ظلم عظیم ہوگا۔ بہر صورت قانون کی نظر ہر ایک کے لیے یکساں ہونی چاہیے۔ قانون کا ایک ہی مطلب ہو کہ مجرم کا نام بس مجرم ہے کوئی اور نہیں۔ اگر یہ جرم حاکم وقت کا بیٹا یا بھائی بھی کرتا ہے تو قانون کے مطابق اس کو بھی کٹہرے میں لا کھڑا کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو امید ہے میرا پیارا گلگت بلتستان بہت جلد جنت کا منظر پیش کرے گا۔

میں انتہائی دردمندی کے ساتھ عامۃ الناس بالخصوص تعلیم یافتہ طبقے سے گزارش کرونگا کہ خدارا! اپنی دھرتی کی حفاظت کے لیے ریاست کے ساتھ دیں۔ ریاست ماں سے بھی عظیم ہوتی ہے۔ اس کی رٹ کو کسی صورت چیلنج نہ کیجیے۔ ریاست نے ہمیں سب کچھ دیا ہے اور ایک دفعہ بھی احسان نہیں جتلایا مگر ہمیں بھی اس ریاست کی حفاظت کے لیے اس کے بنائے قوانین کو دل و جان سے تسلیم کرنا چاہیے۔ ریاست کبھی نہیں چاہیے گی کہ وہ اپنے کسی بے گناہ شہری پر ظلم کرے یا سزا دے۔

لہٰذا اس ماں کی تقدیس کا خیال رکھے۔ ہر وہ عمل جو ریاست پاکستان کے لیے مضر ہو اس سے خصوصاً اجتناب کرے۔ یہ ریاست کسی خاص فرقے، قوم اور رنگ کے لوگوں کی نہیں۔ یہ ہم سب کی ریاست ہے۔ اور اسکی تقدیس کی حفاظت اور اس کے قوانین پر عمل ہم سب نے کرنا ہے اور اسے فوائد و ثمرات بھی ہم سب نے مل کر حاصل کرنے ہیں۔ خدارا! اس ریاست کی حفاظت کیجیے۔ اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھیں جو سالوں باہر کی دنیا میں رہ کر اپنی ریاست کو لوٹتے ہیں۔ میں نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے مملکت عزیز کے ایئرپورٹوں پر اتر کر ہی اس زمین کو سجدہ کیا ہے اور اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ہمارا آپس کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہمارے مفادات الگ ہو سکتے ہیں، ہماری پالیساں الگ ہو سکتی ہیں۔ ہماری سیاسی سوچ الگ ہو سکتی ہے۔ ہمارا فکر و نظر مختلف ہو سکتا ہے۔ ہماری زبان اور علاقہ بھی مختلف ہو سکتا اور ہمارا مسلک و مذہب بھی الگ ہو سکتا ہے لیکن یاد رہے یہ ریاست ہم سب کی مشترکہ ہے۔ یہ کسی کی مخصوص نہیں۔ آئین پاکستان اس کی ضمانت دیتا ہے۔ اتنی بڑی ضمانت کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ضمانت کی ضرورت نہیں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے افعال و اعمال اس چیز کی غماری کرتے ہیں کہ ہم اس ریاست سے شاکی ہیں۔ ہم اس کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور ہم اس کے بدخواہوں کے لیے امدادی کارکن بنتے جاتے ہیں۔ تو آیئے، عہد کیجیے۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم ریاست کے تمام اداروں کی حفاظت کریں گے اور قانون پر عمل کریں گے اور اپنے جائز مقاصد اور مفادات کی حفاظت قانون و

آئین کے دائرے میں رہ کر کریں گے۔ ہم آئین پاکستان، امن معاہدہ اور ضابطہ اخلاق کو سینے سے لگائیں گے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم ہر اس عمل، قول اور فعل سے اجتناب برتیں گے جس سے ریاست کمزور ہوتی ہو اور ہم ہر وہ کام کی حمایت کریں گے جس سے ریاست مضبوط ہوتی ہو۔ کیونکہ ریاست ماں ہوتی ہے۔ کیا ہم اپنی ماں کے مخالف ہو سکتے ہیں۔۔۔؟ یقیناً نہیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

گلگت میں نشانِ اقراء: ایک شاندار تقریب

یہ سچ ہے کہ تعلیم ہی مسلمانوں کی متاع گم شدہ ہے۔ دنیا میں اسلام واحد دین ہے جس کا آغاز ہی تعلیم سے ہوا ہے۔ وحی کا آغاز بھی ''اقراء'' سے ہوا ہے۔اسی گمشدہ متاع کے حصول کے لیے 1984ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں بزرگان دین کے ہاتھوں ''اقرار روضۃ الاطفال ٹرسٹ'' کے نام سے ایک تعلیمی تحریک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اس تحریک کی جڑیں ملک کے طول وعرض میں پھیل چکی ہیں اورتاحال اس کی شاخوں کے پھیلاؤ کا سلسلہ جاری ہے۔آج ملک عزیز کے چاروں صوبوں، گلگت بلتستان، چترال اور آزاد کشمیر میں مجموعی طور پر اقرار روضۃ الاطفال ٹرسٹ کی 180 شاخیں ہیں۔ان شاخوں میں حفظ قرآن کے ساتھ گریجویشن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان شاخوں میں مجموعی طور پر 76,000 سے زائد طلباء و طالبات زیر تعلیم ہیں۔بنیادی طور پر اقراء کراچی سے پشاور اور گلگت بلتستان تک سینکڑوں شاخوں کا مربوط تعلیمی نظم ہے۔

اقراء روضۃ الاطفال ٹرسٹ کے ذمہ داروں نے گلگت بلتستان کے اقراء کی شاخوں سے مستفید ہونے والے طلبہ وطالبات کو ''نشانِ اقراء'' دینے کے لیے مختلف اضلاع میں تقاریب کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی تقریب ضلع گلگت میں

منعقد کی گئی۔ مزید دو تقریبات ضلع غذر اور دیامر میں منعقد ہونی ہیں۔ برادرم نوید احمد اور اقراء حفاظ گلگت بلتستان کے نگران قاری حسین احمد کی مخلصانہ دعوت نے مجھے بھی اس تقریب میں شرکت کرنے پر مجبور کیا۔ بہت ہی مختصر وقت میں ایک شاندار تقریب گلگت بلتستان کے مرکزی عیدگاہ کنوداس میں منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں گلاپور و متعلقہ، جگلوٹ و متعلقہ اور گلگت و متعلقہ برانچوں کے 556 حفاظ اور 566 حافظات کو نشانِ اقرا سے نوازا گیا۔

عیدگاہ میں منعقد یہ تقریب انتہائی منظم اور مختصر تھی۔ اسٹیج کے تمام فرائض اقراء کے نابالغ طلبہ وطالبات نے انجام دیے۔ پنڈال میں خواتین کے لیے مخصوص اہتمام کیا گیا تھا۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض مزمل احمد، تلاوت قرآن کریم چھوٹا بچہ علی شیر، تلاوت کا ترجمہ یاسر شیخ کیا۔ حمد باری معصوم بچی تبسم، نعت رسول مقبول ﷺ طالب علم عمیر نے پیش کیں۔ ایک زبردست نظم حافظ اسامہ سعید نے پیش کیا۔ اسی کے ساتھ نظم ''قرآن ہمارا رہبر ہے'' حسنیٰ اور ساتھیوں نے پیش کیا اور داد پائیں۔ خوش آمدید ٹیبلو شانزے اور ساتھی اور ٹیبلو ''ہم گلگت بلتستان کے ہیں'' دعا، منیبہ اور ساتھی نے بہت شاندار طریقے سے پیش کیا۔ اسی طرح تعلیم کی اہمیت پر مشتمل ایک شاندار دیہاتی و شہری ڈرامائی ٹیبلو، ماریہ اور اس کی کولیگز نے پیش کیا، حاضرین خوب محظوظ ہوئے۔ اردو میں

تقریر محمد ملک، عربی زبان کی اہمیت پر عربی میں حافظ حذیفہ جبکہ حجاب کی اہمیت پر انگلش میں ایک شاندار تقریر سے عقبی سحر نے شرکاء کا دل جیت لیا۔اور مہمانوں کے لیے اسعد مدنی نے ایک مفصل سپاس نامہ پیش کیا جو معلومات کے اعتبار سے انتہائی پر مغز تھا۔ان طلبہ وطالبات کے ہاتھوں میں گلگت بلتستان کی معروف سیاحتی مقامات کے کارڈ اور بینر بھی تھے ۔اسی طرح ثقافتی لباس میں ملبوس ان طلبہ وطالبات نے معزز مہمانوں کے سامنے علاقائی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے بہترین نمونے بھی پیش کیے۔

اس تقریب کے مہمان خصوصی حضرت مفتی خالد محمود صاحب تھے جو اقراء روضۃ الاطفال پاکستان کے نائب مدیر ہیں اور اقراء معہدالحافظات کے شیخ الحدیث بھی ہیں۔ انہوں نے طلبہ وطالبات اور شرکاء سے ایک شاندار خطاب کیا۔ اس تقریب میں کراچی ولاہور و پشاور سے مفتی محمد صاحب، حاجی عبدالرزاق ، حاجی خاور، حاجی شمسی صاحب اور دیگر مہمانوں نے خصوصی شرکت کی۔ اقراء گلگت بلتستان کے ناظم عمومی جناب مولانا شبیر احمد صاحب بھی تشریف فرما تھے۔اسی طرح چترال کے معروف سماجی شخصیت قاری فیض اللہ چترالی صاحب بھی کراچی سے مہمان علماء کرام کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔اور ضلع گلگت کے ہزاروں خواتین و حضرات اور سماجی شخصیات نے اس تقریب کو رونق بخشی۔

اقراء روضۃ الاطفال ٹرسٹ کی تعلیمی خدمات کا مختصر جائزہ نہ لینا ناانصافی ہوگی۔اس لیے مختصر خلاصہ عرض کیے دیتا ہوں۔اس وقت ملک بھر میں مجموعی طور پر 76,000 سے زائد طلباء وطالبات اقراء روضۃ الاطفال ٹرسٹ اسکول وکالجز سے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔اس سال اقراء روضۃ الاطفال ٹرسٹ کے مدارس سے 4,916 طلباء وطالبات نے تکمیل حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی۔اس طرح پہلے روز سے اب تک اقراکے حفاظ و حافظات کی مجموعی تعداد تقریباً 55000 ہوگئی۔اقراء روضۃ الاطفال ٹرسٹ کے زیر اہتمام اسکول وکالجز بھی ہیں۔پوری دنیا میں واحد تعلیمی ادارہ ہے جس میں حافظ ہونا شرط ہے۔یعنی اقراء کے اسکول وکالج میں ایڈمیشن کے لیے بچہ اور بچی کو حافظ قرآن ہونا لازمی ہے۔اب تک اقرا حفاظ اسکول سے 6,514 طلباء وطالبات میٹرک کا امتحان دے کر کامیاب چکے ہیں، جبکہ 565 طالبات اقرا حفاظ ڈگری کالجز کے تحت انٹرمیڈیٹ کے امتحانات میں سرخرو ہوئی ہیں۔سال 2017ء میں 1300 طلباء وطالبات میٹرک کے امتحان میں شرکت ہونگے جبکہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلباء وطالبات کی تعداد 149 ہے۔

اقراء کا اسکول اور کالج سسٹم بھی بہت معیاری ہے۔ملکی سطح پر اقرار روضۃ الاطفال ٹرسٹ کی کامیابیاں اور اعزازات بھی نمایاں ہیں۔2008 ء میں کراچی بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے جنرل گروپ میں پانچویں پوزیشن لے کر اقرا کی طالبہ حافظہ عائشہ زبیر نے ٹاپ 10 پوزیشنز میں اقرا کی شمولیت کا دروازہ

کھولا۔اس کے بعد 2010 ء میں کراچی انٹرمیڈیٹ بورڈ میں اقرا کی طالبہ حافظہ سمیرا الیاس نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 2012 ء سے تاحال اقرا کی طالبات ٹاپ پوزیشنز حاصل کرنے میں سرفہرست رہی ہیں۔ 2015 ء میں اقراء کی حافظات نے کراچی انٹر میڈیٹ بورڈ آف آرٹس گروپ میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشنز حاصل کی اور پھر اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے 2016 ء میں بھی پہلی تینوں پوزیشنز حاصل کرکے ایک منفرد ریکارڈ قائم کیا۔اسی طرح 2015 ء میں کراچی بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن جنرل گروپ کے امتحان میں دوسری اور تیسری پوزیشن سمیت ٹاپ 10 میں سے 9 پوزیشنز حاصل کرکے اقراء روضۃ الاطفال کا نام روشن کیا۔قراقرم بورڈ میں بھی مختلف سالوں میں اقراء کی طالبات نے پوزیشنیں حاصل کی ہیں۔اس سال بھی اقراء کی طالبہ نے تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔

ملکی اور بین الاقوامی اعتبار سے بھی اقراء روضۃ الاطفال ٹرسٹ کے طلبہ وطالبات نے نمایاں کارگردی دکھائی ہے اور بڑے بڑے اعزازات حاصل کیے ہیں۔چند ایک کا ذکر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔2007 ء میں رابطہ عالم اسلامی کے تحت عالمی سطح پر منعقدہ مقابلہ حفظ قرآن کریم میں دوسری پوزیشن، جبکہ 2009 ء اور 2010 ء میں پہلی پوزیشن حاصل کرکے اپنے ادارے اور ملک و قوم کا نام روشن کیا۔کچھ وجوہات کی وجہ سے کئی گزشتہ چند سالوں سے اقراء کے طلبہ وطالبات رابطہ کے مقابلوں میں شرکت کرنے سے گریزاں ہیں۔اسی طرح متعدد

نونہالوں نے انتہائی کم عمری اور بہت ہی قلیل مدت میں حفظ قرآن کریم کی تکمیل کر کے عوام و خواص کو حیرت میں ڈال دیا۔ انہی نابغہ روزگار بچوں اور بچیوں میں سے ایک چھ سالہ بچی حافظہ خنساء جاوید نے صرف 115 دنوں میں تکمیل حفظ کے ساتھ ساتھ رابطہ عالم اسلامی کے تحت منعقدہ مقابلہ حفظ قرآن کریم میں ملکی اور عالمی سطح پر نمایاں کامیابی کے ساتھ ساتھ حکومت پاکستان کی جانب سے " سفیر قرآن برائے پاکستان " کا منفرد اعزاز بھی حاصل کیا۔

گلگت بلتستان کے ضلع غذر کی طالبہ بی بی مریم بنت غلام حیدر نے صرف پانچ سال اور آٹھ ماہ کی عمر میں حفظ قرآن کریم کی تکمیل کی۔ ضلع گلگت کے طالب علم حافظ عطاء اللہ نے محکمہ تعلیم گلگت بلتستان کی جانب سے پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے الجزائر میں منعقدہ عالمی مقابلہ حسن قرات میں سب سے کم عمر قاری کا اعزاز حاصل کیا۔

انتہائی خوشی کی بات یہ ہے کہ اقرار وضۃ الاطفال ٹرسٹ نے گلگت بلتستان بشمول چترال میں بھی اسی توجہ اور محنت سے کام کیا ہے جس کا مظاہرہ اس نے ملک عزیز کے دیگر علاقوں میں کیا۔ مشاہدے کی بات یہ ہے کہ گلگت بلتستان اور چترال کو ہمیشہ سے ایسے معاملات میں پیچھے رکھا گیا ہے۔ 1999ء میں مولانا یوسف لدھانویؒ اور ان کے رفقاء نے ضلع گلگت اور غذر میں ایک ایک شاخ کی

داغ بیل ڈال دی تھی۔ بعد میں بتدریج ان میں اضافہ ہوتا رہا اور اس وقت اس پورے خطے میں مجموعی طور پر چھوٹی بڑی 50 شاخیں مصروف خدمت ہیں۔اقراء گلگت بلتستان کے لیے سب سے زیادہ وقت اور اخلاص مفتی جمیل صاحب شہیدؒ، مفتی نظام الدین شہید اور ان کے رفقاء نے دکھایا۔ اسی طرح دیگر اکابرین نے بھی دامے درمے قدمے سخنے معاونت کی۔ مولانا سرفراز خان صفدر صاحبؒ پیرانہ سالی میں تشریف لائے اور گلگت اور چترال کے لمبے ترین دورے کیے اور حکم صادر کیا کہ گلگت بلتستان اور چترال کے ہر گاوں میں اقراء کی شاخ کھولی جائیں۔یوں مختصر وقت میں درجنوں شاخوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

1999ء سے تاحال ان شاخوں سے مجموعی طور پر 4,022 طلباء طالبات نے تکمیل حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی ہے، صرف اس سال 2015-16 میں 293 حفاظ و حافظات وفاق المدارس العربیہ کے سالانہ امتحانِ حفظ میں شریک ہوئے ہیں۔اس وقت گلگت بلتستان کے کئی اضلاع میں اقراء کے زیر انتظام کئی شعبے کام کر رہے ہیں جن میں شعبہ روضہ میں 512 ، شعبہ قاعدہ میں 827 ، شعبہ حفظ میں 2,408 اور شعبہ اسکول میں 583 طلباء و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ان کی تعلیم و تربیت اور انتظامات پر مقرر اساتذہ و معلمات اور کارکنان کی تعداد 423 ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں گلگت بلتستان سے 1012 طلباء اور 1284 طالبات نے حفظ قرآن کریم کی سعادت حاصل کرکے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے امتحان میں کامیابی حاصل

کی اور نشانِ اقرا کے مستحق قرار پائے۔

اقرا روضۃ الاطفال کئی شعبوں کے ساتھ '' اقرا معہد الحافظات '' بھی ایک اہم شعبہ ہے جس میں آٹھویں کلاس کے بعد چھ سال کی مدت میں حافظات کو بیک وقت دینی اور دنیوی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان طالبات کو نہ صرف تفسیر قرآن ، حدیث ، فقہ ، عربی زبان ، اسلامی تاریخ ، اصول تفسیر ، اصول فقہ ، اصول حدیث ، بنیادی عقائد کا چھ سالہ معیاری نصاب پڑھایا جاتا ہے، بلکہ اس مدت میں ساتھ ساتھ میٹرک سے گریجویشن تک (جنرل اور آرٹس گروپ کے ساتھ) معیاری تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اب تک کئی گروپ اس کورس کی اعلیٰ معیار سے تکمیل کر چکے ہیں۔ یہ ملک بھر میں اپنی نوعیت کا منفرد نظم ہے۔ بہر صورت مزید تفصیلات اگلی کسی نشست کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔